مرتبہ

عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے .... -/۸
پاکستان سے .... -/۱۰
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی ..... ۷۵ پیسے

جلد ۳۸	بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۹۰ھ مطابق اپریل ۱۹۷۰ء	شمارہ ۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ اپریل تک آجائے، ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج کر ہمیں براہ راست اس کی اطلاع بھی دیں۔ انھیں وی، پی اب نہیں جا سکے گا لہٰذا ۲۸ اپریل تک چندہ کی اطلاع نہ ملنے کی صورت میں ہم مجبور ہوں گے کہ رسالہ بھیجنا

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ تک آجانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمن سنبھلی

خلائی پروازوں کی جدوجہد میں جب سے چاند پر پہنچنے کی مہم سر ہوئی ہے، ہمارے یہاں کے اسلامی جرائد و رسائل میں متواتر ایسے مضامین شائع ہو رہے ہیں جن کا مقصد ناواقفِ حقیقت مسلمانوں کی اس ذہنی پریشانی کو دور کرنا ہے کہ چاند پر پہنچ جانے کا دعویٰ اگر درست مان لیا جائے تو اس سے گویا خدا کی خدائی میں خلل پڑتا ہے اور انسان کے لیے وہ طاقت و قدرت تسلیم ہوتی ہے جو مذہبی معلومات کی رو سے ناقابلِ تسلیم ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ یہ پریشانی بالکل ناواقف اور عامیانہ ذہن کی پیداوار ہے ورنہ اسلام تو انسان کا اتنا بلند و برتر تصور پیش کرتا ہے کہ اس طرح کا کوئی بھی کارنامہ اس سے بعید نہیں۔ اسلام جب انسان کو اللہ کا "خلیفہ" قرار دیتا ہے تو پھر سوائے اس خاص قدرت و اختیار اور اس خاص منصب و امتیاز کے جسے اللہ نے اپنے لیے مخصوص ٹھہرا دیا ہے، وہ کون سا امکان رہ جاتا ہے جسے اس مشتِ خاک میں مخفی سمجھنا غلط ہو؟ اللہ کے اس نائب کی قدرت محدود ضرور ہے، جس طرح ہر نائب کو دیے گئے اختیارات کی ایک حد ہی ہوتی ہے مگر ان حدود کے اندر بھی اتنی وسعت ہے کہ پوری تفصیل کے ساتھ اس کا اندازہ کسی کے بس کی بات ہی نہیں۔ انسان تو اپنی ذات سے اللہ کا ایک معجزہ ہے، اس کے اندر امکانات کا ایک پورا عالم آباد ہے۔ اور اسی معنی میں اس کو "عالمِ صغیر" کہا گیا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ؎

گھٹے اگر تو بس اک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

اس میں ایک لفظ بھی شاعری نہیں، سب حقیقت کی ترجمانی ہے! قرآن جب تخلیقِ انسانی کے تذکرہ میں "فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا" کی تعبیر لاتا ہے۔ جس کا ترجمہ ہم اپنی زبان میں "پس اس نے ایک اندازہ ٹھہرایا" سے کرتے ہیں۔ تو اس تعبیر کا ابہام دراصل یہی بتلاتا ہے کہ صلاحیتوں کا جو بے پناہ خزانہ اپنے کمالِ خلق و صنعت سے خدا نے اس خاک کے پتلے میں رکھ دیا ہے، وہ بیان میں آنے کی چیز نہیں، بس ایک مبہم تصور ہی اس کا قائم کیا جا سکتا ہے۔

الغرض اسلامی عقاید میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بنا پر ایک مسلمان کو انسان کی خلائی پروازوں اور اُن کی کامیابی سے وحشت ہو چنانچہ اہل علم نے اس رُخ پر اپنے اپنے انداز میں اسی حقیقت کو واضح کیا اور عام مسلمانوں کی تشفی کا بقدر ضرورت سامان مہیا کر دیا ہے مگر کچھ اہل قلم اس وحشت کا ازالہ ایک اور ہی انداز سے کر رہے ہیں اور وہ انداز یہ ہے کہ خلائی پروازوں اور اس میں کامیابی کی پیشین گوئی تو خود قرآن میں صراحۃً موجود ہے پھر بھلا ایک مسلمان اس سے کیوں پریشان ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن کی جو آیت ایسے تمام مضامین میں گشت کر رہی ہے وہ پارہ عمّ کی ساتویں سورت (سورۂ انشقاق) کی یہ آیت ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ وَالَّيْلِ	قسم ہے شفق کی اور قسم ہے رات کی اور جو کچھ رات
وَمَا وَسَقَ ۙ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ	جمع کر لیتی ہے اُس کی اور قسم ہے چاند کی جب وہ
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ؕ	بھر جائے تم چڑھ کر رہو گے طبق بر طبق!

کہا جا رہا ہے کہ یہ اسی خلائی دور کی پیشین گوئی ہے شفق اور چاند کے تذکرہ کے ساتھ طبق بر طبق چڑھنے کی اس سے زیادہ صحیح تشریح اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے موجودہ خلائی پروازوں کی پیشین گوئی قرار دیا جائے؟ اس تشریح میں ایک کھلی ہوئی رکاوٹ "وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ" سے پڑتی تھی کہ "رات اور جو کچھ رات جمع کر لیتی ہے" اس فقرہ کا یہاں کیا جوڑ ہے؟ زیادہ ذہین لوگوں نے اس کا حل بھی نکال ہی لیا کہ رات جن چیزوں کو جمع کرتی ہے وہ ستارے ہیں۔ جو رات سے پہلے اکّا دکّا نظر آتے ہیں مگر رات آتے ہی آسمان جیسے ستاروں سے بھر جاتا۔

ایک صاحب نے بالکل ہی غضب ڈھایا ہے کہ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" کو خلائی پروازوں کی پیشین گوئی قرار دینے میں انھیں اس کی بھی ضرورت نہیں پیش آئی کہ اوپر کے فقروں کو اس کا قرینہ ٹھہرائیں بلکہ اوپر کے فقروں میں اُن کے نزدیک وہ وقت بیان ہوا ہے جب یہ خلائی پروازیں انسان شروع کرے گا یعنی قرآن نے نہ صرف ان پروازوں کی پیشین گوئی کر دی تھی بلکہ اُن کا ٹھیک ٹھیک وقت بھی بتا دیا تھا اور وہ اس طرح کہ "شفق" سے مراد ہے سُرخ انقلاب (کمیونزم کا دور دورہ) "وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ" سے مراد، اس سرخ انقلاب کی لائی ہوئی اخلاقی اور روحانی تاریکیاں، اور "وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ" (ماہ کامل) سے مراد ہے امام مہدیؑ کا ظہور! یعنی قرآن کہتا ہے کہ یہ خلائی سفر کا دور اس وقت شروع ہوگا جب دُنیا کمیونزم کی لائی ہوئی تاریکیوں سے بھر جائے گی اور ان تاریکیوں کا ازالہ امام مہدی علیہ السلام کے ظہور سے ہوگا!

ان مطالب کا سراغ کہاں سے لگا ہے؟ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن کی خاص استعارہ کی زبان ہے۔ سبحان اللہ

ؔ یہ وَمَا وَسَقَ کا وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر مترجمین کرتے ہیں اور زیر بحث مضامین میں کیا گیا ہے، ہمارے نزدیک اس کے ایک دوسرے ترجمہ کو ترجیح ہے جس کا عربیت کی رو سے پورا جواز بھی ہے اور بعض نے اسے اختیار بھی کیا ہے۔ آگے ہم نے اس کا وہ دوسرا ترجمہ کیا بھی ہے۔

کیا سستا نسخہ ہے کہ جو جی میں آئے اُسے قرآن کی خاص زبان اور خاص اصطلاح بتا دو۔ گویا یہ کہنے کے بعد اس کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا کہ اس استعاراتی یا اصطلاحی مفہوم کی سند اور دلیل کیا ہے؟ نہ سہی یہ سوال کم از کم یہی سوچا تھا کہ بات بن بھی رہی ہے یا نہیں؟ کیونکہ تفسیر کچھ بھی کیجیے مگر فقروں کی ترتیب تو اپنی جگہ ہوگی اور اس ترتیب کی رو سے جس طرح سرخ انقلاب خلائی دور سے پہلے آجانا چاہیے اسی طرح امام مہدیؑ کو بھی پہلے ہی آنا تھا۔ اُن کی آمد کے بغیر یہ دور کیسے شروع ہو گیا ہے!

افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ کس قدر بھدی، بے تکی اور بے سر پیر کی باتیں آیاتِ قرآنی کے سلسلہ میں ایسے اخبارات بھی چھاپ دیتے ہیں جن پر مسلمانوں کا ایک بڑا سنجیدہ حلقہ اعتبار کرتا ہے۔ جودتِ طبع کے یہ لایعنی مظاہرے تو سوائے اس کے کوئی استحقاق نہیں رکھتے کہ انھیں ردی کی ٹوکری کی نذر کیا جائے اور ایسے مضمون نگار حضرات سے عرض کیا جائے کہ خدا کے لیے وہ قرآن پر رحم ہی کریں، بس اپنے کرنے کا کام کیا کریں۔

خیر اب اصل سوال پر آجائیے کہ کیا واقعی "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" میں خلائی پروازوں کی پیشین گوئی کی گئی ہے؟ اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ شاید ہمارے ان اہلِ قلم نے اُس پوری سورۃ کو نہیں پڑھا جس میں یہ آیت وارد ہوئی ہے، ورنہ اس کا وہم بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سورۃ کچھ ایسی طویل نہیں مختصر ہی ہے، آپ بھی پڑھ لیجیے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا
وَحُقَّتْ ۝ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝
وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ
لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ
إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا
فَمُلَاقِيهِ ۝ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ
بِيَمِينِهِ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا
يَسِيرًا ۝ وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ
مَسْرُورًا ۝ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ
كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۝ فَسَوْفَ
يَدْعُو ثُبُورًا ۝ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ۝
إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝

جب آسمان پھٹ جائیگا، اور سنے گا حکم اپنے رب
کا، اور یہی اُس کے مناسب ہے، اور جب زمین پھیلا
دی جائے گی، اور نکال ڈالے گی وہ سب جو اُس کے
اندر ہے، اور خالی ہو جائے گی، اور سُنے گی حکم اپنے
رب کا، اور یہی اُس کے مُناسب ہے، یہ قیامت کا
دن ہوگا۔ اے انسان تجھے کشاں کشاں پہنچنا
ہے اپنے رب کے پاس اور اُس کا سامنا کرنا ہے، پس
جس کو ملے گا اعمالنامہ اُس کے داہنے ہاتھ میں اُس
سے حساب لیا جائے گا آسان حساب اور پلٹے گا
وہ اپنوں میں خوش ہو کر، اور جس کو ملے گا اعمالنامہ
پیٹھ کے پیچھے سے، وہ پکارے گا موت موت اور
پڑے گا آگ میں، وہ رہا تھا اپنے گھر والوں میں

إِنَّهُ ظَنَّ أَن لَّن يَحُورَ ۞ بَلَىٰ ۚ
إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ۞ فَلَا
أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۞ وَاللَّيْلِ وَمَا
وَسَقَ ۞ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۞
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۞ فَمَا
لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۞ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ
الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ۩ ۞ بَلِ
الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ ۞ وَاللَّهُ
أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ۞ فَبَشِّرْهُم
بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۞ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَ
عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ
مَمْنُونٍ ۞

سجدہ

بخت۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ پھر کر نہ جائے گا کیونکر نہیں؟ اُس کا رب تو اُسے خوب دیکھ رہا تھا سو میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور اس کی تہ در تہ تاریکیوں کی اور چاند کی جب وہ بھر جائے، کہ تم کو چڑھنا ہے سیڑھی پر سیڑھی پھر کیا ہوا ہے اُن کو جو یقین نہیں لاتے؟ اور جب پڑھیے اُنکے پاس قرآن تو سجدہ نہیں کرتے؟ اس سے بھی بڑھ کر یہ منکر جھٹلاتے ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے جو یہ اندر بھرے ہوئے ہیں۔ سو بشارت دے اُن کو دردناک عذاب کی مگر جو لوگ یقین لائے اور عمل کیے انھوں نے بھلے اُن کے لیے بدلہ ہے کبھی نہ ختم ہونے والا

لیجیے سورہ ختم ہو گئی۔ اس میں پہلے فقرہ سے لے کر "فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ" کے الفاظ آنے تک صاف طور سے احوال قیامت اور حساب دکتاب کا بیان ہو رہا ہے۔ اسکے بعد آخر میں پھر "فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ" سے کھلے طور پر وہی جزا و سزا کی بات سامنے آتی ہے۔ ایسے میں یہ خلائی پروازوں کی پیشین گوئی کہاں سے کود پڑے گی؟ اس کا کیا محل اور موقع ہے؟ پوری سورت میں اس بات کی یاد دہانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان کو خدا کے حضور میں حاضر ہونا ہے اور اپنے اچھے بُرے کاموں کی جزاء پانی ہے۔ آغاز سورۃ میں یہ بات اس طرح کہی گئی تھی کہ انسان کو کشاں کشاں اپنے رب کے پاس جانا اور اُس کا سامنا کرنا ہے۔ (يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ) پھر حساب دکتاب اور جزا و سزا کا تفصیلی نقشہ کھینچا گیا۔ اور اس سلسلہ میں سزا پانے والوں کے متعلق کہا گیا کہ اُن کے ذہن میں ہمارے حضور حاضری کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس ذہنیت کی تردید کے لیے اسی بات کو جو "يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ" میں کہی گئی تھی "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ" میں نہایت تاکید کے ساتھ دہرایا گیا ہے۔ یہ اس آیت کی حقیقت ہے باقی تمام افسانہ! ـــــ الفاظ قرآنی کے نہایت مستند شارح امام راغب اصفہانی اپنی کتاب المفردات فی غریب القرآن میں لکھتے ہیں

وقوله لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ أي يترقى منزلًا عن منزل وذلك

اور ارشاد باری "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ" کا مطلب ہے کہ انسان کو منزل بہ منزل لگے جانا ہے۔

اشارۃ الیٰ احوال الانسان من ترقیہ فی احوال شتیٰ فی الدنیا نحو ما اشار الیہ بقولہ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ و احوال شتیٰ فی الاٰخرۃ من النشور والبعث والحساب وجواز الصراط الیٰ حین المستقر فی احد الدارین۔

یہ انسان کے اُن مختلف احوال کی طرف اشارہ ہے جن سے وہ دنیا میں گزرتا ہے مثلاً وہ احوال جن کی طرف آیتہ "خلقکم من تراب ثم من نطفۃ" میں اشارہ کیا گیا ہے اور آخرت کے احوال حشر و نشر حساب اور عبور صراط وغیرہ کی طرف جو جنت یا دوزخ تک پہنچنے میں پیش آئیں گے۔

(باب الطاء۔ صفحہ ۳۴۳ مطبع میمنیہ ــــ مصر)

اس حقیقت کے بارے میں جو استبعاد منکروں کے ذہن میں تھا اسے دور کرنے کے لیے ایک مشاہداتی حقیقت کیطرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کیا انسان نہیں دیکھتا کہ کائنات کی کوئی چیز بھی ایک حالت پر رُک نہیں جاتی۔ سورج کے غروب پر رات کی آمد سے پہلے شفق کی صورت اختیار کرتی ہے اور درجہ بدرجہ بڑھ کر تاریکی کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ چاند ہلال ہوتا ہے تو کس قدر باریک اور کتنی نیچی سطح پر نظر آتا ہے مگر یہی تھوڑا تھوڑا بڑھتا اور اوپر اٹھتا ہوا ایک دن ماہ کامل بن کر ضوفشاں ہوتا ہے۔ تم ایک آدمی پر موت کی حالت طاری ہوتے ہوئے دیکھتے ہو اور پھر وہ تمہاری نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے تو تم سمجھتے ہو کہ معاملہ بس یہیں پر ختم ہو گیا۔ حالانکہ یہاں بھی وہی معاملہ ہے جو تم اِن سامنے کی مثالوں میں دیکھتے ہو۔ یہ آدمی کے سفر کی آخری منزل نہیں تھی۔ وہ مرنے کے بعد بھی منزلوں پر منزلیں طے کر رہا اور مختلف احوال سے گزر رہا ہے۔ مثال میں ایک لطیف معنویت اور بھی نظر آتی ہے کہ موت کے بعد والے مراحل سب ایک دور وہ ہے جس میں ایک کو دوسرے کا حال کا پتہ نہیں ہے، جیسے رات کے گھپ اندھیرے میں ایک دوسرے کا یہ حال اس دنیا میں بھی ہوتا ہے مگر جب رات چاندنی ہو جائے تو جیسے اُس وقت سب کچھ نظر آنے لگتا ہے ویسے ہی آخرت کی آخری منزلیں سب ایکدوسرے کے سامنے طے کریں گے اور وہ بے خبری یکسر دور ہو جائے گی جو آج حجاب بنی ہوئی ہے۔

انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ کلام خداوندی کی لطیف گہرائیوں اور پہلودار معنویتوں کا احاطہ اور عین حقیقت کی ترجمانی کا دعویٰ کر سکے چنانچہ اوپر جو تشریح فلا اقسم بالشفق کی گئی ہے اُسکی پابندی کسی کو لازم نہیں مگر اتنی بات بالکل قطعی اور یقینی ہے کہ ان قسمیہ فقروں میں بس اسی حقیقت پر استشہاد ہے جس کا اعلان اس سورۃ میں اوپر کیا گیا ہے اور اسی حقیقت کو اس استشہاد کیبا تھ "لترکبن طبقا عن طبق" میں دہرایا گیا ہے۔ اس لیے تشریح جس طرح بھی کی جائے گی اُسکی بنیاد بہر حال یہی رکھنا پڑیگی اور یہ سمجھنا ہوگا۔ یہ خلائی سفر کی گفتگو نہیں ہے سفر آخرت کی گفتگو ہے۔ خلائی طبقات یہاں مراد نہیں ہیں آخرت کے وہ احوال مراد ہیں جن سے کافروں کو انکار تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ لوگ یورپ کے ہر فکر و خیال اور ہر جلوہ و انداز پر قرآن کا انگوٹھا لگوانا چاہتے تھے اس عرفیت کا تو اب بہت کچھ خاتمہ ہو گیا۔ مگر اسکی جگہ یہ نیا دور چلا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی سائنسی فتوحات کا ذکر قرآن میں دکھایا جائے۔

خدا معلوم یہ نیا ذوق کیا کیا تماشے دکھائے گا اور کیسی کیسی جودتِ طبع کا شکار آیاتِ قرآنی کو ہونا پڑے گا۔ اللہ ہی ہے جو اسے ہر طرح سے محفوظ رکھے ہوئے ہے ورنہ ہماری کمزوریاں تو ابتک نہ جانے اسے کیا سے کیا بنا چکی ہوتیں۔

کِتَابُ الْمُعَاشَرَةِ وَالْمُعَامَلَاتِ

مَعَارِفُ الْحَدِیْث

(مُسَلْسَل)

میاں بیوی کے باہمی حقوق اور ذمہ داریاں (۲)

اسی عنوان کے تحت وہ حدیثیں گزشتہ شمارہ میں پیش کی جا چکی ہیں جن میں بیویوں پر شوہروں کے حقوق بیان فرمائے گئے ہیں اور اُن کو شوہروں کی فرمانبرداری اور رضاجوئی کی ترغیب دی گئی ہے —— اب ذیل میں وہ حدیثیں درج کی جا رہی ہیں جن میں شوہروں کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ وہ بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کریں، ان کو رفیقۂ حیات اور شریک زندگی بنا کے رکھیں، اُن کی ضروریات اور راحت رسانی کی فکر کریں، ان کی غلطیوں سے چشم پوشی اور درگزر کریں، اور اگر کوئی ایسا سنگین معاملہ ہو جس میں تنبیہ و تادیب ضروری ہو تو حد ضرورت سے آگے نہ بڑھیں اور اپنے اختیارات کا بیجا استعمال نہ کریں اور اُن کے بارہ میں اُس خدا سے ڈریں جو سب کچھ دیکھتا ہے اور مرنے کے بعد جس کے سامنے ہر ایک کو جانا ہے۔

بیویوں کے حقوق اور اُن کی رعایت و مدارات کی تاکید:-

عَنْ جَابِرٍ [فی حدیث طویل فی قصۃ حجۃ الوداع ، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی خطبتہ یوم عرفۃ] اِتَّقُوا اللّٰہَ فِی النِّسَاءِ وَاِنَّکُمْ اَخَذْتُمُوْھُنَّ بِاَمَانِ اللّٰہِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَھُنَّ بِکَلِمَۃِ اللّٰہِ وَلَکُمْ عَلَیْھِنَّ اَلَّا یُوْطِئْنَ فُرُشَکُمْ اَحَدًا تَکْرَھُوْنَہٗ فَاِنْ فَعَلْنَ ذٰلِکَ فَاضْرِبُوْھُنَّ

ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ.

_______ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (حجۃ الوداع میں یوم عرفہ کے خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت بھی دی) لوگو! اپنی بیویوں کے بارہ میں اللہ سے ڈرو، تم نے اُن کو اللہ کی امان کے ساتھ اپنے عقد میں لیا ہے اور اُسی اللہ کے کلمہ اور حکم سے وہ تمہارے لیے حلال ہوئی ہیں، تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ جس کا گھر میں آنا اور (تمہارے بستروں پر بیٹھنا تمھیں ناپسند ہو وہ اُس کو آکر وہاں بیٹھنے کا موقع نہ دیں، پس اگر وہ ایسی غلطی کریں تو اُن کو (تنبیہ و تادیب کے طور پر) تم سزا دے سکتے ہو جو زیادہ سخت نہ ہو، اور تمہارے ذمہ مناسب طریقہ پر اُن کے کھانے کپڑے (وغیرہ ضروریات) کا بندوبست کرنا ہے۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں سب سے پہلی بات تو یہ فرمائی گئی ہے کہ مرد جو عورتوں کے با اختیار اور صاحب امر سربراہ ہیں وہ اپنی اس سربراہی کو خدا کے مواخذہ اور محاسبہ سے بے پروا ہو کر عورتوں پر استعمال نہ کریں وہ ان کے معاملہ میں خدا سے ڈریں اور یاد رکھیں کہ اُن کے اور اُن کی بیویوں کے درمیان خدا ہے، اسی کے حکم اور اسی کے مقرر کیے ہوئے ضابطۂ نکاح کے مطابق وہ اُن کی بیوی بنی ہیں اور اُن کے لیے حلال ہوئی ہیں، اور وہ اللہ کی امان میں ان کی ماتحت اور زیردست بنائی گئی ہیں، یعنی ان کی بیوی بن جانے سے اُن کو اللہ کی امان اور پناہ حاصل ہے۔ اگر شوہر اُن کے ساتھ ظلم و زیادتی کریں گے تو اللہ کی دی ہوئی امان کو توڑیں گے اور اُس کے مجرم ہوں گے ______ "اَخَذْتُمُوْهُنَّ بِاَمَانِ اللہِ" کا یہی مطلب ہے ______ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جملہ نے بتایا کہ جب کوئی عورت اللہ کے حکم کے مطابق کسی مرد سے نکاح کر کے اس کی بیوی بن جاتی ہے تو اُس کو اللہ کی ایک خاص امان حاصل ہو جاتی ہے ______ یہ عورتوں کے لیے کتنا بڑا شرف ہے اور اس میں اُن کے سربراہ شوہروں کو کتنی سخت آگاہی ہے کہ وہ یہ بات یاد رکھیں کہ ان کی بیویاں اللہ کی امان میں ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ شوہروں کا بیویوں پر یہ حق ہے کہ جن مردوں یا عورتوں کا گھر میں

آنا اور بیویوں سے بات چیت کرنا انھیں پسند نہ ہو بیویاں ان کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دیں۔ —— "وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَلَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ" کا یہی مطلب ہے [۱] —— آگے فرمایا گیا ہے کہ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں تو مردوں کو ان کے قوام اور سربراہ کی حیثیت سے حق ہے کہ اگر وہ ان کی اصلاح اور تنبیہ کے لیے مناسب سمجھیں تو ان کو سزا دیں، لیکن صراحت کے ساتھ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ یہ سزا سخت نہ ہو —— "غیر مبرح" کا یہی مطلب ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ بیویوں کا شوہروں پر یہ خاص حق ہے کہ وہ ان کے کھانے کپڑے وغیرہ کی ضروریات کا اپنی حیثیت اور معاشرہ کے دستور کے مطابق پوری کریں۔ اس معاملہ میں بخل و کنجوسی سے کام نہ لیں۔ "بالمعروف" کا یہی مطلب ہے۔

بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَاِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ شَيْئٍ فِي الضِّلَعِ اَعْلَاهُ فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهُ كَسَرْتَهُ وَاِنْ

---

[۱] اس کا پس منظر یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کی معاشرت میں، گھروں کے اندر دور قریب کے رشتہ داروں اور دوسرے تعلق والوں کے آنے جانے اور عورتوں سے بات چیت کرنے کا عام رواج تھا، حالانکہ ان میں ایسے بھی ہوتے تھے جن کا گھر میں آنا اور بیوی سے بات چیت کرنا شوہر کو ناگوار اور ناپسند ہو سکتا تھا۔ اسی کے بارے میں اس حدیث میں عورتوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ وہ اس معاملہ میں شوہروں کی مرضی کی پابندی کریں اور ایسے کسی مرد یا عورت کو گھر میں آنے اور پاس بیٹھ کر بات کرنے کی اجازت نہ دیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناپسند ہو۔ الغرض "لا یوطئن فرشکم" کا یہی مطلب ہے —— اور آگے اسی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اگر بیویاں اس کی خلاف ورزی کریں تو شوہروں کو بطور تنبیہ و تادیب کے سزا دینے کا بھی حق ہے۔ لیکن یہ سزا سخت نہ ہو [ضرباً غیر مبرح] جو لوگ اس کا مطلب بدکاری اور زنا سمجھتے ہیں وہ بہت غلط سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس کی سزا تو شریعت میں سنگساری ہے —— ۱۲

تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ ــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
لوگو! بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کے بارہ میں میری وصیت مانو (یعنی میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کی ان بندیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، نرمی اور ملاطفت کا برتاؤ کرو، اُن کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے (جو قدرتی طور پر ٹیڑھی ہوتی ہے) اور زیادہ کجی پسلی کے اوپر کے حصہ میں ہوتی ہے، اگر تم اس ٹیڑھی پسلی کو (زبردستی) بالکل سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو وہ ٹوٹ جائے گی، اور اگر اُسے یونہی اپنے حال پر چھوڑ دوگے (اور درست کرنے کی کوئی کوشش نہ کروگے) تو پھر وہ ہمیشہ ویسی ہی ٹیڑھی رہے گی، اس لیے بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی میری وصیت قبول کرو۔　　(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) اس حدیث میں عورتوں کے بارہ میں جو فرمایا گیا ہے "إِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ" (ان کی تخلیق اور بناوٹ پسلی سے ہوئی ہے) یہ واقعہ کا بیان بھی ہو سکتا ہے اور اس کو محاوراتی تمثیل بھی کہا جا سکتا ہے، بہر صورت مقصد و مدعا یہ ہے کہ عورتوں کی جبلت اور سرشت میں کچھ نہ کچھ کجی ہوتی ہے جیسے کہ آدمی کی پہلو کی پسلی میں قدرتی کجی ہوتی ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ زیادہ کجی اس کے اوپر والے حصے میں ہوتی ہے، یہ غالباً اس طرف اشارہ ہے کہ عورت میں کجی کا زیادہ تر ظہور اُوپر کے حصہ میں ہوتا ہے جس میں سوچنے والا دماغ اور بولنے والی زبان ہو ــــ آگے فرمایا گیا ہے کہ اگر تم ٹیڑھی پسلی کو زور و قوت سے بالکل سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اگر یونہی چھوڑ دوگے تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی۔ مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی زبردستی اور تشدد سے عورت کی مزاجی کجی نکالنے کی کوشش کرے گا تو وہ کامیاب نہ ہو سکے گا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو نقل کرکے لکھا ہے "معناه اقبلوا وصيتي واعملوا بها في النساء وان في خلقهن عوجا وسوءا وهو كالامر اللازم بمنزلة ما يتوارثه الشيء من مادته وان الانسان اذا اراد استيفاء مقاصد المنزل منها لابد ان يجاوز عن محقرات الامور ويكظم الغيظ فيما يجده خلاف هواه ...... الخ"　　حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۳۵ ج ۲

افتراق اور علیحدگی کی نوبت آجائے، اور اگر اصلاح کی بالکل فکر نہ کرے گا تو وہ کبھی ہمیشہ رہے گی اور کبھی قلبی سکون اور زندگی کی خوشگواری کی وہ دولت حاصل نہ ہو سکے گی جو رشتۂ ازدواج کا خاص مقصد ہے۔ اس لیے مردوں کو چاہیے کہ وہ عورتوں کی معمولی غلطیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے ساتھ بہتر سلوک اور دلداری کا برتاؤ کریں، اس طریقہ سے ان کی اصلاح بھی ہو سکے گی۔ یہ میری خاص وصیت اور نصیحت ہے اس پر کاربند ہو۔ "اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْراً" سے آپ نے کلام شروع فرمایا تھا اور خاتمۂ کلام پر پھر فرمایا "فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ" ــــ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کو عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور دلداری کے برتاؤ کا کتنا اہتمام تھا ــــ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
لَا یَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقاً رَضِیَ مِنْهَا آخَرَ۔

ــــــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی ایمان والا شوہر اپنی مومنہ بیوی سے نفرت نہیں کرتا (یا یہ کہ اس کو نفرت نہیں کرنی چاہیے) اگر اس کی کوئی عادت ناپسندیدہ ہوگی تو دوسری کوئی عادت پسندیدہ بھی ہوگی۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اگر شوہر کو اپنی بیوی کی عادات و اطوار میں کوئی بات مرضی کے خلاف اور ناپسندیدہ معلوم ہو اور اچھی نہ لگے تو اس کی وجہ سے اس سے نفرت اور بے تعلقی کا رویہ اختیار نہ کرے اور نہ طلاق کے بارے میں سوچے بلکہ اس میں جو خوبیاں ہوں ان پر نگاہ کرے، اور ان کی قدر و قیمت سمجھے۔ یہ مومن شوہر کی صفتِ ایمان کا تقاضا اور مومنہ بیوی کے ایمان کا حق ہے ــــ اسی صورت حال کے بارہ میں قرآن مجید میں ہدایت دی گئی ہے۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْئاً وَّیَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْراً كَثِیْراً۔ (النساء، ع ۳)

اور بیویوں کے ساتھ مناسب و معقول طریقہ سے گزران کرو، اگر وہ تمہیں ناپسند بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو اور اللہ نے اس میں بہت خیر و خوبی رکھی ہو۔

بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کمالِ ایمان کی شرط:۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ أَكْمَلِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِيْمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَأَلْطَفُهُمْ بِأَهْلِهِ۔

———— رواہ الترمذی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں میں اس آدمی کا ایمان زیادہ کامل ہے جس کا اخلاقی برتاؤ سب کے ساتھ بہت اچھا ہو (اور خاصکر) بیوی کے ساتھ جس کا رویہ لطف و محبت کا ہو۔

(جامع ترمذی)

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ إِيْمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ ———— رواہ الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مسلمانوں میں زیادہ کامل الایمان وہ ہیں جن کے اخلاق بہتر ہیں اور (واقعہ میں اور اللہ کی نگاہ میں) تم میں اچھے اور خیر کے زیادہ حامل وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں زیادہ اچھے ہیں۔ (جامع ترمذی)

بیویوں کے ساتھ رسول اللہ صلعم کا معیاری اور مثالی برتاؤ:۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِيْ۔

———— رواہ الترمذی والدارمی و رواہ ابن ماجہ عن ابن عباس

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ آدمی تم میں زیادہ اچھا اور بھلا ہے جو اپنی بیوی کے حق میں اچھا ہو،

(اسی کے ساتھ فرمایا) اور میں اپنی بیویوں کے لیے بہت اچھا ہوں ۔۔۔ (جامع ترمذی،
نیز مسند دارمی اور سنن ابن ماجہ میں یہی حدیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت
کی گئی ہے)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ آدمی کی اچھائی اور بھلائی کا خاص معیار اور نشانی یہ ہے کہ اس کا برتاؤ اپنی بیوی کے حق میں اچھا ہو، آگے مسلمانوں کے واسطے اپنی اس ہدایت کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی مثال بھی پیش فرمائی کہ خدا کے فضل سے میں اپنی بیویوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتا ہوں ۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ بیویوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ انتہائی دلجوئی اور دلداری کا تھا، جس کی ایک دو مثالیں آگے درج ہونے والی حدیثوں سے بھی معلوم ہوں گی۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَلْعَبُ بِالْبَنَاتِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ لِي صَوَاحِبُ يَلْعَبْنَ مَعِي فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ يَنْقَمِعْنَ مِنْهُ فَيُسَرِّبُهُنَّ اِلَيَّ فَيَلْعَبْنَ مَعِي ۔۔۔۔۔۔ رواه البخاری ومسلم

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (یعنی نکاح و رخصتی کے بعد آپ کے ہاں آجانے کے بعد بھی) گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی، اور میرے ساتھ کھیلنے والی میری کچھ سہیلیاں تھیں (جو ساتھ کھیلنے کے لیے میرے پاس یہاں بھی آیا جایا کرتی تھیں)، تو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو وہ (آپ کے احترام میں کھیل چھوڑ کے) گھر کے اندر جا چھپتیں، تو آپ اُن کو میرے پاس بھجوا دیتے (یعنی خود فرما دیتے کہ وہ اسی طرح میرے ساتھ کھیلتی رہیں) چنانچہ وہ آ کے پھر میرے ساتھ کھیلنے لگتیں۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

تشریح) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا صحیح روایات کے مطابق نو سال کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آ گئی تھیں[1]، اور اُس وقت وہ گڑیوں سے کھیلا کرتی تھیں،

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پہلے اور ان کے بعد بھی جن ازواج مطہرات سے نکاح کیا (باقی اگلے صفحہ پر)

اور انھیں اس سے دلچسپی تھی۔ صحیح مسلم کی ایک دوسری حدیث میں خود حضرت عائشہ کا اپنے متعلق یہ بیان ہے "وَزُفَّتْ اِلَیْہِ وَھِیَ بِنْتُ تِسْعٍ وَلُعَبُھَا مَعَھَا" (یعنی جب اُن کی رخصتی ہوئی تو وہ نو سال کی تھیں اور اُن کے کھیلنے کی گڑیاں اُن کے ساتھ تھیں) صحیحین کی زیرِ تشریح حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اس کھیل بلعد تفریحی شغلہ سے نہ صرف یہ کہ منع نہیں فرماتے تھے بلکہ اس بارہ میں ان کی اس حد تک دلداری فرماتے تھے کہ جب آپ کے تشریف لانے پر ساتھ کھیلنے والی دوسری بچیاں کھیل چھوڑ کے بھاگ گئیں تو آپ خود اُن کو کھیل جاری رکھنے کے لیے فرما دیتے۔ ظاہر ہے کہ بیوی کی دلداری کی یہ انتہائی مثال ہے۔

حضرت عائشہ کی گڑیاں اور تصویر کا مسئلہ

یہاں بعض ذہنوں میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب ذی روح کی تصویر بنانا، اور اُس کا گھر میں رکھنا جائز نہیں اور اُس پر صحیح حدیثوں میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیقہ کو گڑیوں سے کھیلنے اور گھر میں رکھنے کی اجازت کیوں دی؟ بعض شارحین نے اس کا ایک جواب یہ بھی دیا ہے کہ حضرت عائشہ کے گڑیوں سے کھیلنے کا یہ واقعہ ہجرت کے ابتدائی زمانہ کا ہو جبکہ تصویروں کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا، بعد میں جب تصویروں کے بنانے اور رکھنے کی سخت ممانعت کر دی گئی تو گڑیوں کے بنانے اور کھیلنے کی بھی گنجائش نہیں رہی ـــــ لیکن اس عاجز کے نزدیک زیادہ صحیح جواب یہ ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ گڑیاں تصویر کے حکم میں داخل ہی نہیں تھیں، ـــــ وہ تو چودہ سو برس پہلے کی بات ہے، خود ہمارے اس زمانہ میں جبکہ سینے پرونے کے فن نے وہ ترقی کر لی ہے جو معلوم ہے، گھروں کی چھوٹی بچیاں اپنے کھیلنے کے لیے

(حاشیہ صفحۂ گزشتہ) وہ عموماً سن رسیدہ بیوائیں یا پہلے شوہروں کی مطلقہ تھیں، تنہا حضرت صدیقہ وہ ہیں جن کی عمر کم تھی اس کم عمری میں یہ نکاح جن عظیم مقاصد اور مصالح کے لیے کیا گیا تھا انکی وضاحت کیلئے مستقل مقالہ کی ضرورت ہے۔ اتنا اشارہ یہاں بھی مناسب ہوگا کہ اُمت کو ایک ایسی معلمہ کی ضرورت تھی جسکی مکمل تربیت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اعلیٰ صلاحیتیں بخشی ہوں اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری محرم راز رہی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے اشارہ سے اس مقصد کیلئے حضرت عائشہ کا انتخاب فرمایا تھا اور اسی لیے گویا بچپن ہی سے انکو اپنی رفاقت اور تربیت میں لے لیا تھا۔ ۱۲

جو گڑیاں بنالیتی ہیں ہم نے دیکھا ہے کہ تصویریت کے لحاظ سے وہ بھی اتنی ناقص ہوتی ہیں کہ ان پر کسی طرح بھی تصویر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اس لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کی گڑیوں کے بارہ میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

حضورؐ کا حضرت عائشہ سے دوڑ میں مقابلہ :۔

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا كَانَتْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ قَالَتْ فَسَابَقْتُهُ فَسَبَقْتُهُ عَلٰى رِجْلَيَّ فَلَمَّا حَمَلْتُ اللَّحْمَ سَابَقْتُهُ فَسَبَقَنِيْ قَالَ هٰذِهٖ بِتِلْكَ السَّبْقَةِ ＿＿＿＿ رواہ ابوداؤد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں ایک سفر میں حضورؐ کے ساتھ تھی تو پیدل دوڑ میں ہمارا مقابلہ ہوا تو میں جیت گئی اور آگے نکل گئی، اس کے بعد جب (فربہی سے) میرا جسم بھاری ہوگیا تو (اس زمانہ میں بھی ایک دفعہ) ہمارا دوڑ میں مقابلہ ہوا تو آپ جیت گئے اور آگے نکل گئے، اس وقت آپ نے فرمایا یہ تمہاری اس جیت کا جواب ہوگیا۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) بلا شبہ بیویوں کے ساتھ حسن معاشرت اور ان کا دل خوش کرنے کی یہ بھی نہایت اعلیٰ مثال ہے اور اس میں اُن لوگوں کے لیے خاص سبق ہے جن کے نزدیک دین میں اس طرح کی تفریحات کی کوئی جگہ نہیں۔

حضورؐ نے حضرت عائشہ کو خود کھیل دکھایا :۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ وَاللّٰهِ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْمُ عَلٰى بَابِ حُجْرَتِيْ وَالْحَبَشَةُ يَلْعَبُوْنَ بِالْحِرَابِ فِي الْمَسْجِدِ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتُرُنِيْ بِرِدَائِهٖ لِاَنْظُرَ اِلٰى لَعِبِهِمْ بَيْنَ اُذُنِهٖ وَعَاتِقِهٖ ثُمَّ يَقُوْمُ مِنْ اَجْلِيْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَنَا الَّتِيْ اَنْصَرِفُ فَاقْدُرُوْا قَدْرَ الْجَارِيَةِ الْحَدِيْثَةِ السِّنِّ الْحَرِيْصَةِ

عَلَى اللَّهْوِ ـــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، بیان کرتی ہیں، خدا کی قسم میں نے یہ منظر دیکھا ہے کہ (ایک روز) حبشی لوگ مسجد میں نیزہ بازی کا کھیل کھیل رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ان کا کھیل دکھانے کے لیے میرے لیے اپنی چادر کا پردہ کر کے میرے حجرہ کے دروازہ پر کھڑے ہو گئے (جو مسجد ہی میں کھلتا تھا) میں آپ کے کاندھے اور کان کے درمیان سے ان کا کھیل دیکھتی رہی، آپ میری وجہ سے مسلسل کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ میرا جی بھر گیا اور میں خود ہی لوٹ آئی (حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس واقعہ سے) اندازہ کرو کہ ایک نوعمر اور کھیل تماشے سے دلچسپی رکھنے والی لڑکی کا کیا مقام تھا۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) یہ واقعہ بھی بیویوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حسنِ معاشرت اور ان کی دلجوئی و دلداری کی انتہائی مثال ہے اور اس میں اُمت کے لیے بڑا سبق ہے۔

عید میں لہو ولعب کی بھی گنجائش

البتہ اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور سے قابلِ لحاظ ہے کہ یہ عید کا دن تھا جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس کی تصریح ہے[۱]، اور عید میں لہو ولعب کی بھی ایک حد تک گنجائش رکھی گئی ہے، کیونکہ عید اسی جشن و نشاط کا یہ بھی ایک فطری تقاضا ہے ــــ صحیحین اور دوسری کتب حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ واقعہ مروی ہے کہ ایک دفعہ عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کپڑا اوڑھے آرام فرما رہے تھے دو بچیاں آئیں اور دف بجا بجا کر جنگ بعاث سے متعلق کچھ اشعار گانے لگیں، اتنے میں حضرت ابوبکرؓ آگئے انھوں نے ان بچیوں کو ڈانٹ کر بھگا دینا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ کھول کر فرمایا "دَعْهُمَا يَا اَبَا بَكْرٍ فَاِنَّهَا اَيَّامُ عِيْدٍ"[۲] (ابوبکر! ان بچیوں کو چھوڑ دو یعنی جو کچھ یہ کر رہی ہیں کرنے دو یہ عید کا دن ہے۔ ــــ مطلب یہی تھا کہ عید میں اس طرح کے لہو ولعب کی ایک حد تک گنجائش رکھی گئی ہے ــــ الغرض زیرِ تشریح

---

[۱] و [۲] صحیح بخاری وصحیح مسلم کتاب العیدین۔

حدیث میں حبشیوں کے جس کھیل کا اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اُس کھیل کو دیکھنے کا جو ذکر ہے اُس کے بارہ میں ایک بات تو یہ ملحوظ رہنی چاہیے کہ وہ عید کا دن تھا اور عید میں اس طرح کی تفریحات کی ایک حد تک گنجائش ہے۔

یہ ایک بامقصد اور تربیتی کھیل تھا اسی لیے خود حضورؐ نے بھی اس میں دلچسپی لی

علاوہ ازیں نیزہ باری کا یہ کھیل ایک بامقصد کھیل تھا جو فنِ جنگ کی تعلیم و تربیت کا بھی ایک ذریعہ تھا، غالباً اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس سے دلچسپی لی، صحیحین کی اسی حدیث کی بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کھلاڑیوں کو "دُونَكُمْ يَا بَنِي أَرْفِدَةَ" کہہ کر ایک طرح کی داد بھی دیتے اور اُن کی ہمت افزائی فرماتے تھے[۱] ـــــ اور اسی واقعہ سے متعلق صحیحین کی بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کھلاڑی حبشیوں کو جو مسجد میں اپنا کھیل دکھا رہے تھے مسجد سے بھگا دینا چاہا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا "دَعْهُمْ" یعنی انھیں کھیلنے دو، اور ان کھلاڑیوں سے فرمایا "أَمْناً بَنِي أَرْفِدَةَ[۲]" یعنی تم بے خوف اور مطمئن ہو کر کھیلو! ـــــ

پردہ کا سوال

اس حدیث کے سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ یہ حبشی لوگ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لیے یقیناً غیر محرم اور اجنبی تھے، پھر انھوں نے ان کا کھیل کیوں دیکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں دکھایا؟ ـــــ

بعض شارحین نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ یہ واقعہ اُس ابتدائی زمانہ کا ہے جب پردہ کا حکم نازل ہی نہیں ہوا تھا" لیکن روایات کی روشنی میں یہ بات صحیح ثابت نہیں ہوتی فتح الباری میں حافظ ابن حجر نے ابن حبان کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ سنہ ۷ھ کا ہے جبکہ حبش کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور حجاب کا حکم یقیناً اس سے پہلے آچکا تھا[۳] ـــــ اس کے علاوہ حضرت عائشہ کی زیرِ تشریح حدیث میں بھی یہ مذکور ہے کہ

---

[۱] و [۲] صحیح بخاری و صحیح مسلم کتاب العیدین۔

جس وقت وہ یہ کھیل دیکھ رہی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے اپنی چادر مبارک کا پردہ کر دیا تھا، اگر یہ واقعہ حجاب کے حکم سے پہلے کا ہوتا تو اس کی ضرورت نہ ہوتی۔

دوسری بات اس سوال کے جواب میں یہ کہی گئی ہے کہ چونکہ اس کا قطعاً کوئی خطرہ نہیں تھا کہ ان حبشیوں کا کھیل دیکھنے کی وجہ سے حضرت صدیقہ کے دل میں کوئی برا خیال اور وسوسہ پیدا ہو اس لیے ان کے لیے یہ دیکھنا جائز تھا، اور جب بھی کسی عورت کے لیے ایسی صورت ہو کر وہ فتنہ اور مفسدہ سے مامون و محفوظ ہو تو اس کے لیے اجنبی کو دیکھنا ناجائز نہیں ہوگا۔ امام بخاری نے صحیح بخاری کتاب النکاح میں اسی حدیث پر باب النظر الی الحبش ونحوھم من غیر ریبۃ کا ترجمۃ الباب قائم کرکے اسی جواب کی طرف اشارہ کیا ہے اور بلاشبہ یہی جواب زیادہ تشفی بخش ہے۔ واللہ اعلم۔

بقیہ ارشاداتِ حکیم الامۃ

کیا ہو وہ ترکستان کو جا رہا ہو)

(بہت سے) مہتممین اور منتظمین کی ظاہری حالت سے یہی پتہ چلتا ہو کہ بس مدرسہ سے عزت و جاہ مقصود ہو، کیونکہ مدرسہ نہ رہا تو اہتمام اور حکومت جاتی رہے گی ــ جب مدرسے کا اجراء اشاعتِ دین اور رضائے خدا و رسول کے لیے ہو تو اس سے آگے قدم نہ بڑھانا چاہیے ــ حق غالب رہتا ہو کیونکہ اس کی شان ہو۔ اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی (حق غالب ہوتا ہو، مغلوب نہیں ہوتا) ــ اگر دل میں یہ پختہ نیت کر لو کہ جب تک یہ کام حدودِ شرعیہ کے تحت میں رہے گا تو اس کام کو کریں گے اور جس دن ایسا نہ رہا اسی دن چھوڑ دیں گے ..... حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قلمی گرامی نامہ مکاتیب رشیدیہ کے آخر میں درج ہو جس کو مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا دیوبندی رحمۃ اللہ علیہما کے نام ــ جبکہ وہ مخالفین کی وجہ سے کچھ پریشان تھے ــ تحریر فرمایا تھا اس میں ایک جملہ یہ بھی تھا کہ میرے عزیزو! تم کیوں پریشان ہوتے ہو، مدرسہ مقصود نہیں ــ رضامندی حق جل و علا مقصود ہو اور اس کے بہت طرق ہیں۔ منجملہ ان کے ایک مدرسہ بھی ہو۔ اگر مدرسہ رہے کام کیے جاؤ اور اگر نہ رہے کسی اور جگہ بیٹھ کر کام کر لینا ــ

ارشادات حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانویؒ

علماء و طلباء، اصحاب درس و ارباب مدارس کے لیے لمحۂ فکریہ

تلخیص ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

فرمایا کہ ـــ ایک شخص نے مولانا محمد قاسم صاحب (نانوتوی) رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ حضرت حاجی صاحبؒ (کیا) مولوی تھے؟ فرمایا کہ (وہ تو) مولوی گر تھے۔ ماشاء اللہ کیا نفیس جواب ہے ـــ

فرمایا کہ ـــ حضرت مولانا گنگوہیؒ جس وقت نابینا ہو گئے تو میں کبھی ویسے ہی چپکے سے جا کر نہیں بیٹھا بلکہ جب گیا تو بعد سلام (یہ کہہ دیا کہ اشرف علی آیا ہے) اور جب چلنے لگا تو کہہ دیا کہ اشرف علی رخصت چاہتا ہے۔ ویسے چپکے سے جا کر بیٹھنے میں تجسس کی مشابہت ہے تشبہ بالتجسس ہے۔ آنے جانے کی اطلاع سے یہ فائدہ تھا کہ شاید کوئی بات میرے سامنے نہ فرمانا چاہیں اور حضرتؒ فرمانے لگیں ـــ

فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب کسی مسئلے کی تقریر کو ختم فرما لیتے اور کوئی دوبارہ دریافت کرتا تو فرماتے کہ اس سے (یعنی مجھ سے) دریافت کر لو یہ سمجھ گئے ہیں۔ (بعض) لوگوں کو اس سے ناگواری ہوتی کہ سب باتیں یہی سمجھ جاتے ہیں اور کوئی نہیں سمجھتا۔ اس وجہ سے دوبارہ کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ میں نے بہت چاہا کہ ایسا نہ فرمایا کریں۔ لوگوں کو اس سے کبھی حسد ہوتا ہے مگر چونکہ یہ کہنا بھی خلاف ادب تھا اس لیے عرض نہ کر سکا ـــ

فرمایا کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مدرس

کے مہتمم نے عرض کیا کہ حضرت! ضرورت ہوتی ہے مدارس میں چندے کی۔ اور چندہ مانگنے میں ذلت ہو تو کیا صورت کی جائے؟ فرمایا کہ غریبوں سے مانگو کچھ ذلت نہیں (ہوگی) اور مالدار اوّل تو بے چارے تنگ ہوتے ہیں۔ پانچسو کی آمدنی ہو اور چھ سو کا خرچ ہو۔ یہ تو رحم کے قابل ہیں ـــــــ

فرمایا کہ دیوبند کے بڑے جلسے کے زمانے میں ایک شخص نے مدرسے میں ایک گھوڑا دیا تھا۔ مولانا (محمود حسن صاحب دیوبندیؒ) نے اِس کو ایک مقام پر بھیجدیا تھا کہ اِس کو فروخت کر دیں۔ اُس مقام سے ایک شخص اُس گھوڑے کے متعلق ایک (دستی) خط لایا تھا۔ اُس زمانے میں جلسے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ مہتمم صاحب نے خط کا جواب دے کر اُس کو رخصت کر دیا۔ مولانا دیوبندیؒ نے مہتمم صاحب سے پوچھا کہ اِس خط کے لانے والے کو کھانا بھی کھلا دیا تھا؟ مہتمم صاحب نے فرمایا کہ حضرت! کھانا تو ہجوم اشغال میں نہیں کھلایا، پیسے دے دیے ہیں کہ کچھ لے کر کھائے گا۔ فرمایا یہ کافی نہیں، غریب آدمی پیسے خرچ نہیں کرتا۔ گھر کو باندھ کر لے جاتا ہے ـــ اور لوگوں سے پوچھا کہ وہ شخص کس راستے گیا ہے؟ پتہ لگا کہ فلاں سڑک کو گیا ہے۔ مولانا اُدھر ہی تشریف لے گئے اور اُس کو واپس کر کے کھانا کھلا کر پھر رخصت کیا ـــ فرمایا کہ مولانا دیوبندیؒ اچھے خوش حال گھرانے کے تھے۔ جوانی میں بہت پُر تکلف کپڑا پہنتے تھے مگر میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ حال ہو گیا (کہ بالکل معمولی لباس پہننے لگے) ـــ میں جب دیوبند جایا کرتا تھا تو مجھے یاد نہیں کہ مولانا سے ملنے کی ابتدا میں نے کبھی کی ہو جب ارادہ کرتا کہ ذرا سانس لے کر حاضر ہوں گا۔ بس جھٹ مولانا تشریف لے آئے ـــ

فرمایا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب (نانوتوی) رحمۃ اللہ علیہ کی مہر الٹی کے بیج کے برابر چھوٹی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ ذرا بڑی مُہر بنوا لیجئے۔ مولانا نے فرمایا کیا ہوگا۔ یہ چھوٹی سی ہی ایسی ہو کہ اوّل اِس کو تلاش کرتے ہیں جہاں یہ نہ ہو بڑی بڑی مُہریں ..... بیکار سمجھی جاتی ہیں ـــ

فرمایا کہ ـــ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ الحمد للہ ہمارے سلسلے میں زیادہ تر طلبار (علماء) اور غرباء ہی کا مجمع ہے ـــ ....

فرمایا کہ حاجی محمد عابد (دیوبندیؒ) ہمارے بزرگوں کے رفقاء میں سے ہیں ـــ میرے اُستاد مولانا فتح محمد صاحبؒ اُن کی ایک حکایت بیان فرماتے تھے کہ ایک دفعہ طالب علمی کے زمانے میں میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کیونکہ اُس وقت وہ مہتمم مدرسے کے تھے ـــ اُسی

وقت ایک ڈپٹی بھی حضرت حاجی محمد عابدؒ کے پاس آئے تھے اس وقت حاجی صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ چکے تھے اس لیے اُن سے کھڑے ہی کھڑے کچھ معمولی گفتگو کرکے اُن کو رخصت کردیا پھر میں گیا تو لوٹ کر اپنی جگہ بیٹھنے لگے، میں نے عرض کیا اس کی حاجت نہیں، میں ویسے ہی (کھڑے کھڑے) گفتگو کروں گا۔ فرمایا تم نے اپنے آپ کو ڈپٹی کلکٹر صاحب پر قیاس کر لیا ہوگا؟ کہاں وہ دُنیادار اور کہاں تم نائب رسولؐ ــــــــ

فرمایا کہ ــــ ہمارے مولانا محمد یعقوبؒ ماہانہ امتحان نہ لیتے تھے۔ جب مہینہ ختم ہوتا تو پرچہ امتحان کا حکم لگا کر بلا امتحان ہی سب کے نمبر لکھ دیتے تھے۔ ایک طالب علم نے عرض کیا کہ حضرت بلا امتحان ہی نمبر لکھ دیتے ہیں۔ فرمایا مجھے سب کی لیاقت معلوم ہے ــ اگر کہو تو لاؤ سب کا امتحان بھی لے لوں۔ مگر یاد رکھو کہ اس سے کم ہی نمبر آئیں گے ــــــ

فرمایا کہ ــــ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کے سبق پڑھانے کے اندر آنسو کثرت سے جاری ہو جاتے تھے ــ ایک دفعہ ہم نے چاہا کہ مولانا سے مثنوی شروع کریں تو مہتمم صاحب نے فرمایا کہ انھیں مدرسے میں بیٹھنے دوگے یا نہیں؟ اگر مثنوی پڑھانے لگے تو جنگلوں کو نکل جائیں گے ــ آگ بھڑک اٹھے گی۔

فرمایا کہ ــــ مولانا محمد یعقوبؒ کے صاحبزادے مولوی علاء الدین صاحبؒ نے میرے ساتھ پڑھا ہے اور میرے ساتھ اُن کی دستار بندی ہوئی ہے اگر زندہ ہوتے تو مولانا کے جانشین ہوتے امتحان میں اُن کے نمبر مجھ سے کم تھے ــ لوگ یہ چاہتے تھے کہ چونکہ یہ مولانا کے صاحبزادے ہیں اس لیے دستار بندی میں مجھ سے اُن کی (یعنی مولوی علاء الدین کی) تقدیم ہو جائے۔ اس پر حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا ہے جس کا استحقاق ہو اُسی کی تقدیم ہو گی ــــ

فرمایا کہ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کے صاحبزادے مولوی علاء الدینؒ کا انتقال خاص جمعہ کے روز ہوا ہے۔ نماز سے پہلے اُن کی بہت غیر حالت تھی جب نماز کا وقت آیا تو مولانا یہ کہہ کر کہ "اللہ کے سپرد اللہ خاتمہ بخیر کرے" نماز میں پہونچ گئے۔ نماز میں دیر نہ کی حالانکہ مولانا کی وجاہت ایسی تھی کہ اگر کتنی ہی دیر فرماتے تب بھی لوگوں کو گراں نہ ہوتا مگر ایسا نہیں کیا وقت پر پہونچے ــــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ فقہ کی بات یہ ہو کہ خطبے کو خفیف کرے اور نماز کو طویل یعنی بہ نسبت خطبے کے طویل کرے ــــــ

فرمایا کہ — ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے اطلاع کی کہ حضرت یہاں (خانقاہ امدادیہ میں) مدرسہ کی سی صورت ہوگئی ہو دعا فرمادیجئے گا۔ مولانا نے فرمایا اچھا ہو بھائی مگر خوشی تو اُس وقت ہو گی جب یہاں اللہ اللہ کرنے والے بھی جمع ہو جائیں گے —

فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مثنوی کا درس ہو رہا تھا اور جلسہ عجیب جوش و خروش سے پُر تھا۔ اُس روز حضرتؒ نے پکار کر یوں دُعا فرمائی — اے اللہ ہم لوگوں کو بھی ذرہ محبت عطا فرما — ..... پھر دوسرے جلسے میں فرمایا کہ بھائی ذرے سے زیادہ کا تحمل بھی نہیں ہو سکتا —

فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب مثنوی پڑھاتے تو خوب زور و شور سے تقریر فرماتے اور جب درس ختم ہو جاتا تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ ارے بھائی شربت بناؤ سر بادو۔ بس یہ حالت تھی (جو اِس شعر میں بیان کی گئی ہو) —

ہر چند پیر خستہ و بس ناتواں شدم ہر گہ نظر بسوئے تو کردم جواں شدم

(یعنی میں اگرچہ بوڑھا اور بہت ناتواں ہو گیا ہوں لیکن جب تیری جانب نظر ڈالتا ہوں تو جوان ہو جاتا ہوں) — بڑھاپے میں قوت روحانی بڑھ جاتی ہو۔ جو کیفیت کہ بڑھاپے میں باقی رہتی ہو وہ روحانی ہو اور جو بڑھاپے میں زائل ہو جائے تو سمجھو کہ نفسانی تھی .....

فرمایا کہ جس وقت دیوبند کے مدرسے میں شورش ہوئی ہو تو اُس زمانے میں مولوی اصغر حسین صاحب (محدث دیوبندیؒ) نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک بزرگ موٹر میں سوار آرہے ہیں اور انھوں نے میرے پاس آکر موٹر ٹھہرایا — اور وہ بزرگ مشابہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں — انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ اُن سے (یعنی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے) کہہ دینا گھبرائیں نہیں سب خیریت رہے گی —

فرمایا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کے قطب الدین ایک صاحبزادے تھے اُن کی شادی لکھنؤ ہوئی تھی) اور ولیمہ نانوتہ میں ہوا تھا۔ مولانا نے اُس ولیمے میں پلاؤ زردہ بہت اچھا پکوایا تھا۔ کھانے میں ذرا دیر ہوگئی تھی۔ جمعہ کا دن تھا۔ گاؤں والے بھی ..... آئے تھے تو مولانا نے فرمایا کہ پہلے اِن گاؤں کے آدمیوں کو کھلا دو کیونکہ ان کو دور جانا ہو گھر کے آدمی پھر کھالیں گے جب

اُن کو کھانے بٹھایا تو چاروں طرف زردے کی مانگ ہونے لگی۔ مولانا پریشان ہوئے کیونکہ زردہ بہ نسبت پلاؤ کے تھوڑا پکا تھا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس کی خبر ہوئی تو مولانا فوراً مجلسِ طعام میں تشریف لائے اور مجمع میں آ کر فرمانے لگے کہ یہ پلاؤ بھی کھانے ہی کے واسطے پکا ہے اور زردہ اندازے سے پکا ہے۔ اور کھلانے والوں کو حکم دیا کہ اب پلاؤ دو اور زردہ نہ دو۔ بس سب دم بخود ہو گئے پھر کسی نے (زردہ) نہ مانگا اور کام حُسن و خوبی کے ساتھ انجام کو پہونچ گیا۔ اس پر فرمایا کہ مولانا گنگوہیؒ کے اندر شانِ انتظام بڑی تھی ......

فرمایا کہ ایک مرتبہ دیوبند کے ایک پہلوان نے باہر کے کسی پہلوان کو پچھاڑ دیا تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی خوشی ہوئی اور فرمایا ہم بھی اس پہلوان اور اُس کے کرتب کو دیکھیں گے۔ حافظ نورالحق کی بیٹھک میں اُسے بلایا اور اُس کے کرتب دیکھے۔

فرمایا کہ ہمارے حضرات، خلوت وغیرہ پسند نہیں کرتے تھے .... مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ نے بھی کبھی گوشہ نشینی اختیار نہیں کی البتہ مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری رحمۃ اللہ علیہ پر بہ نسبت دوسرے حضرات کے قدرے اس کا غلبہ تھا باقی بقدرِ ضرورت خلوت سب حضرات کا معمول تھا۔ چنانچہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھوڑی دیر حجرہ بند کر کے اُس میں بیٹھتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ میرا جی یوں چاہتا ہے کہ سب سے الگ ہو کر ایک گوشے میں بیٹھ جاؤں۔ مولانا نے تحریر فرمایا کہ ہمارے بزرگوں نے ایسا کیا نہیں اس سے شہرت ہوتی ہے۔

فرمایا کہ ایک مرتبہ میں نے حضرت مولانا محمد یعقوبؒ سے عرض کیا کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ قیامت کے دن جب جنت نہ بھرنے کی شکایت کرے گی تو اللہ تعالیٰ ایک مخلوق پیدا کرے گا اور اُسے بلا عمل جنت میں داخل کرے گا تو یہ لوگ تو بڑے مزے میں ہوں گے۔ فرمایا اُنھیں کیا خاک مزہ ہوگا وہ راحت کا کیا لُطف اٹھائیں گے۔ جو راحت بعد کلفت کے ہو اُس میں لذت ہوتی ہے۔ جنت میں آرام اور چین ہم کو ہوگا جو مختلف شدائد و آلام اور مصائب و نوائب جھیلے ہوئے ہیں۔

فرمایا کہ جب (مفتی) مولوی محمد شفیع صاحب دیوبندی یہاں آنے لگے تو ایک صاحب نے اُن سے کہا کہ درسیات کو چھوڑ کر کہاں وقت ضائع کرنے جاتے ہو؟ میں نے یہ سُن کر اُن سے

پوچھا کہ بھائی سچ کہنا یہاں آکر تمہارے علوم درسیہ میں کچھ اضافہ ہوا یا نہیں؟ انھوں نے کہا بہت کچھ ہوا میں نے کہا کہ بس معترض کا یہی جواب ہے ——

ایک صاحب اپنے بچے کو لے کر حاضر ہوئے اور (مدرسۂ خانقاہ کے) ایک (سن رسیدہ) معلم صاحب کے زیادہ مارنے پیٹنے کی شکایت کی۔ اس پر ان (معلم صاحب) کو بلایا گیا اور شرعی شہادت کے بعد حضرت نے ان سے فرمایا کہ جب تم کو مارنے سے منع کر دیا ہے پھر تم نے خلاف کیوں کیا؟ اس کا انھوں نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ حضرت نے ان کو اپنے پاس سے اٹھا دیا اور فرمایا تمہارا فیصلہ مہتمم صاحب کے آنے پر ہوگا (مہتمم صاحب باہر گئے ہوئے تھے) طلبا سے مارنے کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ اس لڑکے نے یہ کہدیا تھا کہ "چھٹی کا وقت ہو گیا" اتنی سی بات پر اس کو بیحد مارا .... فرمایا کہ یہ تو جنون ہے کہ ذرا سی بات پر اس قدر سزا .... وہ معلم ابھی مجلس ہی میں تھے کہ حضرت نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا تم کو یہاں رہنے کی تو اجازت ہے لیکن جب تک یہاں رہو میرے سامنے نہ پڑو اور طلبا سے فرمایا کہ تم ان کے پاس نہ پڑھو — مجلس کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس وقت مختتم فیصلہ نہ کرنے کا راز یہ ہے کہ حدیثوں میں غصہ کے وقت فیصلہ کرنے کی ممانعت آئی ہے اس لیے ایسے امور میں غصے کے وقت کبھی فیصلہ نہیں کرتا۔ بعد غصہ دور ہو جانے کے جب تک تین تین چار چار مرتبہ غور نہیں کر لیتا .... اس وقت تک سزا نہیں دیا کرتا۔
پھر ان معلم کو اپنے پاس سے اٹھا کر ایک دوسرے معلم کو جو کہ نو عمر تھے بلایا جب وہ آگئے تو ان سے فرمایا کہ معلوم ہوا ہے تم بھی بچوں کو مارتے ہو اس کا صحیح اور معقول جواب دو، تاویلات کو ہرگز نہ مانوں گا یہ بتلاؤ کہ جب میں نے منع کر دیا ہے تو پھر کیوں مارتے پیٹتے ہو۔ یہ شرارت، نفس کی ہے یا نہیں؟ انھوں نے اقرار کیا ہاں بے شک شرارت، نفس کی ہے .... پھر فرمایا کہ قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ خدا کی قسم اب کسی بچے کو نہ ماروں گا اور اگر اس پر قادر نہ ہو تو کام چھوڑ دو ہم اپنا انتظام خود کر لیں گے میں نے تمہارے واقعات گھر پر بچوں کو بلا کر زدو کوب کرنے اور ایسی مار پیٹ کرنے کے جس سے وہ بچے بے ہوش ہو گئے، سُنے ہیں تم کو اس قدر مارنے کا کیا حق ہے؟ .... تمہارے ذمے پڑھانا ہے علم آجانا تھوڑا ہی ہے فقہا نے اس کو خوب سمجھا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی عقد اجارہ میں یہ کہے کہ اتنا حساب کتاب مجھے آجائے تو یہ دوں گا تو یہ اجارہ باطل ہے اور اگر یہ کہا کہ سکھاؤ پڑھاؤ خواہ آئے خواہ نہ آئے تو یہ جائز ہے کیونکہ استاد کے اختیار میں سکھلانا پڑھانا ہے، آجانا نہیں

ہے...... تم ایسے لڑکوں کی حالت لکھ کر مہتمم صاحب کو دیدو، وہ اگر مصلحت سمجھیں گے، اُن کے ماں باپ کو اطلاع کر کے خارج کر دیں گے تم ماں باپ کا کام اپنے ذمّے کیوں لیتے ہو اُن کو اگر پڑھانا ہوگا تو اپنے لڑکوں کا مزاج آپ درست کر دیں گے ــــ دیکھو انگریزی مدارس میں مارنے کا قاعدہ بالکل نہیں ہے۔ دُنیادار تو حقیقت کو سمجھیں اور دیندار طبقہ نہ سمجھے ــــ اور اب تو جبریہ تعلیم کا قاعدہ نکل آیا ہے۔ دینی مکاتب سے بُعد ہو رہا ہے۔ اس سختی سے تو بچے اور اُچاٹ ہوں گے اور دینی تعلیم کو چھوڑ دیں گے ایسے وقت تو نہایت شفقت سے کام لینا چاہیے......

فرمایا کہ ــ آج کل چندوں کا فساد اِس قدر ہو گیا ہے کہ لوگ اِن چندوں کی مصلحت سے راہِ حق کو چھوڑ کر راہِ باطل اختیار کرنے لگے ــ ایک قاری صاحب نے جو کہ ایک دینی مدرسہ میں مدرس ہیں جب ضاد صحیح پڑھنا شروع کیا تو عوام تو بدظن ہو ہی گئے تھے تعجب یہ ہے کہ علماء مدرسہ نے بھی اُن کو ــ محض عوام کی خاطر سے کہ اُن کی وحشت سے چندہ کم نہ ہو جائے ــ روکا کہ "کیا پڑھتے ہو ہمارے بزرگوں نے کبھی اس طرح نہیں پڑھا" ــ یہ کیا واہیات بات ہے بزرگوں کو بدنام کرتے ہیں۔ کیا ہمارے بزرگ غلط پڑھتے تھے؟ ــ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ تو کبھی امامت ہی نہ کرتے تھے اُن کا تو میں نے سُنا نہیں ــ ہاں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا پڑھنا سُنا ہے۔ بہت صحیح پڑھتے تھے اور قاری بھی تھے اور حضرت مولانا گنگوہیؒ کی قرأت کو میں نے بھی سُنا ہے اور مزید تقویت کے لیے ایک ماہر قاری سے پوچھا بھی کہ تم نے حضرتؒ کا پڑھنا سُنا ہے؟ کہا ہاں میں نے ۲ مرتبہ حضرتؒ کے ساتھ دَور کیا ہے۔ حضرت نہایت صحیح پڑھتے تھے اور حروف، مخارج سے نکالتے تھے ــ غرضیکہ اُس دینی مدرسہ کے اُن قاری صاحب نے مجھے لکھا کہ لوگ میرے پیچھے نماز نہیں پڑھتے (اور علماء مدرسہ بھی میرا ساتھ نہیں دیتے پھر میں کیا کروں؟) میں نے لکھا کہ اگر اہل مدرسہ کو رزّاق سمجھتے ہو تو غلط پڑھو اور اگر خدا کو رزّاق سمجھتے ہو تو صحیح پڑھو ــ بس چند دن میں سب ٹھیک ہو گئے ــ...... اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فلاں (صحیح) کام سے مدرسہ کے چندے میں کمی ہو جائے گی۔ عوام بدظن ہو جائیں گے۔ فلاں رئیس صاحب چندہ بند کر دیں گے چاہے خدا اور رسولؐ کے احکام کی کتنی ہی نافرمانی ہو جائے مگر عوام کے خلاف نہ ہو

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی ــــ کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

(یعنی میں ڈرتا ہوں کہ اے دیہاتی تو کعبہ کو نہیں پہونچ سکے گا اس لیے کہ جو راستہ تو نے اختیار

(باقی ص۱۵ پر)

اِسلام کی چار اَساسی عِبادتوں میں

حج کا مقام

از حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند مدظلہٗ

(گزشتہ سے پیوستہ)

(یہ مضمون ایام حج سے چند ہی روز پہلے لکھا گیا ہے، اس کا بہت مختصر خلاصہ حج کے دن ریڈیو سے نشر بھی ہو چکا ہے پہلی قسط گزشتہ ماہ ہدیۂ ناظرین ہو چکی ہے، یہ دوسری اور آخری قسط ہے)

عقل پر چونکہ نظام عالم کا دار و مدار رکھا گیا ہے اور عقل ہی دین کے لحاظ سے مدار تکلیف بھی ہے اور ساتھ ہی وہ جبلّت بھی ہے جو انسان میں پیدائشی طور پر تخلیق کی گئی ہے. اس لیے ولادت سے لیکر موت تک انسان میں عقل ہمہ وقتی طور پر قائم رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُس پر طفولیت اور شباب کے اوقات آتے ہیں اور وہ ناتواں اور توانا ہوتی ہے لیکن انسان میں جاگزیں ہمہ وقت رہتی ہے اور کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا کہ انسان عقل و شعور سے خالی محض ہو غرض عقل و شعور انسانیت کے ساتھ ہمہ وقت درجہ بدرجہ لازم ملزوم رکھے گئے ہیں تاکہ نظام زندگی مختل نہ ہونے پائے

اور ظاہر ہے کہ نماز کی بنیاد عقل و ادب اور عقل و شعور کی تسکین پر تھی جو انسان میں ایک خلقی غریزہ اور مستمر جبلت ہے کہ کسی وقت بھی خود سے زائل نہیں ہوتی اس لیے نماز بھی عمر بھر کے لیے دوامی بلکہ ہمہ وقتی رکھی گئی ہے کہ ولادت سے لے کر موت تک زندگی کے کسی موڑ پر بھی انسان سے الگ نہ ہو، ولادت کے بعد تو متصلاً اذان و تکبیر سے بچہ کے کانوں کو آشنا بنا کر گویا

نماز کے لیے اُسے تیار کیا جاتا ہے اور پھر قدرے ہوش آتے ہی ساتویں برس کی عمر سے نماز کی تاکید کی جاتی ہے اور دسویں برس کی عمر سے اس بارہ میں اس پر سختی بھی کی جاتی ہے تاکہ نماز کی عادت پڑ جائے اور پھر سن بلوغ کو پہونچتے ہی نماز اس پر فرض کر دی جاتی ہے اور نہ صرف سالانہ یا ماہانہ یا ہفتہ وار بلکہ روزانہ اور وہ بھی دن اور رات کے دونوں ہی حصوں میں یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے، پانچ وقت روزانہ فریضہ بناکر اور پھر ان پانچ فرائض کے ساتھ قبل و بعد کی رکعتیں سنت بناکر پھر روزانہ دن اور رات کے نوافل الگ ہیں، کہیں تہجد، کہیں اشراق، کہیں چاشت، کہیں فیئی الزوال، کہیں صلوٰۃ الاوابین، اور کہیں صلوٰۃ التوابین، پھر غیر موقت نمازیں الگ ہیں، کہیں سجودِ شکر جو بذیل نوافل ہی ادا ہوتے ہیں اور کہیں صلوٰۃ فزع کہ کسی بھی خطرے اور مصیبت کے وقت نماز کی طرف رجوع کیا جائے جو حضور اقدس کی عادت کریمہ تھی، کہیں صلوٰۃ توبہ ہے جو معاصی مٹانے کے لیے رکھی گئی ہے اور کہیں صلوٰۃ حاجت ہے جو مرادیں مانگنے کے لیے ہے، کہیں صلوٰۃ استسقاء ہے اور کہیں صلوٰۃ خسوف و کسوف، اور پھر اُوپر سے کثرت نوافل کی ترغیب الگ ہے جو کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں۔ دن کی نوافل چار چار رکعت کے ساتھ اور رات کی دو دو رکعت کے ساتھ اور آخر کار موت کے بعد بھی نماز ہی پر انسانی زندگی کے معاملات ختم کیے گئے ہیں جس کا نام صلوٰۃ جنازہ ہے۔ غرض جیسے ولادت سے لیکر موت تک عقل کا احاطہ وسیع ہے کہ وہ کسی وقت بھی انسانی جبلّت سے باہر نہیں ہوتی ایسے ہی اس عقل پر مبنی شدہ عبادت (یعنی نماز) کا دائرہ بھی مہد سے لے کر لحد تک وسیع رکھا گیا ہے کہ زندگی میں کسی وقت بھی انسان سے جُدا نہیں ہوتی، بخلاف محبت کے کہ وہ اگرچہ جبلّی ہے اوّل تو خود منشاء شعور نہیں مثل مشہور ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے پھر اُس کا ظہور کسی بیرونی علاقہ پر موقوف ہے اگر کوئی محبوب ہی نہ ہو یا اُس کا علم و شعور نہ ہو تو محبت کا ظہور بھی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ ہمیشہ اور ہمہ وقت یکساں نہیں رہتی بلکہ اُس میں اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، کبھی اُس میں جوش اور ولولہ ہوتا ہے اور کبھی سکون، کسی وقت یہ جوش مستی و بے خودی کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کبھی صرف اُنس و موانست ہی کے درجہ میں رہ جاتا ہے، کسی وقت عاشق جان سپاری کے جذبہ بلکہ بار بار مرنے کی آرزو سے لذت پانے لگتا ہے اور کبھی اُس پر سرد مہری چھا جاتی ہے اور گم سا ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات خود محبت ہی کسے سے مبتدل بہ عداوت ہو جاتی ہے اور محسوس نہیں ہوتا کہ یہ وہی

محبت والا انسان ہو جواب سے پہلے تھا۔ بالخصوص مستی و دیوانگی اور محویت و بے خودی کی ایسی گھڑیاں تو خال خال ہی آتی ہیں۔ ظاہر ہو کہ حج کی بنیاد مطلق محبت یا اُنس پر نہیں بلکہ عشق کے انتہائی درجہ پر ہو اور شوق کی بھی انتہائی منزل سے متعلق ہو کہ اُس کے بعد شوق محبوب کا کوئی درجہ باقی نہ رہو جسے جان سپاری کی آرزو کہتے ہیں ورنہ آدمی پوری زندگی کی ساری راحتوں اور ساری لذتوں کو خیرباد کہہ کر گھر در عزیز و اقربا اور تمام تعلقات سے بیگانہ بن کر کوچہ محبوب میں جان تک فدا کردینے کے لیے کیسے تیار ہو سکتا ہو اور ظاہر ہو کہ ایسا انتہائی شوق جان نثاری کہ اس کے بعد شوق کا کوئی درجہ باقی نہ رہو، عمر بھر میں ایک ہی بار آسکتا ہو ورنہ اگر کوئی درجہ شوق پھر بھی ایسا باقی رہ جائے جس کا عاشق کو انتظار ہو تو اُسے انتہائی شوق نہیں کہہ سکتے وہ تو ابتدائی یا درمیانی درجہ ہوگا اب خواہ شوق کا یہ درجہ ابتدا ہی میں آجائے یا درمیان اور آخر میں آئے رہے گا ایک ہی، اس کی ایسی ہی مثال ہو جیسے تکوینی اُمور میں مومن کی موت کا مقام ہو کہ شوق لقاء رب اور وصال محبوب کی تڑپ میں مومن اپنی جان ہی ملک الموت کے حوالہ کر دیتا ہو اور اُس کی روح اس تڑپ میں اسی طرح جسم سے بہہ کر نکل جاتی ہو جیسے پانی بھری مشک کا منہ کھول کر اسے اُلٹا دیا جائے اور پانی کا ایک ایک قطرہ غرغرا کر نکل جائے، اور ظاہر ہو کہ یہ انتہائی مقام انتہا، عمر میں ایک ہی مرتبہ آتا ہو یعنی موت ایک ہی بار آتی ہو بار بار نہیں آتی کیونکہ عشق کا یہ انتہائی مقام بھی ایک ہی بار کا ہو بار بار کا نہیں ورنہ اسے انتہائی نہ کہا جائے۔

ٹھیک اسی طرح تشریعی امور میں شوق و محبت کا یہ انتہائی مقام کہ تحق محبوب فدائے نفس کے لیے آدمی مضطر ہو جائے، ایک ہی ہو سکتا ہو اور ایک ہی بار آسکتا ہو ورنہ اُسے انتہائی اور آخری کیوں کہا جائے؟ اور جبکہ حج کا تعلق عشق و محبت کے اسی مقام سے ہو تو حج لازم بھی عمر میں ایک ہی بار آسکتا تھا بار بار نہیں۔ اس لیے حج عمر میں ایک ہی بار فرض کیا گیا نہ کہ ماہانہ یا سالانہ، البتہ چونکہ یہ محبت جس سے حج کا تعلق ہو عقلی ہو طبعی نہیں جس میں ارادہٗ اختیار کو دخل نہ ہو اس لیے گو یہ انتہائی مقام محبت ایک ہی ہو اور ایک ہی بار آئے لیکن ارادہٗ اختیار سے اس کی نقل ضرور اُتاری جا سکتی ہو جو بالکل اُس کے مشابہ ہو اس لیے حج فرض کے بعد حج نفل کی اجازت بھی دی گئی ہو کہ وہ نفل حج ہو، اصل حج نہیں اسی لیے اُس پر ثواب اور درجات کے وہ نتائج مرتب نہیں ہوتے جو حج فرض پر ہوتے ہیں کیونکہ جیسے حج فرض کے بعد یہ بار بار کا شوق پہلے انتہائی شوق کی نقل

اور اُس کا مثل ہو عین نہیں کہ وہ تو ایک ہی ہو اور ایک ہی بار کا ہو ایسے ہی یہ بار بار کا حج فرض کی نقل ہو بعینہ وہ نہیں کہ وہ تو ایک ہی ہو اور ایک ہی بار آسکتا تھا بار بار نہیں کیونکہ اس کا منشا بھی انتہائی شوق وجذبۂ جان فدائی ہونے کی وجہ سے ایک ہی ہو اور ایک ہی دفعہ آسکتا ہو ورنہ وہ انتہائی باقی نہ رہے جبکہ شے کی انتہار ایک ہی ہوتی ہو متعدد نہیں ہوتی۔

بہرحال نماز کا منشا عقل وخرد ہو اور عقل انسان میں ہمہ وقتی ہو۔ یہ نہیں ہوتا کہ آج آدمی عقلمند ہو اور کل کو بے وقوف ہو جائے تو نماز بھی ہمہ وقتی ہو اور اس کی تسبیں پوری عمر کو گھیرے ہوئے ہیں اور حج کا منشار انتہار عشق و فدائیت ہو اور عشق میں اُتار چڑھاؤ کہ

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اور اُس کا آخری منتہا فدائے نفس ہے اور اُس کی ساعتیں انتہائی ہونے کی وجہ سے عمر میں ایک ہی بار آتی ہیں اس لیے حج بھی عمر بھر میں ایک ہی بار فرض ہو بار بار نہیں؛

بہرحال نماز اور حج کے اس تجزیہ و تقابل سے (کہ ایک عقلی عبادت ہو اور ایک عشقی، ایک بار بار فرض کی گئی ہو اور ایک صرف ایک بار، ایک کا سرچشمہ عقل و ادب ہو جس سے شائستہ افعال کا ظہور ہوتا ہو اور ایک کا عشق و فدائیت ہو جس سے ترک نفس اور ترک مالوفات نفس کا ظہور ہوتا ہو) یہ صاف روشن ہو جاتا ہو کہ حج تروک کا مجموعہ ہو جس میں اوّل سے لے کر آخر تک ترک ہی ترک کی گرم بازاری رہتی ہو۔ ترک وطن، ترک شہریت، ترک قبائل، ترک لذات، ترک شہوات، ترک زینت و نفس پروری، ترک خودی و خودداری، ترک لباس اور پیکر آرائی، ترک ثاث و شوکت آرائی، ترک خود بینی و خود نمائی وغیرہ کہ یہ سب امور از قسم تروک ہیں از قسم افعال نہیں اور اگر حج میں کوئی فعل بھی ہو تو وہ ان ہی تروک کے ضمن میں اُن ہی کی تکمیل کے لیے رکھا گیا ہو جو تابع ترک ہو خود اصل نہیں، کیونکہ حج جبکہ عشقی عبادت ہو اور عشق میں عاشق کا اصل مقام ترک ہی ہو کہ اُسے محبوب کے مقابلہ میں اپنے نفس ہی کی پرواہ نہیں رہتی چہ جائیکہ نفس کے مرغوبات کی آرزو ہو ورنہ وہ عاشق نہ رہے حتیٰ کہ اُسے سب سے زیادہ مرغوب وصالِ محبوب ہوتا ہو جس کے لیے وہ طبعاً ان تروک کی راہ چلتا ہو لیکن اگر محبوب کی خواہش ترک وصال کی ہو تو وہ خیال وصال کو بھی ترک کر دینے کو سو جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہو بقول فارسی شاعر کے ؎

میلِ[1] من سوئے وصال و میلِ او سوئے فراق
ترک کارِ خود گرفتم تا بر آید کارِ دوست

اور بقول عربی شاعر کے

أُرِيدُ وِصَالَهُ وَيُرِيدُ هَجْرِي
فَأَتْرُكُ مَا أُرِيدُ لِمَا يُرِيدُ

بہر حال عاشق کی پہلی اور آخری مراد مرضئ محبوب میں مستغرق ہو کر اپنا اور اپنی مرغوبات کا ترک اور انھیں فنا کر دینا ہو نہ کہ فعل اور ان کا باقی رکھنا یہ خلاف نماز کے کہ وہ تروک کے بجائے افعال کا مجموعہ ہو، وقار و متانت کا چال ڈھال میں اختیار کرنا، بدن اور لباس میں صفائی ستھرائی کی پوری سعی کرنا، آغاز نماز میں ہاتھ کانوں تک لیجا کر دنیا و مافیہا سے دست برداری دینا، قیام کے فعل میں دست بستگی کا فعل انجام دینا، ہاتھ باندھ کر اپنی وفاداری کا عملی اقرار کرنا، آنکھ نیچی رکھ کر ادب و تعظیم کے ساتھ اپنی حیا و انکسار کا ثبوت دینا، رکوع میں جھک کر اپنی پستی اور ہیچ میرزی کھولنا، سجدہ میں گر کر اپنی ذلت و خواری اور محکومی و غلامی کو نمایاں کرنا، دعاء و الحاح میں دل کے ساتھ زبان کو بھی متحرک رکھنا، غرض قیام و قعود، رکوع و سجود، دعا و درود، تلاوت کلام معبود اور اس کی ثنائے لا محدود وغیرہ سب افعال ہی افعال ہیں جو عبدیت کے جذبات نمایاں کرنے کے لیے عمل میں لائے جاتے ہیں، تروک نہیں ہیں کہ چپ چاپ رہ کر ان سے باز رہا جاتا ہو، کیونکہ دانشمند محکوم کا کام ہی اپنے حاکم کو راضی کرنے کے لیے ہمہ وقت مستعدی سے مرضئ محبوب کے افعال بجالانا ہے نہ کہ اپنے کسی خیال میں غرق ہو کر ڈیوٹی سے غافل ہو جانا۔

اندریں رہ می تراش و می خراش   تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

اور اگر اس عبادت میں کوئی ترک بھی رکھا گیا ہو تو وہ ان ہی افعال کے ضمن میں اُن ہی کی تقویت و تکمیل کے لیے ہو جو تابع افعال ہو، خود اصل نہیں، پس نماز مجموعۂ افعال ہو جو خدمت گار کا کام ہو کہ ہمہ وقت حرکت و عمل میں مستعد رہے اور رج مجموعۂ تروک ہو جو عاشق بے نوا کا کام ہو کہ ہمہ وقت ترک خودی و خود نمائی میں رہے نہ کہ اثبات خودی و خودداری میں غرق ہو۔

غور اس پر کیا جائے کہ نماز کے ان مشقت طلب افعال میں وجود میں پانچ مرتبہ

---

[1] میری رغبت ہو وصال کی اور محبوب کی رغبت ہو فراق کی اس لیے میں نے اپنا کام (وصال) ترک کر دیا ہو تاکہ دوست کا مقصد پورا ہو جائے۔
[illegible]

بطور فریضہ اور رات دن میں بچاسوں مرتبہ حسب استطاعت و قوت بطور نفل کے رکھے گئے ہیں، سب سے بڑا مانع دنیا اور دنیوی لذات اور سامان عیش و نشاط ہو کہ اُن ہی سے امتثال امر میں سستی اور کاہلی راہ پاتی ہو اور آدمی ان تن آسانیوں اور عیش کوشیوں میں پھنس کر حاضری دربار کے قابل نہیں رہتا اور ان ساری عیش پسندیوں کا سب سے بڑا ذریعہ اور وسیلہ یا بالفاظ دیگر دنیا کا معظم ترین حصہ مال و دولت ہو جو اس عبادت میں رکاوٹ بنتا ہو چنانچہ عامۃً امراء اور دولتمند ہی نماز دن میں سستی اور مساجد کی حاضری میں غفلت دکھلاتے ہیں غرباء اکثر و بیشتر اس دلدل میں پھنسے ہوئے نہیں ہیں بقول علامہ اقبال مرحوم

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب
اُمرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

اس لیے ضرورت تھی کہ زر و مال کے افراط سے بچانے کے لیے اس گنجینۂ زر پر کوئی بریک لگایا جائے اور اُس کی یہ آہنی گرفت کچھ ڈھیلی کی جائے تاکہ تعیش و عیش کوشی کے ان جذبات کے معتدل ہو جانے سے اس فریضۂ نماز کی ادائیگی اور پابندی کے لیے راستہ ہموار ہو اس لیے شریعت نے فریضۂ زکوٰۃ اور اُس کی ساتھ صدقات واجبہ، صدقات نافلہ، خیر خیرات، صلہ رحمی لطایا و ہدایا مقرر کیے اور نہ صرف نقد و زیور ہی میں بلکہ زمین اور کھیت کی پیداوار میں بھی حتیٰ کہ جانوروں اور مویشیوں تک میں حسب شرائط و حدود مصارف رکھے جس سے آدمی اس زر و مال کو اپنے سے کھو سکے تاکہ ایک طرف تو اُس میں افراط زر کا وہ استغناء اور اُس کے سبب سے تن آسانی اور راحت طلبی کی وہ بے تحاشا بھوک باقی نہ رہے جو نماز جیسی عظیم عبادت کی طرف دوڑنے میں پیر کی زنجیر اور سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی تھی، اور دوسری طرف آدمی عوام سے اپنے کو مافوق نہ سمجھنے لگے جس سے عوام کی صف میں مساویانہ انداز سے کھڑا ہونے سے اُسے عار لاحق ہو پس زکوٰۃ حقیقتاً نماز کی تمہید اور اس کا راستہ ہموار کرنے کے لیے موثر سبب اور اس سب سے بڑی رکاوٹ کا دفعیہ ثابت ہوتی ہو اس لیے یہ نتیجہ بآسانی نکل آتا ہو کہ اس جانی عبادت (نماز) کے لیے یہ مالی عبادت (زکوٰۃ) وسیلہ

اور تابع کی حیثیت رکھتی ہو. خود بذاتہ اصل نہیں گو فریضہ ہونے میں نماز ہی کے ہم پلہ ہو جیسے وضو نماز کے لیے ایک مفتاح اور کنجی کی حیثیت رکھتی ہو جو نماز کے تابع ہو خود بذاتہ اصل نہیں گو فریضہ ہونے میں اُس سے کم نہیں کہ فریضہ کا مقدمہ بھی فرض ہی ہوتا ہو، پس فرضیت میں یہ وسیلہ اور مقصود برابر ہیں مگر مقصد اور وسیلہ کے فرق سے دونوں الگ الگ ہیں۔

اُدھر حج چونکہ مجموعۂ متروک تھا اس لیے اگر سارے مرغوباتِ نفس کے تروک کا سارا بوجھ آدمی پر بیکدم ڈال دیا جاتا تو طبعاً وہ اُسے برداشت نہ کر سکتا اس لیے ضرورت تھی کہ حج سے پہلے اُس کے متصل کچھ ابتدائی اور روزمرہ کے تروک کی اُسے مشق کرائی جاتی تاکہ دھائی تہائی اور غیر معمولی تروک برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا اور ظاہر ہو کہ روزمرہ کی مرغوباتِ نفس میں جن کی محبت میں گرفتار ہو کر آدمی محبتِ خداوندی اور اُس کے پاک گھر کی کوچہ نوردی کی لذت سے ناآشنا اور محروم رہتا ہو، ہمہ وقتی مرغوب محبوب کھانا پینا اور شہوانی لذات ہیں۔ اس لیے شریعت نے ہر سال ایک مہینے رمضان کے روزے فرض کیے تاکہ ایک ماہ تک دن میں کھانا پینا اور جنسی لذات ترک کر کے اور رات میں نیند کی شہوت کو خیرباد کہہ کر وہ آگے کے اہم تروک کے قابل بن سکے، پھر دن بھر کے ان تروک کے ضمن میں ذکر رب الانام اور رات کے ترک نوم کے ضمن میں تراویح و تہجد میں تلاوت کلام ملک العلام رکھے گئے جن میں لگے رہنے سے محبوب حقیقی کے یہاں حاضر باشی کے وقت محبوب کو پکارنے اور لبیک کہنے کی زبان میں صلاحیت اُبھر آئے جسے ان لذات کے شغف نے دبا رکھا تھا اُس کی ساتھ ہی پھر رمضان مبارک میں جب نصف چلہ یعنی بیس دن کی فاقہ مستی سے ان شہوات بطن اور شہوات فرج یعنی کھانے پینے اور بیوی باندی کی رغبت سے اک گونہ کنارہ کشی میسر آگئی تو آخر عشرہ میں اعتکاف کی سنت رکھدی گئی اور بتلا دیا گیا کہ محبوب حقیقی کی طرف دوڑنے کے لیے خورد و نوش اور بیوی باندی کا ترک کرنا کافی نہیں بلکہ گھر بار چھوڑ کر خدا کے گھر (مسجد) میں شب و روز قیام کرنا بھی بہ تقاضائے عشق ضروری ہوتا کہ گھر بار کے تعلق سے بھی ایک گونہ یکسوئی اور بیگانگی میسر آجائے۔

اور جونہی رمضان میں ان ابتدائی تروک پر بندہ کو قدرت ہو گئی اور وہ آئندہ کے بڑے تروک کے لیے ذی استعداد بن گیا تو رمضان ختم ہوتے ہی شوال سے اشہرِ حج شروع ہو جاتے

ہیں گویا خدائی اعلان ہو جاتا ہے کہ اس محبوب حقیقی کی محبت میں کھانا پینا، جنسی لذات اور گھر باہر کی لذات کا ترک کر دینا کافی نہیں کہ یہ صرف تمہید تھی بلکہ کوچہ محبوب کی حاضری کے لیے شہر اور وطن کو بھی خیرباد کہہ دیا جائے کہ ان لذات میں رہتے ہوئے دیار محبوب کی حاضری اور مشاہدہ جمال نصیب نہیں ہو سکتا، اس سے صاف واضح ہے کہ روزہ و اعتکاف در حقیقت حج کی تمہید ہے تاکہ ان ابتدائی تروک کی مشق سے انتہائی تروک کی استعداد پیدا ہو جائے۔ بغرض مجموعۂ تروک کی عبادت (حج) کے لیے تمہیدی عبادت بھی تروک کی ہو سکتی تھی تو وہ فرض کی گئی جس کا نام روزہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مجموعۂ افعال کی عبادۃ (نماز) کے لیے تمہیدی عبادت بھی فعلی ہی رکھی گئی تھی جس کا نام زکوٰۃ ہے کیونکہ فعل فعل کی عادت ڈال سکتا ہے اور ترک ترک کی، یہ نہیں ہو سکتا کہ فعل سے ترک فعل کی عادت پڑ جائے اور ترک فعل سے فعل کی، اس لیے نماز کا مقدمہ زکوٰۃ ہے اور حج کا مقدمہ روزہ ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی چار اساسی عبادتوں میں دو عبادتیں نماز اور حج اصل ہیں اور دو عبادتیں زکوٰۃ اور روزہ ان کے تابع اور ان تک پہونچانے کا وسیلہ ہیں گو بلحاظ فرضیت اور رکن اسلام ہونے کے چاروں اصل اور مقصود ہیں، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی روحانیت کی جوہری ترقی کی تکمیل حقیقتاً انہی دو اساسی عبادتوں نماز اور حج میں مضمر ہے جبکہ ان کے ساتھ یہ دو تمہیدی عبادتیں زکوٰۃ اور صیام بھی لگی رہیں لیکن ان دو اصل عبادتوں نماز اور حج میں حج کو دیکھا جائے تو اس میں نماز بھی بدستور قائم رہتی ہے بلکہ اپنے مراتب و کیفیات کے لحاظ سے بدرجہا بڑھ جاتی ہے کہ حرم الٰہی میں ایک نماز ایک لاکھ کے برابر ہو جاتی ہے ادھر خود طواف بیت کے بعد دوگانہ طواف بھی واجب ہے جو نماز ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف حج کا زمانہ ہی نماز سے خالی نہیں بلکہ عین حج بھی نماز سے خالی نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نماز حج کے لوازم میں ہے اس لیے حج جہاں عشق کا مقام رکھتا ہے وہاں عقل کے مقام کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ادھر جنایات احرام میں جگہ جگہ کفارے اور صدقات بھی حج کا جزو ہیں جو زکوٰۃ کا موضوع ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ حج زکوٰۃ و صدقات سے بھی خالی نہیں اور زکوٰۃ کی روح بھی اس میں سمائی ہوئی ہے، ادھر حج کے اصلی اور بنیادی رکن وقوف عرفہ کے دن کا روزہ بھی حسب استطاعت مطلوب ہے جو رمضان کا موضوع ہے جس سے نمایاں ہوتا ہے کہ حج کی عبادت صیام سے بھی خالی نہیں

بلکہ روزہ بھی اُس کا ایک جزو ہو پس حج جامع صلوٰۃ و صیام و زکوٰۃ ثابت ہوتا ہو اندریں صورت جبکہ حج کی عبادت نماز روزہ اور زکوٰۃ و صدقات کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہو اُسے اگر اس جامعیت کی بنا پر دوسری عبادات کے مقابلہ میں من کل الوجوہ نہ سہی تو بڑی حد تک ایک ممتاز فضیلت کا حامل سمجھا جائے تو بعید از قیاس نہیں پس اس سے زیادہ حج کی فضیلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جامع عبادات اور جامع عشق و عقل ہے جو انسان کے دو بنیادی عنصر ہیں۔

حج کی ایک یہ خصوصیت بھی قابل غور ہو جو اور عبادتوں میں اس طرح نمایاں نہیں ہو کہ ایام حج یعنی آٹھویں ذی الحجہ سے تیرھویں ذی الحجہ تک کے پانچ دونوں میں حج کے ذریعہ سے اُمتیوں کو نبیوں کی زندگی سے ہمکنار کر دیا جاتا ہو۔ انبیاء علیہم السلام کی زندگی کا طغرائے امتیاز کمال زہد و قناعت اور دُنیائے لذات و خواہشات سے بے تعلقی ہو۔ وہ مساکین اور غرباء میں ملے جلے رہتے ہیں، بدن پر حُلّہ یعنی ایک لنگی اور ایک چادر اُن کا غالب لباس ہو۔ گھر باہر سے فارغ القلب نہ زمین نہ جائداد، نہ زر نہ مال، بیوی بچے بھی ہوں تو قلب اُن سے یکسو، اُن سے محبت بھی ہو تو لِلّٰہِ حُبًّا لِلّٰہِ نہ لِوَجْہِ النفس۔ ہر وقت محبت حق میں سرشار، ہر بندگی بجالانے پر بھی شرمسار، نہ فخر، نہ غرور، نہ شیخی نہ جذبۂ تفوق، زبان پر ہر وقت ذکر الٰہی، دل میں ہر وقت محبت خداوندی، ہاتھ پیر ہمہ وقت مجاہدہ و ریاضت اور طاعت و بندگی میں مصروف، انہماک لذات سے کوسوں دور، ہوائے نفس سے کلیتہً نفور، رکوع و سجود اور ہمہ وقتی عبادت و ذکر سے معمور خیر خواہی خلائق اور خدمت خلق سے مسرور، لوگوں کی اذیت کڑی پر صبر و تحمل، نہ انتقام نہ بدلہ، گریۂ شوق اور بکاءِ خوف کی لگن، ہر وقت سفر در وطن اور خلوت در انجمن، زیادتِ علم و معرفت کی ہمہ وقت دُھن وغیرہ وغیرہ کیا حج کے پانچ دنوں میں یہی صورت ایک عازم حج کی نہیں ہوتی کہ وطن سے دور، بیوی بچوں سے مہجور، شوق عشق میں نہ بیوی یاد، نہ بچوں کا دھیان، نہ زائد از ضرورت زر و مال نہ سامان راحت و لذت، غریبانہ اور مسافرانہ زندگی، زہد و قناعت سے گزر بسر، مسکینوں جیسا لباس، ایک لنگی اور ایک چادر، عمومی مساوات کا رنگ ڈھنگ نہ کوئی اونچا، نہ کوئی نیچا، بادشاہ و گدا سب ایک رنگ، اور ایک لباس میں ملبوس، نہ زینت نہ ٹیپ ٹاپ، نہ کوٹھی کا غرور نہ بلڈنگ کا فخر نہ ماتحتوں پر فوقیت کا تخیل نہ غریبوں

کی تحقیر، خلاف طبع ساتھیوں اور ہم سفروں کی اڑی کڑی پر تحمل، محبت الٰہی میں غرق، رقت قلب اور گریہ و بکا، محبت الٰہی میں استغراق، زبان پر ذکر و تلبیہ، ہاتھ پیر طاعت و خدمت میں مصروف، مسائل حج کی ہمہ وقت جستجو اور پوچھ پاچھ اور مزید علم کا شوق، وعظ و تذکیر سے استفادہ کا ہمہ وقتی جذبہ وغیرہ غرض جو زندگی انبیاء کو دی جاتی ہے وہی ان پانچ دنوں میں درجہ بدرجہ امتیوں کو بھی نصیب کر دی جاتی ہے اور یہ سمجھوا دیا جاتا ہے کہ نبیوں جیسی پاک زندگی جو زہد و قناعت سے بھرپور اخوت و مساوات سے معمور اور وطن و مکان اور مرغوبات نفس سے دور رہ کر اگر پانچ دن بسر کی جاتی ممکن ہے جبکہ قلب کا جذبۂ عشق بیدار ہو تو عمر کے دوسرے حصوں میں بھی بسر کی جاتی ممکن ہے اگر جذبۂ عشق کو سونے نہ دیا جائے اور دینی محرکات سے اُسے جگایا جاتا رہے جیسا کہ ان دنوں میں اُسے بیدار رکھا جاتا ہے، تاکہ یہ کہنے کا کسی کو موقع نہ ملے کہ یہ زندگی صرف نصیب خواص ہے۔ عوام کے لیے یہ زندگی ناممکن ہے، اگر یہ وسوسہ صحیح ہوتا تو ان پانچ دن میں بھی یہ زندگی ناممکن ہوتی، اسی لیے حج کے بارہ میں فرمایا گیا کہ انسان حج کر کے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسے آج اس کی ماں نے اُسے جنا ہے کہ جیسے وہ معصوم اور بے لوث پیدا ہوتا ہے، اس طرح حاجی بھی حج کے بعد ایسا ہی پاک اور معصوم صفت بن جاتا ہے، اس سے اندازہ کیا جائے کہ حج کی فضیلت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ امتی کی زندگی کو نبی کی زندگی میں ڈھال دیتا ہے اور عمر بھر کے لیے ایسی زندگی کا امکان نمایاں کر دیتا ہے، جسے غفلت شعار لوگ ناممکن جاننے کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

طلب حدیث کے لیے رحلت

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری شیخ الحدیث
دار العلوم فلاح دارین ترکیسر سورت، گجرات

رحلت وہ مقدس سفر ہے، جو علم دین کی تحصیل کے لیے کیا جاتا تھا، مسلمانوں کو اپنے پیغمبر علیہ الصلوات والتسلیم کی تعلیمات سے جو خصوصی تعلق رہا ہے، اس کی بنا پر علم حدیث کی حفاظت وصیانت کے لیے تمام ممکن ذرائع واسباب کو اختیار کیا گیا۔ اس کا اندازہ صحابہ وتابعین اور بعد کے علماء ومحدثین کے علمی اسفار سے بھی کیا جا سکتا ہے، کہ ان کے نزدیک علم حدیث کی طلب میں براعظموں اور سمندروں کو پار کر لینا معمولی بات تھی، یہانتک کہ اس لفظ رحلت میں ایک شان تقدس پیدا ہو گئی، حضرت ابراہیم بن ادھم جو اپنے زمانے کے کبار اولیاء اللہ میں تھے. فرماتے ہیں کہ.

انّ اللہ یدفع البلاء عن هٰذہ الاُمة برحلة اصحاب الحدیث[۱]	اللہ تعالیٰ محدثین کے سفر کی برکت سے اس اُمت کی بلاؤں کو دور فرماتا رہتا ہے۔

قرآن وحدیث میں بھی اس مبارک سفر کی تاکید وترغیب بیان کی گئی ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا	اور ایسا تو ممکن نہیں ہے کہ سب کے سب

---

[۱] معرفۃ علوم الحدیث ص۸ .

کَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن کُلِّ فِرْقَةٍ	مسلمان نکل کھڑے ہوں، پھر کیوں نہ نکلیں ان کی
طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَ	ہر جماعت میں سے چند لوگ تاکہ دین میں
لِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ	سمجھ پیدا کریں، اور ڈرائیں اپنی قوم کو
لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ [۱]	جب لوٹ آئیں ان کی جانب تاکہ وہ بچتے رہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

من خرج فی طلب العلم فهو فی	جو شخص طلب علم میں نکلا، پس وہ اللہ کے
سبیل اللہ حتی یرجع۔ [۲]	راستے میں ہے، جب تک واپس نہ آئے۔

آپ کا ارشاد ہے۔ "من سلك طريقا يلتمس فيه علما سهل الله له به طريقاً إلى الجنة" [۳] جو شخص علم کی تلاش میں کوئی راستہ اختیار کرے گا، حق تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کرے گا۔

عہد نبوی میں مدینہ منورہ میں دور دراز کے قبائل اپنے نمائندوں کو بارگاہِ رسالت میں اسلام کے احکام معلوم کرنے کے لیے بھیجتے تھے تاکہ یہ واپس جاکر تعلیم وارشاد کی خدمت انجام دیں۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں اس سفر کی ترغیب و تحریض کے لیے تین تراجم قائم فرمائے ہیں۔ باب ما ذكر في ذهاب موسى في البحر [۴]۔ اور اس باب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو بیان فرمایا ہے کہ وہ اتنے بڑے اور جلیل القدر پیغمبر ہیں، انھوں نے بھی تحصیل علم کی خاطر ہر طرح کی صعوبتوں اور مشقتوں کو برداشت کیا، یہاں تک کہ اس کے لیے بحری سفر بھی اختیار فرمایا۔ دوسرا ترجمہ باب الخروج في طلب العلم [۵] منعقد کیا ہے اور اس ترجمہ میں ذکر فرماتے ہیں۔

ورحل جابر بن عبد الله مسيرة	حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ نے حضرت
شهر إلى عبد الله بن انيس	عبداللہؓ بن انیس سے ایک حدیث
في حديث واحد۔ [۶]	سننے کے لیے سفر کیا۔

---

[۱] سورۂ توبہ رکوع ۱۵ [۲] مشکوٰۃ المصابیح صہ۳۴ [۳] حوالہ مذکور صہ۳۴ [۴-۵] صحیح بخاری صہ۱۶ [۶] حوالہ مذکور صہ۲۱

اور تیسرا باب ہے، باب الرحلۃ فی المسئلۃ النازلۃ ہنگامی مسئلہ پیش آجائے تو اس کے لیے سفر کرنا امام دارمی نے بھی اپنی سنن میں ترجمہ قائم فرمایا ہے باب الرحلۃ فی طلب العلم والعناء یعنی طلب علم کی غرض سے سفر کرنا اور اس میں مشقت برداشت کرنا، علامہ خطیب بغدادی کی الرحلۃ پر مستقل تصنیف ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد دور صحابہؓ میں ہمیں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ صرف ایک حدیث کا علم حاصل کرنے کے لیے بعض صحابۂ کرامؓ نے دور دراز کا سفر اختیار کیا امام بخاری نے الادب المفرد میں اور امام احمد وابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ مدینۂ منورہ میں مقیم تھے۔ وہ فرماتے ہیں، کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں ایک صاحب کے متعلق اطلاع ملی کہ انھوں نے آنحضرتؐ کی ایک حدیث سنی ہے میں نے اُسے اُن سے براہ راست حاصل کرنے کے لیے اسی وقت ایک اونٹ خریدا اور اس پر کجاوہ کس کر ایک ماہ تک چلتا رہا، اور ملک شام پہونچا جہاں ان صحابی (عبداللہؓ بن انیس) کا قیام تھا، اُن کے مکان پہونچ کر اطلاع کرائی کہ دروازہ پر جابرؓ کھڑا ہے، انھوں نے سننے کے ساتھ پوچھا' جابر بن عبداللہ؟ کہا جی ہاں! وہ فوراً باہر آگئے، اور گلے ملے، پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے پاس ایک حدیث کی اطلاع ملی تھی، میں ڈرا کہ کہیں موت آجائے' اور اس حدیثِ مبارک کے سننے سے محروم رہ جاؤں، یہ سُن کر حضرت عبداللہؓ بن انیس نے وہ حدیث بیان کردی، وہ حدیث آخرت میں قصاص سے متعلق تھی ؎۲

اسی طرح کا ایک اور واقعہ حضرت ابوایوبؓ انصاری کا ہے۔ ایک حدیث انھوں نے براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس میں کچھ تردد پیدا ہوا، اس حدیث کے سننے کے وقت حضرت عقبہ بن عامرؓ صحابی دربار رسالت میں موجود تھے، لیکن وہ مصر میں قیام پذیر ہو گئے تھے، سُن کر حیرت ہوتی ہے کہ صرف ایک حدیث میں معمولی تردد کو دور کرنے کے لیے حضرت ابوایوبؓ مصر روانہ

؎۱ سنن دارمی ص　　؎۲ فتح الباری ۱۷ ص ۱۴۳ و ۱۰۴ طبع جدید

ہوتے ہیں اور عقبہ بن عامر کے پاس پہنچ کر فرماتے ہیں، مجھ سے اس حدیث کو بیان کرو جو تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مومن کی پردہ پوشی کے متعلق سنی ہے اس حدیث کو براہ راست سننے والوں میں میرے اور تمھارے سوا اور کوئی باقی نہیں رہا، حضرت عقبہ بن عامر اس حدیث کو ان کے سامنے دہراتے ہیں "من ستر مومنا فی الدنیا علی خزیۃ ستر اللہ یوم القیامۃ" حضرت ابوایوبؓ یہ سنتے ہی فوراً اپنی سواری کی طرف پلٹے، اور مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوگئے، واپسی میں اتنی جلدی کی کہ حضرت مسلمہؓ (والی مصر) نے جو نذرانہ ان کو بھیجا تھا، وہ بھی عریش مصر میں ان کو ملا۔ [۱]

امام دارمی نے اپنی سنن میں عبداللہؓ بن بریدہ سے روایت کی ہے، کہ ایک صحابی سفر کرکے حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے پاس مصر پہونچے، اس وقت وہ اپنی اونٹنی کو چارہ کھلا رہے تھے، ان کو دیکھ کر فرمایا مرحبا! صحابی مذکور نے حضرت فضالہؓ سے کہا، لم آتک زائرا میں آپ کی زیارت کے لیے نہیں آیا ہوں، بلکہ میں نے اور آپ نے ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، مجھے اُمید ہے کہ وہ آپ کے حافظہ میں ہوگی، حضرت فضالہؓ نے پوچھا وہ کون سی حدیث ہے؟ صحابیؓ مذکور نے کہا کذا وکذا، جس میں یہ یہ ہے۔ [۲]

یہ عہد صحابہؓ کے چند واقعات ہم نے نقل کیے ہیں، دورِ تابعین و تبع تابعین میں اس سلسلے کو بہت ترقی ہوئی۔

"حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے تلامذہ آپ سے علم حاصل کرنے اور حدیثیں سن لینے کے باوجود مدینہ منورہ کا (کوفہ) سے رُخ کرتے تھے، اور وہاں جاکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے علم حاصل کرتے تھے، اور حدیثیں لکھتے تھے" [۳]

کثیر بن قیس تابعی فرماتے ہیں۔

"میں دمشق میں حضرت ابوالدرداءؓ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا، دفعتہً ایک شخص نے اُن سے آکر عرض کیا، ابوالدرداءؓ! میں مدینۃ الرسولؐ سے چل کر آپ کے پاس آیا ہوں، اور

---

[۱] جامع بیان العلم ج۱ ص۹۳ [۲] سنن دارمی ص۶۵ [۳] مناقب الامام احمد از ابن جوزی ص۲۰۳

کسی دنیوی حاجت و ضرورت سے نہیں آیا ہوں، ایک حدیث کے لیے آیا ہوں، معلوم ہوا ہو کہ آپ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں، حضرت ابوالدرداءؓ نے جب یہ سُنا تو فضیلتِ علم کے بارے میں پہلے ایک حدیث اُس شخص کو سنائی، پھر جس حدیث کو سُننے کے لیے سفر کیا تھا اس کو سنایا۔[1]

خطیب بغدادی نے ابوالعالیہ کی یہ روایت نقل کی ہے، کہ وہ فرماتے تھے کہ

"ہم بصرہ میں بعض صحابہ کرام سے روایات (بالواسطہ) سنتے، مگر جب تک مدینہ منوّرہ جاکر خود ان کی زبان سے نہ سُن لیتے ہمیں چین نہ آتا۔[2]

حضرت سعید بن مسیب جلیل القدر تابعی ہیں، فرماتے ہیں، کہ میں نے ایک حدیث کی طلب و تلاش میں کئی کئی رات اور دن کا سفر کیا ہے۔[3]

حضرت عبداللہ بن مسعود کا ارشاد ہے کہ "اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھنے والا کسی جگہ موجود ہے تو میں ضرور اس کے پاس سفر کر کے جاؤں گا۔[4]

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ عامر شعبی نے ایک بار ایک حدیث بیان کی، اور پھر سائل سے (جو خراسان کا رہنے والا تھا) کہنے لگے کہ ہم نے تمھیں مفت میں بتا دیا ہے، ورنہ اس سے کم کے لیے تو مدینہ منورہ کا سفر کیا جاتا تھا۔[5]

خطیب بغدادی نے عبیداللہ بن عدی سے جو کبار تابعینؒ میں سے ہیں، نقل کیا ہے،

"مجھے ایک حدیث کے متعلق پتہ چلا کہ اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، دل میں خدشہ آیا کہ کہیں خدانخواستہ ان کا انتقال ہو گیا تو براہ راست ان سے وہ حدیث نہ سن سکوں گا۔ بس فوراً ہی سفر شروع کر دیا اور انکی خدمت میں عراق پہونچ کر دم لیا۔[6]

ائمہ حدیث کے تذکروں میں اس کی بکثرت مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں:

---

[1] جامع ترمذی ص ۹۳ ج ۲ [2] سنن دارمی ص ۷۳ [3] معرفۃ علوم الحدیث ص ۸ [4] فتح الباری ص ۱۴۲ ج ۱
[5] صحیح بخاری ص ۲۳ ج ۱ [6] فتح الباری ص ۱۴۲ ج ۱

مسلمانوں کے عہدِ عروج میں محدثین کرام خصوصیت سے جن ممالک اور شہروں کی طرف رحلت کرتے تھے، علامہ ذہبی نے ان ملکوں اور شہروں کے بیان میں مستقل ایک رسالہ تحریر کیا ہے جس کا نام "الامصار ذوات الآثار" یعنی "حدیثوں کے شہر" رکھا ہے۔ یہ پورا رسالہ حافظ سخاوی نے "الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ" میں نقل کر دیا ہے[۱]

اس زمانہ میں جو محدث طلب علم میں اسفار سے گھبراتا تھا وہ طعن و ملامت کا نشانہ بنتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے خلف بن ایوب سے جو بلخ میں تھے، آکر ایک مسئلہ دریافت کیا، وہ کہنے لگے مجھے تو معلوم نہیں، سائل نے کہا پھر کسی ایسے شخص کا پتہ بتا دیجئے جسے یہ مسئلہ معلوم ہو، فرمایا ایسے تو حسن بن زیاد ہیں، جو کوفہ میں ہیں، اس پر سائل نے کہا کوفہ تو بہت دور ہے، خلف نے فرمایا "من همه الدین فالکوفة الیه قریبة" جسے دین کی فکر ہو اس کے لیے کوفہ قریب ہے۔

امام یحییٰ بن معین جو ناقدِ فن ہیں فرماتے ہیں، "جو محدث اپنے ہی شہر میں حدیثیں لکھا کرے اور سفر نہ کرے اس میں تم کبھی بھلائی محسوس نہ کرو گے"[۲] ائمہ اربعہ میں امام مالک کے سوا کہ انھوں نے مدینۂ منورہ سے باہر طلب علم کے لیے قدم نہیں نکالا کیونکہ مدینہ اس زمانہ میں خود علم و فن کا مرکز تھا، دور دراز سے تشنگان علم اپنی پیاس بجھانے وہاں آتے تھے، اور بقیہ ائمہ نے دور دراز کا سفر اختیار کیا اور اس راستے کی مشقتوں اور صعوبتوں کو برداشت کیا، ائمہ و محدثین کرام اور علماء سلف کی علمی رحلتوں کے حالات پڑھ کر عقل انسانی حیران رہ جاتی ہے، کہ اس زمانہ میں جب آمد و رفت کی نہ یہ تیز رفتار سواریاں تھیں اور نہ ہی سفر کی موجودہ سہولتیں، ان حضرات نے حفاظت حدیث اور تحصیل علم کی خاطر اس طرح بحر و بر کو ایک کر ڈالا، کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام عالم اسلامی ایک شہر میں تبدیل ہو گیا ہے۔

محدثین کرام کے ان علمی اسفار کا اعتراف اسلام کے دشمنوں اور مستشرقین یورپ نے

---

[۱] کتاب مذکور ص۱۳۶ تا ص۱۴۲　[۲] معرفۃ علوم حدیث از حاکم نیشاپوری ص۹

بھی کیا ہے، چنانچہ مشہور مستشرق گولڈزیہر (GOLD ZIHER) جس نے علم حدیث پر بہت سے اعتراضات کیے ہیں وہ بھی اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہے کہ "جن ائمہ حدیث کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے علم حدیث کے لیے چار چار مرتبہ مشرق و مغرب کا سفر کیا، وہ میری نگاہ میں نہ دور از قیاس ہے، اور نہ ہی اس میں مبالغہ ہے لہ

نظر و ہمت کو بلند کیجیے کہ ہمارے اسلاف نے کس محنت و جانفشانی کے ساتھ دین و سنت کے سرمایہ کی حفاظت کی اور اس سے مسائل کا استنباط و استخراج کیا، تاکہ اللہ کی حجت عالم پر تمام ہو۔

لہ علوم الحدیث و مصطلحہ ص ۵۶

بقیہ درس قرآن

دبکم علیکم.... الی قولہ لعلکم تتقون سے لے کر لعلکم تتقون تک

یوں تو قرآن مجید کا ہر حکم واجب العمل ہے لیکن ان آیتوں میں جو ہدایتیں اللہ تعالیٰ کی وصیت کے عنوان سے دی گئی ہیں اُن کی یقیناً خاص اہمیت ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو توفیق دے کہ انکی پابندی اور پیروی کا خصوصیت سے اہتمام کریں۔ وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

درسِ قرآن —— مرکز والی مسجد

۸؍ فروری ۷۰ء (یکشنبہ)

● دینِ حق کی بنیادی اور ابدی ہدایات
● انسانوں کیلئے انکے رب کی مقرر کی ہوئی صراطِ مستقیم
● بندوں کو اُن کے پروردگار کی وصیّت

(۲)

[۸؍ فروری کو سورۂ الانعام کے ۱۷ ویں اور اٹھارویں رکوع کا درس ہوا تھا۔ یہ دونوں رکوع اور ان کا ترجمہ گذشتہ اشاعت میں قارئین پڑھ چکے ہیں۔ لیکن صفحات میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے تشریح اور تفسیر صرف ۱۷ ویں رکوع کی شائع ہو سکی تھی۔ اٹھارویں رکوع کی تشریح و تفسیر ناظرین آج کی صحبت میں ملاحظہ فرمائیں۔

سلسلۂ کلام کے استحضار کے لیے یہ یاد کر لیا جائے کہ ۱۷ ویں رکوع سے پہلے قریباً ۱۰ آیتوں میں مشرکینِ عرب کی اس گمراہی کا ذکر کیا گیا تھا کہ انھوں نے بہت سی اُن حلال طیب چیزوں کو جنھیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے، خواہ مخواہ حرام ٹھہرا لیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں ایک پوری شریعت گھڑ لی ہے اور اس کو بالکل بے دلیل اور بے سند اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو جرمِ عظیم ہے —— اس کے بعد ۱۷ ویں رکوع میں ان کی اسی گمراہی اور اس مجرمانہ حرکت پر زیادہ تفصیل کے ساتھ

تبصرہ فرمایا گیا اور اس بارے میں جو کچھ وہ کہتے تھے اس کی بھرپور مدلل تردید فرمائی گئی۔
—— اس سب کے بعد اٹھارویں رکوع میں جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ رَبُّكُمْ —— اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ ان مشرکوں سے کہیے کہ تم نے جن چیزوں کو خواہ مخواہ اور بغیر کسی سند کے حرام قرار دے رکھا ہے، اس کی حقیقت تو تم کو بتا دی گئی اور تمہیں معلوم ہو گیا کہ یہ سب بے اصل جاہلانہ خیالات و خرافات اور شیطانی تسویلات ہیں۔ اب آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے پروردگار نے واقعۃً کن کن باتوں کو حرام قرار دیا ہے اور اپنے بندوں کے لیے اس کی بنیادی ہدایتیں اور ہدایتیں کیا ہیں جو پیغمبروں کے ذریعہ ہمیشہ دی جاتی رہی ہیں۔

الغرض اس اٹھارویں رکوع میں اللہ تعالیٰ کی ان بنیادی اور دائمی ہدایات کو بیان فرمایا گیا ہے جو پیغمبروں کے ذریعہ ہر دور میں انسانوں کو دی جاتی رہی ہیں اور آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہی بندوں کے لیے ان کے رب کی خاص ہدایتیں اور اسکی مقرر کی ہوئی صراط مستقیم ہے جس کی پیروی کرنی چاہیئے۔]

اس تمہیدی نوٹ کے بعد درس کا وہ حصہ ملاحظہ فرمایا جائے جو گزشتہ شمارہ میں شائع ہونے سے رہ گیا تھا۔

ارشاد ہے :-

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۖ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝

مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر اپنی قوم کے اُن لوگوں سے کہیے جنھوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی بہت سی حلال طیب چیزوں کو حرام بنا لیا ہے اور ایک پوری شریعت گھڑلی

ہے اور بغیر دلیل اور سند کے اس کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان سے کہیے کہ آؤ مجھ سے سنو، میں تمھیں بتاؤں کہ تمھارے پروردگار نے فی الواقع کن کن باتوں کو حرام قرار دیا ہے، اور تمھارے لیے اور سب بندوں کے لیے اس کی بنیادی ہدایتیں کیا ہیں؟ ـــــ سنو سب سے اہم اور مقدم ہدایت اُس کی یہ ہے کہ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا یعنی اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ نہ اس کی ذات میں نہ اس کی صفات میں، نہ اُس کے حقوق میں۔ یہ اللہ کی وہ ہدایت اور وہ حکم ہے جو ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو سب سے پہلے پہونچایا ہے۔

اس کے بعد دوسرے نمبر کی اس کی ہدایت یہ ہے کہ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرو، ان کی فرمانبرداری اور خدمت کرتے رہو۔ قرآن پاک میں اور تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں خالق کے بعد مخلوق پر سب سے بڑا حق ماں باپ ہی کا بتایا گیا ہے، ان کو اللہ تعالےٰ نے پیدائش کا اور پھر پرورش کا وسیلہ بنایا ہے۔ قرآن مجید میں جابجا اسی طرح اللہ کی عبادت اور توحید کی ہدایت کے ساتھ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر اس سے بھی زیادہ وضاحت فرمائی گئی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْا	مطلب یہ ہو کہ تمھارے رب کا قطعی حکم
إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا	ہو کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔
إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ	صرف اسی کی عبادت اور پرستش کرو
أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا	اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک
تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا	کرو۔ اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی
وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ	ایک ہی تمھارے سامنے بوڑھے ہو جائیں
لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ	(اور بظاہر تمھارے لیے بوجھ بن جائیں)،
وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ	تب بھی اس کی پوری دھیان رکھو کہ ان کے
صَغِيْرًا ۝	لیے کوئی نازیبا اور ناگوار بات زبان
	سے نہ نکالو اور ان کے سامنے اپنے کو ادب

سے جھکائے رکھو اور اس عملی برتاؤ کے
علاوہ ان کے حق میں خدا سے دعا کیا
کرو کہ اے اللہ ان پر اپنی رحمت فرما جس
طرح انھوں نے مجھے بچپن میں پالا اور
پرورش کیا تھا۔

تو شرک سے پرہیز اور توحید پر قائم رہنے کی پہلی ہدایت کے بعد دوسری ہدایت یہ دی گئی کہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور اُن کے خدمت گزار اور فرمانبردار بن کے رہو (وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا) اس کے بعد تیسری ہدایت یہ فرمائی گئی وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ ط یعنی مفلسی کی وجہ سے اپنے بچوں بچیوں کو ہلاک نہ کر ڈالو۔

عربوں میں انتہائی درجہ کی جو گمراہیاں رائج تھیں اُن میں سے ایک یہ شقاوت بھی تھی کہ بعض غریب اور نادار لوگ بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کو اس خیال سے کہ خود ہمارے کھانے کو تو ہے نہیں انھیں کہاں سے کھلائیں گے خود اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیتے تھے۔ اللہ کی پناہ! یہ وہ شقاوت ہے جو بھیڑیوں، چیتوں، اور سانپوں بچھوؤں میں بھی نہیں تھی۔

قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ بعض دوسرے اسباب اور خیالات کی بنا پر بھی بیچارے معصوم بچوں کو ختم کیا جاتا تھا، مثلاً خاص خاص بتوں اور دیوتاؤں کے بھینٹ اور چڑھاوے کے طور پر ان کو قربان کر دیا جاتا تھا۔ اسی سورۂ انعام میں کچھ ہی پہلے یہ آیت گزر چکی ہے وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۝ اس آیت میں بچوں کے اسی قتل کا ذکر ہے جو یہ مشرکین اپنے مشرکانہ خیالات و توہمات کی بنا پر بتوں کے بھینٹ اور چڑھاوے کے لیے بچوں کو قربان کر دیتے تھے اور اپنی جہالت و بدبختی سے اس کو نیکی سمجھتے تھے اور اس سے بڑی برکتوں کی امید رکھتے تھے۔

ایک تیسری شکل قتلِ اولاد کی بعض خاص قبیلوں اور طبقوں میں یہ بھی رائج تھی کہ صرف بیچاری لڑکیوں کو ان کے جاہل و ظالم باپ اس خیال سے ختم کر دیتے تھے کہ اگر یہ

زندہ رہیں گی تو کسی کے ساتھ شادی ہوگی، پھر وہ ہمارا داماد بنے گا۔ اس کو وہ جاہل اپنے لیے باعثِ عار سمجھتے تھے۔ اور اس سے بچنے کے لیے بیچاری لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ سورۂ تکویر میں غالباً اسی کے بارے میں فرمایا گیا ہے وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ مطلب یہ ہے کہ اُس دن کو یاد کرو اور اس منظر کا ذرا خیال کرو جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت برپا ہوگی اور جس معصوم بچی کو زندہ زمین میں گاڑ دیا گیا تھا اُس سے پوچھا جائے گا کہ اے معصوم بچی! بتا کہ تجھے کس جرم میں زندہ زمین میں گاڑا گیا تھا۔ جن لوگوں کو عربی زبان کا کچھ ذوق ہو وہ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس سوال میں کتنا جلال و غضب بھرا ہوا ہے — اور اس ظلم کے کرنے والوں کے لیے کتنے شدید عذاب کی اس میں آگاہی ہے —

تو قرآن مجید سے بھی اور عربوں کی تاریخ سے بھی قتلِ اولاد کی ان تین شکلوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے پہلی صورت یعنی بچے کے کھانے پینے اور پرورش کے اقتصادی اور معاشی بوجھ سے بچنے کے لیے اسکو ختم کر دینے کا رواج نسبتاً زیادہ تھا اور یہ غالباً دنیا کی اور قوموں میں بھی رہا ہے اور آج کل بھی اخبارات میں کبھی کبھی اس طرح کے واقعات کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ غالباً اسی لیے اس کی ممانعت کو بنیادی ہدایات میں شامل کیا گیا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس ظلم و شقاوت کی جڑ بنیاد دراصل یہ جاہلانہ اور کافرانہ نظریہ ہے کہ اپنے بچوں کے رازق اور روزی رساں ہم ہیں۔ اور جب ہمارے پاس روزی کا سامان نہیں تو پھر ان بچوں کو کہاں سے کھلائیں گے؛ اس لیے وہ ان کو پیدا ہوتے ہی ختم کر دینا آسان سمجھتے تھے۔ اسی لیے قرآن پاک میں اس کی ممانعت کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِیَّاهُمْ کہ رزق اور روزی دینے والے تو ہم ہیں۔ تمہاری پرورش بھی ہمارے ہی رزق سے ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔ اسی طرح ان بچوں کی پرورش بھی ہمارے ہی رزق سے ہوگی۔

عرب کے ان اَن پڑھ مشرکوں نے اقتصادی و معاشی مسئلہ کا حل یہ سمجھا تھا کہ پیدا ہونے والے بچوں کو جینے نہ دو، پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان کو ختم کر دو، ہمارے زمانہ کے پڑھے لکھے خدا ناشناسوں نے یہ ترقی یافتہ حل نکالا ہے کہ بچوں کو پیدا ہی نہ ہونے دو۔ اس کے لیے

حکومتیں منصوبے بناتی ہیں اور ان پر کروڑوں بلکہ اربوں روپیہ خرچ کرتی ہیں لیکن اس کی بھی جڑ بنیاد یہی گمراہی ہے کہ رزق اور روزی کا مسئلہ اللہ کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ اپنے ہاتھوں میں سمجھا جاتا ہو۔ قرآن مجید کی یہ آیت ان حکومتوں کو بھی یہ پکار کر کہہ رہی ہے۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ـــ اگر آدمی سمجھنا چاہے تو کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے برابر اس کا تجربہ ہو رہا ہے کہ اللہ نے انسان کو وہ عقل و فکر دی ہے جس سے وہ ان تدبیروں کو سوچ سکتا ہے اور وہ آلات ایجاد کر سکتا ہے جن کے ذریعے ضروریات بڑھنے کے ساتھ زمین سے پیداوار بڑھاتے چلے جائیں۔ اور زمین میں وہ صلاحیت رکھی ہے کہ جو پیداوار اس سے ہوتی ہے اس پر دسوں بیسوں گنا اضافہ ہو سکتا ہے ـــ اگر یہ نہ ہوتا اور زمین میں اتنی ہی پیداوار ہوا کرتی جتنی اب سے دو چار سو برس پہلے ہوتی تھی تو ہمیں اور آپ کو کھانے کے لیے ایک دانہ بھی نہ ملتا۔

یہاں تک تین بنیادی ہدایتیں ہوئیں۔ چوتھی ہدایت یہ فرمائی گئی کہ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ فواحش فاحشہ کی جمع ہے، فاحشہ اس فعل کو کہتے ہیں جو انسانی شرم و حیا کے بالکل خلاف ہو، جیسے زناکاری اور اس کے قبیل کی چیزیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ زنا اور اس جیسی دوسری گندی اور شرمناک باتوں کے پاس نہ جاؤ ـــ کسی چیز سے الگ اور دور رہنے کی تاکید کرنی ہو تو یہی کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ اس سے دور ہی دور رہو ـــ حقیقتاً وہ خبیث افعال جنھیں فواحش کہا گیا ہے ایسے ہی گندے اور ناپاک ہیں کہ اللہ کے بندہ کو ان سے دور ہی رہنا چاہیے ـــ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ کا مطلب یہ ہے کہ ان بدفعلیوں سے بھی بچو اور دور رہو جن کا فاحشہ اور بے حیائی والا عمل ہونا بالکل علانیہ اور کھلا ہوا ہو، اور ان بدفعلیوں سے بھی دور رہو جن کی یہ حیثیت کچھ ڈھکی چھپی ہو۔ جیسے آنکھ کی بدفعلی، ہاتھ کی بدفعلی، زبان کی بدفعلی، ان سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث پاک میں ان اعضاء کا زنا بتلایا ہے ـــ یہ چوتھی ہدایت ہوئی۔

پانچویں ہدایت یہ فرمائی گئی ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آدمی کو پیدا کیا اور اس کی جان کو قابل احترام قرار دیا ہے۔ لہٰذا جب تک وہ کوئی ایسا جرم نہ کرے جس کی وجہ سے اس کا خون بہانا اور ہلاک کیا جانا خدا کے

قانون کی رُو سے درست نہ ہو جائے ، اس کو قتل نہ کیا جائے ۔ حاصل یہ کہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی بھی آدمی کا قتل کرنا قطعاً حرام ہے۔

اللہ کے قانون میں تین جرم ایسے ہیں جن کی سزا قتل ہے ۔ ایک تو ناحق قتل کی سزا قتل ہو یعنی اگر کوئی آدمی کسی دوسرے کو قصداً ناحق قتل کرے تو قصاص میں اس کو قتل کیا جائے گا۔ دوسرے کسی شادی شدہ کا زنا کرنا ایسا جرم ہے کہ شریعت اسلام میں اس کی سزا سنگ ساری ہے۔ جو قتل کی بھی انتہائی اذیت ناک شکل ہے ـــــ تیسرے ارتداد یعنی اللہ کا دین اسلام قبول کرکے پھر اُس سے غداری کرنا اور کفر اختیار کرلینا ، ایسا شخص بھی خدا کے قانون کی رو سے واجب القتل ہو جاتا ہے ـــــ لیکن ان سزاؤں کا اختیار بھی صرف حاکم اسلام کو ہے۔ عوام میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان مجرموں کو بھی قتل کرسکیں اگر وہ ایسا کریں گے تو خود مجرم ہوں گے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس آیت " لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ " میں جو قتل ناحق کو حرام قرار دیا گیا ہے تو یہ صرف مسلمانوں ہی کے حق میں نہیں ہے ۔ بلکہ جس طرح کسی مسلمان کا ناحق قتل حرام اور سنگین گناہ ہے اسی طرح غیر مسلم کا قتل بھی حرام اور ایسا ہی سنگین گناہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے " مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ " یعنی جو کوئی کسی غیر مسلم معاہد کو ناحق قتل کرے گا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا ـــــ معاہد ہر وہ غیر مسلم ہے جو مسلمانوں کے ساتھ کسی معاہدہ کی بنیاد پر رہتا ہو ، خواہ وہ معاہدہ انفرادی ہو یا اجتماعی اور خواہ حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی ، مثلاً ہم اپنے ملک میں غیر مسلموں کے ساتھ رہتے ہیں تو ہم سب کا ایک اجتماعی غیر رسمی معاہدہ ہے اور ہم سب ایک دوسرے کے لیے معاہد ہیں ، اور اس لیے ناحق کسی غیر مسلم کا خون بہانا بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح مسلمان کو قتل کرنا۔

یہاں تک پانچ ہدایتیں فرمائی گئیں ـــــ شرک نہ کرو ـــــ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو ، انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہونچاؤ اور دل نہ دکھاؤ ـــــ غریبی اور افلاس کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو ـــــ زنا جیسی بدفعلیوں سے دور رہو ـــــ کسی آدمی کا خون نہ بہاؤ

جب تک وہ کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہ کرے جس کی وجہ سے اس کا قتل کیا جانا ضروری ہو جائے۔

یہ پانچوں ہدایتیں ایسی ہیں کہ انسانی عقل بدیہی اور نظری طور پر خود بھی ان کو ضروری سمجھتی ہے۔ اسی لیے ان ہدایتوں کے بعد متصلاً فرمایا گیا ہے "ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ" کہ تمھیں یہ ہدایتیں دی گئی ہیں، تمھیں چاہیے کہ اپنی عقلوں سے کام لو اور سوچو سمجھو کہ یہ باتیں کس قدر معقول ہیں اور ان میں تمھارے لیے کتنی خیر اور بھلائی ہے۔

ان پانچ کے بعد چار ہدایتیں اس کے بعد والی آیت میں دی گئی ہیں۔ ارشاد ہو

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝

ان میں پہلی ہدایت کا تعلق خاص طور سے ان لوگوں سے ہے جو کسی کے انتقال کے بعد اس کے یتیم بچوں کے مال و جائداد کی دیکھ بھال کے ذمہ دار ہوتے ہیں، انھیں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یعنی اس میں کوئی تصرف نہ کرو، ہاں نیک نیتی سے اور یتیموں کی خیر خواہی پیش نظر رکھتے ہوئے ایسا تصرف کر سکتے ہو جس میں بھلائی ہو۔ آگے فرمایا "حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ" یعنی یہ ہدایت اور تاکید اس وقت تک کے لیے ہے، جب تک کہ وہ یتیم اس عمر تک نہ پہونچ جائے جبکہ وہ اپنے مالی معاملات خود دیکھ بھال سکے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی آدمی کا انتقال ہو گیا اس نے چھوٹے بچے چھوڑے اور ان کے لیے مال و جائداد بھی چھوڑی ایسی صورت میں قریبی اعزہ ہی جائداد اور مال اور کاروبار کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اب اگر ان کی نیت خراب ہو یا یتیموں کی جائداد اور مال و کاروبار کے سلسلہ میں وہ غفلت برتیں اور ذمہ داری کا جو حق ہے وہ ادا نہ کریں تو اس کا انجام یہی ہوگا کہ بیچارے یتیم بچوں کا اثاثہ برباد ہو جائے گا ۔۔۔ اسی لیے اس آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو شخص یتیموں کے مال و جائداد کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہو اس کو بہت احتیاط۔ کامل دیانت اور ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اپنا فرض اس وقت تک ادا کرنا چاہیے جبکہ وہ بچے اپنا کام خود سنبھالنے کے قابل ہو جائیں، وہ یتیموں کے مال و جائداد میں کوئی ایسا تصرف

نہ کریں جو بہتر نہ ہو اور جس میں یتیموں کی بھلائی نہ ہو — سورۂ نساء کے شروع میں وہ آیت گزر چکی ہے جس میں ایسے لوگوں کو جو بدنیتی اور بددیانتی سے یتیموں کے مال میں تصرف کریں جہنم کے سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے — ارشاد فرمایا گیا ہے" اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝ (جو لوگ ظالمانہ طور پر اور ناجائز طریقوں سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے بھرتے ہیں اور وہ دوزخ کی آگ میں جلیں گے۔) —

دوسری ہدایت یہ فرمائی گئی ہے — " وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ " مطلب یہ ہے کہ خرید و فروخت کے وقت اور کسی کو اس کا حق ادا کرنے کے وقت پوری پوری دیانتداری سے کام لو، بے ایمانی اور دھوکہ بازی بالکل نہ ہو۔ اسی کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے" لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا " اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا حکم اور اس کا مطالبہ بس یہ ہے کہ تم اپنی طرف سے اس کی پوری کوشش کرو کہ کسی کی حق تلفی تم سے نہ ہو، اگر بالفرض بھول چوک ہو جائے تو تم سے مواخذہ نہ ہوگا۔

یہ ناپ تول میں بددیانتی بھی اُن سنگین گناہوں میں سے ہے جن پر قرآن مجید میں سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ ارشاد ہے" وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے بڑی خرابی ہے اور بڑا خوفناک عذاب ہے جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں، جب دوسروں سے ناپ کر لیتے ہیں تو بھرپور لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو بے ایمانی سے کم دیتے ہیں۔ کیا انھیں اس کا خیال نہیں ہے کہ وہ قیامت کے اس عظیم دن میں یا جب سب لوگ خدا کے حضور میں پیش ہوں گے وہ بھی زندہ کیے جائیں گے اور خدا کی عدالت میں ان کی بھی پیشی ہوگی۔

اس کے بعد تیسری ہدایت یہ فرمائی گئی ہے " وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى " مطلب یہ ہے کہ جب کسی معاملہ میں تمھیں فیصلہ دینا ہو یا گواہی دینی ہو تو حق و انصاف کی بات

کہو، اگرچہ معاملہ کا کوئی فریق تمہارا عزیز قریب ہی کیوں نہ ہو ــــ تم اس کے نفع نقصان اور رضامندی اور ناراضی کی بالکل پروا نہ کرو۔ اسی طرح رشوت وغیرہ مالی منفعت کی وجہ سے بےانصافی نہ کرو، بلکہ وہی کہو جو دیانت داری سے حق و انصاف کا تقاضا ہو۔

چوتھی اور آخری ہدایت جو سب سے زیادہ جامع ہے یہ فرمائی گئی ہے "وَبِعَهْدِ اللّٰهِ أَوْفُوا" یعنی اللہ کا عہد پورا کرو ــ اس سے مراد بظاہر وہ عہد و میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیوں کے ذریعہ بندوں سے لیا جاتا رہا ہے، مثلاً یہ کہ اُس کی عبادت و فرمانبرداری کریں، اُس کی مقرر کی ہوئی شریعت اور صراط مستقیم پر چلیں، اُس کے نبیوں کی پیروی کریں۔ ــــ انبیاء علیہم السلام جو ایمان کی دعوت دیتے ہیں وہ دراصل اسی عہد و میثاق کی دعوت دیتے ہیں، اور جو شخص ان کی دعوت پر ایمان لاتا ہے وہ دراصل اللہ تعالیٰ سے یہ عہد و میثاق کرتا ہے۔ "بِعَهْدِ اللّٰهِ أَوْفُوا" میں اسی عہد و میثاق کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، اسی لیے میں نے عرض کیا کہ یہ جامع ترین ہدایت ہے، اور اس کی وسعت میں وہ سب جائز عہد و معاہدے بھی آگئے جو بندے آپس میں کرتے ہیں اور جن کے پورا کرنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے ــــ یہی ہدایت سورۂ بنی اسرائیل میں ان الفاظ میں دی گئی ہے۔

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ	اپنے عہد معاہدوں کو پورا کرو۔ ان کے
كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝	بارے میں آخرت میں تم سے بازپرس ہوگی۔

پہلی پانچ ہدایتوں کے بعد یہ چار ہدایتیں اور ہوئیں ــــ یتیموں کے مال کے بارے میں بہت محتاط رہو ــــ ناپ تول میں پوری دیانت داری سے کام لو ــــ گواہی میں اور اسی طرح فیصلہ میں کسی کی طرفداری نہ کرو بلکہ خدا لگتی کہو ــــ اللہ کے عہد و میثاق کو پورا کرو۔

ان چاروں ہدایتوں کا تعلق زیادہ تر اُن دنیوی معاملات سے ہے جن میں اکثر لوگوں سے لغزش ہوتی ہے۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی اُن احکام اور ہدایات کو اور آخرت میں اللہ کے سامنے حاضری اور حساب اور وہاں کی جزا سزا کو یاد کرے اور یاد رکھے ــــ اسی لیے ان چار ہدایتوں کے بعد فرمایا گیا ہے "ذَالِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝" مطلب یہ

کہ تمہیں یہ ہدایتیں دی گئی ہیں۔ چاہیے کہ ان کو یاد رکھو، نصیحت حاصل کرو اور عمل کرو۔

اس کے بعد آخر میں فرمایا گیا ہے

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

اس کا تعلق اوپر کے پورے مضمون سے ہے، مطلب یہ ہے کہ جو نو بنیادی ہدایتیں یہاں ایک خاص ترتیب کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں، یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی صراط مستقیم ہے، یہی اللہ تعالیٰ کی رضا اور نجات و فلاح کا راستہ ہے، اللہ کے سب پیغمبروں نے اپنی قوموں اور اُمتوں کو اسی کی دعوت اور تعلیم دی تھی، تم بھی اس کی پیروی کرو۔ اس کے علاوہ جو دوسرے راستے اور طریقے نکال لیے گئے ہیں وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے راستے نہیں ہیں، ان پر چلو گے تو اللہ کی صراطِ مستقیم سے ہٹ جاؤ گے اور جو منزلِ مقصود ہے یعنی اللہ کی رضا اور نجات و فلاح اُس سے محروم ہو جاؤ گے ——— آخر میں فرمایا گیا ہے "ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝" مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس صراطِ مستقیم کی وصیت اور نصیحت تم کو اس لیے کی ہے کہ اس پر چل کر تمہاری زندگی تقوے والی ہو جائے اور پھر تم اس کے غضب اور عذاب سے بچ جاؤ اور اس کی رضا اور جنت پالو جو اس کے متقی بندوں کا حصہ اور نصیب ہے۔

ان آیتوں کے سلسلہ میں ایک وضاحت اور ضروری ہے۔ سلسلۂ کلام ان الفاظ سے شروع ہوا تھا، "قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ" (اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو آؤ میں تمھیں سناؤں جو تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے) ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے کہ آگے وہ چیزیں ذکر کی جائیں گی جنھیں اللہ نے بندوں کے لیے حرام قرار دیا ہے لیکن جو نو ہدایتیں اس کے بعد ذکر فرمائی گئی ہیں ان میں سے کچھ منفی ہیں اور کچھ مثبت ہیں، مثلاً فرمایا گیا شرک نہ کرو، اولاد کو قتل نہ کرو، فواحش کے پاس نہ جاؤ، کسی کو ناحق قتل نہ کرو، یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یہ پانچ ہدایتیں منفی ہیں اور ممانعت کی صورت میں کی گئی ہیں جن سے معلوم ہو گیا کہ یہ پانچ باتیں حرام ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ باقی چار ہدایتیں ایجابی شکل میں دی گئی ہیں، یعنی چار کاموں کے کرنے کا حکم تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے ——— فرمایا گیا ہے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

کرو۔ ناپ تول پوری کرو، عدل و انصاف کی بات کرو، خدا کا عہد پورا کرو، ــــ طرز بیان کے اس فرق میں خاص حکمت یہ ہے کہ جن پانچ چیزوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے اُن میں شریعت کا اصل مقصد اور مطالبہ یہی ہے کہ یہ کام نہ کیے جائیں، اس لیے ان کے لیے ممانعت کا عنوان اختیار فرمایا گیا اور اس طرح ان کا حرام ہونا معلوم ہو گیا، اور جن چار باتوں کا مثبت انداز میں حکم دیا گیا ہے وہاں اصل مطلوب ان کاموں کا کرانا ہے۔ اگرچہ اسی مثبت حکم سے ان اعمال کی جانب مخالف کی حرمت بھی معلوم ہو گئی، کیونکہ جس چیز کے بارے میں شریعت کا حکم ہوگا کہ یہ واجب و فرض ہے تو اس کی ضد اور جانب مخالف کا حرام ہونا خود بخود معلوم ہو جائے گا، مثلاً والدین کے ساتھ حسن سلوک فرض ہے تو اس کا لازمی اور بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ بدسلوکی اور ایذا رسانی حرام ہے، اسی طرح ناپ تول صحیح اور پوری کرنا فرض قرار دیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس میں بد دیانتی اور کمی بیشی حرام ہو گئی، علیٰ ہذا عدل و انصاف کی بات کہنا اور عہد کا پورا کرنا جب فرض و واجب کر دیا گیا تو اس کی ضد اور جانب مخالف یعنی بے انصافی اور بد دیانتی اور عہد شکنی کی حرمت معلوم ہو گئی۔

یہ تو ہدایتیں جو سورۂ انعام کی ان آیتوں میں دی گئی ہیں ان کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی وصیت فرمایا گیا ہے اور مکرر سہ کرر فرمایا گیا ہے "ذَالِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ" یہ تمھارے رب کی وصیت ہے، یہ تمھارے پروردگار کی وصیت ہے ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جن کو قرآن مجید کے علم میں خاص امتیاز حاصل تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے اس امتیاز کی توثیق فرمائی تھی تفسیر ابن کثیر میں اُن کے بارہ میں روایت ذکر کی گئی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔

من اراد ان ینظر الی وصیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم التی علیہا خاتمہ فلیقرء ھٰؤلاء الآیات "قل تعالوا اتل ما حرم	جو کوئی یہ چاہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ وصیت نامہ دیکھے جس پر آپ کی مہر لگی ہوئی ہے وہ سورۂ انعام کی یہ آیتیں پڑھے ــــ قل تعالوا سے

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

نئی مطبوعات

عزائم (ہفتہ وار) ایڈیٹر انیس چشتی

شرکائے ادارت: ڈاکٹر محمد آصف قدوائی، حفیظ نعمانی، محسن عثمانی۔

سائز ۲۰×۳۰/۴ سالانہ چندہ پندرہ روپئے، غیر ممالک سے ایک پونڈ

پتہ :- دفتر باغ گونگے نواب، امین آباد، لکھنؤ۔

باغ گونگے نواب لکھنؤ کی جس عمارت سے ۱۹۶۲ء میں ہفتہ وار ندائے ملت طلوع ہوا تھا، اگست ۱۹۶۹ء سے یہی عمارت ہفتہ وار عزائم کا مطلع بن گئی ہے۔ اور جو قلم ندائے ملت کی صورت گری کیا کرتے تھے وہ سب ایک نئے عزم اور نئے ولولے کے ساتھ اس نئے چراغ کو اپنا خونِ جگر دیتے نظر آرہے ہیں۔

چھ مہینے سے کچھ اوپر اس نئے اخبار کی اشاعت کو ہوگئے ہیں۔ اور اتنی مدت کوئی قابلِ اعتماد رائے ظاہر کرنے کے لیے کم نہیں ہے۔ اب تک کی اشاعتوں میں بہت کم ایسی ہوں گی جو یہ تاثر نہ دیتی ہوں کہ ایک بڑا وقیع اضافہ اردو صحافت میں ہوا ہے۔ ملک کی سیاست سے گہری واقفیت بہم پہنچانے اور سیاسی نظر پیدا کرنے میں مسلمانوں کے کسی دوسرے اخبار کا نام مشکل ہی سے اس اخبار کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ اور مسلمانوں میں سیاسی نظر پیدا کرنا وقت کی جیسی ضرورت ہے اُسے بیان کی حاجت نہیں۔ اس خاص موضوع کے علاوہ ملک کے اعلیٰ مفاد اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے حالات اور اُن کی رفتار پہ بے لاگ تبصرے، بیرونی دنیا خصوصاً اسلامی دُنیا کے جائزے اور متنوع معلومات کا وہ سب ہی سامان جس کی توقع ایک معیاری ہفتہ وار سے کرنی چاہیے عزائم کے صفحات میں بڑے سلیقے اور قرینے سے ملتا ہے۔

اُمید ہے کہ مسلم صحافت میں معیار اور دیدہ وری کی جستجو کرنے والوں کی سرپرستی سے یہ اخبار محروم نہیں رہے گا اور جس فاقہ مستی کے ساتھ محض عزائم کے بل پر چند دیوانوں نے یہ قدم اٹھایا ہو انھیں ناقدری کا شاکی نہیں ہونا پڑے گا۔

Regd No. L-353
Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.
VOL 38 NO. 1 APRIL 1970
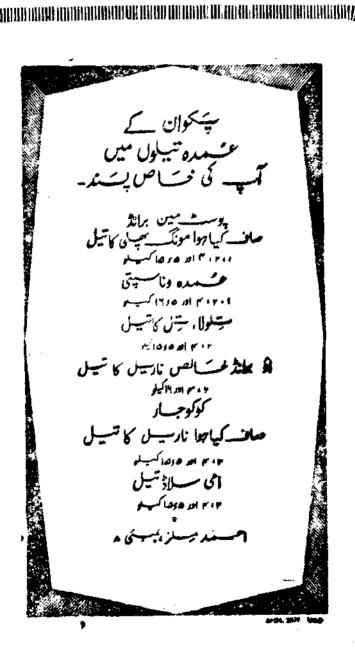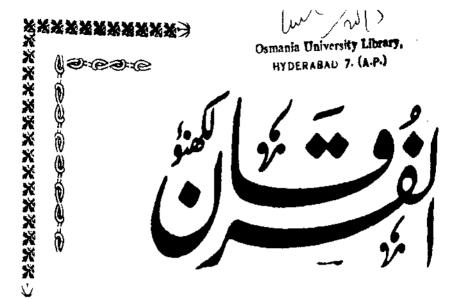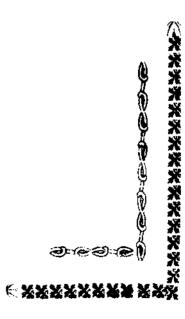
مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

حدیث کی کتابوں میں ایک باب ہوتا ہے "باب تغیرُ النَّاس" اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیثیں ذکر کی جاتی ہیں جن میں آپ نے اُمّت کو اس سے خبردار کیا ہے کہ بعد کے زمانہ میں تمہارے اعتقادات رجحانات اور اعمال و اخلاق اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بہت تبدیلیاں آئیں گی۔ اور وہ بہت بڑی تبدیلیاں ہوں گی — ان احادیث کا اصل مقصد و مدّعا یہ ہے کہ اللہ کے بندے ہوشیار اور چوکنے رہیں اور ان تبدیلیوں سے اپنی حفاظت اور بچاؤ کی فکر کرتے رہیں — اسی لیے اُمّت کے مصلحین اور محافظین بھی ہمیشہ مسلمانوں کو یہ حدیثیں یاد دلاتے رہے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے مطابق وہ تبدیلیاں آنی تھیں آئیں اور اُن کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس کا سب سے زیادہ احساس اُن لوگوں کو ہوا اور سب سے زیادہ انھیں کا دل روہا جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے فیض یافتہ صحابۂ کرام خاص کر سابقین اوّلین کو دیکھا تھا اور پھر بعد کے مسلمانوں کو بھی دیکھا — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی اور خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ جو اُن صحابہ میں سے ہیں جنھوں نے حضورؐ کے بعد طویل عمر پائی اور پہلی صدی کے آخری حصّہ تک اس دُنیا میں رہے۔ وہ اپنے دور کے مسلمانوں سے فرمایا کرتے تھے۔

لو ان رجلا ادرك السلف
الاوّل ثم بعث اليوم ما عرف
من الاسلام شيئًا... الا هذه
الصّلاة [1]

(اگر کوئی ایسا آدمی جس نے اُمت کے سابقین اوّلین کو پایا اور دیکھا تھا، آج اپنی قبر سے اُٹھا کر تمہاری اس دنیا میں بھیجا جائے تو اسلامی زندگی کی خصوصیات میں سے اس نماز کے سوا کچھ بھی نہ پہچانے گا۔ کیونکہ باقی سب چیزوں میں فرق پڑ چکا ہے)

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوسرے مشہور صحابی حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ جنھوں نے

---

[1] کتاب [illegible] مقام نافع طبی صفحہ ۱۴

آخر میں شام میں سکونت اختیار فرمالی تھی اپنے علاقہ کے اُن مسلمانوں سے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کبار کو نہیں پایا تھا، فرمایا کرتے تھے۔

لوخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں تشریف لائیں
علیکم ما عرف شیئاً مما کان علیہ	(اور تمھارا حال دیکھیں) تو جس حال میں آپ اور آپ کے
ھو واصحابہ الا الصلوٰۃ	اصحاب تھے اس میں سے کچھ بھی نماز کے سوا نہ پہچانیں گے۔

پھر دوسری صدی ہجری میں اسی علاقہ شام کے محدث وفقیہ امام اوزاعیؒ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا یہ درد بھرا مقولہ اپنے زمانہ کے لوگوں کے سامنے نقل کر کے فرمایا کرتے تھے۔

فکیف لو کان الیوم	اگر ابوالدرداء آج ہوتے (اور اس وقت کی حالت دیکھتے) تو اُن کے احساس کا کیا حال ہوتا ــــ

پھر امام اوزاعیؒ کے شاگرد عیسیٰ بن یونسؒ جب اپنے حلقہ میں امام اوزاعیؒ سے یہ روایت نقل کرتے تو حسرت کے ساتھ فرماتے:۔

فکیف لو ادرک الاوزاعی ھذا الزمان[1]	اگر ہمارے شیخ اوزاعی ہمارے اس زمانہ کو دیکھتے تو ان کا احساس کیا ہوتا!

عہدِ نبوی کے بعد پہلی اور دوسری صدی ہی میں جس تیز رفتاری سے عام مسلمانوں کی دینی زندگی میں تغیر و انحطاط ہو رہا تھا اُس کا کچھ اندازہ حضرت انس، حضرت ابوالدرداء، امام اوزاعی اور اُن کے شاگرد عیسیٰ بن یونسؒ کے ان درد بھرے کلمات سے کیا جا سکتا ہے ــــ اس کے بعد سے اب تک ۱۲، ۱۳ صدیاں گزر چکی ہیں اور تغیر و انحطاط کا یہ عمل برابر جاری ہے لیکن اسی کے ساتھ اُمت کے مصلحین و مجددین اور علمائے ربانیین جو دین کی امانت کے امین و محافظ ہیں قرنِ اوّل سے ابتک اپنے اپنے دائروں میں برابر اس کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے لیے جو صراطِ مستقیم مقرر فرما گئے تھے اور زندگی کا جو لائحہ عمل اور دستور دے گئے تھے مسلمان اُس پر ثابت و قائم رہیں ــــ اُمتِ محمدیہ میں جس درجہ میں بھی دین سے تعلق، علم و عمل اور آخرت کی فکر ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں، عالم اسباب میں یہ سب اُن ہی وارثانِ انبیاء کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر دور کے یہ مصلحین و مجددین وہ علمائے ربانی تھے جنھوں نے علمِ نبوی کی میراث کو اُس کے شرائط و لوازم کے ساتھ اپنے اوپر کے طبقہ سے حاصل کیا تھا اور اپنے ظاہر و باطن کو اسی کے رنگ میں رنگ

[1] کتاب الاعتصام ص ۱۷۰

لیا تھا۔ اس تعلیم و تعلّم اور افادہ و استفادہ کے طریقے اور اس کے وسائل زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہے لیکن اصل حقیقت کا تسلسل اور توارث قریباً یکساں رہا۔ یہاں تک کہ اب سے کچھ اوپر ایک صدی پہلے ہمارے ملک میں علم نبوی کے اس تسلسل اور توارث کو برقرار رکھنے ہی کے لیے دینی مدارس کا وہ نظام شروع ہوا جو ہمارے سامنے ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے اس دور کے علمائے دین صدفی صد اسی کی پیداوار ہیں اور بظاہر ورثۂ نبوی کے اس توارث و تسلسل کا اب ان مدارس ہی پر انحصار ہے۔ لیکن تغیر و انحطاط کے عمل نے خود ان کو کہاں پہونچا دیا ہے؟ اور دین کو اور دین والی اُمت کو جس طرح کے علمائے ربانی اور وارثینِ انبیاء کی ضرورت ہے اُن کی پیداوار کا اب ان مدارس میں کیا تناسب ہے؟ اور ان کے حال کو دیکھ کر مستقبل کے بارے میں ان سے کیا امید کی جا سکتی ہے؟ —— یہ وہ سوالات ہیں جن پر ہمارے ان مدارس کے ذمہ داروں، اساتذہ اور منتظمین کو دوسرے تمام مسائل سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

راقم سطور کی عمر قمری حساب سے پینسٹھ سے متجاوز ہو چکی ہے۔ پچاس سال سے اس عاجز کا ان مدارس سے قریبی تعلق ہے۔ میں تو آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور ہر واقف جانتا ہے کہ ہمارے اکثر مدارس میں خاص کر بڑے اور مرکزی مدارس میں اگرچہ اس مدت میں بظاہر بڑی ترقیاں ہوئی ہیں۔ لاکھوں کی لاگت سے تیار ہونے والی شاندار عمارتوں کا اضافہ ہوا ہے۔ اساتذہ اور طلباء کی تعداد بھی دوگنی چوگنی ہو گئی ہے۔ اسی تناسب سے ہر سال کے فارغین کے شمار میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ بجٹ بھی اتنا آگے بڑھ گیا ہے جس کا ان مدارس کے قائم کرنے والے ہمارے اسلاف کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا (مثال کے طور پر صرف دارالعلوم دیوبند کے بارے میں عرض کرتا ہوں کہ میرے زمانۂ طالب علمی میں اس کا بجٹ ایک لاکھ سے کم رہتا تھا۔ اب سو لاکھ سے متجاوز ہو چکا ہے) اور یقیناً ایک لحاظ سے یہ ترقیاں قابل شکر اور لائق فخر ہیں لیکن ہر صاحبِ بصیرت اور واقف حال دُکھ کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ جس نسبت سے یہ عددی اور مادّی و ظاہری ترقیاں ہوئی ہیں اُس سے کہیں بڑی نسبت سے ان کی رُوح میں انحطاط ہوا ہے۔ فالی اللہ المشتکی۔

کتاب المعاشرۃ والمعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

ہمسایوں کے حقوق

انسان کا اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور قریبی رشتہ داروں کے علاوہ ایک مستقل واسطہ اور تعلق ہمسایوں اور پڑوسیوں سے بھی ہوتا ہے، اور اس کی خوشگواری اور ناخوشگواری کا زندگی کے چین سکون پر اور اخلاق کے بناؤ بگاڑ پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم و ہدایت میں ہمسائگی اور پڑوس کے اس تعلق کو بڑی عظمت بخشی ہے اور اس کے احترام و رعایت کی بڑی تاکید فرمائی ہے، یہاں تک کہ اس کو جزو ایمان اور داخلۂ جنت کی شرط اور اللہ و رسول کی محبت کا معیار قرار دیا ہے — اس سلسلہ میں آپ کے مندرجہ ذیل ارشادات پڑھئے! —

پڑوسی کے بارہ میں حضرت جبرئیل کی مسلسل وصیت اور تاکید:-

عَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَازَالَ جِبْرَئِيلُ يُوصِيْنِي بِالْجَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ اَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ

——— رواه البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (اللہ کے خاص قاصد) جبرئیل پڑوسی کے حق کے بارہ میں مجھے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ وہ اسکو

وارث قرار دے دیں گے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ پڑوسی کے حق اور اس کے ساتھ اکرام و رعایت کا رویہ رکھنے کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت جبرئیل مسلسل ایسے تاکیدی احکام لاتے رہے کہ مجھے خیال ہوا کہ شاید اس کو وارث بھی بنا دیا جائے گا، یعنی حکم آجائے گا کہ کسی کے انتقال کے بعد جس طرح اس کے ماں باپ، اُس کی اولاد اور دوسرے اقارب اس کے ترکہ کے وارث ہوتے ہیں اسی طرح پڑوسی کا بھی اس میں حصّہ ہو گا ___ ظاہر ہے کہ اس ارشاد کا مقصد صرف ایک واقعہ کا بیان نہیں ہے، بلکہ پڑوسیوں کے حق کی اہمیت کے اظہار کے لیے یہ ایک نہایت مؤثر اور بلیغ ترین عنوان ہے۔

پڑوسیوں کے ساتھ اچھا رویہ اللہ و رسول کی محبت کی شرط اور اس کا معیار:-

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِيْ قُرَادٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ يَوْمًا فَجَعَلَ اَصْحَابُهٗ يَتَمَسَّحُوْنَ بِوَضُوْئِهٖ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَحْمِلُكُمْ عَلٰى هٰذَا؟ قَالُوْا حُبُّ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُحِبَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اَوْ يُحِبَّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ فَلْيَصْدُقْ حَدِيْثَهٗ اِذَا حَدَّثَ وَلْيُؤَدِّ اَمَانَتَهٗ اِذَا اؤْتُمِنَ وَلْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهٗ۔

___ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

عبد الرحمٰن بن ابی قراد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو صحابہ آپ کے وضو کا استعمال پانی لے لے کر اپنے پر ملنے لگے حضور نے اُن سے فرمایا کہ تمہارے لیے اس کا کیا باعث اور محرک ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ اللہ و رسول کی محبت! ___ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس کی یہ خوشی اور چاہت ہو کہ اس کو اللہ و رسول کی محبت نصیب ہو یا یہ کہ اس سے اللہ و رسول کو محبت ہو تو اُسے چاہیے کہ وہ ان تین باتوں کا اہتمام کرے جب بات کرے تو سچ بولے، جب کوئی امانت اُس کے سپرد کی جائے تو امانتداری کے ساتھ اس کو ادا کرے، اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا رویہ رکھے۔

(شعب الایمان للبیہقی)

پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ لازمۂ ایمان:-

عَنْ اَبِیْ شُرَیْحٍ الْعَدَوِیِّ قَالَ سَمِعَتْ اُذُنَایَ وَاَبْصَرَتْ عَیْنَایَ حِیْنَ تَکَلَّمَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ جَارَہٗ وَمَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ وَمَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیَقُلْ خَیْرًا اَوْ لِیَصْمُتْ ـــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو شریح عدوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سُنا اور جب وقت آپ یہ فرما رہے تھے اُس وقت میری آنکھیں آپ کو دیکھ رہی تھیں ـــ آپ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اُس کے لیے لازم ہے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرے، اور جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اُسے لازم ہے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے لازم ہے کہ اچھی بات بولے یا پھر چپ رہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

[یہی مضمون قریب قریب انہی الفاظ میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا گیا ہے۔]

وہ آدمی مومن اور جنتی نہیں جسکے پڑوسی اُس سے مامون اور بےخوف نہ ہوں:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ قِیْلَ مَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ الَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ۔

ـــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن) ارشاد فرمایا کہ "خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں، خدا کی قسم اس میں ایمان نہیں، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہیں" ـــــ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ کون شخص؟ (یعنی حضورؐ کس بدنصیب شخص کے بارے میں قسم کے ساتھ ارشاد فرما رہے ہیں کہ وہ مومن نہیں اور اس میں ایمان نہیں؟) آپ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ آدمی جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور مفسدہ پردازیوں سے مامون اور بے خوف نہ ہوں (یعنی ایسا آدمی ایمان سے محروم ہے)"

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(یہ حدیث قریب قریب انہی الفاظ میں حضرت طلق بن علی سے طبرانی نے معجم کبیر میں اور حضرت انس سے حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے)

(تشریح) حدیث کے الفاظ میں غور کر کے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کیسے جلال سے معمور ہے اور جس وقت آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہوگا اس وقت آپ کا حال اور آپ کے خطاب کا انداز کیا رہا ہوگا ـــــ بہرحال اس پرجلال ارشاد کا مدعا اور پیغام یہی ہے کہ ایمان والوں کے لیے لازم ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ اور رویہ ایسا شریفانہ رہے کہ وہ ان کی طرف سے بالکل مطمئن اور بے خوف رہیں، ان کے دلوں دماغوں میں بھی ان کے بارے میں کوئی اندیشہ اور خطرہ نہ ہو ـــــ اگر کسی مسلمان کا یہ حال نہیں ہے اور اس کے پڑوسی اس سے مطمئن نہیں ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اسے ایمان کا مقام نصیب نہیں ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ ـــــ رواہ مسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "وہ آدمی جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے اس کے پڑوسی مامون نہ ہوں۔"

(صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جس آدمی کا کردار اور رویہ ایسا ہو کہ اس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور بد اطواریوں سے خائف رہتے ہوں وہ اپنی اس بدکرداری کی وجہ سے اور اس کی سزا

ایسے بغیر جنت میں نہ جاسکے گا۔

تشریح ان دو حدیثوں سے سمجھا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت میں ہمسایوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا کیا درجہ اور مقام ہے۔ نبوت کی زبان میں کسی عمل کی سخت تاکید اور دین میں اس کی انتہائی اہمیت جتانے کے لیے آخری تعبیر یہی ہوتی ہے کہ اس میں کوتاہی کرنے والا مومن نہیں، یا یہ کہ وہ جنت میں نہ جاسکے گا ـــــ افسوس ہے کہ اس طرح کی حدیثیں ہمارے علمی اور درسی حلقوں میں اب کلامی بحثوں اور علمی موشگافیوں کا موضوع بن کر رہ گئی ہیں، شاذ و نادر ہی اللہ کے وہ خوش نصیب بندے ہوں گے جو یہ حدیثیں پڑھ کر اور سن کر زندگی کے اس شعبہ کو درست کرنے کی فکر میں لگ جائیں حالانکہ حضور کے ان ارشادات کا مقصد و مدعا یہی ہے ـــــ یہ حدیثیں پڑھنے اور سننے کے بعد بھی اپنے پڑوسیوں کے ساتھ برتاؤ اور رویہ کو بہتر اور خوش گوار بنانے کی فکر نہ کرنا بلاشبہ بڑی شقاوت اور بدبختی کی نشانی ہے ـــــ

اسی سلسلہ معارف الحدیث کی پہلی جلد کتاب الایمان میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے کہ اس طرح کی حدیثیں جن میں کسی عملی یا اخلاقی تقصیر اور کوتاہی کی بنا پر ایمان کی نفی کی گئی ہے یا جنت میں نہ جاسکنے کی وعید سنائی گئی ہے اُن کا مدعا اور مطلب کیا ہوتا ہے اور شریعت میں ایسے لوگوں کا حکم کیا ہے۔

وہ شخص مومن نہیں جو پیٹ بھر کے سو جائے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو:-

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا آمَنَ بِيْ مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰى جَنْبِهٖ وَهُوَ يَعْلَمُ بِهٖ۔

ـــــــــــ ـــــ رواہ البزار والطبرانی فی الکبیر

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا (اور وہ میری جماعت میں نہیں ہے) جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کے رات کو بے فکری سے سو جائے کہ اس کے برابر رہنے والا اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور اس آدمی کو اس کے بھوکے ہونے کی خبر ہو۔ (مسند بزار، معجم کبیر للطبرانی)

یہی مضمون تقریب قریب انہی الفاظ میں امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اور حاکم نے مستدرک میں ان کے علاوہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت کیا ہے۔)

(ف) افسوس ہم مسلمانوں کے طرز عمل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات میں اتنا بعد اور فاصلہ ہو گیا ہے کہ کسی ناواقف کو اس بات کا یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ تعلیم اور ہدایت مسلمانوں کے پیغمبر کی ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ارشادات میں اعلان فرمادیا ہے کہ جو شخص اپنے پڑوسیوں کے بھوک پیاس کے مسئلوں اور اسی طرح کی دوسری ضرورتوں سے بے فکر اور بے نیاز ہو کر زندگی گزارے وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا اور اس نے میری بات بالکل نہیں مانی اور وہ میرا نہیں ہے ــــ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ان تمام حدیثوں میں مسلم اور غیر مسلم پڑوسی کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے، بلکہ آگے درج ہونے والی بعض حدیثوں سے معلوم ہوگا کہ یہ سارے حقوق غیر مسلم پڑوسیوں کے بھی ہیں۔

ہمسائگی کے بعض متعین حقوق:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے بعض متعین حقوق کی نشان دہی بھی فرمائی ہے، ان سے اس باب میں شریعت کا اصولی نقطۂ نظر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ حَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَقُّ الْجَارِ إِنْ مَرِضَ عُدْتَهُ وَإِنْ مَاتَ شَيَّعْتَهُ وَإِنِ اسْتَقْرَضَكَ أَقْرَضْتَهُ وَإِنْ أَعْوَزَ سَتَرْتَهُ وَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ هَنَّأْتَهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ مُصِيْبَةٌ عَزَّيْتَهُ وَلَا تَرْفَعْ بِنَائَكَ فَوْقَ بِنَائِهِ فَتَسُدَّ عَلَيْهِ الرِّيْحَ وَلَا تُؤْذِيْهِ بِرِيْحِ قِدْرِكَ إِلَّا أَنْ تَغْرِفَ لَهُ مِنْهَا ــــ رواہ الطبرانی فی الکبیر

معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، پڑوسی کے حقوق تم پر یہ ہیں کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور

خبرگیری کرو، اور اگر انتقال کر جائے تو اُس کے جنازہ کے ساتھ جاؤ (اور تدفین کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤ) اور اگر وہ (اپنی ضرورت کے لیے) قرض مانگے تو (بشرطِ استطاعت) اس کو قرض دو، اور اگر وہ کوئی بُرا کام کر بیٹھے تو پردہ پوشی کرو، اور اگر اُسے کوئی نعمت ملے تو اُس کو مبارکباد دو، اور اگر کوئی مصیبت پہونچے تو تعزیت کرو۔ اور اپنی عمارت اُس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اُس کے گھر کی ہوا بند ہو جائے اور (جب تمہارے گھر کوئی اچھا کھانا پکے تو اس کی کوشش کرو کہ) تمہاری ہانڈی کی مہک اُس کے لیے (اور اُس کے بچوں کے لیے) باعثِ ایذا نہ ہو (یعنی اس کا اہتمام کرو کہ ہانڈی کی مہک اُس کے گھر تک نہ جائے) الّا یہ کہ اُس میں سے تھوڑا سا کچھ اُس کے گھر بھی بھیج دو (اس صورت میں کھانے کی مہک اس کے گھر تک جانے میں کوئی مضائقہ نہیں) (معجم کبیر طبرانی)

تشریح) اس حدیث میں ہمسایوں کے جو متعین حقوق بیان کیے گئے ہیں اُن میں سے آخری دو خاص طور سے قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے گھر کی تعمیر میں اُس کا لحاظ رکھو اور اس کی دیواریں اس طرح نہ اُٹھاؤ کہ پڑوسی کے گھر کی ہوا بند ہو جائے اور اس کو تکلیف پہونچے۔ اور دوسرے یہ کہ گھر میں جب کوئی اچھی مرغوب چیز پکے تو اس کو نہ بھولو کہ ہانڈی کی مہک پڑوسی کے گھر تک جائے گی، اور اُس کے یا اُس کے بچوں کے دل میں اس کی طلب اور طمع پیدا ہو گی جو اُن کے لیے باعثِ ایذا ہو گی، اس لیے یا تو اپنے پر لازم کر لو کہ اُس کھانے میں سے کچھ تم پڑوسی کے گھر بھی بھیجو گے یا پھر اس کا اہتمام کرو کہ ہانڈی کی مہک پڑوسی کے گھر تک نہ جائے جو ظاہر ہے کہ مشکل ہے۔۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دو ہدایتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پڑوسیوں کے بارے میں کتنے نازک اور باریک پہلوؤں کی رعایت کو آپ نے ضروری قرار دیا ہے۔

قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث ابن عدی نے "کامل" میں اور خرائطی نے "مکارم الاخلاق" میں عبداللہ بن عمرو بن العاص سے بھی روایت کی ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے۔

وَاِنِ اشْتَرَیْتَ فَاکِھَۃً فَاھْدِ لَہٗ	اور اگر تم کوئی پھل پھلار خرید کر لاؤ تو اس
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَاَدْخِلْھَا سِرًّا	میں سے پڑوسی کے ہاں بھی ہدیہ بھیجو، اور

وَلَا يَخْرُجْ بِهَا وَلَدُكَ لِيَغِيظَ بِهَا وَلَدَهُ — اگر ایسا نہ کر سکو تو اُس کو چھپا کے لاؤ (کہ پڑوس والوں کو خبر نہ ہو اور اس کی بھی احتیاط کرو کہ) تمہارا کوئی بچہ وہ پھل لے کر گھر سے باہر نہ نکلے کہ پڑوسی کے بچے کے دل میں اُسے دیکھ کے جلن پیدا ہو۔

کنز العمال

اللہ تعالیٰ اُمّت کو توفیق دے کہ وہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایتوں کی قدر و قیمت کو سمجھیں اور اپنی زندگی کا معمول بنا کر اُن کی بیش بہا برکات کا دُنیا ہی میں تجربہ کریں۔

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا طَبَخَ أَحَدُكُمْ قِدْرًا فَلْيُكْثِرْ مَرَقَهَا ثُمَّ لِيُنَاوِلْ جَارَهُ مِنْهَا۔ ——— رواہ الطبرانی فی الاوسط

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کے ہاں سالن کی ہانڈی پکے تو اُسے چاہیے کہ شوربہ زیادہ کرلے، پھر اُس میں سے کچھ پڑوسی کو بھی بھیج دے۔ (معجم اوسط للطبرانی)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت قریب قریب ان ہی الفاظ میں جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی گئی ہے۔)

پڑوسی کی تین قسمیں، غیر مسلم پڑوسی کا بھی حق ہے:-

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْجِيرَانُ ثَلٰثَةٌ فَجَارٌ لَهُ حَقٌّ وَاحِدٌ وَهُوَ أَدْنَى الْجِيرَانِ حَقًّا وَجَارٌ لَهُ حَقَّانِ وَجَارٌ لَهُ ثَلَاثَةُ حُقُوقٍ فَأَمَّا الَّذِي لَهُ حَقٌّ وَاحِدٌ فَجَارٌ مُشْرِكٌ لَا رَحِمَ لَهُ، لَهُ حَقُّ الْجِوَارِ، وَأَمَّا الَّذِي لَهُ حَقَّانِ فَجَارٌ مُسْلِمٌ لَهُ حَقُّ الْإِسْلَامِ وَحَقُّ الْجِوَارِ وَأَمَّا الَّذِي لَهُ ثَلَاثَةُ حُقُوقٍ فَجَارٌ مُسْلِمٌ ذُو رَحِمٍ لَهُ حَقُّ الْإِسْلَامِ وَحَقُّ الْجِوَارِ وَحَقُّ الرَّحِمِ ———

——— رواہ البزار فی المسند وابونعیم فی الحلیہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، پڑوسی تین قسم کے اور تین درجے کے ہوتے ہیں، ایک وہ پڑوسی جس کا صرف ایک ہی حق ہو، اور وہ (حق کے لحاظ سے) سب سے کم درجہ کا پڑوسی ہے، اور دوسرا پڑوسی جس کے دو حق ہوں، اور تیسرا وہ جس کے تین حق ہوں تو ایک حق والا وہ مشرک (غیر مسلم) پڑوسی ہے جس سے کوئی رشتہ داری بھی نہ ہو (تو اس کا صرف پڑوسی ہونے کا حق ہے) اور دو حق والا وہ پڑوسی ہے جو پڑوسی ہونے کے ساتھ مسلم (یعنی دینی بھائی) بھی ہو، اس کا ایک حق مسلمان ہونے کی وجہ سے ہوگا اور دوسرا پڑوسی ہونے کی وجہ سے، اور تین حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی بھی ہو، اور مسلم بھی ہو اور رشتہ دار بھی ہو، تو اس کا ایک حق مسلمان ہونے کا ہوگا، دوسرا حق پڑوسی ہونے کا اور تیسرا حق رشتہ داری کا ہوگا۔ (مسند بزار، حلیہ ابی نعیم)

(تشریح) اس حدیث میں صراحت اور وضاحت فرمادی گئی ہے کہ پڑوسیوں کے جو حقوق قرآن و حدیث میں بیان فرمائے گئے اور اُن کے اکرام اور رعایت وحسنِ سلوک کی جو تاکیدیں فرمائی گئی ہیں اُن میں غیر مسلم پڑوسی بھی شامل ہیں اور اُن کے بھی وہ سب حقوق ہیں — صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے یہی سمجھا تھا۔ جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ ان کے گھر بکری ذبح ہوئی وہ تشریف لائے تو انھوں نے گھر والوں سے کہا

اَهْدَيْتُمْ لِجَارِنَا الْيَهُوْدِيْ اَهْدَيْتُمْ لِجَارِنَا الْيَهُوْدِيْ ؟ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا زَالَ جِبْرَئِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ	تم لوگوں نے ہمارے یہودی پڑوسی کے لیے بھی گوشت کا ہدیہ بھیجا ؟ تم لوگوں نے ہمارے یہودی پڑوسی کے لیے بھی بھیجا؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا، آپ فرماتے تھے کہ پڑوسیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کے بارہ میں مجھے جبرئیل (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) برابر وصیت اور تاکید کرتے

رہے۔ یہاں تک کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ وہ اسکو

وارث بھی قرار دے دیں گے۔

افسوس ہے کہ عہدِ نبویؐ سے جتنا بُعد ہوتا گیا اُمت آپ کی تعلیمات اور ہدایات سے اسی قدر دور ہوتی چلی گئی ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے بارے میں جو وصیت اور تاکید اُمت کو فرمائی تھی اگر صحابۂ کرام کے بعد بھی اس پر اُمت کا عمل رہا ہوتا تو یقیناً آج دُنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا ــــ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو توفیق دے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کی قدر و قیمت سمجھیں اور اُس کو اپنا دستور العمل بنائیں۔

تعلیم و تربیت کا اہتمام بھی پڑوسی کا حق ہے:-

پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات یہاں تک درج ہوئے اُن کا زیادہ تر تعلق زندگی کے معاملات میں اُن کے ساتھ اکرام و رعایت کے برتاؤ اور حُسنِ سلوک سے تھا۔ آخر میں آپ کا ایک وہ ارشاد بھی پڑھیئے جس میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اگر کسی کے پڑوس میں بیچارے ایسے لوگ رہتے ہوں جو دینی تعلیم و تربیت اور اپنی علمی اور اخلاقی حالت کے لحاظ سے پسماندہ ہوں تو دوسرے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اُن کی تعلیم و تربیت اور اُن کے سُدھار و اصلاح کی فکر و کوشش کریں، اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو مجرم اور سزا کے مستحق ہوں گے۔

عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبْزٰی عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ
قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَابَالُ اَقْوَامٍ لَا
یُفَقِّهُوْنَ جِیْرَانَهُمْ وَلَا یُعَلِّمُوْنَهُمْ وَلَا یَعِظُوْنَهُمْ، وَلَا یَاْمُرُوْنَهُمْ وَلَا
یَنْهَوْنَهُمْ وَمَابَالُ اَقْوَامٍ لَا یَتَعَلَّمُوْنَ مِنْ جِیْرَانِهِمْ وَلَا یَتَفَقَّهُوْنَ
وَلَا یَتَّعِظُوْنَ وَاللّٰهِ لَیُعَلِّمَنَّ قَوْمٌ جِیْرَانَهُمْ وَیُفَقِّهُوْنَهُمْ وَیَعِظُوْنَهُمْ
وَیَاْمُرُوْنَهُمْ وَیَنْهَوْنَهُمْ وَلَیَتَعَلَّمَنَّ قَوْمٌ مِنْ جِیْرَانِهِمْ وَیَتَفَقَّهُوْنَ وَ
یَتَّعِظُوْنَ اَوْ لَاُعَاجِلَنَّهُمْ بِالْعُقُوْبَةِ فِی الدُّنْیَا ــــــــ

—— رواه ابن راهويه والبخاري في الوحدان وابن السكن وابن منده

علقمہ بن عبدالرحمٰن بن ابزیٰ نے اپنے والد عبدالرحمٰن کے واسطہ سے اپنے دادا ابزیٰ خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن (اپنے ایک خاص خطاب میں) ارشاد فرمایا، کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو اور کیا حال ہے اُن کا (جنھیں اللہ نے علم و تفقہ کی دولت سے نوازا ہے اور اُن کے پڑوس میں ایسے پسماندہ لوگ ہیں جن کے پاس دین کا علم اور اُس کی سمجھ بوجھ نہیں ہے) وہ اپنے ان پڑوسیوں کو دین سکھانے اور ان میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، نہ اُن کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں نہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں —— اور کیا ہو گیا ہے ان (بے علم اور پسماندہ) لوگوں کو کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے دین سیکھنے اور دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے کی فکر نہیں کرتے، نہ ان سے نصیحت لیتے ہیں —— خدا کی قسم! (دین کا علم اور اُس کی سمجھ رکھنے والے) لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے (ناواقف اور پسماندہ) پڑوسیوں کو دین سکھانے اور دین کی سمجھ بوجھ اُن میں پیدا کرنے کی کوشش کریں اور وعظ و نصیحت (کے ذریعہ ان کی اصلاح) کریں اور انھیں نیک کاموں کی تاکید اور بُرے کاموں سے منع کریں —— اور اسی طرح ان کے ناواقف اور پسماندہ پڑوسیوں کو چاہیے کہ وہ خود طالب بن کر اپنے پڑوسیوں سے دین کا علم و فہم حاصل کریں اور ان سے نصیحت لیں —— یا پھر (یعنی اگر یہ دونوں طبقے اپنا اپنا فرض ادا نہیں کریں گے) تو میں ان کو دُنیا ہی میں سخت سزا دلواؤں گا۔

(مسند اسحاق بن راھویہ، کتاب الوحدان للبخاری، مصنف ابن السکن، مسند ابن منده)

(تشریح) یہ حدیث کنز العمال جلد پنجم میں "حق الجار" کے زیر عنوان اسی طرح مذکور ہے جس طرح یہاں درج کی گئی ہے۔ لیکن دوسری جگہ اسی کنز العمال میں حضور کا یہی خطاب قریب قریب انہی الفاظ میں اس اضافہ کے ساتھ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے سخن اس خطاب میں ابو موسیٰ اشعری اور ابو مالک اشعری کی قوم اشعریین کی طرف تھا، اس قوم کے افراد عام طور سے دین کے علم اور تفقہ سے بہرہ مند تھے۔ لیکن ان ہی کے علاقہ میں اور

اُن کے پڑوس میں ایسے لوگ بھی آباد تھے جو اس لحاظ سے بہت پسماندہ تھے، نہ ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی اور نہ خود ان میں اس کی طلب اور فکر تھی ـــــ اس لحاظ سے یہ دونوں طبقے قصوروار تھے، اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کریمانہ عادت کے مطابق ان کو نامزد کیے بغیر اپنے اس خطاب میں ان دونوں پر عتاب فرمایا تھا، اس روایت میں آگے یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب اشعریین کو یہ معلوم ہوا کہ اس خطاب میں حضور کے عتاب کا روئے سخن ہماری طرف تھا تو اُن کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُنھوں نے حضور سے یہ وعدہ کیا کہ ہم انشاء اللہ ایک سال کے اندر اندر ان آبادیوں کے لوگوں کو دین کی تعلیم دے دیں گے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر علاقہ کے ان لوگوں کو جو دین کا علم رکھتے ہوں اس کا ذمہ دار قرار دیا کہ وہ اپنے اس پڑوس کے ناواقف لوگوں کو دین کی تعلیم دیں اور تبلیغ اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ اُن کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیں، اور اسی طرح ناواقف لوگوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے کہ وہ اپنے اس پڑوس کے اہل علم اور اہل دین سے تعلیم اور تربیت و اصلاح کا ربط رکھیں ـــــ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل جاری رہتا تو امت کے کسی طبقہ میں بھی دین سے بے خبری اور اللہ و رسول سے وہ بے تعلقی نہ ہوتی جس میں امت کی غالب اکثریت آج مبتلا ہے ـــــ بلاشبہ اس وقت کا سب سے بڑا اصلاحی اور تجدیدی کارنامہ یہی ہے کہ امت میں تعلیم اور تعلم کے اس عمومی غیر رسمی نظام کو پھر سے جاری اور قائم کیا جائے جس کی اس حدیث پاک میں ہدایت فرمائی گئی ہے۔ بڑے خوش نصیب ہوں گے وہ بندے جن کو اس کی توفیق ملے ـــــ

ارشاداتِ حکیم الامتہ حضرت مولانا تھانویؒ

علماء و طلباء ارباب اہتمام اور اصحاب مدارس کے لیے لمحۂ فکریہ

تلخیص ــــــ از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

قسط (۸)

فرمایا کہ ایک مولوی صاحب جو اچھے مناظر اور اچھے عالم ہیں لیکن لباس اکثر انگریزی نما پہنتے ہیں۔ اُن کا خط آیا ہے ــ لکھا ہے کہ اب میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ جو کپڑے اِس قسم کے میرے پاس ہیں اُن کے علاوہ ان جیسے اور نہیں بناؤں گا اور مجھے نصیحت فرمائیے۔ میں نے لکھا ہے کہ اگر مجھے لکھنا بھی تو یہی لکھتا جو تم نے تہیہ کرلیا ہے ــ فرمایا آگے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے سُنا ہے کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ اس پر میں نے اُن کو لکھا ہے کہ ناراض تو نہیں ہوں۔ ہاں زیادہ راضی ہونے کو جی نہیں چاہتا ہے اب الحمدللہ تم نے زیادہ راضی ہونے کے اسباب شروع کر دیے ہیں ــــ

فرمایا کہ ــ حدیث شریف میں جو آیا ہے کہ حجۃ الوداع میں آپ نے سَو اونٹ ذبح فرمائے۔ تریسٹھ تو اپنے دستِ مبارک سے، باقی حضرت علیؓ کے دستِ مبارک سے ذبح کرائے تو اُس وقت اونٹوں کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک بڑھ بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوتا تھا کہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ذبح فرمائیں۔ اس موقع پر بعض بزرگوں نے دامیر

خسروکا) یہ شعر لکھا ہو جس کے لیے اس جگہ سے بہتر دوسری جگہ چسپاں ہونے کا کوئی موقع نہیں ہو۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف ۔ بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

(یعنی جنگل کے تمام ہرن ذوق و شوق کے ساتھ اس اُمید پر اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے ہیں کہ آپ کسی روز شکار کو آئیں گے)۔

فرمایا کہ مولوی سلیمان صاحب (پھلواروی مرحوم) ایک مرتبہ وعظ کہہ رہے تھے۔ مثنوی اچھی پڑھتے تھے۔ بڑے خوش طبع تھے..... آواز اچھی تھی۔ مجلس وعظ میں ..... علماء سے مخاطب ہو کر انھوں نے کہا کہ تم لوگ اتنی دیر سے بیٹھے ہو تمہارا کوئی آنسو بھی ٹپکا ہو اگر یہاں صوفیہ کا مجمع ہوتا تو وہ اب تک کتنی مرتبہ رو دیتے ..... اس پر حضرت حکیم الامۃ نے ارشاد فرمایا کہ واقعی نرے مولویوں کا تو دل بھی نہیں روتا۔

فرمایا کہ ایک دفعہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے درس حدیث میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا قصہ آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبی بن کعبؓ سے فرمایا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہو کہ سورہ لم یکن تمہیں سناؤں تو انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہو؟ فرمایا ہاں تمہارا نام لیا ہو تو اس پر آپ (حضرت ابی بن کعبؓ) رونے لگے۔ ایک طالب علم نے حضرت مولاناؒ سے کہا کہ یہ تو خوشی کی بات تھی رونے کی کیا بات ہو۔ مولانا نے فرمایا کہ جا احمق تو کیا جانے کیسی خوشی کیسا رنج ہوتا ہو۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر شرح فرمائی ہو کہ رونا کبھی خوشی سے ہوتا ہو کبھی رنج سے کبھی گرمیِ بازارِ عشق سے ہوتا ہو۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے رونے کی حقیقت حضرتؒ کے ارشاد سے بخوبی واضح ہوگئی میں اور آسان کر کے کہتا ہوں کہ محبت کے جوش میں کبھی رونا آتا ہو۔

فرمایا کہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب کسی مضمون پر تقریر فرماتے اور کوئی شبہ پیش کرتا تو فرماتے کہ یہ مدرسہ نہیں ہو۔ یہ کام کرنے کے ہیں کر کے دیکھو۔ حضرت حاجی صاحبؒ کا یہ ارشاد نقل کر کے فرمایا کہ مدرسین کو قیل و قال کی عادت ہوتی ہو اور عارفین کو اس سے انقباض ہوتا ہو جو کام میں مشغول ہوتا ہو اُس پر حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔

عارفین کی حالت عوام کی طرح نہیں ہوتی اُن کو اطمینان ہوتا ہے چونکہ حضرت حاجی صاحبؒ کے یہاں حقائق میں تردد نہ تھا اس لیے سوال و جواب سے تنگ ہوتے تھے۔ جیسے اگر کوئی کسی سے کہے کہ آفتاب نکل آیا اب بجائے اس کے کہ وہ اُس کا ممنون ہو اُس سے مباحثہ شروع کر دے تو اُس کو کس قدر ناگوار ہوگا.........

فرمایا کہ — خدا کے سوا کسی پر نظر کیوں رکھی جائے، اسی واسطے (قرآن مجید میں) فرمایا گیا ہے۔ وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — (زمین و آسمان کے تمام خزانے اللہ ہی کے ہیں) ———

ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھے کچھ اذکار تعلیم فرما دیجئے جس سے میری اصلاح ہو جائے فرمایا اصلاح تو معالجات نفس سے ہوتی ہے۔ اذکار تو مثل مفرحات و مقویات کے ہوتے ہیں جس طرح مقویات و مفرحات کے نسخے تو کتابوں میں دیکھ کر بھی بنا سکتا ہے مگر طبیب کی ضرورت تو جو پڑتی ہے تو وہ معالجات کے اندر پڑتی ہے۔ جیسے سرسام، سکتہ اور ضعف وغیرہ وغیرہ کا معالجہ ــــ اور اوراد و اشغال تو کتابوں میں بھی درج ہیں مگر شیخ کی جو ضرورت پڑتی ہے تو وہ معالجات نفس کے اندر پڑتی ہے۔ جیسے تکبر، حسد، کینہ، ریا وغیرہ وغیرہ کا علاج کہ اس کے لیے ماہر طبیب روحانی کی شدید ضرورت ہے۔ معالجات نفس بھی گو بعض کتابوں میں درج ہیں مگر ان سے بغیر کسی کامل کی رہنمائی اور تلقین کے کام نہیں چل سکتا) ــــ رہے وظائف تو وہ اس پر (اتنے) شاق نہیں گزرتے وہ تو ایک تھوڑے سے وقت میں .... بیٹھ کر پورے کر لیتا ہے ــــ اب اگر کسی کے اندر عُجب و ریا کا مرض ہے تو کیا وہ محض وظیفوں سے چلا جائے گا۔ وظائف تو محض تقویت و برکت کے لیے ہیں۔ اگر کوئی سرسام، ضیق النفس کا مریض، حکیم سے کہے کہ حضور مجھے تو خمیرہ گاؤ زبان عنبری لکھ دیجئے تو اس سے یہی تو کہا جائے گا کہ بتائی تجھ کو امراض سے شفا ہو جائے گی تو اس وقت دماغ کے لیے دیں گے ابھی اس کا وقت نہیں ہے ــــ

فرمایا کہ۔ بعض لوگ مولویوں سے کہتے ہیں کہ "ہندوستان میں سود حلال کر دو کیونکہ گو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہے مگر امام ابو حنیفہؒ کا فتویٰ حربی سے سود لینے کے جواز میں ہے۔ امام ابو یوسفؒ کا قول کوئی حجت بھی نہیں"۔۔۔ میں کہا کرتا ہوں جی ہاں آپ کو امام صاحبؒ

کے تمام قولوں میں یہی ایک قول پسند آیا ہے۔ امام صاحب کا قول نماز میں، روزے میں، داڑھی میں حجت نہیں ہے بس سود میں حجت ہے ۔۔۔۔

فرمایا کہ۔ جس شخص سے تعلیم ذکر و شغل کا تعلق ہو اُس سے ایسے مسائل فقہیہ نہ دریافت کرے جن میں قیل و قال ہو۔ اس طریق میں یہ قیل و قال بہت مضر ہے۔ اغبیاء (بے وقوفوں) کو کون سمجھائے؟ یہ ذوقی امر ہے میں تو ایسی باتیں اُنھیں کی مصلحت سے کہتا ہوں ۔۔ (ہنس کر فرمایا) ...... اور میرے ذمے یہ نہیں کہ مصلحت کی وجہ بھی بتاؤں۔ اتنا بتا دینا کافی ہے کہ یہ خلافِ مصلحت ہے۔ میں نے احباب کو لکھ دیا ہے کہ باطنی حالات کے ساتھ مسائل فقہیہ نہ لکھا کرو ۔۔ ایک ..... رنڈھی مجھ سے اکثر مسائلِ فقہیہ پوچھا کرتے تھے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ مجھے ذکر و شغل سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا میں نے کہا کہ تم مجھ سے مسائل فقہیہ نہ پوچھا کرو۔ اور میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ مولانا خلیل احمد صاحب (محدث سہارنپوری) کو اس فن (فقہ) میں زیادہ مہارت ہے تم اُن سے پوچھا کرو ۔۔ چنانچہ جس دن سے اُنھوں نے ایسے سوالات (مجھ سے کرنے) بند کیے اُسی دن سے فائدہ ہونا شروع ہو گیا۔ میرا تو مشاہدہ ہے مگر اب تبلائیے کہ دوسروں کو کس طرح سمجھاؤں؟ ۔۔۔۔

فرمایا کہ۔ بعض مواقع پر معاشرت اور معاملات (بعض) رندوں کے اچھے ہیں اور اہل علم کے خراب ہیں۔ ایک ثقہ صورت میرے ایک دوست سے دس روپے مانگ کر لے گئے تھے۔ جب تقاضا کیا تو کہا ہاں دیدوں گا پھر تقاضا کیا تو کہا ہاں دیدوں گا پھر تقاضا کیا تو کہدیا کہ آپ کے پاس میری کوئی تحریر ہے؟ ۔۔ (جس سے یہ ثابت ہو کہ میں نے آپ سے روپے لیے ہیں۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے تقاضے سے روک دیا اور گویا ادائیگی کا انکار کر دیا ۔۔۔۔

فرمایا کہ۔ آج کل جو تحریری امتحان رائج ہے میں تو اُس کا مخالف ہوں۔ اس میں طلبا پر بڑی مشقت و گرانی پڑتی ہے۔ امتحان سے مقصود تو استعداد کا دیکھنا ہے سو طالب علمی کے زمانے میں اس قدر استعداد کا دیکھنا کافی ہے کہ اس کتاب کو یہ اچھی طرح سمجھ بھی گیا یا نہیں؟ یہ کتاب دیکھ کر امتحان دینے سے بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ باقی رہا حفظ ہونا یہ پڑھنے پڑھانے سے خود ہو جاتا ہے بلکہ طالب علمی کے زمانہ کا حفظ کیا ہوا (اور رٹا ہوا مضمون و سبق) یاد بھی نہیں رہتا اور دماغ مفت میں خراب ہو جاتا ہے۔ میرے یہاں کانپور میں ہمیشہ تقریری امتحان ہوتا تھا اور شروح و حواشی دیکھ کر جواب

دینے کی اجازت تھی جس سے سب طلبا رُعا ر دیتے تھے۔ بس اس قدر دیکھ لے کہ اس مقام کو یہ طالب علم مطالعہ سے یا حواشی و شرح کی اعانت سے حل بھی کر سکتا ہے یا نہیں؟ —— اس سے زیادہ بکھیڑا ہے —— اس رائے کو میں نے دوسرے مدارس میں بھی پیش کیا، مانتے تو ہیں عمل میں نہیں لاتے ——

جب یہاں کوئی اہل مدارس سے آتا ہے اور نصیحت کی فرمائش کرتا ہے تو میں اُسی چیز کا ذکر کرتا ہوں جس کی اُس میں کوتاہی ہے جیسے چندہ وغیرہ کا (کہ صحیح طریقے سے کرنا چاہیے) مگر عمل کوئی نہیں کرتا اس لیے اب جی نہیں چاہتا (کہ اُن سے کچھ کہوں) —— معلوم ہوتا ہے ..... کہ (لوگوں کو) اپنی حالت کے بدلنے کی مطلق فکر نہیں ہے ——

فرمایا کہ ایک مرتبہ قاری محی الدین (محی الاسلام) سے (جو پانی پت کے رئیس تھے اور سبعہ میں سارا قرآن تراویح میں پڑھ لیتے تھے) میں نے کچھ قرآن سننے کی خواہش ظاہر کی اُنھوں نے بڑی خوشی سے پڑھا مجھے اُن کا پڑھنا بہت پسند آیا اور بڑا جی خوش ہوا کیونکہ بے تکلف پڑھا قاری عبداللہ صاحب مکی کا پڑھنا بھی مجھ کو بیحد پسند تھا کیونکہ وہ بے تکلف پڑھتے تھے۔ وہ میرے اُستاد بھی ہیں۔ اُنھوں نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا تھا کہ قرآن شریف میں کسی لہجے کا قصد نہ رکھنا چاہیے۔ مخارج و صفات کی رعایت کرنا چاہیے اسی سے جو لہجہ پیدا ہوگا وہ حسین ہوگا ——

فرمایا کہ —— ایک فلسفی نے لکھا ہے کہ پہلے میں دہری تھا صرف مثنوی کی برکت سے مسلمان ہوا اور میں مثنوی کو اچھی طرح سمجھا بھی نہیں ہوں" —— دیکھیے ہم تو (مثنوی کے) معتقد ہیں مگر یہ شخص تو معتقد بھی نہ تھا —— (واقعی) مثنوی میں بڑی برکت ہے اور کیوں نہ ہو وہ فیض کہاں کا ہے؟

نیا وردم از خانہ چیزے نخست	تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(میں اپنے گھر سے کوئی چیز نہیں لایا میری سب چیزیں تو نے ہی عطا کی ہیں تو ہی اُن کا مالک ہے)

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ —— اس زمانے کو کیا پوچھتے ہو خدا کی پناہ میرٹھ میں ایک صاحب عہدیدار تھے وظائف، اشراق، چاشت سب ادا کرتے تھے اور وظائف کے ہی درمیان رشوت کی بھی (اشارۃً) گفتگو ہوا کرتی تھی اور چونکہ پیر نے وظیفے میں بولنے کو منع کر دیا تھا اس لیے صرف اشارے سے بتا دیا کرتے تھے۔ کبھی دو انگلیاں اُٹھا دیں کہ دو سو لوں گا کبھی تین اُٹھا دیں

کہ میں سوؤں گا اور بغیر مصلّے کا کونہ اُٹھا دیتے تھے۔ ظالم چاشت پڑھ کر کئی سجدے پے کرا ٹھتا تھا۔ ایک دفعہ رُڑکی میں یہ لطیفہ ہوا کہ ایک صاحب نے مجھ سے دعوت کی مجلس میں دریافت کیا کہ یہ حکایت (جو آپ نے کسی وعظ کی مجلس میں سنائی ہے) کس شخص کی ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کو اس کے پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں اعتراض کے لیے نہیں پوچھتا ہوں بلکہ بلکہ اس لیے پوچھتا ہوں کہ میرے والد بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ اگر یہ اُن کی ہی نسبت کہا گیا ہے تو میں درخواست کروں گا کہ اُن کے لیے مغفرت کی دُعا کیجئے میں نے کہا بھئے مسلمانوں کی مغفرت کی دُعا سے کیا عذر ہے میرا اُن کا اس تہذیب سے بڑا دل خوش ہوا۔ اور ان کو ندامت اس قدر شرمندہ ہوا کہ وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ کھانا کھاتے ہی فوراً چلا آیا اسی طرح ایک وعظ میں میں نے ایک انگریزی خواں بیرسٹر کی حکایت بیان کی تھی کہ ایک صاحبزادے ولایت سے پڑھ کے آئے تھے وہ جب اپنے باپ سے ملے تو کہا وِل بڈھا تم اچھا ہے؟..... اور اتفاق سے وہ دونوں باپ بیٹے اُس وعظ میں موجود تھے اور اس واقعے کے جاننے والے لوگ وعظ ہی میں اُن دونوں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے اور وہ بھی لوگوں کو ہنستا دیکھ کر ہنس رہے تھے مگر عجیب بات یہ تھی کہ دونوں صاحب بڑی محبت سے مجھ سے ملے جب میں موٹر سے اُترا تھا مجھ کو لینے آئے تھے اور بعد کو سوار کرنے بھی آئے۔ ذرا بُرا نہیں مانا۔ سب سے زیادہ اکرام انھیں نے کیا بڑے شریف تھے۔ مگر (اس واقعے کو) مجھ سے لوگوں نے بعد میں کہا اور اگر مجھے مجلسِ وعظ میں معلوم ہو جاتا تو موٹر تک آنا دشوار ہو جاتا مجھے بڑی شرم آئی.....

فرمایا کہ۔ ایک شخص کا خط آیا ہے اور اس میں بیعت کی درخواست کی ہے اور آپ چُنگی پر مُحرّر ہیں۔ چُنگی پر جو رسیدیں ہوتی ہیں اُس کی ردّی پر ایک طرف کاٹ کر وہ خط لکھا ہے میں نے جواب میں لکھا ہے کہ جس کے قلب میں دین کی یہ وقعت ہو وہ قابلِ خطاب نہیں ہے۔ بھلا کلکٹر کو تو ایسے کاغذ پر درخواست دے دیں؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دین کو کس قدر گھٹیا سمجھتے ہیں۔ پھر احباب کہتے ہیں کہ سختی کرتے ہیں۔ بھلا ایسے نالائقوں کے ساتھ اور کیا معاملہ کیا جائے۔ میں اپنے احباب ہی سے مشورہ لیتا ہوں۔ جواب دیں۔

فرمایا کہ۔ جس کا دماغ کمزور ہوتا ہے میں اُسے قرآن حفظ کرنے سے منع کر دیتا ہوں

ایسا شخص تو کچھ عربی پڑھنے کے بعد حفظ شروع کرے تو قواعد معلوم ہونے کی وجہ سے حفظ آسان ہو جاتا ہے ...... بعض اہل مدارس طلباء سے ایسی ایسی محنتیں کراتے ہیں کہ جس سے وہ بیکار ہو جاتے ہیں ...... بعضے کا نیہ حفظ کراتے ہیں بھلا یہ بھی حفظ کرانے کی چیز ہے. اگر حفظ ہی کا شوق ہے تو قرآن شریف حفظ کر لو ——

فرمایا کہ ایک شخص نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ یہ جو آیت ہے —— عله إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۔ تو فلا جناح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص سعی نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں ہے. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ شبہ سن کر فرمایا بِئْسَمَا قُلْتَ يَا ابْنَ أُخْتِي عله —— اگر یہ مراد ہوتی (کہ سعی نہ کی) جائے تو کوئی گناہ نہیں) تو أَنْ لَا يَطَّوَّفَ بِهِمَا فرمایا جاتا —— اس لیے اب عدم وجوب پر استدلال صحیح نہیں رہا۔ یہ سوال کہ اس طرح کیوں تعبیر فرمایا گیا تو نکتہ یہ ہے کہ مشرکین اُس کے کرنے میں حرج سمجھتے تھے یہ اُن کا رد ہے۔ (حضرت عائشہ رضؓ کے) اِس جواب کو ایک تابعی نے سُنا تو فرمایا ذَاكَ الْعِلْمُ۔ یعنی یہ ہے علم ۔ کہ ذرا سی بات سے گتھی سلجھ گئی ۔ رہا یہ شبہ کہ یہ آیت اگر عدم وجوب پر دلالت نہیں کرتی تو وجوب پر بھی دلالت نہیں کرتی اس کا جواب یہ ہے کہ سعی کا وجوب ۔ حدیث إِنَّ اللهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ عله —— سے ثابت ہے ——

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اکبر (بھائی اکبر علی مرحوم کو) تو یہاں تک یہ افسوس ہوا کہ ہائے مجھے والد صاحب نے عربی نہ پڑھائی اور مجھے الحمد اللہ کبھی یہ افسوس نہیں ہوا کہ ہائے مجھے والد صاحب نے انگریزی نہ پڑھائی.

فرمایا کہ ۔ فلاں فلسفی صاحب نے لکھا ہے کہ امداد المشتاق بھی جس پایے کی سمجھتا تھا

عله بے شک صفا اور مروہ منجملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا (اُس کا) عمرہ کرے اُس پر ذرا بھی گناہ نہیں، صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے)

عله اے عزیز تو نے بغیر سوچے ہوئے غلط سوال کیا۔

عله بے شک اللہ تعالےٰ نے تم پر سعی کو واجب قرار دیا ہے۔

ویسی ہی نکلی اور مکتوبات میقوبی سے میرے بہت سے شبہات رفع ہوگئے۔ واقعی شہادت ایسے لوگوں کی معتبر ہو کہ جنھوں نے فلسفے کا رنگ بھی دیکھا ہو۔ ہم لوگ تو پہلے ہی سے بزرگوں کی جوتیوں میں رہے ہیں۔ ہمیں قدر ہی کیا ہو؟ ــــــــ

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

(یعنی جو سستا سودا خریدتا ہو سستا ہی بیچتا ہو۔ ایک بچہ ایک موتی کو ایک روٹی کے عوض دے دیتا ہو) ــــــــ

فرمایا جس زمانے میں، میں نے تفسیر بیان القرآن لکھی ہو تو ایک جنٹ انگریز نے نہایت اشتیاق کے ساتھ ملاقات کی اور پوچھا کہ اِس تفسیر پر تم کو کس قدر روپیہ ملا؟ میں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ اُس نے کہا اس کے لکھنے سے پھر کیا فائدہ ہوا؟ میں نے کہا دُنیا میں تو یہ کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو نفع ہوگا اور آخرت میں یہ کہ مالکِ حقیقی خوش ہوں گے۔ پھر وہ خاموش ہوگیا ــــ

فرمایا کہ۔ آدمی کو چاہیے کہ خدا سے صحیح تعلق پیدا کرے پھر اللہ تعالےٰ بڑے بڑے متکبروں اور فرعونوں کی گردنیں اُس کے سامنے جُھکا دیتے ہیں ــــ

فرمایا کہ۔ دُنیا کے لباس میں دُنیا حاصل کرنا اتنا مُضر نہیں جتنا کہ دین کے پردے میں دُنیا حاصل کرنا مُضر ہو ــــ

فرمایا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے میرے سامنے دریافت کیا کہ حیض کے زمانے میں جو نمازیں (عورتوں کی) قضا ہوتی ہیں اُن کی تو قضا نہیں اور جو روزے ہوتے ہیں اُن کی قضا ہو۔ اس کی کیا وجہ ہو؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہو کہ اگر (اِس حکم کو) نہ مانو گے تو سر پر اتنے جوتے لگیں گے جو بال بھی نہ رہیں "۔ جب تک تعلیم سادہ رہی لوگوں کے ایمان قوی رہو اور جب سے یہ نئی روشنی شروع ہوئی ہو لوگوں کے ایمان ضعیف ہوگئے ہر ہر بات میں (خواہ مخواہ لِمَ اور کیف (چلایا جاتا ہو) ــــ لوگوں کے قلوب سے خدا و رسول کی عظمت اُٹھ گئی۔ موٹی بات ہو کہ جب ہم نے خدا کو خدا اور رسول کو رسول مان لیا تو اُن کے احکام میں چوں و چرا کیسی؟ ــــ (علمی حیثیت سے کوئی جامع اور ماہر شریعت، احکام کے لمیات و علل بیان کرے تو کچھ مضائقہ نہیں البتہ عوام کے لیے چوں چرا مُضر ہوگی) ــــ

فرمایا کہ ـ ایک مرتبہ مولانا دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے جلسۂ دستار بندی میں مدرسہ جامع العلوم کانپور بلوایا۔ آپ تشریف لے گئے میں نے وعظ کے واسطے عرض کیا۔ فرمایا میرے بیان سے لوگ خوش نہ ہوں گے اور اس میں میرا تو کچھ نہ جائے گا تمہاری ہی اہانت ہوگی کہ اُن کے اُستاد ایسے ہیں ..... غرضیکہ بڑی دِقت کے بعد منظور فرمایا۔ مولانا کا علم اور علماء کا مجمع خوب طبیعت کھلی ہوئی تھی۔ مضامین عالیہ (بیان) ہو رہے تھے کہ اتنے میں (مولانا) مولوی لطف اللہ صاحب علیگڑھیؒ تشریف لے آئے اُن کو دیکھتے ہی ایک دم بیٹھ گئے ـــ (مولانا) مولوی فخر الحسن صاحب (گنگوہیؒ) نے دوسرے وقت دریافت کیا وعظ کیوں بند کر دیا تھا؟ ـــــ فرمایا کہ اس وقت (مولانا علیگڑھیؒ کی آمد کے وقت) مجھے خیال ہوا کہ اب وقت ہے مضامین کا یہ[عـه] دیکھیں گے کہ علم کیا چیز ہے تو اس طرح وعظ میں خلوص نہ رہا اس لیے میں نے (وعظ) قطع کر دیا۔

فرمایا کہ ـــ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ مُراد آباد کے جلسے میں تشریف لے گئے۔ لوگوں نے وعظ کے لیے اصرار کیا۔ مولانا نے عذر فرمایا کہ مجھے عادت نہیں ہے مگر لوگوں نے نہ مانا آخر مولانا کھڑے ہوئے اور حدیث فقیہٌ واحدٌ اَشَدُّ علَی الشیطٰنِ من اَلفِ عابدٍ ـــ پڑھی اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ ایک عالم شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے ـــ وہاں ایک مشہور عالم تھے وہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ یہ ترجمہ غلط ہے اور جس کو ترجمہ بھی صحیح کرنا نہ آئے تو اس کو وعظ کہنا جائز نہیں ـــ بس مولانا فوراً ہی بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے وعظ کی لیاقت (اور عادت) نہیں ہے مگر ان لوگوں نے نہ مانا۔ خیر اب میرے پاس عذر کی دلیل بھی ہو گئی یعنی آپ کی شہادت۔ پھر حضرت مولانا نے اُن بزرگ سے بطرزِ استفادہ پوچھا کہ غلطی کیا ہے؟ تاکہ آئندہ اُس سے بچوں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اَشد کا ترجمہ اَثقل (زیادہ بھاری) کا نہیں آتا بلکہ اضر کا آتا ہے۔ مولاناؒ نے فی الفور فرمایا کہ حدیث وحی میں ہے اَحیاناً یاتینی مِثلَ صلصلۃِ الجرَسِ وَھوَ اَشدُّ علَیَّ[عـه] کیا یہاں بھی اضر (زیادہ مُضر) کے معنی ہیں؟ وہ معترض عالم دم بخود ہو گئے ـــــ

عـه تلمیذ حضرت قاسم العلوم والمعارف ومحشی ابو داؤد

عـه اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سوال کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی مجھ کو وحی آتی ہے مثل آوازِ جرس کے اور وحی کی یہ قسم مجھ پر بہت زیادہ بھاری ہوتی ہے۔

تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہ رائے بریلوی
از قلم: محمد الحسنی ایڈیٹر "البعث الاسلامی"
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ
حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی کے جد اعلیٰ اور عہد عالمگیر کے ممتاز شیخ وقت اور عارف باللہ حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی
کے صفات و کمالات اور اخلاق عالیہ کا پر اثر اور ایمان افروز تذکرہ اور ان کے باکمال فرزندوں اور خلفاء کے مختصر حالات زندگی
ایک عظیم شخصیت کا تعارف جو ابھی تک پردہ گمنامی میں ہے۔
زیر طبع
ناشر: مکتبہ اسلام، ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ (یوپی)

مولانا کرامت علی جونپوری رحمۃ اللہ علیہ

اور

اُن کا ترجمہ شمائل ترمذی

(از مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی، ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ)

سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک دعوت و جہاد کے فیض سے چند برسوں کے اندر کتاب و سنت کے احیاء و اتباع کا جتنا رواج اندرچہ چاہندوستان و پاکستان کے گوشہ گوشہ میں ہوا، اتنا چرچا اس سے پہلے صدیوں میں نہیں ہوا تھا، یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ آج یہاں قال اللہ و قال الرسول کی جو آواز بھی سنائی دیتی ہے، اگر تاریخی سراغ لگایا جائے تو اس کا سر رشتہ خانوادہ ولی اللہی یا سید صاحب کے سلسلۂ طلائے ناب سے ضرور مل جائے گا، سید صاحب کی تحریک دعوت و جہاد کا غلغلہ گو چند برسوں رہا۔ اور وہ آپ کی اور حضرت اسماعیل شہید دہلوی اور آپ کے دوسرے رفقاء کی شہادت کے بعد مدھم پڑ گیا مگر دلوں اور دماغوں میں اس نے جو نقوش چھوڑے تھے وہ آج بھی جریدۂ عالم پر ثبت ہیں۔ اس تحریک کے ذریعہ ایمان و یقین علم و عمل، اتباع سنت اور احیائے دین کے جو چشمہائے فیض آج سے ڈیڑھ پونے دو سو برس پہلے جاری ہوئے تھے، ان کے سوتے آج بھی خشک نہیں ہوئے ہیں، اور انشاء اللہ قیامت تک وہ اسی آب و تاب سے رواں دواں رہیں گے۔

ان چشمہائے یمن و سعادت کے سوتے جن بزرگوں کے فیض نظر اور بے پناہ جد و جہد سے خشک نہیں ہونے پائے، ان میں ایک مولانا کرامت علی جونپوری رحمۃ اللہ تعالےٰ بھی ہیں، مولانا نے

جو دینی و علمی یادگاریں چھوڑی ہیں، ان میں ایک شمائل ترمذی کا ترجمہ بھی ہے، یہ ترجمہ نہ صرف دینی نقطۂ نظر سے اہم ہے بلکہ اردو نثر کی تاریخ میں بھی اس کا ایک اہم مقام ہونا چاہیے تھا۔ مگر اردو ادب کی تاریخ کا یہ افسوسناک پہلو ہے کہ اس کی تاریخ لکھنے والوں نے چند شعر موزوں کرنے والوں اور چند مضامین لکھنے والوں کو تو اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام دیا ہے، مگر بے شمار علماء و صوفیہ اور خاص طور پر سید صاحب کے سلسلہ کی اردو کی خدمات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج سے لے کر دلی کالج کے قیام بلکہ غالب کے عہد تک اردو ادب کا جتنا ذخیرہ ان اداروں اور بیسیوں مصنفین نے مل کر فراہم کیا، اس سے کئی گنا زیادہ اردو نثر کا ذخیرہ سید صاحب کے سلسلہ کے دو چار بزرگوں مثلاً مولانا اسماعیل شہید، مولانا خرم علی بلہوری، مولانا سخاوت علی جونپوری اور مولانا کرامت علی جونپوری نے فراہم کیا، اول الذکر مصنفین کی کتابیں اگر ہزار دو ہزار کی تعداد میں شائع ہوئیں تو ان علماء کی اردو کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپیں اور بکیں، پہلے گروہ نے اگر اردو کی آواز کچھ خواص تک پہنچائی تو ان بوریا نشینوں نے اس کی آواز سے ہندوستان کے بچے بچے کے کان کو آشنا کر دیا۔

اس دعوت کا یہ بھی ایک فیض تھا کہ اس تحریک کے نتیجہ میں عیسائیوں، آریوں اور سکھوں، اہل بدعت اور دوسرے بہت سے گروہوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ اور عوام کے ولولۂ جہاد اور جذبۂ دعوت و اصلاح کو سرد کرنے کے لیے موافقت و مخالفت میں بے شمار کتابیں لکھیں، اور سب نے اردو ہی کو اپنا ذریعۂ تقریر و تحریر بنایا، اس طرح ہزاروں رسالوں، کتابوں اور مضامین کا انبار لگ گیا، مگر تاریخ ادب اردو کے مصنفین نے اس سلسلہ کی خدمات کو تلاش کرنے کی بہت کم زحمت گوارا کی، سید حامد حسن صاحب قادری نے صرف اتنا لکھ کر اپنا فرض انجام دیا کہ

"مولوی سید احمد بریلوی نے اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی، فارسی میں تنبیہ الغافلین لکھی ہے جس کا اردو ترجمہ مولوی عبداللہ نے ہگلی (کلکتہ) سے شائع کیا، مولوی اسماعیل دہلوی نے کئی کتابیں عقائد کے متعلق اردو میں لکھیں، جن میں تقویت الایمان بہت مشہور ہے، اس زمانہ میں مولوی سید احمد بریلوی صاحب کے مریدوں نے بہت سی کتابیں تبلیغ و اشاعت کی غرض سے لکھیں، مثلاً ترغیب جہاد، ہدایۃ المومنین، نصیحۃ المسلمین وغیرہ، یہ کتابیں اردو کی ترقی کے سلسلہ میں شامل ہیں، مولوی اسماعیل کی تقویت الایمان بہت صاف و سلیس زبان میں ہے۔" (تاریخ داستان اردو ص ۱۵۶)

"بنگال میں اردو" کے مصنف نے مولانا کرامت علی کو اردو کا شیدائی لکھا ہے، مگر ان کے تذکرہ میں اتنا لکھنا کافی سمجھا ہے کہ "مشرقی بنگال میں اردو زبان کے شیدائی مولوی کرامت علی صاحب تھے مذہبی اصلاحی موضوعات پر بیشتر مفید کتابیں لکھیں۔" (ص ۲۹) ان کی کتابوں کی محض اتنی حیثیت کہ "اردو کی ترقی کے سلسلہ میں شامل ہیں۔" قرار دینا ایک تاریخی ظلم ہے، اور اس تاریخی ظلم کے جہاں اور دوسرے اسباب ہیں ان میں ایک بڑا سبب یہ سمجھا ہے کہ اردو ادب کی تاریخ، انگریزوں کے عہد میں مرتب ہوئی، جن کو سید صاحب اور ان کے سلسلہ کے دینی و علمی کارناموں سے شدید بغض و عناد تھا، اور ان کے نقشہائے دوام کو مٹانے میں انھیں لذت ملتی تھی، ملک میں اس وقت انگریزوں سے جو عام ذہنی مرعوبیت چھائی ہوئی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کی ساری ترقی کا سہرا انگریزوں اور ان کے قائم کردہ یا ان کے ہم نوا اداروں اور اشخاص کے سر باندھ دیا گیا، اور انفرادی و اجتماعی طور پر علما اور مصلحین نے اردو کی جو خدمات انجام دیں، وہ نظر انداز ہو گئیں، خاص طور پر سید صاحب کی تحریک اور ان کے کارناموں کے بارے میں برسوں ہر طرف سناٹا چھایا رہا، اب کہیں کہیں اس کا ذکر آنے لگا ہے، مولانا خرم علی کی نصیحۃ المسلمین اور ان کی وہ نظم جو انھوں نے کتاب کے آخر میں عورتوں اور بچوں کو یاد کرانے کے لیے لکھی تھی، جس کا ایک شعر یہ ہے۔

خدا فرما چکا قرآن کے اندر
مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر

یہ ایک زمانہ میں بچہ بچہ کی زبان پر تھا، مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تقویۃ الایمان اور مولانا سلطان احمد کی تذکیر الاخوان ایک مدت تک خاص و عام ہر شخص کے مطالعہ میں رہتی تھی، مولانا سخاوت علی کی راہ نجات اور مولانا کرامت علی کی مفتاح الجنہ ہمارے بچپن تک گھر گھر میں پڑھی اور سمجھی جاتی تھی۔ یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپیں اور شائع ہوئیں، یہ جملہ معترضہ بیچ میں اس لیے لانا پڑا، کہ مولانا کا ترجمہ شمائل ترمذی دینی حیثیت کے ساتھ اردو ادب کا بھی شاہکار ہے، مگر افسوس ہے کہ کسی حیثیت سے بھی اس کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا۔

یہاں مختصراً مولانا کے حالات زندگی لکھے جاتے ہیں، پھر اس کتاب کے تعارف کے سلسلہ میں کچھ باتیں عرض کی جائیں گی۔

مولانا کا نام اور مولد و مسکن

مولانا کا اصل نام علی تھا، مگر عام طور پر ان کی زندگی ہی میں لوگ انھیں مولانا کرامت علی کہنے لگے تھے۔ خود انھوں نے اپنی کتابوں کے شروع میں لکھا ہے "خاکسار علی حنفی جونپوری مشہور کرامت علی (مفتاح ص ۲)

یہ لقب عوام نے مولانا کی ان زندہ کراموں کی وجہ سے عطا کیا" جو دعوت و اصلاح کے سلسلہ میں ان سے روزانہ صادر ہوتی رہتی تھیں۔ مولانا کے پوتے مولانا عبد الباطن صاحب ملاؔ نا کی سوانح میں لکھتے ہیں:

"آپ کا نام علی تھا، آپ سے بکثرت کراموں کا صدور ہوا، یہی وجہ ہو کہ لفظ "کرامت" آپ کے نام کا جزو بن گیا" (ص ۲)

مولانا کا مولد اور مسکن شہر جونپور کا مشہور محلہ ملاٹولہ ہے جہاں اب بھی مولانا کے خاندان کے لوگ موجود ہیں، "مشاہیر جونپور" میں ہے، کہ اس محلہ کا نام اسی خانوادہ کی سکونت کی نسبت سے پڑا ہے[1] مولانا کی ولادت ۱۸ محرم الحرام ۱۲۱۵ھ کو ہوئی "مشاہیر جونپور" میں ہے۔

اسلاف کرامش بعہد سلاطین اسلام	سلاطین اسلام کے عہد میں ان کے اسلاف
خطیب جامع و عیدین بودند بایں وجہ	کرام جامع مسجد اور عیدین کے امام تھے اس وجہ
جائے سکونتش ملاٹولہ مشہور شد۔	سے ان کی رہائش گاہ کا نام ملاٹولہ پڑ گیا۔

مولانا کا سلسلۂ نسب ۳۵ واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ مولانا اپنے والدین کی تنہا اولاد تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت جونپور ہی میں ہوئی۔ سب سے پہلے اپنے والد مولانا ابراہیم صاحب سے بسم اللہ کی، اور فارسی اور ابتدائی عربی کی تکمیل کے بعد دوسرے اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

مولانا عبد الباطن صاحب لکھتے ہیں۔

علم دینیہ مولانا قدرت اللہ ردولوی مرحوم سے، علم حدیث مولانا احمد اللہ انامی سے، علم معقولات مولانا احمد علی چریا کوٹی سے، علم تجوید قرآن قاری سید ابراہیم مدنی اور قاری سید محمد

---

[1] اُس وقت عام طور پر علماء اور خاص طور پر ائمہ مساجد کو ملا کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا۔

اسکندر سے علماً و عملاً حاصل کیا (ص ۱۳۸)

مولانا نے سماعت قرآن پاک کی سند بھی مولانا احمد اللہ نامی شیخ سے لی تھی، جن کا سلسلہ مشہور قاریٔ قرآن صحابی حضرت ابی بن کعب تک پہنچتا ہے۔[1]

مشاہیر جونپور میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسماعیل شہید سے بھی ان کے علمی استفادہ کا ذکر ہے۔

مولانا کرامت علی جملہ علوم معقول و منقول از علمائے عصر اکتساب نمودند از خوان علوم مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ مولانا اسماعیل دہلوی ہم نقمہا برچیدند (۱۳۵)

مولانا کرامت علی صاحب نے تمام علوم عقلی ونقلی کو اپنے عہد کے علماء سے حاصل کیا تھا۔ انھوں نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسماعیل شہید کے خوان علم سے بھی کسب فیض کیا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید احمد شہید صاحبؒ کی خدمت میں جانے سے پہلے بھی مولانا نے دلی کا سفر کیا تھا۔

مولانا کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ انکو تمام ہی دینی علوم میں درک تھا، مگر اہل تذکرہ فقہ اور قرأت میں ان کی خصوصی دستگاہ کا تذکرہ خاص طور پر کرتے ہیں، مشاہیر جونپور میں ہے:

فاما مسائل فقہ از بس مستحضر بود قاری ہفت قرأت بودند کلام مجید را بہ آواز خوش و بہ لحن پر درد خداوندی خواندند وقتیکہ بجہت حصول سعادت حج و عمرہ وزیارت نبوی رفتہ بود بمکۂ معظمہ قاریان آنجا مشق نمودے (ص ۱۳۹)

مولانا کو فقہ کے مسائل حد سے زیادہ یاد تھے، سبعہ کے قاری تھے، قرآن مجید انتہائی خوش الحانی اور درد و سوز کے ساتھ پڑھتے تھے جب حج و عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو وہاں کے قاریوں سے بھی مشق کی تھی۔

شمائل ترمذی اور مشکوٰۃ کے ترجمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن حدیث اور عربی ادب میں ان کو خاص دستگاہ حاصل تھی خواص طور پر شمائل نبوی کا ہر فقرہ اپنی معنویت کے ساتھ عربی ادب کا بھی شاہکار ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جن الفاظ میں آپ کے حلیۂ مبارک اور سیرت و شمائل کی

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماع قرآن کی سند کا بھی رواج تھا۔

تصویر کشی کی ہے، اس سے بہتر الفاظ کا انتخاب ممکن نہیں ہے، اس لیے اس کی معنویت کو مجروح کیے بغیر، کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں تھا، پھر یہ علمی و ادبی ترجمہ اردو نثر میں اس وقت ہوا ہے، جب اردو نثر قصہ کہانی اور میر امن کی چہار درویش سے آگے نہیں بڑھی تھی، یہ ترجمہ پہلی بار ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء میں شائع ہوا۔

مولانا خط نستعلیق اور خط نسخ دونوں کے بہترین خطاط تھے، ان کو اس میں اتنی مہارت تھی کہ ایک چاول پر پوری سورۂ اخلاص لکھ دیتے تھے۔

بر یک دانہ برنج یا نخود سورۂ قل ہو اللہ بتمامہ نوشتے (ص ۱۳۶)

مولانا نے فن سپہ گری اور بنوٹ کی بھی مشق کی تھی، اس سلسلہ میں ان کے بہت سے واقعات منقول ہیں۔ کچھ واقعات کا ذکر آئے گا۔

مولانا کے علم و فضل پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے، صاحب "تذکرۂ علمائے ہند" نے ان کو کثیر التصانیف لکھا ہے، مشاہیر جونپور کے مصنف نے انھیں از علمائے ناموران ذات بابرکات ش سرمایۂ ناز و افتخار جونپور بود وغیرہ الفاظ سے یاد کیا ہے، ان کی تصانیف سے بھی ان کے علم و فضل کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

باطنی فیض مگر مولانا کی حیات پر سعادت کا دائرۂ فضل و کمال اس سے بھی آگے تھا! ایک طرف وہ علم و فن میں تمام علمائے عصر کے ہم عناں تھے، تو دوسری طرف زہد و اتقاء، اتباع سنت اور دعوت و عزیمت کی پرخار وادیوں سے نہ صرف گزرے تھے، بلکہ ان صفات ملکوتی میں انھیں ایک ممتاز مقام حاصل تھا، اور یہ سب اثر تھا سید صاحب کے فیض نظر کا۔

و فیض ور از مولانا سید احمد شہید اندوختند۔ (ص ۱۰۵)

تذکرۂ علمائے ہند کے مصنف نے سید صاحب سے ان کی بیعت کا دو لفظوں میں ذکر کیا ہے۔

و مرید سید احمد بریلوی سید صاحب کے مرید تھے۔

مزید تفصیل مولانا عبد الباطن صاحب کے بیان سے معلوم ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"مولانا کی عمر ابھی اٹھارہ سال کی تھی کہ تزکیۂ نفس کے خیال نے زور پکڑا، اس کے لیے دلی جانے کا ارادہ تھا، مگر سید احمد شہید کی شہرت ہوئی، وہ وطن سے قریب بھی تھے، اس لیے ان کی خدمت

میں رائے بریلی پہنچے۔ وہاں علماء کی ایک جماعت جن میں مولانا اسماعیل شہیدؒ، مولانا عبدالحئی جیسے سرآمد روزگار علماء بھی موجود تھے، ان کی علمی صحبت میں بھی رہے اور حضرت سید صاحب سے باطنی استفادہ بھی کیا۔ مولانا جس ذوق و شوق سے سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ سید صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں بیعت کر لی اور ایک ہفتہ میں مقامات سلوک طے کرا دینے کے بعد فرمایا کہ ہدایت کے کام میں لگ جاؤ۔ سید صاحب نے جو خلافت نامہ مولانا کو عطا کیا ہے، وہ اب بھی اس خاندان میں محفوظ ہے۔

راقم کو اس کا فوٹو مولانا عبدالباطن صاحب نے بھیجا ہے جس کی عبارت اتنے باریک فارسی خط میں ہے کہ پڑھی نہیں جاتی۔ اس پر تاریخ خلافت ۱۲۳۶ھ درج ہے۔

خود مولانا نے سید صاحب سے اپنی عقیدت اور شیفتگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

”جب دین میں نوع نوع کے فساد ظاہر ہوتے ہیں تب اللہ تعالیٰ دین کے تازہ کرنے کے واسطے ایک شخص کو پیدا کرتا ہے اور اس کے اعوان اور مددگار بہت سے ہوتے ہیں سو اس وقت کے مجدد ہمارے صاحب طریقہ حضرت امیرالمومنین سید احمد قدس سرہ ہوئے اور انھوں نے دین کو تازہ کیا۔ (نور علی نور)

اسی طرح اپنی متعدد کتابوں میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

مولانا بھی کچھ دنوں اور قیام کرنا چاہتے تھے، مگر سید صاحب نے فرمایا تھا کہ ہدایت کے کام میں لگ جاؤ اس لیے واپسی کا قصد کر لیا، لیکن ان کے ذوق و شوق کو محسوس کر کے سید صاحب نے پھر فرمایا کہ

”کام تو خدا کی رحمت سے ہو گیا، اور بہت جلد ہو گیا، اب بہ حیثیت مہمان دو چار روز اور بھی ٹھہر کر دیکھ بھال کر لو۔“

مولانا نے یہاں اٹھارہ دن قیام کیا، اس دوران میں کئی واقعے پیش آئے جن میں ایک اہم واقعہ مولانا نے خود اپنی کتاب نور علی نور میں نقل کیا ہے۔

ایک روز اس عاجز مسکین نے حضرت عالم ربانی مولانا عبدالحئی رحمۃ اللہ سے عرض کیا کہ آپ جو اس قدر میاں صاحبؒ سے اعتقاد رکھتے ہیں اور روپے پیسے کپڑے وغیرہ دنیاوی

ؒ عام بول چال میں حضرت سید صاحب کو لوگ میاں صاحب اور میر صاحب کہتے تھے

چیزوں کو چھوڑ کے میاں صاحب کی صحبت اختیار کیے ہیں، اور آپ کے بدن پر جو کپڑا ہے اس کے سوا آپ کے پاس کہیں کپڑا بھی نہیں، اور آپ جب میاں صاحب کے روبرو بات کرتے ہیں، تو ترساں اور لرزاں رہا کرتے ہیں، تو للہ آپ ہم سے سچ بیان کیجئے کہ آپ نے میاں صاحب سے کیا پایا جو اپنا حال ایسا بنایا، تب مولانا مغفور نے فرمایا کہ انشاء اللہ تعالےٰ میں سچ بیان کروں گا، سنو! میرا یہ حال تھا کہ میں سلوک الی اللہ اور مشاہدہ حاصل ہونے کا بڑا اشتیاق تھا۔ تب میں نے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ سے عرض کیا، کہ مجھ کو آپ سلوک الی اللہ کی تعلیم کیجئے اور اس کے قبل میں بہت سے ہندی اور ولائتی مرشدوں سے توجہ لے چکا تھا، مگر میرا مقصود حاصل نہ ہوا تھا۔ تب آپ نے مجھ کو حضرت شاہ غلام علی قدس سرہ کے پاس بھیجا۔ وہاں بھی چند روز توجہ لیتا رہا، مگر میرا مقصد حاصل نہ ہوا، تب میں نے حضرت مولانا سے پھر عرض کیا۔ کہ یہ خادم حضور کی توجہ کا محتاج ہے۔ اور حضور دوسرے مقام میں بھیجتے ہیں، ہم کو آپ خود تعلیم کیجئے! تب حضرت مولانا نے فرمایا کہ میاں میں بہت بڈھا اور کمزور ہوا اور مجھ میں بہت دیر تک بیٹھنے کی طاقت نہیں۔ یہ مقصد تمہارا امیر احمد صاحب (سید صاحب کو شاہ عبدالعزیز صاحب میر صاحب کہا کرتے تھے) سے حاصل ہوگا، تم اُن سے بیعت کرو، تب اس جناب کا فرمانا مجھ کو بہت شاق گزرا اور میں ناراض ہو کے چپ رہا، پھر کئی بار اور بھی عرض کیا، وہی جواب پایا، آخر کو بعد چند روز کے یہ واقعہ درپیش ہوا کہ میں اور حضرت میاں صاحب اور میاں محمد اسماعیل مدرسہ کے ایک ہی مکان میں رہا کرتے تھے، ایک شب کو بعد عشا کے جب ہم تینوں شخص پلنگ پر سوئے۔ تب میاں صاحب نے فرمایا کہ مولانا! مجھ کو حضرت رب العالمین نے اپنے فضل و کرم سے بطور الہام کے خبر دیا ہے کہ فلانی تاریخ فلانے سفر میں تو جاوے گا اور فلانے مقام میں یہ ہوگا، فلانے مقام میں وہ ہوگا، اور اس قدر لوگ مرید ہوں گے، وعلیٰ ہذا القیاس سب باتیں بیان کیں۔ پھر دوسرے روز بھی ایسی ہی عجیب و غریب باتیں بیان کیں۔ اس طرح سے کئی روز تک مکہ معظمہ کے سفر اور جہاد کے سفر اور جہاد کے واقعات کا بیان بالتفصیل تمام فرمایا، تب ہم نے اور میاں محمد اسماعیل نے مشورہ کیا، کہ اگر یہ سب باتیں سچ بیان کرتے ہیں تو بلاشبہ یہ بہت بڑے شخص اور قطب ہیں، ان سے کچھ فیض لینا بہت ضروری ہے، سو اُن کسی بات میں ان کا امتحان کریں، تب میاں محمد اسماعیل نے کہا کہ آپ ہم سے بڑے ہیں، آپ ہی تجویز کرکے

کسی بات میں امتحان کیجئے، آخر کو جب پہر رات کو میاں صاحب نے پکارا کہ مولانا! تب ہم نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی بزرگی میں کچھ شبہ نہیں، مگر ہم کو ان سب باتوں سے کیا فائدہ! کچھ ہم کو عنایت کیجئے تب فرمایا کہ مولانا! کیا مانگتے ہو، تب ہم نے کہا کہ حضرت! ہم یہی مانگتے ہیں، کہ جیسی نماز صحابہ کرام ادا کرتے تھے۔ ویسی ہی دو رکعت ہم سے ادا ہو، یہ کہا اور میاں صاحب یکبارگی خاموش ہو گئے اور اس روز پھر کچھ نہ بولے، تب ہم لوگوں نے جانا کہ فقط یہ زبانی باتیں تھیں، اصل باتوں سے ان کو کچھ علاقہ نہیں، مگر ہمیشہ کی دوستی اور صحبت کی مروت سے ہم لوگ کچھ نہ بولے کہ اب شرم دلانا کیا ضرور اور چپ کرکے سو رہے، پھر آدھی رات کے کچھ قبل یا بعد حضرت میاں صاحب نے پکارا مولانا! اس پکارنے سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، میں نے جواب میں کہا حضرت! تب فرمایا کہ جاؤ اس وقت اللہ کے واسطے وضو کرو، تب پھر میرے بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے میں نے کہا کہ بہت خوب دو تین قدم چلا تھا کہ پھر پکارا مولانا! سنو، میں پھر کے حضرت کے پاس حاضر ہوا، فرمایا تم نے خوب سمجھا، میں نے کہا کہ اللہ کے واسطے وضو کرو، پھر میں نے کہا بہت خوب اور چلا، دو تین قدم چلا تھا کہ پھر پکارا اور ویسی طرح فرمایا، اسی طرح تین بار کہا، تیسری بار جا کے میں وضو کرنے لگا، تو ایسا حضور دل اور حق سبحانہ کے خوف سے میں نے ادب کے ساتھ وضو کیا کہ ایسا وضو کبھی نہ کیا تھا، پھر وضو کرکے حضرت کے حضور میں حاضر ہوا، فرمایا جاؤ، اللہ رب العلمین کے واسطے اس وقت دو رکعت نماز پڑھو، تب میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اور نماز کے واسطے چلا، دو تین قدم چلا تھا کہ پھر پکارا اور میں حضور میں حاضر ہوا، فرمایا تم نے خوب سمجھا یا نہیں میں نے کہا کہ جاؤ اس وقت اللہ رب العلمین کے واسطے دو رکعت نماز پڑھو میں نے کہا بہت خوب اور نماز کے واسطے چلا، پھر تیسری بار پکارا اور ویسا ہی سمجھا دیا، تب میں نے ایک گوشہ میں نماز شروع کی، تو تکبیر تحریمہ کے ساتھ ہی ایسا مشاہدہ جلال میں غرق ہوا کہ ہوش باقی نہ رہا، اور اس قدر رویا کہ آنسو سے داڑھی تر ہو گئی، اور اس قدر نماز میں غرق ہو گیا، کہ دنیا کی یاد مطلق باقی نہ رہی، اور نہایت خوف اور لذت کے ساتھ میں نے دو رکعت نماز پڑھی، جب دو رکعت پڑھا تو خیال کیا کہ میں نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھا تھا۔ پھر سلام پھیر کے دوبارہ دوسری بار دو رکعت کی نیت کیا۔ پھر جب پڑھ چکا، تو خیال کیا، کہ فاتحہ میں سورہ ضم نہ کیا تھا، پھر شروع کیا۔

اسی طرح ہر بار ایک ایک واجب کے ترک کرنے کا خیال آتا تھا، اور نماز کو ناقص سمجھ کے دہراتا تھا، واللہ اعلم سو رکعت یا زیادہ یا کم پڑھا ہوگا۔ کہ صبح صادق کا قریب ہوا، پھر آخر کو ناچار ہو کے سلام پھیرا، اور بہت شرمندہ ہوا، کہ میری استعداد اس طرح کی ناقص ہے کہ دو رکعت پوری بھی حضور دل کے ساتھ نہ پڑھ سکا، اور اتنے بڑے کامل شخص کو میں نے آزمایا، اب اگر وہ پوچھیں کہ تم نے دو رکعت اللہ کے واسطے پڑھا تو میں کیا جواب دوں گا، میں تو حضور دل کے ساتھ جیسا کہ حق نماز پڑھنے کا ہے، ویسا دو رکعت بھی نہ پڑھ سکا، اسی سوچ میں شرم کے دریا میں غرق ہو گیا اور اپنے قصور کا معترف ہو کے اللہ سبحانہ کے خوف سے استغفر اللہ استغفر اللہ کہنا شروع کیا جب اذان ہوئی، تب مجھ کو ہوش ہوا اور یاد پڑا کہ صحابہ کرام کا یہی حال تھا، کہ تمام رات عبادت کرتے اور پچھلی رات کو استغفار کرتے تھے۔ ان کی شان میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا والمستغفرین بالاسحار، اور سمجھا بلاشبہ یہ بڑے کامل مرشد ہیں، کہ ان کے کلام سے میرا مقصد پورا ہوا، اور جو نعمت مدت دراز کی محنت میں حاصل نہ ہوئی تھی، سو ان کے ایک دم کے فرمانے سے حاصل ہوئی۔ پھر میں مسجد میں گیا، اور قبل نماز فجر کے، میں نے حضرت میاں صاحب سے بیعت کیا، اور صبح کی نماز کے بعد محمد اسماعیل سے میں نے رات کا پورا قصہ بیان کیا۔ چونکہ وہ مجھ کو صادق جانتے تھے۔ انھوں نے بھی حضرت میاں سے بیعت کیا۔ پھر میں دن کو حضرت شاہ عبد العزیز کے پاس گیا اور رات کا قصہ بیان کیا اور اپنے بیعت کرنے کا بیان کیا۔ آپ نے فرمایا الحمد للہ بارک اللہ خوب کیا میاں، میں تم سے اس واسطے کہا کرتا تھا کیوں میاں! تم نے میر صاحب کا کمال دیکھا تب میں نے عرض کیا، کہ حضرت میں نے بہت درویشوں کی خدمت کی، اور بہت طریقوں کے موافق میں نے شغل اور مراقبہ کیا۔ میرا مقصد کبھی حاصل نہ ہوا۔ حضرت سید صاحب نے ایک بات زبان سے کہدی اور میں اپنا دلی مقصد پا گیا۔ حضرت! یہ کون سا طریقہ کہلاتا ہے؟ تب فرمایا کہ میاں ایسے لوگ کسی طریقے کے محتاج نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ جو زبان سے کہیں وہی طریقہ ہے، ایسے لوگ خود صاحب طریقہ ہوتے ہیں، اور ایسے لوگ طریقہ نکالتے ہیں، حضرت مولانا کے فرمانے سے اور بھی زیادہ مجھ کو حضرت میاں صاحب کے مرشد صاحب طریقہ ہونے کا یقین ہوا اور میرا اعتقاد اور بھی زیادہ ہوا، اس سبب سے میں میاں صاحب کی غلامی میں حاضر ہوں، اور

ان کی غلامی کے قابل بھی میں اپنے تئیں نہیں پاتا۔"

حضرت سید صاحب کی یہ روشن کرامت تھی کہ مولانا جونپوری کو ان کے شوق جہاد کے باوجود بنگال روانہ کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ بنگال کا اسلام جیسے تاریک خطہ کا کیا انجام ہوتا۔ سوانح احمدی مصنفہ مولوی محمد جعفر صاحب کے صفحہ ۱۴۱ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا کرامت علی مرحوم سید صاحب کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے اور قبل معرکۂ بالاکوٹ حضرت سید صاحب نے مولانا کو ہدایت خلق اور اشاعت دین کی غرض سے ہندوستان روانہ کر دیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال، بالاکوٹ کی ناکامی حضرت سید صاحب پر منکشف ہو چکی تھی اس لیے حضرت سید صاحب نے مولانا سے وہی خدمت لینی چاہی، جو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص و مقدر ہو چکی تھی۔

جو لوگ حضرت سید صاحب کی تحریک کو ناکامی سے تعبیر کرتے ہیں وہ اگر صرف علمائے صادق پور و مولانا کرامت علی صاحب جونپوری کی تبلیغی مساعی پر ایک نظر ڈال لیں تو شاید وہ اپنی رائے واپس لینے پر مجبور ہوں گے۔ آگے ذکر آئے گا کہ مولانا کی وجہ سے صوبہ بنگال جو عہد حالیہ میں بھی مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ بن سکا، وہ محض مولانا کرامت علی کی کوششوں سے اکثریت کا صوبہ بن گیا۔

شاہ عبد العزیز صاحب اور مولانا اسماعیل شہید کی صحبت علمی نے ان کو اگر علم و فضل سے آراستہ کیا، تو سید صاحب کے فیض باطنی سے ان میں زہد و قناعت، ورع و تقویٰ، ایثار و قربانی اور خدمت دین اور احیائے سنت کا وہ پرشور جذبہ پیدا ہوا کہ انھوں نے جونپور کی مسند درس و افتاء اور امامت و خطابت اور ذاتی عزت و وجاہت سب کو خیرباد کہہ کر بنگال کے گانوں گانوں کی خاک چھانی اور قال اللہ و قال الرسول کی صدائے پر درد سے اہل بنگال کے کانوں سے آباد کرنے [illegible] جان جان آفریں کے سپرد کی [illegible] ربیع الاول ۱۲۹۰ھ [illegible] صوبہ بنگال کے مقام رنگ پور میں مولانا کی وفات ہوئی۔ صاحب [illegible] ان کی تاریخ وفات بعد رحمت [illegible] کرامت علی جنتی سے نکلتی ہے۔

۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ

اب ہم مولانا کے عادات وخصائل اور ان کی تبلیغی کوششوں کی تھوڑی تفصیل کرتے ہیں

عادات وخصائل مولانا کی ذات زہد واتقا اور بذل وجود میں اسلاف کا نمونہ تھی، افسوس ہو کہ مولانا کے اخلاق وعادات کے بارے میں تذکرہ علمائے ہند اور مشاہیر جونپور میں دو دو چار چار فقروں سے زیادہ نہیں ملے، مگر ان مجمل بیانات سے بھی کسی قدر ان کے مرتبہ کی بلندی کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے۔ تذکرہ علمائے ہند میں ہو۔

متشرع ومتورع بودند — شریعت کے پابند اور صدور جہ پرہیزگار تھے۔

مشاہیر جونپور میں ہے۔

مولانا مرد میدان زہد وتقوی، صاحب بذل وہمت وسیر چشم بودند ہرکہ از نذور و فتوح آمدے برحاجتمندان وفقراء ومساکین تقسیم کردے۔ — مولانا زہد وتقوی کے مرد میدان اور بڑے اولوالعزم فیاض اور سیر چشم تھے۔ ان کے پاس جو نذریں اور ہدایا آتے تھے وہ سب غرباء ومساکین پر صرف کر دیتے تھے۔

مولانا کے عادات وخصائل اور معمولات کو مولانا عبد الباطن نے تفصیل سے لکھا ہو جس کا کچھ خلاصہ یہ ہے۔

"حضرت مولانا کے مزاج میں حرارت اسلامی اور جوش ایمانی اعلیٰ درجہ کا تھا، آپ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد تھے، بعد تہجد صبح تک آپ ذکر خدا میں مشغول رہا کرتے تھے۔ صبح کے بعد اشراق تک آپ مع اپنے مریدین کے مراقبہ کرتے۔ آپ کے حلقہ میں بہت لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ اس کے بعد طلباء کو قرآن شریف یا تجوید وقرأت پڑھایا کرتے تھے، اس کے بعد چائے پی کر تصانیف کے شغل میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اور کھانا کھانے کے بعد دوپہر کو آپ قیلولہ فرمایا کرتے تھے۔ ظہر کی نماز موافق مذہب حنفی کے اول وقت میں اور عشا کی نماز کچھ تاخیر کر کے ادا کرتے تھے، اور آپ ہمیشہ نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں جا کر ادا فرمایا کرتے تھے اور عشا کے بعد کھانا کھا کر کتابوں کی تصنیف وکتب بینی میں مصروف رہا کرتے، آپ رات کو بہت کم سوتے تھے اور تھوڑی دیر استراحت فرما کر تہجد کی نماز کے واسطے بیدار ہوا کرتے تھے۔ اور آپ اکثر باوضو رہا کرتے تھے۔ آپ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے پابند تھے۔ یہاں تک کہ مسواک

قبل وضو بنج وقتہ کیا کرتے اور پابند کوفی تھے۔ عمامہ ہمیشہ باندھتے تھے۔ پائجامہ اونچا پہنتے تھے۔ موزہ کا استعمال کبھی نہیں کیا۔ ہاتھوں میں ہر وقت تسبیح رکھتے۔ اور پڑھتے تھے۔ آپ کو پان سے بہت شوق تھا اور حقہ سے نفرت تھی، اور حقہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ اس کا ترک اولیٰ ہے۔ اور بعد مغرب گھی آپ طلبار کو قرأت مشق کرتے۔ اور علم قرأت میں آپ کے ہزاروں شاگرد تھے۔ آپ سات قرأتوں کے ساتھ قرآن مجید پڑھا کرتے تھے۔ ابتدائے زمانہ میں آپ درسی کتابوں کو پڑھاتے۔ اس کے بعد علم تجوید اس کے بعد تعلیم ذکر و مراقبہ۔ آپ کی خوراک بہت مختصر تھی، اور کھانے میں کوئی تکلف نہ تھا، قناعت ایسی تھی کہ جو کچھ سامنے آتا، شکر بھیج کر کھا لیتے۔ آموں سے آپ کو شوق تھا، احقر کی بڑی پھوپھی صاحبہ فرماتی تھیں کہ آم کی فصل میں آپ کے واسطے آم کا التزام رہتا جسے آپ کھانا کھانے کے بعد نوش فرماتے، جب فصل ختم ہونے والی ہوتی تو آم کا حلوہ گمی چینی کی آمیزش سے تیار کیا جاتا آپ اسے کچھ روز تک کھاتے، آپ کی مہر میں "علی جونپوری" کھدا ہوا تھا۔ آپ اپنے نام کو اپنی تصانیف میں یوں لکھا کرتے۔

خاکسار علی جونپوری حرف بہ کرامت علی جونپوری کا

آپ کی روش تحریر عربی کی شل محدثین کے سادی اور سلیس، عام فہم سخواص پسند ہوا کرتی تھی، چناں چہ نسیم الحرمین، براہین قاطعہ، میلاد خیر البریہ وغیرہ دیکھنے سے معلوم ہوگا۔ مولانا نے اپنی مادی اور معنوی دونوں یادگاریں چھوڑی ہیں۔

اولاد مولانا کے کل ۱۴ اولادیں ہوئیں، ۶ لڑکے اور ۸ لڑکیاں، وفات کے وقت بڑے صاحبزادے مولانا کی زندگی میں وفات پا گئے تھے۔ بقیہ وفات کے وقت موجود تھے۔ بڑے صاحبزادے کا نام حافظ عبد اللہ تھا۔ مولانا کے بعد ان کے اہل خاندان نے ایک مدت تک دعوت و تبلیغ کو اپنا شعار بنائے رکھا آج بھی اس خاندان میں مولانا عبد الباطن صاحب حیات ہیں جو اپنی خاکساری اور تواضع میں آپ اپنی مثال ہیں۔

(باقی) ————

پاکستان کا المیہ

[ناظم دار المصنفین جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کے قلم سے ان کا سفر نامۂ پاکستان "معارف" میں شائع ہو رہا ہے۔ چند اوراق میں مشرقی پاکستان کے "انصار و مہاجرین" کے باہمی تعلقات کا بھی تذکرہ ہے۔ ان اوراق کے مطالعہ میں ناظرین الفرقان بھی شریک ہوں — ادارہ —]

میں پہلی بار ڈھاکہ ۱۹۵۱ء میں آیا تھا، اُس وقت یہ شہر بہت زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا، کلکتہ کے مقابلہ میں یہ محض ایک قصبہ معلوم ہوتا تھا، دوسری بار ۱۹۶۲ء میں آیا تو اس کی شکل بہت بدل گئی تھی۔ اب ۱۹۶۹ء میں آیا تو اس کی بہت سی سڑکوں پر کلکتہ ہی جیسی رونق اور چہل پہل پائی۔ موتی جھیل، جناح ایونیو، اسٹیڈیم، دھان منڈی، گلشن اور نیو پلٹن میں تو بہت سی خوبصورت عمارتیں بن گئی ہیں، ایک روز اپنے چھوٹے چچا جناب سید صلاح الدین صاحب کے ساتھ ہائی کورٹ چلا گیا، اس کی نئی عمارت بہت شاندار ہے، لیکن بلندی کی کمی محسوس ہوئی، عمارت کا پورا فرش موزیک کا ہے، یہاں کی نئی عمارتوں میں موزیک کی بڑی فراوانی دیکھی، چیف جسٹس کے کورٹ کے اندر گیا، بڑا وسیع ہال تھا، جو ہر طرح آراستہ تھا، وکلاء اور ججوں کا لباس وہی تھا جو ہندستان کے ہائی کورٹ میں ہے۔ عمارت کے بیچ میں وسیع لان تھا، اس کی گھاس اچھی نہ تھی، مونتھے بکثرت تھے، لیکن مالیوں نے اس کو کاٹ کر برابر کر رکھا تھا جس سے دیکھنے میں پورا لان بھلا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے دن ڈھاکہ ہائی کورٹ کے جسٹس محمود حسین صاحب کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا، وہ اپنی سفید لمبی ڈاڑھی میں بہت متشرع معلوم ہوئے۔ سلہٹ کے رہنے والے ہیں، اُردو صاف اور اچھی بولتے ہیں، باتیں شروع ہوئیں تو میں نے کہا کہ آپ کے ہاں ہائی کورٹ کی عمارت خوبصورت اور شاندار ہے، کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ

جیسا اس کا ظاہر ہے ویسا اس کا باطن بھی ہو جائے۔ گفتگو چل نکلی تو بولے کہ مسلمانوں کا بھی عجیب حال ہے۔ حافظ شیرازی کی موت ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ کافر مرا، اور ان کے جنازہ کی نماز پڑھنے سے انکار کیا، لیکن ان کے دیوان سے فال نکالی گئی تو یہ شعر نکلا۔

قدم دریغ مدار از جنازہ حافظ   کہ اگرچہ غرق گناہ ست می رود بہ بہشت

پھر کہنے لگے کچھ مسلمان، مرنا مدہم کو بھی مسلمان نہیں سمجھتے ہیں، خدا ایسے مسلمانوں پر اپنا فضل رکھے۔

جمعہ کے روز ڈھاکہ کی مشہور مسجد بیت المکرم میں نماز پڑھنے گیا، جو یہاں کی جامع مسجد ہے، بالکل ہی نئے طرز کی سہ منزلہ عمارت ہے، ہر منزل پر جماعت کھڑی ہوتی ہے۔ اس میں دہلی کی جامع مسجد کی طرح لمبا صحن نہیں ہے۔ اور نہ گنبد ہے۔ دھوپ سے بچنے کے لیے اس میں شامیانہ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی بیچ میں ایک بڑا ہال ہے، وہیں امام صاحب کی امامت کی جگہ بنی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر اور نیچے کے حصوں میں دوکانیں ہیں جن سے کافی آمدنی ہوتی ہوگی، اس کا ایک کتب خانہ بھی ہے تمام فرش موزیک کا ہے۔ امام صاحب کے لیے ایک علیحدہ کمرہ بھی ہے جہاں ان سے لوگ فیوض و برکات حاصل کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں، موجودہ امام صاحب کا اسم گرامی مولانا عمیم الاحسان ہے، پہلے ان کا وطن بہار شریف ضلع پٹنہ تھا، میں ۱۹۶۷ء میں پٹنہ میں ایک بڑا آپریشن کرا رہا تھا تو میرے ایک محترم عزیز جناب سید محمد انیس صاحب نے ان سے میرے لیے دعائیں کرائی تھیں، اس لیے میں ان سے جذبۂ ممنونیت کے ساتھ ملا، وہ دار المصنفین سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے بڑی خندہ پیشانی سے ملے، دیر تک گفتگو ہوتی رہی، انھوں نے بتایا کہ اردو اور بنگلہ میں ان کی تقریباً اسّی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جمعہ کی نماز کا وقت آیا تو اپنے حجرہ سے باہر نکلے، ایک عصا بردار مرصع عصا لیے ان کے آگے آگے چلا، وہ سب سے مصافحہ کرتے ہوئے منبر تک پہنچے، خطبہ کچھ تحت اللفظ اور کچھ قرأت کے ساتھ پڑھا، ان کے پڑھنے کا انداز اچھا اور موثر تھا، مگر لاؤڈ اسپیکر اچھا نہ تھا، اس لیے آواز کبھی کبھی ناصاف ہو جاتی تھی، مقتدی دس ہزار سے کم نہ رہے ہوں گے۔

اسی روز شام کو خبر ملی کہ بنگالیوں اور اردو بولنے والے مہاجروں میں تناؤ پیدا ہو گیا ہے، دونوں کے تعلقات خراب ہو رہے ہیں، اردو بولنے والے مہاجروں کا مطالبہ یہ تھا کہ آئندہ انتخا

کے لیے ووٹر بنانے کے لیے نئے فارم اردو میں بھی مہیا کیے جائیں۔ چیف الیکشن کمشنر کی طرف سے اعلان ہوا کہ مشرقی پاکستان میں بنگالی کے علاوہ اردو میں فارم دینے سے انتظامیہ کی مشکلات بڑھ جائیں گی اردو بولنے والے مہاجروں نے حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کی خاطر ڈھاکہ میں محمد پور اور میرپور کے علاقوں میں دکانیں بند کیں اور کرائیں، یہ جھگڑا دراصل مہاجروں اور حکومت کے درمیان تھا لیکن بنگالیوں اور اردو بولنے والے مہاجروں کے جھگڑے کی شکل میں تبدیل ہو گیا، گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ ۲ر نومبر سے کئی روز تک خاص خاص اوقات میں کرفیو لگا رہا، ۳ر نومبر کی صبح کو اخبار ملا تو اس میں یہ خبر تھی کہ چھ آدمی ہلاک ہوئے، یہ خبر پڑھ کر بڑا دکھ ہوا کہ جب پاکستان میں مسلمان مسلمان سے لڑ کر ہلاک ہوتے ہیں تو پھر ہندوستان میں اگر ہندو مسلمان لڑتے ہیں تو وہاں کیا شکایت ہو سکتی ہے طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں، بنگالیوں اور غیر بنگالیوں دونوں کی زبان پر تھا کہ ان کے آدمی زیادہ مارے گئے، مجھ کو کرفیو سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا، ہر طرف ہو کا عالم چھایا تھا، فوجی ٹرک گزرتا تو اس کی صرف آواز کانوں میں پڑتی۔ ۲ر نومبر سے ۹ر نومبر تک فضا بڑی مکدر رہی، اخباروں میں مارننگ نیوز اور پاکستان آبزرور دونوں کا لب و لہجہ صلح کل تھا، لیڈروں کے بیانات میں بھی امن و آشتی کا پیام ہوتا، بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے ملے جلے جلوس بھی نکلے اور مسلمان بھائی بھائی کے نعرے لگائے گئے، پاکستان آبزرور کے ایڈیٹر عبدالسلام صاحب کا ایک اچھا مضمون بھی شائع ہوا، جس میں انھوں نے اس جھگڑے کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا، بنگالیوں اور غیر بنگالیوں دونوں پر الزامات عائد کیے، اردو بولنے والے مہاجروں کو مخاطب کر کے لکھا کہ وہ اپنے کلچر کے احساس برتری میں مبتلا ہیں، اور بنگالیوں کی طرف روئے سخن کر کے لکھا کہ ان میں تنگ نظری آگئی ہے۔ اردو بولنے والے مہاجروں سے اپیل کی کہ وہ احساس برتری کو چھوڑ کر بنگلہ زبان ضرور سیکھیں، بنگالیوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اردو زبان ضرور سیکھیں کیونکہ اردو زبان بھی ان کے کلچر کا ایک ضروری حصہ ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے لوگ اردو سیکھے بغیر مشرقی پاکستان کو عظیم تر نہیں بنا سکتے۔ پاکستان آبزرور میں وہاں کے مشہور رہنما حمید الحق چودھری صاحب کا بھی ایک مضمون شائع ہوا، جس میں انھوں نے مشرقی پاکستان کے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ تصادم محض اس لیے ہوا کہ ان میں رواداری وطنیت اور عزت نفس وغیرہ کا فقدان ہو گیا ہے، لیکن ایک بنگالی اخبار پوربودیش کا لب و لہجہ

اچھانہ تھا، اس کے ایک مضمون کا اردو ترجمہ مہاجروں کے اخبار ہماری آواز میں چھپا، اسمیں یہ لکھا گیا تھا کہ مہاجروں کو مشرقی پاکستان میں جگہ دے کر ان پر بڑا احسان کیا گیا ہے۔ اس لیے ان کو بنگالیوں کے سامنے جھکا رہنا چاہیے، اور وہ لیے لائے ہوئے کلچر کو خیرباد کہہ کر بنگالیوں میں ضم ہو جائیں، پاکستان آبزرور کے ایک اڈیٹوریل سے بھی یہ معلوم ہوا کہ کچھ اشتہارات ایسے بھی بنگالی زبان میں چھپے جن میں بنگالیوں کو یہ تلقین کی گئی تھی کہ وہ اردو بولنے والوں کو بالکل ختم کر دیں، پھر ایسے اشتہارات بھی تقسیم کیے گئے جن میں بنگالی جاگو اور ہماری بھاگو کا بھی نعرہ بلند کیا گیا، وہاں کے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار دی پیوپل کے ایک مضمون کو بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا، جس میں فساد کی ساری ذمہ داری مہاجروں پر ڈال دی گئی تھی، اس کے مضمون نگار کو شکایت تھی کہ ان کو حکومت نے محمد پور اور میرپور میں اجتماعی طور پر بسا کر سخت غلطی کی ان کو منتشر رکھنا چاہیے تھا، تاکہ وہ بنگالیوں میں رفتہ رفتہ ضم ہو جاتے۔ مضمون نگار نے یہ بھی لکھا کہ مہاجروں کو بسا کر بنگالیوں پر بڑا اقتصادی بار پڑ رہا ہے، اور ان کو کروڑوں روپے مہاجروں کی خاطر ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ مضمون مہاجروں کیلئے بڑا تلخ تھا، بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کی اس اعصابی جنگ میں کچھ مہاجروں کے حوصلے پست ہو گئے ہیں، اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کا مستقبل مشرقی بنگال میں تاریک ہے، لیکن کچھ مہاجر ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان چھوڑ کر تو یہاں آئے، اب یہاں سے کہاں جائیں، ان کے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لیے ان کی ایک تنظیم بھی قائم ہے، اس کا ایک کنونشن ۱۳ اکتوبر کو رنگ پور میں ہوا تھا، جس میں یہ مطالبے کیے گئے تھے۔ (۱) مشرقی پاکستان کے اردو بولنے والے طلبہ کے لیے ذریعۂ تعلیم اردو ہو، ڈھاکہ یونیورسٹی کی طرح چاٹگام اور راج شاہی یونیورسٹیوں میں بھی اردو کے شعبے قائم کیے جائیں۔ (۲) پالی ٹکنک، میڈیکل اور انجینیرنگ کالجوں میں مہاجروں کے بچوں کے لیے نشستیں مخصوص کر دی جائیں (۳) ایسے مقامات پر جہاں مہاجروں کی کثیر آبادی ہے، مثلاً میرپور، محمد پور، اسٹیشن ڈیہہ، خالص پور، یونر پاڑا، اور بوگرا وغیرہ میں پرائمری سے لے کر کالج تک تعلیم اردو میں ہو، سید پور کے ٹکنیکل ہائی اسکول میں اردو کو بھی مساوی حیثیت دی جائے (۴) ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں بنگلہ کے ساتھ اردو کو مساوی حیثیت دی جائے (۵) فوج، پولیس، عدلیہ، انتظامیہ اور دوسری ملازمتوں میں مہاجر امیدوار اردو

کے لیے کوٹہ مخصوص کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اخبار میں ان تجویزوں کو پڑھ کر مجھ کو ایسا محسوس ہوا کہ میں پاکستان کا کوئی اخبار نہیں پڑھ رہا ہوں بلکہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ہندوستان کے کسی مسلم اخبار کا مطالعہ کر رہا ہوں، ایک روز مہاجروں کے آرگن ہماری آواز کے نامہ نگار حفیظ الحق سے ملاقات ہوئی، وہ بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے جھگڑوں پر دیر تک تبصرہ کرتے رہے۔ ان کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کی صورت حال اس لیے بگڑتی چلی جا رہی ہے کہ قائد اعظم نے پاکستان کے بنیادی تصورات کے ساتھ جو مذہبی و اخلاقی، قومی اور وطنی فضا تیار کی تھی، وہ ان کے بعد قائم نہ رہ سکی، اسی روز ایک بہت ہی سلجھے اور دور اندیش بنگالی مسلمان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا تو وہ بھی کہنے لگے، ہمارے سامنے قومی سیرت و ذہن کا جو اعلیٰ تصور ہونا چاہیے، وہ ابھی تک نہیں پیدا کیا جا سکا ہے۔ یہ اعلیٰ تصور کسی مثالی نمونہ کے کردار رکھنے والے رہنما ہی کے ذریعہ ساری قوم کے سامنے آسکتا ہے، لیکن اس وقت ہماری ذہنی نشو و نما اخباروں کی لمبی لمبی سرخیوں اور جلسے جلوس کے نعروں سے ہو رہی ہے، وہ یہ بھی کہنے لگے کہ اس وقت ہم صرف دنیاوی منفعت اور مادی فوائد کے حصول میں لگے ہوئے ہیں، فیکٹریوں، کارخانوں، محکموں اور عمارتوں کی توسیع کا مطالبہ تو جاری ہے، مگر کسی کو ذاتی اخلاق و سیرت کو سنوارنے کے لیے کچھ کہیے تو وہ سننے کے لیے تیار نہیں، یہ مادی فوائد کی ہوس معلوم نہیں ہم کو کہاں لے جائے گی۔

بہت سے تعلیم یافتہ بنگالیوں سے ملنے کا موقع ملا جن میں ایک ریٹائرڈ ایس۔ پی تھے۔ کچھ سکریٹریٹ کے ملازمین اور کچھ ہائی کورٹ کے وکلا تھے، ان کی گفتگو کا رنگ کچھ اور تھا، ان سب کو شکایت تھی کہ مغربی پاکستان والوں نے ان کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے۔ بلکہ ظلم کیا ہے، ان کا خون چوس چوس کر اپنے یہاں غیر معمولی ترقی کرلی ہے۔ مشرقی پاکستان زر مبادلہ زیادہ حاصل کرتا ہے، لیکن ان کی ساری آمدنی کا نوے فی صد حصہ مغربی پاکستان میں خرچ ہوتا رہتا ہے، کراچی اور اسلام آباد کی ترقی ان ہی کے روپے سے ہوئی ہے۔ ملازمتوں میں ان کی آبادی کے تناسب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے۔ فوج میں ان کو جگہ نہیں دی جاتی، انگریزوں کے زمانے کی طرح وہ مغربی پاکستان کے محض محکوم ہیں۔ یہ کیسی بے انصافی ہے کہ ان کی آبادی تو اکثریت میں ہے

لیکن اکثریت اقلیت کے ماتحت ہو گئی ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ اکثریت کی حکومت ہونی چاہیے۔ اس لیے سارے مرکزی دفاتر حتیٰ کہ دارالسلطنت کو بھی مشرقی پاکستان ہی میں رہنا چاہیے۔ ان شکایتوں میں بڑی تلخی ہوتی تھی، اتفاق سے ان ہی دنوں لاہور کے ایک ہفتہ وار رسالہ "زندگی" کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس کے سرورق پر یہ لکھا ہوا تھا کہ اس کی اشاعت ۲۴ ہزار ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، مدیر مسئول الطاف حسین قریشی اور مدیر مجیب الرحمٰن شامی ہیں، اس میں ایک ایسا مضمون نظر سے گزرا جس میں مشرقی پاکستان کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس کی تردید کی گئی تھی کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کے مقابلہ میں .... زرمبادلہ زیادہ حاصل کرتا ہے، مثلاً اس میں ۶۴-۱۹۶۳ء تک کے برآمد کے اعداد و شمار دیے گئے تھے، اس کے بیان کے مطابق ۶۴-۱۹۶۳ء میں مشرقی پاکستان سے ایک ارب ۲۲ کروڑ اور مغربی پاکستان سے ایک ارب ۷ کروڑ کی برآمد ہوئی، لیکن مغربی پاکستان کی برآمد کی کمی کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ یہ اپنا مال باہر بھیجنے کے بجائے مشرقی پاکستان کو بھی سپلائی کرتا ہے۔ مثلاً ۶۳-۱۹۶۲ء میں مشرقی پاکستان نے مغربی پاکستان کو ۴۰ کروڑ ۱۹ لاکھ کا مال بھیجا تو مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو ۸۵ کروڑ ۱۵ لاکھ کا مال بھیجا۔ درآمد میں بھی مغربی پاکستان مشرقی پاکستان سے بڑھا ہوا ہے۔ مثلاً ۶۴-۱۹۶۳ء میں مشرقی پاکستان نے ایک ارب ۴۵ کروڑ کا مال درآمد کیا تو مغربی پاکستان نے ۲ ارب ۹۰ کروڑ کا مال درآمد کیا، پھر اس مضمون میں یہ بھی تھا کہ مرکزی حکومت زرمبادلہ مشرقی پاکستان میں زیادہ خرچ کر رہی ہے۔ مثلاً ۶۵-۱۹۶۴ء میں یہ زرمبادلہ مشرقی پاکستان میں ۳۹ کروڑ ۲۰ لاکھ خرچ ہوئے، اس کے مقابلہ میں مغربی پاکستان میں صرف ۲۷ کروڑ ۱۹ لاکھ خرچ کیے گئے۔ میں نے ایک روز ایک سنجیدہ بنگالی مسلمان سے اس مضمون کے اعداد و شمار کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ قابل اعتماد نہیں، یہ محض اخباری پروپیگنڈا ہے۔ پھر یہ بھی کہا کہ ہمارا بیرونی زرمبادلہ اب تو ہر سال کم ہوتا جائے گا، اس لیے کہ مغربی پاکستان تیزی سے ہر شعبہ میں ترقی کر رہا ہے، اور ہم بہت پچھڑتے جا رہے ہیں، تعلیم یافتہ مہاجروں کا بھی خیال تھا کہ ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان میں پہلے سے ضرور زیادہ ترقی ہوئی ہے، پھر بھی مرکزی حکومت نے بہت سی باتوں میں اس علاقہ کو کافی نظر انداز کیا ہے، جس سے مشرقی پاکستان

والوں کا اشتعال بڑی حد تک درست ہے۔ مگر مرکزی حکومت کے ایک بہت بڑے افسر سے بات ہوئی تو وہ یہ کہتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں ترقیاتی پروگرام کے لیے جو روپے مرکز سے آتے ہیں وہ اس عجلت اور مستعدی سے خرچ نہیں کیے جاتے جس طرح پاکستان کے مغربی حصہ میں ہوتے ہیں۔

ان گفتگوؤں کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر غلط فہمیاں دور ہوتی رہیں تو پھر بہت سی شکایتیں خود بخود رفع ہو جائیں، پاکستان مسلمانوں کی بڑی قربانیوں کے بعد بنا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کو پھر سے ایک مملکت ملی ہے، جس پر ان کو حکومت کرنے کا موقع ملا ہے۔ ان کی سلطنت ایک زمانہ میں کشمیر سے اراکان تک پھیل گئی تھی، لیکن وہ کھو بیٹھے۔ آخر ان کے زوال کے کیا اسباب ہوئے، حال اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے ماضی سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمان ۱۲۰۵ء سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان کے اندر قطب مینار، تخت طاؤس اور تاج محل تو ضرور بناتے رہے، لیکن انھوں نے کوئی ایسا مضبوط صالح، توانا اور صحت مند معاشرہ نہیں بنایا جو ان کو ہر حال میں سنوارے اور سنبھالے رکھتا، اسی لیے وہ منتشر اور پراگندہ ہو کر سب کچھ کھو بیٹھے، ماضی کے اس دردناک پہلو سے بہت کچھ سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کہتی ہے کہ معاشرہ اچھا ہوتا ہے تو سیاست بھی اچھی رہتی ہے۔ معاشرہ بگڑا ہوا ہو تو سیاست بھی بگڑی رہتی ہے۔ ارباب فکر کی تعلیم ہے کہ اچھے معاشرہ کے لیے پاک ضمیر، بلند خیال اور لطیف ذوق کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب قوم کی اصلی روح میں پاکیزگی بھی ہو، اقبال نے بھی کہا ہے۔ ع

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید　　ضمیر پاک وخیال بلند و ذوق لطیف

النبی الخاتم

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا ایک عظیم شاہکار جس میں ساڑھے چار سو عنوانات کے تحت سیرت نبوی کے پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور اُن میں سے تقریباً تین سو عنوانات کا تعلق ان جدید نظریات سے ہے جن سے النبی الخاتم صلعم کی پاک زندگی کو متعدد سیرت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اس کتاب سے پہلے کسی کتاب میں بحث نہیں کی گئی۔

ہر سہ رنگا دیدہ زیب ٹائٹل۔ رنگین آفسٹ طباعت۔ اعلیٰ کاغذ قیمت ۴/۵۰

خطبات مدارس

حیات نبوی کے مختلف پہلوؤں پر علامہ سید سلیمان ندوی کے خطبات جو مرحوم کے علم و تحقیق کا نچوڑ ہیں۔ قیمت صرف ۳/-

رحمت عالم

علامہ سید سلیمان ندوی نے یہ کتاب سیرت کے موضوع پر نہایت ہی آسان زبان میں خاص طور پر طلبا کے لیے لکھی ہے۔ قیمت ۱/۷۵

پیغمبر عالم

آنحضرت صلعم کی حیات طیبہ پر ایک مستند ناصحانہ کتاب — از مولانا عبدالصمد رحمانی۔ قیمت صرف ۶/۷۵

خلفاء راشدین

سیرت خلفاء راشدین پر حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی کی عظیم تصنیف جو مسلمانوں کے دلوں میں حضرات صحابہ اور بالخصوص چاروں خلفاء راشدین کی محبت و عظمت اور حسن عقیدت پیدا کرتی ہے اور ضمناً اس میں اس دور کے تمام اہم تاریخی واقعات بھی سامنے آجاتے ہیں اور ان کے صحیح اسباب بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ قیمت صرف ۲/۵۰

دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا

حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانی کی مشہور و معروف تصنیف۔ قیمت ۶/-

صدیق اکبر

از مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی "الفاروق" کے بعد اردو زبان میں سیرت صدیق اکبر کا جو خلا محسوس ہوتا تھا اس کو اس کتاب نے کما حقہ پر کر دیا ہے۔ ندوۃ المصنفین کی شائع کردہ ہے۔

قیمت صرف ۸/-

الفاروق

اس کتاب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مفصل سوانح حیات، عادات و خصائل، علمی کمالات، ان کے عہد کے تمام ملکی اور مالی اور فوجی انتظامات اور ان کے مجتہدانہ و مبصرانہ کارناموں کو نہایت شرح و بسط اور دلپسند و دلکش انداز کے ساتھ زیر قلم لایا گیا ہے۔

قیمت صرف ۶/-

سیرت عائشہؓ

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حالات زندگی اور اخلاق و عادات کی تفصیل اور ان کے علوم و مجتہدات پر بحث و تبصرہ۔ قیمت صرف ۴/-

سیرت عمرؓ بن عبدالعزیز

خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے مفصل سوانح زندگی اور ان کے عہد کے مجددانہ کارنامے۔ قیمت صرف ۴/-

سیرۃ النعمان

امام اعظمؒ کے سوانح حیات، ان کے فقہ کی خصوصیات اور ان کے شاگردوں کے حالات پر ایک جامع اور بصیرت افروز کتاب — مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی۔ قیمت ۳/۵۰

الغزالی

حجۃ الاسلام امام غزالی کی سوانح عمری علامہ شبلی نعمانی کے قلم سے ۵/-

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

Regd No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 38 NO. 2 MAY 1970

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/۰
پاکستان سے ۸/۵۰
صفحات ۵۶ صفحات
قیمت فی کاپی .... ۷۵ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۸ | بابتہ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ مطابق جون ۱۹۷۰ء | شمارہ ۳

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں
چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جون تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجکر ہمیں براہ راست اسکی اطلاع بھی دیں۔
انھیں وی پی اب نہیں کیا جا سکے گا لہذا ۲۰ جون تک چندہ کی اطلاع نہ ملنے کی صورت میں ہم مجبور ہوں گے کہ رسالہ بھیجنا بند کر دیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو
فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ــــــــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی

مئی کے دوسرے ہفتہ میں مہاراشٹر کے مسلمانوں پر جو قیامت گزری ہے قدرتی طور سے توقع کی جائے گی کہ اس دفعہ کا اداریہ اسی سانحہ پر نکلے گا اور فسادات کے موضوع پر کوئی کام کی بات سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ باتیں بہت ہو چکیں، لکھنے اور کہنے کے لیے اب کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ جو کچھ رہ گیا ہے ـــ اور تمام تر رہ ہی گیا ہے ـــ وہ صحیح قسم کی عملی جد وجہد ہے۔ اپنے گرد و پیش کے انسانوں کی طرف سے کوئی واقعہ بار بار پیش آئے تو وہ خود ہی بتانے لگتا ہے کہ کیوں کر پیش آ رہا ہے اور اسے روکنے کے لیے ہماری طرف سے صحیح تدبیر کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ فسادات کا واقعہ جس کی تکرار کا اب کوئی شمار نہیں رہ گیا ہے اور ملک کا کوئی خطّہ نہیں جہاں کے مسلمانوں کو اس کا کم و بیش تجربہ نہ ہو چکا ہو، اگر اس پر بھی اپنے اسباب ہم پر واضح کرنے اور جد وجہد کی صحیح سمت اور شکل پر مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہے تو پھر کسی تحریری اور تقریری رہنمائی سے بھی یہ کام انجام نہیں پا سکتا! اس لیے ہم مہاراشٹر کے اس دلدوز سانحہ کے سلسلہ میں بس مظلوم خاندانوں کے حق میں دُعا اور دلی ہمدردیوں کے اظہار پر اکتفا کرتے ہوئے اس سانحہ کے آغاز والے دن ہی کے ایک ایسے واقعہ کو آج کی صحبت کا موضوع بناتے ہیں، جس پر لکھنا شاید کچھ کام آئے۔

---

۸ مئی کے اخبارات میں پارلیمنٹ کی کارروائی کے سلسلہ کی یہ خبر شائع ہوئی ہے اور مصدّق ہو چکی ہے کہ ایک جن سنگھی ممبر نے مسلم پرسنل لا میں "اصلاحات" خصوصاً عورتوں کے حقوق سے متعلق اصلاحات کا جائزہ لیے جانے کے لیے ایک کمیشن مقرر کرنے کی تجویز وزارت قانون کے سامنے پیش کی، جس پر کچھ بحث و مباحثہ کے بعد وزیر قانون نے اعلان کیا کہ وہ اس تجویز پر غور کریں گے۔

ہمارے سامنے یہ سمجھنے کی تو کوئی گنجائش نہیں کہ ان صفحات میں کچھ لکھنے کی رسائی ایوانِ حکومت

یا عام ممبران پارلیمنٹ تک بھی ہو جائے گی۔ لیکن اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ حکمراں کانگریس سے تعلق رکھنے والے اور دوسرے مسلم ممبران میں سے کسی کی نظر ان سطروں پر پڑے اور ان میں کوئی کام کی بات ان حضرات کو نظر آئے تو پھر یہ اس جگہ تک اس کے پہونچنے کا ذریعہ بنیں، جہاں براہ راست یہ نہیں پہونچ سکتی۔

ایک جن سنگھی ممبر کے بارے میں تو کسی تعجب کا سوال ہی نہیں کہ اسے مسلمان عورتوں کی "ہمدردی" میں مسلم پرسنل لا کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے اس بات کی شرم کیوں نہیں آئی کہ یہ وہی مسلمان عورت ہے جو ملک کے طول و عرض میں آخری درجہ کی بے رحمی کے ساتھ ماری اور کاٹی جا رہی ہے، جو آن کی آن میں اپنے شوہر، باپ، بھائی، بیٹوں اور گھر در سے محروم کر دی جاتی ہے، جس کے شیر خوار بچے اس کی گود سے چھین کر آگ میں پھینک دیے جاتے ہیں، جس کی آبرو اُن وحشی غولوں کے رحم و کرم پر ہے جو ہر جگہ ہر وقت نمودار ہو سکتے ہیں، اور جس کا حالِ زار کسی بھی پہلو سے سننے اور دیکھنے کے لیے پتھر کا جگر چاہیئے ___ ٹھیک ہے ایک جن سنگھی کو اس میں شرم کی بات ہی نہ تھی۔ کیونکہ اس کی نظر میں تو یہ ہندوستان کا فخر ہے، اس کی قوم کے احساسِ خودی کی نمود ہے۔ اور اس نمود میں' اس کی جماعت کا سب سے بڑا ہاتھ ہے، مگر کیا اندرا حکومت کے ایک وزیر کے لیے بھی یہ شرمانے کی بات نہ تھی کہ جس عورت کے اُن عام شہری حقوق کا تحفظ کرنے میں حکومت کی ناکامی نہیں بے پروائی تمام حدود سے گزر چکی ہے جن کا تحفظ مسلمہ طور پر اُسی کی آخری ذمہ داری ہے، اُسی عورت کے ان حقوق کے لیے سرگرم ہونے کی تجویز پر توجہ کا اظہار کیا جائے جن کے بارے میں حکومت یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں کہ ان کے معاملے میں اس کو براہِ راست مداخلت کا حق ہے۔ جن کے بارے میں یہ بھی مسلّم نہیں کہ ان کا مبینہ عدم تحفظ حقیقت بھی ہے۔ اور جن کے بارے میں یہ کہنے کی جرأت تو اس عدم تحفظ کو حقیقت ماننے والا بھی کوئی شخص نہیں کر سکتا کہ اس سے بھی کچھ اسی درجہ کی مصیبت مسلمان عورت پر آئی ہوئی ہے جس درجہ کی مصیبت میں اسے فسادات نے ڈال رکھا ہے! کتنا ہی بڑھا چڑھا کر اس پرسنل لا کی "مصیبت" کو بیان کر دیجئے مگر کون ہے جو فسادات کی مصیبت کے مقابلہ میں اس کا نام لینے کی جرأت کر سکے؟

بیس برس سے زیادہ ہو گئے، یہ فسادات بڑھتے اور بھیانک سے بھیانک ہی ہوتے چلے جا رہے

ہیں۔ پہلے بڑے پیمانے کے فسادات خاصے خاصے وقفوں سے ہوتے تھے۔ اب سال میں کئی کئی فساد ایسے ہوتے ہیں جو پچھلے بڑے فسادات کا ریکارڈ توڑ دیتے ہیں۔ اور تو اور خود ملک کے صدر کی نظر میں ان کی غارت گری اس حد کو پہونچ چکی ہے کہ "جنگی سطح پر اس کا مقابلہ ہونا چاہیے" مگر ایک قانون بھی آج تک ایسا نہیں بنا جس سے بربریت کا یہ کھیل لوگوں کے لیے کچھ مشکل اور مہنگا ہی ہو جائے، کوئی شخص کیفر کردار کو نہیں پہونچا کسی ایک کا گلا قانون کے ہاتھ میں نہیں آتا جبکہ مقابلۃً کتنے ہی معمولی مسائل کے لیے دستوری ترمیمیں تک ہوگئی ہیں اور غیر ہنگامی مسائل تک کے لیے آرڈی نینس کا اختیار کام میں لے آیا گیا ہے ـــــ مسلمانوں کی موت وزیست کے مسئلہ میں اس بے فکری اور بہلوتہی کا مظاہرہ کرنے والی حکومت مسلمان عورتوں کو ان کے مردوں کی زیادتیوں" سے بچانے کی کسی تحریک پر غور وخوض ہی کی مستعدی کا بھی اظہار کرتی نظر آئے تو یہ اُن زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہے جو اصل فرائض سے پہلوتہی نے ڈال رکھے ہیں۔

فسادات کا زخم کھانے اور سراپا فریاد نظر آنے والی اُن عورتوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے جن کے حالِ زار کی چشم دید گواہی میں خود حکومتِ ہند کی سربراہ مسز گاندھی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اپنے اس دورِ حکومت میں بھی اور اس سے پہلے بھی ان عورتوں کے دلدوز مناظر جگہ جگہ ان کی نظر سے گزرے ہیں۔ انھوں نے خود اپنی زبان سے انھیں اپنی بپتا سنائی ہے۔ اور زبانِ حال سے فریاد کی ہے کہ ان کے تحفظ کے لیے کچھ ہونا چاہیئے! ـــــ ایک مسز گاندھی کیا اُن کے کئی ایک وزراء اور کانگریس کے جو مسلمان عورت کے اس حالِ زار کے عینی شاہد ہیں، پارٹی کے کتنے ممبران اور پارلیمنٹ کے دوسرے ارکان نکلیں گے جنھوں نے جگہ جگہ یہ منظر دیکھے اور فریاد سنی ہے! لیکن وہ کتنی مسلمان عورتیں ہیں جو اپنے پرسنل لا کے خلاف فریاد لے کر وزیر اعظم کی خدمت میں باریاب ہوئی ہوں؟ کسی دوسرے وزیر سے فریاد کی ہو؟ کسی ممبر پارلیمنٹ کا دامن پکڑا ہو کہ خدارا اس مصیبت سے نجات دلائیے؟ ملک کا انگریزی پریس جو مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا بڑا حامی ہے اُسی کے اوراق میں ڈھونڈیئے کہ کوئی قابلِ ذکر واقعہ اس طرح کا ملتا ہے؟ جبکہ اول الذکر نوعیت کے جتنے واقعات چاہییے آپ کو اسی پریس میں مل جائیں گے۔ اور بعض جگہ فوٹوؤں کے ساتھ مل جائیں گے! ـــــ پھر جس معاملہ میں مسلمان عورتوں کے انبوہ کے انبوہ سراپا فریاد بنے مدتوں سے ہر راستہ پر مل رہے ہیں۔ اور اس میں فریاد رسی مسلمہ طور سے حکومت کا اولین فریضہ بھی ہے۔ وہاں تو حکومت سچ مچ کا کوئی ایک قدم بھی آج تک نہ

ہلا سکی، مگر مسلم پرسنل لا کا معاملہ جس میں شکایت کا کوئی قابلِ ذکر ریکارڈ تک نہیں ہے اور نہ ہی حکومت یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ یہ اس کے دائرۂ مداخلت کی چیز ہے' اس میں "فرض شناسی" دکھلانے کے لیے ایک جن سنگھی ممبر کی تجویز بھی قابلِ اعتنا قرار دی جاتی ہے!

بہت صاف صاف بات ہو کہ ہندوستان میں جو کوئی بھی مسلمان عورت سے ہمدردی کا دعویٰ کرتا ہو اُسے سب سے پہلے فسادات کی اس مصیبت کے خلاف کھڑا ہونا چاہیے جو آزادی کے بعد سے لاتعداد مسلمان عورتوں کی زندگی کو جہنم بنا چکی ہے یا سرے سے زندگی ہی چھین چکی ہے اور جس کا سلسلہ ہر آنے والے دن میں خوفناک سے خوفناک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جب تک یہ عظیم اور ہمہ گیر مصیبت ہندوستان کی مسلمان عورت کے سر سے نہیں ٹلتی اُس وقت تک مسلم معاشرہ میں عورت کی مظلومیت کے خلاف حکومت کا دروازہ کھٹکھٹانے والا کوئی شخص ہو یا اُسے شرفِ توجہ بخشنے والی حکومت' دونوں میں سے کسی کو بھی یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ فعل کسی ادنیٰ اخلاص پر بھی محمول کیا جائے گا! کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے مسٹر سارڈیسائی نے قومی یکجہتی کونسل کی تنظیمی کمیٹی کے جلسہ میں کتنی سچی بات کہی ہے کہ

> "پہلا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو پورا پورا تحفظ نصیب ہو۔ اُس کے بعد یہ صحیح ہوگا کہ ہم اُن کی فرقہ داریت سے لڑنے اُٹھیں"۔ عــ۵

مسلم پرسنل لا کی مبینہ خرابیوں کے خلاف جنگ کے سلسلہ میں یہ بات یقیناً اس سے بھی زیادہ صحیح ہے!

مرکزی وزیر قانون نے جہاں ہمیں یہ شکایت کا موقع دیا ہو وہاں ایک بات بہت شکر گزاری کے قابل بھی اُن کی زبان سے نکلی ہے اور اُسے ہماری تلخ کامی میں ضائع نہیں ہو جانا چاہیے۔ مسٹر رام کنور گپتا (جن سنگھی ممبر) کی مذکورہ بالا تجویز کو وزیر قانون نے قابلِ غور تو قرار دے دیا مگر اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ دستور کے رہنما اصولوں کی جس دفعہ (۴۴) کی بنیاد پر مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ اُٹھایا جاتا ہے۔ اُس دفعہ کے ساتھ بنیادی حقوق والے باب کی دفعہ ۲۵ کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ تمام فرقوں کے وہ مذہبی حقوق جو انھیں دستور کے نفاذ کے وقت حاصل ہیں برقرار رکھے جائیں گے۔

عــ۵ ٹائمز آف انڈیا۔ ۲۲ مئی ۱۹۷۰ء

مسلمانوں کا کہنا ہے کہ ان کا پرسنل لا ایک مذہبی قانون ہے۔ یہ اگر واقعہ ہے تو پھر مسلم پرسنل لا میں مداخلت بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہوگی۔

حکومت کی طرف سے یہ اطمینان تو مسلمانوں کو بہت بار دلایا گیا تھا کہ ان کی مرضی کے بغیر ان کا پرسنل لا نہیں بدلا جائے گا، لیکن یہ بات کسی آئینی بنیاد کے حوالے سے نہیں کہی جاتی تھی، جس کے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے تھے اور قرائن سے اس کی تائید بھی ہوتی تھی کہ یہ موقف صرف سیاسی مصلحت سے اختیار کیا گیا ہے، جو بالکل ناقابلِ اعتبار چیز ہے۔ یہ اس دفعہ پہلی بار ہوا ہے کہ حکومت کی طرف سے اور وہ بھی پارلیمنٹ کے اندر اس آئینی دلیل کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے جسے مسلمان اس معاملہ میں تسلیم کیے جانے پر برابر زور دے رہے تھے۔ رہا یہ مسئلہ کہ مسلم پرسنل لا کی حیثیت ایک مذہبی قانون کی ہے یا نہیں تو اس معاملہ میں کسی ایسی بحث کی گنجائش نہیں ہے جو چل سکے۔ اہم بات بس اتنی ہی تھی کہ ہمارے سیکولر حکمراں دستور کے رہنما اصولوں کی دفعہ ۴۴ کے حوالے سے یہ بات آئینی طور پر فیصل شدہ نہ قرار دیں کہ پرسنل لا کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، اس لیے پارلیمنٹ کا یہ ریکارڈ ہمارے بہت کام کا ہے، اسے ہم کو اپنے مقدمہ کی مسل میں شامل کر لینا چاہیے۔

افسوس اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے بھی کچھ لوگ اس کے کوشاں ہیں کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کی کچھ "اصلاح" کرائی جائے۔ اس سلسلہ میں ایک باقاعدہ مسودۂ قانون 'پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی غرض سے مرتب کیا گیا ہے جو آج کل اخبارات میں زیر بحث بھی ہے۔ اس کے مرتب سپریم کورٹ میں پریکٹس کرنے والے ممبئی کے ایک مسٹر دانیال لطیفی ایڈووکیٹ ہیں جنھوں نے اس قسم کی خدمات کے لیے اپنے کچھ ہم خیالوں کے ساتھ ایک "مسلم ترقی پسند گروپ" دہلی میں بنا رکھا ہے۔ اس مسودۂ قانون کی تمہید میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں تجویز کردہ "اصلاحات" کی منظوری سے تمام ہندوستانیوں کے لیے ایک ہی سول کوڈ کی اس منزل کا راستہ ہموار ہوگا جس کی ہدایت دستور کے رہنما اصولوں میں حکومت کو دی گئی ہے۔

ان مسلمانوں کو داد دینے کے لیے الفاظ ہمیں نہیں مل رہے ہیں جو یکساں سول کوڈ کے معنیٰ ابھی نہیں سمجھ رہے ہیں جبکہ اس کی سب سے بڑی علمبردار جن سنگھ بن گئی ہے۔ اور یا اگر سمجھ رہے ہیں تو گویا مسلمانوں کی فلاح وہ اسی منزل میں دیکھتے ہیں جس منزل پر جن سنگھ انھیں دیکھنا چاہتی ہے —— جن سنگھ کا نقطۂ نظر تو یہی

کہ یکساں سول کوڈ بن جانے اور مسلمانوں کا جداگانہ پرسنل لا ختم ہوجانے سے اُن کے ملی تشخص کا کام ہی رفتہ رفتہ تمام ہوجائے گا، لیکن فوری طور پر جو فائدہ وہ اس نعرہ بازی میں دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کی جتنی جتنی مزاحمت اور مخالفت مسلمانوں کی طرف سے ہوگی اُس سے یہ تأثر جس کی فی الجملہ فضا پہلے ہی سے بنی ہوئی ہے اور بھی مؤثر پیمانہ پر دیا جاسکے گا کہ مسلمان علیٰحدگی پسند اور خود بیں ہیں۔ اور یہی ان فسادات کی جڑ ہے جن کا انھیں بیحد شکوہ ہے! یہ فائدہ اس شکل میں کتنا زیادہ نہ بڑھ جائے گا جبکہ کچھ مسلمان کہلانے والے بھی جن سنگھ کے ہم آواز ہوجائیں اور جب اُن کی بھی مخالفت مسلم رائے عامہ کی طرف سے کی جائے تو جن سنگھ کو اور بڑھ کر کہنے کا موقع ملے کہ مسلمانوں کی اکثریت سے علیٰحدگی پسندی کا یہ عالم ہے کہ خود اُن کے دانشور بھی یکساں سول کوڈ کی حمایت کریں تب بھی وہ اس پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں؟ — پس اگر یکساں سول کوڈ کی بابت تھوڑی دیر کو مان بھی لیا جائے کہ اس کی طرف بڑھنے میں مسلمانوں کی فلاح ہے تب بھی حالات کے اس نقشے میں جو لوگ مسلمانوں کی عام رائے کو اپنے حق میں کیے بغیر ایک ترمیمی بل لے کر پارلیمنٹ میں پہونچ جانا چاہتے ہیں وہ سوائے اس کے کس تبصرہ کے مستحق ہیں کہ نادانستہ ہی سہی جن سنگھ کے کھیل کو تقویت پہونچا رہے ہیں!

یہ اس مسئلہ کا وہ پہلو تھا جس پر اس بات کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ جو ترمیمات اس مسودۂ قانون کے ذریعہ مسلم پرسنل لا میں چاہی گئی ہیں وہ بالکل بجا اور قابل قبول ہی ہوں۔ لیکن اس پہلو سے بھی جب ہم غور کرنے چلتے ہیں تو ایک ایسی فیصلہ کن بات سامنے آجاتی ہے جس کے بعد مسودہ کی دفعات پر کسی تفصیلی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان دفعات پر متعدد تنقیدیں اخبارات میں نکلنے کے بعد صاحب مسودہ مسٹر دانیال لطیفی نے ۱۹ ارمئی کے ہندوستان ٹائمز میں ایک مضمون اپنے مسودہ کی حمایت میں سپرد قلم کیا ہے۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں :-

> "..... مسلمانوں کے زیادہ سوچنے سمجھنے والے طبقے میں یہ حقیقت روز بروز تسلیم شدہ بنتی جارہی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں بعض تبدیلیاں وقت کی فوری ضرورت ہیں۔ ایک طرف بڑے شہروں کی زندگی میں روایاتی پابندیوں کے خاتمہ نے غیر ذمہ دار اور نا فرض شناس مردوں کے لیے اُن کے معاشرتی فرائض سے پہلو تہی آسان کردی ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ قانون کی گرفت کو زیادہ سخت کیا جائے۔ دوسری طرف عورتوں میں تعلیم کی ترقی نے اُن کے اندر مردوں کی اُن زیادتیوں پر سر جھکانے کا مادہ کم کردیا ہے

جنھیں ان کی مائیں اور نانی دادئیں برداشت کرتی آئی تھیں خصوصاً جو عورتیں گھر سے باہر کی سرگرمیاں بھی رکھتی ہیں اُن کے حق میں تو یہ مسئلہ بالکل حقیقی ہے اور ایسی عورتوں کی تعداد میں اب روزمرہ اضافہ ہو رہا ہے"

لطیفی صاحب کے مسودۂ قانون پر تفصیلی تبصرہ کرنے والوں میں سے ایک صاحب نے (جو خدا کے فضل سے قدیم نہیں جدید ہی تعلیم یافتہ اور نئی سوسائٹی ہی کے آدمی ہیں) لکھا تھا کہ مسلم پرسنل لا کے بارے میں لطیفی صاحب کا تصوّرِ اصلاح بری طرح "عورت زدہ" ہے" یہ تبصرہ مسودہ کی روشنی میں ہر جہت سے چست تھا مگر اب مذکورۂ بالا اقتباس نے تو، جس میں ان تبدیل شدہ حالات کی وضاحت کی گئی ہے جن کی بنا پر مسلم پرسنل لا میں لطیفی صاحب کی تجویز کردہ اصلاحات کی ضرورت ہے، اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دکھایا کہ محض "عورت" نہیں ترقی پسند عورت اس مسودہ پر سوار ہے۔ یہ وضاحت سامنے آنے پر گویا لطیفی صاحب کا اپنا اقرار سامنے آجاتا ہے کہ ان کی مطلوبہ "اصلاحات" کے پیچھے بنیادی مسئلہ اس نئی "مسلمان عورت" کا ہے جو "شمعِ انجمن" بن کر رہنا چاہتی ہو۔ وہ اُس عورت کے مفاد کا تحفظ چاہتے ہیں جو "شوہر پرست بیوی" کے بجائے "پبلک پسند لیڈی" بننے اور "آؤٹ سائڈ کیریر" (OUT SIDE CAREER) بنانے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اور یہی وہ فیصلہ کن نقطہ ہو جس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ جن ترمیمات کا مقصد یہ ہو وہ اسلامی نقطۂ نظر سے درست ہو ہی نہیں سکتیں!

عورت کے حقوق کا تحفظ کرنے اور مرد کی زیادتیوں سے اُسے بچانے کے لیے مسلم پرسنل لا میں کسی زمانہ کے تغیرات کے تحت کچھ قانونی دفعات بڑھانے کی معقولیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بات کسی حال میں بھی معقول نہیں ٹھہرائی جا سکتی کہ عورت کے "حقوق" اور مرد کی "زیادتیوں" کا پیمانہ اسلام کی روشنی کے بجائے ہم اپنی مرضی سے طے کر لیں۔ عورت کے لیے جس آزادی کے حقوق اور جیسی مساوی حیثیت لطیفی صاحب مسلم پرسنل لا میں تسلیم کرانا چاہتے ہیں، کیا وہ قرآن و حدیث سے کوئی دلیل لا سکتے ہیں جس سے یہ آزادی اور یہ مساوات قابلِ تسلیم بنتی ہو؟ ایک آدھ جگہ اس مسودۂ قانون میں قرآن کا حوالہ بھی ملتا ہو، پھر کیا بات ہو کہ جس ماڈرن عورت کا مسئلہ خاص طور پر اُن کے بل کا محرک ہو، اسکے مطلوبہ خاص حقوق اور حیثیت کا تحفظ کرنے والی تجاویز میں ہم کو قرآن و حدیث کا کوئی حوالہ نہیں ملتا! کیا اس کا سبب بجز اسکے کچھ اور ہے کہ ان تجاویز کی حمایت قرآن و حدیث میں تلاش کرنی بے سود سمجھی گئی؟ ___ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے لیے

پیش کیے گئے جس مسودۂ قانون کا حال یہ ہو کہ اسمیں اسلامی شریعت کے دلائل سے استدلال ہی کو ضروری نہ سمجھا گیا ہو، اُس کی تجاویز اگر خلافِ شریعت نہ بھی ہوں تب بھی وہ قابلِ رد ہو۔ چہ جائیکہ تجاویز اور مقصد تجاویز دونوں اسلامی تعلیمات سے ٹکرا رہے ہوں۔

لطیفی صاحب کا ترمیمی بل پڑھنے کے بعد اس بارے میں کچھ زیادہ شک شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ پرسنل لا کے معاملات میں قرآن و حدیث کو سند بنانے کا اصول نہیں مانتے۔ لیکن افسوس یہ ہو کہ وہ یہ بات کھل کر نہیں کہتے حالانکہ ترقی پسندی تو بڑی جرأت مندی کی علامت ہو۔ اس کا آغاز ہی حقیقت میں کچھ جرأتوں سے ہوتا ہے۔ پھر یہ لطیفی صاحب اور اُنکے ساتھی کیسے ترقی پسند ہیں جو جرأت سے اپنا موقف ظاہر کرنے کے بجائے دھوکے کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ وہ بڑھے چڑھے حقوق اور حیثیت کا سبز باغ دکھا کر مسلمان عورت کو اپنی حمایت میں لینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ جرأت کی بات یہ تھی کہ وہ اپنا بنیادی موقف بھی سامنے لاتے اور پھر دیکھتے کہ اس چارہ پر کتنی مسلمان عورتیں اُن کے ساتھ آتی ہیں۔

حرفِ آخر۔ مسلمانوں کے جن سنگھی مہربان ہوں یا ترقی پسند مسلمان وہ اپنی اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کے سدباب کے لیے جو سب سے زیادہ بھروسہ کے قابل تدبیر ہو سکتی ہو وہ صرف ایک ہو کہ حکومت ہند جب اپنی پالیسی یہ بیان کرتی ہے جس کا حوالہ جن سنگھی ممبر کی مذکورۂ بالا تجویز پر وزیر قانون نے بھی دیا تھا، کہ کسی فرقہ کا پرسنل لا اُس کی متفقہ خواہش کے بغیر نہیں بدلا جائے گا، تو اور کچھ نہیں اس پالیسی ہی کو ایک ترمیم کے طور پر دستور کے رہنما اُصولوں کی دفعہ ۴۴ میں شامل کرنے کا مطالبہ حکومت سے کیا جائے۔ اس کام کی اولین ذمہ داری مسلم ممبران پارلیمنٹ، خصوصاً حکمران پارٹی کے ممبران پر عائد ہوتی ہے۔ انھیں اس مسئلہ پر غور کر کے فوری طور سے کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ اور ان کے علاوہ مسلم تنظیموں پر اس سلسلہ میں جس حد تک ذمہ داری عائد ہوتی ہو انھیں اُس کی طرف اسی اہمیت کے ساتھ توجہ دینی چاہیے۔ یہ آئے دن احتجاج اور بحث مباحثہ کہاں تک کیا جائے۔ کوئی مثبت قدم اُٹھا کر بھی دیکھنا چاہیے۔

حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کا وصال

يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

۱۴ ربیع الاول ۱۳۸۹ھ (۱ مئی ۱۹۶۹ء) پنجشنبہ کی صبح، مولانا علی میاں کے نام مولانا محمد عمران خانصاحب کا بھوپال سے دیا ہوا تار پہنچا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ "افسوس! حضرت صاحب کا وصال ہوگیا"

یہ بھوپال کے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی (علیہ الرحمۃ) کے وصال کی اطلاع تھی۔ چونکہ کسی علالت کی کوئی اطلاع پہلے سے نہیں تھی اس لیے کئی دن تک انتظار رہا کہ کچھ تفصیل کسی ذریعہ سے معلوم ہو لیکن کہیں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ پانچویں دن خود مولانا محمد عمران خانصاحب لکھنؤ تشریف لائے تو موصوف ہی سے تفصیل معلوم ہوئی۔

عام دستور کے مطابق اپنے تاثرات کے اظہار سے بہتر اور ناظرین کے لیے زیادہ مفید یہی معلوم ہوا کہ واقعۂ وفات کی وہ تفصیل ہی نذر ناظرین الفرقان کر دی جائے، جو مولانا محمد عمران خانصاحب سے معلوم ہوئی ہے۔

اگرچہ حضرت علیہ الرحمۃ کی عمر قمری حساب سے قریباً ۷۰ سال اور شمسی حساب سے قریباً ۶۸ سال تھی اور جسمانی طور پر بہت لاغر و نحیف بھی تھے لیکن ضعف پیری کا کوئی خاص اثر نہیں تھا، روحانی قوت نے جسم کو بھی چاق و چست بنا رکھا تھا۔ علاوہ اپنے خاص اشغال و اوراد اور معمولات کے جن میں دن رات کے اوقات کا بڑا حصہ مصروف رہتا تھا۔ مجلس میں گھنٹوں مسلسل تقریر فرماتے تھے۔ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے مرتب کیے ہوئے حضرت کے مجلسی ملفوظات جو "الفرقان" میں گزشتہ تین سالوں سے شائع ہوتے رہے ہیں، اُن میں بھی مولانا موصوف نے حضرت کی اس غیر معمولی کیفیت کا تذکرہ فرمایا ہے۔

ادھر کئی مہینے سے عام و خاص گفتگوؤں میں مسلسل اس کا اظہار فرماتے تھے کہ مجھے نوٹس مل چکا ہے، جانے کا وقت بہت قریب آگیا ہے بلکہ فرماتے تھے کہ زندگی کا وقت ختم ہو چکا ہے، میں اب موت میں چل رہا ہوں۔ گزشتہ مہینے میں مولانا علی میاں بعض رفقاء کے ساتھ ایک دن کے لیے بھوپال حضرت کی مجلس میں حاضر ہوئے تھے، حضرت علیہ الرحمۃ کی مجلس میں یہ مولانا کی آخری حاضری تھی، اس مجلس کے ملفوظات مولانا موصوف نے حضرت کے وصال سے صرف ہفتہ عشرہ پہلے الفرقان

میں اشاعت کے لیے دیے تھے چنانچہ وہ اس شمارہ میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس کے آخری ملفوظ میں بھی پوری صراحت کے ساتھ حضرت نے اپنے بارے میں یہی اطلاع دی تھی ـــ اور بھی مختلف ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس آخری دور میں اس احساس و یقین کا اتنا غلبہ تھا کہ قریب قریب ہر مجلس میں اس کا اظہار فرماتے تھے۔

مولانا محمد عمران خانصاحب نے بتایا قریباً دو مہینے پہلے حضرت کی طبیعت چند روز کچھ ناساز رہی تھی، ہاتھ پاؤں پر کچھ ورم ہو گیا تھا، جو علاج سے جاتا رہا تھا لیکن اس کے بعد سے جسمانی ضعف بہت بڑھ گیا تھا سہارے کے بغیر اُٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے، مگر نماز بالکل اُسی طرح پڑھتے تھے جس طرح ہمیشہ پڑھا کرتے تھے دیکھنے والے کو اس میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا، البتہ مسجد تشریف نہیں لے جا سکتے تھے گھر ہی پر جماعت ہوتی تھی ـــ اس شدید ضعف کے زمانے میں بھی معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا، بے خوابی کی شکایت ہو گئی تھی اس لیے رات کو نیند بہت دیر سے آتی تھی لیکن ہمیشہ کے معمول کے مطابق تہجد کے لیے اپنے وقت پر اُٹھ جاتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جو وقت سونے کا ہو اس وقت تو نیند نہیں آتی، اور جو وقت سونے کا نہیں جاگنے کا ہے اس وقت آتی ہے، تو میں اس کو پاس نہیں آنے دیتا۔

روزانہ کا معمول تھا کہ فجر کے بعد اشراق تک مصلے ہی پر اذکار و اوراد میں مشغول رہتے، اشراق پڑھ کے خانقاہ تشریف لے آتے، اور کسی کو ساتھ بٹھا کے پہلے قرآن مجید کے ۴۔ ۵ پارے سناتے، سننے والے صاحب اگر حافظ ہوتے تب بھی حضرت کے حکم کے مطابق قرآن مجید میں دیکھ کے سنتے۔ اس کے بعد گویا مجلس شروع ہو جاتی سب سے پہلے ایک دو رکوع کے بقدر قرآن مجید تلاوت فرما کر اس کا ترجمہ سناتے۔ اس کے لیے مولانا شیخ محمد صاحب جالندھری مرحوم کا ترجمہ سامنے رہتا، اسی سے پڑھ کر سناتے۔ اس کے بعد کوئی اور تفسیر سے (اکثر احسن التفاسیر سے، جو اردو کی بہت اچھی تفسیروں میں سے ہے) کچھ پڑھ کر سناتے اور اس ترجمہ اور تفسیر کے سلسلہ میں جو ضروری بات ہوتی اس کو درمیان میں فرماتے جاتے ـــ اس کے بعد حدیث کی کتاب (زیادہ تر مشکوٰۃ شریف) سے کوئی دوسرے صاحب پہلے حدیث کا عربی متن پڑھتے اور حضرت کتاب ہی سے اُس کا ترجمہ خود پڑھ کر سُناتے ـــ اس سب کے بعد امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں سے کوئی مکتوب پڑھ کر سُناتے اور کوئی دوسرے صاحب مکتوبات کے مطبوعہ اردو ترجمہ سے اس کا ترجمہ پڑھ کر سُناتے اور حضرت کو جو کچھ فرمانا ہوتا وہ فرماتے ـــ پھر حاضرین مجلس کے احوال اور ان کی سطح کا لحاظ فرماتے ہوئے اُس طرح کے حقائق و معارف بیان فرماتے جس کا نمونہ "یک دو ساعت صحبتے با اولیاء" کے زیر عنوان مولانا علی میاں کے مرتب کردہ ملفوظات میں ناظرین الفرقان پڑھتے رہے ہیں، اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس کی آخری قسط زیر نظر شمارہ ہی میں شائع ہو رہی ہے۔ یہ سب روزمرہ کا معمول تھا اور بس یہی حضرت کی مجلس تھی۔ اکثر ۱۰۔۱۱ بجے یہ سلسلہ ختم ہوتا تھا۔ اتوار کے دن

حاضرین کی تعداد بہت زیادہ ہوجاتی تھی، اس آخری دور میں چار چار سو اور پانچ پانچ سو تک پہونچ جاتی تھی اُس دن ارشادات کا سلسلہ بہت طویل ہوجاتا اور مجلس کبھی کبھی بارہ بجے کے بعد ختم ہوتی۔

آخری اتوار (۱۰ رمئی ۱۹۷۰ء) کو مجلس اور زیادہ طویل ہوئی اور اُس دن بار بار اس کا اظہار فرمایا کہ میرا وقت بالکل قریب آگیا ہو۔ اس سلسلہ میں ایک خاص والہانہ کیفیت کے ساتھ عارف رومی کے یہ اشعار بھی پڑھے ؎

این چہ خوش باشد کہ سوئے شہ روم　　　واصل درگاہ آں بیچوں شوم
وقت آمد کز جہانِ بیکسی　　　پائے کوبان سوئے بامِ او رسی

اس کے بعد پیر اور منگل کو بھی بالکل اپنے معمول کے مطابق مجلس ہوئی ــ بدھ کے دن بھی (جو حضرت کے وصال کا دن ہے) روزمرہ کی طرح مجلس ہوئی بلکہ اُس دن صبح کو قرآن مجید روزمرہ کے معمول سے بہت زیادہ قریباً دوگنا سنایا۔ دوسرے معمولات ترجمۂ قرآن، تفسیر و حدیث شریف میں بھی کچھ زیادتی رہی۔ اور حضرت گیارہ بجے کے بعد خانقاہ سے اٹھ کر اندر تشریف لے گئے۔ بہت خفیف سا کھانا تناول فرمایا۔

گھر میں ایک الماری ہو جس میں حضرت اپنی کچھ خاص پسندیدہ چیزیں محفوظ رکھتے تھے اور وہ ہمیشہ بند رہتی تھی سب سے چھوٹی صاحبزادی صاحبہ کو بلایا اور وہ الماری کھلوائی اُن سے فرمایا جو چیزیں تم ان میں سے لینا چاہو لے لو، اُنھوں نے کچھ چیزیں نکال لیں، اور معمول کے مطابق الماری کو بند کرنا چاہا تو فرمایا اب اس کو بند نہ کرو، کھلی رہنے دو۔

پھر صاحبزادے سعید میاں اور میاں مصباح الحسن سے کچھ باتیں فرماتے رہے۔ پھر قیلولہ کی نیت سے لیٹ گئے۔ دو ڈھائی بجے کے قریب اُٹھ کر ظہر کی نماز ادا فرمائی اور پھر لیٹ گئے ــ یہاں تک کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی ــ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا طبیعت پر گھبراہٹ ہے پھر اٹھ کر غسل خانہ تشریف لے گئے۔ وہاں چکر آگیا، چھوٹی صاحبزادی کو احساس ہوگیا، وہ اور اُن کی والدہ پہونچیں وہاں سے اُٹھا کر لایا گیا اور لٹا دیا گیا۔ اسوقت غشی کی سی کیفیت تھی۔ قریباً دس منٹ میں ہوش آگیا۔ ڈاکٹر قریشی صاحب کو بلایا گیا تھا وہ فوراً پہونچ گئے۔ حضرت نے اُن سے فرمایا کچھ نہیں بس چکر آگیا تھا۔ اس کے بعد کچھ پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ لیکن سنا نہیں جا سکا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ بڑے صاحبزادے صاحب نے صرف یہ آیت سنی وَكَأَيِّنْ مِّنْ دَابَّةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ ..... الآیۃ۔ اسی حالت میں پیٹ میں یا سینہ میں تکلیف شروع ہوئی۔ شدتِ کرب کی وجہ سے بار بار اُٹھانے کو اور لٹانے کو فرماتے۔ ڈاکٹر قریشی صاحب نے انجکشن تیار کیا اور عرض کیا کہ اسے لگوا لیجیے، ان شاء اللہ ابھی سکون ہوجائے گا۔ فرمایا کہ اچھا لگا دیجیے۔ اور پھر کچھ پڑھنے میں مشغول ہوگئے صاحبزادگان اور صاحبزادیاں اور اہلیہ محترمہ قریب تھیں، فرمایا کہ تم سب کلمہ شریف پڑھو، کلمۂ شہادت پڑھو، یٰسین شریف پڑھو۔ بڑے صاحبزادے محمد سعید صاحب نے یٰسین شریف شروع کردی۔ دوسرے حضرات کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت پڑھنے لگے۔ فرمایا اب میں رخصت ہورہا ہوں۔ گھٹنوں تک جان نکل چکی ہے۔ پھر کچھ پڑھنے میں مشغول ہوگئے جو سنا نہیں جا سکا، تھوڑی دیر کے بعد فرمایا اب ہاتھوں کی جان نکل چکی ہے۔ پھر موجودین کو مخاطب کرکے فرمایا تم سب گواہ رہنا اور پھر بلند آواز سے ایک دفعہ کلمۂ شہادت پڑھا۔ پھر قریباً ایک منٹ کے بعد بلند آواز سے فرمایا، السّلام علیکم۔ اور رُوح

واصل بحق ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

بڑی صاحبزادی صاحبہ ناگپور میں تھیں اُن کو ٹیلیفون سے اطلاع دی گئی، وہ اسی وقت بھوپال کے لیے روانہ ہوگئیں، اُن کے انتظار کی وجہ سے تدفین میں تاخیر کی گئی۔ اور جمعرات کے دن ۴ بجے سہ پہر جنازہ خانقاہ سے اٹھ سکا۔ جنازہ میں شریک ہونے والوں کا اندازہ پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک کیا گیا ہے۔ جنازہ کی نماز صاحبزادگان کے اصرار سے مولانا محمد عمران خاں صاحب نے پڑھائی اور عصر و مغرب کے درمیان تدفین عمل میں آئی۔

اس حادثہ سے حضرت کے اعزہ و متعلقین اور محبین و مسترشدین کا متاثر اور غمزدہ ہونا بالکل فطری بات ہے لیکن حق یہ ہے کہ حضرت تو اپنی مراد کو پہونچ گئے جس کے لیے روح مدت سے مشتاق اور بے چین تھی ـــــ حضرت کا ایک ملفوظ جو الفرقان میں اب سے بہت پہلے شائع ہوا تھا، اس کا اقتباس آج پھر پڑھ لیا جائے۔

ایک سلسلۂ کلام میں "حیاتِ طیبہ" اور دنیا و آخرت کی زندگی کی حقیقت بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"مجھے تعجب ہوتا ہے جب کوئی بڑھاپے کی شکایت کرتا ہے اور بڑے درد و حسرت سے کہتا ہے کہ اب مرنا ہی باقی ہے، وہ لڑکوں اور جوانوں کو رشک و حسرت سے دیکھتا ہے کہ کبھی میں بھی ایسا ہی تھا۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی کسان خوشی خوشی کھیتی کرے جب غلہ کاٹنے کا وقت آئے تو رنجیدہ اور مایوس ہو، حالانکہ یہ ساری محنت و مشقت اسی دن کے لیے تھی۔ ..... حدیث میں آیا ہے کہ جو اللہ کی ملاقات کا شائق ہو اللہ بھی اُس کی ملاقات کا مشتاق ہوتا ہے" مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَائَہٗ ـــــ حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بندے کے لیے خدا کی طرف سے سلام و پیام آتا ہے۔"

اسی سلسلۂ کلام میں پنجرہ میں بند ایک مینا کا یہ حال بیان فرما کر کہ وہ اُڑنے والی میناؤں کی آواز سُن کر پنجرہ میں بڑی بیتابی سے پھڑ پھڑایا کرتی تھی ـــــ فرمایا کہ

"یہی حالت روح کی ہے جب وہ اوپر کی آوازیں سنتی ہے اور اس کے کان میں صدا آتی ہو "یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی" تو وہ بھی پھڑپھڑاتی ہے اور اس کا دل بھی چاہتا ہے کہ پنجرہ کی تیلیاں توڑ کر وہ بھی اپنے آشیانے کی طرف پرواز کرے اور اپنے ہم جنسوں میں جا ملے۔"

(ملفوظات حضرت شاہ محمد یعقوبؒ صفحہ ۹۶-۹۹ (زیر طبع)

ایک دوسرے ملفوظ میں مومن کی موت کی یہ حقیقت بیان کرتے ہوئے کہ وہ دراصل وطن اصلی عالم آخرت اور اللہ تعالیٰ کے مقام قرب و رضا کی طرف منتقلی کا نام ہے ــــ ارشاد فرمایا۔

"میں تو جب کسی بندۂ خدا کے متعلق سنتا ہوں کہ وہ کلمہ پڑھتے ہوئے ایمان کے ساتھ دنیا سے گیا تو میرا مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے اور کبھی خیال آتا ہے کہ اس کے گھر مٹھائی بھیجوں۔"

(یکے از ساعت صحبتے با اہل دل صفحہ ۹ (زیر طبع)

ہم ــــ حضرت کے صاحبزادگان، صاحبزادیوں اور اہلیہ محترمہ اور تمام محبین و مسترشدین کی خدمت میں حضرت ہی کے یہ دو ملفوظ بطور تعزیت پیش کرتے ہیں ــــ اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازے، درجے بلند فرمائے اور اخلاف کو اُن کی اصل دولت کا وارث بنائے۔

انہ غفور رحیم شکور۔

محمد منظور نعمانی

۲۲ ربیع الاول سنہ ۹۰ھ ، ۳۰ مئی سنہ ۷۰ء

"یک دو ساعت صحبتے با اہلِ دل"

(کتابی شکل میں)

گزشتہ تین سالوں میں (یعنی ۸۷ھ، ۸۸ھ اور ۱۳۸۹ھ میں) حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ کے ملفوظات کی جو قسطیں الفرقان میں شائع ہوتی رہیں اُن کو پڑھ کر اللہ کے بہت سے مخلص بندوں نے ملفوظات کے مرتب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں کو بھی لکھا اور دفتر الفرقان کو بھی کہ ان تمام ملفوظات کو یکجا طور پر کتابی شکل میں ضرور شائع کیا جائے ـــــ مولانا موصوف نے گزشتہ رمضان مبارک میں اس کا ارادہ فرمالیا، جو ۱۲ قسطیں الفرقان میں شائع ہو چکی تھیں اُن پر نظرِ ثانی فرماکر ہر ملفوظ پر ایسا عنوان بھی قائم کیا جس میں حتی الوسع ملفوظ کی پوری روح آجائے ـــــ اس کے بعد گزشتہ ذیقعدہ (جنوری) میں مولانا نے پھر بھوپال کا سفر کیا اور پورا ایک ہفتہ صاحب ملفوظات کے دولتکدہ ہی پر مقیم رہے اور روزانہ کی مجلسوں کے ملفوظات خاص اہتمام سے قلمبند فرمائے، اور چونکہ کتابی اشاعت کا فیصلہ کیا جا چکا تھا اس لیے ان کو الفرقان میں شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا ـــــ پھر تقریباً پچاس صفحے کا خود مولانا نے مقدمہ بھی لکھا جس میں صاحب ملفوظات (حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ) کے نہایت سبق آموز سوانح حیات کے علاوہ حضرت کے والد ماجد حضرت شاہ ابو احمد مجددیؒ اور دادا حضرت شاہ خطیب احمد مجددیؒ اور پردادا حضرت شاہ رؤف احمد مجددی کا تذکرہ بھی بقدر کافی آگیا ہو۔ نیز تاریخ کی روشنی میں دکھایا گیا ہو کہ سلطنت مغلیہ کے سقوط کے بعد ہندوستان کی اسلامی ریاستوں میں مجددی سلسلہ کے مشائخ کا قیام محض اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ دین کی حفاظت اور اُمت کی اصلاح و تربیت کیلئے دراصل ایک غیبی انتظام تھا۔

چونکہ کئی مہینے پہلے سے صاحب ملفوظات (علیہ الرحمہ) کے ارشادات سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ دُنیا سے رخصتی کا وقت قریب ہے۔ اسلئے مولانا علی میاں کی بھی اور ادارہ الفرقان کی بھی انتہائی خواہش اور کوشش تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے یہ جلد سے جلد شائع ہو جائے لیکن اللہ کی مشیت کا فیصلہ یہی تھا کہ وہ حضرت کے وصال کے بعد ہی شائع ہو، ابھی کتابت ہو رہی تھی ۲۰۰ صفحے کی کتابت ہو چکی تھی کہ ۱۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۹۰ھ (۲۰ مئی ۱۹۷۰ء) کو حضرت واصل بحق ہو گئے۔ کچھ کتابت اب بھی باقی ہے لیکن طباعت شروع کرادی گئی ہے۔ اگر کوئی غیر معمولی حادثہ پیش نہ آگیا تو امید ہے کہ ان شاء اللہ مہینے سوا مہینے میں کتاب تیار ہو جائے گی اور الفرقان کی آئندہ اشاعت میں اس کی تیاری کی اطلاع دی جاسکے گی۔ ضخامت کا اندازہ تقریباً چار سو صفحات کا ہے۔

ادارۂ الفرقان اللہ تعالیٰ کے اس انعام و احسان کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہے کہ ان ملفوظات کو جو حضرت علیہ الرحمہ کے فیوض کا محفوظ خزانہ اور آپ کے باقیات صالحات ہیں پہلے الفرقان کے ذریعہ ہزاروں بندوں تک پہونچانے کی توفیق بخشی ـــــ اور اب کتابی شکل میں بھی ان کی اشاعت کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ اللّٰھم لک الحمد والمنۃ

ـــــ (ادارہ)

معارف الحدیث

(مسلسل)

کمزور اور حاجتمند طبقوں کے حقوق

یہاں تک جن طبقوں کے حقوق کا بیان کیا گیا یہ سب وہ تھے جن سے آدمی کا کوئی خاص تعلق اور واسطہ ہوتا ہے خواہ نسلی اور خونی رشتہ ہو یا ازدواجی رابطہ، یا ہمسائگی اور پڑوس کا تعلق، یا عارضی اور وقتی سنگھ ساتھ، ـــــ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں ان کے علاوہ تمام کمزور طبقوں اور ہر طرح کے حاجتمندوں، یتیموں، بیواؤں، غریبوں، مسکینوں، مظلوموں، آفت رسیدوں اور بیماروں وغیرہ کا بھی حق مقرر کیا گیا ہے، اور آپؐ نے اپنے پیروؤں کو اُن کی خدمت و خبرگیری اور ہمدردی و معاونت کی تلقین و تاکید فرمائی ہے اور اس کو اعلیٰ درجہ کی نیکی قرار دے کر اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے بڑے انعامات کی بشارت سنائی ہے ـــــ ان سب طبقوں سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات ذیل میں پڑھیئے!

مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کی کفالت و سرپرستی:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
اَلسَّاعِیْ عَلَى الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِیْنِ كَالْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ
اَحْسِبُهٗ قَالَ كَالْقَائِمِ لَا یَفْتُرُ وَكَالصَّائِمِ لَا یُفْطِرُ ـــــ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی بیچاری بے شوہر والی عورت یا کسی مسکین حاجتمند کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا بندہ (اللہ کے نزدیک اور اجر و ثواب میں) راہ خدا میں جہاد کرنے والے بندہ کے مثل ہے — اور میرا گمان ہے کہ یہ بھی فرمایا تھا کہ — اس قائم اللیل (یعنی شب بیدار) بندہ کی طرح ہے جو (عبادت اور شب خیزی میں) سستی نہ کرتا ہو' اور اس صائم الدہر بندہ کی طرح ہے جو ہمیشہ روزہ رکھتا ہو کبھی ناغہ نہ کرتا ہو۔　　(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) ہر شخص جو دین کی کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، جانتا ہے کہ راہ خدا میں جہاد و جانبازی بلند ترین عمل ہے' اسی طرح کسی بندہ کا یہ حال کہ اس کی راتیں عبادت میں کٹتی ہوں اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتا ہو، بڑا ہی قابل رشک حال ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک یہی درجہ اور مقام ان لوگوں کا بھی ہے جو کسی حاجتمند مسکین یا کسی ایسی لاوارث عورت کی خدمت و اعانت کے لیے جس کے سر پر شوہر کا سایہ نہ ہو دوڑ دھوپ کریں، جس کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود محنت کر کے کمائیں اور ان پر خرچ کریں' اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دوسرے لوگوں کو ان کی خبر گیری اور اعانت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کریں — بلاشبہ وہ بندے بڑے محروم ہیں جو اس حدیث کے علم میں آ جانے کے بعد بھی اس سعادت سے محروم رہیں۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ لَهُ اَوْلِغَيْرِهٖ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا وَ اَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى وَفَرَّجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا۔

رواہ البخاری

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اور اپنے یا پرائے یتیم کی کفالت کرنے والا آدمی جنت میں اس طرح (قریب قریب) ہوں گے اور آپ نے اپنی انگشت شہادت اور بیچ والی انگلی سے اشارہ

کر کے بتلایا اور اُن کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی۔　　　(صحیح بخاری)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کلمہ والی انگلی اور اُس کے برابر کی بیچ والی انگلی اس طرح اٹھا کر اُن کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا، بتلایا کہ جتنا تھوڑا سا فاصلہ اور فرق تم میری ان دو انگلیوں کے درمیان دیکھتے ہو بس اتنا ہی فاصلہ اور فرق جنت میں میرے اور اُس مردِ مومن کے مقام میں ہوگا جو اللہ کے لیے اس دُنیا میں کسی یتیم کی کفالت اور پرورش کا بوجھ اٹھائے خواہ وہ یتیم اس کا اپنا ہو (جیسے پوتا یا بھتیجہ وغیرہ) یا پرایا ہو یعنی جس کے ساتھ رشتہ داری وغیرہ کا کوئی خاص تعلق نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ان حقیقتوں پر یقین نصیب فرمائے اور وہ سعادت میسر فرمائے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ارشادات میں ترغیب دی ہے۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَبَضَ یَتِیْمًا مِنْ بَیْنِ الْمُسْلِمِیْنَ اِلٰی طَعَامِہٖ وَشَرَابِہٖ اَدْخَلَہُ اللّٰہُ الْجَنَّۃَ اَلْبَتَّۃَ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ قَدْ عَمِلَ ذَنْبًا لَا یُغْفَرُ

______ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے جس بندہ نے مسلمانوں میں سے کسی یتیم بچہ کو لے لیا اور اپنے کھانے پینے میں شریک کر لیا تو اللہ تعالیٰ اُس کو ضرور بالضرور جنت میں داخل کرے گا ___ الا یہ کہ اُس نے کوئی ایسا جرم کیا ہو جو ناقابل معافی ہو۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث سے صراحۃً معلوم ہوا کہ یتیم کی کفالت و پرورش پر داخلۂ جنت کی قطعی بشارت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ آدمی کسی ایسے سخت گناہ کا مرتکب نہ ہو جو اللہ کے نزدیک ناقابلِ معافی ہو (جیسے شرک و کفر اور خونِ ناحق وغیرہ) دراصل یہ شرط اس طرح کی تمام تبشیری حدیثوں میں ملحوظ ہوتی ہے۔ اگرچہ الفاظ میں مذکور نہ ہو، بہرحال اس طرح کی تمام ترغیبی اور تبشیری حدیثوں میں بطور قاعدہ کلیہ کے اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَسَحَ رَأْسَ یَتِیْمٍ لَمْ یَمْسَحْہُ اِلَّا لِلّٰہِ کَانَ لَہٗ بِکُلِّ شَعْرَۃٍ یَمُرُّ عَلَیْھَا یَدُہٗ حَسَنَاتٌ وَمَنْ اَحْسَنَ اِلٰی یَتِیْمَۃٍ اَوْ یَتِیْمٍ عِنْدَہٗ کُنْتُ اَنَا وَھُوَ فِی الْجَنَّۃِ کَھَاتَیْنِ وَقَرَنَ بَیْنَ اِصْبَعَیْہِ۔

——— رواہ احمد والترمذی

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی یتیم کے سر پر صرف اللہ کے لیے ہاتھ پھیرا تو سر کے جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرا تو ہر ہر بال کے حساب سے اس کی نیکیاں ثابت ہوں گی اور جس نے اپنے پاس رہنے والی کسی یتیم بچی یا یتیم بچے کے ساتھ بہتر سلوک کیا تو میں اور وہ آدمی جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے اور آپ نے اپنی دو انگلیوں کو ملا کر بتایا اور دکھایا (کہ ان دو انگلیوں کی طرح بالکل پاس پاس ہوں گے)

(مسند احمد، جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ یتیموں کے ساتھ حسن سلوک پر جو روح پرور بشارت اس حدیث میں سنائی گئی ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ یہ حسن سلوک خالصاً لوجہ اللہ ہو۔ اس کو بھی قاعدہ کلیہ کی طرح اس طرح کی تمام ترغیبی اور تبشیری حدیثوں میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیْرُ بَیْتٍ فِی الْمُسْلِمِیْنَ بَیْتٌ فِیْہِ یَتِیْمٌ یُحْسَنُ اِلَیْہِ وَشَرُّ بَیْتٍ فِی الْمُسْلِمِیْنَ بَیْتٌ فِیْہِ یَتِیْمٌ یُسَاءُ اِلَیْہِ ——— رواہ ابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمانوں کے گھرانوں میں بہترین وہ گھرانہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو اور مسلمانوں کے گھروں میں بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔ (سنن ابن ماجہ)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلاً شَکَا اِلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَسْوَةَ قَلْبِهٖ قَالَ اِمْسَحْ رَأْسَ الْیَتِیْمِ وَاَطْعِمِ الْمِسْکِیْنَ ــــ رواہ احمد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قساوت قلبی اور سخت دلی کی شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ یتیموں کے سر پر (پیار کا) ہاتھ پھیرا کرو اور مسکینوں حاجتمندوں کو کھانا کھلایا کرو۔ (مسند احمد)

تشریح) یتیموں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرنا اور مسکینوں حاجتمندوں کو کھانا کھلانا دراصل وہ اعمال ہیں جو دل کی دردمندی اور ترحم کے جذبہ سے صادر ہوتے ہیں، لیکن اگر کسی کا دل دردمندی اور جذبۂ ترحم سے خالی ہو اور اُس کے بجائے اس میں قساوت ہو تو اُس کا علاج یہ ہے کہ وہ عزم اور قوتِ ارادی سے کام لے کر یہ اعمال کرے، انشاء اللہ اُس کے دل کی قساوت دردمندی سے بدل جائے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اسی طریق علاج کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

محتاجوں، بیماروں اور مصیبت زدوں کی خدمت و اعانت:۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْمُسْلِمُ اَخُوْ الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُهٗ وَلَا یُسْلِمُهٗ وَمَنْ کَانَ فِیْ حَاجَةِ اَخِیْهِ کَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهٖ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ کُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ کُرْبَةً مِنْ کُرُبَاتِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔

ــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے (اس لیے) نہ تو خود اُس پر ظلم و زیادتی کرے نہ دوسروں کا مظلوم بننے کے لیے اس کو بے یارو مددگار چھوڑے۔ اور جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کی حاجت روائی کرے گا۔ اور جو کسی مسلمان کی تکلیف اور مصیبت کو دور کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے اُس کی کسی

مصیبت کو دور کرے گا، اور جو کسی مسلمان کی پردہ داری کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُسکی پردہ داری کرے گا (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْیَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَمَنْ یَسَّرَ عَلٰی مُعْسِرٍ یَسَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ فِیْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْهِ ــــــ رواہ ابوداؤد والترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کسی مسلمان کی کوئی دنیوی تکلیف اور پریشانی دور کرے گا اللہ تعالیٰ (اُس کے عوض) قیامت کے دن کی تکلیف اور پریشانی سے اُس کو نجات دے گا، اور جو (قرضخواہ اپنے) کسی تنگ دست مقروض کو (اپنے قرضے کی وصولی کے سلسلہ میں) سہولت دے گا تو اللہ تعالےٰ اُس کو دُنیا اور آخرت میں سہولت دے گا، اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ دُنیا اور آخرت میں اُس کی پردہ پوشی کرے گا، اور جو کوئی بندہ جب تک اپنے کسی بھائی کی امداد و اعانت کرتا رہے گا اللہ تعالیٰ اُس کی مدد کرتا رہے گا۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا عَلٰی عُرْیٍ كَسَاهُ اللّٰهُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ وَاَیُّمَا مُسْلِمٍ اَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰی جُوْعٍ اَطْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ وَاَیُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰی مُسْلِمًا عَلٰی ظَمَاٍ سَقَاهُ اللّٰهُ مِنَ الرَّحِیْقِ الْمَخْتُوْمِ۔

ــــــ رواہ ابوداؤد والترمذی

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان کسی مسلمان کو عریانی کی حالت میں کپڑے پہنائے اللہ تعالےٰ اس کو جنت کے سبز جوڑے عطا فرمائے گا اور جو مسلمان کسی مسلمان کو بھوک کی حالت میں کھانا کھلائے

اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے پھل اور میوے کھلائے گا، اور جو مسلمان کسی مسلمان کو پیاس کی حالت میں پانی (یا کوئی مشروب) پلائے اللہ تعالیٰ اُس کو نہایت نفیس (جنت کی) شراب طہور پلائے گا جس پر غیبی مہر لگی ہوگی۔　　(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

عَنْ اَبِیْ مُوْسیٰ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَطْعِمُوْا الْجَائِعَ وَعُوْدُوا الْمَرِیْضَ وَفُکُّوا الْعَانِیَ　　(رواہ البخاری)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، بیماروں کی خبر لو (اور دیکھ بھال کرو) اور اسیروں قیدیوں کو رہائی دلانے کی کوشش کرو۔　　(صحیح بخاری)

(تشریح) اس حدیث میں بھوکوں کو کھانا کھلانے کے علاوہ مریضوں کی عیادت اور قیدیوں کو رہا کرانے کی بھی تلقین فرمائی گئی ہے۔ "عیادت" کے متعلق یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ہمارے عرف اور محاورہ میں عیادت کا مطلب صرف بیمار پرسی یعنی مریض کا حال دریافت کرنا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں اس کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے اور بیمار پرسی اور خبر گیری کے علاوہ تیمارداری بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے اس لیے اس حدیث میں مریضوں کی عیادت کا جو حکم دیا گیا ہے اُس کا مطلب صرف بیمار پرسی نہیں ہے بلکہ تیمار داری اور حسب استطاعت دوا علاج کی فکر بھی اس میں شامل ہے ــــ اسی طرح قیدیوں کو رہا کرانے کا جو حکم اس حدیث میں دیا گیا ہے اُس کے بارے میں بھی یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس سے وہی اسیران بلا مراد ہیں جو ناحق قید میں رکھے گئے ہوں یا کم از کم ان کے رہا ہو جانے سے خیر کی اُمید ہو، بلاشبہ ایسے گرفتاران بلا کا رہا کرانا اور اُن کو آزادی دلانا بڑا کار ثواب ہو۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ قَالَ یَا رَبِّ کَیْفَ اَعُوْدُکَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ عَبْدِیْ فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْہُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّکَ لَوْ عُدْتَّہٗ لَوَجَدْتَّنِیْ عِنْدَہٗ یَا ابْنَ اٰدَمَ اِسْتَطْعَمْتُکَ فَلَمْ تُطْعِمْنِیْ قَالَ یَا رَبِّ کَیْفَ اُطْعِمُکَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّہٗ

اِسْتَطْعَمَكَ عَبْدِىْ فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ اَطْعَمْتَهٗ لَوَجَدْتَّ ذٰلِكَ عِنْدِىْ، يَا ابْنَ آدَمَ اِسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِىْ قَالَ يَارَبِّ كَيْفَ اَسْقِيْكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ قَالَ اِسْتَسْقَاكَ عَبْدِىْ فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهٖ اَمَا اِنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهٗ وَجَدْتَّ ذٰلِكَ عِنْدِىْ

رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرزند آدم سے فرمائے گا کہ اے ابن آدم میں بیمار پڑا تھا تو نے میری خبر نہیں لی، بندہ عرض کرے گا اے میرے مالک اور پروردگار میں کیسے تیری تیمارداری یا بیمار پرسی کر سکتا تھا تو تو رب العالمین ہے (بیماری کا تجھ سے کیا واسطہ اور تیری بارگاہ میں اس کا کہاں گزر!) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے علم نہیں ہوا تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تھا، تو نے اس کی عیادت نہیں کی اور خبر نہیں لی، کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اس کی خبر لیتا اور تیمارداری کرتا تو مجھے اس کے پاس ہی پاتا۔۔۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا (خداوندا) میں تجھے کیسے کھانا کھلا سکتا تھا تو تو رب العٰلمین ہے (تجھے کھانے سے کیا واسطہ) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے اس کو کھانا نہیں دیا، کیا تجھے علم نہیں ہے کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو اس کو میرے پاس پالیتا۔ اے ابن آدم میں نے پینے کے لیے تجھ سے (پانی) مانگا تھا، تو نے مجھے نہیں پلایا، بندہ عرض کرے گا میں تجھے کیسے پلاتا تو تو رب العٰلمین ہے (تجھے پینے سے کیا واسطہ) اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پینے کے لیے مانگا تھا تو نے اس کو نہیں پلایا، سن اگر تو اس کو پلا دیتا تو اس کو میرے پاس پالیتا۔ (صحیح مسلم)

تشریح) اس حدیث میں جس مؤثر اور غیر معمولی انداز میں کس میرس بیماروں کی عیادت و تیمارداری اور بھوکوں پیاسوں کو کھلانے پلانے کی ترغیب دی گئی ہے اس میں غور کرنے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت میں ان معاشرتی اعمال اور حاجتمند بندوں کی خدمت و اعانت کی کسقدر اہمیت ہے اور ان کا درجہ کتنا بلند ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ جو کسی بیمار کی خدمت و عیادت کرے گا وہ خدا کو اس کے پاس پائے گا اور اُسے خدا مل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

یک زمانہ صحبتے با اہل دل

ملفوظات حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی دامت برکاتہم

مرتبہ مولوی سید محمد ثانی الحسنی[1]

۲۷ محرم الحرام ۱۳۹۰ھ مطابق ۵ اپریل ۱۹۷۰ء بروز یکشنبہ ½ ۹ بجے صبح۔

حسب معمول اتوار کو خانقاہ مجددیہ میں عمومی مجلس ہوئی۔ اتوار ہونے کی وجہ سے خانقاہ حاضرین سے بھری ہوئی تھی، ہر طبقہ اور درجہ کے لوگ تھے۔ حسب ذیل حضرات قابل ذکر ہیں۔ مولانا محمد عمران خاں صاحب، مولوی محمد نعمان صاحب، محمد ثانی، نواب سید ظہور الحسن صاحب، سید معشوق علی صاحب، مولوی محمد مرتضیٰ صاحب ناظر کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، یوسف صاحب تاجر (کویت)

علم اور عمل فرمایا لوگ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پانی دم کر کے دے دیجیے، ہمیں کہتا ہوں کہ میاں خود ہی دم کر لو اللہ نے تم کو بھی علم دے رکھا ہے میرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے۔ دم کا پانی مانگنے کی مثال ایسی ہے کہ دیوار میں ایک چوکھٹا (بورڈ) لگا ہے آپ اس کو پڑھنا جانتے ہیں مگر خود نہیں پڑھتے

---

[1] بھوپال کے اس سفر میں مولانا علی میاں کی طبیعت مضمحل رہی اس لیے اس سفر کی مجلس وہ قلمبند نہیں کر سکے، اتوار (۲۷ محرم) کی یہ مجلس مولانا کے ایما سے اُن کے عزیز مولوی محمد ثانی صاحب نے مرتب کی تھی۔ (ادارہ)

اور مجھ سے کہتے ہیں ذرا اس کو پڑھ دیجئے میں کہتا ہوں میاں ذرا خود بورڈ پر نظر ڈالو اور خود پڑھ لو، اس کو دیکھ سکتے ہو، اس کو پڑھ سکتے ہو، پھر میرے محتاج ہو، حالانکہ وہ تمہارے سامنے ہے مگر ادھر کوئی توجہ نہیں کرتا۔

ماحول کا اثر فرمایا آدمی جس ماحول میں رہتا ہے عموماً اس میں رنگ جاتا ہے اس کا ذہن اور دل و دماغ اسی میں چلتا ہے اور سارے اعضاء اس سے مانوس ہو جاتے ہیں وہ جب دوسرے ماحول میں جاتا ہے تو بڑی اجنبیت محسوس کرتا ہے اور تکلیف و گھٹن ہوتی ہے حضرت مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک چمڑا پکانے والے کا لڑکا چمڑے دار ماحول سے اتنا متاثر تھا کہ ایک بار وہ عطر کی دکان سے گزرا تو عطر کی خوشبو کا متحمل نہ ہو سکا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا جب باپ نے پرانے چمڑے کو سنگھایا تو ہوش آیا۔ یہی حال آج کے گندے ماحول کا ہے کہ اس ماحول میں پرورش پانے والا اچھے اور صالح ماحول میں گھٹن محسوس کرتا ہے اور وہ ماحول اس کے ذہن و دماغ پر بوجھ معلوم ہوتا ہے۔

فطرت صحیحہ غالب رہتی ہے انسان کی فطرت صحیح ہوتی ہے ماحول اس فطرت کو بدلتا ہے مگر وہ فطرت غالب آجاتی ہے جیسے قطب نما ہوتا ہے۔ تم جس سمت میں اس کو رکھو گے قطب نما کی سوئی قطب کی طرف مڑ جائے گی، تم گھماتے رہو مگر سوئی اپنے مرکز ہی کی طرف جائے گی۔ میری خانقاہ میں ایک دیہاتی آیا، میں نے اس سے پوچھا تمہارے یہاں بارش ہوئی، اس نے بے تکلف جواب دیا ہم نے خدا کے کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ کرتے ہیں تو بارش بھی خدا نے روک دی اور کہدیا کہ سب کچھ تم لوگ کرتے ہو تو بارش بھی برسا لو۔ دیکھئے اس دیہاتی کی فطرت صحیح تھی اس کا ذہن ادھر ہی گیا اور ایسا جواب دیا۔

کبھی عادت فطرت بن جاتی ہے حقیقت حال یہ ہے کہ فطرت تو اپنے صحیح راستہ پر جا رہی ہے اس کو بتکلف غلط راستہ پر ڈالا جاتا ہے اور غلط کاموں کا عادی بنایا جاتا ہے، حیدرآباد میں ایک رئیس نے ہتھنی خریدی تھی وہ ہتھنی کسی تماشہ والے کی تھی اس کو عادت تھی کہ ایک پتھر پر چاروں پاؤں سمیٹ کر بیٹھتی تھی حالانکہ اس کا بیٹھنا باعث تکلیف تھا اور وہ یہ عمل بہ تکلف کرتی تھی لیکن اس طرح بیٹھنا اس کی عادت میں داخل ہو چکا تھا، اسی طرح اور عادتوں کا حال ہے کہ وہ عادت بنتے بنتے فطرت ہو جاتی ہیں اور ان عادتوں کو چھوڑنا

ناگوار ہوتا ہے۔ عادتوں کو چھوڑنا ایسا ہے جیسے کانٹوں پر چادر ڈال کر کھینچنا۔

ماحول سے لڑنا چاہیے لوگ فطرت کو برا کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو فطرت کے برے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ فطرت سب کی صحیح ہے ماحول خراب ہے۔ اس خراب ماحول میں رہ کر فطرت کی طرف رُخ کرنا ہے۔ صحابہ کرام کی فطرت صحیح تھی ماحول خراب تھا، انھوں نے عزم اور یقین سے اس خراب ماحول میں اپنے رُخ کو فطرت صحیحہ کی طرف کیا اور ماحول کا مقابلہ کیا۔ ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میرا تبادلہ ایسی جگہ ہو گیا ہے جہاں کا ماحول بہت خراب ہے۔ میں نے کہا ماحول خراب ہے تو کیا تمھاری فطرت تو صحیح ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے لاؤ مٹھائی کھلاؤ، معانقہ کرو، بہت اچھی جگہ تمھاری بدلی ہوئی، تم کو تو وہ ماحول نصیب ہوا جو صحابہ کرام کو نصیب ہوا تھا صحابہ کرام نے اسی ماحول میں کام کیا اور ماحول کو بدلا تم بھی صحابہ کے نقش قدم پر چلو غلط ماحول میں رہ کر دستور ہے کماؤ، اگر بیروں کے گھر میں پیدا ہو کر اس میں رہے تو کیا کمال ہے۔

چو دل با خدا بست تو خلوت نشینی

بہت سے تو ایسے ہیں کہ گھر میں ہر وقت اللہ و رسول کا تذکرہ سنتے ہیں اچھے لوگوں کی گود میں پرورش پاتے ہیں، صالح ماحول میں زندگی گزارتے ہیں مگر دوسرے غلط ماحول کی طرف ڈھلک جاتے ہیں کیونکہ ان کے رجحانات غلط ماحول کی طرف ہوتے ہیں۔

نازک پرزہ یا بالکمانی فرمایا میں نے بار ہا عرض کیا ہے کہ انسان میں ایک بال کمانی ہے مگر کسی نے یہ نہ پوچھا کہ انسان کی بال کمانی کیا ہوتی ہے؟ جس طرح بڑی بڑی مشینری میں ایک چھوٹا اور نازک پرزہ ہوتا ہے اس نازک پرزے کے سہارے پوری مشین چلتی ہے اگر وہ پرزہ خراب ہو یا کسی مشین کی بال کمانی میں تنکا اڑ جائے تو پوری مشین رک جاتی ہے، اسی طرح انسان کی بال کمانی یا نازک پرزہ اس کا دل ہے بس اس نازک پرزہ یا بال کمانی کو صاف رکھو اور اپنی جگہ پر رکھو سارا جسم اپنی جگہ کام کرے گا، خدا کی محبت و خوف کی دولت ملے گی۔ یاد رکھو کہ جن کی نظر خدا کی عظمت و طاقت پر رہتی ہے وہ دُنیا کی کسی طاقت سے نہیں ڈرتے نہ کسی دنیاوی ہیبت سے مرعوب ہوتے ہیں، مقدمہ پیش ہے وکیل و گواہ حاضر ہیں ایک خدا سے ڈرنے والا کبھی نہ گھبرائے گا کیونکہ

اس کو خدا پر بھروسہ ہے۔ جو لوگ حاکموں کے سامنے جاتے کپکپاتے ہیں ان کے دل میں حاکموں کی ہیبت ہوتی ہے۔ حاکموں کی ہیبت خدا کی عظمت کے احساس سے محروم کر دیتی ہے۔ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے میرے ایک ملنے والے ہیں۔ ماشاء اللہ چہرے پر داڑھی ہے، شروع شروع لوگوں نے کہا کہ بایں صورت تم انجینیرنگ کیسے پڑھو گے؟ مگر وہ خدا سے ڈرنے والے کسی اور سے نہ ڈرے اور داڑھی رکھے رہے۔ خدا کی عظمت کو دل میں بٹھایا، انجینیرنگ پاس کی، اب ماشاء اللہ بڑے انجن چلاتے ہیں۔ ماحول خراب ہے مگر خود صورۃً سیرۃً نیک ہیں۔ مجھ سے وظیفہ پوچھا میں نے کہا اللہ پر بھروسہ رکھنا تمہارا وظیفہ ہو۔ بس اپنے نازک پرزہ (دل) کو ٹھیک رکھو، سارا کام بنتا جائے گا۔

مقصدِ حقیقی فرمایا فراہیم صاحب نے مجھ سے کہا کہ میرے بچہ کا تبادلہ ایسی جگہ ہوا ہے جہاں کا ماحول بہت خراب ہے۔ میں نے پوچھا تنخواہ کیا ملتی ہے؟ بولے ڈیڑھ سو۱۵۰۔ میں نے کہا کہ اگر ڈیڑھ ہزار ملنے لگیں اور ماحول خراب رہے اور ساری تکالیف باقی رہیں تو دعا کر دوں؟ کہنے لگے حضرت یہ تو بد دعا ہوئی، جن کی نظر دُنیوی اجر پر ہوتی ہے۔ وہ دولت و ثروت کے طالب نہیں ہوتے وہ خدا کی خوشی کو مطمحِ نظر بناتے ہیں۔ میں کل ہی حیات الصحابہ؏ میں پڑھ رہا تھا کہ ایک صحابی نے حضور سے اس کی اجازت طلب کی کہ اپنی قوم میں جا کر اسلام کی تبلیغ کریں۔ حضور نے فرمایا کہ تم کو تمہاری قوم شہید کر ڈالے گی، عرض کیا مجھ کو اجازت مرحمت فرما دیجئے، اس میں میرے دل کو راحت ہو گی، اجازت مل گئی وہ گئے کسی نے نیزا پھینکا، وہ آنکھ میں لگا، ان کے قبیلہ نے بدلہ لینا چاہا، فرمایا بدلہ مت لو! یہ کیوں کہا؟ اس لیے کہ ان کو بہ آزار کا یقین تھا اس لیے دُنیا کی دولت، عزت، زندگی کی راحت ان کی نگاہوں میں ہیچ تھی۔

علت غائی اگر پیش نظر رہے تو کوئی تکلیف تکلیف نہیں رہتی بلکہ تکلیف بھی راحت بن جاتی ہے۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے میری بچی علی گڑھ میں پڑھتی ہے۔ غذا خراب ہے مگر برداشت کر رہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ چونکہ علت غائی (تعلیم) پیش نظر ہے اور وہ ٹھیک ہے اس لیے ان تکلیف کو خوشی سے برداشت کر رہی ہے۔

؏ تالیف حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ

عارضی چمک دمک یا دائمی سکون

ظاہر پر نہ جاؤ اگرچہ ظاہری عزت ظاہری حسن و جمال، ترقی، دولت و ثروت کا کیا اعتبار، یہ دیکھو نتیجہ کیا ہے۔ اگر نتیجہ خراب ہے تو یہ چمک دمک حسن و جمال، عزت و دولت راحت نہیں تکلیف ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ نہایت اچھا مکان ہے۔ دیواریں خوبصورت، چھت بلند، نرم نرم بستر، بلند مسہری، گاؤ تکیے لگے ہوئے، پلنگ پوش پڑا ہوا، ہر طرح کا آرام، آرائش و زیبائش، خدام خدمت کے لیے تیار۔ میاں صاحب تشریف لائے مسہری پر لیٹے اور سو گئے اور ان کا نوکر سامنے زمین پر بے بستر، بے تکیہ کے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھٹملوں، پسوؤں اور مچھروں نے میاں کو ستایا، ان کی آنکھ کھلی، کروٹ بدلنے لگے۔ بے چین و بے قرار بستر پر پہلو بدلنے لگے، اب کوئی غم گسار نہیں اور نوکر صاحب آرام سے فرش پر خراٹے لے رہے ہیں وہاں نہ مچھر تھے نہ کھٹمل نہ پسو۔ اب تم بتاؤ کس کو آرام ملا، میاں کو یا نوکر کو۔ نرم بستر اونچی مسہری، بجلی کے پنکھے راحت کا سامان بنے یا وہ فرش خاکی۔؟ انبیائے کرام یہی بتاتے ہیں کہ دنیا کی زندگی چاہے جتنی آرام دہ ہو اور چمک دمک رکھنے والی ہو اس میں مچھر ہیں، کھٹمل ہیں، پسو ہیں، جس طرح ایک سونے والے کو نیند اور آرام مقصود ہے۔ نرم بستر نہیں وہ آرام کو ترجیح دے گا چاہے زمین پر ملے یا بے بستر اور بے مکان کے حاصل ہو۔ اسی طرح آخرت کا آرام و راحت اجر و ثواب مقصود ہے چاہے وہ فاقوں سے حاصل ہو یا دنیاوی مشقتوں سے علت غائی دائمی آرام ہے۔

جزا کے یقین پر ہر مشکل آسان

دنیاداروں کو دیکھو کہ وہ دولت و ثروت حاصل کرنے کے لیے مشکل سے مشکل کام کرتے ہیں، ان کے لیے دولت کی امید میں مشکل سے مشکل کام آسان ہو جاتا ہے اور ناممکن سے ناممکن عمل ممکن بن جاتا ہے بس امید چاہیے اگر کسی کو دولت یا کسی قسم کے فائدہ کی امید ہوتی ہے تو سارے اعذار اور موانع ختم ہو جاتے ہیں اور قوت و طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ میں کوردائی[عہ] گیا۔ میں چلنے پھرنے سے معذور ہوں نہ پیروں میں طاقت نہ دل میں ہمت۔ سخت گرمی کا موسم دوپہر کا وقت لو چل رہی تھی منھ کو جھلسا دینے والی گرم ہوا۔ نواب

عہ علاقۂ بھوپال کی ایک ریاست۔

صاحب نے مجھ سے کہا آپ اس وقت اسٹیشن پیدل چلے جائیں، میں یہ سن کر گھبرا گیا، اسٹیشن جانا اور مجھ جیسے معذور کے لیے اس دوپہر میں محال اگر نہیں تو پہاڑ ضرور ہے۔ نواب صاحب میری نگاہوں میں محبوب تھے مگر ان کے حکم سے میں بددل ہو گیا۔ میری معذوری کا لحاظ نواب صاحب نہیں کرتے اور اس دوپہر میں اسٹیشن جانے کو کہہ رہے ہیں، نواب صاحب کے یہاں کا کھانا جو بہت قیمتی اور مرغن تھا میرے لیے زہر معلوم ہونے لگا، میں نے سوچا میں خواہ مخواہ یہاں آیا وہ سوکھی روٹی، چٹنی گھر میں جو تھی اچھی تھی، اس بلا میں تو گرفتار نہ ہوتا۔ نواب صاحب پھر آئے اور بولے کیسے جائیں گے آپ؟ یہ کہہ کر نواب صاحب اندر چلے گئے، میں نے منت مانی اے خدا اگر اس سے چھٹکارا مل گیا تو میں تیری جناب میں ایک بکرا ذبح کروں گا۔ مجھ کو اس سے نجات دیدے۔ نواب صاحب پھر آئے اور کہا اگر آپ نہیں جاتے تو میں فلاں شخص کو بھیجدیتا ہوں۔ اگر آپ جاتے تو آپ کا فائدہ ہو جاتا۔ ۱۵ ہزار روپیہ آپ کو مل جاتا، خیر کسی سے کہہ دیتا ہوں، ۱۵ ہزار کا نام سن کر میرے جسم میں لہر دوڑ گئی۔ ۱۵ ہزار کتنے زیادہ ہیں صرف اسٹیشن جانے پر ملیں گے کتنا سستا سودا ہے۔ اب خون دوڑنے لگا، ۱۵ ہزار کے سامنے معذوری ختم ہو گئی، جسم میں قوت آ گئی، بجلی دوڑنے لگی۔ بے ساختہ منھ سے نکلا نواب صاحب میں جا سکتا ہوں، میں پوچھتا ہوں کہ ذرا سی دیر میں کیفیت کیوں بدلی، معذوری کیوں ختم ہو گئی۔ اس لیے کہ ۱۵ ہزار کی اُمید ہو گئی، جزا کا یقین ہو گیا۔ ایک بڑا فائدہ سامنے آ گیا۔

دُنیا یا آخرت

فرمایا آخرت کی مثال دنیا بھی صحیح نہیں وہ تو بے مثال اور بے مثل ہے۔ اس کی مثال کیا، صرف سمجھانے کے لیے عرض کر رہا ہوں۔ حضرت مجدد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگر اُس عالم کا ایک ذرہ بھی اس عالم میں آ جائے تو سارا عالم روشن ہو جائے تو ان دونوں میں کیا مناسبت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مردہ سنت کے احیا پر سو شہیدوں کا ثواب بتایا ہے لیکن ہمارا یقین مردہ ہے۔ نہ اجر و ثواب کا یقین ہے۔ نہ خدا کے وعدوں کا، اس لیے اسلام کی باتیں ناممکنات سی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ہم نے ممکنات کے دائرہ میں قدم ہی نہیں رکھا، بس ہم دنیا کی ممکنات کے اندر پڑے ہیں۔ اسی لیے اسلام کا چھوٹا سے چھوٹا مسئلہ، جیسے وضو، نماز، سنتیں تک ہم پر بھاری ہیں بس ہماری نظر دنیاوی فوائد اور ظاہری ٹیپ ٹاپ پر ہے۔ قرآن نے کیا خوب فرمایا۔

یعلمون ظاہراً من الحیاۃ الدنیا — جانتے ہیں اوپر اوپر دنیا کے جینے کو اور وہ لوگ آخرت

وہم عن الآخرۃ ھم غافلون ۔ کی خبر نہیں رکھتے۔

دنیا کو محبت سے دیکھنا اور اس کو رغبت آخرت کا حجاب بن جاتی ہے اور دنیا سبز باغ معلوم ہونے لگتی ہو۔ مگر پھر کیا انجام ہوتا ہے فنا اور صرف فنا' انجام قبر ہے اور قبر ایک حسرت کدہ۔

عبرت و حسرت جاؤ اور قبرستان والوں سے پوچھو' دولت سے کھیلنے والے اور عیش و تنعم میں زندگی گزارنے والے خاک کا پیوند ہیں۔ تم کو یہ شہر خموشاں بتائے گا۔

کم ترکوا من جنات وعیون وزروع — بہت سے چھوڑ گئے باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور
ومقام کریم ونعمۃ کانوا فیہا — گھر خاصے اور آرام کا سامان جس میں باتیں بنایا
فاکھین کذالک واورثناھا قوما — کرتے تھے۔ یوں ہی ہوا اور وہ سب ہاتھ لگا دیا
آخرین۔ — ہم نے ایک دوسری قوم کے۔

کھوگئے قبر والے کب بولتے ہیں میں کہتا ہوں قبر والے زبان حال سے نہیں زبان قال سے بولتے ہیں۔ سننے کی طاقت ہونی چاہیے۔ صلاحیت اور مناسبت ہونی چاہیے۔ جس طرح اس دنیا میں دور دراز علاقہ کی بات آپ ٹیلیفون اور لاسلکی سے سنتے ہیں مگر کب جب آپ رسیور یا آلہ سماعت اپنے کانوں سے لگاتے ہیں۔ اسی طرح قبر والوں کی بولی سننے کے لیے بھی ایک رسیور کی ضرورت ہے اور وہ ہے قرآن کریم۔ اس کے ذریعہ سنو تو سن سکو گے۔ قبر والے کہہ رہے ہیں اور پکار پکار کہہ رہے ہیں۔

یا ویلتنا قد کنا فی غفلۃ من — ہائے کم بختی ہماری ہم بے خبر رہے اس سے بلکہ
ھذا بل کنا ظالمین۔ — ہم تھے گنہگار۔

کیا کہوں قبر والے اپنی چھاتی کوٹ رہے ہیں۔ ماتم کر رہے ہیں۔ اس غم میں کہ دنیا کی زندگی برباد کی اور دنیا کے عارضی عیش و تنعم میں پڑ کر خدا فراموش بن بیٹھے اور آخرت کا عیش بھول گئے یہ قول ان لوگوں کا ہوگا جو کافر ہوں گے اور قیامت میں کہیں گے۔ کہاں گیا وہ تزک و احتشام وہ عزت و ترقی' وہ مال دولت وہ آرام و راحت جو دنیا میں ہم کو حاصل تھا " من لم یذق لم یدر" (جس نے چکھا نہیں وہ کیا جانے)

بچے کی فطرت والدین بگاڑتے ہیں فرمایا بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے مگر ماں باپ کی حرکتوں اور افعال سیئہ سے فطرت مسخ ہو جاتی ہے۔ ابھی چند دن کی بات ہے ایک

معصوم سا بچہ کھیل رہا تھا میں نے محبت سے اس سے پوچھا بیٹے کیا پڑھتے ہو۔ اس نے ایسا غلط اور بیہودہ جواب دیا کہ میں مبہوت ہو کر رہ گیا میرے دل پر جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا میں نے کہا جاؤ شہزادے جاؤ تم نے ایسا زہر دیا کہ اس کا تریاق مشکل ہے۔ یہ تمہارا قصور نہیں تمہاری تو فطرت صحیح تھی۔ تمہارے باپ نے تمہاری فطرت بگاڑ دی بچپن ہی سے تم کو خراب کر دیا ایسے ہی بچے قیامت میں کہیں گے۔

ربنا انا اطعنا سادتنا وکبرائنا فاضلونا السبیلا۔ — اور کہیں گے اے رب ہم نے کہا مانا اپنے سرداروں کا اور اپنے بڑوں کا پس انھوں نے بھٹکا دیا ہم کو راہ سے۔

وہ بچے اپنے مربیوں کی شکایت کریں گے کہ انھوں نے ہماری زندگی برباد کی۔

حرکت میں برکت

فرمایا ہم غریب لوگ تھے گڑ کے چاول کھاتے تھے، اب خدا نے وسعت دی تو قسم قسم کے کھانے کھاتے ہیں، ان قسم قسم کے لذیذ کھانوں کے آگے وہ گڑ کے چاول بھول گئے۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں معلوم ہوتی، پہلے میٹھے تیل کے دیے ٹمٹماتے تھے۔ اسی میں سارا کام ہوتا تھا۔ لوگ رہتے تھے، کھاتے تھے، پڑھتے لکھتے تھے اور اس میں خوش تھے سمجھتے تھے بڑی نعمت ہے۔ امراء اور بادشاہوں کے یہاں ۵۔ ۵ چراغ جلتے تھے شمعیں روشن ہوتی تھیں ان کو تیل کی کیا کمی تھی۔ مالدار لوگ تھے۔ پھر دنیا نے ترقی کی تیل کے بجائے بجلی آئی۔ دستی اور فرشی پنکھوں کے بجائے بجلی کے پنکھے ہوگئے۔ یہ اس لیے ہوئے کہ دنیا والوں نے فکر و تدبر سے کام لیا۔ تیل کے چراغوں کو کافی نہیں سمجھا خدا نے عقل و تدبیر کی جو دولت انسان کو دی ہے اس سے کام لیا گیا اور دیکھتے دیکھتے ترقی ہوتی گئی۔ اسی طرح ہم کو بھی اپنی موجودہ زندگی پر قناعت نہ کرنی چاہیے، اس کو بہتر بنانے کی فکر کرنی چاہیے۔ آخرت والی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے میں تدبر سے کام لینا چاہیے۔ خدا کا فرمان ہے۔

من کان یرید حرث الآخرۃ نزدلہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منھا وما لہ فی الآخرۃ من نصیب۔ — جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی زیادہ کریں گے ہم اس کے واسطے اس کی کھیتی اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی اسکو دیں گے ہم کچھ اس میں سے اور اس کے لیے نہیں آخرت میں کچھ حصہ۔

خدا نے ایمان کی جو روشنی ہم کو دی ہے بیشک یہ بڑی روشنی ہے مگر اس روشنی میں اضافہ کی کوشش کرنی چاہیے جس طرح دیئے سے لیمپ ہوئے، لیمپ سے ترقی کر کے بجلیاں ہوئیں اور انسان اس سے آگے سوچ رہا ہے اسی طرح ہم کو ایمان کی روشنی کو بڑھانا چاہیے۔ آج جس طرح بجلی کی روشنی میں دیے اور لیمپ کی روشنی اندھیری لگتی ہے۔ اسی طرح آخرت کی نعمتوں اور راحتوں کے آگے دنیا کی راحتیں ہیچ معلوم ہونگی۔

دنیا کے معاملہ میں ہم ترقی کرتے جارہے ہیں۔ ہمارا دماغ چلتا رہتا ہے مگر دین کے معاملہ میں قناعت پسند ہیں۔ ترقی کی کوئی پرواہ نہیں، یہ فطرت انسانی ہے کہ ایک ترقی کے بعد دوسری ترقی کو سوچتا ہے۔ دین میں بھی یہی ہونا چاہیے۔ اسی کا نام عبادت ہے۔ ہم روزہ رکھتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں یہ سب ٹھیک ہیں مگر ان نمازوں میں ان روزوں میں روح پیدا کریں۔ افسوس ہے کہ نماز پڑھنے والے نمازوں سے بیگانے ہیں، نہ روح کا پاس نہ ارکان کا خیال، نہ جہت ٹھیک نہ دل صحیح رُخ پر، سجدہ کرتے ہیں تو پاؤں قبلہ سے بے رُخ۔

ادب کیا ہے فرمایا ادب بڑی چیز ہے۔ کہنے کا انداز ہونا چاہیے۔ ایک بات کئی انداز سے کہی جاتی ہے۔ ایک کا اثر کچھ ہوتا ہے، دوسری کا کچھ۔ جیسے آپ کسی کی دعوت کریں پہلے کھانے والوں سے آپ کہیں میاں جلدی کھاؤ اور دوسروں کے لیے جگہ چھوڑو۔ تم دیر لگا رہے ہو آپ کے اس جملے سے مہمان اکھڑ جائے گا اور وہ قورمہ اور پلاؤ قورمہ اور پلاؤ نہ معلوم ہوگا بلکہ زہر ہوگا، اگر یہ کہا جائے کہ زہر کھانا زیادہ اچھا ہوگا اس طرز کے کھانے سے، تو غلط نہ ہوگا۔

طریقہ تو یہ ہے ابھی تشریف رکھیے اور نوش فرمائیے۔ اسی طرح سے آدمی نماز پڑھ رہا ہو اور خیال اس طرف لگا ہو کہ میں نماز ختم کروں اور فلاں کام شروع کروں تو یہ نماز کی بے ادبی ہے، اور ایسا ہی ہے جیسے ایک معزز مہمان سے کہا جائے کہ جلدی کھانے سے فارغ ہوئیے تاکہ جگہ خالی ہو دوسرے مہمان بیٹھیں۔

دنیا کا حرج دین سے استغنا معاملہ بالکل اُلٹا کر دیا گیا ہے۔ نماز بہت ہی جلدی پڑھتے ہیں۔ دُعا میں دیر لگاتے ہیں حالانکہ نماز دُعا کی جامع ہے، وہ خود دعا ہے۔ نوافل کا بڑا اہتمام فرائض کا خیال کم ہے۔ حالانکہ نوافل بارات ہیں اور فرائض دولہا، میں تو کہتا ہوں کہ اگر کسی نے وظیفہ بھی نہیں پڑھا اور نماز کو قاعدہ کے ساتھ ادا کیا تو سب دعا اور وظیفے پورے

ہو گئے. کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہزاروں میں ایک کو بھی نماز کے احکام اور ارکان یاد نہیں اور دنیا بھر کی معلومات پوچھ لیجئے، صبح ہوئی اخبار کی تلاش ہوئی. امریکہ میں کیا ہو رہا ہے. روس میں کیا ہو رہا ہے. میرے محلہ میں ایک شخص مسجد کے سامنے رہتا تھا. مضبوط پہلوان نام کا مسلمان. نماز ایک وقت کی نہیں پڑھتا تھا مگر اخبار کا کیڑا تھا بس اسی میں اس کی زندگی تمام ہو گئی. خدا اس کی مغفرت کرے. بات یہ ہے کہ دماغوں میں دنیا کی زندگی کا کچرا بھرا ہے اور سڑ رہا ہے. عطر لگانے اور خوشبو میں بسانے سے کام نہیں چلے گا وہ کچرا نکال دیا جائے اور بدبو دور کر دی جائے. خوشبو تو فطری ہے. عجیب بات ہے لوگوں کے لیے. یہ آسان ہے کہ پانی میں کھڑے گھنٹوں وظیفہ پڑھیں مگر یہ کہو کہ اپنا حال بدلو، دماغوں سے کچرا نکالو. بُرے خیالات سے دل پاک کرو تو یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

ادب و لحاظ فرمایا خدا نے ہم کو ادب سکھایا ہے اور سب سے بڑا ادب اللہ و رسول کے آگے سر جھکا دینا ہے. قرآن نے صحابہ کرام کو خطاب کر کے کہا

لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی. نہ اونچی کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز پر.

کتنا معرکۃ الآرا لحاظ ہے. کتنا عظیم المرتبت ادب ہے. دیکھو مسلمانو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مبارک کے آگے اپنی آواز پست رکھنا، یہ حکم وقتی نہ تھا صرف صحابہ کرام کو نہ تھا بلکہ پوری اُمت کو ہے قیامت تک ہے. یہ قرآنی آواز آج بھی اسی طرح آرہی ہے جس طرح اپنے نزول کے وقت سنائی دی تھی، آج یہ آواز ہم کو بتا رہی ہے کہ حضورؐ کے کسی حکم کے آگے اپنی مصلحت نہ ڈھونڈنا، دین میں علل مت تلاش کرنا. بےچون وچرا حکم رسول کو ماننا ورنہ تمہاری آواز حضور کی آواز پر بلند ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ ہوگا

ان تحبط اعمالکم وانتم کہ اکارت ہو جائیں تمہارے اعمال اور تمہیں

لاتشعرون. خبر بھی نہ ہو.

صحابہ کرام نے اس ادب کو سیکھ لیا تھا اور وہ آوازوں کو حضور کی آواز کے آگے اتنی پست رکھتے تھے کہ گویا مجلس میں ہیں نہیں. ظاہراً بھی اور باطناً بھی. یہی وجہ تھی کہ ان کے حالات بدل جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ مخالف آتے تھے، زہر میں بجھی تلوار لاتے تھے اور سر قدموں پر ڈال دیتے تھے. ان کے قصے پڑھو اور دیکھو صحابہ کے قصے قصے نہیں وہ تو ایسے ہیں جیسے ہمارے کان ناک زبان یعنی وہ تمام اعضاء جن پر ہماری زندگی کا انحصار ہے. کل ہی میں حیات الصحابہ میں دیکھ رہا تھا کہ جب مشرکین مکہ کو بدر

میں شکست ہوئی تو رنج و غم کی فضا چھا گئی۔ عمیر نے صفوان سے مشورہ کیا کہ اگر قرض اور بیوی بچوں کا خیال نہ ہوتا تو (نعوذ باللہ) میں جاکر کام تمام کر دیتا۔ صفوان نے ان کاموں کی ذمہ داری لی۔ عمیر تلوار کو زہر میں بجھا کر مدینہ چلا۔ حضور اپنی مجلس میں رونق افروز تھے۔ حضرت عمر نے عمیر کو اس حال میں آتے دیکھا تو خدمت میں عرض کیا کہ خدا کا دشمن آرہا ہے، حکم ہو تو آگے بڑھ کر قتل کر دوں۔ ارشاد ہوا آتا ہے تو آنے دو، وہ قریب آیا تو فرمایا کس ارادے سے آئے ہو۔ کہنے لگا اپنے بیٹے کو چھڑانے۔ ارشاد فرمایا اور وہ جو صفوان سے تنہائی میں مشورہ کر رہے تھے وہ کیا تھا، عمیر کا دل بدل گیا فوراً مسلمان ہو گئے۔ یہ کیوں ہوا ان کا ارادہ کیوں بدلا۔ قاتل سے شیدائی کیوں بن گئے۔ حالات میں یکدم تغیر کیسے ہوا۔ قرآن میں ڈھونڈو اور تلاش کرو ملے گا۔ میں تو یہی کہتے کہتے مرجاؤں گا کہ اپنے جسم کے نازک پرزے کو درست کرو اور اس کی حفاظت کرو۔ صحابہ نے صرف یہ بالکمائی درست کر لی تھی اور اس میں جو تنکا آگیا تھا وہ نکال دیا تھا۔ عمیر نے بھی آخر وہ تنکا نکال دیا تو حالت بدل گئی اور فطرت صحیحہ لوٹ آئی ساری مشنری جو غلط چل رہی تھی صحیح چلنے لگی۔

شوقِ لقائے مولیٰ

میرا تو حال یہ ہے کہ میرے قدم تو موت میں پڑ رہے ہیں اور میرا رُخ اب اُدھر ہی ہے۔ مجھے اب کوئی تمنا اور آرزو نہیں بس ایک ہی تمنا ہے۔

اسی تمنا میں عمر گذری کہ یار ہم سے تو آملے گا
نہ ہم نے جانا کہ وصل کیا ہے نہ ہم یہ سمجھے وصال کیا ہے

خدا مجھے حیات نصیب کرے میں تو موت کے مدرسے میں داخل ہو کر اسی سے مانوس ہو چکا ہوں

مکن گریہ بر گور مقتول اوست
برو خرمی کن کہ مقبول اوست

میں ایک مرتبہ بہت کمزور ہو گیا تھا اور جسم سے خون مفقود ہو گیا تھا سارے احباب و مخلص دوست اس پر متفق تھے کہ خون چڑھایا جائے۔ میں نے کہا جس کو جینے کی تمنا ہو وہ خون چڑھائے۔ میرا حال تو یہ ہے "اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْکَ" اللہ تعالیٰ کے شوقِ لقاء میں جو قدم اٹھا اس پر تو خوش ہونا چاہیئے۔

حضرت عمرؓ کی معاشرتی اصلاح

(از مولانا محمد تقی امینی، ناظم سُنّی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ہر جماعت اور حکومت معاشرتی اصلاح کی علمبردار ہو لیکن اس کا دائرہ چند بے خطر چیزوں کی اصلاح سے آگے نہیں بڑھتا۔ ذیل میں معاشرتی اصلاح کے لیے حضرت عمرؓ کی کوششیں ذکر کی جاتی ہیں تاکہ اس کے بنیادی خد و خال نمایاں ہوں۔

حضرت عمرؓ مسلم گھرانوں اور خاندانوں کا ہمیشہ جائزہ لیتے رہے اگر ان میں تدبیر منزل کی خلاف ورزی یا کسی کی حق تلفی دیکھی تو فوراً اس کی اصلاح فرمائی مثلاً

(۱) نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی شادی میں تاخیر نہ ہونے دی۔

زوّجوا اولادکم اذا بلغوا ولا تحملوا آثامھم [۱] — تمہاری اولاد جب بالغ ہو جائے تو ان کا نکاح کر دو، ان کے گناہوں کا بوجھ نہ اٹھاؤ۔

(۲) حسب و نسب اور شرافت کے مصنوعی بتوں کو توڑ کر نئے معیار کی تاکید کی چنانچہ فرمایا

حسب المرء دینه واصله عقله ومروته خلقه [۲] — مرد کا حسب اس کا دین ہو، نسب اس کی عقل ہو اور شرافت اس کا خلق ہو۔

ایک اور روایت میں ہے۔

الحسب المال [۳] — حسب مال ہو۔

---

[۱] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الستون ص۲۰۲ [۲] ص۲۰۳ [۳] ایضاً

غالباً یہ فرق اشخاص کے حالات کے لحاظ سے ہو۔

(۳) خوبصورت عورت کا بدصورت مرد کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کیا۔

لا تنکحوا المرءۃ الرجل القبیح الذمیم	بدصورت اور بھدے مرد سے عورت کا نکاح
فانہن یحببن لانفسہن ما	نہ کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی عورتیں
تحبون لانفسکم[1]	اپنے لیے پسند کرتی ہیں۔

(۴) مہر کی زیادتی سے روکا اور عام حالات کے لیے مہر کی ایک حد مقرر کی۔

لا تغالوا فی مہور النساء فانہا لو	عورتوں کا زیادہ مہر مقرر نہ کرو اگر اس میں بزرگی
کانت مکرمۃ فی الدنیا او	شرافت ہوتی یا اللہ کے نزدیک تقویٰ کی بات
تقوی عند اللہ لکان احقکم	ہوتی تو اس کے سب سے زیادہ مستحق رسول اللہ
بہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم[2]	صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

(۵) عورتوں کے حقوق کا خاص خیال رکھا اور ان کی حق تلفی پر سختی سے کارروائی کا حکم دیا چنانچہ ایک شخص نے اپنی بیویوں کو طلاق دے کر اپنا سب مال لڑکوں میں تقسیم کر دیا جب اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو پہونچی تو آپ نے فرمایا کہ عورتوں کو رجوع کرو اور مال کی تقسیم فسخ کرو ورنہ میں انکو وارث بنا دوں گا اور تمہاری قبر پر سنگساری کروں گا۔[3]

(۶) عورت کے مصنوعی حسن و جمال اور زیب و زینت کے جال میں پھنسنے سے منع کیا چنانچہ فرمایا

اذا تم لون المرءۃ وشعرہا فقدتم	جب عورت کا رنگ اور اس کے بال ٹھیک
حسنہا[4]	ہوں تو اس کا حسن پورا ہو۔

(۷) گھریلو زندگی میں مرد کے لیے زیادہ باوقار اور منہ بند رہنا پسند نہ کیا۔

انی احب ان یکون الرجل فی	مجھے یہ بات پسند ہے کہ مرد اپنے اہل و عیال میں
اہلہ کالصبی فاذا احتیج الیہ	بچہ کے مثل رہے اور جب اس کے پاس ضرورت
کان رجلا[5]	لائی جائے تو مرد ہو جائے۔

---

[1] ازالۃ الخفا مقصد دوم کتاب النکاح ص ۱۱۲۔ [2] [3] ازالۃ الخفا مقصد دوم کتاب النکاح ص ۱۲۲۔
[4] [5] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الستون ص ۱۹۲۔

(۸) اخلاق و کردار کی درستگی کے لیے ہر اُس اقدام سے دریغ نہ کیا جس سے عورتوں اور مردوں کے خیالات و جذبات صاف ستھرے رہ سکیں اگرچہ بظاہر نظر میں کسی کی حق تلفی ہوتی ہو۔

ایک مرتبہ خواتین آپس میں باتیں کر رہی تھیں کہ مدینہ میں سب سے زیادہ حسین ترین کون شخص ہے؟ ایک خاتون نے کہا کہ ابو داؤد "شغال" (یہ لقب تھا) سب سے زیادہ حسین شخص ہے۔ یہ گفتگو رات کو خواتین کی ایک نشست میں ہو رہی تھی جس کو حضرت عمرؓ نے گشت میں خود ہی سُن لیا تھا۔ دوسرے دن "شغال صاحب" کا پتہ لگایا گیا جو نہایت حسین و جمیل اور مردانہ بانکپن سے آراستہ تھے۔ دیکھتے ہی سر کے بال منڈا دیے اور پگڑی باندھنے کا حکم دیا لیکن اس ظالم کا نکھار و حُسن اور بڑھ گیا۔

بالآخر "شغال" کو فوجی وردی پہنادی گئی اور شیشہ گری و عشوہ طرازی سے نکال کر خارہ شگافی و جفا طلبی کی زندگی کی طرف لے آیا گیا۔[1]

(۹) اسی طرح رات کو گشت کے وقت ایک عورت کو یہ شعر پڑھتے سُنا۔

الا سبیل الی خمر فاشربہ	کیا شراب دستیاب ہونے کی کوئی صورت نہیں؟
ام لا سبیل الی نصر بن حجاج	کیا نصر بن حجاج سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں؟

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ نصر بن حجاج نہایت خوبصورت آدمی ہے جس کو عورتیں حسرت و آرزو کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ آپ نے بلا کر اس کے سر کے بال منڈا دیے لیکن اس کے بعد وہ اور زیادہ خوبصورت نظر آنے لگا بالآخر کچھ رقم دے کر اس کو جلا وطن کر دیا۔[2]

(۱۰) عورتوں اور مردوں کے مخلوط اجتماع پر پابندی لگائی اور ایسے واقعات پر سزا دی۔

ضرب عمر بن الخطاب رجالا ونساءً	حضرت عمرؓ نے ان مردوں اور عورتوں کو سزا
ازدحموا علی الحوض[3]	دی جو حوض پر جمع ہو گئے تھے۔

(۱۱) باندی کو زرق برق لباس پہن کر باہر نکلنے اور فتنہ انگیزی کرنے سے منع کیا۔

---

[1] ابوبکر و فاروق اعظم بارھواں باب از ڈاکٹر طٰہٰ حسین [2] الطرق الحکمیہ فصل و مسلک اصحابہ صہ ۱۴ و ازالۃ الخفاء مقصد دوم گشت حضرت عمرؓ [3] ازالۃ الخفاء مقصد دوم سیاست فاروق اعظم صہ ۹۸۔

ایک باندی کو اس حالت میں دیکھ کر اپنی بیٹی حفصہؓ سے فرمایا

الم ار جاریۃ اخیک تجوس الناس۔	کیا میں نے تیرے بھائی کی باندی کو نہیں دیکھا کہ لوگوں کو دیکھتی پھرتی ہے۔

اور پھر اس پر سخت نکیر کی۔ ؎۱

(۱۲) فوجی خدمات پر مامور شوہروں کو چار ماہ سے زیادہ باہر رہنے سے روک دیا۔

صورت یہ ہوئی کہ حسب دستور رات کو گشت کر رہے تھے ایک گھر سے عورت کے ایسے اشعار پڑھنے کی آواز آئی جن میں شہوانی جذبات کا اظہار تھا۔ عورتوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دو ماہ تک شوہر کی جدائی برداشت ہو سکتی ہے۔ تیسرے ماہ قوت برداشت میں کمی آجاتی ہے اور چوتھے ماہ جذبات کی ہیجان انگیزی شباب پر ہوتی ہے۔

اس تحقیق کے بعد افسران کو لکھ کر بھیجا کہ کسی شخص کو چار ماہ سے زیادہ باہر نہ روکا جائے۔ ؎۲

(۱۳) بیوی کے حقوق کی پامالی کی وجہ سے زیادہ عبادت کرنے سے منع کر دیا جس کی صورت یہ ہوئی کہ کعبؓ بن سعد حضرت عمرؓ کے پاس تشریف فرما تھے کہ ایک عورت نے آکر کہا۔

ما رایت قط رجلا افضل من زوجی انہ یبیت لیلۃ قائما ویظل نھارہ صائماً فی الیوم الحار ما یفطر۔	میں نے کوئی مرد اپنے شوہر سے زیادہ افضل نہیں دیکھا۔ وہ شب بیداری کرتے اور دن میں روزہ رکھتا ہے۔ گرمی کے دنوں میں بھی افطار نہیں کرتا۔

شوہر کی تعریف بیوی کی زبان سے سن کر حضرت عمرؓ خوش ہوئے اور کہا

مثلک اثنی بالخیر۔	تیری ہی جیسی عورت سے یہ توقع ہو سکتی ہے

وہ "غریب" حیاء کی وجہ سے زیادہ نہ کہہ سکی اور اٹھ کر جانے لگی۔ کعبؓ بن سعد نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ یہ عورت آپ سے مدد کے لیے آئی تھی آپ نے اس کی کوئی مدد نہ کی اس پر حضرت عمرؓ نے بلا کر صورت حال کی وضاحت چاہی اور کہا۔ "کعب کا خیال ہے کہ تو اپنے شوہر کی شکایت کر رہی ہے" اُس نے جواب دیا۔

اجل انی امرأۃ شابۃ وانی	جی ہاں میں ایک جوان عورت ہوں اور

؎۱ ازالۃ الخفاء مقصد دوم من ابواب شتی ص۱۳۵ ؎۲ ایضاً گشت عمرؓ

ابتغی ما تبتغی النساء۔ وہی چاہتی ہوں جو دوسری عورتیں چاہتی ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کو بلا بھیجا اور یہ مقدمہ کعبؓ کے حوالہ کر دیا اور انھوں نے یہ فیصلہ دیا۔

فانی اری لھا یوماً من اربعۃ — اس عورت کے لیے ہر چوتھا دن مخصوص ہوگا

ایام کان لزوجھا اربع نسوۃ — گویا چار عورتیں ہیں اور چوتھے دن اس کی باری

فاذا لم یکن غیرھا فانی — آتی ہے۔ اب جبکہ چار نہیں ہیں تو تین دن

اقضی لہ بثلثۃ ایام ولیالیھا یتعبد — رات عبادت کے لیے ہیں اور ایک دن اور رات

فیھن ولھا یوم ولیلۃ [1] — عورت کے لیے ہے۔

کعب نے اس فیصلہ میں قرآن حکیم کی اُس آیت سے استدلال کیا جس میں وقت ضرورت چار تک سے شادی کرنے کی اجازت ہے۔

(۱۴) کتابیہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی ممانعت کر دی چنانچہ حضرت حذیفہؓ نے ایک یہودیہ سے نکاح کر لیا تو اس کی اطلاع پر علیحدگی کا حکم دیا۔ اس پر حذیفہؓ نے پوچھا کہ کیا وہ حرام ہے، حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ میں حرام تو نہیں کہتا ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تم لوگ بدکار عورتوں کے جال میں پھنس جاؤگے [2]

امام محمد نے اس واقعہ کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا جواب ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

فانی اخاف ان یقتدی بک — میں ڈرتا ہوں کہ دوسرے مسلمان تمہاری پیروی

المسلمون فیختاروا نساء — کریں گے اور ذمیہ (کتابیہ) عورتوں کے جمال

اھل الذمۃ لجمالھن — کی وجہ سے مسلم عورتوں پر ان کو ترجیح دیں گے

وکفی بذلک فتنۃ لنساء — یہ بات بڑی آسانی سے مسلم عورتوں کے لیے فتنہ

المسلمین [3] — بن سکتی ہے۔

(۱۵) میل ملاقات میں معاشرتی امتیازات ختم کیے اور صورت یہ اختیار کی کہ دُوسا کو ثانوی حیثیت

---

[1] الاستیعاب ازالۃ الخفاء مقصد دوم سیاست فاروق اعظم [2] احکام القرآن للجصاص باب تزوج الکتابیات ج ۲، ص ۳۲۴ [3] کتاب الآثار باب تزوج الیہودیۃ والنصرانیۃ۔

دی اور جن کو وہ کمتر سمجھتے تھے ان کو درجہ اول پر رکھا۔[1]

(۶) اپنی بیوی میں "بیگمات" کی خصوصیات نہ پیدا ہونے دیں بلکہ خدمت خلق اور رفاہ عام پر مامور کیا۔ چنانچہ ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک رات گشت کر رہے تھے کسی گھر سے "دردزہ" میں مبتلا عورت کے کراہنے کی آواز سنی، فوراً واپس اپنی بیوی ام کلثوم کو خدمت کے لیے لے گئے جو برابر زنانی امور کی نگہداشت کرتی رہیں یہاں تک کہ فراغت ہو گئی۔[2]

(۷) ہر قسم کے امتیازات ختم کر کے چرواہے کو بھی اسی طرح مستحق ٹھہرایا جس طرح دوسرے مستحق ہوتے ہیں۔

خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو ایسی حالت کر دوں گا کہ ایک چرواہا صنعاء پہاڑی پر بکریاں چرا رہا ہوگا اور اس کا حصہ اس مال میں ہوگا۔[3]

عورت اس وقت کے معاشرہ میں نہایت پست تھی پھر کاشت کار کی بیوہ عورت؟ جس کے لیے حضرت عمر نے فرمایا۔

لان بقیت لارامل اهل العراق	اگر میں زندہ رہا تو عراق کی بیواؤں کو ایسا بنا
لادعهن لا یحتجن الی احد بعدی[4]	دوں گا کہ وہ میرے بعد کسی کی محتاج نہ رہیں گی۔

(۸) حکومتی طبقہ کے لیے عام حالات میں متوسط درجہ کی زندگی کا معیار پیش کیا چنانچہ فرمایا۔

قوتی کقوت رجل من قریش	میری اور میرے اہل و عیال کی روزی اس قدر
لیس باغنا هم ولا بافقرهم[5]	ہو کہ جتنی کہ قریش کے متوسط درجہ کی شخص کی
	ہوتی ہو جو نہ زیادہ مالدار ہو اور نہ زیادہ مفلس ہو۔

(۹) اعلیٰ افسران کے لیے خصوصی قانون نافذ کیے۔ مثلاً

(۱) ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوں۔

---

[1] تاریخ عمر ابن الجوزی الباب الثالث والثلثون ص۸۱ [2] ابوبکر صدیق و فاروق اعظم بارھواں باب از ڈاکٹر طٰہٰ حسین [3] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الثامن والثلثون [4] الخراج ص۳۷

[5] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الثامن والثلثون ص۱۰۳

(۲) باریک کپڑے نہ پہنیں۔

(۳) میدہ کی روٹی نہ کھائیں۔

(۴) لوگوں کی حاجتوں سے اپنے دروازے بند نہ کریں۔

(۵) بیماروں کی بیمار پرسی کے لیے جایا کریں۔

اگر کوئی افسران باتوں کی خلاف ورزی کرتا تو اس کو سخت سزا دیتے یا معطل کر دیتے تھے[1]

(۳۰) افسر اعلیٰ کے تقرر کے وقت اس کے پاس جس قدر مال و اسباب ہوتا اس کی مفصل فہرست تیار کرا کے دفتر میں محفوظ رکھتے۔ اگر معمولی حالت میں غیر معمولی ترقی ہوتی تو اس سے مواخذہ کرتے تھے۔

کان عمر بن الخطاب یکتب اموال	حضرت عمرؓ جب کسی کو حاکم اعلیٰ بناتے تو اس
عماله اذا ولاهم ثم يقاسمهم ما	کے اموال کی فہرست تیار کراتے پھر جو اس سے
زاد على ذالك[2]	زیادہ ہوتا اس میں سے عوام کا حصہ نکالتے۔

(۳۱) اہل کتاب سود کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے ذریعہ خانہ شہر سے ہٹانے کا حکم دیا تاکہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ مسلمان اس کو جائز سمجھتے ہیں چنانچہ فرمایا۔

ان الله تبارك وتعالى قد اغنانا	اللہ نے ہم کو مسلمانوں کی وجہ سے ان سے بے
بالمسلمين[3]	نیاز کر دیا ہے۔

(۳۲) دعوت کے کھانے میں خدام کو شریک کرنے کی تاکید کی اور خلاف ورزی کی صورت میں دعوت سے بغیر کھائے واپس آگئے چنانچہ رؤساء مکہ کی ایک دعوت میں خدام کھانے میں شریک نہ تھے تو حضرت عمرؓ نے پوچھا

مالي ارى خدامكم لا ياكلون	کیا بات ہے، ہم خدام کو کھانے میں شریک نہیں
معكم اترغبون۔	دیکھ رہے ہیں، کیا تم لوگ ان سے اعراض کرتے ہو۔

صاحب خانہ نے جواب دیا۔

ولكنا نستأثر عليهم۔	ہم اپنے کو ان پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس پر حضرت عمرؓ سخت ناراض ہوئے اور خادموں کو کھانے کا حکم دیا اور خود بغیر کھائے واپس آگئے۔

فقعد الخدام ياكلون ولم ياكل امير المومنين[4]	خادم بیٹھ کر کھانے لگے اور امیر المومنینؓ نے نہیں کھایا۔

غرض اس قسم کی بہت سی اصلاحات ہیں جن سے معاشرتی اصلاح کا پتہ چلتا ہے۔

---

[1] کتاب الخراج فی تفصیل اسباد داختیار الولاۃ [2] فتوح البلدان صفحہ ۲۱۹ [3] المدونۃ کتاب الذبائح
[4] ایضاً الباب الثامن والثلاثون صفحہ ۹۷

مولانا کرامت علی جونپوری رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کا ترجمہ شمائل ترمذی

(از مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ)

(۲)

دعوت و تبلیغ کا کام ہندوستان کے علماء و صوفیہ نے دعوت و تبلیغ کے خصوصی کام کو ہمیشہ اپنا شعار بنائے رکھا، اور ان کے فیض سے پورے ملک میں اسلام اپنی اصلی حالت میں زندہ رہا، مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ مغل حکومت کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں اور خصوصیت سے مسلمانوں میں جو دینی اور اخلاقی زوال پیدا ہو رہا تھا۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ دعوت و تبلیغ کے کام کو زیادہ سے زیادہ عمومیت دی جائے، اور اسے خانقاہوں اور مدرسوں سے نکال کر بازاروں اور گلی کوچوں تک پہنچایا جائے چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی مختلف کتابوں میں اس طرف توجہ دلائی، اور اس خانوادہ نے اس کو کسی قدر عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی مگر حقیقتہً یہ سعادت اسی خانوادہ کے تربیت یافتہ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور اس خانوادہ کے چشم و چراغ حضرت مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبد الحئی صاحب بڈھانوی کے حصہ میں آئی جنھوں نے دعوت و تبلیغ کی ایسی مشعل جلائی کہ اس کی روشنی سے پورا ملک منور ہو گیا اور چند برسوں میں توحید خالص کا غلغلہ اور قال اللہ قال الرسول کی آواز مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک پہنچ گئی، سید صاحب اور اُن کے رفقائے خاص کی شہادت کے بعد گو تحریک جہاد کی ہماہمی تو قدرے کم ہو گئی، مگر دعوت و تبلیغ کی جو شمع انھوں نے جلائی تھی، انشاء اللہ اس کی لو کی تابانی قیامت تک باقی رہے گی۔ اور اس کی ایک تابندہ یادگار مولانا کرامت علی صاحب جونپوری ہیں۔

مولانا کرامت علی صاحب جونپوری میں دعوت و تبلیغ کا جذبہ عنفوان شباب ہی سے موجود تھا، مگر سید صاحب کی خدمت سے واپسی کے بعد اس جذبہ میں بہت تیزی آئی، بلکہ انھوں نے اس کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی اور اسی کے ہو رہے۔ ان کی دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں کے بارے میں ان کے معاصر تذکرہ نویسوں نے اپنی عادت کے مطابق محض چند جملے لکھے ہیں، مگر دوسرے ذرائع سے جو معلومات مل سکی ہیں، ان سے ان کے کاموں کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تذکرہ علمائے ہند کے مصنف نے لکھا ہے۔

متشرع متورع، واعظ، کثیر التصانیف و در
ہدایت خلق بغایت کوشید خصوصاً مردم ممالک
بنگالہ از و مستفیض شدند در آں دیار طریق اسلام
از یمن و برکت او خوب شیوع یافت۔

شریعت کے انتہائی پابند، بہت متقی اور واعظ
تھے، اپنی تصانیف اور وعظ و تذکیر کی
بہت یادگاریں چھوڑ گئے ہیں، اور خلائق کی
ہدایت میں بہت کوششیں کیں، بنگال کے
لاکھوں آدمی ان سے مستفیض ہوئے، اور
اس دیار میں ان کی برکت و سعادت سے
اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔

مشاہیر جونپور کے مصنف نے قدرے اور تفصیل کی ہے۔

ہمت شیوع دین اسلام بر دعوت و ہدایت اسلامیان
کمر ہمت بربست تمام اوقات در ایں تحقیق
سنگی گذرانید۔

اسلام کی اشاعت میں انھوں نے پورے طور
پر کمر ہمت باندھی اور پوری زندگی اس کار
عظیم میں صرف کر دی

زیادہ حصہ عمر عزیز در سیاحی بلاد شرقیہ بنگالہ دسر
بلندی بسر شد در آں دیار باعث شیوع و ترقی
اسلام ایں ذات خجستہ صفات شد۔

عمر عزیز کا زیادہ حصہ ملک کے مشرقی حصہ میں بسر
کیا اور بڑی عظمت و عزت حاصل کی، دیار شرق
میں اسلام کی اشاعت و ترقی انھی کی ذات سے تھی۔

مولانا کی تبلیغی سرگرمیاں دو حصوں میں منقسم ہیں، ایک کا تعلق جونپور اور اس کے گرد و نواح سے ہے، اور دوسرے کا تعلق بنگال اور آسام کے بعض علاقوں سے ہے، جونپور اور گرد و نواح میں آپ کے اصلاح و تبلیغ کا دائرہ زیادہ تر مسلمانوں تک محدود رہا، مگر بنگال میں مسلمانوں کی اصلاح کے ساتھ آپ نے غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ کا جو وسیع کام کیا ہے، وہ کام کوئی حکومت بھی نہ کر سکی، افسوس ہے کہ ان کے کارناموں کو

ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ میں وہ مقام نہ مل سکا، جو انہیں ملنا چاہیے تھا۔ ہندوستان کی دعوت و تبلیغ کی تاریخ میں بے شمار ایسی شخصیتیں ملیں گی جن کے کارنامے صفحۂ تاریخ پر بالکل ہی نہیں آسکے ہیں بلکہ اس راہ میں ہزاروں ایسے مرد ان کار ملیں گے جن کے نام سے بھی ہم واقف نہیں ہیں اور جن لوگوں کے نام یا کارنامے تاریخ کے صفحات میں آ گئے ہیں، ان میں بھی بیشتر تعداد ایسی ہے کہ ان کے جتنے کارنامے ہمارے سامنے آسکے ہیں، ان سے کئی گنا کارنامے ہمارے علم میں نہیں آسکے ہیں، یہ ان کی بے نفسی اور اخلاص تھا کہ انھوں نے اپنی شخصیت کو مٹا کر خدا کے دین کو زندہ کیا تھا، ہندوستان میں دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کے لیے آج بھی ان کے خاموش طریقہ کار میں ثمرین بصیرتیں پوشیدہ ہیں۔

پہلے ہم جونپور اور اس کے گرد و نواح میں مولانا کی اصلاحی کوششوں کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد مشرقی ہند میں ان کی دعوت و تبلیغ کی جو تفصیلات ہمیں مل سکی ہیں، ان کی وضاحت کریں گے۔ مولانا نے تقریباً اپنی عمر کا دو تہائی حصہ بنگال میں بسر کیا، مگر بنگال جانے سے پہلے اور پھر درمیان میں جب جب جونپور واپسی ہوتی، آپ اصلاح حال کی فکر میں رہتے، جونپور جو ایک زمانہ میں علما و صلحا کا مرکز رہ چکا ہو اور مشرق کا شیراز کہا جاتا تھا جس سرزمین میں ملا محمود جونپوری وغیرہ جیسے اور کتنے سرکردہ علما گزر چکے ہیں، جہاں جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے بیک وقت کئی کئی سو علما و صلحا کی پالکیاں جاتی تھیں، وہاں کی دینی حالت یہ تھی کہ ابراہیم شرقی کی بنوائی ہوئی شاندار جامع مسجد میں جمعہ تک نہیں ہوتا تھا، وہاں دن کے وقت اذان کہنے کو نحوست سمجھا جاتا تھا، دینی احکام کی جگہ بے شمار بدعتوں اور رسم و رواج نے لے لی تھی، نہ صرف جونپور بلکہ اس کے قریبی اضلاع اعظم گڑھ سلطانپور وغیرہ کا بھی یہی حال تھا، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہو کہ مولانا جسم و جثہ کے اعتبار سے بھی قوی ہیکل تھے، اور انھوں نے فن سپہ گری بھی سیکھا تھا، چنانچہ انھوں نے دعوت و تبلیغ میں اپنی جسمانی طاقت اور فن سپہ گری دونوں سے کام لیا، مولانا نے اس دیار میں جو اصلاحی کام کیے ان کی ایک ہلکی سی جھلک ذیل کے بیانات و واقعات سے معلوم ہوگی یہ معلومات اور بیانات مولانا کی بعض تصنیفات اور ان کے پوتے مولانا عبدالباطن صاحب کی بعض کتابوں سے لیے گئے ہیں۔

مولانا کے اندر دعوت و اصلاح کا جذبہ عنفوان شباب ہی سے تھا، حضرت سید صاحب کی خدمت سے واپس آکر تو بالکل اسی کے ہو رہے، محلہ محلہ جا کر نماز روزہ کی تاکید کرتے، لوگوں میں جو

بدعات اور رسومات رواج پا گئی تھیں۔ ان کے خلاف وعظ کہتے تھے۔ بعض محلوں میں اذان و جماعت شروع کی تو لوگ کہتے تھے یہ دن کے وقت اذان کیسی؟ مولانا عبد الباطن صاحب لکھتے ہیں۔

مولانا اپنے مرشد سید صاحب سے رخصت ہو کر اپنے وطن جونپور تشریف لائے، چونکہ آپ تبلیغ اور ہدایت خلق کا سلسلہ پہلے ہی سے جاری فرما چکے تھے۔ اب جونپور آ کر اس کام میں اور بھی سرگرم عمل ہو گئے، اور محلہ محلہ اور گھر گھر پھرتے، نماز روزہ پردہ اور دیگر ارکان اسلام کی تلقین و تاکید فرماتے۔ اس جونپور میں دن کو اذان نہ ہوتی صرف صبح و شام کو طلوع و غروب کی پہچان کی غرض سے بطور رسم اذان ہوا کرتی، آپ نے اس جاہلانہ رسم کی اصلاح کی اور بڑی کوششوں سے پانچوں وقت اذان و جماعت مسجدوں میں جاری کرائی، غیر اللہ کے نام پر منتیں ماننا اور دیگر مشرکانہ رسوم میں لوگ بکثرت مبتلا تھے۔ شادی و غمی کے موقع پر ہندوانہ رسوم برتے جاتے تھے۔ ان سب برائیوں اور معصیتوں سے لوگوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعہ باز رکھا۔ عوام بھی مولانا کی جد و جہد دیکھ کر متاثر ہوتے، اور مطیع و فرمانبردار بن جاتے۔ اس سرعت کے ساتھ مولانا کی یہ کامیابی حضرت سید صاحب کی برکت کے سبب تھی۔

مسلمانان جونپور کے دینی تحفظ اور ان کے دین پر ثابت قدم رہنے کے خیال سے مولانا نے جامع مسجد جونپور میں بعد نماز جمعہ وعظ کا سلسلہ قائم کیا کہ ہر ہفتہ دین کی باتیں سننے سے لوگوں کی استقامت میں پختگی ہو گی۔ بعد نماز جمعہ وعظ و نصیحت کا جو سلسلہ قائم فرمایا تھا وہ ہمیشہ کا معمول ہو گیا۔ اور اس سے اہل جونپور کو بہت کچھ فائدہ ہوا یہی سبب ہے کہ جونپور کے عوام دینی سمجھ میں بہت غنیمت ہیں (سوانح مولانا کرامت علیؒ)

خود مولانا کرامت علی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب زاد التقویٰ میں جونپور کی دینی حالت کے بارے میں یہاں تک لکھا ہے۔

> اور مسجدوں کا حال یہ تھا کہ لوگ ناچ کرواتے اور ہندوؤں کی بارات اترتی اور شراب پیتے تھے۔ (زاد التقویٰ)

وہاں کی جامع مسجد کی جو حالت تھی اس کو اس دور کے ایک مشہور شاعر منشی عبد الحمید صاحب دماغ نے نظم کر دیا ہے، جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

جو مشہور کعبہ کے حالات ہیں　　تھی اس سے کبھی کچھ اس کی حالت ردی
مویشی یہاں باندھتے تھے کسان　　وہاں تو بتوں ہی کی بھرمار تھی

یہاں لید و گوبر کا انبار تھا   وہاں تو صفائی تھی ہر طرح کی
وہاں تھا نہ اس طرح فسق و فجور   عبادت ہی تھی گو بتوں ہی کی تھی
یہاں برخلاف اس کے اندھیر تھا   برے کاموں کی سارے مرکز یہ تھی

وہ مسجد جو حضرت سلطان الاولیاء عیسیٰ تاج الدین رحمۃ اللہ علیہ کے اشارے سے شاہ ابراہیم شرقی نے تعمیر کی تھی جس میں خود شیخ نماز پنجگانہ ادا کرتے تھے جس میں علماء کی ۹ سو پالکیاں نماز جمعہ کے لیے آیا کرتی تھیں۔ اس کا یہ حال تھا، تو دوسری مسجدوں کی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا برابر اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح یہ جامع مسجد پھر سے آباد ہو جائے۔ اہل بدعت جن کے لیے دن کی اذان تک نامانوس تھی، اس میں جمعہ جماعت کو کب برداشت کرسکتے تھے۔ مگر مولانا نے خدا کے اعتماد پر اس میں دوبارہ جمعہ قائم کردیا، پہلا جمعہ جب آپ نے اس میں ادا کیا، تو صرف پانچ آدمی شریک تھے۔ ایک مولانا کے چچا شیخ امیر اللہ صاحب اور محلہ کے تین اور مخلص آدمی، مولانا کے پوتے مولانا ابو البشر صاحب راوی ہیں کہ اس زمانہ میں مولانا کے اتنے دشمن ہو گئے تھے کہ ان کی جان کو بھی خطرہ تھا چنانچہ آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی مگر اللہ نے محفوظ رکھا، ایک بار کا واقعہ مولانا خود بیان کرتے ہیں کہ

> ایک بار میں منشی امام بخش صاحب مرحوم جونپور کے مکان کے قریب سے گزر رہا تھا۔ مجھ کو جاتے ہوئے ایک بوڑھی عورت نے دور سے دیکھ لیا، اور وہ اس وقت ہانڈی لے کر دھونے نکلی تھی، جب وہ میرے پاس پہونچی تو ہانڈی کھینچ کر پھینک ماری کہ یہی وہ نیا مولوی ہے جس نے دن کو اذان دلائی ہے (ص ۴۲)
>
> اس فقیر نے دین جاری کرنے میں جس قدر کوشش کی ہے اور تکلیفیں اٹھائی ہیں، اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک ملک پھرتا رہا اور قرآن شریف لکھ کر اور تجارت کر کے اپنا خرچ چلاتا تھا، یہاں تک کہ سفر سے آکر سواری کا خرچ قرض لے کے ادا کرتا تھا، اور جس مقام میں جاتا تھا وہاں اکثر مقام میں جان کا خوف رہتا تھا، اور فقیر اس وقت ہتھیار بند رہتا تھا۔ (اطمینان قلب)

مولانا کو دعوت و تبلیغ کے جرم میں کئی بار قتل کرنے کی سازش کی گئی مگر وہ اپنے فن سپہ گری سے ہر بار بچ گئے۔ مولانا مرحوم نے جو سنتیں زندہ کیں، خدا کا شکر ہے کہ بڑی حد تک وہ آج تک جاری ہیں، جونپور جو ایک دو صدی پہلے مدارس عربیہ کا سب سے بڑا مرکز اور شیراز مشرق کہا جاتا تھا، وہاں اب علم دین کے اعتبار سے ہر طرف سناٹا تھا، مولانا نے علم دین کی اشاعت کے لیے مدرسہ حنفیہ اور مدرسۃ القرآن جاری کیے، دل الذکر

کے سب سے پہلے مدرس مولانا عبدالحئی صاحب[عہ] کے والد محترم مولانا عبدالحلیم صاحب ہوئے. خود مولانا عبدالحئی صاحب کی حفظ قرآن کی تعلیم یہیں شروع ہوئی. خدا کے فضل سے یہ دونوں مدرسے جاری ہیں اور ایک سال سے ان میں نئی روح آگئی ہے۔ (ص ۳۵)

جونپور کے نواحی میں کام کرنے کے بعد سید صاحب کے ارشاد کے مطابق بنگال تشریف لے گئے، اور جب تک آپ بقید حیات رہے وہاں دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہے۔

بنگال و آسام میں دعوت و تبلیغ کا کام

مولانا نے ۵۰ سال کی عمر پائی جس میں سے تقریباً ۱۸ سال بنگال و آسام اور ان کے قرب و جوار میں دعوت و تبلیغ کا کام کرتے ہوئے گذرے، مولانا کے بعض بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا قدم جزائر سندھ تک بھی گیا ہے، اس درمیان میں ایک دو بار جونپور بھی آنا ہوا مگر وہاں زیادہ مدت تک قیام نہ رہ سکا۔ مولانا نے اصلاح و تبلیغ کا جو وسیع کام اس دیار میں کیا، اس کی پوری تفصیل ہمارے سامنے نہیں آسکی مگر بعض تذکرہ نگاروں اور بعض دوسرے بیانات سے اس کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے، مشاہیر جونپور کا بیان ہے۔

در ملک بنگالہ یک و کرور مردم بدست گرفتند	بنگال میں لاکھوں آدمی مولانا کے حلقہ ارادت
ایشاں شاید ہیچ قریہ و بلدہ باقی نبود کہ	میں داخل ہیں کوئی شہر اور کوئی بستی باقی نہ ہوگی
دراں مریداں و مستفیضان فیض نماندہ۔	جہاں مولانا کے ارادت مند اور فیض یافتہ نہ
(ص ۳۶)	ہوں۔

تذکرۂ علمائے ہند کے مصنف کا بیان اوپر آچکا ہے پھر بھی اسے ملاحظہ فرمائیں۔

در ہدایت خلائق نہایت کوشید خصوصاً	مخلوق کی ہدایت میں حد درجہ کوشاں رہتے تھے
مردم ممالک بنگالہ ازو مستفیض شدند دراں	خصوصیت سے بنگال کے لوگ بہت زیادہ آپ
دیار اشاعت اسلام از برکت او بخوبی شیوع	سے مستفیض ہوئے اس دیار میں ان کی برکت سے
یافت (ص ۱۷۱)	اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔

۱؎ کلکتہ کی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کے ہاتھ پر تقریباً ایک کرور آدمیوں نے اسلام قبول کیا یعنی مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت دراصل انہی کی سعی تبلیغ کا نتیجہ ہے۔ یہ روایت ممکن ہے کہ کچھ مبالغہ ہو مگر یہ تو واقعہ ہے کہ مشرقی

(باقی اگلے صفحہ پر)

عہ مولانا عبدالحئی لکھنوی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲

مولانا نے دو درجن سے زیادہ تصانیف چھوڑی ہیں، مگر ان کی للّٰہیت و کسرِ نفسی تھی کہ اپنی ان مساعیٔ جمیلہ کا کسی کتاب میں مفصل ذکر نہیں کیا ہے، جا بجا دو چار جملے مل جاتے ہیں، جن سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> فقیر کا تو حال یہ ہے کہ ہندوستان سے کلکتہ اور چاٹگام اور سندیپ تک اور ڈھاکہ سے سلہٹ تک سارے شہر اور گاؤں ہیں جو دیارِ شرقی میں ہیں ہمیشہ سیر کرتا اور دین کی محافظت کرتا پھرتا ہے۔ اسی کام میں پچاس برس سے زیادہ مدت گزر گئی۔ (مراد المریدین)

مولانا پہلی بار ۱۲۵۰ھ میں جونپور سے کلکتہ روانہ ہوئے اس سفر کی مختصر روداد سنیے۔

کلکتہ روانگی اوپر ذکر آ چکا ہے کہ شوق کے باوجود حضرت سید احمد شہید نے جس طرح مولانا محمد علی رامپوری اور مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی کو تحریکِ جہاد کی شرکت سے روک کر معرکۂ بالاکوٹ سے پہلے ہی دعوت و تبلیغ کے کام کے لیے ہندوستان کے مختلف خطوں میں روانہ فرما دیا تھا اسی طرح مولانا کرامت علی صاحب کو اپنے یہاں مختصر قیام کے بعد واپس کر دیا اور ان کے لیے مشرقی ہند کا خطہ منتخب کیا، رخصت کرتے وقت فرمایا کہ ہدایت کے کام میں لگ جاؤ، مرشد کی ہدایت کے مطابق مولانا نے کچھ دن جونپور اور اس کے نواح میں اصلاح کا کام کر کے بنگال و آسام کا قصد کیا، جونپور سے روانہ ہوئے تو پہلی منزل کلکتہ ہوئی، جونپور سے کلکتہ پہنچنے میں تقریباً ایک ماہ لگ گئے[1]، کلکتہ میں حضرت سید صاحبؒ کے متعدد خلفاء

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) بنگال کو مسلمان صوبہ بنانے میں مولانا کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ الحاج محمد احمد خان ایم۔ اے اپنی کتاب "سوانح حیات خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ" میں لکھتے ہیں "زوال سلطنت اسلامیہ کے باوجود ملکہ اس کے بعد اس کثرت سے مسلمان ہونا شروع ہوئے کہ مشرقی بنگال پورا پورا مسلمان ہو چکا ہے۔ یہ کوشش صرف جونپور کے ایک بزرگ کی تھی جنھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں ایک کروڑ سے زیادہ غیر مسلموں کو مسلمان بنا دیا۔ آپ کا نام نامی مولوی کرامت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ (۸۵۔ بحوالہ روایت مولانا عبد الباطن صاحب)

[1] یہ جزائر ہند کے جزیروں میں ایک جزیرہ

[2] مولانا کے اہل خاندان اور خود مولانا کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا مع اہل و عیال روانہ ہوئے اور ہمیشہ اہل و عیال ساتھ رہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اس سے پہلے اس دیار کا سفر کر چکے تھے ورنہ ایک اجنبی جگہ مع اہل و عیال سفر کرنا ظاہری طور پر کسی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتا، گو کہ اللہ والوں کا معاملہ بالکل جدا ہوتا ہے۔

ومتوسلین مثلاً مولانا وجیہہ محدث مدرس اول مدرسہ عالیہ مولانا حافظ جمال الدین صاحب، مولانا قاضی عبدالباری موجود تھے، مولانا کی آمد سے ان حضرات کو بیحد مسرت ہوئی کئی دن کلکتہ میں مولانا کا وعظ ہوتا رہا، جس کا عوام وخواص پر بڑا اچھا اثر ہوا، پھر یہیں سے مولانا کے مشرقی بنگال کے تبلیغی دورے کا پروگرام بنا، مشرقی بنگال و آسام میں مولانا کے دوروں اور ان کے کاموں کی تفصیلات بہت طویل ہیں۔ مولانا عبدالباطن صاحب کی زبانی مختصر روداد درج ذیل ہے۔

حضرت مولانا نے کلکتہ سے فارغ ہوکر، بنگال و آسام کا دورہ بذریعہ بوٹ شروع کیا، اس وقت ریل وجہاز کی سہولتیں جو اب ہیں، نہ تھیں، سفر میں ہزاروں طرح کی دقتیں اور رکاوٹیں حائل تھیں، ہر مشکل وآزمائش کا مقابلہ مردانہ وار کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں دشمنان دین اور مخالفین شریعت کہیں کہیں راہ میں روڑے بن کر آئے۔ سید صاحب کی دعائے خاص اور مولانا کے خلوص نیت کی برکت نے تبلیغی رفتار میں کہیں رکاوٹ اور تنزلی پیدا نہ ہونے دیا، رفتہ رفتہ دشمن دوست اور مخالف شریعت پابند شریعت ہوگئے، مولانا کا صبح و شام کا مشغلہ رد شرک و بدعت تھا، جس کو تقریر و تحریر سے ظاہر فرماتے رہے، اسی طرح ارکان دین اور احکام شریعت کو بسط کے ساتھ لوگوں کو سمجھاتے اور اسی کا پابند کرنے کی کوشش کرتے، جس جگہ مسجد نہ ہوتی، وہاں مسجد بنانے میں جد وجہد فرماتے، جس جگہ مدرسہ یا مکتب کی ضرورت سمجھتے وہاں مدرسہ و مکتب قائم کرتے، تاکہ لوگوں میں دینی ترقی کی بنیاد مستحکم ہو اور ہدایت و تبلیغ کی جڑ مضبوط اور دیرپا ہو، جس کا ذریعہ دینی علم اور مدرسہ ہو۔

سفری مدرسہ

حضرت مولانا کا سارا وقت اور سارا سال دورہ و سیاحت میں صرف ہوتا تھا اس لیے ضرورت وقت کی بنا پر اپنے ہمراہ سفری مدرسہ قائم کیا، جس میں مقامی باشندوں کو تعلیم و تدریس کے ذریعہ پابند عمل و عقائد بنا کر اور احکام شریعت سے خوب واقف کرا کر اطراف وجوانب میں اعلاء کلمۃ اللہ اور دعوت حق کے لیے بھیجتے، اس سفری مدرسہ کے اخراجات و نیز طلباء کے مصارف خوراک کے ..... مولانا خود کفیل ہوتے، چونکہ آپ بوٹ سے دریائی سفر کرتے اور اہل وعیال بھی ہمراہ ہوتے، اس لیے ایک بوٹ مدرسہ کے لیے بھی مخصوص تھا، جس پر ظاہری تعلیم، درستگی اعمال وعقاید کے علاوہ روحانی تعلیم، تزکیۂ نفس، درستگی اخلاق و اخلاص اور ذکر اذکار کا طریقہ اور مقامات سلوک کی بھی تعلیم ہوتی تھی، اس سفری مدرسہ سے جو حضرات فارغ ہو

کر نکلے۔ وہ خود ایک زبردست مبلغ ثابت ہوئے۔ ان صحبت یافتہ مبلغوں نے بنگال کے گوشہ گوشہ میں مولانا کی ہدایت کے مطابق اور ان کے بتائے ہوئے دستور العمل کے موافق دین اسلام کی بہت ٹھوس خدمات انجام دیں جس کا مبارک اثر آج تک باقی ہو۔

یوں تو مولانا نے پورے بنگال اور آسام میں دعوت و تبلیغ کا کام کیا مگر چند ضلعے آپ کی تبلیغی سرگرمیوں کا خاص مرکز رہے ہیں، ڈھاکہ، میمن سنگھ، رنگ پور، دیناج پور، فرید پور، بریسال، آسام میں گوال پاڑہ، کامروپ، دھوبڑی وغیرہ خاص طور پر نواکھالی میں مولانا کا کام سب سے زیادہ تھا، مولانا عبدالباطن صاحب اپنے سفر کے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"احقر نے متعدد بار اضلاع بنگال، ڈھاکہ، میمن سنگھ، رنگپور، دیناج پور، پبنہ، فرید پور، بریسال تپرہ، و اضلاع آسام میں گوال پاڑہ، کامروپ، دھوبڑی کے دیہاتوں کی سیاحت کی، تو ہر جگہ مولانا کی اصلاح و تبلیغ کا اثر پایا، بہت سے مقامات پر دوران سیاحت میں احقر کا گزر ہوا، تو لوگوں نے بتایا کہ اس اطراف میں فلاں بزرگ کو مولانا کرامت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا تھا، ان بزرگ سے دیس کو بہت ہدایت ہوئی، خاص طور پر نواکھالی کا پورا ضلع مولانا کے حلقۂ اثر میں تھا، نواکھالی میں سید صاحب کے ایک خلیفہ حضرت مولانا امام الدین صاحب پہلے سے موجود تھے، اور ان ہی کے ایماء سے مولانا نے نواکھالی کو اپنے کام کا خاص مرکز بنایا۔

اس کی کچھ تفصیل مولانا کے پوتے کی زبانی سنیے۔

پھر نواکھالی کی طرف بہ تحریک اپنے پیر بھائی ولی کامل شیخ طریقت حضرت مولانا امام الدین صاحب مرحوم سودا رامی جو اجل خلفاء سید صاحب ہیں تشریف لے گئے، نواکھالی پہنچنے پر حضرت مولانا جونپوری سے باشندگان نواکھالی بڑی عقیدت و محبت سے پیش آئے۔ اور جلد مطیع و فرمانبردار ہو گئے اور صحیح معنوں میں نمونۂ انصار بن گئے، اور شل پروانہ مولانا پر نثار ہونے لگے، اور مولانا کی خدمت گزاری کو سرمایۂ آخرت شمار کرنے لگے، مولانا ان لوگوں کے حسن اخلاق سے بہت خوش ہوئے، آپ کی قلبی مسرت اور دعا کا اثر آج تک نواکھالی اور اس کے سارے ضلع میں باقی ہے چنانچہ آج بھی باشندگان ضلع نواکھالی بہ نسبت اور اضلاع کے پابند شریعت اور اسلامی لباس کے شیدا ہیں، اس ضلع میں بکثرت مدرسے، نمازیوں سے آباد مسجدیں آپ کو گاؤں گاؤں میں ملیں گی، غریب سے غریب گھرانہ بھی پردۂ شرعی کا پابند ملے گا۔

ایک مکان سے دوسرے مکان میں جانے کے لیے پالکی اور کشتی کے علاوہ برقعہ کا رواج ہے، غریب ہے تو چادر و چھتری کو استعمال میں لاتا ہے، نواکھالی ضلع میں غسل کرنے کے لیے تالاب بنے ہوتے ہیں، عورتوں کے غسل کے لیے یہ انتظام دیکھ کر دل بہت خوش ہوا کہ ان کو بے پردگی سے بچانے اور پردہ قائم رکھنے کے لیے بانس کی ٹٹی کی لانبی کشادہ سرنگ بناتے ہیں جس کا تعلق زنانہ مکان سے تالاب تک ہوتا ہے۔ عورتیں اسی سرنگ کے اندر سے بے تکلف تالاب میں آکر غسل کرتی ہیں، کہیں سے سامنا نہیں پڑتا، دین کی اہمیت اور محبت نے اس مشکل کام کو کتنا آرام دہ اور آسان بنا دیا، مسلمانان نواکھالی کا یہ طریقہ نمونہ عمل ہے، اس ضلع کے بچے بچے تک اسلام بلکہ جیسی بڑی سنت کے پابند ہیں، علماء و فضلاء اور طلباء کی تعداد بھی اس ضلع میں نسبتہً اور اضلاع کے بہت زیادہ ہے، بنگال و آسام کے اضلاع میں اکثر نواکھالی کے مبلغین و مدرسین دینی خدمت انجام دے رہے ہیں، اور حضرت مولانا کی ہدایت کی توسیع میں لگے ہوئے ہیں۔

احقر نے متعدد بار اضلاع بنگال اور اضلاع آسام کے دیہاتوں میں سیاحت کی، تو سب جگہ نواکھالی کے مولوی صاحبان کو دینی خدمت میں تن دہی و انہماک سے کام کرتے ہوئے پایا، دیہاتوں میں ان لوگوں نے مدرسے، مکتب قائم کیے، مسجدوں میں جمعہ و جماعت سے رونق بخشی، بچوں کو قرآن پاک اور ضروری مسائل دینیہ سے واقف کرایا، قرأت کی مشق کرائی، یہ سب حضرت مولانا کی تعلیم و دعا کی برکت کا اثر ہے۔ اس ضلع میں سمندر کے وسط میں ایک جزیرہ ہے، جس کا نام سندیپ ہے جس زمانہ میں احقر کا سندیپ جانا ہوا تھا تو معلوم ہوا کہ اس جزیرہ میں ۔۔ علماء موجود ہیں، اسی جزیرہ میں والد محترم مولانا حافظ عبد الاول رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، اس جزیرہ کے علماء اور ان کی علمی ترقی، عوام اور ان کی اخلاقی ترقی و مہمان نوازی کا کچھ حال حضرت والد مرحوم نے اپنے عربی کے ایک رسالہ "المجلۃ الادیب لاجلۃ السندیپ" میں تحریر فرمایا ہے، جو لائق دید ہے۔

اس زمانہ میں بنگال میں ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے کے لیے کشتی کا استعمال ناگزیر تھا، مولانا کے ساتھ اہل و عیال اور طلبائے علوم دینیہ کا بھی ایک جم غفیر رہتا تھا، ان سب کے لیے کشتی کا انتظام کرنا پڑتا تھا، اس پر مولانا کو سیکڑوں روپے روزانہ خرچ کرنے پڑتے تھے، جس کی وجہ سے بسا اوقات مقروض ہو جاتے تھے، اور کبھی کبھی سخت عسرت اور تنگدستی کا سامنا ہو جاتا تھا، کئی جگہ مولانا نے اپنی کتابوں میں ان دقتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

اب کی بار سفر میں چند روز کچھ تکالیف ظاہری ایسی ہوئی تھیں کہ بعضے ہمراہیوں کو کچھ وسواس آگیا تھا، مگر ہم کو اللہ تعالیٰ نے استقامت کے ساتھ رکھا تھا۔ (مراد المریدین)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

اس فقیر کے ساتھ کئی بوٹ تھا، اور ایک سو روپیہ ہر روز کا خرچ ہے اور بعضے مقام سے لوگ دعوت کر کے فقیر کو لے گئے، اور دس روز میں ہزار روپیہ خرچ کرنا پڑا، اور ان لوگوں نے نہ سمجھا، اور فقیر مقروض ہو گیا (〃)

مولانا نے بنگال و آسام میں کتنی دقتوں اور مشکلات سے دعوت دین کا کام انجام دیا، اس کی پوری تفصیل تو ہمارے سامنے نہیں ہے، مگر مولانا کے پوتے مولانا کے سوانح کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

جس وقت مولانا کی تشریف آوری بنگال میں ہوئی تو آپ نے دیکھا اور سنا کہ بہت سے مقاموں میں اسلام صرف نام کا رہ گیا ہے، اور وہاں تبلیغ کی سخت ضرورت ہے، اس وقت مولانا نے ان مقامات کا دورہ خصوصیت کے ساتھ فرمایا، اور جو جو مشکلیں پیش آئیں ان سب کو صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے ہدایت فرماتے، وعظ سناتے، اور احکام شریعت بتلاتے رہتے، سخت سے سخت تکلیف نے بھی آپ کو اپنے ارادہ و عزم سے ہٹنے نہ دیا، مصائب و مشکلات کے پہاڑ نے آپ سے ٹکر لی، مگر آپ کے قدم ہمیشہ ثابت قدم رہے، بلکہ دین کے لیے سرفروشانہ رفتار اور بھی تیز تر ہو گئی۔ مولانا کے پرانے خدام سے سنا گیا کہ بعض مقاموں میں مولانا کو سخت تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں کہیں کہیں فاقے کرنے پڑے، کسی مقام پر صرف کدو جوش دے کر، فاقہ توڑا گیا، ایک مقام پر کئی دن تک صرف کدو ابال کر گزر کی گئی حضرت مولانا اور ان کے مخلص ہمراہیوں کو ان حالات میں برکات اخروی کا مشاہدہ ہوا، بعض جگہ دشمنان دین اور خلاف شرع پیروں نے مولانا کو ہلاک کرنے کی ناپاک کوشش کی، آپ بطور احتیاط اعداء دین کے شر سے محفوظ رہنے کیلیے بوٹ کو ساحل دریا سے دور لنگر انداز کرتے اور بنگلہ ترجمان کے ذریعہ بنگلہ زبان میں مسائل دینیہ لوگوں کو بتلاتے، جہلاء اور پابند رسوم عوام اُن دینی احکام اور مسائل کو نئی بات اور اپنی رسومات اور اپنے عقیدے کے خلاف تصور کر کے دشمنی اور ایذا رسانی کے لیے کمر بستہ ہو جاتے، اور کنارہ دریا سے بوٹ پر پتھر اور ڈھیلے مارتے، طرح طرح کی ایذا پہونچانے کی کوشش کرتے، اسی طرح کے واقعے مولانا کو سفر بنگال میں متعدد مقاموں میں پیش آتے رہے، جب اہل

ساحل دو چار دوز ان دینی باتوں کو دور سے سنتے اور مولانا کے استقلال اور اسلامی جاہ و جلال کو دیکھتے تو یہ سمجھ کر کہ یہ شخص بے غرض ہم لوگوں کو ایسی ہی باتوں کی تعلیم کرتا ہے جس میں ہمارا ہی فائدہ ہے اور خیر خواہی ہے ۔ ایک ایک دو دو کرکے بوٹ پر آتے اور توبہ کرکے داخل بیعت ہوتے اور تابع فرمان شریعت بن جاتے۔ اس وقت مولانا نے اصلاح کا صرف ایک ہی پہلو پیش نظر رکھا تھا، کہ لوگوں کو نرمی کے ساتھ سمجھا کر، شرک سے توبہ کراتے۔ کلمہ پڑھوا کر سنتے، اور اس کی تصحیح فرماتے، اس کے معنے سمجھاتے اور درستگی اعتقاد کی پوری کوشش فرماتے، کہ دین کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔ اسی طرح ارکان اربعہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ پر بیعت لیتے۔ اور اس پر پابندی کا اقرار لیتے۔ جب اس قدر اصلاح و ہدایت ہوچکتی تو پھر رسومات جہالت اور بدعتوں کی تردید فرما کر سنت کی حقیقی شاہراہ پر لاکر کھڑا کرتے۔ اس مقام پر پہنچ کر، وہ صحیح العقیدہ اور پختہ مسلمان بن جاتا۔

اسی سلسلہ ہدایت میں آپ کا گزر ایک ایسی بستی میں ہوا۔ جہاں ایک مسلمان زمیندار بڑا ظالم اور عالموں کا دشمن رہتا تھا۔ اس نے بعض عالموں کو بے قصور مروا ڈالا تھا۔ جب اس کو آپ کے پہنچنے کی خبر ہوئی، تو اس نے مولانا کو بلوا بھیجا، اس وقت متعقدین میں کہرام مچ گیا۔ اور اکثر لوگ مولانا کو یہ مشورہ دینے لگے کہ کسی صورت سے اس کے آدمی کو ٹال دیا جائے، اور موقعہ پاکر کسی وقت یہاں سے چلے جائیے لیکن مولانا کچھ بھی ہراساں نہ ہوئے، اور ان لوگوں کو تسلی و تشفی دے کر، اس زمیندار کے مکان پر تشریف لے گئے، وہ زمیندار معمولاً کسی کو زمین پر بھی بیٹھنے کا اشارہ نہ کرتا۔ آپ کو دیکھتے ہی ایک کرسی بیٹھنے کو دی، آپ سے خدا کی وحدانیت پر تکرار شروع کر دیا۔ مولانا ہر چند اس کو سمجھاتے اور بہت نرمی کے ساتھ دلائل عقلی و نقلی بیان فرماتے، لیکن وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھتا تھا پھر کہنے لگا کہ آپ کی ان تقریروں سے اگر میں نہ سمجھوں تو آپ کیا کیجئے گا آپ نے فرمایا کہ ایک بار دو بار تین بار سمجھاؤں گا، تب اس نے کہا اگر جب بھی نہ سمجھوں، اس وقت آپ نے میان سے تلوار کھینچ لی، اور فرمایا کہ اس سے تم کو سمجھاؤں گا، مولانا کے اس جوش اسلام اور حرارت ایمانی کو دیکھ کر وہ ڈر گیا، اور کہنے لگا، کہ میں نے اس مسئلہ کو کئی مولویوں سے اور بھی دریافت کیا، لیکن وہ لوگ میری ایسی کہنے اور حضور حضور کہنے لگے، تب میں نے غصہ ہوکر، ان کے قتل کا حکم دیا، کہ ان سے دین کی بربادی ہوتی ہے، بے شک آپ سچے ہادی ہیں، آپ کی ذات سے دین اسلام کی تازگی اور رونق ہوگی، پھر اس زمیندار نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور سچا معتقد ہوگیا۔

اعلانِ حق اور بعض باطل عقیدوں کی اصلاح

مولانا ابتدا میں بدعت و رسومات کے بارے میں زیادہ سخت انداز اختیار نہ فرماتے، مگر جو لوگ کسی درجہ میں مولانا سے مانوس ہو جاتے تھے، ان کو بدعات و رسومات سے ضرور روکتے، آپ کی ان اصلاحی کوششوں کا دائرہ جوں جوں وسیع ہوتا گیا، اہل بدعت اور دوسرے لوگوں نے آپ کی مخالفت کرنی شروع کر دی، اسی کے ساتھ انگریزوں اور ان کے ہم نوا علما نے سید صاحب اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کو اور ان کی تحریک دعوت و جہاد کو پورے ہندوستان میں بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا جس کا اثر بنگال کے جہلا میں بھی تھا جب ان مخالفین کو معلوم ہوا کہ مولانا جونپوری بھی اسی سلسلۂ طلائے ناب کی ایک زریں کڑی ہیں، تو ان کی مخالفت اور بڑھ گئی، روزانہ سید صاحب اور مولانا اسماعیل شہید کے بارے میں اور ان کی کتاب تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم کے بارے میں مولانا سے استفسار کرتے، ایک طرف مولانا کی اصلاحی کوششوں کی مخالفت تھی ہی ادھر سید صاحب کی نسبت نے اس مخالفت کو دو آتشہ کر دیا، مگر مولانا نے ایک دن کے لیے بھی مداہنت سے کام نہیں لیا، بلکہ نہایت صفائی سے جواب دیا، بلکہ بعض سوالوں کے جواب میں پورا پورا رسالہ لکھ ڈالا۔ "ذخیرۂ کرامت" "قامع المبتدعین" اور "استقامت" وغیرہ اسی سلسلہ کی کتابیں ہیں۔ اس میں سب سے پیش پیش کوئی مخلص الرحمٰن نام کا ایک آدمی تھا جو کلمہ میں اپنا نام شامل کر کے اپنے ماننے والوں سے بیعت لیتا تھا، کئی بار مناظرہ سے اسے خاموش ہونے پر مجبور کر دیا، اسی طرح میلاد، عرس، فاتحہ رسمیہ وغیرہ کے بارے میں لوگ آپ سے استفسار کرتے اور الجھتے رہے مگر آپ اتمام حجت کے طور پر ان مسائل پر گفتگو فرماتے اور اپنے کام میں لگے رہتے۔

بنگال میں ایک فرقہ منکرین جمعہ کا پیدا ہو گیا تھا جو اپنے کو لاجمعہ کہتا تھا۔ اس کا سرگردہ مولوی عبدالجبار نامی ایک شخص تھا۔ مولانا نے کو اپنے دلائل سے اس کے سرگردہ عبدالجبار کو خاموش کر دیا تھا۔ اور اس نے مولانا کے ہاتھ پر توبہ کی مگر پھر بھی وہ اپنی سازشوں سے باز نہیں آیا اور مولانا کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ڈالیں مگر بفضلہ تعالیٰ آپ کے مخلصانہ کام کو نقصان نہیں پہنچا اور ان تمام اہل مکر کو منہ کی کھانی پڑی۔

سُرمہ
دُرِّ نجف
- آنکھوں کی تمام بیماریوں کا دشمن
- بینائی کا محافظ
- اسے روز کا معمول بنائیے تو نگاہ انشاء اللہ آخر عمر تک قائم رہے گی۔
- درِّ نجف لگتا نہیں بلکہ ٹھنڈک اور فرحت پہونچاتا ہے۔
- سُرمے کے ساتھ ہماری جستی کیمیائی سلائی بھی طلب فرمائیے۔
سونے چاندی کے ورق
سچے موتی
اور
۲۶ دواؤں کا
مرکب
ایک تولہ: چھ روپے
چھ ماشہ ساڑھے تین روپے
ڈاک خرچ ڈھائی روپے
کوئی سی بھی تین شیشی ایک ساتھ طلب کرنے پر ڈاک خرچ معاف
تاجر حضرات شرائط کمیشن طلب کریں
دار الفیض رحمانی۔ دیوبند (یو۔پی)

Regd No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 38 NO. 3 JUNE 1970

مرتبہ

عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت فی کاپی ۷۵ پیسے

جلد ۳۸ | بابت ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق جولائی سنہ ۱۹۷۰ء | شمارہ ۴

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ر جولائی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجکر ہمیں براہ راست اسکی اطلاع بھی دیں، انھیں وی پی اب نہیں کیا جاسکے گا لہذا ۲۰ر جولائی تک چندہ کی اطلاع نہ ملنے کی صورت میں ہم مجبور ہونگے کہ رسالہ بھیجنا بند کر دیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۵ر تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ر تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

ایک معاصر نے فسادات کے سلسلہ میں ایک بہت ہی قابلِ غور پہلو کی نشاندہی کی ہے جس کا حق ہے کہ ملت کے زیادہ سے زیادہ افراد تک اُسے پہونچانے میں حصہ لیا جائے۔ معاصر نے لکھا ہے:

"...... موجودہ فرقہ وارانہ بلووں کو دیکھئے تو ایک بڑی عبرت انگیز حقیقت سامنے آئے گی۔ یہ بلوے زیادہ تر اُن مقامات پر ہو رہے ہیں جہاں مسلمان اقتصادی اعتبار سے اچھی حالت میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلوائیوں کو کسی نے حکم دیا ہو کہ مسلمانوں کی اقتصادیات کو کچل ڈالو۔

سزا کا نشانہ اقتصادیات کو بنانا ظاہر کرتا ہے کہ ہم سے کوئی اقتصادی غلطی ہو رہی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو اس حقیقت تک پہونچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ ہمارے خوشحال لوگ دینی معاملات میں جو سب سے بڑی اقتصادی غلطی کر رہے ہیں وہ یہ کہ اپنے اموال میں سے خدا کا حق ادا نہیں کرتے۔ نماز روزہ اب بھی مسلمانوں میں کافی پایا جاتا ہے۔ شراب اور سُود سے اجتناب کرنے والے بھی بے شمار ہیں مگر ایسے لوگ ایک فی صدی سے بھی کم ہیں جو صاحبِ نصاب ہونے کے بعد باقاعدہ شرعی طریقہ پر اپنی زکوٰۃ نکالتے ہوں۔

.... اگر مسلمان اس فریضہ کو باقاعدہ شرعی طور پر ادا کرنے لگیں تو قرآن کی بنیاد پر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صورتِ حال (اقتصادی مار) ختم ہو جائے گی اور بلوائیوں کے لیے ان کے مال حرام ہو جائیں گے جو آج ان کے لیے اس طرح مُباح کر دیے گئے ہیں گویا ان کا کوئی والی وارث ہی نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس دنیا کو بے والی وارث اور اس میں متحرک طاقتوں کو بے مہار نہیں سمجھتے بلکہ ایک عزیز و حکیم ہستی کا عقیدہ رکھتے ہیں جس کے اذن و ارادے کے بغیر یہاں پتہ بھی نہیں ہلتا اور جس کا کوئی اذن و ارادہ بلند ترین درجے کے حکیمانہ مقاصد سے خالی نہیں ہو سکتا ــــــ جیسے کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے ــــ اُن کے لیے یہ سمجھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ ان فسادات میں اس مالکِ کائنات کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے یا اس کا کوئی مقصد اس میں کام نہیں کر رہا ہے۔ ان فسادات کے کچھ قابلِ غور پہلوؤں پر نظر ڈالئے تو ایک طرح سے یہ حقیقت آنکھوں سے دکھائی دینے لگے گی کہ یہ بس خدا کا ارادہ اور اُس کی مشیت ہی ہے کہ فسادات کا سلسلہ مٹنے میں نہیں آتا۔

(۱) حضرت آدم کے فرزند آنکھ کان، دل جگر، گوش و ہوش، عقل و خرد اور علم و نظر کی نعمتوں سے کم و بیش سرفراز ہوتے ہوئے، اچھی خاصی ایک تعداد میں تھوڑے نہ بہت، دس اور بیس سال سے اپنے ہی ابنائے جنس بلکہ برادرانِ وطن کے ایک طبقے کے خلاف اس ظلم و بربریت کا منصوبہ چلا رہے ہوں جس کے مناظر سے پتھروں کے جگر شق ہو سکتے ہیں، دھرتی کا قرار جا سکتا ہے اور کائنات سکتہ میں آ سکتی ہو، لیکن ان ابنائے آدم کی نہ آنکھ ان جگر خراش مناظر پر اپنا کام کرتی ہے، نہ کان حق ادا کرتے ہیں، دل و جگر جیسے پتھر کے ہو گئے ہوں اور عقل و خرد پر گویا پتھر پڑ گئے ہوں۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ[ع۵] کی جیتی جاگتی تصویر!

(۲) علیٰ ہذا اس پڑھے لکھے اسکیم ساز اور شر آفریں طبقے کا آلۂ کار جو ابنائے آدم بنتے ہیں وہ سب کے سب بھی کوئی اُجڈ اور وحشی نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر، انجینیر اور اچھے اچھے خاندانوں کے طالب علم تک اس بربریت میں حصہ لے رہے ہیں۔ اور حصہ بھی کیسا؟ کہ نہ پڑوسی کی تمیز، نہ دوست کی تفریق، نہ ساتھی کا لحاظ اور نہ ہم سبق کا پاس! پڑوسی کی گردن پر بھی چھرا چل رہا ہے، اس کے بیوی بچے بھی ذبح ہو رہے ہیں، اس کا مکان بھی لوٹا جا رہا ہے، دوست اور ساتھی کے ساتھ بھی یہی سب ہو رہا ہے،

ع۵ ان کے دل ہیں مگر اُن سے سمجھتے نہیں، اور اُن کی آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں اور اُن کے کان ہیں پر اُن سے سُنتے نہیں، یہ لوگ بالکل چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی بھٹکے ہوئے۔

ہم جماعت دہم سبق بھی ایک غیر و اجنبی کی طرح نشانۂ ستم ہے!

(۴) اور آگے بڑھیے۔ لگ بھگ پچاس کروڑ کی قوم ہے جس سے یہ دونوں (اسکیم ساز اور آلۂ کار) طبقے تعلق رکھتے ہیں! کیسے کیسے اچھے لوگ اس انسانی سمندر میں نہ ہوں گے اور اُن اچھوں کی تعداد کم سے کم بھی ہوگی تب بھی کیا اتنی نہ ہوگی کہ وہ اگر اثر انداز ہونے کا ارادہ کرلے تو اس بربریت کو جاری رہنے کی راہ نہ مل سکے؛ مگر یہ اچھے، نیک دل اور فرض شناس و باصلاحیت لوگ اپنوں ہی میں کے کچھ لوگوں کے ہاتھوں انسانیت کی اس تاراجی اور بے گناہوں کی بربادی کے اس مسلسل اور ہوشربا عالم میں بھی، جبکہ ضمیر اور احساسِ فرض کی دُنیا تہ و بالا ہو جانی چاہیئے، کسی طرف سے بھی اٹھتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ سچ مچ کی کوئی جنبش نہیں، کوئی حرکت نہیں، جیسے ان کی بھی آنکھیں نہیں ہیں جو کچھ دیکھیں، کان نہیں ہیں جو کچھ سُنیں، دل نہیں ہیں جو درد سے تڑپیں، عقلیں نہیں ہیں جو اس کا انجام سوچیں اور ضمیر پر موت کی نیند ہے، جس سے اثر پذیری کا سوال ہی نہیں!

سوچیے کہ یہ غیر فطری حالت کسی انسانی آبادی پر اتنی طویل مدت بغیر اس کے طاری رہ سکتی ہے کہ قلب و نظر، سمع و بصر اور احساس و ادراک کے خالق و مالک ہی نے اسے طاری کر رکھا ہو؟ ورنہ اتنی بڑی مدت میں تو اوّلاً تھوڑے بہت لوگ خود اسکیم ساز اور سرچشمۂ فساد طبقے ہی میں سے نکل آنے چاہیئے تھے جنھیں ان کا ضمیر ملامت کرتا اور تلافیِ مافات کی خواہش اُن کے اندر اُبھرتی ــــ چلیے نہ ہوا سہی اس طبقہ میں کوئی ردعمل، بہت چھنٹے ہوئے قسی القلب یہ لوگ تھے، بہت سوچ سمجھ کر اور دلوں کو بالکل پتھر کر کے اور پھر ٹھوک بجاکے یہ کام انھوں نے شروع کیا تھا۔ مگر ان کے آلۂ کار طبقے کا تو یہ حال نہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ سب کے سب تربیت یافتہ بھی مان لیے جائیں تب بھی جس بڑی تعداد میں ان کا ہجوم ہوتا ہے اس میں کچے اور پکے سب ہی طرح کے ہونا لازم ہیں۔ کچھ نہیں تو کچے عنصر ہی میں یہ ردعمل کسی وقت ہونا تھا، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ اس طبقہ میں بہت بڑا عنصر بالکل غیر تربیت یافتہ عوام کا ہوتا ہے جو محض اشتعال انگیز نعروں سے شریک کار کرلیے جاتے ہیں۔ مگر اس پر بھی کوئی قابلِ ذکر مثال سامنے نہیں آتی کہ فلاں بلوے میں حصہ لینے والے اتنے آدمیوں نے اس بلوے کے لرزہ خیز نتائج پر ندامت کا اظہار کیا۔ اور ان بہیمانہ افعال سے فطری نفرت ان میں جاگ اٹھی!

اچھا کوئی توجیہ اس دوسرے طبقے کے لیے بھی ایسی کر لیجئے جس کے سہارے آپ یہ ماننے سے بچ سکیں کہ اس انتہائی خلافِ فطرت حال پر قائم رہنے میں ارادہ خداوندی کا کوئی دخل نہیں ہے لیکن اس تیسرے طبقے کو کیا کہیے گا جو کم و بیش پچاس کروڑ آبادی کے نیک دل، نیک نفس اور فرض شناس و باصلاحیت افراد سے مل کر بنتا ہے؛ انھیں انسانیت کی یہ جامہ دری ناپسند ہے۔ بربریت کے اس عریاں رقص پر ان کے اندر نفرت پائی جاتی ہے، ان کا دل بے گناہوں کے اس مسلسل قتلِ عام پر ملول اور راہنوں کی ان حرکتوں پر شرمسار ہے۔ ضمیر کو ٹھوکے بھی لگتے ہیں۔ مگر قدم جنبش میں نہیں آتے، ہاتھوں کو حرکت کوئی نہیں ہوتی، ادائے فرض کے لیے کمر باندھنا ایسا لگتا ہے جیسے اس کی صلاحیت ہی نہ ہو ــــ گویا اٹھنا چاہتے ہیں مگر اُٹھ نہیں سکتے۔ قدم بڑھانے کی خواہش ہے مگر بڑھا نہیں سکتے۔ ہاتھوں کو تولتے ہیں مگر ہلا نہیں سکتے!

سارے ملک کا سروے ہم میں سے کسی نے نہیں کیا، مگر بس ایک مثال اس صورت حال کو شاہدے کی سطح پر لے آنے کے لیے کافی ہے ــــ ملک کے وزیر داخلہ مسٹر چوان قریب سے جاننے والوں کی شہادت کے مطابق ایک نیک اور نرم خو انسان ہیں، عملی صلاحیت کے لیے اس سے بڑا سرٹیفکیٹ کیا چاہیے کہ اتنی بڑی مملکت کے وزیر داخلہ ہیں اور ایک نازک ترین وقت میں وزارت دفاع کو سنبھالنے کا قرعہ انھیں کے نام نکل چکا ہے۔ تازہ ترین فسادات (بھیونڈی وغیرہ) کے سلسلہ میں ان کی نیک دلی اور نرم خوئی بھی اس طور پر مشاہدہ میں آچکی ہے کہ ان فسادات کے مظلوموں کا حال پارلیمنٹ میں بیان کرتے ہوئے وہ سچ مچ رو پڑے۔ ایک مظلومہ کا خاص طور پر ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اپنے دلدوز تاثر کا ان الفاظ میں اظہار کیا کہ اس کا جو چہرہ میں نے دیکھا ہے وہ ہمیشہ ہی میرا پیچھا کرتا رہے گا۔ مگر ایک اس دل کا آدمی جو فرض شناسی اور صلاحیت عمل میں بھی منتخب ہے، پھر وزارتِ داخلہ کے جیسے اختیارات بھی اسے حاصل ہیں، وزیر اعظم کے پورے تعاون کی بھی توقع (کم ازکم اس معاملہ میں تقاضائے فرض پورا کرنے کے لیے) اسے بلا کسی شک و شبہ کے ہونی چاہیئے، اسی کے دورِ وزارت میں ان اندوہناک فسادات کو وہ ترقی ہوتی ہے کہ کمیت و کیفیت ہر دو اعتبار سے پچھلے تمام ریکارڈ گرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس تین چار برس کے پورے عرصہ میں اس کے احساسِ فرض کا یہ حال رہتا ہے کہ کوئی قدم اُٹھانا تو کیا اوپر ذکر

کیے گئے جیسے تأثرات بھی اس کی زبان پر جب آتے ہیں جب خاص اُس کے گھر میں اور اُس کے معتمد لوگوں کے انتظام میں ایک رسوا کن فساد جنم لیتا ہے۔

اس ایک مثال کی روشنی میں دیکھ لیجئے کہ کیا عجیب و غریب حال اکثریت کے اس طبقے کا ہے جسے بہر حال ان انسانیت کش بلوؤں کے خلاف تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہو جانا چاہیے تھا۔ ایسا طبقہ موجود ہے۔ اور ناگزیر ہے کہ ہو۔ اور اتنی بڑی تعداد پر مشتمل ہو جتنی تعداد کو پچاس کروڑ انسانوں کی ایک آبادی لازماً چاہتی ہے۔ اس طبقہ میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کی بنا پر اسے میدان میں آنا چاہیے اور پھر لازماً مؤثر بھی ہونا چاہیے۔ لیکن وہ نہیں میدان میں آتا، نہیں اس کی فطرت اسے اُٹھانے میں کامیاب ہو رہی ہے۔ تو وہ کیا چیز ہے جو اس کے عملِ فطرت کے راستہ میں رکاوٹ بن گئی ہے؟ کس نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے ہیں؟ کون اس کے ضمیر اور تقاضہائے ضمیر کے بیچ میں کھڑا ہو گیا ہے؟ کوئی چیز ہو جس کا نام ارادۂ الٰہی کے سوا یہاں لے لیجئے؟

یہ ایک معمہ ہمارے اربابِ فکر کے لیے بنا ہوا ہے کہ آدمیوں کے اتنے بڑے سمندر میں، رشیوں اور منیوں کی سرزمین میں، ست اور اہنسا کے دیس میں کوئی مؤثر حرکت اس بربریت اور وحشت کے خلاف نہیں ہوتی، گنتی کے کچھ لوگ بھی نہیں اُٹھتے کہ ہمارے ہوتے ہوئے یہ سب نہیں ہوگا، پورا ملک ایک شمشان گھاٹ بنا ہوا ہے، جہاں بد رُوحوں کے رقص کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں! —— یہ "معمہ" اُسی وقت تک معمہ ہے اور معمہ ہی رہے گا جب تک اس پر دماغ سوزی میں اس عالم کے سب سے بڑے عامل اور (FACTOR) ارادۂ الٰہی کی طرف ذہن نہ جائے۔ جو اس عامل کا قائل نہیں وہ کوئی ایک توجیہ بھی ایسی نہیں لا سکتا جو اس معاملہ میں تحیّر سے نجات دے دے اور تعجب کی خلش دل و دماغ سے نکل جائے۔ اور اس عامل کی کارفرمائی مان لیجئے تو پھر کسی حیرت و استعجاب کا سوال باقی نہیں رہتا۔ اس لیے کہ اس میں یہی طاقت و قدرت ہے کہ جو اور کسی طرح نہ ہو سکتا ہو وہ اُس کے ایک ایما سے ہو جائے۔

پس یہ جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے وہ ارادۂ الٰہی کی کارفرمائی سے ہو رہا ہے اور اس کا ثبوت خود اس سلسلۂ واقعات ہی کے اُن قابلِ غور پہلوؤں میں موجود ہے جو بالکل قدرتی طور سے

ہماری توجہ چاہتے ہیں ـــــ اوپر کی تمام گفتگو کا بس یہی خلاصہ ہے! یہ گفتگو اس سے مختصر عبارت میں بھی کی جا سکتی تھی، مگر کچھ فائدہ نہ سمجھ کر ذرا تفصیلی پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا۔

وہ کون سی حکمت ہے جو اس ارادۂ الٰہی کے پیچھے کام کر رہی ہے؟ کیا مقصد بارگاہِ الٰہی کا اس صورتِ حال سے ہے جو مسلمانوں کے حق میں یہاں پیدا کر دی گئی ہے؟ ــــ کوئی نہیں ہے جو غیب کے ان اسرار سے پردہ اٹھا سکے اور کہہ سکے کہ یہ اس بنا پر ہو رہا ہے اور اس مقصد سے ہو رہا ہے۔ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ یہ کیوں اور کس مقصد سے ہے؛ لیکن اس نے اپنی سنت و عادت اور بندوں کے ساتھ معاملت کے آئین و قانون کا جو بیان اب سے چودہ سو برس پہلے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نازل فرما دیا ہے، اسکی تصدیق اور اس پر ایمان کا تقاضہ ہم سے یہ ہے کہ جب اس طرح کے حالات میں ہم اپنے آپ کو پائیں، اور اپنے اندر وہ احوال بھی ہم دیکھتے ہوں جن کی بنا پر ایسے حالات میں گرفتار کر دینا خدا نے اپنی سنت اور اپنا قانون بتایا اور امم سابقہ میں اس کی مثالوں سے ہمیں روشناس کرایا ہے، تو انتہائی خوف اور خشیت کے ساتھ یہ سمجھیں کہ ہمارے لیے باہر کے یہ ناساز گار اور اذیت ناک حالات اپنے اندر کے انہی احوال کا نتیجہ ہیں۔

اہلِ کفر کے مظالم کا تختۂ مشق انبیاء علیہم السلام اور اُن کے اصحاب و انصار بھی بنے ہیں، صالحین کی جماعتیں بھی ایسے وقت سے گزری ہیں، اور دل ہلا دینے والے ستم اُن پر ہوئے ہیں۔ اور یہ سب تذکرے بھی قرآن پاک ہی میں موجود ہیں۔ لیکن یہ بڑی خود فریبی ہوگی کہ ہم خود کو اُن پر قیاس کرنے لگیں۔ وہ سراپا اطاعت ہم سراپا عصیان، وہ مجسم موعظت ہم سراپا غفلت۔ اُن سے کسی کا جھگڑا اس لیے نہیں تھا کہ کچھ حقوق چاہتے ہیں، کسی کو اُن کے باعزت وجود سے بیر نہیں تھا، اُن کے کاروبار، کھیت اور باغ نہیں تھے جو لوگوں سے دیکھے نہ جاتے ہوں۔ ان سے عداوت اس لیے تھی کہ توحید کی دعوت دیتے اور شرک کو غلط ٹھیراتے ہیں، ان رسوم و رواج میں خدا کی ناراضگی بتاتے ہیں جن کے یہ پشتہا پشت سے خوگر ہیں اور اُن ناانصافیوں اور غلط کاریوں کی مذمت کرتے ہیں جن کی لذّت اور عادت معاشرہ کی نس نس میں سمائی ہوئی ہے۔ اور جہاں مظلومین کی صفت یہ ہو وہاں اس کا سوال ہی کیونکر ہوگا کہ ان پر ہونے والا ظلم عتابِ الٰہی کا عکس

اور اُس کی گرفت کا ظہور ہے وہاں تو مخالفوں کو ظلم وجبر کی آزادی اور قوت دیئے جانے کا ایک ہی مطلب ہوگا کہ حق اور صداقت کی قوت دُنیا کو دیکھنے کا موقع ملے کہ کیسے کیسے مظالم ٹوٹنے پر بھی وہ ایک انچ سمجھوتہ باطل سے نہیں کرتا! اور ساتھ میں حق کا دامن تھام لینے والوں کی آزمائش ہو کہ وہ کہاں تک ثابت قدمی دکھلاتے ہیں اور کیا کیا قربانی خدا کی راہ میں پیش کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہی قانون ابتلاء و آزمائش ہے جس کا اعلان مُومنین کے اس گروہ کے معاملہ میں قرآن مجید میں ایک جگہ یوں فرمایا گیا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ
وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ
وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ
الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا
أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا
لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں
اور پیداواروں کے نقصان سے تمہاری آزمائش
کریں گے۔ تو اُن صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی
کی) بشارت سنا دو کہ جب کوئی مصیبت اُن پر آئے
تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کے ہیں اور اسی کی
طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ
وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ
خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ
الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا
حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ
آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ (البقرہ ع ۲۶)

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ یونہی بہشت میں داخل ہو جاؤ گے
جبکہ ابھی تمکو پہلے لوگوں کی سی مشکلیں تو پیش آئی ہی
نہیں۔ اُن کو (بڑی بڑی) سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں
اور وہ صعوبتوں میں ہلا ہلا دیئے گئے۔ یہاں تک کہ
پیغمبر اور مومن لوگ جو اُن کے ساتھ تھے سب پکار اٹھے
کہ کب خدا کی مدد آئے گی۔

کیا ہم بھی انہی اوصاف کے مالک ہیں جن کے ساتھ مخالفین کو مظالم کی چھوٹ خدا کی ناراضگی اور عتاب کا مظہر نہیں قرار دی جا سکتی بلکہ غایت رضامندی کے ساتھ اس قانون آزمائش کا نتیجہ ہوتی ہے جسے عمل میں لا کر پروردگار دیکھتا ہے کہ اہل ایمان کس درجہ اپنے رب سے وفاداری میں پختہ ہیں اور دُنیا کو یہ دیکھنے کا موقع دیتا ہے کہ اُس کے رسولوں کے پیغام میں کیسی ٹھوس صداقت ہے جو بڑے سے بڑے ظلم وجبر کے آگے بھی اپنے ایک ایک جزو پر مصر رہتی ہے؟ یقیناً ہم ایسا نہیں کہہ سکیں گے یقیناً ہم ایسی

غلط فہمی کا ثبوت اپنے ہی حال کے بارے میں نہیں دیں گے! ہماری زندگی کے شعبوں میں فرق ہے۔ ہم ایمان کے ابتدائی تقاضے پورے کرنے والے بھی کم سے کم تر ہو چکے ہیں۔ کوئی ایک شعبۂ زندگی بھی نہیں جس کے بارے میں ہم اطمینان کر سکیں کہ اتنے میں تو ہم پورے مومن و مسلم ہیں۔ قوم کی مجموعی حالت کے نقشے میں ہمارا عمل ہمارے دعوئ ایمان کی تکذیب کر رہا ہے۔ ہم اس جگہ پر پہنچے ہوئے ہیں جہاں یہ حدیث نبوی مکمل طور سے صادق آتی ہوئی نظر آتی ہے کہ "تم ہر وہ ڈھنگ اختیار کرو گے جو تم سے پہلی امتیں (اپنے دورِ فساد میں) اختیار کر چکی ہیں" اور اس حال میں جب کسی مسلمان قوم کو اہلِ کفر کے مظالم سے سابقہ پیش آئے، بلا کسی جواز کے وہ ستائی جائے اور اس طرح ستائی جائے جیسے مٹا دی جائے گی، ظالموں کے دل اپنے ظلم پر نرم ہونے کے بجائے اور سخت ہی ہوتے چلے جائیں اور انسانیت و مذہبیت کی کوئی اپیل اُن پر کارگر نہ ہو سکے تو اس مسلمان قوم کی کم سے کم سعادت یہ ہے کہ اس صورتِ حال کو اپنے رب کے اس قانونِ گرفت پر محمول کرے جس کا ذکر بنی اسرائیل کے تذکرے میں قرآن مجید جگہ جگہ کرتا ہے، اور جو یہ ہے کہ اپنے آپ کو صاحبِ ایمان کہنے والے اور پیغمبروں سے اپنا رشتہ بتانے والے لوگ جب اپنے عمل سے اس دعوے کی تکذیب کرنے لگتے ہیں، تو پروردگار اپنی حکمت کے مطابق مختلف شکلوں میں ان کی گرفت اسی دنیا میں کرتا ہے، اور اس میں وقت کے بدترین کافروں کے ہاتھوں ذلت و بربادی بھی شامل ہے۔

آج کسی پر دوحی تو بے شک نہیں آ رہی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال ہماری دینی غفلتوں اور معصیتوں پر سزا کی ایک شکل ہے، مگر چودہ سو برس پہلے جو وحی آ چکی ہے اور ہمارا سرمایۂ ایمان ہے، وہ یہ تقاضہ ہم سے کرنے کے لیے کافی ہے کہ پردۂ غیب میں ان حالات کا منشا جو بھی کچھ ہو ہم یہی سمجھیں کہ یہ ہمارے اعمال کی سزا اور سنبھل جانے کے لیے تنبیہ ہے۔ کسی خاص عمل کو اپنی طرف سے متعین کر دینے کا حق بھی کوئی شخص نہیں رکھتا کہ اس کی بنا پر عتابِ الٰہی کو حرکت ہوئی ہے، لیکن ایک خاص عمل جس کی دین میں بڑی اہمیت ہے، ایمان اور کفر کے درمیان اولین خط کھینچنے والی چیزوں میں اُسے رکھا گیا ہے، اور وہ بھی ان چیزوں میں ہے جن میں غفلت اور نافرمانی بہت وسیع پیمانے پر ہمارے اندر آ گئی ہے، تو

ع۵۔ لتتبعن سنن من کان قبلکم شبرا بشبر و ذراعا بذراع الخ

عین ایمان کا تقاضا ہے کہ سب سے پہلے نظر اسی کی طرف جائے۔ یہ ایک خاص چیز کو اپنی طرف سے تعین کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی اولیت اور اہمیت کو ظاہر کرنا ہے کہ توبہ وانابت کا عمل یہاں سے شروع ہونا چاہیے۔

زکوٰۃ کی اہمیت دین میں ایسی ہی ہے کہ کوئی اور کوتاہی ہم سے نہ بھی ہو رہی ہوتی تو تنہا اسی کے معاملہ میں کوتاہی پر ہمارا یہ سمجھنا حق ہوتا کہ ہمیں اس کی پاداش میں پکڑا گیا ہے۔ ایسے اہم فریضہ میں کوتاہی بلکہ لاپروائی کا جو عالم ہے بظاہر کسی دوسرے اس درجہ کے فریضہ میں یہ نوبت نہیں پہونچی ہے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہی نہیں بلکہ حج کا شرف حاصل کرنے والوں میں کتنے ایسے صاحب نصاب ملتے ہیں جو زکوٰۃ کی ادائیگی سے آشنا نہیں۔ ایسے عالم میں جب ایک مومن یہ بھی دیکھے کہ خاص طور پر وہ مقامات مسلم کش بلووں کا ہدف بن رہے ہیں جہاں مسلمان اقتصادی طور سے مضبوط اور خوشحال ہیں تب تو لامحالہ اس کا ذہن اس طرف جانا ہی چاہیئے کہ اس عذاب میں بڑا دخل زکوٰۃ سے لاپروائی کا ہے۔ یہ اقتصادی مار اس لیے دی جا رہی ہے کہ ہم مال کی محبت میں خدا کے حق کو فراموش کر رہے ہیں۔

بہرحال قطعی طور پر تو یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ ہماری کون سی خطا یا کون کون سی خطائیں اس بات کا موجب ہیں کہ اس نوعیت کے حالات ہم پر مسلّط کر دیے جائیں۔ لیکن اتنی بات میں کسی شبہ کی گنجائش قرآن وحدیث کی روشنی میں نہیں نکلتی کہ یہ ہماری کچھ خطائیں اور غفلتیں ہی ہیں جنھوں نے ان ہوشربا حالات کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ہم نے کوئی دعوت رشد وہدایت نہیں بلند کر رکھی ہے کہ اس پر ماحول بگڑ اٹھا ہو۔ ہم تو اس کے برعکس قدم قدم پر اس ماحول سے سمجھوتہ کر رہے ہیں۔ اسلامی قومیت کے بجائے ہندوستانی قومیت کو ہم نے تسلیم کرلیا، ایک قوم سے ایک فرقہ بن جانے پر ہم راضی ہو گئے ہیں۔ اسلام کی عالمگیری کے بہت سے مضمرات سے ہم تبرّی کرتے ہیں۔ اور اسلامی اخوت میں وہ معنیٰ نہ پائے جانے کا اعلان بھی ہماری طرف سے ہو رہا ہے جس کو یہ ماحول پسند نہیں کرتا۔ ہم میں سے جن لوگوں کا کہنا تھا کہ سیکولرازم ہر حالت میں شرک ہے اور اُس کو کسی تاویل کے ذریعہ شرک سے خالی دکھانا محض فریب کاری یا سادگی ہے، وہ بھی بالآخر ایک تاویل کے ذریعہ اسے گوارا کیے جانے کا سرٹیفکٹ دے چکے ہیں۔ ہم سے سوال ہوتا ہے کہ کافر کسے کہتے ہیں تو سیدھا سیدھا جواب دینے کی جرأت ہمارے اچھے اچھے نہیں کرتے۔ انبیاء علیہم السلام کے طرز پر بے لاگ دعوت توحید سے ہمارے اہل دعوت کتراتے ہیں۔ اور اسکولوں میں اپنے بچوں کو دی جانے والی شرک بھری تعلیم پر ایک دن بھی ہمارا وہ ردعمل دنیا نے نہیں دیکھا

جو ہمارے دین و ایمان کا تقاضہ تھا پھر اس حال میں یہ تو نہیں سوچا جا سکتا کہ خدا ہمارے دین و ایمان کی پختگی دیکھ رہا ہے، جیسے کہ ہم سے پہلے بھی پختہ کاروں کو بڑے بڑے مصائب کے ذریعہ آزمایا گیا ہے۔ یہاں تو اپنی یہ کمزوری اور ساتھ ساتھ ان دینی احکام میں بھی مجموعی اعتبار سے پوری قوم کی کوتاہی اور نافرمانی دیکھتے ہوئے جس سے ہمیں کوئی روک نہیں رہا ہے، یہی ماننا پڑے گا کہ قانون ابتلاء کے مصائب نہیں قانون گرفت کے مصائب ہیں جن کا ہم شکار ہیں اور اس بنا پر ان مصائب کا ازالہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم اپنا حال بدل کر خدا سے رحم و کرم کے طلب گار ہوں۔

مصائب و آفات کے ازالہ کی اسبابی تدابیر برحق۔ خدا کا فیصلہ بھی بدلے گا تو اس کی عام عادت و سنت کے مطابق اس بدلے ہوئے فیصلہ کا ظہور بھی اسباب ہی کی راہ سے ہوگا۔ خالی توبہ تلا کرنے سے حالات بدل جانے کی امید کسی کے لیے بھی صحیح نہیں۔ لیکن تدبیر بھی کام دیتی ہے جب تقدیر سازگار ہو۔ تقدیر ساز نہیں کر رہی ہے تو تدبیر کا کارگر ہونا تو درکنار تکمیل تک پہونچنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں، ایک کام جو عام قانون فطرت کے مطابق آسانی سے ہو جانا چاہیئے تقدیر کی ناسازی کے ساتھ وہ جوئے شیر لانے کا مصداق بن جاتا ہے اور یہی چیز ہے جس کا ہم اپنی تدبیروں میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ہم سب محسوس کرتے ہیں اور شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ہمارا اتحاد و اتفاق کسی بھی تدبیر کی کامیابی کے لیے شرط اوّل ہے، مگر اس احساس اور خواہش کے باوجود یہ کام اس درجہ مشکل بنا ہوا ہے جیسے اس کی ضرورت ہی کا احساس نہ ہو۔ ہر کام کے لیے پیسہ چاہیئے اور ہم میں پیسے والے بھی موجود ہیں جن کا ذاتی تحفظ بھی اپنی ملت کے منظم، مضبوط اور باثر ہونے پر موقوف ہے، مگر ان کے دل نہیں کھلتے کہ ملت کی تنظیم و تعمیر پر ان کی دولت صرف ہو۔ ملت کا مفاد چاہتا ہے کہ جماعتی اور گروہی مصلحتیں اس پر قربان کر دی جائیں، مگر ہماری جماعتیں جو سب کی سب ملت کے مفاد ہی کا کلمہ پڑھتی ہیں یہ حوصلہ ان میں سے ایک کو بھی نصیب نہیں کہ اپنے مصالح پر بھی ملت کے مفاد کو مقدم کر دیں۔ غرض تدبیری میدان کے وہ قدم بھی ہم سے نہیں اٹھ رہے ہیں جو بالکل ہمارے اختیار کے بھی ہیں اور کسی شخص کو ان کی ضرورت سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا کیا مطلب ہے سوائے اس کے کہ تقدیر راستہ روکے کھڑی ہے؟ اور پھر اس کا کیا علاج بجز اس کے ہے کہ خدا کو راضی کیا جائے جس کے حکم کا نام تقدیر ہے۔

وہ قوم بڑی خوش قسمت ہے جسے اپنی تقدیر کے قانون کا علم ہو کہ کن اعمال سے تقدیر موافق یا مخالف

ہوتی ہے۔ لیکن پھر وہی قوم سب سے زیادہ بدقسمت ہے اگر وہ اس علم سے فائدہ نہیں اٹھاتی اور تقدیر کی ناموافقت کے اسباب اپنے عمل میں دیکھتے ہوئے بھی ان تدبیروں کی طرف نہیں آتی جن سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ بلکہ صرف ان تدبیروں کے لیے جان گھلاتی رہتی ہے جن کا برسرِ کار آنا تقدیر کی مخالفت کے ساتھ ممکن نہیں۔

ہم جیسے سخت ترین حالات میں ہیں کہ فی الواقع کوئی ایک مکمل تدبیری اسکیم بھی کسی دماغ کی سطح پر ایسی نہیں ابھرتی کہ ان حالات کی تمام پیچیدگیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے عالمِ فکر و نظر ہی میں ہم اس اسکیم کو راہِ نجات ٹھہرا سکیں، ایسے سخت حالات میں ایک خدا ناآشنا قوم کے لیے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ محض دنیاوی تدبیروں ہی کے اندر گھومتی یا اپنے دماغ کو گھماتی رہے۔ کیونکہ اسکے پاس کوئی اور ملجا و ماویٰ اور کوئی اور دل کا سہارا ہی نہیں لیکن جس قوم کا ایمان ایک ایسے حامی و ناصر اور ایسے ملجا و ماویٰ پر ہو جس کی قدرت میں ہر پیچیدگی کا حل اور ہر سختی کا علاج ہے اور جس کی نصرت ہر بڑی سے بڑی رکاوٹ اور مزاحمت کو کاٹ سکتی ہے، وہ بھی ایسے کٹھن وقت میں سب سے پہلے دوڑ کر اس سراپا رحمت و قدرت کے پاؤں نہ پکڑے تو اس سے زیادہ بے نصیب کون ہے؟ مسلمان جو ایک ایسے ہی حامی و ناصر کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس کی رضا جوئی کا طریق بھی جانتے ہیں وہ اگر اپنے ان حالات میں دوسری کسی قوم کی طرح بس اسبابی تدبیروں ہی کا راگ گاتے رہیں اور بے عملی کے سوا کوئی عمل نہ پاکر بھی اپنے اس ناصر و کارساز معبود کی مدد لینے کے لیے نہ دوڑیں تو ان کا مطلب دو باتوں میں سے ایک کے سوا کیا ہوگا کہ یا تو ایمان کے دعوے میں کوئی حقیقت نہیں رہ گئی ہے اور یا انھیں سنجیدگی سے نجات مطلوب ہی نہیں ہے۔

فاتح اندلس طارق بن زیادؒ نے اپنی کشتیاں جلا دینے کے بعد اپنی فوج سے کہا تھا کہ

البحر من ورائکم والعدو امامکم ولیس	تمہارے پیچھے سمندر اور سامنے دشمن ہے اور خدا کی قسم صدق
لکم واللہ الا الصدق والصبر۔	و صبر کے سوا اب کوئی ذریعہ نجات تمہارے پاس نہیں ہے۔

بالکل یہی حال ہم ہندستانی مسلمانوں کا ہے۔ ہم نے بھی سچ مچ اپنے ہاتھ سے اپنی کشتیاں جلائی ہیں۔ خواہ ہم میں سے بعض اپنی ناسمجھی سے ایسا نہ سمجھتے ہوں۔ اور پھر سامنے جو کچھ ہے وہ سب کے سامنے ہے یہاں بھی اصل تدبیر کے لیے میدان اتنا تنگ اور ناسازگار ہے کہ صدق و صبر کی پشت پناہی سے ہی وہ کوئی اثر دکھا سکتی ہے، اور صدق و صبر کا اولین مصداق کیا ہے؟ خدا پر ایمان میں سچائی اور اس کے احکام پر مضبوطی! مع

یہی ہے رختِ سفر اپنے کارواں کے لیے[ع۵]

ع۵ اقبال کے مصرع میں تصرف کے ساتھ۔

معارف الحدیث

(مسلسل)

غلاموں اور زیردستوں کے بارے میں ہدایات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں مبعوث ہوئے تو عرب میں بلکہ قریب قریب اس پوری دنیا میں جس کی تاریخ معلوم ہے غلاموں کا طبقہ موجود تھا، فاتح قومیں مفتوح قوموں کے افراد کو غلام بنا لیتی تھیں، پھر وہ اُن کی ملکیت ہو جاتے تھے، ان سے جانوروں کی طرح محنت و مشقت کے کام لیے جاتے تھے اور ان کا کوئی حق نہیں سمجھا جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو غلاموں کو آزاد کرنے کو بہت سے گناہوں کا کفارہ اور بہت بڑا کار ثواب قرار دیا اور طرح طرح سے اس کی ترغیب دی، دوسری طرف ہدایت فرمائی کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے، ان پر محنت و مشقت کا زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے، ان کے طعام و لباس جیسی بنیادی ضرورتوں کا مناسب انتظام کیا جائے، بلکہ حکم دیا کہ جو گھر میں کھایا جائے وہی ان کو کھلایا جائے، جیسا کپڑا خود پہنا جائے ویسا ہی ان کو پہنایا جائے، ان کے معاملہ میں خدا کے محاسبہ اور مواخذہ سے ڈرا جائے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ان ہدایات اور تعلیمات نے غلاموں کی دنیا ہی بدل دی، پھر تو ان میں سے ہزاروں اُمت کے آئمہ اور پیشوا تک ہوئے، ہزاروں حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے، اُن کی حکومتیں تک قائم ہوئیں، یہ سب اُس ہدایت و تعلیم ہی کے نتائج تھے جو انسانیت

کے اس مظلوم و ناتوان طبقہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو دی تھی اور پھر ساری دُنیا اس سے متاثر ہوئی۔ اس سلسلہ کی چند حدیثیں ذیل میں پڑھی جائیں۔

غلاموں کے بنیادی حقوق :۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْمَمْلُوْكِ طَعَامُهٗ وَكِسْوَتُهٗ وَلَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ اِلَّا مَا يُطِيْقُ ـــــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا طعام اور لباس غلام کا حق ہے اور یہ بھی اس کا حق ہے کہ اسے ایسے سخت کام کی تکلیف نہ دی جائے جس کا وہ متحمل نہ ہو سکے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں صرف یہ فرمایا گیا ہے کہ طعام و لباس غلام کا حق ہے، آقا کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کا یہ حق ادا ہو، اسے ضرورت بھر کھانا اور کپڑا دیا جائے۔
آگے درج ہونے والی حدیث سے معلوم ہو گا کہ اسے وہی کھانا کھلایا جائے جو گھر میں کھایا جائے وہی لباس پہنایا جائے جو خود پہنا جائے ـــــ یہ بھی فرمایا گیا کہ اس پر کام کا بیجا بوجھ نہ ڈالا جائے اتنا ہی کام لیا جائے جتنا وہ کر سکے۔ یہ گویا غلاموں کے بنیادی حقوق ہیں۔

یہ غلام تمہارے بھائی ہیں ان سے برادرانہ سلوک کیا جائے :۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ اَخَاهُ تَحْتَ يَدَيْهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا يُكَلِّفْهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا يَغْلِبُهٗ اِنْ كَلَّفَهٗ مَا يَغْلِبُهٗ فَلْيُعِنْهُ عَلَيْهِ۔

ـــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ یہ بیچارے غلام) تمھارے بھائی ہیں اللہ نے ان کو تمھارا زیر دست (محکوم) بنا دیا ہے، تو اللہ جس کے زیر دست (اور تحت حکم) اُس کے کسی بھائی کو کر دے تو اس کو چاہیے کہ اس کو وہ کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہ پہنائے جو خود پہنتا ہے، اور اس کو ایسے کام کا مکلّف نہ کرے جو اس کے لیے بہت بھاری ہو۔ اور اگر ایسے کام کا مکلف کرے تو پھر اس کام میں خود اُس کی مدد کرے۔　　(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں ہر غلام کو اُس کے آقا کا بھائی بتایا گیا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے تحت میں کر دیا ہے۔ اس تعبیر میں اس مظلوم طبقہ کے ساتھ حسنِ سلوک کی جتنی مؤثر اپیل ہے وہ ظاہر ہے ــــ غلام اور آقا کو بھائی غالباً اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ دونوں بہرحال آدم و حوا کی اولاد ہیں ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند　　که در آفرینش زیک جوہر اند

پھر اسی تعلق اور رشتہ کی بنیاد پر فرمایا گیا ہے کہ جب تمھارا غلام اور خادم تمھارا بھائی ہے تو اس کے ساتھ وہی برتاؤ ہونا چاہیے جو بھائیوں کے ساتھ ہوتا ہے اسے وہی کھلایا اور پہنایا جائے جو خود کھایا اور پہنا جائے۔

غلام یا نوکر جو کھانا بنائے اُس میں سے اُس کو ضرور کھلایا جائے :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَنَعَ لِاَحَدِكُمْ خَادِمُهٗ طَعَامَهٗ ثُمَّ جَاءَهٗ بِهٖ وَقَدْ وَلِیَ حَرَّهٗ وَ دُخَانَهٗ فَلْیُقْعِدْهُ مَعَهٗ فَلْیَاْكُلْ فَاِنْ كَانَ الطَّعَامُ مَشْفُوْهًا قَلِیْلًا فَلْیَضَعْ فِیْ یَدِهٖ مِنْهُ اُكْلَةً اَوْ اُكْلَتَیْنِ ــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کا خادم اس کے لیے کھانا تیار کرے پھر وہ اس کے پاس لے کر آئے ــــ اور اُس نے اُس کے پکانے اور بنانے میں گرمی اور دھوئیں کی تکلیف اٹھائی ہو ــــ تو آقا کو چاہیے کہ کھانا تیار کرنے والے اس خادم کو بھی کھانے میں اپنے ساتھ

بٹھالے اور وہ بھی کھائے ـــــ پس اگر (کبھی) وہ کھانا تھوڑا ہو (جو دونوں کے لیے کافی نہ ہو سکے) تو آقا کو چاہیے کہ اس کھانے میں سے دو ایک لقمے ہی اس خادم کو دے دے۔ (صحیح مسلم)

تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جن گھروں میں غلام یا باندیاں ہوتی تھیں کھانے پکانے، جیسے خدمت کے کام انہی سے لیے جاتے تھے، ان کے بارے میں آپ نے ہدایت فرمائی کہ جب وہ کھانا پکا کے لائیں تو ان کو اپنے کھانے میں شریک کر لو اور ساتھ بٹھا کر کھلاؤ، اور جب کھانا کم ہو، اس کی گنجائش نہ ہو تب بھی ان کو اس میں سے کچھ حصہ ضرور دو، کیونکہ انھوں نے اس کے پکانے میں گرمی اور دھوئیں کی تکلیف برداشت کی ہے ـــــ ہمارے زمانہ میں اسی بنیاد پر یہی حکم کھانا پکانے والے نوکروں اور نوکرانیوں کے لیے ہوگا۔

غلاموں کی غلطیوں قصوروں کو معاف کیا جائے:۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ كَمْ نَعْفُوْ عَنِ الْخَادِمِ فَسَكَتَ ثُمَّ أَعَادَ عَلَيْهِ الْكَلَامَ فَصَمَتَ فَلَمَّا كَانَتِ الثَّالِثَةُ قَالَ اعْفُوْا عَنْهُ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً ـــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ اپنے خادم اور غلام کی غلطیاں کس حد تک ہمیں معاف کر دینا چاہئیں؟ ـــــ آپ نے سکوت فرمایا (اور کوئی جواب نہیں دیا) ـــــ اس شخص نے دوبارہ آپ کی خدمت میں یہی عرض کیا ـــــ آپ پھر خاموش رہے۔ اور جواب میں کچھ نہیں فرمایا ـــــ پھر جب تیسری دفعہ اس نے عرض کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا، ہر روز ستر دفعہ۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح) پہلی اور دوسری دفعہ جو آپ نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی اختیار فرمائی اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ آپ نے سوال کرنے والے صاحب کو اپنی خاموشی سے یہ تأثر دینا چاہا کہ

کہ یہ کوئی پوچھنے کی بات نہیں ہے، اپنے زیردست خادم اور غلام کا قصور معاف کر دینا تو ایک نیکی ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت حاصل ہوتی ہے اس لیے جہاں تک ہو سکے معاف ہی کیا جائے لیکن جب دو دفعہ کے بعد تیسری دفعہ بھی اُن صاحب نے پوچھا تو آپ نے فرمایا "کُلَّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً" یعنی اگر بالفرض ہر روز صبح سے شام تک ستر قصور کرے تب بھی اُسے معاف ہی کر دو۔ ظاہر ہے کہ یہاں "سبعین" سے ستر کا خاص عدد مراد نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا زیردست غلام یا نوکر بار بار غلطی اور قصور کرے تو انتقام نہ لو، معاف ہی کر دو۔

اس عاجز کے نزدیک معافی کے اس حکم کا مطلب یہی ہے کہ اس کو انتقاماً سزا نہ دی جائے، لیکن اگر اصلاح و تادیب کے لیے کچھ سرزنش مناسب سمجھی جائے تو اس کا پورا حق ہے اور اس حق کا استعمال کرنا اس ہدایت کے خلاف نہ ہوگا بلکہ بعض اوقات اس کے حق میں یہی بہتر ہوگا۔

عَنْ کَعْبِ بْنِ عُجْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَضْرِبُوْا اِمَاءَکُمْ عَلٰی کَسْرِ اِنَاءِکُمْ فَاِنَّ لَہَا اٰجَالًا کَاٰجَالِکُمْ۔

رواہ الدیلمی

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ اپنی باندیوں کو برتن توڑ دینے پر سزا نہ دیا کرو اس لیے کہ برتنوں کی بھی عمریں مقرر ہیں تمہاری عمروں کی طرح۔　　(مسند الفردوس للدیلمی)

(تشریح) گھروں میں کام کرنے والی باندیوں اور نوکرانیوں سے اور اسی طرح غلاموں اور نوکروں سے برتن ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے اور ان بیچاروں کی پٹائی ہوتی تھی، اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ جس طرح وقت پورا ہونے پر آدمی مر جاتا ہے اسی طرح وقت پورا ہونے پر برتن ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اس لیے ان بیچاروں سے انتقام لینا اور مارنا پیٹنا بہت ہی غلط بات ہے، رہاں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اصلاح و تادیب کی نیت سے مناسب تنبیہ اور سرزنش کی جا سکتی ہے۔

غلام پر ظلم کرنے والے سے قیامت میں بدلہ لیا جائے گا:۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

مَنْ ضَرَبَ مَمْلُوْکَہٗ ظَالِماً اُقِیْدَ مِنْہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی اپنے غلام کو ناحق مارے گا قیامت کے دن اس سے بدلہ لیا جائے گا۔

(شعب الایمان للبیہقی)

غلام پر ظلم کا کفارہ:۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ ضَرَبَ غُلَامًا لَہٗ حَدًّا لَمْ یَاْتِہٖ اَوْ لَطَمَہٗ فَاِنَّ کَفَّارَتَہٗ اَنْ یُعْتِقَہٗ

رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ فرماتے تھے کہ جس کسی نے اپنے غلام کو کسی ایسے جرم پر سزا دی جو اُس نے نہیں کیا تھا یا اُس کو طمانچہ مارا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کردے۔ (یعنی اگر ایسا نہیں کرے گا تو خدا کے ہاں سزا کا مستحق ہوگا) (صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ کُنْتُ اَضْرِبُ غُلَامًا لِّیْ فَسَمِعْتُ مِنْ خَلْفِیْ صَوْتًا اِعْلَمْ اَبَا مَسْعُوْدٍ لَلّٰہُ اَقْدَرُ عَلَیْکَ مِنْکَ عَلَیْہِ فَالْتَفَتُّ فَاِذَا ھُوَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ھُوَ حُرٌّ لِوَجْہِ اللّٰہِ فَقَالَ اَمَا لَوْ لَمْ تَفْعَلْ لَلَفَحَتْکَ النَّارُ اَوْ لَمَسَّتْکَ النَّارُ

رواہ مسلم

حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اپنے ایک غلام کو مار رہا تھا میں نے پیچھے سے آواز سُنی (کوئی کہہ رہا تھا) کہ اے ابومسعود! تجھے معلوم رہنا چاہیئے (اور اس بات سے غافل نہ ہونا چاہیے) کہ اللہ کو تجھ پر اس سے زیادہ قدرت اور قابو حاصل ہے جتنا تجھے اس بیچارے غلام پر ہے ـــــ میں نے مڑکر دیکھا تو وہ

فرمانے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے ـــــ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (میں نے اس کو آزاد کر دیا) اب یہ (میری طرف سے) اللہ کے لیے آزاد ہے، آپ نے ارشاد فرمایا تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر تم یہ نہ کرتے (یعنی اس غلام کو اللہ کے لیے آزاد نہ کر دیتے) تو "لَفَحَتْكَ النَّارُ" (جس کا ترجمہ ہے کہ جہنم کی آگ تمہیں جلا ڈالتی) ـــــ یا فرمایا "لَمَسَّتْكَ النَّارُ" (جس کا ترجمہ ہے کہ جہنم کی آگ تمہیں لپیٹ میں لے لیتی)

(صحیح مسلم)

(تشریح) اگر اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہو تو ظلم و زیادتی اور ہر قسم کے گناہوں سے بچانے کے لیے بہترین تدبیر یہی ہے کہ اللہ کی پکڑ اور آخرت کے مواخذہ و محاسبہ کو یاد دلایا جائے ـــــ اللہ تعالیٰ ایمان نصیب فرمائے۔

غلاموں کے بارہ میں حضورؐ کی آخری وصیت :-

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ آخِرُ كَلَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوةَ، الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ فِيْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ـــــ رواہ ابوداؤد

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (وفات سے پہلے) جو آخری کلام فرمایا وہ یہ تھا "اَلصَّلٰوةَ الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ فِيْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" (یعنی نماز کی پابندی کرو، نماز کا پورا اہتمام کرو، اور اپنے غلاموں زیر دستوں کے بارہ میں خدا سے ڈرو) (سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس دنیا سے اور اُمت سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو خاص طور سے دو باتوں کی تاکید اور وصیت فرمائی تھی۔ ایک یہ کہ نماز کا پورا اہتمام کیا جائے اس میں غفلت اور کوتاہی نہ ہو یہ سب سے اہم فریضہ اور بندوں پر اللہ کا سب سے بڑا حق ہے ـــــ دوسری یہ کہ غلاموں باندیوں کے ساتھ برتاؤ میں اُس خداوند ذوالجلال سے ڈرا جائے جس کی عدالت میں ہر ایک کی پیشی ہو گی اور ہر مظلوم کو ظالم سے بدلہ دلوایا جائے گا ـــــ غلاموں زیر دستوں کے لیے یہ بات کتنے شرف کی ہے کہ

نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دُنیا سے جاتے وقت سب سے آخری وصیت اللہ کے حق کے ساتھ اُن کے حق کی ادائیگی اور اُن کے ساتھ حُسنِ سلوک کی فرمائی۔ اور اس حدیث کے مطابق سب سے آخری لفظ آپ کی زبانِ مبارک سے جو ادا ہوا وہ یہ تھا "وَاتَّقُوا اللهَ فِيمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے جو صحیح بخاری میں بھی مروی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے آخری کلمہ آپ کی زبانِ مبارک سے یہ ادا ہوا تھا " اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الْأَعْلٰى " (اے اللہ مجھے رفیقِ اعلیٰ کی طرف اُٹھا لے) شارحین نے ان دونوں حدیثوں میں اس طرح تطبیق کی ہے کہ اُمت سے مخاطب ہو کر آپ نے وصیت کے طور پر آخری بات تو وہ فرمائی تھی جو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مندرجہ بالا حدیث میں مذکور ہوئی ہے، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف مخاطب ہو کر آخری کلمہ وہ فرمایا تھا جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نقل فرمایا ہے۔ واللہ اعلم

آقاؤں کی خیر خواہی اور وفاداری کے بارے میں غلاموں کو ہدایت :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح غلاموں کے حقوق اور اُن کے ساتھ حُسنِ سلوک کے بارے میں آقاؤں کو ہدایات دیں اسی طرح غلاموں کو بھی آپ نے نصیحت فرمائی اور ترغیب دی کہ وہ جس کے زیرِ دست ہیں اُن کے ساتھ خیر خواہی اور وفاداری کا رویہ رکھیں، آپ نے کسی غلام کی بڑی خوش نصیبی اور کامیابی یہ بتائی کہ وہ اپنے خالق و پروردگار کا عبادت گزار اور اپنے سید و آقا کا وفادار و فرمانبردار ہو۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعِمَّا لِلْمَمْلُوكِ أَنْ يَتَوَفَّاهُ اللهُ بِحُسْنِ عِبَادَةِ رَبِّهِ وَطَاعَةِ سَيِّدِهِ نِعِمَّا لَهُ ــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی غلام اور مملوک کے لیے بڑی اچھی اور کامیابی کی بات ہے کہ اللہ اس کو ایسی حالت میں اُٹھائے کہ وہ اپنے پروردگار کا عبادت گزار اور اپنے سید و آقا کا فرمانبردار ہو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا نَصَحَ لِسَيِّدِهٖ وَاَحْسَنَ عِبَادَةَ رَبِّهٖ فَلَهٗ اَجْرُهٗ مَرَّتَيْنِ ـــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی غلام جب اپنے سید (آقا) کی خیر خواہی اور وفاداری کرے اور خدا کی عبادت بھی اچھی طرح کرے تو وہ دوہرے ثواب کا مستحق ہوگا۔

(صحیح مسلم وصحیح بخاری)

تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت وتعلیم کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ ہر فرد اور ہر طبقہ کو آپ ترغیب دیتے ہیں اور تاکید فرماتے ہیں کہ وہ دوسرے کا حق ادا کرے اور حقوق کے ادا کرنے میں اپنی کامیابی سمجھے۔ سیدوں اور آقاؤں کو آپ نے ہدایت فرمائی کہ وہ غلاموں زیردستوں کے بارے میں خدا سے ڈریں، ان کے حقوق ادا کریں ان کے ساتھ بہتر سلوک کریں ان کو اپنا بھائی سمجھیں اور ایک فرد خاندان کی طرح رکھیں ـــــ اور غلاموں مملوکوں کو ہدایت فرمائی اور ترغیب دی کہ وہ سیدوں آقاؤں کے خیر خواہ اور وفادار ہو کر رہیں ـــــ

ہماری اس دنیا کے سارے شر وفساد کی جڑ بنیاد یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کا حق ادا کرنے سے منکر یا کم از کم بے پرواہ ہے اور اپنا حق دوسرے سے وصول کرنے بلکہ چھیننے کے لیے ہر کشمکش اور جبر وزور کو صحیح سمجھتا ہے اسی نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے، اور اس وقت تک یہ دنیا امن وسکون سے محروم رہے گی جب تک کہ حق لینے اور چھیننے کے بجائے حق ادا کرنے پر زور نہ دیا جائے گا۔ اگر عقل وبصیرت سے محرومی نہ ہو تو مسئلہ بالکل بدیہی ہے ـــــ

بڑوں اور چھوٹوں کے باہمی برتاؤ کے بارہ میں ہدایات

ہر معاشرہ اور سماج میں کچھ بڑے ہوتے ہیں اور کچھ ان کے چھوٹے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑوں کے چھوٹوں کے ساتھ اور چھوٹوں کے بڑوں کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں بھی ہدایات فرمائی ہیں، اگر ان کا اتباع کیا جائے تو معاشرہ میں وہ خوشگواری اور روحانی سرور وسکون

رہے جو انسانیت کے لیے نعمتِ عظمیٰ ہے ـــــ اس سلسلہ کی چند حدیثیں یہاں بھی پڑھ لی جائیں۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيْرِنَا ـــــ رواہ الترمذی وابوداؤد

عمرو بن شعیب اپنے والد شعیب سے اور وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو آدمی ہمارے چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ نہ کرے اور بڑوں کی عزت کا خیال نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ شَيْخٌ يُرِيْدُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَبْطَأَ الْقَوْمُ اَنْ يُّوَسِّعُوْا لَهٗ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا ـــــ رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بڈھے بزرگ آئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچنا چاہتے تھے، لوگوں نے (جو اس وقت حاضر تھے) اُن کے لیے گنجائش پیدا کرنے میں دیر کی (یعنی ایسا نہیں کیا کہ اُن کے بڑھاپے کے احترام میں جلدی سے اُن کو راستہ دے دیتے اور جگہ خالی کر دیتے) تو حضورؐ نے فرمایا کہ جو آدمی ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے، اور ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دین سے وابستگی چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بڑوں کے ساتھ ادب و احترام کا برتاؤ رکھے اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آئے، اور جو ایسا نہ کرے اس کو حق نہیں ہے کہ وہ حضور کی طرف اور آپ کی خاص جماعت کی طرف اپنی نسبت کرے۔

قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث جامع ترمذی ہی میں حضرت عبداللہ بن عباس

رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی گئی ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَکْرَمَ شَابٌّ شَیْخاً مِنْ اَجَلِ سِنِّہٖ اِلَّا قَیَّضَ اللّٰہُ لَہٗ عِنْدَ سِنِّہٖ مَنْ یُکْرِمُہٗ ــــــ رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو جوان کسی بوڑھے بزرگ کا اُس کے بڑھاپے ہی کی وجہ سے ادب و احترام کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس جوان کے بوڑھے ہونے کے وقت ایسے بندے مقرر کرے گا جو اُس وقت اُس کا ادب و احترام کریں گے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) اوپر جو دو حدیثیں درج ہوئی ہیں اُن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بڑوں کے ادب و احترام اور چھوٹوں پر شفقت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و تعلیم میں کیا درجہ ہے اور اُس میں غفلت اور کوتاہی کتنا سنگین جرم ہے ــــ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا ــــ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑوں کا ادب و احترام اور اُن کی خدمت وہ نیکی ہے جس کا صلہ اللہ تعالیٰ اس دُنیا میں بھی عطا فرماتا ہے اور اصل جزا و ثواب کی جگہ تو آخرت ہی ہے۔

ارشاداتِ حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانویؒ

علماء و طلباء، اربابِ اہتمام و اصحابِ مدارس کے لیے لمحۂ فکریہ

تلخیص ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

(ماخوذ از افاضات حصہ نہم جزو دوم)

——— قسط (۹) ———

(شیخ الہند) حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض عجیب و غریب واقعاتِ تواضع اور حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہما کے ساتھ ان کی غایتِ حسنِ عقیدت کی روایات سُنا کر فرمایا ——— کہ یہ سب اثر اسی نسبتِ باطنی کا ہے جو کسی کو بھی نظر نہیں آتی ——— میں تو اس کی مثال (گھڑی) کی بال کمانی سے دیا کرتا ہوں کہ وہ بھی اس قدر باریک ہوتی ہے کہ اس کا نظر آنا بھی مشکل ہوتا ہے، لیکن جتنے بڑے بڑے پرزے ہیں سب اسی پر چلتے ہیں ——— پھر اپنے دیگر اکابر کے تذکرے فرما کر فرمایا ——— کہ وہ حضرات تو منعَم علیہم (جن پر انعام ہوا) تھے ہی مگر اُن کی زیارت کرنے والا اس لیے منعم علیہ ہے کہ خود اُن کی زیارت ایک بڑی اور مستقل نعمت تھی جو اللہ تعالیٰ نے ہم کو نصیب فرمادی ......

ایک خادم کے خلافِ مزاج بعض بیجا تکلفات سے متاثر ہو کر فرمایا ——— ارے بھائی ہم ایک پیغمبر کے غلام ہیں۔ ہمیں جو سکھایا گیا ہے قولاً، فعلاً، حالاً، بس اُسی کے مطابق ہم کو عمل کرنا چاہیے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تکلفات ہمیں نہیں سکھائے جن کو آجکل ادب اور تعظیم سمجھا جاتا ہے یہ سب عجمیت ہے۔

.... اور یہ ساری خرابی اسی کی ہے کہ لوگ حدود سے نکل گئے۔ جب حدود ہی سے نکل گئے تو بس پھر کوئی حد نہیں معلوم نہیں کہاں تک پہونچیں۔ اب جو شخص شامت زدہ اس کا انتظام کرے وہ بدنام، بد خلق بدمزاج ــ پھر ایک لمبا سانس لیا اور بے اختیار منھ سے نکلا اللہ اللہ ــ سنت کے ترک کرنے سے بڑی ظلمت پیدا ہوتی ہے کہ وظیفے اور ذکر و شغل بھی اُس کا تدارک نہیں کر سکتے ــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اُمت کی خدمت اور اُن کے دین کی حفاظت کرنا چاہیے۔ اپنی شہرت میں کیا رکھا ہے ..... اُمت کی حفاظت وہ (اہم) چیز ہے کہ اُس کے مقابلے میں اپنے عزیزوں کی بھی پرواہ نہ کرنی چاہیے۔ چاہے کوئی کتنا ہی محبوب ہو ــــ وہ اگر ہمارا محبوب ہے تو دین اُس سے زیادہ محبوب ہے، تو بڑے محبوب کا لحاظ (زیادہ کرنا) چاہیے یا چھوٹے محبوب کا؟ ــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا ــ کچھ پتہ نہیں کہ خاتمہ کس حال پر ہوگا، بس اللہ ہی کی پناہ ڈھونڈھے اور دعووں کو مٹاتا رہے ــ ایک بڑے فاضل یہاں آئے اور مجھ سے کہا کہ کچھ نصیحت کیجئے، میں نے کہا کہ آپ تو خود عالم ہیں آپ کو کیا نصیحت کروں۔ انھوں نے پھر اصرار کیا ــ میں نے کہا مجھے تو بس ایک ہی سبق یاد ہے اُسی کو دُہرائے دیتا ہوں وہ یہ کہ اپنے کو مٹانا چاہیے ــ اس کا اُن پر اتنا اثر ہوا کہ رونے لگے ــ پھر فرمایا کہ خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی کمالات اور انتہائی محبوبیت کے باوجود فرماتے ہیں " لا ینبغی لاحدٍ ان یقول انا خیرٌ من یونس بن متّٰی " ــــ یعنی مجھ کو یونس علیہ السلام پر فضیلت نہ دو اور یہ نہ کہو کہ میں اُن سے بہتر ہوں ــ تو دیکھیے باوجود یقینی افضل ہونے کے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ مجھے یونس علیہ السلام سے افضل نہ کہو ــــ اسی سلسلے میں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت سُنائی جو مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ نے بیان کی تھی کہ جب بخاری کے درس میں یہ حدیث آئی تو شاگردوں نے اشکال پیش کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت یونس علیہ السلام سے بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام سے یقیناً افضل تھے پھر آپ نے اس کی نہی کیوں فرمائی، حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یہی تو افضل ہونے کی دلیل ہے جو افضل ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو افضل نہیں سمجھا کرتے وہ یہی کہا کرتے ہیں کہ میں افضل نہیں۔ شاگردوں نے پھر اشکال کیا، حضرت مولاناؒ نے پھر سمجھایا لیکن طلبہ نے پھر عرض کیا کہ حضرت ابھی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر مولانا نے دوسری قوت سے کام لینا چاہا، فرمایا اچھا میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم مجھے کیا سمجھتے ہو اپنے سے افضل

یا کمتر؟ سب نے عرض کیا کہ حضرت! چہ نسبت خاک را با عالم پاک ـــــ ہماری حقیقت ہی کیا ہے حضرت کے سامنے ـــــ پھر فرمایا کہ اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم مجھے سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟ عرض کیا بالکل سچا، پھر فرمایا اگر میں کسی بات کو قسم کھا کر کہوں پھر تم مجھے سچا سمجھوگے یا کیا؟ کہا تب تو اور بھی زیادہ آپ کی بات کا یقین کریں گے۔ جب ان سب باتوں کا اقرار کرا چکے تو پھر فرمایا کہ تو اب میں تم سے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تم میں سے ہر ہر شخص کو اپنے سے ہزار درجہ افضل سمجھتا ہوں ـــــ بس یہ فرمانا تھا کہ ساری مجلس تڑپ گئی۔ سب بیتاب ہو گئے لوٹنے لگے ..... اور مولانا چپکے سے اٹھ حجرے میں جا بیٹھے۔ درس وغیرہ ختم ہو گیا۔ اگلے دن جب پھر سبق شروع ہوا تو فرمایا کہ کہو بھائی اب بھی اُس حدیث میں کچھ شبہ ہے؟ سب نے بالاتفاق عرض کیا کہ حضرت اب تو کوئی شبہ نہیں رہا ـــــ پھر حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے یہ تصرف کے قصد سے نہیں کیا ہمارے حضرات اس کا قصد نہیں کیا کرتے۔ مگر ہر شے میں ایک خاصیت ہے۔ صدق میں خاصیت ہے کہ از دل خیزد بر دل ریزد ـــــ

حضرت حکیم الامتؒ نے ایک بار ایک خادم کو تنبیہ فرمائی جنھوں نے ایک ہی ہاتھ میں ایک دینی کتاب اور جوتے دونوں اس طرح لے رکھے تھیں کہ جوتے کتاب سے مس ہوتی تھی۔ فرمایا کہ آج کل طبیعتوں میں ادب بالکل نہیں رہا ـــــ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ کا ارشاد ہے کہ یہ جو بعض طلبہ بائیں ہاتھ میں کتب دینیہ اور دائیں ہاتھ میں جوتے لے کر چلتے ہیں بہت مذموم ہے کیونکہ خلاف ادب ہے اور صورۃً فوقیت دینا ہے جوتوں کو کتب دینیہ پر ـــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایسے تو بے نظیر بزرگ عالم اور اُن کی تنخواہ صرف چالیس روپے ماہوار تھی (جو آج ایک نیا اور معمولی مدرس بھی مشکل سے قبول کرتا ہے) ـــــ اب تو اتنی تنخواہ کو کوئی خاطر میں بھی نہیں لاتا اور وہاں اس کی بھی بڑی قدر تھی ـــــ وجہ یہ تھی کہ وہ حضرات اپنے کو صاحب کمال ہی نہیں سمجھتے تھے ..... چونکہ مولانا کا کنبہ بہت بڑا تھا اس لیے خرچ میں بہت تنگی ہوتی تھی ..... ـــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ متنبی نے (اشعار میں) تکلفات کا زیادہ اہتمام کیا ہے اور اسی کو اہل عرب اچھا نہیں کہتے ـــــ کہتے ہیں کہ اس کے کلام میں عجمیت ہے عربیت نہیں ـــــ عربیت میں تو سادگی ہوتی ہے تکلف نہیں ہوتا۔ اس پر یاد آیا کہ قاری عبدالرحمٰن صاحب (محدث) پانی پتی اپنے صاحبزادے

قاری عبدالعلیم صاحب کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اِن کو (قرأت میں) عجمیت سے تو نکال دیا ہے مگر یہ عربیت میں ابھی نہیں آیا۔ وہ خود بھی ایسا سادہ پڑھتے تھے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ قاری ہیں۔ حالانکہ قاری صاحب (پانی پتی) قرأت میں کامل تھے ۔ اُنھوں نے اس کمال کو اکتساب سے اس طرح بھی حاصل کیا تھا کہ جب حج کو گئے تو راستے میں کسی چٹان پر بیٹھ جاتے تھے اور وہاں جو بدوؤں کے بچے کھیلتے ہوتے اور آپس میں بولتے اُن کے مخارج کو بہت غور کے ساتھ سنتے اور دیکھتے کہ کس حرف کو کس طرح ادا کرتے ہیں تو اِس طرح اُنھوں نے اس کمال کا اکتساب کیا تھا اور اسی کمال کی بنا پر ــــ باوجودیکہ اُن کے صاحبزادے بھی بڑے ماہر قاری تھے ــــ یہ فرمایا کہ عجمیت سے تو میں نے نکال دیا ہے لیکن عربیت میں ابھی نہ لاسکا۔

فرمایا کہ اکبر حسین صاحب (اکبر) جج اور ناظر حسین صاحب رامپوری وکیل کی قابلیت جو حکام میں مُسلّم تھی وہ عربی ہی کی بدولت تھی۔ چنانچہ وکیل صاحب نے تو خود کہا کہ یہ جو وکالت میں میری نظر ایسی رسا ہے یہ محض ہدایہ پڑھنے کی برکت ہے ــــ پھر فرمایا کہ عربی کے طالب علموں کو اپنی ہی دولت کی خبر نہیں یہ بھی فرمایا کہ اگر کتب درسیہ سمجھ کر پڑھیں تو بڑی قابلیت پیدا ہو ــــ مگر اکثر طالب علم سمجھ کر نہیں پڑھتے ــــ پھر فرمایا کہ قابلیت نئے نصاب سے نہیں پیدا ہوتی۔ دیوبند کے قدیم نصاب سے نصیب ہوتی ہے...

فرمایا کہ جب میں کانپور میں تھا تو وہ وقت ایسا تھا کہ وہاں کے مختلف علماء میں باوجود اختلاف مشرب کے اتنی تہذیب تھی کہ اگر کوئی شخص کسی مولوی کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو وہ کہہ دیتا تھا کہ فلاں مولوی صاحب کے پاس جاکر پوچھو، یہاں تک کہ ایک شخص نے تنگ آکر ایک مولوی صاحب سے کہا کہ بس جی جب کوئی مولوی مسئلہ نہیں بتاتا دوسرے ہی سے پوچھنے کو کہہ دیتا ہے تو اب میں پادری صاحب سے جاکر مسئلہ پوچھوں گا ــــ جب میں نے یہ رنگ دیکھا کہ لوگ پریشان ہوتے ہیں بالخصوص رویت ہلال کے متعلق جس کے فیصلے کی فوری ضرورت ہے تو میں نے مختلف علماء سے مل کر اور ضرورت ظاہر کرکے اُن کی رضامندی سے کہ مولوی محمد عادل صاحب کو جو سب سے زیادہ بوڑھے بھی تھے ...... امیر ہلال مقرر کرا دیا اور اِس کا اعلان کر دیا کہ ہلال کے متعلق جس کو جو کچھ پوچھنا ہو وہ اُنھیں سے جاکر پوچھے۔ اگر علماء کو بھی کچھ اختلاف ہو تو وہ بھی براہ راست اُنھیں کے پاس جاکر اُن سے گفتگو کرکے اخیر بات طے کرلیں، غرض ہلال کے بارے میں اُنھیں کا قول، قولِ فیصل قرار دیا جائے تاکہ عوام میں تو تشویش نہ ہو، جس کے بہت اچھے نتائج مشاہدے میں آچکے تھے تو وہ وقت ایسا تھا کہ باوجود اختلاف مسلک کے سب علماء کو اس بات

پر متفق کیا جا سکا، آج کل ایسے اختلافات کے ہوتے ہوئے بھلا سب کا متفق کر لینا کہاں ممکن ہے؟ ــــ

فرمایا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے یہاں حدیث کا درس ہو رہا تھا جب یہ حدیث آئی "من صلّی رکعتین لا یحدث فیہما نفسہ غفر لہ ما تقدم من ذنبہ" یعنی اگر کوئی شخص دو رکعتیں ایسی پڑھے جن میں حدیث النفس نہ ہو یعنی کوئی خیال نہ لائے تو اس کے گزشتہ سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اس پر ایک طالب علم نے یہ سوال کیا کہ کیا ایسی نماز ممکن ہے؟ اس کا ضابطے کا جواب تو اور ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خطرات کا آنا یہاں مراد نہیں بلکہ لانا مراد ہے۔ ارادہ اختیاری فعل ہے۔ لیکن مولاناؒ نے ایک حکیمانہ جواب ارشاد فرمایا کہ میاں کبھی تم نے ایسی نماز پڑھنے کا ارادہ بھی کیا تھا، جب نہیں کیا تو یہ سوال قبل از وقت ہے۔ جب ایسی نماز پڑھنے کی کوشش کرو اور دشواری پیش آئے تب یہ سوال کرنا۔ پہلے کر کے دیکھو پھر ممکن ہونے اور ناممکن ہونے کو پوچھنا ـــ غرض لوگ اپنی اصلاح کا ارادہ ہی نہیں کرتے ورنہ اصلاح کوئی ایسی چیز نہیں جو نہ ہو سکے۔ قصد سے اللہ تعالیٰ سب آسان فرما دیتے ہیں ــ اور اصلاحِ معاشرت جس کا ذکر اس سلسلۂ گفتگو کے آغاز میں تھا اس کے آسان ہونے کا ایک معین طریقہ یہ ہے کہ یوں غور کرے کہ جیسا معاملہ میں اس شخص سے کر رہا ہوں اگر میرے ساتھ لوگ ایسا ہی) معاملہ کریں تو مجھے تکلیف ہوگی یا نہیں؟ اور میں ایسی حالت میں کیا چاہوں گا پس اگر صحیح ذوق ہوگا۔ تو اسی سے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ امر تکلیف دہ ہے یا نہیں؟.....

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ہمارے بزرگوں میں للّٰہیت تھی اور اپنے بزرگوں کی اسی صفت پر نظر کرنے کی اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی توفیق دی ـ اور سب چیزوں کی کمی تو معاف بھی ہو سکتی ہے لیکن للّٰہیت کی کمی معاف نہیں ہوتی، اس سے درگزر نہیں کیا جاتا یعنی کمال میں اس کا شرط ہونا نظر انداز نہیں ہوتا۔ اگر کسی میں یہ چیز کم ہو تو یوں کہیے کہ اس میں بہت کمی ہے۔ وہاں تو نہ تقریر کو کوئی پوچھتا ہے نہ تحریر کو کوئی پوچھتا ہو نہ اوراد کو کوئی پوچھتا ہے۔ بس اصل چیز یہ ہے۔ اس کا جب غلبہ ہوتا ہے تو اس کا نام فنا ہے۔ صوفیہ نے تو اس کا نام فنا رکھا اور اہل ظاہر کی اصطلاح میں اس کو للّٰہیت اور اخلاص کہتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کیا چیز زیادہ تھی۔ یہی للّٰہیت اور خلوص ورنہ کیا وہ سارے حضرات اصطلاحی عالم تھے یا ان حضرات سے عمل میں کوئی کوتاہی کبھی ہوتی ہی نہ تھی؟ مگر اسی للّٰہیت اور اخلاص کی وجہ سے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تک فرماتے ہیں اگر نصف مُد میرا صحابی اللہ کی راہ میں دے

تو وہ غیر صحابی کے اُحد پہاڑ کی برابر خرچ کرنے سے بھی افضل ہے ۔ تو بات کیا ہے؟ یہ ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سب کے سب نہایت مخلص اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار تھے۔ پہلی اُمم میں کسی اُمت کو یہ باتیں (علی وجہ الاتم) نصیب نہیں ہوئیں۔ بلکہ اور لوگ تو بجزت اپنے انبیاء سے اُمتی ہو کر بھی قیل وقال کرتے رہے اور یہاں اللہ اکبر ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنی جان تک کی بھی پرواہ نہیں کی۔

اپنے معمولات کے متعلق فرمایا ۔ کہ بضرورت جیسا جیسا تجربہ ہوتا گیا۔ قواعد وضوابط تجویز کرتا گیا اکثر سلطنت کا قانون بھی جبھی سخت بنایا جاتا ہے جب رعایا بدعنوانیاں کرتی ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ دیوبند کے نصاب سے فلسفے کی بعض کتابوں کو نام کے تعین کے ساتھ خارج کرا دیا تھا کیونکہ حضرتؒ اُن کو مضرِ دین سمجھتے تھے۔ کسی نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی شکایت کی کہ مولانا گنگوہی نے ان کتابوں کو حرام کہہ دیا تو مولانا نے فرمایا کہ حضرتؒ نے حرام نہیں کیا بلکہ تمہاری طبیعتوں نے حرام کیا ہے۔ خود تمہاری طبیعتوں ہی میں کجی ہے اس لیے یہ کتابیں مُضرِ دین ہو جاتی ہیں ورنہ اگر طبیعت سلیم ہو تو یہ کتابیں بھی بجائے مُضرِ دین ہونے کے مُعین دین ہو جائیں۔

فرمایا ۔ جب میں کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں تھا تو اُس زمانے میں ایک متمول رئیس کانپور آئے۔ وہاں کے جتنے مدرسے تھے اُن سب کے مہتمم اور مدرسین اپنے اپنے طلبہ کو لے کر چندے کی غرض سے ۔ اُن رئیس کے استقبال کے لیے اسٹیشن پہونچے۔ مجھ سے بھی کہا گیا لیکن میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں تو اپنے مدرسے سے ایک چڑیا کے بچے کو بھی نہ جانے دوں گا، میرے نزدیک مال سے زیادہ عزت ہے اور اس صورت میں عزت یقیناً برباد ہو گی اور مال کا ملنا محض محتمل ہے۔ ممکن ہے کہ مل جائے اور ممکن ہے کہ نہ ملے اور دوسری صورت میں عزت تو یقیناً محفوظ ہے چاہے مال ملے چاہے نہ ملے۔ غرض میں نے تو اپنے مدرسے میں سے کسی کو نہیں جانے دیا۔ دوسرے مدرسے والے گئے اور اپنی اپنی ضرورتیں ظاہر کیں لیکن انھوں نے سب کی درخواستیں سُن کر کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ یہاں ایک مدرسہ جامع العلوم بھی ہے اور اُس کا کوئی ذمہ دار نہیں اُس کے لیے میں دو سو روپے سال مقرر کرتا ہوں لیجئے اور سب کو تو جواب دیدیا اور ہمارے مدرسے کے لیے دو سو روپے سال مقرر کر دیے پھر دو سو روپے سال برابر آتے رہے .....

فرمایا کہ ایک بار حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسجد کے حجرے میں اپنے ایک شاگرد کے پاس تشریف لائے جن کے پاس چارپائی نہ تھی، مولانا اُن کے لیے خود بہ نفس نفیس گھر سے

چارپائی اُٹھا کر لائے۔ ابھی لا ہی رہے تھے کہ اتفاق سے اُن شاگرد نے دیکھ لیا دوڑ کر چارپائی اٹھانے لگے۔ مولانا نے فوراً چارپائی چھوڑ دی اور فرمایا کہ لو تم خود ہی اس چارپائی کو لے جاؤ۔ یہ واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ میں طالب علمی کے ختم تک اِس خیال میں رہا کہ دنیا بھر کے علما اسی شان کے ہوتے ہوں گے لیکن جب باہر نکلا تو دیکھا اور کسی جگہ یہ رنگ ہی نہیں۔ اُس وقت اپنے حضراتِ اساتذہ کی قدر ہوئی کہ اللہ اکبر۔ یہ حضرات اپنی کہیں نظیر نہیں رکھتے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں کے اندر اوروں سے زیادہ سلطنت کرنے کی صفات موجود ہیں، مثلاً عدل و انصاف، رحم وغیرہ مگر بس کمی یہ ہے کہ اُن میں نظم نہیں اور نظم نہ ہونے کا سبب یہ ہو کہ اُن میں اتفاق اور اتحاد نہیں اور اتحاد و اتفاق کی جڑ حضرت حاجی صاحبؒ نے عجیب فرمائی جس کی تمام عقلاء زمانہ کو بھی خبر نہیں فرماتے تھے کہ اتفاق کی جڑ تواضع ہو۔ اگر ہر شخص دوسرے کو اپنے سے افضل سمجھنے لگے تو پھر نا اتفاقی کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ نا اتفاقی اسی سے تو پیدا ہوتی ہو کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے افضل سمجھتا ہو اور اُس سے بڑھنا چاہتا ہو۔ سبحان اللہ کیا حقیقت ظاہر فرمائی ہے۔ اس پر ایک صاحب نے استفسار کیا کہ تواضع کیونکر پیدا ہو؟ فرمایا کہ تواضع اختیاری چیز ہو۔ دوسروں کے ساتھ تواضع کا برتاؤ کرے خواہ نفس کو ناگوار ہو بس اسی سے تواضع کی صفت پیدا ہو جائے گی اگر صفت بھی نہ پیدا ہو صرف عمل ہی تواضع کے خلاف نہ ہو تو یہ بھی کافی ہو۔ اب تو یہ ہو کہ کسی کو اپنا بڑا تسلیم کر لینے میں عار آتی ہو اور جب تک کسی کو بڑا تسلیم نہ کر لیا جائے مرکزیت جو نظم کے لیے ضروری ہو قائم نہیں ہو سکتی۔ خلاصہ یہ کہ تصوف کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ سب سے اوّل چیز تصوف میں تواضع ہی کی تعلیم ہو جس کو اصطلاح میں فنا کہتے ہیں۔ عموماً تو تصوف میں فنا سب سے آخر مقام سمجھا جاتا ہو لیکن درحقیقت سب سے اوّل مقام بھی فنا ہی ہو۔ اور سب سے آخر مقام بھی فنا ہی ہو کیونکہ فنا کے بھی درجات ہوتے ہیں باقی بدون فنا کے تو اس طریق میں کوئی شخص ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ لاکھ وظیفے پڑھے، لاکھ تسبیح پھیرے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حجروں میں بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا میدان میں آنا چاہیے میں کہتا ہوں کہ حجرے ہی میں بیٹھنے سے میدان کی قابلیت پیدا ہوتی ہو۔ جیسے ریڈیو حجرے ہی میں رکھا جاتا ہو۔ پھر وہیں پر سے تقریریں نشر کی جاتیں ہیں جن سے تمام عالم میں ہل چل پڑ جاتی ہو۔۔

اسی سلسلۂ گفتگو میں یہ بھی فرمایا کہ بدون تواضع کے امیر کی اطاعت بھی نہیں ہوسکتی اور حکومت کے لیے اطاعتِ امیر لابدی ہے. مسلمانوں میں اس وقت بڑی کمی ایسی اطاعت کی ہے ــــــ ....

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میں نے تو ترجیح الراجح کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے کہ جس کو جو غلطی میری تصانیف میں ملے اُس سے مجھے مطلع کر دے تاکہ اگر مجھے اپنی غلطی کا اطمینان ہو جائے تو اُس سے بالاعلان رُجوع کروں چنانچہ مجھ سے جہاں کہیں لغزش ہوئی ہے اس کا دل کھول کر بہت فراخدلی سے اقرار کیا ہے اور جہاں مجھے شرحِ صدر اپنی غلطی کا نہیں ہوا وہاں دوسرے کا قول بھی نقل کر دیا ہے تاکہ جو قول جس کے جی کو لگے وہ اُسی کو اختیار کرے. میں نے ہمیشہ یہی کیا کہ خواہ مخواہ اپنے قول کو نباہا نہیں ـــ یہ برکت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے ویسے تو یہ خصلت اپنے سب ہی اکابر میں تھی لیکن جیسا رنگ مولانا میں اس صفت کا نمایاں تھا اور حضرات میں ویسا نہ تھا. دورانِ درس میں جہاں کسی مقام پر شرحِ صدر نہ ہوا جھٹ اپنے کسی ماتحت مدرس کے پاس کتاب لیے ہوئے جا پہونچے اور بے تکلف کہا کہ مولانا! یہ مقام میری سمجھ میں نہیں آیا. ذرا اس کی تقریر تو کر دیجئے. چنانچہ بعد تقریر کے واپس آکر طلبہ کے سامنے اُن کو دُہرا دیتے اور فرماتے کہ (فلاں) مولانا نے اِس مقام کی یہ تقریر کی ہے. اسی طرح اگر کوئی طالبعلم کسی مقام کی، مولانا کی تقریر کے مُعارض تقریر کرتا اور وہ صحیح ہوتی تو اپنی تقریر سے فوراً درس ہی میں رجوع فرما لیتے اور صاف لفظوں میں فرماتے کہ مجھ سے غلطی ہوئی اور صرف ایک ہی بار نہیں بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رہ رہ کر جوش کے ساتھ بار بار فرماتے ہاں واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ــــــ

حضرت مولاناؒ کو ایسی باتوں سے ذرا عار نہ آتی تھی ـــ بات یہ ہے کہ جن کی بڑی شان ہوتی ہے وہ کہیں ایسی باتوں سے گھٹتی ہے. اگر کسی کی ایک من شان ہو اور اس میں سے ایک تولہ گھٹ جائے تو اس کو اس کمی کی کیا پرواہ ہوگی؟ ہاں جس کی ایک چھٹانک ہی شان ہے اس میں اگر آدھی چھٹانک جاتی رہی تو اُس کے پاس پھر آدھی چھٹانک ہی رہ جائے گی .... اکابر اپنی غلطیوں کے اقرار سے کبھی نہیں شرمائے. چھٹ بھیئے ہی شرماتے ہیں ــــــ

فرمایا کہ ـ مجھے سب سے زیادہ محبت صوفیہ سے ہے پھر فقہاء سے، پھر محدثین سے. یہ ترتیب تو محبت میں ہے. باقی عظمت، سو میرے قلب میں سب سے زیادہ (عظمت) علماء (اور محدثین) کی ہے بالخصوص فقہاء کی. اور محبت مجھے صوفیہ سے زیادہ ہے اُن کی طرف دل کو کشش، علماء سے

زیادہ ہے ــــــ ....

فرمایا کہ حضرت احمد بن حنبلؒ اتنے بڑے عالم اور امام تھے لیکن پھر بھی حضرت بشر حافیؒ کی خدمت میں جو اُمّی تھے ــــ جایا کرتے تھے کسی نے اعتراض بھی کیا کہ آپ عالم ہو کر غیر عالم کے پاس کیوں جاتے ہیں. فرمایا ہم تو عالم ہیں کتاب کے اور وہ عالم ہیں صاحبِ کتاب کے ــــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اہلِ مال کو مال پر اور اہلِ جاہ کو جاہ پر ناز ہوتا ہے. حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تو جاہ کا نام کمالِ وہمی رکھا ہے. وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا کسی کے متعلق وہم اور خیال ہو گیا کہ یہ صاحبِ کمال ہے بس اس کا نام جاہ ہے. یہ جاہ محض دوسروں کے وہم اور خیال پر مبنی ہے. ذرا اُن کا خیال بدلا اور پھر کچھ بھی نہیں ــــ بخلاف بزرگانِ دین کی جاہ کے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنے کو مٹایا مگر یہ بڑھتے ہی چلے گئے ــــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اب پیر کا بھی اتنا ادب نہیں جتنا غیر متعلق بزرگوں کا پہلے تھا. ــــ اور آج (بعض) شیوخ کو وہ بات میسر نہیں جو پہلے دنیا داروں کو حاصل تھی.

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ وعظ بڑی نافع چیز ہے اور یہ دین میں اس قدر اہم خدمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا اصل کام یہی تھا. درس و تدریس وغیرہ. سب اسی کے مقدمے ہیں. اب آج کل علماء نے تو اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھا اس لیے جاہلوں کے ہاتھ میں یہ کام چلا گیا. اور انھوں نے لوگوں کو گمراہ کیا.

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ خود عمل نہ کرے تو کہنے میں قوت نہیں ہوتی اس لیے اثر کم ہوتا ہے.... جو شخص خود تقویٰ اختیار کرتا ہے اس کے کہنے کا زیادہ اثر ہوتا ہے بہ نسبت اس کے جو غیر متقی ہے. چنانچہ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے دو جملوں میں جو اثر ہوتا تھا وہ دوسرے واعظوں کی لمبی لمبی تقریروں میں بھی نہ ہوتا تھا جو اثر اُن کے اِس جملے میں ہوتا تھا کہ "خدا سے ڈرو" ــــ وہ دوسروں کے سالہا سال کے وعظ و پند میں نہیں ہوتا تھا ــــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ بعض بزرگوں میں اتنی شفقت ہوتی ہے کہ مخلوق کی اصلاح کی

؎ صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ　　حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی
(حضرت جگر مرادآبادیؒ)

خاطر احیاناً اپنے معمولات میں بھی وہ تغیر و تبدل کر دیتے ہیں چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شفقت و اخلاق کی یہ حالت تھی کہ بعد نماز فجر لوگ گھیر لیتے تو آپ مجمع کی طرف رخ کیے دیر دیر تک بیٹھے رہتے یہاں تک کہ بعض دن تو اشراق اور اوراد و وظائف سب موخر ہو جاتے تھے ــــ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ میں چونکہ شانِ انتظام غالب تھی اس لیے، جہاں کسی معمول کا وقت آیا بس بلا کچھ کہے اٹھ کر چل دیے کسی سے عذر و معذرت بھی تو نہیں کرتے تھے۔ عشا کے بعد جب سونے کا وقت آجاتا تو حاضرین سے بے تکلف فرما دیتے کہ جاؤ بھائی آرام کرو اب میں سوؤں گا ــــ

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے فرمایا کہ مجھے ایک دفعہ ظہر کی نماز پڑھ کر جوش اٹھا اور خلاف وقت حضرت کی خدمت میں جا پہنچا۔ حالانکہ دوسروں کی راحت کا خیال رکھنا میرا امر طبعی ہے لیکن اس وقت حضرت، کچھ ایسے یاد آئے کہ میں خدمت میں حاضر ہو گیا اور حضرت کی تکلیف کا کچھ خیال ہی نہیں ہوا ــ اس وقت حضرت کے پاس کوئی نہیں تھا۔ حجرے میں تنہا لیٹے ہوئے تھے اور سینے پر مثنوی شریف کھلی ہوئی رکھی تھی۔ میں نے سلام کیا تو فوراً اٹھ بیٹھے اور بڑی بشاشت سے پوچھا کہ اس وقت کیسے آئے۔ میں نے عرض کیا کہ معاف کیجئے اس وقت حضرت کا حرج ہوا اور خلوت میں فرق آیا۔ فرمایا نہیں نہیں کچھ حرج نہیں ہوا ــ "خلوت از اغیار نہ از یار" (خلوت، غیروں سے ہوتی ہے دوستوں سے نہیں ہوتی) ــــ میں نے عرض کیا کہ اس وقت بے اختیار (حاضری کو) جی چاہا اس لیے بے وقت حاضر ہو گیا .... طالبین پر حضرتؒ کی بڑی شفقت تھی۔ اسی وجہ سے حضرتؒ سے بہت نفع ہوا۔ حافظ شیرازیؒ نے ایسے ہی بزرگوں کے متعلق کہا ہے

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است
زانکہ لطفِ شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل عموماً واعظین کا، بیان صاف اور پورا نہیں ہوتا مُبہم، موہم اور ناتمام ہوتا ہے جس سے بڑی بڑی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں میں سے ایک نعمت قوتِ بیانیہ کا بھی خاص طور سے ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ سورہ الرحمٰن میں ارشاد ہے "خَلَقَ الْإِنسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے بیان (اور تقریر) بھی ایک بڑی نعمت ہے اور اس کے خاص آداب ہیں جو کچھ کہنا ہو ان آداب کے تحت میں کہنا چاہیے ــــ

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ اپنے کو بڑا سمجھنا سب سے بڑی دلیل خرابی دماغ کی ہے ــ بالخصوص دوسرے بڑوں کے ہوتے ہوئے ــــ

مولانا کرامت علی جونپوری رحمۃ اللہ علیہ

اور

اُن کا ترجمہ شمائل ترمذی

(از مولانا حبیب اللہ صاحب ندوی، ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ)

(۳)

مولانا کے تبلیغی کاموں کی کامیابی کے اسباب

مولانا جونپوری کے تبلیغی کاموں کی اوپر جو تفصیل بیان کی گئی ہے اُن پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اصلاح و تبلیغ کا اتنا عظیم کام جو پوری ایک جماعت بلکہ ایک حکومت کے کرنے کا تھا وہ محض ان کی ذات کے ذریعہ کیسے انجام پا گیا۔ بنگال کے مسلمانوں کی اصلاح کا جو کام آپ نے انجام دیا وہ بجائے خود بہت حیرت انگیز ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ صوبۂ بنگال و آسام کے غیر مسلموں میں آپ نے وہ کامیابی حاصل کی جو دعوت و تبلیغ کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ صوبۂ بنگال جو مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں بھی مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ نہ بن سکا اور جس کو عام طور پر "جہنم پر از نعمت" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اُس کو مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ اور اہل ایمان کے ذریعہ "جنت پر از نعمت" کا نمونہ بنانے میں مولانا کی تبلیغی کوششوں کا بہت زیادہ دخل ہے، مگر افسوس ہے کہ انگریزوں کو سید صاحب کے سلسلہ کے بزرگوں سے جو بغض و عناد تھا اور ان سے جو عام مرعوبیت چھائی ہوئی تھی اس کے نتیجہ میں بہت کم لوگوں نے اُن کے سلسلۃ الذہب کی دینی خدمات کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ ایک میں کہیں

ذکر آنے لگا ہو۔ اوپر ذکر آچکا ہو کہ مولانا کے ہاتھوں پر بنگال و آسام کے لاکھوں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا جس کا اعتراف حال کے بہت سے تاریخ نویسوں نے بھی کیا ہو' الحاج محمد اجمل خاں ایم۔ اے اپنی کتاب سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ میں لکھتے ہیں۔

"زوال سلطنت اسلامیہ کے باوجود بلکہ اس کے بعد اس کثرت سے مسلمان ہونا شروع ہوئے ہیں کہ مشرقی بنگال پورا پورا مسلمان ہو چکا ہو۔ یہ کوشش صرف جون پور کے ایک بزرگ کی تھی جنھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں ایک کروڑ سے زیادہ غیر مسلموں کو مسلمان بنا دیا۔ آپ کا نام نامی مولانا مولوی کرامت علی صاحبؒ تھا۔"

سیرت سید احمد شہیدؒ کے مصنف لکھتے ہیں:-

"صرف مولوی کرامت علی صاحبؒ جونپوری کی کوششوں سے جو آپ کے (سید صاحب رح) کے مشہور خلیفہ تھے بنگال میں لاکھوں آدمی مشرف باسلام ہوئے" سیرت سید احمد شہیدؒ

مختصراً یہاں ان داخلی اور خارجی اسباب کی قدرے تفصیل کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہو جن کی بنا پر مولانا کی سعی دعوت و تبلیغ سعی مشکور ثابت ہوئی۔ توفیق الٰہی کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کے لیے ان اسباب کو اختیار کیے بغیر کامیابی ناممکن ہو۔

اخلاص و للّٰہیت دعوت و تبلیغ کی راہ کا سب سے قیمتی زاد راہ اخلاص و للّٰہیت ہو اور خدا تعالیٰ نے اس دولت سے مولانا کو پورے طور پر نوازا تھا' مولانا جونپور کے ممتاز خاندان کے فرد تھے۔ ان کی پرورش بڑی ناز و نعمت میں ہوئی تھی۔ خاندانی وجاہت کی وجہ سے عوام سے رابطہ کی نوبت کم ہی آتی تھی مگر ان کا اخلاص اور غایت درجہ کی للّٰہیت ہی تھی کہ اس عیش و آرام کو چھوڑ کر بنگال اور آسام کے دور دراز علاقوں کی خاک چھانی اور سارے اعزاز و اکرام کو بالائے طاق رکھ کر اور ہزار ہا مشقتیں اور زحمتیں اٹھا کر دین حق کی "صدائے غریب" کو بنگال و آسام کے جاہل عوام کے لیے مانوس بنا دیا اور پھر اس صدائے دل نواز کو ان کے کانوں سے اتار کر دلوں کی گہرائی تک پہنچا دیا۔ مولانا کی للّٰہیت کا اندازہ اس واقعہ سے بھی کیا جا سکتا ہو کہ جب وہ مرجع خلائق بن چکے تھے۔ اسی اثنا میں بنگال میں ایک عربی قاری آگئے۔ مولانا پہلے سے تجوید و قرأت سے واقف تھے مگر ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے ان سے سبقاً سبقاً تجوید و قرأت کے شعبہ کی تکمیل کی اور پھر اس فن میں کئی کتابیں لکھیں۔ مولانا

کے کچھ اقوال ہم آخر میں نقل کریں گے جس سے ان کے زہد و اتقا اور اخلاص وللّٰہیت کا اندازہ ہوگا۔

(۲) دوسری چیز جو مولانا کے کاموں میں معنوی سہارا بنی وہ تھی حضرت سید صاحبؒ کی دعائے خاص۔ مولانا جونپوری حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سید صاحبؒ نے چند ہی دن میں ان کی دعوتی صلاحیت کا اندازہ فرمالیا اور شوقِ جہاد کے باوجود ان کو دو ہفتہ بعد یہ دعا اور حکم دے کر رخصت فرمادیا کہ "خدا کی رحمت سے کام ہوگیا اور بہت جلد ہوگیا۔ اب ہدایت کے کام میں لگ جاؤ۔" چنانچہ اس دعا اور حکم کا یہ اثر ہوا کہ مولانا اس کے بعد اسی کے ہو رہے۔ مولانا نے دعوت وتبلیغ کے لیے بنگال و آسام کے غربت کدہ کا انتخاب حضرت سید صاحبؒ کے حکم ہی سے کیا تھا۔

(۳) ان معنوی اسباب کے ساتھ مولانا نے اس راہ میں جو غیر معمولی محنت، جدوجہد اور استقامت کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے اسلاف کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ شدید موانع کے باوجود ان کا کام کسی آن بھی رکا نہیں۔ مولانا نے خود اپنی محنت و مشقت اور جدوجہد کے واقعات بہت کم نقل کیے ہیں، مگر ان کی کتابوں میں ضمناً جو اشارات آجاتے ہیں اُن سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ایک جگہ سفر کی تکالیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اب کی بار سفر میں چند روز کچھ ظاہری تکالیف ایسی ہوئی تھیں کہ بعض ہمراہیوں کو کچھ وسواس آگیا مگر ہم کو اللہ نے استقامت کے ساتھ رکھا تھا۔"

اوپر ذکر آچکا ہے کہ بسا اوقات کئی کئی دن اُبلے کدو پر پورا قافلہ گزر کرتا تھا۔

مولانا کے سفر کے سارے اخراجات، ان کے متوسلین برداشت کرتے تھے مگر بسا اوقات قرض کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اس فقیر کے ساتھ کئی بوٹ ہیں اور ایک سو روپے روزانہ کا خرچ ہے اور بعضے مقام پر لوگ دعوت دے کر فقیر کو لے گئے مگر ان لوگوں نے نہ سمجھا اور فقیر مقروض ہوگیا۔"

دورانِ سفر میں آپ پر کاموں کا کتنا ہجوم رہتا تھا اس کا اندازہ مولانا کے پوتے مولانا عبدالباطن صاحب کے بیان سے ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"مولانا کو بسلسلہ تبلیغ ایک وقت میں بہت سے کام ایک ساتھ انجام دینے پڑتے تھے مثلاً عام مسلمانوں کو وعظ ونصیحت کے ذریعہ باعمل مسلمان بنانا، بے شرع فقیروں، بدعتی پیروں

کا استیصال، وحدت وجودی عقیدہ والوں کا رد، خارجی گروہ کی بدعقیدگی کی روک تھام اور ان کے عقائد کے بطلان میں رسائل لکھ کر شائع کرنا، ضروریات دین کی کتابوں کی تالیف و تصنیف، استفتاؤں کا جواب، غلط اور گمراہ کن فتاووں اور رسالوں کا رد لکھنا، طالبین کو ذکر و اذکار اور سلوک کی تعلیم دینا، فن تصوف میں کتابوں کی تالیف و اشاعت، طلبا کو تجوید قرآن کی تعلیم، مبلغین کو خاص ہدایت کے ساتھ بنگال و آسام کے گوشوں میں روانہ کرنا۔ اور ان کی نگرانی بھی کرنا، جس جگہ ضرورت محسوس ہوتی وہاں مسجد و مدرسہ قائم کرنا، اور اس کی کفالت کے لیے لوگوں کو مستعد و آمادہ کرنا، خود اپنے قافلہ کی جس میں عورتیں اور بچے، طلبا، مہمان، ترجمان، ملاح و خدام ہوتے ان لوگوں کی دیکھ بھال اور ان کے حقوق و راحت کا خیال کرنا، خود اپنے معمولات باطنی کو پابندی سے ادا کرنا، غرضیکہ مولانا ایک ایسے مرد مجاہد تھے کہ جن کے جسم کا ہر عضو ہمہ وقت دین و خلق کے لیے وقف تھا اور مثل مشین کام کر رہا تھا ــــ دل و دماغ اور کل اعضا و جوارح اپنے اپنے فرائض میں مشغول تھے جس کام کی انجام دہی کے واسطے ایک دفتر و عملہ کی ضرورت تھی اس کو وہ تن تنہا انجام دے رہے تھے اور اپنے خزانۂ توکل سے تمام کثیر اخراجات کے خود ہی کفیل تھے"

(۴) مولانا کو اپنے کاموں میں جن وجوہ سے کامیابی ہوئی ان میں ایک بڑا سبب اُن کا اعتدال و توازن اور سادہ انداز بیان تھا۔ مولانا نے جس وقت اپنا کام شروع کیا اس وقت بنگال میں نہ جانے کتنے فتنے سر اٹھائے ہوئے تھے مگر مولانا ان فتنوں سے ہمیشہ صرف نظر کر کے اپنے کام میں مشغول رہتے۔ البتہ جہاں ناگزیر ہو جاتا وہاں اپنی زبان کھولتے اور قلم کو حرکت دیتے۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں جو اہل باطل کے رد میں کتابیں لکھیں ہیں وہ انتہائی مجبوری کی بنا پر۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جن گمراہ کرنے والے نے ہزاروں آدمی کے دین کو برباد کر دیا اور سینکڑوں کلمہ گو کو بغیر جنازہ کی نماز کے دفن کروا دیا سو بموجب حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کا ذکر ہم نام لیکے کر دیتے ہیں تاکہ لوگ اس کے فساد سے محفوظ رہیں۔ وہ حکم یہ ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تم لوگ باز رہتے ہو بدکار کے ذکر کرنے سے یعنی ایسا نہ کرو بلکہ بیان کرو فاجر کو اس کے عیب کے ساتھ جو اس میں ہو تاکہ پرہیز کریں لوگ اس فاجر سے۔"

مولانا نے ہمیشہ بحث و مباحثہ اور مناظرہ سے گریز کیا مگر بسا اوقات اس کی ضرورت پیش آتی تو

مناظرہ بھی کرلیا کرتے تھے۔ مگر ان کو خدا نے جو دعوت و تبلیغ کا ایک فطری اور سادہ انداز بیان دیا تھا زیادہ تر وہ اسی سے کام لیتے تھے ان کے سادہ انداز بیان کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ بنگال میں ایک گروہ منکرین جمعہ کا پیدا ہو گیا تھا وہ اسے دار الحرب کہہ کر جمعہ کا انکار کرتا تھا اور مولانا کا شدید مخالف تھا۔ مولانا نے ان کے ایک مرکز میں ایک بار نماز جمعہ ادا فرمائی اور پھر یہ تقریر کی۔

"خواہ مخواہ لوگ ہم کو کہتے ہیں کہ ہم نئی بات ایجاد کرتے ہیں۔ ہماری نئی بات یہی ہے کہ ہم نماز کا حکم دیتے ہیں اور جمعہ قائم کرتے ہیں اور جو لوگ اس ملک میں جمعہ کو بالکل ناجائز بتلاتے ہیں۔ ہند اور بنگال کو دار الحرب کہہ کر جمعہ کی فرضیت کے منکر ہیں اور جمعہ پڑھنے سے زبردستی لوگوں کو روکتے ہیں ان سے ہم مناظرہ کرتے اور نماز جمعہ کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اب تم لوگ بتلاؤ کہ یہ مسجد کس نے بنائی ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ شجاع بادشاہ نے بنوائی ہے؟ پوچھا کہ کس واسطے بنوائی؟ کہا نماز کے لیے، پھر فرمایا کتنے روز ہوئے اس مسجد کو بنے ہوئے؟ عرض کیا گیا کہ سینکڑوں برس گزر گئے، تو فرمایا کہ ممبر مسجد میں کس لیے بنایا ہے؟ کہا گیا خطبہ پڑھنے کے لیے، فرمایا خطبہ کب پڑھتے ہیں؟ کہا گیا جمعہ کو۔ فرمایا کہ تو معلوم ہوا کہ یہ مسجد قدیم ہے اور ممبر بھی قدیم ہے اور جمعہ کا چرچا اور رواج بھی قدیم ہے صرف بیچ میں لوگوں کی سستی سے جمعہ کی نماز متروک ہو گئی تھی جس کو ہم پھر جاری کرتے ہیں اور قدیم بات کو یاد دلاتے ہیں۔ پھر فرمایا۔ دیکھو وہی سینکڑوں برس کی بات کو پھر ہم جاری اور تازہ کر رہے ہیں اور بھولے ہوئے مسائل کو یاد دلا رہے ہیں۔ ہماری بات نئی نہیں ہے بلکہ پرانی اور قدیم ہے۔"

(۵) مولانا کی دعوتی اور تبلیغی کامیابی پر اس حیثیت سے اور زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا بنگلہ زبان سے واقف نہیں تھے پھر بھی بنگالیوں میں ان کو یہ کامیابی کیسے ہوئی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے مولانا نے دو طریقے اختیار کیے۔ ایک تو اس دیار میں اردو کو رواج دیا اور لوگوں کو اس سے مانوس کیا اور اپنی کتابوں کے ذریعہ ان کی اصلاح کی۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی اردو اور بنگالی کی شدید عصبیت کے باوجود بنگالیوں کی دینی مجلسیں اردو زبان ہی میں ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ بہت سے بنگالی علماء کو اردو زبان سکھا کر اپنی ترجمانی پر مامور کیا۔ اور بہت سے لوگوں کو دور دراز مقامات پر تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا۔ چنانچہ آج بھی مولانا کے بہت سے خلفاء کے نام اہل بنگال کی زبان پر ہیں۔ ان خلفاء کے ناموں کی تفصیل آگے آئے گی جو مولانا کی ترجمانی

کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہی حضرات غالباً غیر مسلموں کو مولانا کے قریب لاکر ان کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا سبب بنے۔

(۶) مولانا کے دعوتی کاموں میں ایک "خارجی" چیز معاون ثابت ہوئی وہ تھی مولانا کے والد محترم کا جذبۂ ایثار و قربانی۔ مولانا جس وقت بنگال روانہ ہوئے تو صاحب اہل و عیال ہو چکے تھے۔ مولانا کے والد مولانا ابو ابراہیم شیخ امام بخش باحیات تھے اور عمر رسیدہ ہو چکے تھے مگر جب مولانا نے حضرت سید صاحب کے ارشاد کے مطابق دعوت و تبلیغ کی غرض سے بنگال و آسام کے سفر کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے شفقت پدری کے باوجود ان کو ایک دن بھی اس سے نہیں روکا اور جانے کے بعد ۱۸ برس تک ان کی واپسی نہیں ہوئی، ادھر اہل خاندان برابر مولانا کے والد صاحب پر زور ڈال رہے تھے کہ ان کو جونپور واپس بلانے کے لیے خط لکھیں مگر ان کے والد صاحب ہمیشہ اس کو ٹالتے رہے یہاں تک کہ ۱۸ برس کے بعد وہ خود واپس ہوئے تو وہ بیحد خوش ہوئے مگر ان کی واپسی کی خوشی ان کو کس حیثیت سے ہوئی اس کا اندازہ ان کے ان تاثرات سے ہوتا ہے جو انھوں نے ان کی واپسی پر ظاہر کیے۔

ان کے والد نے اہل خاندان اور حاضرین سے (جو اس وقت ملاقات کے لیے آئے ہوئے تھے) مخاطب ہو کر فرمایا:

بعض لوگوں کو تعجب تھا کہ حضرت سید صاحبؒ نے اول ہی ہفتہ گزر جانے پر مولوی صاحب سے (مولانا کرامت صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہدیا کہ "ہدایت کے کام میں لگ جاؤ" پھر اٹھارہ یوم کے بعد اجازت و خلافت بھی عطا فرما کر رخصت فرما دیا اور پھر جہاد میں جاتے وقت ان کو صوبہ بنگال کی تبلیغ کا کام سپرد فرمایا اور ان کے ارشاد کے موافق کاربند ہوئے۔ اب بتلاؤ کہ یہ ان کا سفر کتنے دن کا ہوا اور کتنے دنوں کے بعد واپس ہو کر حاضرین سے ملے؟ سبھوں نے عرض کیا کہ حضرت مولانا پورے اٹھارہ برس کے بعد تشریف لائے اور خدا کے فضل و کرم سے عیال و اطفال کی ایک جماعت ماشاء اللہ لے کر آئے۔ مولانا کے والد مرحوم نے فرمایا اب دیکھو حضرت سید صاحب کے فیوض و برکات کا اثر کہ ان کی صحبت کا ایک ایک دن ایک ایک سال کی تبلیغی قوت رکھتا ہو جو شاہد ہے تمام احباب و مخلصین مجھ سے فرمائش کرتے تھے کہ تم مولوی صاحب کو لکھو کہ مدتیں گزر گئیں اور گزرتی جارہی ہیں۔ آپ جونپور والوں کو بھول گئے۔ اطراف و جوانب کے مریدین امید و یاس کے عالم میں منتظر ہیں مگر میں نے کبھی

اُن کے سفر کے انقطاع کا حکم نہیں لکھا۔

ان تاثرات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے والد کے اندر دعوت و احیائے دین کا کتنا بے پایاں جذبہ موجود تھا کہ دین کے لیے اپنے محبوب لختِ جگر کی مفارقت انھوں نے ایک دو دن نہیں بلکہ پورے اٹھارہ سال برداشت کی اور پھر تھوڑے دن کے بعد انھیں پھر رخصت کر دیا اور اسی زمانۂ مفارقت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اللہ ان پر رحمتوں کی بارش کرے۔

(۷) اس سلسلہ میں سید صاحب کے وہ خلفاء جو کلکتہ اور بنگال وغیرہ میں موجود تھے وہ بھی مولانا کے کاموں میں بے حد معاون ہوئے۔ ان میں حسب ذیل حضرات خواص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا حافظ جمال الدین صاحب، محدث مولانا محمد وجیہہ صاحب مدرس اول مدرسہ عالیہ قاضی عبدالباری صاحب وغیرہ ——————

ان حضرات نے مولانا کے کاموں میں پورا تعاون کیا اور ان کو ہر طرح کی مدد بہم پہنچائی،

(۸) اس کام میں مولانا کے سیکڑوں تلامذہ اور متوسلین بھی شریک تھے، جن کے ناموں کی تفصیل باوجود کوشش نہ مل سکی۔ مولانا کے اہل خاندان میں اُن کے تقریباً ۷۰۔۸۰ خلفاء و متوسلین کے نام محفوظ ہیں اُن میں چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ مولانا انوار اللہ صاحب مصنف خوارق مکیہ۔ یہ چاٹگام کے رہنے والے تھے، اور مولانا کے خلیفۂ خاص تھے، اور آپ کے شریک کار۔

۲۔ مولانا سید محمد شاہ محدث رام پوری، ریاست رام پور کے سابق قاضی مولانا حامد شاہ صاحب کے یہ والد ماجد تھے۔ اور مولانا کے کاموں میں برابر شریک رہے۔ رام پور کے علاوہ بنگال کے علاقہ پابنیا اور ناگور وغیرہ کے لوگوں کو ان سے بہت فیض پہنچا۔

۳۔ مولانا عبدالعزیز صاحب، یہ ضلع فریدپور کے مقام طلفت گنج کے رہنے والے تھے، یہ مولانا کے ترجمان خاص تھے۔ مولانا کی اردو تحریروں کا بنگلہ زبان میں ترجمہ بھی کرتے تھے۔ خود بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

۴۔ منشی نعمت اللہ صاحب، احمد پور پابنا کے رہنے والے تھے۔ آپ نے مولانا کے ارشاد کے مطابق بگمڑہ، رنگ پور، سراج گنج اور گوکنڈہ وغیرہ میں زبردست تبلیغی کام کیا۔ گوکنڈہ میں آپ

نے ایک بڑی مسجد تعمیر کرائی تو ۲۰۔ ۲۵ میل سے لوگ اس میں جمعہ ادا کرنے آتے تھے۔

(۵) قاری محمد جاوید صاحب، یہ سلہٹ کے رہنے والے تھے، اور مولانا کے خاص جاں نثاروں میں تھے۔ یہ آسام کے ایک اونچے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے صاحبزادے شمس العلماء ابو نصر صاحب آسام کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں۔

(۶) مولانا احسن اللہ صاحب اور منشی حاجی عبدالرحیم صاحب دونوں حضرات مولانا کے بوٹ کے گشتی مدرسہ کے فیض یافتہ تھے! اول الذکر بڑے جید عالم تھے۔ اور ان کے بعد بھی ان کے خاندانوں میں مدتوں علم دین اور دعوت دین کا چرچا رہا۔

۷۔ ان کے علاوہ مولانا فیض اللہ صاحب نواکھالی، مولانا الٰہی بخش عطا صاحب فتادی و دائم الدین مولانا عبدالنقاد صاحب مصنف خلاصۃ المسائل وغیرہ۔ مولانا کے ان خلفاء نے تبلیغ و اصلاح میں مولانا کا پورا تعاون بھی کیا اور خود بھی پورے پورے علاقہ میں زبردست دعوتی و اصلاحی کام کیا۔

۸۔ مولانا کے خلفاء و متوسلین کے ساتھ ان کے اہل خاندان اور خاص طور پر ان کے دو صاحبزادگان نے مولانا کی زندگی میں اور آپ کے بعد بھی بڑا زبردست اصلاحی کام کیا، ایک مولانا حافظ احمد صاحب متوفی ۱۳۱۶ھ دوسرے مولانا عبدالاول صاحب متوفی ۱۳۴۹ھ ہیں۔ مولانا حافظ احمد صاحب کی ولادت کلکتہ میں مولانا کے اثنائے قیام ہی میں ہوئی۔ یہ علم و فضل، زہد و تقویٰ اور تبلیغ و دعوت میں مولانا کے نقش ثانی تھے اور ان اوصاف اور خدمات کی وجہ سے عوام میں حد درجہ مقبول تھے۔ ان کے عقیدتمندوں میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سب ہی شامل تھے۔ ان کے کاموں اور دوروں کی خبریں کلکتہ اور بنگال کے سارے اخبارات جلی سرخیوں سے شائع کرتے تھے ایک بار کلکتہ میں مولانا کے گرد دعا کرانے والوں کا غیر معمولی مجمع ہوا، اور مولانا نے ہزاروں کو پانی میں کالا زیرہ دم کرکے دیدیا، جس سے نہ جانے کتنے مریض شفایاب ہوئے۔ ایک شاعر نے اس پر یہ شعر کہا ؎

دکھایا اثر کالی زیرہ نے جب پرستش گئے بھول کالی کی سب

مولانا احمد صاحب کا انتقال ڈھاکہ میں ہوا، اور وہیں چوک والی مسجد میں آپ کا مزار ہے۔

مولانا کے دوسرے صاحبزادے مولانا عبدالاول صاحب دعوت و تبلیغ کے ساتھ متعدد اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں جنمیں بعض کتابیں عربی زبان میں ہیں، آپ کا انتقال کلکتہ میں ہوا اور مانک تلہ میں آپ کا مزار ہے۔ ان کے خاندان کے بہت سے حضرات آج تک تبلیغ و اصلاح کا کام جاری کیے ہوئے ہیں۔

راقم الحروف کے نزدیک یہ تھے وہ خارجی اسباب جو مولانا کے دعوت و تبلیغ کے کام میں معاون ثابت ہوئے واللہ اعلم بالصواب۔ (باقی)

لے بنگال میں کالی کی پرستش کثرت سے ہوتی ہے بعض لوگوں نے کلکتہ کی وجہ تسمیہ بھی یہی بتائی ہے۔ ۱۲

درسِ قرآن

مولانا محمد منظور نعمانی

مرکز والی مسجد - ۲۱ر جون ۶۹ء

"نبیِ اُمّی" کے مبعوث ہو جانے کے بعد
اُن پر ایمان اور اُن کی شریعت کی پیروی نجات و فلاح کی شرط ہے

حمد و صلوٰۃ، اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الاعراف ع ۱۹)

جو لوگ پیروی کرتے ہیں (خدا کے) اُس پیغمبر کی جو نبی اُمّی ہے، جسکو وہ لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں، جو اچھی پسندیدہ باتوں اور نیک کاموں کی ان کو ہدایت کرتا ہے اور بری باتوں اور ناپسندیدہ کاموں سے ان کو منع کرتا ہے اور نفیس پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتاتا ہے اور خراب گندی چیزوں کو ان کے لیے حرام ٹھیراتا ہے اور اُن کے بوجھ (جن کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے) اور وہ بندشیں جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے ان سے دور کرتا ہے۔

پس جو لوگ اس نبی اُمّی پیغمبر پر ایمان لائے اور اسکی تائید و حمایت کی اور (اسکے پیغمبرانہ مشن میں) اسکے مددگار رہے اور اُس نورِ ہدایت کی انھوں نے پیروی اختیار کی جو (خدا کی طرف سے) اس پیغمبر پر اتارا گیا ہے تو یہی لوگ فلاح یاب اور بامراد ہیں۔ (سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷)

تفسیر و تشریح

یہ سورۂ اعراف کے ۱۹ویں رکوع کی آخری آیت ہے۔ اس سے اوپر کی آیتوں میں جو پچھلے ہفتہ زیر درس تھیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک واقعہ اور ان کی ایک اہم دعا کا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے جواب کا ذکر کیا گیا تھا۔ — واقعہ یہ ذکر کیا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل میں سے ستر نمائندے منتخب کر کے اپنے ساتھ مقررہ وقت پر اس مقام پر لے گئے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا۔ ان نمائندوں کو ساتھ لے جانے کا مقصد یہ تھا کہ وہاں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہو اور اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت دی جائے اس کو یہ لوگ بھی ممکن حد تک دیکھ اور سُن سکیں، پھر خود ان کے دلوں میں اطمینان و یقین پیدا ہو اور اُن کے شہادت دینے اور بتانے سے قوم کے عوام میں بھی اطمینان و یقین پیدا ہو۔ لیکن ہوا یہ کہ بنی اسرائیل کے ان نمائندوں نے خدا کی قدرت کی کھلی نشانیاں بھی دیکھیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو جو ہدایات دی گئیں اُن کو بھی سُنا لیکن مزاج کے فساد اور شرارت و سرکشی کی وجہ سے، یہ سب کچھ دیکھنے، سننے کے بعد بھی کہا کہ ہم اُس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک کہ خدا کو کھلم کھلا ہم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ (لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً)

ان کی اس گستاخی پر خدا کا جلال ظاہر ہوا۔ نیچے سے "رجفہ" یعنی سخت ہولناک بھونچال آیا اور اوپر سے "صاعقہ" یعنی بجلی کا ایسا کڑاکا ہوا جس سے دل پھٹ جائیں۔ اُس سے یہ سب لوگ مُردوں کی طرح گر پڑے — موسیٰ علیہ السلام نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا کہ خداوندا تو مالک و مختار ہے۔ تجھے ہم سب کو ہلاک کر ڈالنے کا بھی پورا حق ہے۔ اور تو چاہتا تو میری قوم کے ان گستاخوں کی گستاخی سے پہلے اور اس جُرم کے بغیر ہی انھیں اور اُن کے ساتھ مجھے بھی ختم کر سکتا تھا۔ کوئی تیرے فیصلہ کو روک نہیں سکتا تھا (رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ)۔ لیکن تو نے ہمارے بہت سے قصوروں اور کوتاہیوں کے باوجود ہمیں ہلاک نہیں کیا بلکہ ہمیں برابر انعامات سے نوازتا رہا۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری قوم کے ان جاہلوں بے وقوفوں کی ایک جاہلانہ اور احمقانہ حرکت کی وجہ سے آج تو ہم سب کو ہلاک کر دے۔ یعنی یہ بات تیری شان کریمی سے بعید ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ یہ جو تیری طرف سے جلال کا ظہور ہوا ہے یہ ہمارے لیے بس ایک آزمائش اور تنبیہ ہے۔ (اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ

وَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَاءُ ط) ــــــ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ان قصورواروں کے لیے بلکہ ان کے ساتھ پوری قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ التجا کی۔

اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الْغَافِرِیْنَ o وَاكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَا اِلَیْكَ ط

یعنی خداوندا! تو ہمارا والی اور کارساز ہے۔ پس ہم کو بخشدے اور رحم فرما۔ تو سب سے اچھا بخشنے والا ہے اور لکھدے ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی ہم تیری طرف رجوع ہو گئے ہیں۔ یعنی ہم نے سب طرف سے یکسو ہو کر تیری طرف رُخ کر لیا ہے اور تیری بندگی اور فرمانبرداری کا ارادہ کر لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے جواب میں فرمایا گیا۔

عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاءُ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ط فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ o

مطلب یہ ہے کہ میرے ہاں عذاب بھی ہے اور رحمت بھی۔ لیکن عذاب سب کے لیے نہیں ہے۔ یہاں تک کہ سارے مجرموں اور گنہگاروں کے لیے بھی نہیں ہے۔ بلکہ صرف ان مجرموں کے لیے ہے جن کو میں عذاب دینے ہی کا فیصلہ کر دوں۔ یعنی جو اپنے سنگین جرموں کی وجہ سے معافی کے قابل ہی نہ ہوں۔ مگر میری رحمت ہر چیز کو محیط ہے۔ کوئی شے نہیں ہے جسے میری رحمت سے کچھ نہ کچھ حصّہ نہ مل رہا ہو۔ لیکن اے موسیٰ! جس رحمت خاصہ کی تم نے استدعا کی ہے کہ دنیا میں بھی حسنہ یعنی میرا فضل خاص ہو اور اسی طرح آخرت میں بھی خصوصی رحمت و کرم ہو تو یہ چیز کسی خاص نسل یا کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے اور نہ مخصوص کی جا سکتی ہے بلکہ یہ ان بندوں کا حصّہ ہے جن میں بنیادی طور پر یہ تین صفات ہوں۔

ایک یہ کہ ان میں تقویٰ اور پرہیزگاری ہو یعنی وہ سب بری باتوں اور برے کاموں سے بچنے اور پرہیز کرنے کا اہتمام کرتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ زکوٰۃ دیتے ہوں۔ جو اکثر دنیا والوں کے لیے سب سے مشکل کام ہوتا ہے اور تیسرے یہ کہ ہماری ساری آیتوں پر ایمان لائے ہوں۔ یعنی ہمارے سارے فرمانوں اور حکموں کو دل و جان سے مانتے ہوں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کی درخواست کا جواب ہوا۔ جس کا حاصل یہ ہوا

کہ ہماری رحمت کا یہ خاص درجہ کہ دنیا اور آخرت دونوں میں ہمارا خصوصی فضل و انعام ہو۔ یہ اُن وفادار اور اطاعت شعار بندوں کے لیے طے شدہ ہو جو زندگی میں تقویٰ کا طریقہ اختیار کریں اور اپنی دولت اور کمائی اللہ کی رضا کے واسطے قربان کریں اور اللہ کے تمام فرامین اور احکام کو مانیں، تو قوم بنی اسرائیل میں سے جو لوگ رحمت الٰہی کا یہ خاص درجہ حاصل کرنا چاہیں وہ اپنے اندر یہ تین باتیں پیدا کریں، انکو یہ درجہ مل جائے گا۔

اس کے بعد رکوع کی یہ آخری آیت ہو جو میں نے اس وقت آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہو۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ...... الاٰیۃ

بہت سے مفسرین کی رائے یہ ہو کہ اوپر والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی استدعا کا جو جواب دیا ہو، یہ آیت بھی اُسی کا جُز ہو اور اس میں رحمت الٰہی کا خاص درجہ پانے والوں کی چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہو کہ وہ نبی امی (یعنی آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائیں اور انکی پیروی کریں لیکن میرے نزدیک دوسرے مفسرین کی یہ رائے قابل ترجیح ہو کہ اس آیت میں ایک دوسرا مستقل اہم اعلان کیا گیا ہو۔ اور اس کے مخاطب موسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے بنی اسرائیل یعنی وہ یہود و نصاریٰ اس کے خصوصی مخاطب ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا پیغمبر مانتے تھے اور اپنے کو خدا کی خاص رحمت اور اُس کے خصوصی فضل و انعام کا مستحق سمجھتے تھے، تو اس آیت میں دراصل انھیں کو بتایا گیا ہے کہ اب جبکہ خدا کی طرف سے وہ "الرسول" اور "النبی الامی" (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہو گئے جن کا ذکر تمھاری مقدس الہامی کتابوں تورات و انجیل میں موجود ہے اور ایسا تفصیلی ذکر موجود ہے کہ گویا وہ خود ہو بہو اس میں لکھے ہوئے ہیں ــ ـــ اور تمھاری آنکھیں ان مقدس کتابوں کے صفحات میں ان کو دیکھ رہی ہیں اور پا رہی ہیں۔ (يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ) ـــ تو اب ان کے مبعوث ہو جانے کے بعد دُنیا اور آخرت میں فلاح و کامیابی کے لیے اور اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و انعام کے لیے یہ بھی لازمی شرط ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے اور جو نور ہدایت اور شریعت وہ لے کر آئے ہیں اُس کا اتباع کیا جائے اور راہِ خدا کی ہدایت کی جد و جہد میں ان کا ساتھ دیا جائے۔ کیونکہ اس دور میں وہی خدا کے

رسول اور خدا کی مرضی کے نمائندے ہیں اور اب خدا کی رحمت اور رضامندی ان کی پیروی سے وابستہ ہے پس اس دور میں جو ان پر ایمان نہیں لائے گا اور ان کی لائی ہوئی ہدایت کی پیروی نہیں کرے گا وہ فلاح و نجات سے محروم رہے گا۔ ــــ میرے نزدیک اس آیت کا یہی پیغام ہے اور اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے ایک اہم منشور اور اعلان کی ہے۔

اب ذرا اس آیت کے الفاظ پر کسی قدر تفصیل سے غور کر لیا جائے ــــ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نو صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ سب سے پہلے کہا گیا ہے اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ ــــ

پیغمبروں کو دو حیثیتیں حاصل ہوتی ہیں، یا یوں کہا جائے کہ ان کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی ہدایت اور اُس کے احکام بندوں کو پہونچاتے ہیں، اس لحاظ سے ان کو رسول کہا جاتا ہے۔ ــــ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات اور عالم آخرت اور عالم غیب کی بہت سی باتوں کا اور ہدایت و احکام کا علم وحی و الہام کے ذریعہ ان کو عطا فرماتا ہے، اس لحاظ سے ان کو نبی کہا جاتا ہے ــــ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دونوں حیثیتوں کو ظاہر کرنے کے لیے اَلرَّسُوْلَ بھی کہا گیا ہے اور اَلنَّبِيَّ بھی، تیسری صفت اَلْاُمِّيَّ بیان کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نوشت و خواند یعنی لکھنے پڑھنے کے لحاظ سے آپ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے، اس لیے آپ کے علوم کسی اُستاد اور کسی کتاب سے حاصل کیے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کے عطا فرمائے ہوئے ہیں ــــ چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ " اَلَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ " جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ اُن کو اپنی الہامی کتابوں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، ــــ یہاں یہ بات خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ اُن کا نام لکھا ہوا پاتے ہیں یا اُن کا حلیہ اور سراپا یا اُن کے اخلاق و عادات یا ان کی کوئی اور خاص بات لکھی ہوئی پاتے ہیں بلکہ فرمایا گیا ہے " يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ " یعنی خود آپ کو لکھا ہوا پاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کتابوں میں آپ کا ایسا مکمل تذکرہ ہے کہ گویا اُن کے صفحات میں خود ہو بہو آپ لکھے ہوئے ہیں، اور ان کے پڑھنے والے یہودی و نصرانی اپنی کھلی آنکھوں ان کتابوں میں آپ کو دیکھتے ہیں ــــ اس سے ایک یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگرچہ تورات و انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی تحریف ہو چکی تھی جس کا ذکر خود قرآن مجید میں

جا بجا کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود جو توراۃ اور انجیل حضور کے زمانہ میں یہود و نصاریٰ پڑھتے تھے اُن میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا صاف اور مکمل تذکرہ موجود تھا کہ اس آیت میں فرمایا گیا "یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ" لیکن ہمارے اس زمانہ میں تورات و انجیل کے نام کی جو دو کتابیں پائی جاتی ہیں اُن میں اگرچہ ایسی عبارتیں موجود ہیں جن کے مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں لیکن وہ ایسی روشن اور کھلی ہوئی نہیں ہیں جن کی بنا پر کہا جا سکے کہ آپ خود توراۃ و انجیل میں لکھے ہوئے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ ۱۳، ۱۴ صدیوں میں بھی توراۃ و انجیل میں بہت کچھ تحریف اور تبدیلی ہوئی ہے ۔

یہاں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے، اس آیت میں بالاعلان یہ دعویٰ کیا گیا ہے اور خاص طور سے یہود و نصاریٰ کو سنایا گیا ہے اور گویا اُن کو چیلنج کیا گیا ہے کہ تمہاری مقدس کتابوں توراۃ و انجیل میں یہ "الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ" (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) لکھے ہوئے ہیں اور تم ان کتابوں میں ان کو لکھا ہوا پاتے ہو ۔ اگر بالفرض قرآن کا یہ دعویٰ واقعہ کے مطابق نہ ہوتا یا اس میں کچھ بھی کچا پن ہوتا تو اس زمانہ کے یہود و نصاریٰ یقیناً اس کی تردید اور تکذیب کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت اور قرآن مجید کے خلاف یہ ان کی خاص دلیل ہوتی اور اس میں بڑا وزن ہوتا لیکن تاریخ میں کہیں اس کا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ اس دور کے یہود و نصاریٰ نے اس قسم کی کوئی بات کہی ہو اور قرآن پاک کے اس دعوے کی تردید و تکذیب میں آواز اٹھائی ہو ۔ اگر انصاف کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ بڑی فیصلہ کن بات ہے ۔

یہاں ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہماری حدیث کی کتابوں میں متعدد ایسی روایتیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ کتاب کے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویریں تک موجود تھیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے جو محدث بھی ہیں اپنی تفسیر میں کئی روایتیں حدیث کی مختلف کتابوں سے سند کے ساتھ نقل کی ہیں۔ اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ قدیم آسمانی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ اتنی تفصیل کے ساتھ کیا گیا تھا اور اتنی وضاحت کے ساتھ آپ کا سراپا بیان کیا تھا کہ اس کی روشنی میں آپ کی تصویریں تک بنائی گئی تھیں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا قرآن پاک کی اس آیت کے الفاظ "يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ" سے اس کی پوری تائید ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سورۂ اعراف سے پہلی

سورۃ "الانعام" میں یہ آیت گزر چکی ہے "اَلَّذِیْنَ آتَیْنَاهُمُ الْكِتَابَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ" یعنی اہل کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں ـــــ یہ آیت بھی یہی بتاتی ہے کہ اگلی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ایسی تفصیل سے کیا گیا تھا کہ اس کی روشنی میں ان کتابوں کے پڑھنے والے اور خاص کر بنی اسرائیل کے احبار اور علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے پہچانتے تھے جیسے دیکھے بھالے آدمی کو پہچانا جاتا ہے بلکہ جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے کو پہچان لیتا ہے۔

یہود و نصاریٰ کی موجودگی میں اور ان کی کتابوں اور ان کے علماء کی موجودگی میں قرآن مجید کا یہ دعویٰ خود اس کی دلیل ہے کہ حقیقت یہی تھی۔

میں آیت کے الفاظ "یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ" کی وضاحت کر رہا تھا۔ بات بہت طویل ہو گئی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نو صفات بیان کی گئی ہیں۔ ایک "الرسول" دوسری "النبی" تیسری "الامی" اور چوتھی یہ کہ "اہل کتاب ان کو توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں"۔ ان چاروں کی تشریح ہو چکی ہے۔ ان کے بعد پانچویں اور چھٹی صفت یہ بیان کی گئی ہے "یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ" یعنی وہ رسول ان لوگوں کو معروف کی ہدایت کرتا ہے اور منکر سے منع کرتا ہے ـــ معروف اُن سب اعمال و اخلاق کو کہا جاتا ہے جن کو انسان کی سلیم فطرت پسند کرے، اور جن کی وجہ سے آدمی کو تعریف اور تحسین کے لائق سمجھا جائے اور منکر اس کے برعکس اُن رذیل اور قبیح اعمال و اخلاق کو کہا جاتا ہے جن سے فطرت سلیم انکار اور [illegible] کرے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ہدایات کو تفصیل سے دیکھا جائے تو [illegible]لوم ہوگا کہ جن اعمال و اخلاق کی آپ نے ہدایت فرمائی ہے وہ شریف انسانوں کے نزدیک معروف اور پسندیدہ ہیں اور اُن کو نیکی سمجھا جاتا ہے اور جن کاموں سے آپ نے منع فرمایا ہے وہ منکر اور ناپسندیدہ ہیں اور اُن کو گراوٹ کی بات سمجھا جاتا ہے ـــــ

پھر ساتویں اور آٹھویں صفت یہ بیان کی گئی ہے "یُحِلُّ لَهُمُ ال[illegible]طَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ" یعنی وہ رسول نبی اُمی دُنیا کی تمام نفیس اور پاکیزہ چیزوں کو [illegible]انسان کے لیے حلال ٹھہراتا ہے اور گندی خراب چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے ـــــ اور سب سے آخر میں نویں صفت یہ بیان کی گئی ہے "یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ" مطلب یہ ہے کہ لوگوں پر خاص کر بنی اسرائیل پر ان کی شرارت و سرکشی

کی وجہ سے اگلی شریعتوں میں جو بعض سخت احکام عائد کیے گئے تھے جو بہت ہی مشکل اور بھاری تھے۔ یہ رسول نبی اُمّی ان کی منسوخی کا اعلان کرکے ان سے نجات دیتا ہے اور وہ بوجھ اتارتا ہے جس کے تلے وہ دبے ہوئے تھے۔
۔۔۔سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے کہ بعض چیزیں جو فی نفسہ حلال طیب تھیں، بنی اسرائیل پر ان کی شرارت و سرکشی کی وجہ سے حرام کردی گئی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس حکم کی منسوخی کا اعلان کیا اور ساری دنیا کے لیے ان چیزوں کو حلال کردیا۔۔۔ اسی طرح بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ اگر کپڑے میں کہیں ناپاکی لگ جائے تو وہ حصہ کاٹ کر پھینک دیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سخت حکم کی منسوخی کا اعلان فرمایا اور بتلایا کہ صرف دھو دینے سے کپڑا پاک ہو جائے گا۔۔۔ میں نے صرف دو مثالیں دی ہیں، بنی اسرائیل کی شریعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کے احکام کا مقابلہ کرکے ایسی بہت سی مثالیں معلوم کی جا سکتی ہیں۔۔۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نو صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے
فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

مطلب یہ ہے کہ اب جو لوگ اس نبی اُمّی رسول پر ایمان لائیں، یعنی جو ان کو خدا کا رسول اور نبی مانیں اور منکرین و مخالفین کے مقابلہ میں اُن کی تائید و حمایت کریں اور اُن کی مشن پیغمبرانہ مہم میں ان کا ساتھ دیں اور مدد کریں اور جو نورِ ہدایت ان کے ساتھ اتارا گیا ہے یعنی قرآن مجید اور وہ دستور شریعت جو قرآن ہی میں ہے اُس کی پیروی کریں اور اُس کو اپنا دستور زندگی بنالیں وہی فلاح یاب اور کامیاب ہوں گے اور دنیا و آخرت میں وہی خدا کی رضا و رحمت کے مستحق ہوں گے۔۔۔

آیت کا اصل مقصد اور پیغام دراصل یہی ہے جو اس کے اس آخری حصہ میں ہے، اس سے پہلے جو کچھ فرمایا گیا تھا وہ دراصل اسی کی تمہید تھی اور اُس میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف کرایا گیا تھا۔ اور اتنا تفصیلی تعارف اسی لیے کرایا گیا تھا کہ آپ کے بارہ میں اتنا اہم اور غیر معمولی اعلان کیا جانا تھا یعنی یہ کہ آپ کے مبعوث ہو جانے کے بعد نجات و فلاح کے مستحق وہی ہوں گے جو آپ پر ایمان لائیں اور آپ پر نازل کی ہوئی مقدس کتاب قرآن مجید اور اُس کی شریعت کی پیروی کریں۔۔۔
ہمارا ایمان ہے اور قرآن مجید نے ہمیں بتایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خدا کے پیغمبر تھے جنھیں خدا کی ہمکلامی کا

شرف بھی حاصل ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر تورات نازل فرمائی تھی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے پیغمبر اور کلمۃ اللہ تھے اور اُن کو اللہ تعالیٰ نے بڑے غیر معمولی قسم کے معجزات عطا فرمائے تھے اور انجیل ان پر نازل کی گئی تھی اور اپنے اپنے دَور میں ان پر ایمان لانا اور ان کی لائی ہوئی ہدایت و تعلیم کی پیروی کرنا نجات و فلاح کے لیے بلکہ اللہ تعالیٰ کا قربِ خصوصی حاصل کرنے کے لیے بھی کافی تھا۔

لیکن قرآن مجید کی اس آیت میں (اور بہت سی دوسری آیتوں میں بھی) اعلان فرمادیا گیا ہے کہ خدا کے آخری نبی و رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہوجانے کے بعد ان پر ایمان لائے بغیر اور ان کی شریعت کو اختیار کیے بغیر کوئی شخص فلاح و نجات حاصل نہیں کرسکتا ـــــ یہ خداوندی فیصلہ اور منشور ہے اور اسی کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث پاک میں یہاں تک ارشاد فرمایا "لَوْ كَانَ مُوسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِيْ"[1] یعنی اگر آج اللہ کے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو اُن کے لیے بھی میری شریعت کی پیروی لازم ہوتی ـــــ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

والذی نفس محمد بیدہ لا یسمع بی[2]	اس پاک ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی (یعنی میری)
من ھذہ الامۃ یہودی ولا نصرانی	جان ہے اس دور کا جو یہودی یا نصرانی میری
ثم یموت ولم یومن بالذی ارسلت بہ	اطلاع پالے، پھر اس حال میں مرجائے کہ جو دین
الا کان من اصحٰب النار۔	اور شریعت اللہ کی طرف سے میں لایا ہوں اس پر
	وہ ایمان نہ لائے اور اسکو قبول نہ کرے تو وہ اہل
	نار میں سے ہوگا۔ اور نجات و فلاح سے محروم رہے گا۔

بہرحال یہ مسئلہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لانا اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کو قبول کرنا نجات و فلاح کی شرط ہے، اسلام کے اُن بنیادی مسائل میں سے ہے جن کو قرآن مجید میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ اس میں کسی دوسری رائے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

سبحان ربك رب العزة عما یصفون ○ وسلام علی المرسلین ○
والحمد للہ رب العٰلمین ○

---

[1] رواہ احمد والبیہقی [2] رواہ مسلم

نئی مطبوعات

غیرسودی بنک کاری | از ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی
صفحات ۳۲۶۔ سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ مجلد قیمت ۴/
ناشر: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ دہلی ۶

جدید معاشیات میں بینکنگ کے نظام کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ اور یہ نظام سرتاپا سود میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی اسلامی ملک اپنی معاشیات کو سود سے پاک کرنا چاہے تو اس کی کیا سبیل ہے، جبکہ بینکنگ کا نظام قائم رکھے بغیر موجودہ دور میں ایک ترقی یافتہ معیشت کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وقت کے اس اہم ترین سوال کے ماتحت اسلامی دنیا کے بہت سے مفکرین بینکنگ کا ایک ایسا نظام تجویز کرنے میں اپنی علمی اور فکری صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں جس میں سود کا عنصر نہ ہو۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے استاذ معاشیات ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اور جہاں تک ہمارا علم ہے اب تک کی تمام کوششوں میں اس کا درجہ بلند ہے۔

بینکنگ کا نظام جو معاشرہ کو معاشی سہولت بہم پہنچانے کے لیے نہیں بلکہ اصلاً سودی کاروبار کے ذریعہ اُس کی دولت گھسیٹنے کے لیے وجود میں آیا تھا اور اسی ذہن سے اُس کا تانا بانا تیار ہوا ہے، اُس میں ایسی اصلاحی تجاویز کا بیڑا اٹھانا جن کے ذریعہ اس کاروبار میں سے سود کا عنصر نکل جانے پر بھی وہ ایک منفعت بخش کاروبار رہ سکے، ایک ایسی فکری جرأتمندی اور مجتہدانہ طبیعت کا ثبوت ہے جس پر ہر وہ شخص مسرور ہوگا، جسے عالم اسلام میں اس جنس کی بے حد ضرورت مگر بیحد کم یابی کا احساس ہے۔

بینک کاری کے مسائل اور معاشیات میں اُس کے کردار سے ہمیں فنّی واقفیت نہیں چنانچہ زیر تبصرہ کتاب کے بعض مباحث کو سمجھنا بھی ہمارے لیے وقت طلب ہے۔ لیکن مجموعی طور مصنف کے اندازِ کلام میں جو وضاحت و خود اعتمادی نظر آتی ہے اور غیر سودی بینک کاری کے لیے اُن کا

پیش کردہ خاکہ بادی النظر میں جس طرح ایک نہایت جامع اور قابل فہم و قابل عمل تجویز ہونے کا تاثر دیتا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع پر پوری طرح حاوی اور اُس میں ایک صاحب بصیرت کا مقام رکھتے ہیں۔

غیر سودی بینکنگ کے لیے مرتب کردہ اس عملی خاکہ کی بنیاد اسلامی شریعت کے اصول مضاربت و شرکت پر رکھی گئی ہے، جو اس مسئلہ پر اسلامی نہج سے سوچنے والوں کی اب تک ایک متفقہ سی رائے ہے لیکن ان اصولوں کی وضاحت اور بینکنگ کے پس منظر میں ان پر غور و خوض کے لیے "شرکت اور مضاربت کے شرعی اصول" کے نام سے مصنف نے ایک پوری کتاب الگ سے لکھی ہے۔ جو ہمارے پاس نہیں آئی ہے۔ مگر اُس کا مطالعہ زیر تبصرہ کتاب سے پہلے کیا جانا قدرتی طور پر ضروری ہے۔

اس اعتراف کے بعد کہ کتاب کا موضوع ہمارے لیے اجنبی ہے اس میں کسی جگہ انگلی رکھنے کا حق ہمیں نہیں رہ جاتا۔ لیکن ایک خلش کو ظاہر کرنے کے لیے ڈرتے ڈرتے اتنا کہنا ہے کہ مصنف جب اس کے حامی ہیں کہ عام حالات میں ایک اسلامی نظام حکومت بینکوں کو نجی ملکیت ہی کے زمرہ میں رکھے گا تو نجی ملکیت والے بینکوں سے جو چند افراد اور خاندانوں کی معاشی اجارہ داری وجود میں آتی ہے۔ اُس کا سدّباب کس طرح کیا جائے گا؟ ۔۔۔ ہو سکتا ہے اس سوال کا جواب کتاب میں کہیں موجود ہو مگر ہمارے ذہن کی گرفت میں وہ نہیں آسکا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "شرکت و مضاربت کے شرعی اصول" میں اس کا جواب مل جاتا ہو مگر یہ کتاب ہمارے مطالعہ میں نہیں آئی ہے۔

اسلام کی دعوت

از سید جلال الدین عمری

سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت و طباعت متوسط قیمت ۔/۲

ناشر: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ دہلی۔ ۶

کتاب کے نام سے خیال ہوتا ہے کہ دعوت اسلامی کی ماہیت و حقیقت سے اس میں بحث کی گئی ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے کار دعوت کی اہمیت، دعوت کا طریق و نہج، اس کے آداب و شرائط اُس کے مختلف دائرے اور داعی کے لیے ضروری اوصاف اس کتاب کا موضوع ہے۔

کتاب میں اس بات کی صراحت تو کہیں نہیں ہو کہ یہ جماعت اسلامی سے متعلق افراد کی تربیت و رہنمائی کے لیے لکھی گئی ہو، مگر واقعی نوعیت یہی ہو۔ یعنی اس کا تخاطب خاص طور پر ایسے افراد سے ہو جو فریضۂ دعوت ہی کی انجام دہی کے لیے ایک جماعت سے وابستہ ہو چکے ہیں اور اس روشنی میں کتاب کو دیکھتے ہوئے یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہو کہ جو احوال و اوصاف ایک مومن کی زندگی میں داعی بن کر کھڑے ہونے سے پہلے آجانے چاہئیں، بلکہ جن کے بغیر اس کا تصور بھی ممکن نہیں کہ کوئی شخص حقیقتہً دعوت اسلامی کا بوجھ اٹھانے کے لیے کسی پکار پر لبیک کہے گا، مثلاً نماز کا اہتمام، تعلق باللہ، فکر آخرت اور کامل اتباع شریعت، ان اوصاف کی اہمیت بھی ان اہل دعوت کو اس طرح بتائی گئی ہو جیسے وہ ان کی اہمیت سے آشنا ہی نہ ہوں! یہ باتیں اگر بے ضرورت طور پر کتاب میں آئی ہیں تو بے محل وعظ اسے کہنا پڑے گا اور اگر واقعہ میں یہ حال اِن اہل دعوت کا ہو، تو وہ تصور دعوت قابل اصلاح ہو جس کے ماتحت ایک شخص اسلام کے بنیادی اوصاف سے خالی ہوتے ہوئے داعئ اسلام بن جائے۔

جماعت اسلامی نے اپنی دعوتی جدوجہد میں شرکت کے لیے اصلاً جس اپیل پر لوگوں کو بلایا تھا وہ یہ تھی کہ دنیا کا اجتماعی نظام باطل کے ہاتھوں سے چھن کر اسلام کے ہاتھ میں آجائے۔ اس جذبہ سے کسی دعوتی جدوجہد میں شریک ہونے والے اُن لوگوں کی ایک تعداد جن کی دینی زندگی کا آغاز بس اسی دعوت پر لبیک کہنے سے ہوا ہو، نفسیاتی طور پر ضرور ایسی ہو گی جس کا سارا ذوق بس باطل پر تنقید کرنے اور مخالف طاقتوں کے مقابلہ میں اپنے حق کو غالب کرنے کی معروف کوششوں میں سمٹا ہوا ہو، اور باقی دینی اعمال و اوصاف سے اُن کا تعلق بس ایک عام مسلمان کی طرح رسمی انداز ہی کا ہو۔ جماعت کے ذمہ داروں کی یہ کوشش بہت قابل تحسین ہو کہ ایسے افراد کی اصلاح ہو مگر اس کے لیے بہت صاف طور پر اُن کا دعوتی جذبہ اور تصور دعوت درست کرنے کی ضرورت ہو جسے یہ کتاب پورا نہیں کرتی۔ (اس کے علاوہ مقاصد میں کتاب خاص حد تک کامیاب ہے)

یہ کتاب اپنے مخاطب داعیوں میں اسلام کے مطلوب اوصاف اس طرح کی نمائش کے ذریعہ پیدا کرنا چاہتی ہو کہ

> "اسلام کی دعوت کا مطلب محض یہ نہیں ہو کہ انسانوں کے درمیان اس کے حق و صداقت کا اعلان کر دیا جائے، بلکہ اپنے مزاج کے لحاظ سے یہ ایک زبردست انقلابی کوشش ہو۔ اسلام چاہتا ہو کہ وہ انسانوں کے تمام خود ساختہ دینوں پر غالب آجائے اور سب اُس کے تابع د

محکوم بن کر رہیں۔ جو شخص خارج کی دنیا میں اسلام کا یہ مطلوبہ انقلاب برپا کرنا چاہتا ہو، پہلے اُسے اپنے اندر کی دنیا میں اسی نوعیت کا انقلاب برپا کرنا ہوگا، ورنہ باہر کی دنیا میں اس کی کوشش کامیاب نہ ہو گی۔" (صفحہ ۵)

یہ "دعوت اور اتباع" کے عنوان سے گفتگو کا ایک ٹکڑا ہے اور بالکل یہی انداز فہمائش دعوت اور تعلق باللہ، دعوت اور فکر آخرت، دعوت اور نماز وغیرہ کی گفتگو میں ملتا ہے۔ لیکن اگر اسلام کی دعوت کو "ایک زبردست انقلابی کوشش" "ایک بہت بڑا جہاد" اور "اقامت دین کا کام" وغیرہ سمجھ کر اسمیں لگنے سے تعلق باللہ، فکر آخرت اور ذوق نماز وغیرہ کی کیفیات پیدا ہوجایا کرتیں تو اسلام کی دعوت کے یہ معنیٰ تو مصنف کے مخاطب لوگ پہلے ہی سے سمجھے ہوئے تھے۔ جو بات دعوت اسلامی کے اس تصور سے پہلے نہ پیدا ہوسکی ہو وہ اسی تصور کی تجدید سے پیدا ہو جانے کی اُمید کیونکر صحیح ہو گی؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ باتیں دعوت سے پہلے پیدا ہونے کی ہیں۔ دعوت کے کام سے ان میں ترقی ہوسکتی ہے بلکہ لازماً ہونا چاہیے، لیکن جو شخص ان باتوں کے بغیر اسلام کا "داعی" اور خارج کی دنیا میں اُس کی اقامت کا "ساعی" بن گیا ہے، سمجھ لینا چاہیے کہ اُس کے اندر وہ چیز ہی نہیں ہے جس سے یہ باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ باتیں اسلام کے اس تصور سے پیدا ہوتی ہیں کہ وہ خدا کے سامنے خود کو جھکا دینے اور ہمہ دم اس کو اپنے پر نگراں اور ہر ضرورت میں مرجع و ماویٰ سمجھتے ہوئے ہر آن اسی کی طرف متوجہ اور اس کی رضا جوئی میں سرگرم رہنے کا نام ہے۔ اس تصور کے ساتھ آدمی اسلام کو اپنا دین بنانے کے لیے پسند کرے گا تو لازماً اس کے ایک ایک حکم کو اپنے اوپر نافذ کرے گا، ایسے اعمال (نماز وغیرہ) کی طرف ایک عجیب ذوق سے لپکے گا جنھیں دربار خداوندی میں حاضری کے ہم معنی اور غایت قرب کا مصداق بتایا گیا ہے۔ اور ہر اُس بات سے بچے گا خواہ وہ کیسی ہی من پسند ہو جس کے لیے بتا دیا گیا ہو کہ وہ آخرت میں خدا کی ناراضگی بن کر سامنے آئے گی۔ یہ شخص اسلام کی دعوت اور خارج کی دنیا میں اس کی اقامت کے لیے بھی خدا کے حکم کے بموجب ساعی ہوگا مگر صرف باطل طاقتوں کو مٹا دینے کے جذبے سے نہیں بلکہ اصلاً اس جذبے سے کہ خدا کی ہدایت کا نور عام ہو، اُس کے بندے اپنے مالک کی رضا جوئی کی طرف آئیں، اسکی رحمتوں اور نوازشوں سے حصہ پائیں اور عتاب میں گرفتار ہونے سے بچ جائیں۔ اس جذبہ سے دعوت کا کام بالکل فطری طور سے انسان کے تعلق باللہ کو بڑھانے والا ایک عمل بن جاتا ہے۔ فکر آخرت

دوچند ہو جاتی ہے۔ کامل سے کامل تر اتباع کا ذوق اُبھرتا ہے اور اس میدان میں کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ خدا کی مدد ہی کو سمجھتے ہوئے یہ آدمی نماز جیسے اعمال کی طرف کچھ اور بھی بے قراری کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے تاکہ خدا سے استعانت کے لیے عرض معروض کرسکے اور ایک نئی روح اور نئی طاقت اُسے اس کارِ عظیم کے لیے میسر آئے۔

یہ ہے اسلام کی دعوت کا وہ تصور جو داعی میں اسلام کے تمام مطلوبہ اوصاف دوچند کرتا ہے۔ اور یہ ہے اسلام کا وہ تصور جس سے اُس کی دعوت کے سلسلہ میں آدمی کا یہ ذہن بنتا ہے۔ اس کے بجائے اگر اصلاً ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے اسلام کو دیکھا جائے اور اُس کی دعوت کا مطلب بس اس نظام کو دنیا کے دوسرے نظاموں پر غالب کر دینے کی ایک زبردست انقلابی کوشش سمجھا جائے تو پھر وہ اساس ہی گویا منہدم ہو جس سے تعلق باللہ کا جذبہ اُبھرتا ہے، نماز جیسے اعمال کا ذوق پیدا ہوتا ہے، اور دعوت کے علاوہ دیگر احکام دین کے کامل اتباع کی بھی حقیقی فکر دل میں آتی ہے۔ یہ تصور بڑی بڑی قربانیاں آدمی سے کرا سکتا ہے۔ مگر جو کام انقلابی کوشش "اور اسکے ناگزیر مراحل کے زمرہ میں نہیں آتے اُنکی طرف التفات یہ کہاں سے لاسکتا ہے۔ بات کچھ باریک نہیں کاش سے سمجھا جائے!

استدراک

الفرقان بابت ماہ ذی الحجہ ۸۹ھ مطابق مارچ سنہ ء کے عنوان "نئی مطبوعات" کے تحت تبصروں میں حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب لاجپوری کے فتاویٰ جلد دوم میں منقولہ ایک حدیث میں، ایک لفظ (علیٰ حرب) کے ترجمہ سے اختلاف ظاہر کیا گیا تھا۔ مولانا نے اس پر ہمیں تحریر فرمایا ہے کہ سنن ابی داؤد میں جہاں یہ حدیث آئی ہے وہاں بین السطور میں اس لفظ کے وہی معنیٰ بتائے گئے ہیں جو ترجمہ میں انھوں نے اختیار فرمائے ہیں، نیز بذل المجہود شرح ابی داؤد میں بھی یہی تشریح ہے ـــــ تبصرہ نگار حضرت مولانا کا مشکور ہے کہ زمانہ طالب علمی سے ذہن میں پڑی ہوئی ایک غلط فہمی اُن کی توجہ کی بدولت دور ہو گئی۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

پیٹ کے بھاری پن اور سینہ کی جلن میں
جلد آرام کے لیے
پچنول لیجیے
پیٹ میں درد، بدہضمی، کھٹی ڈکاریں، اپھارا، جلن، متلی، بھوک کی کمی اور کھانے کے بعد طبیعت میں سستی وغیرہ، ان سب شکایتوں میں
پچنول
مفید ہے
ہمدرد
HTA-HDP-1246-U

Regd No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 38 NO. 4 JULY 1970

الفرقان

لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے
مزید محصول ڈاک کا اضافہ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندستان سے ...... -/۸
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۵۰ صفحات
قیمت
فی کاپی ...... ۵۰ پیسے

جلد ۳۸ | بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ مطابق اگست ۱۹۷۰ء | شمارہ ۵

اگر اس دائرہ میں ( ) سرخ نشان ہے تو

تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ اگست تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستانی خریدار : اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجکر ہمیں براہ راست اسکی اطلاع بھی دیں انھیں وی پی اب نہیں جاسکے گا لہذا ۳۰ اگست تک چندہ کی اطلاع نہ ملنے کی صورت میں ہم مجبور ہوں گے کہ رسالہ بھیجنا بند کر دیں۔

نمبر خریداری : براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت : الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر (ایڈیٹر و پروپرائٹر) نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محترم علماء اور رہنمایانِ دین کی خدمت میں

از ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

کسی بھی تھوڑے بہت پڑھے لکھے اور سمجھدار مسلمان سے پوچھیے کہ کیا موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر کوئی بات ہوسکتی ہے کہ یہاں کا نظام حکومت سیکولر رہے؟ یقین ہے کہ جواب نفی ہی میں ہوگا اور تسلیم کیا جائے گا کہ حالات کے موجودہ نقشے میں مسلمانانِ ہند کا مفاد حکومت کی اسی شکل میں ہے۔

یہ کوئی مجرد قیاس اور اندازے ہی کی بات نہیں ہے، تجربہ بھی یہی دکھا رہا ہے کہ کسی مکتب فکر کا بھی ہندوستانی مسلمان اس معاملہ میں کسی دوسری رائے کا اظہار نہیں کرتا، جس کسی کو بھی اظہار خیال کے مواقع حاصل ہیں یا حاصل ہو جاتے ہیں وہ موجودہ امکانات میں مسلمانوں کے لحاظ سے سب سے اچھی شکل اسی کو مانتا ہے کہ نظام حکومت سیکولر اور جمہوری رہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم میں سے بہت سوں کا بلکہ بیشتر کا ایک بڑا عجیب رویہ یہ ہے کہ سیکولر حکومت جس سیکولر ذہن (یعنی نظریہ سیکولرزم) سے پیدا ہوتی ہے اسے قابل نفرت و مذمت خیال کیا جاتا ہے، اس نظریہ کے داعیوں کو ہم خدا کے باغیوں کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کی دعوت کو اسلامی دعوت کا حریف قرار دیتے ہیں اور کسی طرح یہ بات گوارا نہیں ہے کہ کوئی مسلمان بحیثیت ایک نظریہ کے ہندوستان کی حد تک بھی ان کی دعوت سے ہم آہنگی کا اظہار کرے۔

اس میں کلام نہیں کہ سیکولر حکومت کا نظریہ اسلامی نظریۂ سیاست سے جوڑ نہیں کھاتا ، سیاست میں اسلامی نقطۂ نظر کی بات کی جائے گی تو لامحالہ اس نظریہ کو بھی غیر اسلامی نظریوں کی صف میں شمار کرنا ہوگا ۔ مگر ہماری سمجھ میں جو بات اب تک نہیں آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں یا ایسی ہی کسی اور جگہ محض سیکولرزم کی بنیاد پر ملے ہوئے حقوق اور اس سے پیدا ہونے والے فوائد کو تو ہم پسند کریں اور جہاں ضرورت ہو سیکولرزم ہی کے حوالے سے ہم ان کے لیے لڑیں بھی ۔ حتیٰ کہ اس سیکولرزم کے علمبرداروں سے اس بات کی خواہش بھی کریں کہ جو غیر مسلم گروہ یہاں حکومت کے سیکولرزم کو تباہ کرنا چاہے اس کے خلاف وہ شمشیر برہنہ بن جائیں ۔ لیکن خود مسلمانوں کو سیکولرزم کے تصور سے نفرت دلائی جائے اور وہ سب باتیں کی جائیں جن کا ذکر ابھی ہم نے اوپر کیا ہے ۔ یہ تضاد ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ۔

حکومت کا سیکولرزم اگر اسلامی نقطۂ نظر سے ہر جگہ اور ہر حال میں مذمت و نفرت کا مستحق ہے اور کسی موقع پر بھی گنجائش نہیں ہے کہ کھلے دل سے اس کی حمایت کی جا سکے ؟ تو پھر اس کا کوئی پھل ہمیں میٹھا نہیں معلوم ہونا چاہیے ! اس کا دیا ہوا کوئی فائدہ منظور نہیں کیا جانا چاہیے ! اس کے خوان کرم سے ملے ہوئے حقوق لے کر ممنونیت کا قلادہ کسی طرح اپنی گردن میں نہیں ڈالنا چاہیے ! مذکورہ شکل میں تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اسلام میں حرام ٹھہرائے گئے کسی طریقہ کا ذبیحہ ہم بلا اضطرار کے کھانے لگیں !

لیکن ہم نہ صرف اس غیر اسلامی " ذبیحہ " سے بغیر حالت اضطرار متمتع ہو رہے ہیں بلکہ اصرار ہے کہ اس ذبیحہ سے حصہ ملنا بند نہیں ہونا چاہیے ۔ ہر وقت شکوہ و شکایت اور احتجاج و فریاد ہے کہ از روئے سیکولرزم ہمیں فلاں چیز ملنا تھی ، مگر نہیں مل رہی ہے ۔ ملازمتیں اس تناسب سے ملنا تھیں مگر اہل اختیار نے حق ماری پہ کمر باندھ لی ہے ۔ بچوں کو تعلیم کی فلاں سہولتیں لازم تھیں جو تعصب کی نذر ہو رہی ہیں ۔ اردو زبان کو یہ درجہ اور یہ مقام دیا جانا تھا جس میں سراسر دھاندلی حائل ہو گئی ہے ۔ حکمراں پارٹی یا دوسری کوئی پارٹی جو اپنے تئیں سیکولرزم کا دعویٰ کرے الیکشن کے لیے امیدواروں کا انتخاب کرتی ہے تو ہم جانچتے ہیں کہ اس میں مسلم نمائندگی کا تناسب کیا ہے ۔ اور کمی کی شکل میں

شکایت کرتے ہیں کہ ہمیں ہمارا پورا حق کیوں نہیں ملا۔ الیکشن کے بعد حکومت بنانے والی پارٹی کے وزیروں کی فہرست پر ہماری نظر جاتی ہے کہ اس میں ہمارے کتنے ہیں اور کس کس مرتبے کے ہیں۔ اور ایک بار پھر شکایت کا دفتر کھلتا ہے کہ تعداد حق کے مطابق نہیں ہے اور فلاں کو فلاں غیر مسلم سے بہتر درجہ ملنا چاہیے تھا مگر اسے کمتر رکھا گیا! یہ سب شکایتیں اور مطالبے سیکولرزم ہی کی دُہائی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہی سیکولرزم جس کا قائل ہونا ہمارے نزدیک کم سے کم سیاسی لادینیت کے مساوی ہے۔ اور جس کے قیام و بقا کی جد و جہد میں کہیں بھی حصہ لینے کو لادینیت کی گاڑی کھینچنے سے کمتر ہم نہیں سمجھتے۔

اس عجیب وغریب رویہ کا تجزیہ اگر ہم کریں تو بات یوں نکلتی ہے کہ کسی ملک میں سیکولرزم کو اساس حکومت بنایا جائے، اس کی تائید تو ہم نہیں کر سکتے۔ اس اساس پر نظام حکومت قائم ہو جائے تو اس کی بقا اور اس کے استحکام کے لیے مثبت جد و جہد میں بھی ہم شریک نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر ہم اقلیت میں ہیں تو اس نظام کو قائم ضرور رہنا چاہیے۔ اور جن لوگوں نے اسے قائم کیا ہے وہ اگر اس کے بقا و استحکام کی کوششوں میں لاپروائی برتیں یا اس پر ٹھیک ٹھیک عمل درآمد میں کوتاہی کریں (جس کا مطلب ہے اقلیتوں کو دیے گئے حقوق پر آنچ آنا اور اکثریت کا اپنے حدود سے بڑھ جانا) تو اسے ہم معاف نہیں کریں گے۔ جو کچھ ہمارے بس میں ہوگا اس کے مطابق کوئی کسر ہم اس میں نہیں اٹھا رکھیں گے کہ ارباب حکومت اپنے نظریہ پر ٹھیک ٹھیک عمل کریں اور ہمارے لیے مانے ہوئے حقوق پورے پورے ہمیں ملتے رہیں۔

اس تجزیہ پر ذرا اور تجزیاتی عمل کیجیے، تو ہمارا ذہن یہ سامنے آئے گا کہ سیکولرزم پر عمل درآمد کا مطلب تو یہ ہے کہ اقلیت کو دیے گئے حقوق کا تحفظ کیا جائے لہذا اس کے لیے جد و جہد میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن خود سیکولرزم کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو سیاسی اور اجتماعی معاملات سے بے دخل کر دیا جائے۔ پس اس کی بنیاد پر کہیں کا نظام حکومت قائم ہونے یا قائم ہو چکا ہو تو اس کے مستحکم رہنے میں دلچسپی لینا کھلی ہوئی کفر نوازی ہے اور یہ کام ایک مسلمان کیسے کر سکتا ہے؟

قطع نظر اس سے کہ یہ منطق ہے کیسی؟ ذرا اس کے نتیجہ پر غور کیجیے تو وہ یہ نکلتا ہے کہ سیکولرزم

کے بقاء و استحکام کی بات تو ملک کے سیکولر لیڈر جانیں، ہمیں تو مطلب صرف اس بات سے ہے کہ ہمارے ان حقوق میں کوئی خلل نہیں پڑنا چاہیے جو از روئے سیکولرزم مانے جا چکے ہیں!

جیسی عجیب ہماری منطق تھی ویسا ہی مضحکہ خیز اس کا نتیجہ بھی ہے! کسی اور کو سیکولر حکومت کی ضرورت ہندوستان میں ہو یا نہ ہو، ہمیں اپنے لیے بہرحال اس کی ضرورت فی الوقت تسلیم ہے اور اس طرح تسلیم ہے کہ اس کا کوئی امکانی بدل بہ ظاہر حالات ہمیں نظر نہیں آتا لیکن کیا مزے کی بات ہے کہ اس طرز حکومت کی بقا کے لیے کوئی کوشش ہم ہرگز نہیں کریں گے؟

سیکولر حکومت ایک نظریاتی حکومت ہے۔ سیکولرزم کے ساتھ جب جمہوریت بھی اساس حکومت ہو یعنی عوام کا حق مانا گیا ہو کہ وہ جیسی چاہیں حکومت بنائیں اور جن لوگوں کو چاہیں زمام حکومت سپرد کریں تو سیکولر طرز کی حکومت قائم ہونا اور پھر قائم رہنا اس بات پر موقوف ہے کہ عوام میں یہ نظریۂ حکومت مقبول ہو اور وہ اس طرز حکومت کی حمایت کریں۔ یہاں پہلے ہی دن سے ایک گروہ تھا جو نہیں چاہتا تھا کہ مسلمانوں کو بھی ہندوؤں جیسے حقوق اس ملک میں دیے جائیں۔ اس کی طاقت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی ہے اور ہندوؤں کے ایک بڑے حصہ کو وہ اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں یہاں سیکولر حکومت کا کیا مستقبل ہے، اگر وہ لوگ بھی اس کی پشت پناہی پر نہ کھڑے ہوں جنھیں سب سے زیادہ یہاں اس قسم کی حکومت کی ضرورت کا احساس ہے؟ اور جن کے سامنے اس کا کوئی بدل دور دور تک نہیں ہے؟

راقم السطور کا خیال ہے کہ ہندوستان میں سیکولرزم کے کمزور اور "نام نہاد" رہنے کا ایک بڑا سبب ہم مسلمانوں کا یہی رویہ ہے۔ پندرہ سال تک کانگرس کو ووٹ دیتے رہنے کے اگر کوئی یہ معنی قرار دے کہ یہ سیکولرزم کی حمایت کا ووٹ تھا تو یہ کوئی حقیقت بیانی نہیں ہوگی۔ یہ اپنی اصلیت میں (تھوڑے سے لوگوں کو مستثنیٰ کر کے) اول اول کانگرس اور کانگریسی لیڈروں کی رضاجوئی کا اور بعد میں فقط لاچارگی کا ووٹ تھا۔ ورنہ سیکولرزم کی حمایت میں صرف اتنا ہی تو کافی نہیں تھا کہ کانگریس کو ووٹ دے دیا جائے۔ اس کی تنظیم سے دلچسپی بھی ضروری تھی۔ اس غرض سے بھی کہ اس کی طاقت بڑھے اور اس غرض سے بھی کہ وہ صحیح راستہ

؎ یہ نہ سمجھا جائے کہ کانگریس کی تنظیم میں شرکت اور سیکولرزم کی حمایت ہمارے نزدیک بھی لازم ملزوم ہیں۔ یہاں یہ بات اس مفروضہ کے منطقی نتیجہ کے طور پر کہی گئی ہے کہ کانگریس کو ووٹ سیکولرزم کی حمایت کے لیے تھا۔

پر رہے۔ کیا مسلمانوں کا دل کبھی اس پورے عرصے میں اس کام کے لیے کُھلا؟ انھوں نے کانگریس کی تنظیم سے کبھی ایسی دلچسپی لی جیسی اُسے سو فی صدی یا نوے فی صدی .... ووٹ دینے والوں کو لینی چاہیے تھی؟ اس عجیب غریب رویہ کی تہ میں، کہ ووٹ تو سو فی صدی مگر شرکت دو فی صدی بھی نہیں، سوائے اس کے کیا چیز تھی کہ سیکولرزم کے کاروبار میں شرکت حلق سے نہیں اترتی![عہ] یہ تو جی چاہتا ہے کہ اکثریت کے کچھ لوگ سیکولرزم کا جھنڈا بلند کیے ان لوگوں کو دبائے رہیں جو خالص ہندو حکومت کے خواہاں ہیں۔ اور اس مقصد کے لیے ووٹ بھی حاضر اور ضرورت ہو تو نوٹ بھی حاضر! مگر ان لوگوں کے ساتھ ہم بھی سیکولرزم کا جھنڈا اٹھائیں اور داعی بن جائیں کہ سیکولرزم ہی ہندوستان جیسے ملک کے لیے صحیح طرز حکومت ہے، یہ اپنے اس عقیدے سے انحراف ہے کہ دنیا میں سب سے اچھا اور مبارک نظام حکومت اسلام کا نظام حکومت ہے۔

اس ساری گفتگو کا مقصد نقطۂ دو نکتوں پر سنجیدگی سے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی دعوت دینا ہے۔

۱۔ یہ کہ جب مسلمان ہی جنھیں سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ ملک کا نظام حکومت سیکولر رہے کھلے دل سے سیکولرزم کے حامی اور اس کے لیے جد و جہد کرنے والے نہ ہوں گے، تو کس سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس پر اپنی جان دے گا؟ اور کیسے ممکن ہے کہ مسلمانوں کی شرکت کے بغیر نہ صرف سیکولرزم کا جھنڈا یہاں بلند رہے بلکہ وہ سیکولرزم اُن کے ڈھب کا بھی ہو؟

۲۔ سیکولرزم کے لیے جد و جہد اور اس کے علمبردار غیر مسلموں کے ساتھ شرکت (بشرطیکہ ہندوستان میں سیکولرزم کے لیے غیر مسلموں کی علمبرداری لابدی بھی سمجھی جائے جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں) اگر کسی حال بھی اسلام میں جائز نہیں تو سیکولرزم کے نام پر الیکشن لڑنے والوں کو ووٹ دینا کیسے جائز ہے؟ اور علیٰ ہذا یہ کیسے جائز ہے کہ سیکولرزم کے نام پر حقوق مانگے جائیں یا اگر ملے ہوئے ہیں تو ان میں عملی کوتاہی پر سیکولرزم ہی کی دہائی دی جائے، سیکولرزم

عہ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو جائے گا کہ اس تحریر میں مسلمانوں کے "جس رویہ سے بحث کی گئی ہے وہ اصلاً دینی نقطۂ نظر سے سوچنے والے **بلکہ دینی** رہنمائی کرنے والے مسلم خواص کی اکثریت کا رویہ ہے **تبعاً اور** عملاً عام **مسلمانوں کا** اس میں **شرکت کی** وجہ سے اسے **مسلمانوں** کا رویہ کہنے میں مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔

ہی کی سند سے اُن کے لیے لڑا جائے ؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، اس کا جواب بدیہی طور سے سوائے نفی کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ سیکولرزم کی جدوجہد میں مسلمانوں کی شرکت کے بعد بھی نتائج ان کی مرضی کے نہ نکلیں مگر یہ امکان کوئی دیوانہ ہی سوچ سکتا ہے کہ وہ تو معاملہ سے بے تعلق رہیں اور دوسرے لوگ ان کی مرضی کا سیکولرزم یہاں قائم کر ڈالیں۔ دوسرے سوال کے بارے میں ہماری رائے (اگر وہ کسی شمار قطار میں ہو) اوپر کی گفتگو کے انداز ہی سے ظاہر ہے اور اس میں بھی ہمیں کسی طویل کلام کی بڑی ضرورت نظر نہیں آتی۔ مگر اس معاملہ میں ایسی بداہت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا جیسی سوال نمبر ا کے معاملہ میں ہم سمجھ رہے ہیں۔ اس لیے قدرے وضاحت (خصوصاً استدلالی پہلو سے) کر دینی ہے تاکہ دوسرے حضرات اسی پر علیٰ وجہ البصیرت غور فرما سکیں۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں سیکولر حکومت قائم کرنے یا اسے برقرار رکھنے کی جدوجہد علی الاطلاق حرام ہے تو یہ بات بھی حرام ہوگی کہ سیکولرزم کی بنیاد پر کوئی حق اس نظام حکومت میں مانگا جائے یا جو حقوق صرف سیکولرزم کی بنیاد ہی پر ملے ہوئے ہیں بغیر حالت اضطرار کے اور رفع اضطرار کی حد سے بڑھ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے یا ان تسلیم شدہ حقوق کا فائدہ ہمیں نہیں پہنچنے دیا جا رہا ہے تو سیکولرزم ہی کے حوالے سے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا جائے۔ یہ سب باتیں بھی اس لیے حرام ہونی چاہئیں کہ ان سب ہی میں سیکولر حکومت پر رضامندی کا اظہار ہے اور بہ زبان حال یہ تسلیم کرنے کا انداز ان میں پایا جاتا ہے کہ سیکولرزم کے اصول پر بھی دستورسازی اور قانون سازی جائز ہے ــ علیٰ ہذا یہ بات بھی مفروضہ صورت میں حرام ہونی چاہیے کہ اپنے مفادات کے معاملہ میں ہم ایسی حکومت پر زور ڈالیں کہ وہ سچائی اور مضبوطی کے ساتھ سیکولرزم پر قائم رہے۔ کیوں کہ سیکولرزم کی تائید اور تاکید میں ایسا کوئی فرق نہیں نکلتا جو ان دونوں کا حکم الگ الگ کر دے۔ مسلمانوں کے جائز مفادات کی خاطر اگر یہ بات جائز نہیں ہے کہ ملک میں سیکولر حکومت قائم ہونے یا اس کے برقرار رہنے کی قولی یا عملی تائید ہم کریں تو یہ بات بھی ہرگز کسی مفاد سے جائز نہیں ہوتی کہ جو لوگ ایسی حکومت قائم کیے ہوئے ہیں ان سے مضبوطی کے ساتھ اس اصول حکومت پر جمے رہنے کی فرمائش ہم کریں۔

یہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ان باتوں میں ہمارا مقصد سیکولرزم سے رضامندی یا اس کی بقا سے

دل جیسی بالکل نہیں ہے، ہمیں تو بس ان حقوق سے سروکار ہے جو حکومتِ وقت نے مان رکھے ہیں یا اپنی مبینہ پالیسی کی رو سے اسے ماننے چاہئیں۔ اس پالیسی کی اساس وہ سیکولرزم کو بتاتی ہے، اس لیے ہم سیکولرزم کا نام ان حقوق کے سلسلے میں لیتے ہیں، گویا اسی کے قول سے اس پر حجت قائم کرتے ہیں۔ نہ یہ کہ سیکولرزم سے رضامندی کا اظہار ہم کرتے ہوں اور چاہتے ہوں کہ وہ باقی رہے! —— یہ منطق ہم نے کچھ لوگوں کو استعمال کرتے دیکھا ہے مگر ہماری نظر میں یہ صداقت سے اتنی دور ہے کہ ایک ذراسی جرح کے آگے بھی نہیں ٹھہر پاتی۔ پوچھیے کہ اگر کل سے یہاں سیکولر جمہوریت کے خاتمہ کا امکان ہمارے سامنے آئے تو کیا اس پر رضامندی کا اظہار کرنے کے لیے ہم تیار ہیں؟ کوئی ذرا سا بھی ذی شعور جس کی سلامتی ہوش حواس بھی مشکوک نہ ہو، اگر اس پر ہاں کہنے والا نکل آئے تو تنہا ہمارے لیے ہی نہیں شاید دنیا بھر کے ذی شعور مسلمانوں کے لیے ایک دریافت ہوگی۔ ہمیں تو ذرا سا بھی تامل یہ کہنے میں نہیں ہے کہ اس طرح کا کوئی امکان اگر سچ مچ محسوس ہونے لگے تو ایسے ایسے لوگ اس سیکولر جمہوریت کی عمر بڑھانے میں کوشاں نظر آسکتے ہیں جن کے بارے میں تصور بھی آج مشکل ہے۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ جب تک یہاں سیکولرزم کے لیے واقعی معنیٰ میں خطرہ بننے والی کوئی طاقت نہیں تھی تو ان دنوں کچھ لوگ یہاں تک سیکولرزم سے بیزاری کی باتیں کرتے تھے کہ ایک ہندو حکومت جو واقعی مذہبی بنیاد پر قائم ہو ہمارے لیے سیکولر حکومت سے زیادہ قابلِ قبول ہے۔ مگر جونہی سیاست کے میدان میں کچھ ایسے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے کہ سیکولرزم کا مستقبل خطرہ میں ہے اور ہندو حکومت کا خواب دیکھنے والے لوگ اچھی خاصی طاقت کی پوزیشن میں آرہے ہیں تو یہ مکالمے دیکھتے ہوتے ہوئے اب ایسے غائب ہوئے ہیں کہ کہیں سننے میں نہیں آتے۔ اب ان کی جگہ سیکولر جمہوری طاقتوں کی حمایت کی باتیں ہیں۔ اور جب کوئی کامیابی ان طاقتوں کو مخالفوں کے مقابلے میں حاصل ہوتی ہے تو اطمینان کا سانس لیا جاتا ہے کہ ابھی بات ان کے قابو میں ہے۔ اسی طرح یہ سخن طرازیاں بھی بس اسی دم تک ہیں جب تک سیکولرزم کی شکست کا مسئلہ سامنے نہیں آتا۔ یہ مسئلہ سامنے رکھ کر پوچھیے کہ آج اس شکست پر رضامندی کا اظہار کرنے کو آپ تیار ہیں تو معلوم ہو جائے گا کہ کتنی سچائی اس بات میں تھی کہ ہم سیکولرزم پر راضی تو ہرگز نہیں ہیں، اپنے حقوق کے سلسلے میں اس کا حوالہ بس سیکولرسٹوں کے قول ہی سے ان پر حجت قائم کرنے کے لیے دیتے ہیں۔

ہماری گزارش یہ ہے کہ حقائق سے آنکھیں ملا کر بات کیجیے۔ ریت میں سر چھپا لینے کو آندھی سے بچاؤ سمجھنا شتر مرغ کو زیب دیتا ہے تو دیتا ہو، عاقل انسان کو زیب نہیں دیتا۔ علیٰ ہذا گڑ سے شوق رکھتے ہوئے گلگلوں سے پرہیز فرمانا اگر کوئی سمجھداری کی علامت نہیں ہے تو گلگلے پسند کرتے ہوئے گڑ سے ترفع دکھانا بھی کوئی معقول بات نہیں ہے۔ یا تو سیکولرزم کو مع اس کے "منافع" کو رد کیجیے اور کہیے کہ اس کے منافع کو قبول کرنے کا بھی وہی حکم ہے جو خود اس پر صاد کر دینے کا۔ جیسے کہ کسی حرام طریقہ پر کیے ہوئے ذبیحہ کا بھی وہی حکم ہے جو اس فعل ذبح کا کہ بدون اضطرار اور زائد از حد اضطرار اس کے گوشت سے استفادہ کی اجازت نہیں۔ چنانچہ اضطرار والی ضرورت سے آگے نکل کر سیکولرزم کے از خود عطا کیے ہوئے حقوق کو بھی ہاتھ مت لگائیے، چہ جائیکہ اس کے نام پر اپنی طرف سے کچھ مانگا جائے اور لڑائی کی جائے کہ از روئے سیکولرزم یہ ہمارا حق ہے یا اپنے مفاد کے لیے چاہا جائے کہ فی الحال یہاں سیکولرزم برقرار رہے! یہ پوزیشن اگر منظور نہیں ہے تو پھر مسئلہ کے اس پہلو کو واضح کیجیے کہ آیا وہ دین ہے جو یہاں اصل اور اسکے ثمرہ کے درمیان تفریق کر رہا ہے یا ہمارے اپنے ذوق اور طبیعت کی بات ہے؟ دین ہے تو وہ دینی سند سامنے آنی چاہیے جو اس دعوے کو ثابت کر سکے۔ ورنہ زمینی نظائر سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ تفریق محض ذوق و طبیعت کا شاخسانہ ہے یعنی یا تو سیکولرزم علی کل حال کی تحریم غلو فی الدین کا نتیجہ ہے۔ یا اس کے مفید ثمرات کی تحلیل اور ان ثمرات کے لیے اس کی بقا کی خواہش میں غیر شرعی توسع سے کام لیا جا رہا ہے۔ اور ان میں سے پہلی صورت میں بلاوجہ دنیا کا اور دوسری میں کھلا ہوا آخرت کا خسارہ ہے۔

اُخروی خسارہ کے لیے کسی تشریح کی حاجت نہیں ورنہ اس کی تفصیل بیان کی جا سکتی ہے دنیوی خسارہ کی بات اوپر آ چکی ہے یہاں ایک منضبط انداز میں اس کو ہم پھر سامنے رکھتے ہیں۔

۱۔ ہم میں کوئی شخص اس میں اختلاف کرنے والا آج نہیں ہے کہ بحالات موجودہ جو ممکن صورتیں ہندوستان میں حکومت کی ہو سکتی ہیں ان میں مسلمانوں کے لحاظ سے سب سے بہتر یا غنیمت سیکولر جمہوریت ہی کا نظام ہے۔

۲) مختلف اسباب سے (خصوصاً قیام پاکستان کے سبب سے) مسلمانوں ہی کو سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ یہاں کا نظام حکومت سیکولر جمہوریت ہو۔

۳. قاعدہ کی بات ہے کہ جس کی ضرورت ہو وہی اس کے لیے سچی لگن سے کام کر سکتا ہے اور اسی کی محنت و کوشش سے یہ ممکن ہے کہ ضرورت کما حقہٗ پوری ہو۔

۴. سیکولر جمہوریت کا قیام تو یہاں غیر رسمی طور پر حصول آزادی کے ساتھ ہی ہو گیا تھا، دو ایک سال کے بعد رسمیات بھی مکمل ہو گئیں۔ مگر عملی طور پر جو یہ صحیح معنیٰ میں آج بھی قائم نہیں ہے اور دن بدن اس میں کھوکھلا پن بڑھ رہا ہے تو منجملہ دوسرے اسباب کے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے لیے کسی براہ راست اور مثبت جدوجہد سے مسلمانوں کی تقریباً بے تعلقی کو اس میں بڑا دخل ہے۔ آج بھی جب کہ وقت بہت گزر چکا اور معاملات کافی بگڑ چکے ہیں اگر کوئی شکل اس بات کی ہے کہ یہاں کے سیکولرزم کا حال ٹھیک ہو (بلکہ فی الحال تو جو اس کے لینے کے دینے پڑ رہے، انھیں سے نجات ملے) تو سب سے زیادہ امید آفریں شکل یہی ہے کہ مسلمان اس تن نیم جان میں جان تازہ ڈالنے کے لیے کھڑے ہو جائیں ۔ اس کے بغیر گویا یہ نوشتۂ دیوار ہے کہ سیکولرزم اور جمہوریت کا یہ برا بھلا مرکب بھی باقی نہیں رہے گا۔ جسے ہم دوسرے امکانات کے مقابلہ میں بہرحال غنیمت جانتے ہیں۔ اور نہ بھی جانتے ہوں تو حقیقت یہی ہے۔

پس سیکولرزم کی کھلے دل سے تائید اور اس کے لیے صحیح معنیٰ میں جدوجہد سے اجتناب ایک ایسا رویہ ہے جو بہت کافی نقصان ہمیں اب تک پہنچا چکا ہے اور یہی رویہ اگر برقرار رہا تو یہ نقصان اپنی انتہا کو پہنچ کر رہے گا۔ لہٰذا اگر یہ معلوم ہو کہ دین ہم سے اس رویہ کا تقاضا ہندوستان جیسے ملک میں نہیں کرتا تو اب یہ رویہ ترک ہونا چاہیے اور مزید نقصان سے بچنے کے لیے وہ رویہ اختیار کیا جانا چاہیے جس سے یہاں کی سیکولر جمہوریت صحیح معنیٰ میں سیکولر جمہوریت بنے اور اسکے استحکام میں ترقی ہو۔

لیکن اگر اس کے برعکس یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیکولرزم کی تائید اور اس کے بقاء و استحکام کی جدوجہد میں شرکت کسی بھی حال میں جائز نہیں تو پھر اس بات پر غور ہونا چاہیے کہ اس محرم شرعی سے فائدہ اٹھانا اور ان فائدوں کے لیے یہ چاہنا کہ سیکولرزم یہاں فی الحال باقی ہی رہے بلکہ دوسروں کے مقابلہ میں سیکولر جمہوریت کے علمبرداروں کی کسی نہ کسی ڈھنگ سے تائید بھی کرنا کیونکر جائز ہوگا؟ اس معاملہ میں کوئی شرعی سند ہاتھ آجائے تو خیر۔ ورنہ صاف بات یہ ہے اس رویہ کو اضطرار کی بہت واضح حدود میں محدود کر کے باقی سے تائب ہو جانا چاہیے۔ ہاں ایک شکل ہماری سمجھ میں آتی ہے جس میں استفادے کو اضطرار سے مقید کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ دوسرے اصول شریعت سے حد بندی کا محل ہوگا اور اس میں کافی گنجائش مل جائے گی۔ وہ شکل یہ ہے کہ ہم سیکولرزم

کے کھلے حریف بن کر کھڑے ہوں۔ سیکولرزم کا یہاں ہر داعی ہمیں اپنا مخالف جانے اور علانیہ "اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کی ابراہیمی سنت پر عمل کر کے گھروں سے لے کے ایوان حکومت تک کلمۂ حق کی سربلندی کا جھنڈا اٹھالیں۔ یہ شکل معاملہ کی پوری نوعیت کو بدل دے گی۔ اب یہاں ملے ہوئے کسی حق سے استفادہ یا اس پر اصرار سیکولرزم سے رضامندی کا مفہوم لازماً نہیں دے گا کہ فی نفسہ جائز استفادہ یا اصرار بھی اس عارض سے حرام ہو جائے بلکہ انھیں حقوق سے استفادہ یا ان کا مطالبہ حرام ہوگا جن سے استفادہ کچھ ایسے قاعدوں اور ضابطوں کا پابند ہو کہ ان کی بجاآوری میں سیکولر حکومت کی مخالفت کا کردار قائم نہ رہ سکے۔ مثلاً پارلیمنٹ یا اسمبلی کی ممبری اور اس کے لیے الیکشن کی امیدواری جس میں قانون کی رو سے دستور ہند سے وفاداری کا حلف لینا شرط ہے۔

تو یہ ہے وہ واحد شکل جس میں ہم ملک کے سیکولر نظام حکومت کو شرعاً ایک ناقابل شرکت اور ناقابل تائید نظام سمجھتے ہوئے بھی اس کے دیے ہوئے حقوق اور اس کے پیدا کیے ہوئے مواقع سے استفادہ اور ان پر اصرار کی کافی گنجائش از روئے شریعت پا سکتے ہیں۔ لیکن کھلی اور کلی مخالفت اور اس کے خطرات کو قبول کرنے کی مردانہ ہمت دکھائے بغیر یہ استفادہ یا اصرار حد اضطرار سے آگے کوئی جواز نہیں رکھتا۔[عہ]

اس تحریر کا مقصد کوئی فیصلہ دینا اور کسی پہلو کی تصویب یا تغلیط کرنا نہیں ہے جیسا کہ تحریر کی مجموعی نوعیت سے بھی ظاہر ہے۔ اور صاحب تحریر کی یہ حیثیت بھی نہیں۔ مقصد ملت کے علما اور ماہرین کتاب و سنت کو متوجہ کرنا ہے کہ اس مسئلہ کو صاف کریں۔ راقم کی نظر میں (اگرچہ صاحب نظری کا دعویٰ کرنے کے لائق وہ نہیں) موجودہ رویہ جس کا اصل تعلق (نیشلسٹ کہلانے والے علماء کو چھوڑ کر) بیشتر علماء و رہنمایان دین ہی سے نیز تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک خاص جماعت سے ہے جو کتاب و سنت کو رہنما بنانے کی داعی ہے —— کسی طرح بھی قابل اطمینان نہیں۔

اگر معاملہ صرف کسی طبقہ یا کسی خاص جماعت اور گروہ کا ہوتا تو اسے موضوع بحث بنانے کی ضرورت

(باقی صلا پر)

عہ واضح رہے کہ اضطرار شرعی مراد ہے۔ وہ "اضطرار" نہیں جو ہمارے زمانے کے بعض لوگوں نے ایجاد کر دیا ہے اور جس کی وسعتوں میں ہر احساس ضرورت سما جاتا ہے چاہے شریعت کی نگاہ میں وہ کیسا ہی نا معتبر بلکہ مردود بھی ہو۔

حضرت حاجی عبدالغفور صاحب جودھپوری کا وصال

محمد منظور نعمانی

اب سے ٹھیک دس سال پہلے الفرقان کی جون اور جولائی ۱۹۶۰ء کی دو اشاعتوں میں اس ناچیز نے ایک مضمون بعنوان ــــ اللہ کا ایک بندہ ــ حضرت حاجی عبدالغفور صاحب جودھپوریؒ کے متعلق لکھا تھا، خوب یاد ہے کہ اُس وقت اُس کا خاص محرک یہ ہوا تھا کہ قریباً ۲۵ سالہ ربط و تعلق کی وجہ سے میں حضرت ممدوح کی نہایت سبق آموز اور عبرت انگیز زندگی اور غیر معمولی بلکہ محیر العقول حالات سے خاصا واقف اور بہت زیادہ متاثر تھا اور اُن کے وجود کو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی اور اسلام کا معجزہ سمجھتا تھا۔ اسی کے ساتھ میں محسوس کرتا تھا کہ اُن کو بہت سے وہ لوگ نہیں جانتے جو اگر جان لیں تو بہت فائدہ اٹھائیں اور بہت کچھ حاصل کر لیں۔

حضرت حاجی صاحب کی عمر اُس وقت اسّی سے متجاوز ہو چکی تھی، خلقی اور جسمانی حیثیت سے بہت لاغر و نحیف اور بظاہر بہت ضعیف سے تھے اس لیے قیاس اور اندازہ یہ تھا کہ دنیا سے ان کی رخصتی کا وقت اب زیادہ دور نہ ہوگا، اسی بنا پر دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان بڑے میاں کے چلے جانے کے بعد ان کے حالات لکھے گئے تو بہت سوں کو بڑی حسرت ہوگی کہ ہمارے زمانہ میں اللہ کا ایک ایسا بندہ موجود تھا اور ہمیں خبر نہ تھی اگر پتہ ہوتا تو ان کی برکات سے متمتع ہوتے ــــ الغرض اس خیال اور نیت سے اُس وقت میں نے وہ حالات الفرقان میں لکھے تھے۔

بہت سے لوگوں کو اُس مضمون ہی سے حضرت کا پتہ لگا، بعض اصحاب توفیق نے اُسے پڑھ کے حضرت کی خدمت میں حاضری اور زیارت و استفادہ کے لیے جودھپور کا سفر کیا، بعضوں نے خط و کتابت سے رابطہ قائم کیا ــــ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اُس کے بعد بھی پورے دس سال تک حضرت ممدوح کو اس دنیا میں رکھا ــــ اِدھر کافی عرصہ سے خطوط سے اطلاع مل رہی تھی کہ ضعف بہت بڑھا ہوا ہے۔ یہ ناچیز

حاضری کا ارادہ بھی کر رہا تھا کہ ۲۷ جولائی کی شام کو حضرت کے صاحبزدگان کی طرف سے لکھا ہوا خط ملا کہ ۲۳ اور ۲۴ جولائی کی درمیانی رات میں تین بجکر پچیس منٹ پر حضرت کا وصال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ وَعَافِہٖ وَاعْفُ عَنْہُ وَاَکْرِمْ نزلہ واجعل الجنۃ مثواہ

اس گنہگار بندہ پر اسکے رب کریم کے بے حد و حساب احسانات میں سے ایک عظیم احسان یہ بھی ہو کہ اِس تھوڑی سی زندگی میں اُس نے بہت سے مقبول بندوں تک پہنچایا، اپنے دل کو ان کی محبت و عظمت اور بغیر کسی استحقاق کے ان کی نظر عنایت و شفقت نصیب ہوئی ــ لیکن حضرت حاجی عبد الغفور صاحب کو صرف ایک باخدا بزرگ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اُس کی صفت ہدایت و رحمت کا ایک معجزہ جانا۔

وہ ایک نہایت غریب تیلی گھرانے میں پیدا ہوئے، جہاں نہ دنیا تھی نہ دین، انتہائی غربت کی وجہ سے بالکل بچپنے ہی سے محنت مزدوری شروع کی، بیلوں، بھینسوں کا گوبر تک بینا، گیارہ سال کی عمر میں یتیم بھی ہوگئے ــــ پھر اس محنت مزدوری ہی کے زمانہ میں اور اسی کو وسیلہ بناکر رحمت خداوندی نے دل میں ایسا دینی رجحان پیدا کیا کہ پیسے بچا بچا کر اچھی دینی اصلاحی کتابیں منگواتے اور چونکہ خود پڑھے لکھے نہیں تھے اس لیے دوسروں کی خوشامد کر کے اُن سے پڑھوا کے سُنتے، پھر اپنے ہی طور پر محنت کر کے اتنی حرف شناسی بھی حاصل کرلی کہ وہ کتابیں خود پڑھنے لگے ــ اسی دور میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینی و دنیوی برکات و ترقیات کی موسلادھار بارشوں کا سلسلہ شروع ہوا ــ دُنیا میں تو ۴۔ ۵ پیسے پانے والے ایک غریب مزدور سے ترقی کر کے بڑے اور بہت بڑے ٹھیکیدار ہوگئے، اس راستہ سے اللہ تعالیٰ نے لاکھوں عطا فرمائے اور لاکھوں ہی اپنے ہاتھوں سے اُن راہوں میں خرچ کیے جن میں خرچ کرنا کارِ ثواب، اپنی آخرت کے لیے بہتر اور اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا کا وسیلہ سمجھا ــ اور اسی کے ساتھ دینی و روحانی ترقی اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ہوتی رہی یہاں تک کہ حضرت حکیم الامتؒ کی طرف سے مجاز ہوئے اب سے کوئی ۲۵۔ ۳۰ سال پہلے قلب میں شدت سے یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو سرمایہ جائداد وغیرہ دی ہو وہ سب آئندہ وارث ہونے والے اصحاب حقوق کو دے کے یا راہ خدا میں صرف کر کے بالکل اُس طرح خالی ہاتھ ہو جاؤں جس طرح ماں کے پیٹ سے پیدا کیا گیا تھا کہ کچھ بھی ملکیت میں نہ تھا، اور آئندہ زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کے مطابق مسکین والی گزاروں اور اسی حال میں اس دنیا سے اپنے رب کے پاس جاؤں

(اللھم احینی مسکیناً و امتنی مسکیناً و احشرنی فی زمرۃ المساکین) چنانچہ ایسا ہی کیا اور سب کچھ اپنی ملکیت سے نکال کے بالکل فقیر بے نوا ہو گئے اور اپنی بنائی ہوئی مسجد کے ایک چھوٹے سے حجرہ میں رہائش اختیار فرمائی۔۔۔۔ دین کی روح اور ایمان کا نقطۂ کمال اخلاص و احسان ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا صحیح علم دراصل علیم بذات الصدور ہی کو ہوتا ہے لیکن جس حد تک کوئی بشر کسی بندہ کے بارے میں اپنے ادراک و احساس اور اندازہ کی بنا پر کچھ کہہ سکتا ہے یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے قریب رہ کے گویا آنکھوں سے نظر آتا تھا کہ اُن کا اُٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، لینا دینا حتیٰ کہ ہنسنا بولنا اور خاموش رہنا بھی اللہ کے لیے اور صرف اللہ کے لیے ہے۔

ابھی اوپر عرض کیا ہے کہ لکھے پڑھے بالکل نہیں تھے، جب اللہ نے دینی ذوق نصیب فرمایا تو اتنی حرف شناسی سیکھ لی تھی کہ اردو کی دینی کتابیں کسی طرح پڑھ لیتے تھے۔ گفتگو میں بعض الفاظ بھی صحیح ادا نہیں ہوتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلب کو حکمت اور تفقہ کی وہ دولت عطا ہوئی تھی کہ ہم جیسے کتاب خواں بھی حضرت کی باتوں سے علم حاصل کرتے تھے، کم از کم اس عاجز نے عارف رومی کے اس شعر کا کوئی مصداق اور نمونہ اُن جیسا دوسرا نہیں دیکھا۔

بینی اندر خود علوم انبیا
بے کتاب و بے معید و اوستا

یہ سب چیزیں تفصیل سے اُس مضمون میں لکھی جا چکی ہیں جو الفرقان میں اب سے دس سال پہلے لکھا گیا تھا۔۔۔ (اگر اللہ نے توفیق دی تو حضرت حاجی صاحبؒ کی زندگی سے متعلق مزید معلومات کا اضافہ کر کے ایک مختصر سوانح حیات کی حیثیت سے اُس کو کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا جائے گا)

حضرت مرحوم ایک وسیع علاقہ کے لیے بجائے خود ایک دینی مرکز اور منارۂ ہدایت تھے، اب وہ اس دنیا سے اٹھا لیے گئے، اللہ تعالیٰ حضرت کے صاحبزادوں کو اور اس علاقہ کے اُن سب حضرات کو جنھوں نے حضرت کی صحبت و تربیت سے تعلق باللہ اور فکر آخرت کی دولت پائی، توفیق دے کہ وہ حضرت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خدمت دین اور خیر کے اُن سب کاموں اور سلسلوں کے باقی اور جاری رہنے کا ذریعہ بنیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حضرت مرحوم کو وسیلہ بنایا تھا۔۔۔ یہی ان پر حضرت کا خاص حق ہے اور یہی اُن کے لیے دینی و ایمانی ترقی اور کامیابی کی خاص راہ ہے۔

اپنے پاکستانی خریداروں سے چند ضروری باتیں

۱۔ ایک سال سے اوپر ہو گیا ہندوستان و پاکستان کے درمیان اخبارات کی آمد و رفت حکومت پاکستان نے قطعی طور پر بند کر رکھی ہے۔ پاکستانی رسائل کی آمد بھی کلیتہً بند ہے۔ البتہ ہندوستانی رسائل کے بارے میں بات صاف نہیں ہے کہ احکام کیا ہیں۔ الفرقان کا تجربہ یہ ہے کہ شروع میں کئی مہینے تک کراچی میں غالباً کوئی پرچہ نہیں پہونچا، دوسرے مقامات پر عام طور سے پہنچتے تھے۔ پھر کراچی میں بھی دوسرے مقامات کی طرح پہنچنے لگا۔ اور اب کسی بھی جگہ سے اس نوعیت کی شکایات ہمارے پاس نہیں ہیں جن سے یہ معلوم ہو کہ وہاں رسالہ پہنچنا یک قلم موقوف ہے ـــــ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی محکمۂ ڈاک کے سسٹم کے کارکنوں کے ذہن اس معاملہ میں صاف یقیناً نہیں ہیں کہ ہندوستانی رسائل کے بارے میں ان کی حکومت کی پالیسی کیا ہے۔ چنانچہ پرچہ نہ پہنچنے کی انفرادی شکایتیں پہلے سے بہرحال بڑھی ہوئی ہیں۔ خاص طور پر اس سال مارچ کا الفرقان تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑے پیمانے پر اس ناصاف ذہن کی نذر ہو گیا اور پاکستانی خریداروں کی ایک بڑی تعداد کو نہیں پہنچ سکا۔

۲۔ چونکہ عام طور پر پرچہ پہنچ جاتا ہے اس لیے ہم برابر بھیجے جا رہے ہیں۔ جو شکایتیں ملتی ہیں اُن کی تلافی میں رسالہ مکرر بھیجدیا جاتا ہے۔ شکایتوں کی کثرت سے ممکن ہے کسی شکایت کی تلافی رہ بھی جاتی ہو مگر دانستہ ایسا نہیں ہوتا اس لیے اس سال سوا سال کے پرچوں سے متعلق جن صاحب کی شکایت باقی ہو وہ ایک بار پھر اطلاع دینے کی زحمت فرمائیں؛ انشاء اللہ تلافی کی جائے گی۔ اس عرصہ کے شمارے بالعموم دفتر میں تھوڑی بہت تعداد میں موجود ہیں اسلیے کہ شکایتوں کی رفتار دیکھ کر شروع ہی سے کچھ فاضل چھپوانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایسے حضرات سے یہ بھی گزارش ہے کہ مطلوبہ پرچہ مل جائے تو اس کی اطلاع بھی دینے کی زحمت اُٹھائیں تاکہ یہاں اطمینان ہو سکے۔

۳۔ جن خریداروں کی مدت خریداری ختم ہو جاتی تھی اور اُن کی طرف سے مقررہ وقت کے اندر چندہ جمع کر دینے کی اطلاع ہمیں نہیں ملتی تھی، اُن کے اگلے مہینے کے پرچے ادارۂ اصلاح و تبلیغ کی معرفت بھیجے جاتے تھے۔ چھ سات مہینے ہوئے کہ یہ پرچے ادارہ کو پہنچنا بند ہو گئے۔ مجبوراً یہ نظام ختم کر دینا پڑا ہے۔ اور اب یہ ہمارے خریداروں ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ وقت پر اپنا چندہ لاہور بھیجدینے کا اہتمام فرمائیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اُن کے نام رسالہ جاری نہیں رہ سکے گا اور اس سے الفرقان کو بہرحال اشاعت گھٹنے کا نقصان پہنچے گا ـــــ ہم اپنے خریداروں سے جو بالعموم دینی جذبہ سے الفرقان کے خریدار ہیں، اُمید کرتے ہیں کہ وہ یہ نقصان الفرقان کو نہ پہنچنے دیں گے۔

والسلام

ناظم ادارۂ الفرقان لکھنؤ

مَعَارِفُ الحَدِیث

(مُسَلسَل)

اِسلامی بَرادری کے بَاہمی تعلق اور برتاؤ کے بارے میں ہدایات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اور اسی طرح آپ سے پہلے تمام انبیاء علیہم السلام بھی) اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینِ حق کی دعوت اور ہدایت لے کر آتے تھے۔ جو لوگ اُن کی دعوت کو قبول کر کے ان کا دین اور اُن کا راستہ اختیار کر لیتے تھے وہ قدرتی طور سے ایک جماعت اور اُمت بنتے جاتے تھے۔ یہی دراصل "اسلامی برادری" اور "اُمتِ مسلمہ" تھی۔

جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں رونق افروز رہے، یہی برادری اور یہی اُمت آپ کا دست و بازو اور دعوت و ہدایت کی مہم میں آپ کی رفیق مددگار تھی۔ اور آپ کے بعد قیامت تک اسی کو آپ کی نیابت میں اس مقدس مشن کی ذمہ داری سنبھالنی تھی۔ اس کے لیے جس طرح ایمان و یقین، تعلق باللہ اور اعمال و اخلاق کی پاکیزگی اور جذبۂ دعوت کی ضرورت تھی، اسی طرح دلوں کے جوڑ اور شیرازہ بندی کی بھی ضرورت تھی، اگر دل پھٹے ہوئے ہوں، اتحاد و اتفاق کے بجائے اختلاف و انتشار اور خود آپس میں جنگ و پیکار ہو تو ظاہر ہے کہ نیابتِ نبوت کی یہ ذمہ داری کسی طرح بھی ادا نہیں کی جا سکتی — اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامیت کو بھی ایک مقدس رشتہ قرار دیا اور اُمت کے

افراد اور مختلف طبقوں کو خاص طور سے ہدایت و تاکید فرمائی کہ وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں، اور باہم خیرخواہ و خیراندیش اور معاون و مددگار بن کے رہیں، ہر ایک دوسرے کا لحاظ رکھے اور اس دینی ناطہ سے ایک دوسرے پر جو حقوق ہوں اُن کو ادا کرنے کی کوشش کریں۔ اس تعلیم و ہدایت کی ضرورت خاص طور سے اس لیے بھی تھی کہ اُمت میں مختلف ملکوں اور نسلوں اور مختلف طبقوں کے لوگ تھے جن کے رنگ و مزاج اور جن کی زبانیں مختلف تھیں اور یہ رنگارنگی آگے کو اور زیادہ بڑھنے والی تھی ـــــ اس سلسلے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ہدایات مندرجہ ذیل حدیثوں میں پڑھیے!

عَنْ أَبِي مُوسَى عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا ثُمَّ شَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ

ـــــــــــــــ رواہ البخاری و مسلم

(حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے تعلق ایک مضبوط عمارت کا سا ہے اُس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے، پھر آپ نے ایک ہاتھ کی اُنگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا (کہ مسلمانوں کو اس طرح باہم وابستہ اور پیوستہ ہونا چاہیے)

(**تشریح**) مطلب یہ ہے کہ جس طرح عمارت کی اینٹیں باہم مل کر مضبوط قلعہ بن جاتی ہیں اُسی طرح اُمتِ مسلمہ ایک قلعہ ہے اور ہر مسلمان اس کی ایک ایک اینٹ ہے، ان میں باہم وہی تعلق و ارتباط ہونا چاہیے جو قلعہ کی ایک اینٹ کا دوسری اینٹ سے ہوتا ہے پھر آپ نے اپنے ایک ہاتھ کی اُنگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ مسلمانوں کے مختلف افراد اور طبقوں کو باہم پیوستہ ہو کر اس طرح اُمتِ واحدہ بن جانا چاہیے، جس طرح الگ الگ دو ہاتھوں کی یہ اُنگلیاں ایک دوسرے سے پیوستہ ہو کر ایک حلقہ اور گویا ایک وجود بن گئیں۔

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُؤْمِنُونَ كَرَجُلٍ وَاحِدٍ إِنِ اشْتَكَى عَيْنُهُ اشْتَكَى كُلُّهُ وَإِنِ اشْتَكَى رَأْسُهُ اشْتَكَى كُلُّهُ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
سب مسلمان ایک شخص واحد کے مختلف اعضاء کی طرح ہیں۔ اگر اس کی آنکھ دکھے تو اس کا
سارا جسم دکھ محسوس کرتا ہے اور اسی طرح اگر اس کے سر میں تکلیف ہو تو بھی سارا
جسم تکلیف میں شریک ہوتا ہے۔ (صحیح مسلم)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ پوری امت مسلمہ گویا ایک جسم و جان والا وجود ہے اور اس کے افراد اس کے اعضاء ہیں۔ جس طرح ایک عضو میں اگر تکلیف ہو تو اس کے سارے اعضاء تکلیف محسوس کرتے ہیں اسی طرح پوری ملت اسلامیہ کو ہر مسلمان فرد کی تکلیف محسوس کرنی چاہیئے اور ایک کے دکھ درد میں سب کو شریک ہونا چاہیے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ وَمَنْ كَانَ فِىْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِىْ حَاجَتِهِ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ـــــ رواه البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے (اس لیے) نہ تو خود اس پر ظلم و زیادتی کرے، نہ دوسروں کا نشانۂ ظلم بننے کے لیے اس کو بے مدد چھوڑے (یعنی دوسروں کے ظلم سے بچانے کے لیے اس کی مدد کرے) ــــ اور جو کوئی اپنے ضرورتمند بھائی کی حاجت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی کرے گا اور جو کسی مسلمان کو کسی تکلیف اور مصیبت سے نجات دلائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن کی کسی مصیبت اور پریشانی سے نجات عطا فرمائے گا، اور جو کسی مسلمان کی پردہ داری کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ داری کرے گا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ وَلَا يَحْقِرُهُ اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا (وَيُشِيْرُ اِلٰى صَدْرِهِ ثَلٰثَ مِرَارٍ) بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ يَحْقِرَ

اَخَاهُ اَلْمُسْلِمُ كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ۔

رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے (لہٰذا) نہ خود اس پر ظلم و زیادتی کرے، نہ دوسروں کا مظلوم بننے کے لیے اس کو بے یار و مددگار چھوڑے، نہ اس کی تحقیر کرے (حدیث کے راوی ابوہریرہ کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینۂ مبارک کی طرف تین دفعہ اشارہ کر کے فرمایا) "تقویٰ یہاں ہوتا ہے، کسی آدمی کے لیے یہی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے اور اس کی تحقیر کرے، مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لیے حرام ہے (یعنی اس پر دست درازی حرام ہے) اس کا خون بھی، اس کا مال بھی، اور اس کی آبرو بھی۔ (صحیح مسلم)

تشریح اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمانے کے ساتھ کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو حقیر و ذلیل نہ سمجھے اور اس کی تحقیر نہ کرے (لَا یَحْقِرُہٗ) اپنے سینۂ مبارک کی طرف تین دفعہ اشارہ کر کے جو یہ فرمایا کہ "اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا" (تقویٰ یہاں سینہ کے اندر اور باطن میں ہوتا ہے) اس کا مقصد اور مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ جان لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑائی، چھوٹائی، عظمت، حقارت اور عزت و ذلت کا دارومدار "تقوے" پر ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" (اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ معزز اور قابل اکرام وہ ہے جس میں تقویٰ زیادہ ہے) اور تقویٰ درحقیقت خدا کے خوف اور محاسبۂ آخرت کی فکر کا نام ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ دل کے اندر کی اور باطن کی ایک کیفیت ہے، اور ایسی چیز نہیں ہے جسے کوئی دوسرا آدمی آنکھوں سے دیکھ کر معلوم کر سکے کہ اس آدمی میں تقویٰ ہے یا نہیں ہے، اس لیے کسی بھی صاحب ایمان کو حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے ایمان والے کو حقیر سمجھے اور اس کی تحقیر کرے، کیا خبر جس کو تم اپنے ظاہری معلومات یا قرائن سے قابل تحقیر سمجھتے ہو اس کے باطن میں تقویٰ ہو اور وہ اللہ کے نزدیک مکرم ہو۔ اس لیے کسی مسلم کے لیے روا نہیں کہ وہ دوسرے مسلم کی تحقیر کرے۔ آگے آپ نے فرمایا کہ کسی آدمی کے برے ہونے کے لیے تنہا یہی ایک بات کافی ہے کہ وہ اللہ کے کسی مسلم بندہ کو حقیر سمجھے اور اس کی تحقیر کرے۔

عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى إِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ۔

——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے پر اور ہر مسلمان کے ساتھ مخلصانہ خیرخواہی پر (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ رسول اللہؐ سے جب میں نے بیعت کی تھی تو آپ نے خصوصیت کے ساتھ تین باتوں کا مجھ سے عہد لیا تھا، ایک اہتمام سے نماز پڑھنے کا، دوسرے زکوٰۃ ادا کرنے کا، تیسرے ہر مسلمان کے ساتھ مخلصانہ تعلق اور اُس کے لیے خیرخواہی اور خیراندیشی کا ——— اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے باہمی تعلق کا اتنا اہتمام تھا کہ آپ نماز اور زکوٰۃ جیسے بنیادی ارکان کے ساتھ اس کی بھی بیعت لیتے تھے۔

عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَا يَهْتَمُّ بِأَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَلَيْسَ مِنْهُمْ وَمَنْ لَمْ يُصْبِحْ وَيُمْسِيْ نَاصِحًا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَلِكِتَابِهٖ وَلِإِمَامِهٖ وَلِعَامَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ فَلَيْسَ مِنْهُمْ۔

——— رواہ الطبرانی فی الاوسط

حضرت حُذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کو مسلمانوں کے مسائل ومعاملات کی فکر نہ ہو وہ ان میں سے نہیں ہے اور جس کا یہ حال نہ ہو کہ وہ ہر دن اور ہر صبح وشام اللہ اور اُس کے رسول اور اُس کی کتاب پاک قرآن مجید کا اور اُس کے امام (یعنی خلیفۂ وقت) کا اور عام مسلمانوں کا مخلص وخیرخواہ ووفادار ہو (یعنی جو کسی وقت بھی اس اخلاص ووفاداری سے خالی ہو) وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔

(معجم اوسط للطبرانی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی بندہ کے اللہ کے نزدیک مسلمان اور مقبول الاسلام ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے معاملات اور اُن کے مصائب ومشکلات

سے بے پروانہ ہو بلکہ ان کی فکر رکھتا ہو، اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ وہ اللہ و رسول اور کتاب اللہ اور حکومت اسلام اور عوام مسلمین کا ایسا مخلص و وفادار اور خیرخواہ ہو کہ یہ خلوص و وفاداری اس کی زندگی کا جزو بن گئی ہو اور اس کی رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گئی ہو کہ وہ کسی وقت بھی اس سے خالی نہ ہو سکے ۔۔۔ خدا کے لیے ہم غور کریں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسقدر اہم ہدایات کو کیسا پس پشت ڈال دیا ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ ۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قسم اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، کوئی بندہ سچا مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہو۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کی اس درجہ خیرخواہی کہ جو خیر اور بھلائی اپنے لیے چاہے وہی اُس کے لیے بھی چاہے، ایمان کے شرائط اور لوازم میں سے ہے اور ایمان و اسلام کا جو مدعی اس سے خالی ہے وہ ایمان کی رُوح و حقیقت اور اُس کے برکات سے محروم ہے۔

اسلامی رشتہ کے چند خاص حقوق:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ خَمْسٌ رَدُّ السَّلَامِ وَعِیَادَةُ الْمَرِیْضِ وَاِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ وَاِجَابَةُ الدَّعْوَةِ وَتَشْمِیْتُ الْعَاطِسِ ۔۔۔۔۔۔۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایک مسلم کے دوسرے مسلم پر پانچ حق ہیں۔ سلام کا جواب دینا، بیمار کی عیادت کرنا، جنازہ کے ساتھ جانا، دعوت قبول کرنا، اور چھینک آنے پر "یرحمک اللہ" کہہ کے اُس کے لیے دُعائے

رحمت کرنا.　　(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(**تشریح**) مطلب یہ ہے کہ روزمرہ کی عملی زندگی میں یہ پانچ باتیں ایسی ہیں جن سے دو مسلمانوں کا باہمی تعلق ظاہر ہوتا ہے اور نشو ونما بھی پاتا ہے. اس لیے ان کا خاص طور سے اہتمام کیا جائے.
—— ایک دوسری حدیث میں سلام کا جواب دینے کی جگہ خود سلام کرنے کا ذکر فرمایا گیا ہے. اور ان پانچ کے علاوہ بعض اور چیزوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں ان پانچ کا ذکر بطور تمثیل کے فرمایا گیا ہے ورنہ اور بھی اس درجہ کی چیزیں ہیں جو اسی فہرست میں شامل ہیں.

مسلمان کی عزت وآبرو کی حفاظت وحمایت :-

عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ اِمْرِءٍ مُسْلِمٍ يَخْذُلُ اِمْرَأً مُسْلِماً فِي مَوْضِعٍ يُنْتَهَكُ فِيْهِ حُرْمَتُهُ وَيُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهِ اِلَّا خَذَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي مَوْضِعٍ يُحِبُّ فِيْهِ نُصْرَتَهُ وَمَا مِنْ اِمْرِءٍ مُسْلِمٍ يَنْصُرُ مُسْلِماً فِي مَوْضِعٍ يُنْتَقَصُ مِنْ عِرْضِهِ وَيُنْتَهَكُ فِيْهِ مِنْ حُرْمَتِهِ اِلَّا نَصَرَهُ اللّٰهُ فِي مَوْطِنٍ يُحِبُّ فِيْهِ نُصْرَتَهُ　—————— رواہ ابوداؤد

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو (بے توفیق) مسلمان کسی دوسرے مسلمان بندے کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑے کا جس میں اُس کی عزت پر حملہ ہو اور اُس کی آبرو اُتاری جاتی ہو تو اللہ تعالیٰ اُس کو بھی ایسی جگہ اپنی مدد سے محروم رکھے گا جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہشمند (اور طلبگار) ہوگا —— اور جو (باتوفیق مسلمان) کسی مسلمان بندہ کی ایسے موقع پر مدد اور حمایت کرے گا جہاں اس کی عزت وآبرو پر حملہ ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے موقع پر اُس کی مدد فرمائے گا جہاں وہ اُس کی نصرت کا خواہش مند (اور طلبگار) ہوگا.　　(سنن ابی داؤد)

عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَمٰى مُؤْمِناً مِنْ مُنَافِقٍ بَعَثَ اللّٰهُ مَلَكاً يَحْمِي لَحْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ وَمَنْ رَمٰى مُسْلِماً بِشَيْئٍ يُرِيْدُ بِهٖ شَيْنَهٗ حَبَسَهُ اللّٰهُ عَلٰى جِسْرِ جَهَنَّمَ حَتّٰى يَخْرُجَ مِمَّا قَالَ ـــــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت معاذ بن انس انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی بددین منافق کے شر سے کسی بندۂ مومن کی حمایت کی (مثلاً کسی شریر بددین نے کسی مومن بندہ پر کوئی الزام لگایا اور کسی باتوفیق مسلمان نے اس کی مدافعت کی) تو اللہ تعالیٰ قیامت میں ایک فرشتہ مقرر فرمائے گا جو اس کے گوشت (یعنی جسم) کو آتش دوزخ سے بچائے گا۔ اور جس کسی نے کسی مسلمان بندہ کو بدنام کرنے اور گرانے کے لیے اس پر کوئی الزام لگایا تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کے پل پر قید کر دے گا اس وقت تک کے لیے کہ وہ اپنے الزام کی گندگی سے پاک صاف ہو جائے۔　　(سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ کسی بندۂ مومن کو بدنام و رسوا کرنے کے لیے اس پر الزام لگانا اور اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنا ایسا سنگین اور اتنا سخت گناہ ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والا اگرچہ مسلمانوں میں سے ہو جہنم کے ایک حصہ پر (جس کو حدیث میں جسر جہنم کہا گیا ہے) اس وقت تک ضرور قید میں رکھا جائے گا جب تک کہ جل بھن کر اپنے اس گناہ کی گندگی سے پاک صاف نہ ہو جائے جس طرح کہ سونا اس وقت تک آگ پر رکھا جاتا ہے جب تک کہ اس کا میل کچیل ختم نہ ہو جائے ـــ حدیث کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ اللہ کے ہاں ناقابل معافی ہے۔ لیکن آج ہم مسلمانوں کا ہمارے خواص تک کا یہ لذیذ ترین مشغلہ ہے اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔

عَنْ اَبِى الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَرُدُّ عَنْ عِرْضِ اَخِيْهِ اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يَرُدَّ عَنْهُ نَارَ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ "وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝" ـــــــــ رواہ البغوی فی شرح السنۃ

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ جب کوئی مسلمان اپنے کسی مسلم بھائی کی آبرو پر ہونے والے حملے کا جواب دے (اور اس کی طرف سے مدافعت کرے) تو اللہ تعالیٰ کا یہ ذمہ ہوگا

کہ وہ قیامت کے دن آتشِ جہنم کو اُس سے دفع کرے ۔۔۔ پھر (بطور سند کے) آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ۔۔۔ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ٥ (اور ہمارے ذمہ ہے ایمان والوں کی مدد کرنا)۔ (شرح السنہ للامام محی السنہ البغوی)

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ذَبَّ عَنْ لَحْمِ اَخِيْهِ بِالْمَغِيْبَةِ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّعْتِقَهٗ مِنَ النَّارِ ۔۔۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس بندہ نے اپنے کسی مسلم بھائی کے خلاف کی جانے والی غیبت اور بدگوئی کی اس کی عدم موجودگی میں مدافعت اور جوابدہی کی تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے کہ آتشِ دوزخ سے اُس کو آزادی بخشدے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اغْتِيْبَ عِنْدَهٗ اَخُوْهُ الْمُسْلِمُ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى نَصْرِهٖ فَنَصَرَهٗ نَصَرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَاِنْ لَّمْ يَنْصُرْهُ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى نَصْرِهٖ اَدْرَكَهُ اللّٰهُ بِهٖ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۔۔۔ رواہ البغوی فی شرح السنہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جس شخص کے سامنے اُس کے کسی مسلم بھائی کی غیبت اور بدگوئی کی جائے اور وہ اسکی نصرت وحمایت کرسکتا ہو اور کرے (یعنی غیبت وبدگوئی کرنے والے کو اُس سے روکے یا اس کا جواب دے اور مدافعت کرے) تو اللہ تعالیٰ دُنیا اور آخرت میں اُس کی مدد فرمائے گا، اور اگر قدرت حاصل ہونے کے باوجود وہ اس کی نصرت وحمایت نہ کرے (نہ غیبت کرنے والے کو غیبت سے روکے، نہ جوابدہی اور مدافعت کرے) تو اللہ تعالیٰ دُنیا اور آخرت میں اس کو اس کوتاہی پر پکڑے گا (اور اس کی سزا دے گا)

(شرح السنہ للامام محی السنہ البغویؒ)

(تشریح) حضرت جابرؓ، حضرت معاذ بن انسؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، اور حضرت اسماء بنت یزید اور

حضرت انس رضی اللہ عنہم کی ان پانچوں حدیثوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک بندۂ مسلم کی عزت و آبرو اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسقدر محترم ہے اور دوسرے مسلمانوں کے لیے اس کی حفاظت و حمایت کس درجہ کا فریضہ ہے اور اس میں کوتاہی کس درجہ کا سنگین جرم ہے۔ افسوس ہے کہ ہدایت محمدی کے اس اہم باب کو اُمت نے بالکل ہی فراموش کر دیا ہے۔ بلاشبہ یہ ہمارے اُن اجتماعی گناہوں میں سے ہے جن کی پاداش میں ہم صدیوں سے اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہیں۔ ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور ذلیل ہو رہے ہیں۔

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے آئینہ ہے:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰۃُ الْمُؤْمِنِ وَالْمُؤْمِنُ اَخُو الْمُؤْمِنِ یَکُفُّ عَنْهُ ضَیْعَتَهٗ وَ یَحُوْطُهٗ مِنْ وَّرَائِهٖ ——— رواہ ابو داؤد والترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہے اور ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے، اُس کے ضرر کو اس سے دفع کرتا ہے اور اس کے پیچھے سے اس کی پاسبانی و نگرانی کرتا ہے۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

(تشریح) آئینہ کا یہ کام ہے کہ وہ دیکھنے والے کو اُس کے چہرہ کا ہر داغ دھبہ اور ہر بدنما نشان دکھا دیتا ہو، اور صرف اسی کو دکھاتا ہو دوسروں کو نہیں دکھاتا۔ ایک مومن کے دوسرے مومن کیلئے آئینہ ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اُس کو چاہیے کہ دوسرے بھائی میں جو نامناسب اور قابل اصلاح بات دیکھے وہ پورے خلوص اور خیر خواہی کے ساتھ اس کو اس پر مطلع کر دے، دوسروں میں اس کی تشہیر نہ کرے ——— آگے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اس دینی اخوت کے ناطے سے اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ اگر اُس پر کوئی آفت اور تباہی آنے والی ہو تو وہ اپنے مقدور بھر اُس کو روکنے اور اس کی زد سے اس کو بچانے کی کوشش کرے، اور جس طرح اپنی کسی عزیز ترین چیز کی ہر طرف سے پاسبانی اور نگرانی کی جاتی ہے اسی طرح اپنے دینی و ایمانی بھائی کی نگرانی اور پاسبانی کرے۔

عام انسانوں اور مخلوقات کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں ہدایات :۔

مندرجۂ بالا حدیثوں میں مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں کے ساتھ تعلق اور برتاؤ کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں، ذیل میں وہ حدیثیں پڑھئے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام انسانوں اور دوسری مخلوقات کے ساتھ تعلق و برتاؤ کے بارے میں ہدایات دی ہیں۔

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّهٗ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَفْضَلِ الْاِيْمَانِ قَالَ اَنْ تُحِبَّ لِلّٰهِ وَتُبْغِضَ لِلّٰهِ وَتُعْمِلَ لِسَانَكَ فِيْ ذِكْرِ اللّٰهِ قَالَ وَمَاذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ وَاَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَتَكْرَهَ لَهُمْ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ ——— رواہ احمد

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایمان کا افضل درجہ کیا ہے؟ (یعنی ایمان والے اعمال و اخلاق میں وہ کون سے ہیں جن کو فضیلت کا اعلیٰ درجہ حاصل ہے) آپ نے ارشاد فرمایا یہ کہ تمھاری محبت و مودت اور تمھاری نفرت و عداوت بس اللہ کے واسطے ہو اور تمھاری زبان اللہ کے ذکر میں استعمال ہو —— معاذ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اس کے علاوہ اور کیا یا رسول اللہ؟ تو آپ نے فرمایا اور یہ کہ تم سب لوگوں کے لیے وہی چاہو اور وہی پسند کرو جو اپنے لیے چاہتے اور پسند کرتے ہو اور اس چیز اور اس حالت کو سب لوگوں کے لیے ناپسند کرو جس کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو۔ (مسند احمد)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و تعلیم میں عام انسانوں کی اس حد تک خیر خواہی و خیر اندیشی اور ان کے ساتھ اتنا خلوص کہ جو اپنے لیے چاہے وہ سب کے لیے چاہے اور جو اپنے لیے نہ چاہے وہ کسی کے لیے بھی نہ چاہے، اعلیٰ درجہ کے ایمانی اعمال و اخلاق میں سے ہے۔

عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت جریر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
اُس شخص پر اللہ کی رحمت نہ ہوگی جو (اس کے پیدا کیے ہوئے) انسانوں پر رحم نہ کھائے گا
اور اُن کے ساتھ ترحم کا معاملہ نہ کرے گا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں اُن لوگوں کے لیے جو دوسرے قابلِ رحم انسانوں کے ساتھ ترحم کا برتاؤ نہ کریں، یعنی ان کی تکلیف اور ضرورت کو محسوس کر کے اپنے مقدور کے مطابق اُن کی مدد اور خدمت نہ کریں، بڑی سخت وعید ہے، فرمایا گیا ہے کہ ایسے لوگ خداوند رحمٰن کی رحمت سے محروم رہیں گے ۔۔۔ الفاظ میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ اس کو بددعا سمجھا جائے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ایسے لوگ خدا کی رحمت سے محروم رہیں۔ واضح رہے کہ چوروں، ڈاکوؤں اور اس طرح کے دوسرے مجرموں کو سزا دینا اور قاتلوں کو قصاص میں قتل کرنا ترحم کی اس تعلیم و ہدایت کے خلاف نہیں ہے، بلکہ یہ بھی عوام کے ساتھ ترحم ہی کا تقاضا ہے، اگر مجرموں کو تعزیری قانون کے مطابق سخت سزائیں نہ دی جائیں تو بیچارے عوام ظالموں کے مظالم اور مجرمین کے جرائم کا اور زیادہ نشانہ بنیں گے۔ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے " وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّا أُولِي الْأَلْبَابِ" (اے اہلِ دانش قصاص کے قانون میں تمہارے لیے زندگی کا سامان ہے)۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ۔

____ رواہ ابوداؤد والترمذی

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اللہ کی مخلوق پر) رحم کھانے والوں اور (اُن کے ساتھ) ترحم کا معاملہ کرنے والوں پر خداوند رحمٰن کی خاص رحمت ہوگی، تم زمین والی مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کرو، آسمان والا تم پر رحمت فرمائے گا۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث میں بڑے ہی بلیغ اور مؤثر انداز میں تمام مخلوق کے ساتھ جس سے انسان کا واسطہ پڑتا ہے ترحم کی ترغیب دی گئی ہے، پہلے فرمایا گیا ہے کہ ترحم کرنے والوں پر خدا کی

رحمت ہوگی، اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تم خدا کی زمینی مخلوق کے ساتھ رحم کا برتاؤ کرو، آسمان والا (رب العرش) تم پر رحمت کرے گا۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے لیے "من فی السماء" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے کہ "وہ جو آسمان میں ہے" ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو آسمان سے وہ نسبت نہیں ہے جو ایک مکین کو اپنے خاص رہائشی مکان سے ہوتی ہے، آسمان بھی زمین اور دوسری مخلوقات کی طرح اُس کی ایک مخلوق ہے وہ رب السمٰوٰت والارض ہے اور اُس کی خالقیت اور الوہیت وربوبیت کا دونوں سے یکساں تعلق ہے (وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ)[1] اس کے باوجود فوقیت اور بالاتری کے لحاظ سے اُس کو آسمان سے ایک خاص نسبت ہے جو زمین اور اس عالم اسفل کی دوسری مخلوقات سے نہیں ہے۔ اور وہی اس کی نوعیت اور کیفیت جانتا ہے، اسی نسبت کے اعتبار سے اس حدیث میں مَنْ فِي الْاَرْضِ "کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے" مَنْ فِي السَّمَاءِ "کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

عَنْ اَنَسٍ وَعَبْدِ اللّٰهِ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت انس اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال (گویا اُس کا کنبہ) ہے، اس لیے اللہ کو زیادہ محبوب اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ کی عیال (یعنی اُس کی مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

تشریح آدمی کے "عیال" اُن کو کہا جاتا ہے جن کی زندگی کی ضروریات کھانے کپڑے وغیرہ کا وہ کفیل ہو، بلاشبہ اس لحاظ سے ساری مخلوق اللہ کی "عیال" ہے وہی سب کا پروردگار اور روزی رساں ہے۔ اس نسبت سے جو آدمی اُس کی مخلوق کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اُس کی محبت اور پیار کا مستحق ہوگا۔

---

[1] سورۂ زخرف آیت ۸۴

اِرشاداتِ حکیم الاُمّتہ حضرت مولانا تھانویؒ

مجالسِ لکھنؤ میں عـــہ

تلخیص ــــــــ از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

(ماخوذ از جمیل الکلام و اسعد الابرار)

حکیم الاُمّتہ حضرت مولانا تھانویؒ ۱۱ر اگست ۱۹۳۸ء کو بغرض علاج مع متعلقین لکھنؤ تشریف لے گئے تھے ۲۰ر ستمبر تک لکھنؤ قیام رہا، درمیان میں دو چار روز کے لیے کانپور تشریف لے گئے تھے ــــــ وہاں حاجی دلدار علی خاں صاحب کے مکان پر قیام فرمایا۔ لکھنؤ میں مولوی محمد حسن صاحب مالک انوار المطابع کے مکان واقع محلہ مولوی گنج میں رونق افروز رہے ــــــ

ــــــ چند حاذق اطباء اور ماہر ڈاکٹروں کے معائنے کے بعد شفاء الملک حکیم عبدالمجید صاحب لکھنوی (مرحوم) کے زیر علاج رہے۔ جناب شفاء الملک اور دیگر اطباء نے ملاقات کی ممانعت کر دی تھی مگر مجمع اتنا آتا رہا کہ حضرتؒ کو ایک اعلان لگانا پڑا جس کے چند جملے یہ ہیں ــــ "میرا یہ سفر (لکھنؤ) علالت کے سبب معالجہ و راحت کی غرض سے ہوا ہے، میری موجودہ حالتِ ضعف میں اطباء اور ڈاکٹروں نے باتفاق زیادہ ملاقات کرنے اور زیادہ بات چیت کرنے سے بتاکید منع کیا ہے اور میں خود بھی طبیعت میں اس کا تحمل نہیں پاتا البتہ قلیل ملاقات

عـــہ اس انتخاب میں بعض ملفوظات کانپور کی مجلس کے بھی ہیں۔ تغلیباً اُن کو بھی مجالس لکھنؤ کے ملفوظات میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اور گفتگو کی اجازت دی ہے الخ ــــ

چند روز قیام گاہ پر ہی نماز با جماعت اور مجالس ملفوظات اور تمام معمولات کا سلسلہ رہا۔ پھر جب کچھ قوت آگئی تو یہ معمول ہو گیا کہ مسجد خواص میں عصر کی نماز کے وقت جاتے اور نماز مغرب پڑھ کر تشریف لاتے تھے ــ نماز عصر پڑھ کر حجرے کے آگے صحن میں رونق افروز ہوتے تھے۔ وہیں ڈاک کا انتظام تھا۔ مغرب تک خطوط کے جوابات اور ملفوظات کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ مسجد خواص میں عصر اور مغرب کی نمازوں میں نماز جمعہ کی مانند مجمع ہوتا تھا، مسجد بالکل بھر جاتی تھی، ہر شخص چاہتا تھا کہ کم از کم زیارت تو کر لوں۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ نماز کے فوراً بعد حضرت والا کی نشست گاہ کے قریب جگہ مل جائے تاکہ ارشادات بخوبی سُن سکوں، بعض لوگ دُعا سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے تھے۔ اُسی وقت دوا استعمال فرماتے تھے اور مغرب تک فیوض و برکات کا دریا موجزن رہتا تھا ــ علاوہ مشاہیر خلفاء ملاقات کیلیے جو حضرات لکھنؤ اور بیرون لکھنؤ سے تشریف لاتے رہے، اُن کے اسماء کی طویل فہرست ہے۔ اُن میں حضرت مولانا عبد الشکور فاروقیؒ بھی ہیں، چند علماء فرنگی محل بھی ہیں۔ مولانا سید علی زینبی امروہیؒ، قاری عبد المالک صاحبؒ، مولانا ظفر الملک علوی مرحوم نیز نواب محمد اسمٰعیل خانصاحب مرحوم (میرٹھ) نبیرہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم، نواب جمشید علیخاں صاحب مرحوم (باغپت)، نواب احمد سعید خاں (چھتاری) وغیرہم بھی شامل ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ بھی لکھنؤ تشریف لے آئے تھے، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی بھی کئی مرتبہ شریک مجلس ہوئے ــ مولانا محمد میاں فاروقی نبیرۂ مولانا محمد حسین الہ آبادیؒ بھی آئے۔ مجالس ملفوظات میں شرکت کرنے والوں میں بقول جناب وصل بلگرامی مولانا عبد الباری ندوی اور حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ سب سے زیادہ مستعد پائے جاتے تھے ــ اُن کی بیتابی، اُن کا شوق، اُن کی محبت اور اُن کی عقیدت دیکھنے کے قابل تھی ــ جمیل الکلام مرتبہ مولانا جمیل احمد تھانوی اور اسعد الابرار مرتبہ مولانا ابرار الحق حقی (مع دردوئی) تصحیح حضرت مولانا اسعد اللہ مدظلہٗ ناظم مظاہر علوم سے یہ ملفوظات اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں رسالے "الفصل للوصل" مرتبہ سید مقبول حسین وصل بلگرامی میں مندرج ہیں۔

فرمایا ــ ایک شخص نے ایک غلام خریدا۔ اُس سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ اب تک جو نام تھا وہ تھا اب سے وہی نام ہے جس نام سے آپ پکاریں، پھر دریافت کیا کہ کھانے پینے میں کیا معمول ہے؟ اُس نے کہا اب تک جو تھا وہ تھا اب سے وہ ہے جو آپ کھلائیں گے پلائیں گے تو بندے کا

معاملہ حق تعالےٰ سے کم از کم ایسا تو ہونا چاہیے ــــــــ

فرمایا ــ ایک صاحب نے مجھ کو عربی میں خط لکھا اور اپنی اصلاح کی درخواست کی میں نے لکھ دیا کہ مُفید (مرشد و استاذ) کا مُستفید (مُرید و مُتعلم) سے اکمل ہونا ضروری ہے۔ میں عربی میں اچھی طرح لکھ نہیں سکتا. آپ لکھ سکتے ہیں (لہٰذا میں آپ کی اصلاح نہ کر سکوں گا) ــــــــ

فرمایا کہ ــ میں نے ایک طالب علم سے کہا تھا أَتَدْعُونَ بَعْلاً وَتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْن (کیا تم پکارتے ہو بعل (بُت) کو اور چھوڑتے ہو بہتر بنانے والے کو) اگر یہ (نعوذ باللہ) غیر اللہ کا کلام ہوتا تو تَذَرُوْنَ کی جگہ تَدَعُوْنَ ہوتا چونکہ معنیٰ کا لحاظ فرمایا گیا ہو اس لیے صنعتِ لفظی کی رعایت نہیں کی گئی ــ (مطلب یہ ہو کہ اگر لفظوں کی رعایت ہوتی تو بجائے تَذَرُوْنَ کے تَدَعُوْنَ ہوتا کیونکہ اس سے پہلے اَتَدْعُوْنَ ہو۔ اور اس طرح محض ایک لفظی صنعت پیدا ہو جاتی. اگر یہ غیر اللہ کا کلام ہوتا تو وہ اسی لفظی رعایت کو مقدم رکھتا. لیکن دونوں لفظوں میں بہت بڑا معنوی فرق ہو کہ تَذَرُوْنَ جان بوجھ کر چھوڑنے کے لیے ہو اور تَدَعُوْنَ عام ہو۔ تو تَذَرُوْنَ سے یہ معنی برآمد ہوئے کہ تم اللہ کو یہ جانتے پہچانتے کے باوجود کہ ہر چیز کا خالق وہی ہو چھوڑتے ہو۔ تو اب چھوڑنے کی بُرائی میں مبالغہ ہو گیا اور تَدَعُوْنَ میں یہ مفہوم نہ نکلتا. خلاصہ یہ کہ اللہ کے کلام میں معنیٰ کی رعایت کو لفظ کی رعایت پر مقدم فرمایا گیا) ــــ

فرمایا کہ ــ محققین نے تصریح کی ہو کہ حق تعالےٰ شانہٗ خیر و شر دونوں کے خالق ہیں اور خلق شر میں حکمت ہو۔ اسی لیے شر حق تعالےٰ کی نسبت سے شر نہیں ہو کیونکہ اُس میں حکمت ہو۔ البتہ ہماری نسبت سے شر ہو کیونکہ ہم سے اُسکے صدور میں کوئی حکمت نہیں۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

کفر ہم نسبت بہ خالق حکمت است[عہ]
چوں بما نسبت کُنی کُفر آفت است

وصل صاحب بلگرامی نے عرض کیا کہ حضرتِ والا کے یہاں (مسائل وغیرہ میں) بہت رجوع ملتا ہو۔ فرمایا ہاں "ترجیح الراجح" کا مستقل سلسلہ (میرے یہاں) ہو اور مولانا انور شاہ (صاحب کشمیریؒ)

عہ خالق کی نسبت سے کُفر کے وجود میں ایک حکمت ہے کہ اس کی موجودگی میں اُس کی ضد اسلام کی حقانیت واضح ہو جاتی ہو لیکن یہی کفر ہماری نسبت سے ایک آفت ہو۔

فرماتے تھے کہ صدیوں کے بعد یہ سلسلہ (دوبارہ) جاری ہوا ہے۔ بہشتی زیور اور ترجیح الراجح کا ایک واقعہ بیان فرما کر فرمایا کہ میں تو ہر ایک مسئلے میں اپنا تسامح قبول کرنے کو تیار ہوں چاہے ایک بچہ ہی بتادے ــــ

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ جذب کوئی تصوف کی اصطلاح ہے؟ ان سے فرمایا کہ طب کی اصطلاح، صرف طب کا طالب علم پوچھ سکتا ہے، مریض نہیں پوچھ سکتا۔ کیا آپ تصوف کا درس لیتے ہیں؟ آپ کو اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے۔ من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ یعنی کسی شخص کا لایعنی سے بچنا، اس کے اسلام کے حُسن اور کمال کی بات ہے ــــ ہر شے کے حدود ہیں حدود سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے ــــ......

مولوی محمد موسیٰ صاحب سرحدی جو مدینہ منورہ کے حرم شریف میں حضرت والا کے مواعظ و تالیفات کا عربی میں درس دیتے تھے، اُن کا خط آیا تھا، انھوں نے اپنے نام کے ساتھ تھانوی لکھا تھا، اس پر فرمایا کہ مولوی موسیٰ نے اپنا وطن ترک کر کے تھانہ بھون کو وطن بنالیا تھا، اس واسطے وہ اپنے کو تھانوی لکھتے ہیں جیسے مولوی ظفر احمد کہ اصل میں تو دیوبندی ہیں، میری بہن کے لڑکے ہیں تو تھانہ بھون اُن کی ننھیال ہوئی مگر وطن بنالینے کی وجہ سے وہ بھی تھانوی لکھتے ہیں۔ پھر فرمایا مولوی موسیٰ دیوبند پڑھتے تھے۔ تھانہ بھون بہت مرتبہ آئے۔ غریب تھے۔ رہا چلے گئے۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ (یہاں) امرود کے پتے کھا کھا کر گزر کر کے چلے گئے اور کسی کو حال نہیں بتایا...... پھر فرمایا کہ مولوی محمد موسیٰ نیک تو بہت ہیں مگر دوسروں کو بھی نیک بنانا چاہتے ہیں۔ آج کل نیک ہونا تو آسان ہے مگر نیک گر ہونا بہت دشوار ہے۔ ان کے اُصول و حُدود کی ہر شخص سے رعایت نہیں ہوتی...... مولوی محمد موسیٰ سرحدی کا مزید تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ پہلے میرے لیے دُعا کرتے تھے کہ مدینہ منورہ آجائے مگر اب یہ دُعا چھوڑ دی کہ ہندوستان میں تو کچھ دینی خدمت کر رہا ہوں معلوم نہیں دوسری جگہ کیا موقع ہو اور اصل بات تو یہ ہے کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ وہاں رہوں مجھے تو اس...... میں ہی رہنے دیا جائے وہاں رہنا بڑے لوگوں کا کام ہے...... مولوی محمد موسیٰ اکثر ایسے ہیں کہ حکومت سے بھی نہیں دبتے۔ ایک مرتبہ امیر مدینہ سے کچھ اختلاف ہوگیا اور اُس کی بدولت کچھ روز جیل میں رہے۔ شاید کوئی مہینہ جاتا ہو کہ خط نہ بھیجتے ہوں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ میری طرف سے روزانہ روضۂ مبارک پر سلام پیش کر دیا کریں اور سلام کے صیغے بھی نہایت عجز کے لکھ دیے تھے، انھوں نے لکھا ہے کہ سب خاندان کی طرف سے روزانہ روضۂ مبارک پر سلام پیش کر دیتے ہیں ــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ایک بار میں نے یہاں لکھنؤ ہی میں ایک وعظ میں بیع صرف یعنی چاندی سونے کی بیع اور گوٹہ زری وغیرہ لینے کے مسائل چار پانچ بیان کر دیے۔ بعد میں دیکھا کہ دو آدمیوں میں اختلاف ہو رہا ہے، ایک کہتا ہے یوں بیان کیا تھا، دوسرا کچھ اور کہتا ہے ان میں سے ایک کو غلط یاد رہا کہیں کا مبتدا کہیں کی خبر سے جوڑ دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ کئی مسئلے بیان کرنے سے یہ خرابی ہوئی۔ عوام کو تو ثواب و عذاب ہی بتانا چاہیے اور یہ تاکید کرنا چاہیے کہ مسائل (علماء سے) پوچھ پوچھ کر عمل کر لیا کریں۔

فرمایا ـــــ ایک عالم نے سہارنپور میں سچّے کام کی ٹوپی پانچ روپے میں خریدی اور کہا کہ میں لیے جاتا ہوں، روپے بھیج دوں گا ـــــ دوکاندار نے عرض کیا کہ مولانا! یہ نسیئہ (اُدھار) کیسے جائز ہوا؟ بولے ہاں بھائی یہ تو جائز نہیں مجھے خیال نہیں رہا۔ تم ٹوپی رکھ لو میں روپے لا کر لے جاؤں گا۔ اُس دوکاندار نے کہا کہ کیا اس وقت یہ ٹوپی لے جانے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی؟ پھر خود صورت بتلائی کہ آپ اس وقت مجھ سے پانچ روپے قرض لے لیجئے اور پھر اس روپے سے ٹوپی خرید لیجئے اور قرض کا روپیہ پھر ادا کر دیجئے۔ دیکھیے ایک عامی آدمی نے مولانا کو ایک معاملے کے عدم جواز کی صورت بتائی پھر اُس کے جواز کی شکل بتائی۔ اگر مسائل پر عمل کرنا شروع کر دیں تو علم اور عمل سب میں آسانی ہو جائے ـــــ

فرمایا ـــ صفائی معاملات ہے تو چھوٹی سی کتاب مگر معتبر ہے اس لیے کہ (حضرت) مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی حرفاً حرفاً دیکھی ہوئی ہے۔ اس میں ایسے ایسے چھوٹے چھوٹے مسئلے لکھے ہیں ـــــ ایک صاحب نے عرض کیا کہ آج کل لوگ پڑھ تو لیتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے ـــ فرمایا عمل کا قصد بھی نہیں کرتے۔ دین کی فکر ہی نہیں ـــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا ـــــ ایک منتہی طالب علم کسی مُبتدی طالب علم کو پڑھا رہے تھے۔ میرا اُدھر سے گزر ہوا تو وہ میزان والے کو الف لام کی قسمیں بتا رہے تھے میں نے کہا مولانا! تم تو چار قسمیں بتا رہے ہو۔ مگر اس کے نزدیک تو ایک ہی قسم ہے یعنی الف لام استغراق کا (یعنی یہ تو تمہاری تقریر میں مستغرق ہے اور اس پر استغراق کی کیفیت طاری ہے اسے کچھ خبر نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو) تم اس بیچارے کو پڑھاتے ہو یا خود اپنی استعداد بڑھانے کی شکل نکال رہے ہو۔ بھلا اس غریب کو اس سے کیا نفع؟" ـــــ

وصّی صاحب بلگرامی نے عرض کیا کہ قصد السبیل حضرت والا کی اور القول الجمیل حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ کی ایک ہی سی ہیں۔ فرمایا القول الجمیل زیادہ جامع ہے اس میں عملیات اور تعویذ وغیرہ بھی ہیں۔

فرمایا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ (نانوتوی) کی تقریر بھی اور تحریر بھی (دونوں) کیسی جامع ہیں سبحان اللہ ــــ معلوم ہوتا ہے کہ علوم بھر دیے گئے ہیں ــــ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ مجھے اصطلاحیں معلوم نہیں ہیں ویسے ہی مضامین وارد ہوتے ہیں اور مولانا کو اصطلاحیں معلوم ہیں۔ اور حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ ہر مرشد و پیر کی ایک پیچ زبان (زبان) ہوتی ہے ..... میری زبان ہیں مولانا محمد قاسم صاحب ــــ

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ حضرت حاجی صاحبؒ کے سامنے مُشکل مُشکل مسائل پیش کرتے تھے ــــ یہ سُناتے جاتے تھے اُور حضرتؒ کچھ کچھ بتاتے جاتے تھے۔ کسی نے مولاناؒ سے کہا کہ حضرتؒ تو سمجھے بھی نہ ہوں گے۔ کیا اچھا جواب دیا نہ تو یہ فرمایا کہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ غلو تھا نہ یہ فرمایا کہ نہیں سمجھتے کہ یہ تنقیص تھی ــــ یہ فرمایا کہ ہمارے اور ان حضرات کے عُلُوم میں ایک فرق ہے۔ ہمارے یہاں اوّل مبادی آتے ہیں پھر مقاصد اُن کے تابع ہوتے ہیں اور اس میں کبھی کبھی غلطی بھی ہو جاتی ہے جبکہ مبادی میں کوئی مقدمہ مخدوش ہو۔ اور ان حضرات کے یہاں مقاصد اوّل آتے ہیں پھر دلائل اس کے موافق سوچ لیے جاتے ہیں ــــ سو میں حضرتؒ کو جو سناتا ہوں تو یہ معلوم کرتا ہوتا ہے کہ مقاصد بھی صحیح ہیں یا نہیں؟ جب تصدیق ہو جاتی ہے تو اطمینان ہو جاتا ہے ــــ

فرمایا۔ ایک بار حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا کہ اور لوگ حضرت کے معتقد ہوئے ہیں مختلف کمالات کے سبب اور میں معتقد ہوا ہوں حضرتؒ کے علم کی وجہ سے۔ کسی نے عرض کیا کہ حضرتؒ کا علم تو آپ کے سامنے کچھ نہیں ہے، فرمایا علم اور چیز ہے اور معلومات اور ــــ (میری معلومات زیادہ ہو سکتی ہیں مگر علم، حضرتؒ ہی کا زیادہ ہے) ــــ

فرمایا ــــ مولانا محمد قاسم صاحبؒ، مطبع مجتبائی میں دس روپے کے ملازم تھے اور اصل میں یہ بات تھی کہ مالک مطبع مولاناؒ کی کچھ خدمت کرنا چاہتے تھے۔ مولانا نے ویسے تو منظور نہ فرمایا اور یہ فرمایا کہ کچھ کام لو اور یہ بھی فرمایا کہ اور کاموں میں تو لیاقت کی ضرورت ہے میں اس قابل نہیں ہوں ہاں قرآن شریف کا منقول عنہ سے مقابلہ کر سکتا ہوں اور اس میں (زیادہ) لیاقت کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے زیادہ پیش کرنا چاہا مگر مولاناؒ نے انکار فرمادیا۔ اسی زمانے میں مولاناؒ نے حضرتؒ سے اجازت چاہی کہ ترک ملازمت کر کے توکل اختیار کروں۔ حضرتؒ نے فرمایا، مولانا ابھی تو آپ پوچھ رہے ہیں اور پوچھنا دلیل ہے تردد کی اور تردد دلیل ہے خامی کی اور خامی کی حالت میں توکل بمعنی ترکِ اسباب جائز نہیں ــــ

مولانا کرامت علی جونپوری رحؒ
اور
ان کا ترجمہ شمائل ترمذی

(مولانا حبیب اللہ صاحب ندوی، ناظم جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ)

(۴)
(آخری قسط)

تصانیف مولانا کی حسب ذیل تصانیف کا ذکر "تذکرہ علمائے ہند" میں ہے (۱) مفتاح الجنۃ (۲) زینۃ المصلی (۳) زاد التقویٰ (۴) راحت روح (۵) نور علیٰ نور (۶) فیض عام (۷) دعوات مسنونہ (۸) قرۃ العین (۹) تزکیہ نسواں (۱۰) تذکیۃ العقائد (۱۱) مراد المریدین (۱۲) قوۃ الایمان (۱۳) نسیم الحرمین (۱۴) احقاق الحق (۱۵) مراۃ الحق (۱۶) رفیق السالکین (۱۷) تنویر القلوب (۱۸) حق الیقین (۱۹) قول الحق (۲۰) مراۃ الحق[1] (۲۱) محاکمۃ المومنین (۲۲) المعاندین (۲۳) براہین قطعیہ فی مولد خیر البریہ (۲۴) کرامۃ الحرمین فی ازالۃ شبہۃ الفریقین (۲۵) ملخص تفصیل الامین (۲۶) الطمینان المکوبہ (۲۷) بہان الاخوان (۲۸) مخارج الحروف (۲۹) ہدایۃ الرافضین (۳۰) زینۃ القاری (۳۱) شرح ہندی جزری (۳۲) شرح شاطبی (۳۳) ترجمہ مشکوٰۃ جلد اول (۳۴) ترجمہ شمائل ترمذی (۳۵) فتح باب بیان (۳۶) کوکب دری (۳۷) نور الہدیٰ (۳۸) حجت قاطعہ (۳۹) مکاشفات رحمت (۴۰) دفع الوسواس (۴۱) مصباح الظلام (۴۲) رسالۂ بیعت (۴۳) قاطع المبتدعین (۴۴) استقامت (۴۵) رد البدعت (۴۶) قوت روح (۴۷) سبیل الرشاد (۴۸) القول الثابت (۴۹) رسالہ محمودیہ وغیرہ۔

---

[1] الفرقان: یہ نام ۱۵ پر بھی ہے۔

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً تمام ہی علوم دینیہ پر مولانا نے اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان کتابوں میں مشکوٰۃ اور شمائل ترمذی کا ترجمہ اور شرح جزری اور شرح شاطبی اپنی دینی و علمی حیثیت کے لحاظ سے اور مفتاح الجنۃ اور عقائد پر بعض دوسری کتابیں اپنی افادیت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں بعض کتابوں کا شمار تو دورِ جاہ متاز ہندوستانی تصنیفات میں ہوتا ہے۔ ان میں چار پانچ کتابیں عربی میں بقیہ اردو میں ہیں۔ ان میں بعض تو بہت زیادہ مقبول اور مشہور ہوئیں خاص طور پر مفتاح الجنۃ جو پہلی بار ۱۲۴۲ھ میں چھپی اور ۱۵ اور ۱۹ برس کے اندر اس کے چار پانچ ایڈیشن نکل گئے۔ ہمارے پیش نظر اس وقت مطبع مصطفائی کا ذکر لکھنؤ ۱۲۶۰ھ کا نسخہ ہے۔ اس کے مالک محمد مصطفیٰ خاں نے جو کتاب کے آخر میں خاتمہ لکھا ہے اس میں انھوں نے تمام مطبوعہ نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ اور سب سے مقابلہ کر کے چھاپا ہے۔ ہم ان کا پورا بیان یہاں نقل کرتے ہیں۔

کتاب مفتاح الجنۃ کہ مولوی کرامت علی صاحب جونپوری نے کہ مصنف اس کے ہیں شہر کلکتہ میں اول دفعہ ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) میں اور دوسری بار ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں چھپوایا تھا۔ اور حاجی عبد الستار صاحب نے بعد اس کے اسی شہر میں چھپوایا۔ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) میں سوا اس بندۂ گنہگار امیدوار مغفرت پروردگار محمد مصطفیٰ خاں بیٹے حاجی محمد روشن خاں مرحوم نے ان تینوں نسخوں کو مع چوتھی نسخہ چھپوائی ہوئی محمد فیض اللہ صاحب کے ۱۲۴۸ھ (۱۸۲۹ء) سن بارہ سو اڑتالیس ہجری میں ساتھ کمال جد و جہد کے ہر ایک جگہ سے جمع کر اول سے آخر تک ہر ایک کو بخوبی تدقیق دیکھ اور لفظ جمع اور مذکر و تانیث موافق اردوئے محلے کی درست کر واسطے خیر خواہی بھائیوں مسلمانوں کے بیچ بیت السلطنت لکھنؤ کے محلہ محمود نگر میں نیچے اکبری دروازہ کے مطبع اپنے میں کہ ساتھ مصطفائی مشہور ہے پچیسویں مہینے جمادی الآخری ۱۲۶۰ھ بارہ سو ساٹھ ہجری میں چھپوایا۔ اب جو شخص اول چاروں کو اکٹھا کر سیر اس کی کرے اس پر بخوبی تمیز یہ روشن ہو جائے کہ یہ نسخہ صحت و متانت و موافقت روزمرہ میں فی الحقیقت لاجواب ہے اور دوسرا ہونا دشوار۔ الحمد للہ اولاً و آخراً۔

(ص ۱۳۰)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۶۰ھ تک ۱۵، ۱۶ برس کے اندر اس کے چار ایڈیشن طابع کے علم میں نکل چکے تھے، مگر خود مولانا کرامت علی کا جو بیان ۱۲۴۳ھ والے ایڈیشن کے آخر میں درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اس کے مطبوعہ یا پھر قلمی نسخے ملک میں پھیل چکے تھے اور انھوں نے اضافہ کے بعد پھر اسے ۱۲۴۳ھ میں چھپوایا، مولانا کا بیان یہ ہے،

اس فقیر نے اس کتاب کو تصنیف کرنے کے کئی برس بعد حج کے سفر سے پھرتے ہوئے ۱۲۴۳ھ میں

چھپوایا تھا سو اب بعضے مقام پر مضمون صاف ہونے کے تئیں کچھ لفظیں زیادہ کم کیں، اور دو چار مسئلے ضروری
چھوٹ گئے تھے، سو ان کو ان کے مقام پر داخل کیا، اب جس کے پاس یہ کتاب ہووے وہ اس کے موافق
اپنی کتاب درست کرلے۔ (ص ۱۲۹)

"اب جس کے پاس یہ کتاب ہووے" سے یا تو مراد قلمی ہو، جیسا کہ دستور تھا، کہ لوگ لکھ کر اپنے پاس
رکھتے تھے یا پھر مطبوعہ مراد ہو، اس سے پہلے مطبوعہ ہونے کی صورت میں ۱۲۴۳ھ کے اڈیشن کے بارے میں
یہ کہا جائے گا کہ مولانا نے ترمیم و اضافہ کے بعد اپنے اہتمام میں سب سے پہلے ۱۲۴۳ھ میں اسے چھپوایا۔

آگے شمائل کے سلسلہ میں ہم مولانا کی اردو تصنیفات کے مقصد پر تفصیل سے بحث کریں گے، مفتاح
الجنہ کی تصنیف جن مقاصد کے پیش نظر ہوئی۔ ان میں سب سے بڑا مقصد دین کی اشاعت تھی، اور یہ اسی
وقت ممکن تھی، جب اسے عوام کی زبان میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ مفتاح الجنہ کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں۔ (ص ۱)[۶]

"وہ بیان یہ ہے کہ جب اس فقیر عاجز نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور اپنی طاقت کے موافق معنی قرآن
شریف اور حدیث کے بیان کرنے شروع کیے، تب اللہ تعالیٰ کے کلام کے اثر سے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
کے حکم کی برکت سے بہت سے مسلمان دین پر مضبوط ہوئے، اور اذان اور نماز خوب ہونے لگی۔ اور مسلمانوں کی عورتیں
بھی بہت سی اللہ کی ہدایت سے نماز پڑھنے لگیں، اس فقیر عاصی نے چاہا کہ ایک رسالہ چھوٹا سا جس میں مسئلے
ضروری نماز کے سب رہیں، ہندی زبان میں جو آسانی سے عورتوں اور مردوں کی سمجھ میں آویں، لکھا چاہیے،
اور اس بات کو موجب بہتری اپنی اور پڑھنے والوں کا سمجھ کے اس رسالہ کی ۲۳ معتبر کتابوں سے جس طرح
شرح وقایہ اور فتاویٰ محیط اور ہدایہ اور فتاویٰ مختصر شافی اور مختصر قدوری اور کنز اور شرح اوراد وغیرہ سے
خوب تحقیق کرکے کتابوں میں سے نکال کے اس رسالہ میں لکھا ہے۔" (ص ۲)

ترجمہ مشکوٰۃ

مولانا نے حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف کا بھی ترجمہ کیا تھا، مولانا نے جس زمانہ میں
مشکوٰۃ کا ترجمہ کیا، اسی کے لگ بھگ ایک دوسرا ترجمہ مولانا قطب الدین صاحب
دہلوی نے مظاہر حق کے نام سے کیا، اور یہ ترجمہ کافی مقبول ہوا اور اب بھی متداول ہے، مولانا کرامت علی

؎ اس وقت "ہو"، "کے" وغیرہ عموماً یائے مجہول کے بجائے یائے معروف سے لکھتے تھے، لیکن ہم نے نقل میں
اس طریقے کی پیروی نہیں کی ہے۔

رحمۃ اللہ کا ترجمہ ہماری نظر سے نہیں گزرا مگر شمائل ترمذی کے ترجمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ترجمہ مظاہر حق کے ترجمہ سے زیادہ رواں اور صاف اور شستہ ہوگا۔ مظاہر حق کا لفظی ترجمہ اگر اصل عربی متن سامنے نہ ہو تو بہت سی جگہ کچھ سمجھ میں نہیں آسکتا، مگر شمائل ترمذی کے ترجمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ترجمہ میں کمی نہ ہوگی۔

ترجمہ شمائل ترمذی

یہاں ہم نے اختصار کے لیے صرف ان کی دو کتابوں کا ذکر کیا ہے، اب ان کی تیسری کتاب ترجمہ شمائل ترمذی کے بارے میں چند باتیں عرض ہیں۔

کتاب کا نام

ترجمہ کا نام "انوار محمدی" ہے، مولانا خود دیباچہ میں لکھتے ہیں:

اور اس شرح کا نام انوار محمدی رکھا، (دیباچہ کتاب)

سنہ ترجمہ و طباعت

مولانا نے اس کا ترجمہ کب شروع کیا، اس کی وضاحت تو نہیں ملتی، مگر اس کے اختتام کی تاریخ کا ذکر خود مولانا نے کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے ایک سو چھتیس برس پہلے یہ ترجمہ مکمل ہو چکا تھا اختتام پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

الحمد للہ کہ ۱۲۵۲ھ (مطابق ۱۸۳۴ء) ہجری نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام مہینہ شوال سولہویں میں اس کتاب شریف کے ترجمہ سے فراغت ہوئی، اور دستاویز نجات کی ہاتھ آگئی (ص ۴۷۷)

کتاب اسی سال چھپ کر، لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف مولانا لکھتے جاتے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ اس کی طباعت بھی ہوتی جاتی تھی، اس لیے کہ مولانا نے اختتام ترجمہ کی تاریخ ماہ شوال ۱۲۵۲ھ بتائی ہے، اور کتاب کے ٹائیٹل پر بھی یہی سنہ طباعت اور مہینہ درج ہے۔

خاکسار علی جونپوری مشہور کرامت علی نے ترجمہ و شرح ہندی زبان میں کر کے محمدی چھاپے خانہ میں چھپوایا، شہر شوال ۱۲۵۲ھ"

یہ محض ترجمہ نہیں ہے، بلکہ شمائل کی مختصر شرح بھی ہے، اور ترجمہ اور شرح کے لکھنے میں مولانا نے اس سلسلہ کی تمام ہی معتبر کتابوں سے استفادہ کیا تھا، خود لکھتے ہیں۔

اور ترے ترجمہ پر کفایت نہ کیا، بلکہ شرح بھی ضروری مقامات کی کر دیا، اگرچہ استاذ کامل سے پڑھا تھا، پر اپنی یاد پر بھروسہ نہ کر کے شرحین معتبر مدد کے واسطے ترجمہ کے وقت سامنے دھر لیا۔ (دیباچہ)

مطبع اور ناشر کا نام

یہ کتاب جیسا کہ مولانا نے ذکر کیا ہے، پہلی بار مطبع محمدی کلکتہ میں چھپی، اس مطبع کے مالک کا نام خادم الدین ارادت اللہ تھا جو ضلع جہانگیر نگر قصبہ رستم آباد

کے رہنے والے تھے، انھوں نے اسی نام کی ایک مہر بھی بنوائی تھی جو کتاب کے ٹائٹل پر ثبت ہے۔

کتاب کی اشاعت مضاربت کے اصول پر ہوئی، یعنی محنت کسی کی اور سرمایہ کسی کا، اس کی صراحت تو نہیں ملتی کہ کیا شرائط طے ہوئے تھے۔ مولانا نے آخر میں لکھا ہے کہ

الحمد للہ کہ شرح شمائل مضاربت مومنان دیندار مولوی عبد الستار و حاجی عبد القادر و منشی حسن و منشی غلام الرحمن و نور علیخاں شیخ عبد اللہ وغیرہ پانچوں صاحبان (ص۲۴۴)

ترجمہ کا مقصد ہندوستان کے علماء و صوفیہ نے اپنی دعوت و اصلاح کی آواز کو عوام تک پہنچانے کے لیے ہمیشہ اُن کی زبان میں گفتگو کی، انھوں نے ہندوستان کی کسی زبان کے ساتھ نہ تو تعصب برتا اور نہ اس کو مذہبی حیثیت دی۔ چنانچہ ہندوستان میں جس وقت دربار شاہی سے لے کر عدالتوں تک میں فارسی کا عام چلن تھا، یہ علماء و صوفیہ ہندوستان کی مختلف بولیوں ہندوی، دکنی، پنجابی وغیرہ میں اپنا پیغام عوام تک پہنچا رہے تھے۔ اس لیے کہ سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی فارسی زبان خواص تک محدود تھی، اور عوام اپنی مقامی بولیوں ہی سے کام لیتے تھے۔ ان علاقائی زبانوں میں ان کے سیکڑوں دوہے ہزاروں فقرے اور جملے اور درجنوں کتابیں اس پر شاہد عدل ہیں، ڈاکٹر عبد الحق نے صوفیہ کی اردو خدمات کے سلسلہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ

> بات یہ تھی کہ ان کے پاس دلوں کے کھینچنے کا وہ سامان تھا کہ جو نہ امراء و سلاطین کے پاس ہے، اور نہ علماء و حکماء کے پاس، لیکن دلوں کو ہاتھ میں لینے کے لیے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے، ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے، درویش کا تکیہ سب کے لیے کھلا تھا، بلا امتیاز ہر قوم و ملت کے لوگ اُن کے پاس آتے، اور ان کی زیارت و صحبت کو موجب برکت سمجھتے۔ عام و خاص کی کوئی تفریق نہ تھی۔ خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے۔ اس لیے تلقین کے لیے انھوں نے جہاں اور ڈھنگ اختیار کیے۔ اُن میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطہ کی زبان سیکھیں، تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ چنانچہ جتنے اولیاء اللہ سرزمین ہند میں آئے، یا یہاں پیدا ہوئے، وہ باوجود عالم و فاضل ہونے کے (خواص کو چھوڑ کر) عوام سے ان ہی کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے تھے۔ یہ بڑا گر تھا اور صوفیہ اسے خوب سمجھتے تھے۔ (ص ۵)

ملک محمد جائسی نے بھی اپنی کتاب میں اس طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اولیاء اللہ نے زبان	(توہم نہ کنند کہ اولیاء اللہ بغیر از زبان عربی تکلم

نہ کردہ زیرا کہ جملہ اولیاء اللہ در ملک عرب مخصوص
نہ بودہ میں بہر ملکے کہ بودہ زبان اں ملک بکار بردہ
دگماں نہ کند کہ ہیچ اولیاء اللہ بہ زبان ہندی نظم
نہ کردہ زیرا کہ اول از جمیع اولیاء اللہ قطب
الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملۃ والدین
قدس اللہ سرہ بدیں زبان سخن فرمودہ بعد ازاں
حضرت خواجہ گنج شکر قدس اللہ سرہ در زبان
ہندی و در پنجابی بعضے اشعار نظم فرمودہ۔

عربی کے علاوہ دوسری زبان میں بات نہیں کی
اس لیے کہ یہ عرب تک محدود نہیں تھے۔ تو وہ
جس ملک میں رہے اسی کی زبان سے کام لیا اور
اور یہ بھی گمان نہ ہونا چاہیے کہ اولیاء اللہ نے
ہندی زبان میں کلام نہیں کیا ہے۔ اس لیے کہ
سب سے بڑی بزرگ ہستی حضرت خواجہ
معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی انھوں
نے ہندی میں بات چیت کی ہے ان کے بعد خواجہ
گنج شکر قدس سرہ نے ہندی اور پنجابی میں
بعض اشعار کہے ہیں۔

سید صاحب کے سلسلہ کے تمام بزرگوں نے اسی مقصد کے پیش نظر زیادہ تر فارسی[1] کے بجائے عوامی بولی اردو یا ہندی میں کتابیں اور نظمیں لکھیں، اور اسی میں انھوں نے ان کو وعظ و تلقین کیا، مولانا کرامت علی صاحبؒ نے مفتاح الجنۃ کے دیباچہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے کچھ حصے ہم نقل کر چکے ہیں مزید چند فقرے ملاحظہ ہوں۔

> اور اس رسالہ کے تئیں نہایت ہندی سیدھی زبان میں جو عورت مرد کی سمجھ میں آوے، بیان کیا، اور کچھ فقیر کو، غرض ریختہ اور رنگینی سے نہیں ہے، اور نہ فقیر شاعروں کے زمرہ میں ہے، اسی واسطے فقیر نے اپنے شہر کی زبان میں لکھا، جس میں کسی کو مشکل نہ معلوم ہو۔ (ص ۷)

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو یا ہندی میں اس کتاب کو لکھنے کا مقصد عوام تک اپنی آواز کو پہنچانا تھا۔ شمائل ترمذی جس پر ہمیں آگے گفتگو کرنی ہے، اس کے ترجمہ کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اکثر لوگ علم تو پڑھتے ہیں مگر حدیث کا ذکر بھی نہیں کرتے، اور پیغمبر صاحب کی حدیث اور

[1] سید صاحبؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ اور دوسرے بزرگوں کی کئی کتابیں فارسی اور عربی میں بھی ہیں، مگر وہ خواص کے لیے ہیں، عوام کے لیے انھوں نے اردو ہی کو ذریعہ اصلاح بنایا۔

ان کی صورت شکل، رہن سہن، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے[1]، سونے جاگنے، چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے، وضو غسل روزہ، نماز وغیرہ اخلاق و عادات کا احوال لوگوں کے نزدیک خواب و خیال ہو گیا، بلکہ خواب بھی بھول گیا اور اس شیرینی کی لذت لوگ بھول گئے، اور عشق دنیاوی کے قصے کہانی میں مشغول ہو رہے، تب بموجب حدیث نبوی الدین نصیحۃ کے یعنی دین کیا ہے خیر خواہی مسلمان بھائی کی، ارادہ کیا کہ کچھ حدیث کی لذت مسلمان بھائیوں کو چکھا دیں، اور ہندی زبان کے پیالہ میں اس آب حیات کو بھر کر پلا دیں۔ تب فکر اور غور کے بعد یہی مناسب دیکھا، کہ شمائل ترمذی جو مشہور اور صحیح کتاب حدیث کی ہے اس کا ترجمہ کریں کیونکہ کتاب مختصر ہے۔ (دیباچہ)

دیباچہ کے آخر میں لکھتے ہیں:

اب مسلمان بھائیوں کو مناسب ہے کہ جب اپنے کام سے فراغت پاکے بیٹھیں، تب اپنے یار آشنا پڑوسی کو اور اپنے گھر کے لوگوں کو اس کتاب کو پڑھ پڑھ کر سنایا کریں، اور قصہ کہانی کی جگہ اس حدیث نبوی کا بیان کریں، کیونکہ قصہ کہانی میں بادشاہ یا شاہزادوں کا عاشق معشوقوں کا حال سُن[2] کے آدمی کا دل بھٹکتا ہے، اور حضرت کی صورت شکل اور سب احوال باکمال کے بیان سے آدمی دین کی راہ پاجاتا ہے، اور یہ کتاب جب کسی کو سُنایا چاہیں تو پہلے متن حدیث کا پڑھ جادیں اور اس کے بعد معنی اور شرح پڑھیں۔ (دیباچہ)

اس عبارت سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) عام طور پر عوام تو عوام علما اور خواص میں بھی حدیث نبوی کا علمی و عملی اعتبار سے چرچا نہیں تھا۔

(۲) عام طور پر اردو زبان میں قصہ کہانی کی کتابیں ملتی تھیں، اور اسی کا لوگ مطالعہ کرتے تھے۔

(۳) عمومی خیر خواہی کے جذبہ سے انھوں نے اس مستند کتاب کا سیدھی ہندی میں ترجمہ کیا، تاکہ لوگوں کا سطحی ذوق بھی بدلے اور حدیث نبوی کا رواج ہو۔

(۴) مولانا نے اردو کو جو اس وقت عام طور پر ہندی کہی جاتی تھی، ہندی ہی کہا ہے، البتہ مفتاح الجنۃ کے ناشر نے اسے 'اردوئے معلیٰ' کہا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں نام رواج پذیر تھے۔ مگر عام طور پر

---

[1] یعنی بیٹھنے۔ [2] شمائل کے دیباچہ میں کے کو یائے معروف سے لکھا ہے، لیکن ہم نے نقل میں اس املے کی پابندی نہیں کی ہے۔

جو زبان بول چال کے لیے استعمال ہوتی تھی اسے ہندی کہتے تھے اور تحریر کے لیے اردوئے معلیٰ استعمال ہوتی تھی یا عوام اسے ہندی کہتے تھے اور خواص اردوئے معلیٰ لقب سے اُسے یاد کیا کرتے تھے۔

ترجمہ کی زبان کسی زبان کے لٹریچر یا معیاری کتابوں کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بذات خود ایک دشوار کام ہے، پھر ایسی زبان میں اس کا ترجمہ کرنا تو اور زیادہ دشوار ہے جس کی ابھی نشو ونما ہو رہی ہو، نہ وہ ابھی علمی زبان بن سکی ہو، اور نہ اس میں نثر کا کوئی ادبی سرمایہ ہو، آج سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے اردو زبان کا سارا سرمایہ شاعری تھا، یا نثر کی چند کتابیں، جو زیادہ تر صحافتی یا جذباتی انداز کی تھیں، یا پھر قصہ کہانی کی، نثر کے اعتبار سے اُردو زبان نہ تو ابھی تک علمی زبان بنی تھی، اور نہ اس میں علمی کتابیں تصنیف ہوئی تھیں، اس لیے اس زبان میں شمائل ترمذی کا ترجمہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، صحابہ کرام نے شمائل نبوی اور سراپائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جن جامع الفاظ اور فقروں میں تصویر کشی کی ہے، وہ عربی ادب کا شاہکار ہیں، اُن کے ایک ایک فقرے پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے گئے ہیں، اس لیے اردو زبان میں جو نثر کے اعتبار سے ابتدائی دور میں تھی، ان کا بامحاورہ ترجمہ کرنا آسان کام نہیں تھا، خود مولانا کو اس وقت کا احساس تھا، لکھتے ہیں۔

> اور اس ترجمہ کو اپنی طاقت اور فہم کے موافق بہت سیدھی اور آسان ہندی زبان میں اور لغت کی تحقیق بہت بڑی محنت کے ساتھ کر کے ترجمہ ٹھیک ٹھیک کر دیا، اور بعضے مقام میں ہندی کا محاورہ درست ہونے کے لیے معنی میں تقدیم و تاخیر کرنا ضرور پڑا، نہیں تو مضمون ہی سمجھنا مشکل ہو جاتا کیونکہ ہر ملک کا محاورہ اپنے اپنے ڈول پر ہوتا۔ (دیباچہ)

اس کتاب کے ذریعہ نہ صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل کی ترویج ہوئی، بلکہ اُس نے اُردو زبان کو بھی غیر معمولی فائدہ پہنچایا، سرورِ کائنات کی ذات سے مسلمانوں کو جو محبت و شیفتگی ہے، اس کے نتیجہ میں یہ کتاب عوام اور خواص دونوں میں بار بار پڑھی گئی، خود مولانا کے متوسلین کا سلسلہ سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا، اور جن کی تعداد ہزاروں سے نکل کر، لاکھوں تک پہنچ گئی تھی، انھوں نے اسے گھر گھر پہنچایا ہوگا، مولانا خود بھی اس کے پڑھنے کی تاکید بار بار کرتے تھے، اوپر اُن کی عبارت نقل کی جا چکی ہے۔ کتاب کے اخیر میں عام مسلمانوں اور اپنے متوسلین کو ان الفاظ میں اس کے پڑھنے اور پڑھانے کی ہدایت کرتے ہیں۔

ان سب مسلمان بھائیوں کی خدمت میں التماس اور اپنی اولاد اور مریدین کو وصیت ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے کو دوسرے کاموں پر مقدم جانیں، اور جب کوئی مشکل پیش آئے، اس کتاب کو تمام پڑھ جاویں، انشاء اللہ مشکل آسان ہو جائے گی۔ (ص ۷۷۴)

اس طرح اس کے ذریعہ حدیث نبوی اور اردو زبان دونوں کا ذوق ہندوستان میں عام ہوا، خود ہندو شعراء نے حمد و نعت میں جو کچھ لکھا ہے، وہ زیادہ تر اسی طرح کی اردو کتابوں سے ماخوذ ہے۔

اب مولانا کے ترجمے اور ان کی شرح کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ مولانا نے مشکل ترین الفاظ اور فقروں اور محاوروں کا کتنا سلیس، شستہ اور معنی خیز ترجمہ کیا ہے اور کتنی آسان زبان میں اس کی شرح کی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آپ کے قد مبارک اور چہرۂ انور کے رنگ و روغن کا ذکر دو چار لفظوں میں کیا ہے، مگر ان سے آپ کا پورا سراپا نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

کان رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھے بہت لانبے
وَسلم لیس بالطویل البائن ولا	اور نہ بہت چھوٹے، اور نہ بہت گورے چٹے
بالقصیر ولا بالابیض الامہق ولا بالادم	اور نہ تھے گندم رنگ سیاہی مائل۔

بائن کو اگر بیان بمعنی ظاہر سے مشتق مانا جائے۔ تو معنی یہ ہوں گے، کہ آپ کا قد لانبا تھا، مگر لمبائی بے ڈول نہیں تھی، یا یوں بمعنی بُعد سے مُشتق مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے، کہ لمبائی حد اعتدال سے آگے بڑھی ہوئی نہ تھی، مولانا نے اپنے ترجمہ میں اس کی پوری رعایت کی ہے۔

اسی طرح امہق اس شخص کو کہتے ہیں، جو بہت زیادہ گورا چٹا ہو، مگر اس کے چہرے پر سرخی اور رونق نہ ہو، مگر آپ کی گورائی ایسی نہیں تھی، بلکہ اس میں ہلکی سی سرخی اور رونق تھی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کان شدید البیاض خوب گورے چٹے تھے، اور حضرت ابو الطفیل کی روایت میں ماانسی شدۃ بیاض وجہہ آپ کے چہرے کے گورے پن کی زیادتی کو میں بھول نہیں سکتا، کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

محدثین نے شدۃ بیاض کی تشریح بریق ولمعان کے لفظ سے کی ہے، چنانچہ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ

کانّ الشمس تجری فی وجہہ — گویا آپ کے چہرے پر سورج جیسی روشنی یا رونق تھی۔

اسی طرح لفظ ادم ہے' اسے سیاہی مائل گندم گوں رنگ کے لیے بولتے ہیں' تو آپ کا رنگ گندم گوں تھا مگر سیاہی کے بجائے سفیدی مائل تھا' اسی کو اسمر اللون بھی کہتے ہیں۔

چنانچہ بیہقی کی روایت میں ہے' کہ

کان ابیض بیاضہ الی السمرۃ۔ — آپ گورے تھے اور گورائی گندم گونی کی طرف مائل تھی۔

یعنی آپ کا رنگ سرخی مائل' پختہ' گندم گوں تھا۔

اس تفصیل کو سامنے رکھ کر' پھر مولانا کے ترجمہ کی فصاحت پر غور کیجئے' انھوں نے اپنے ترجمہ میں سب کی رعایت رکھی ہے' گورا چٹا ہونا خوبی ہے' مگر بہت زیادہ گورا چٹا ہونا قدرے عیب ہے' اس لیے "ولا الامہق" کے ترجمہ میں مولانا نے "نہ تھے بہت گورے چٹے" لکھا ہے جو بہترین ترجمانی ہے۔

اسی طرح حضرت انس کی دوسری روایت ہے کہ

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ربعۃ ولیس بالطویل ولا بالقصیر حسن الجسم وکان شعرہ لیس بجعد وسبط اسمر اللون اذا مشی یتکفأ۔ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قد مبارک بلندی مائل تھا' نہ بہت لانبے تھے اور نہ بہت چھوٹے' بہت پیارا تھا جسم حضرت کا اور تھا حضرت کا بال ایسا کہ نہ تو اس میں بہت پیچ تھے' اور نہ بہت سیدھا سفید سرخی مائل رنگ تھا' حضرت کا' اور جب چلتے تھے تو ایسا لگتا کہ آگے جھکا چاہتے ہیں۔

اس میں اسمر اللون کی تشریح تو آچکی ہے' بقیہ الفاظ ربعہ' جعد' سبط اور یتکفأ کا ترجمہ مولانا نے جو کیا ہے اس سے بہتر ترجمہ کرنا مشکل ہے' خاص طور پر حسن الجسم کا ترجمہ' بہت پیارا جسم تھا حضرت کا' فصیح ترین ترجمہ ہے' اس کے مفہوم میں اعضاء کا تناسب اور جسم کی معتدل اور متوازن ساخت سب شامل ہے' جسے مولانا نے دو جملوں میں ادا کر دیا' اسی طرح یتکفأ کی تشریح حضرت علی نے یہ فرمائی۔

اذا مشی تکفأ تکفوأ — جب راہ چلتے تو آگے کو جھکے لگتے' بھلا لگتا۔

کانما ینحط من صبب — وہ جھکتے گویا کہ اونچے سے نیچے کو اترتے تھے۔

مولانا نے اپنے ترجمہ میں اس پوری تشریح کی رعایت رکھی ہو، پھر تکفؤا لمفعول مطلق ہو اس کا ترجمہ "بھلا لگتا وہ جھکنا" بھی لاجواب ترجمہ ہو۔

حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلاً مربوعاً بعید ما بین المنکبین۔ — اور تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے کہ ان کے بال میں انداز کی شکن تھی نہ بلندی مائل تھا اور تھوڑا ہی سا فرق تھا دونوں مونڈھوں کے بیچ۔

لفظ رَجِل ج پر پیش، زبر اور زیر تینوں حرکتوں کے ساتھ آتا ہو، اس لفظ سے آپ کے بال کی صفت بیان کی گئی ہو جس کے بال نہ بالکل کھڑے ہوں اور نہ گھونگھر والے، بلکہ تھوڑی شکن ہو، اس کو شعر رجل بولتے ہیں، اس کا کتنا اچھا ترجمہ مولانا نے "انداز کی شکن تھی" کیا ہو، ربعہ کا لفظ پہلے آچکا ہو اسی معنی میں مربوعاً بھی ہو، آخری جملہ بعید ما بین المنکبین پر مولانا نے ایک حاشیہ لکھا ہو، جس سے ان کے ذہن اور قلم دونوں کی صفائی کا اندازہ ہوتا ہو

"یعنی پر گوشت بدن تھا، اس لیے پیٹھ کی نالی کم تھی"

یعنی جب یہاں جب بُعَید بائے مضموم عین مفتوح پڑھیں اور بَعِید کی با مفتوح اور عین کو مکسور پڑھیں گے تب یہ معنی ہوں گے، "فرق تھا درمیان دونوں مونڈھوں کے، یعنی سینۂ مبارک چوڑا تھا اور یہ صحیح ہو۔"

اسی طرح بعض راویوں نے وفات کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ساٹھ برس اور بعض نے پینسٹھ اور اکثر نے ترسٹھ بتائی ہو۔ کتاب میں ساٹھ والی روایت نقل کرنے کے بعد عام روایتوں میں اس طرح تطبیق دیتے ہیں۔ " دوسری حدیث میں جو ترسٹھ برس کی روایت ہو اور اس میں ساٹھ ہو، سو یہ وجہ ہو کہ حضرت ربیع الاول میں پیدا ہوئے، اور اسی میں ہجرت کی، اور اسی میں وفات ہوئی، سو راوی نے پورے برس کو شمار کیا، اور کھونٹے برس کو چھوڑ دیا، اور جس میں پینسٹھ برس کی روایت ہو سو اس میں راوی نے ترسٹھ کو اصل سمجھ کر دو برس ولادت اور وفات کے بھی ملا دیے، اور حقیقت میں حضرت کی عمر ترسٹھ برس کی تھی۔ (ص ۲۴)

مثالوں کو طول دینا مناسب نہیں ہو مگر ان کی تحریریں قدیم اردو کا ایک اچھا نمونہ بھی ہیں، اور ان میں مولانا نے جس محققانہ اور عالمانہ انداز میں مختلف احادیث نبوی کی تطبیق دی ہو اور ان میں جو متوازن رائے دی ہو، وہ

افادیت سے خالی نہیں ہے، اس لیے ان کی تحریر کے دو تین اور نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

مہر نبوت کا ذکر کرتے ہوئے ایک صحابی نے بیان کیا، کہ میں نے مُہر نبوت کی جگہ شل جمع کے دیکھا مولانا نے جمع کا ترجمہ چٹکی بھر کیا ہے، پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

جُمع بضم جیم و سکون میم کہتے ہیں۔ اس صورت کو جو انگلیاں مُوڑنے میں حاصل ہوتی ہے اس کو ہندی میں کہتے ہیں چٹکی بھر، فلانی چیز چٹکی بھر ہے۔ (ص ۴۸)

آپ کے بالوں کے خضاب کے بارے میں حضرت انس رضؓ سے کسی نے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ آپ خضاب کی عمر کو پہنچے ہی نہ تھے۔ صرف کنپٹی میں چند بال سفید تھے۔ اس میں لفظ کان شیئاً فی صدغیہ" آیا ہے، اس پر مولانا لکھتے ہیں۔

چند بال کنپٹی میں سفید ہوئے تھے، صدغ اُس عضو کا نام ہے جو آنکھ اور کان کے بیچ میں ہے اسکی ہندی کنپٹی ہے (ص ۵۲)

پھر اسی باب کے سلسلہ میں یہ بھی ذکر آتا ہے کہ جب آپ تیل استعمال فرماتے تھے، تو آپ کے سفید بال نظر نہیں آتے تھے، اور جب تیل استعمال نہیں فرماتے تھے، تو وہ نظر آتے تھے۔

واذا دھن راسہ، لم یُرمنہ شیب فاذا لم یدھن رأی منہ

مولانا اس کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس کی یہ وجہ ہے کہ تیل لگانے میں سب بال تتر بتر[1] جاتے ہیں، چھترے نہیں رہتے، تو سفید بال جس کے تھوڑا ہوتا ہے سیاہی میں چھپ جاتا ہے اور بعضوں نے کہا کہ تیل لگانے سے بال چمکتا ہے، سو چمک کے سبب سے سفید بال نظر نہیں آتے۔

آخر میں ہم مولانا کی تحریر کا ایک لمبا اقتباس نقل کرنے کے بعد اس سلسلہ کو ختم کرتے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مطالبہ میراث پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "لا نورث ما ترکنا صدقۃ" کی روشنی میں جواب دیا تھا، اسی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] اردو میں اس لفظ کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے۔ تتر بتر اور تر بتر، یہاں دوسرے معنی میں مستعمل ہے۔

یعنی نبی لوگ کے مرنے کے بعد میراث نہیں تقسیم ہوتی ہے، اور نبی لوگ کی میراث تقسیم نہ ہونے میں یہ حکمت ہے، کہ اُن کے وارث لوگ اُن کے مرنے کی کہیں آرزو نہ کریں تو ہلاک ہو جائیں، اور دوسرے یہ کہ آدمی یہ شبہ انبیاء کے حق میں نہ کریں، کہ ان کو دنیا کے مال کی خواہش تھی، ان کا سب مال اللہ کا ہے، دنیا کا ہوتا تو تقسیم ہوتا، اور جو قرآن میں بعضے نبیوں کے وارث ہونے کا ذکر ہے، جس طرح مذکور ہے کہ وارث ہوئے داؤد کے سلیمان، تو وہاں مراد علم اور نبوت کی میراث ہے۔ چنانچہ حضرت نے اس کی تفسیر بخوبی فرمایا ہے، مشکوٰۃ میں کتاب العلم کی دوسری فصل میں کثیر بن قیس سے جو حدیث بہت طول روایت سے ہے اسی حدیث میں یہ مضمون بھی ہے، کہ بے شک نبی لوگوں نے وارث نہیں کیا ہے کسی کو دینار اور درہم کا اور میراث نہیں چھوڑا، نبیوں نے سوائے علم کے، سو جس نے علم حاصل کیا ہے، اُس نے پورا حصہ پایا، حضرت صدیق نے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا وہ عرض کر دیا۔ پھر حضرت فاطمہ نے کچھ عذر نہ کیا، ان لوگوں کا دستور تھا، کہ جب حضرت کے فرمان کو سنتے، بلا عذر مان لیتے پھر حجت اور تکرار نہ کرتے۔ اب جو لوگ حضرت صدیق اور حضرت فاطمہ سے فدک کے معاملہ میں کچھ جھگڑا کریں، وہ حضرت فاطمہ کی بزرگی اور علم کے منکر ہیں، اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ، حضرت عمرؓ کے پاس بحث کرتے ہوئے تشریف لائے، انھوں نے حدیث سُنا دیا، بس فراغت ہو گئی، اس کا ذکر آگے آتا ہے (دیکھو ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۴)

انیسویں صدی کا اسلوب تحریر

انیسویں صدی کے نصف آخر کے کچھ پہلے اور اُس کے کچھ بعد کے مصنفین کے زمانہ کو نثر اردو کا چوتھا دور قرار دیا جاتا ہے، یعنی سنہ ۱۸۳۰ سے ۱۸۵۷ تک کا زمانہ، اسی دور میں غالب، امام بخش صہبائی، امانت لکھنوی، ماسٹر رام چندر، مفتی صدر الدین آزردہ وغیرہ پیدا ہوئے، اور اس دور سے کچھ پہلے دسنہ ۱۸۰۱ سے ۱۸۳۰ تک فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں میر امن، سید حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مظہر علی خاں ولا، نہال چند لاہوری، انشاء اللہ خاں انشا، مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب، مرزا کاظم علی جوان ہوئے ہیں، ان تمام لوگوں کا شمار اردو زبان کے ابتدائی معماروں میں ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے، مگر ان میں سے دو چار مصنفین کو چھوڑ کر ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے اُردو زبان کو کوئی سنجیدہ لٹریچر اور اچھا ادب دیا ہو، زیادہ تر لوگوں نے قصہ کہانی کی کتابیں لکھیں یا ترجمہ کیں، اس سے اُردو زبان کو اس حیثیت سے ضرور فائدہ ہوا، کہ اردو زبان عام ہوئی مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کے ذریعہ کوئی سنجیدہ لٹریچر پیدا نہیں ہوا، پھر یہ

بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ناول نگاری اور قصہ کہانی لکھنے میں قلم آزاد ہوتا ہے، اس لیے اس میں لفاظی، مبالغہ آمیزی، سخن طرازی اور دوسرے طریقوں سے عبارت میں زور پیدا کرنا آسان ہوتا ہے، مگر خالص علمی، اور مذہبی موضوعات میں قلم کو بہت سنبھالنا اور پابند رکھنا پڑتا ہے حتیٰ کہ تذکرہ جس میں معمولی زبان و بیان سے کام چل جاتا ہے، اس دور تک اُردو شعراء کے جتنے تذکرے لکھے گئے، وہ فارسی زبان میں لکھے گئے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ اردو شاعری نے تو کافی ترقی کرلی تھی، مگر انیسویں صدی کے نصف اول تک اردو نثر، شعراء کے تذکرے کے قابل بھی نہ تھی۔

مقصد یہ ہے کہ اس ساٹھ ستر برس کی مدت میں اردو زبان کے جتنے نمونے موجود ہیں، ان کو اگر سامنے رکھا جائے، تو مولانا کرامت علی کی زبان و بیان کی داد دینی پڑے گی، ان کی مذہبی کتابوں اور خاص طور پر شمائل ترمذی کے ترجمہ اور اس کی شرح میں سلاست روانی اور زبان کی صفائی کی جو خوبیاں موجود ہیں، اس عہد کی ناول و افسانہ اور طوطا مینا کہانی لکھنے والوں کی کتابوں میں اس سے زیادہ خوبیاں نہیں ہیں، بلکہ بعض بہت گھٹیا نمونے ہیں، مگر افسوس ہے مولانا اور ان کے دوسرے معاصر علماء کی اردو نثر کی خدمات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور ان کا شمار اُردو کے نثر کے معماروں میں نہیں کیا گیا۔

ہم اس دور کے تمام قابل ذکر مصنفین کی تحریروں کے بہت سے نمونے ان کی کتابوں سے جمع کر کے مولانا کی تحریروں سے ان کا موازنہ کرنا چاہتے تھے، مگر یہ مضمون اس وقت الفرقان میں شائع ہو رہا ہے اور یہ چیز اس کے مزاج سے زیادہ میل نہیں کھاتی، اس لیے اسے کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

مضمون کی یہ آخری قسط تھی مگر صاحب مضمون نے اس ماہ چند صفحات اور ارسال فرمائے ہیں جن میں کچھ استدراک ہے، کچھ وضاحت اور کچھ نئی چیزیں جو مضمون نگار کو بعد میں حاصل ہو سکیں ان میں خاص چیز حضرت سید احمد شہیدؒ کا خلافت نامہ ہے جو مولانا کرامت علی صاحب کو عطا فرمایا گیا　　یہ مزید صفحات ان شاء اللہ آئندہ اشاعت میں ہدیہ ناظرین کیے جائیں گے۔

(مرتب)

نئی مطبوعات

دین الٰہی اور اس کا پس منظر از ڈاکٹر محمد اسلم استاذ شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی
سائز ۱۸×۲۲/۸ صفحات ۲۵۷ مجلد قیمت ۵۰/-
ناشر:—— ندوۃ المصنفین۔ سمن آباد۔ لاہور (پاکستان)

فروری، مارچ اور اپریل ۱۹۶۹ء کے شماروں میں شائع ہونے والا ایک مقالہ "اکبر کا دین الٰہی اور اُس کا پس منظر" ناظرین الفرقان کو شاید یاد ہوگا۔ اس موضوع پر کچھ نئے انکشافات اور تحقیقی انداز کا حامل ہونے کی بنا پر ایک پاکستانی ماہنامہ سے اسے الفرقان میں نقل کیا گیا تھا، پیش نظر کتاب اسی مقالہ کی توسیع ہے، اور کسی "نقش ثانی" کے بارے میں جو بھی توقع "نقش اول" سے "بہتر" ہونے کی جا سکتی ہے اُسے پورا کرنے میں یقیناً کوئی کسر "نقاش" نے نہیں چھوڑی ہے۔ اکبری دین الٰہی کے موضوع پر اس درجہ کی کوئی دوسری کتاب کم از کم ہمارے علم میں اب تک نہیں ہے۔

مغل شہنشاہ اکبر کے نوایجاد دین و مذہب اور اسلام کے بارے میں اُس کی معاندانہ روش پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اصلاً ملا عبدالقادر بدایونی کے بیانات کی روشنی میں لکھا گیا ہے، پیش نظر کتاب کا بنیادی ماخذ بھی بدایونی کی "منتخب التواریخ" ہی ہے لیکن بدایونی کے بیانات کی تائید اور اُس کے اشاروں کی تفصیل میں اتنے معاصر تاریخی حوالے مصنف نے بہم پہنچا دیئے ہیں کہ اب بدایونی کی تکذیب یا اس پر اعتماد میں تردد کی بات کسی کے لیے آسان نہیں رہ جاتی۔

مصنف کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے "دین الٰہی" کی تشکیل میں کام کرنے والے عوامل کی جستجو اور اس فساد کے سرچشموں کا سراغ لگانے میں تاریخ کے دفتر کھنگال ڈالے ہیں۔ اور اس

محنت کے صلے میں، جس کے ساتھ ان کی نکتہ شناسی اور تہہ بینی کی خداداد صلاحیت بھی شامل تھی، وہ بہت سے ایسے عوامل کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دینے میں جن پر مزید دلائل و شواہد کی احتیاج تھی اور معاملہ کے کئی ایسے رخوں سے پردہ اٹھانے میں جن تک نگاہیں ابھی نہیں گئی تھیں، کامیاب ہوئے ہیں۔

اکبر کو بگاڑنے اور اس کے "دین الٰہی" کے خط و خال بنانے میں جن جن عوامل نے حصہ لیا، اُن پر مصنف نے حسب ذیل عنوانات کے تحت گفتگو کی ہے۔

۱۔ علمائے سوء ۲۔ صوفیائے خام ۳۔ شیخ مبارک کا منصوبہ ۴۔ اکبر اور ہندو ۵۔ بھگتی تحریک اور اکبر ۶۔ اکبر اور جینی ۷۔ پارسی اور اکبر ۸۔ اکبر اور عیسائی ۹۔ نقطوی تحریک اور اکبر۔

ان مباحث میں صوفیائے خام، شیخ مبارک کا منصوبہ اور ایران کی نقطوی تحریک سے اکبر کا رشتہ، ان تین کو اس کتاب کی جان کہا جا سکتا ہے۔ تصوف کے نام سے اس دور میں لوگوں نے دین پر کیا آفت ڈھا رکھی تھی؟ مصنف نے اس مسئلہ پر اردو داں طبقہ کی معلومات میں کافی اضافہ کا سامان بہم پہنچایا ہے اور اس کے ذریعہ اس بگڑے ہوئے تصوف کی خرافات کا بہت صاف عکس اکبری "دین الٰہی" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ابوالفضل اور فیضی کا باپ مُلّا مبارک اکبر کے بگاڑنے میں ایک اہم ترین عامل کی حیثیت سے مشہور و معروف شخصیت ہے۔ مصنف نے اس کے ذہن، اس کے مزاج اور سابقہ زندگی کا پوسٹ مارٹم کر کے یہ خیال پیش کیا ہے کہ وہ ایک آزاد مشرب شیعہ تھا۔ اور اُس کے تیار کردہ محضر کے پیچھے اکبر کو "امام آخر الزماں" بنانے کا منصوبہ کام کر رہا تھا۔ مصنف نے اپنے اس نظریہ کو بہت شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اُن کے دلائل ناقابل انکار نہ بھی مانے جائیں تب بھی وزنی اور قابل لحاظ یقیناً ماننا ہوں گے۔ اسی ضمن میں ابوالفضل اور فیضی کے بارے میں بھی مصنف کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ اپنے باپ کے مسلک پر تھے۔ اور اس معاملہ میں بھی اُن کے دلائل کے وزن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دین الٰہی کی تشکیل میں، ہر چند کہ مختلف عوامل کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور خود اس کتاب میں ان سب سے بحث ہے، مگر "اکبر اور نقطوی تحریک" کے عنوان سے جو تحقیق ہمارے مصنف نے پیش کی ہے وہ اس معاملہ کے گویا اصل عامل کی نشاندہی ہے۔ اور ہے بھی اتنی مضبوط بنیادوں پر کہ اس میں قیل و قال کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اس دور کے

عہ اس میں سے آخر الذکر بحث بھی الفرقان بابتہ ماہ میں شائع ہو چکی ہے

کے ہندوستان میں مسلمانوں میں سے ایسے لوگ سامنے آنے لگے ہیں جو اکبر اور ابوالفضل وغیرہ کے دفاع میں الحاد اور بد دینی کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ صرف مذہبی رواداری کی ایک سیاسی پالیسی تھی۔ الحاد و بے دینی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ہمارا اشارہ ان ہی لوگوں کی طرف ہے کہ اس کتاب کی "اکبر اور نقطوی تحریک" والی بحث نے ان کے قیل و قال کی گنجائش ختم کر دی ہے۔ ایران کے محمود پسیخوانی کی "نقطوی تحریک" قطعی طور پر ایک ملحدانہ تحریک تھی، اُس کا آغاز ہی خدا سے محمود کی اس طرح کی "ناراضگی" سے ہوا تھا۔ جیسے ابلیس نے ناراض ہو کر بیڑا اٹھایا کہ وہ اپنی بقیہ زندگی بنی آدم کو خدا سے دور کرنے میں صرف کرے گا۔ مصنف نے ایک صاف تاریخی حقیقت کے طور پر دکھایا ہے کہ اکبر اور ابوالفضل سے اس تحریک کا کیسا کھلا ہوا رشتہ قائم ہو گیا تھا، اور پھر نقطویوں کے افکار و عقائد اور "دین الٰہی" کے احکام و عقائد میں موازنہ کر کے دوسری بات یہ دکھائی ہے کہ ان دونوں میں کس درجہ یگانگت پائی جاتی ہے۔

مصنف کی محنت اور اس محنت کی کامیابی کے بارے میں ان احساسات کے ساتھ چند باتیں انھیں توجہ دلانے کے قابل بھی نظر آتی ہیں۔

۱۔ کتاب میں سب سے بڑی کمی یہ محسوس ہوتی ہے کہ واقعات کے بیان میں سنین درج کرنے کا التزام نہیں ہے۔ مثلاً ملا مبارک کس سنہ میں اکبر کے یہاں پہنچا؟ شریف آملی کی رسائی دربار اکبری میں کب ہوئی؟ دکن کا برہمن بھاون کب مسلمان ہو کر بادشاہ کا مقرب بنا؟ ایسے بہت سے مواقع پر یہ جاننے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اکبر پر پڑنے والے اثرات کی ترتیب کیا تھی اور مصنف کے بیان میں ان اثرات کی جو تقدیم و تاخیر اور ایک پر دوسرے کے مبنی ہونے کی جو کیفیت نظر آتی ہے کیا وہ ان واقعات کی واقعی ترتیب کے لحاظ سے بھی صحیح ہے۔

۲۔ مسئلہ کی تنقیح کا بہت کافی سامان کتاب میں ہونے کے باوجود یہ بات صاف نہیں ہوئی کہ اکبر واقعۃً ان باتوں کا قائل ہو گیا تھا جن سے دین الٰہی عبارت تھا، یا محض آزادی و بے قیدی کی خاطر ایک مستقل مذہبی پیشوا بننے کا سوانگ رچانے کے لیے یہ باتیں اُس نے اپنا دین قرار دے لی تھیں جن کی مقبولیت کے لیے اُس وقت کا ماحول بہت سازگار تھا؟ فاضل مصنف کہیں یہ کہہ جاتے ہیں کہ اُس نے دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنے لیے بھی موقع پا کر یہ سوانگ بھرا اور کہیں ایسا ظاہر کرتے ہیں جیسے وہ مختلف اثرات کے تحت سنجیدگی سے ان خرافات کو قبول کر بیٹھا ہو۔ یہ دونوں طرح کی باتیں اتنی جگہ آئی ہیں کہ کسی حوالہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ علیٰ ہذا کہیں

سے کتاب یہ تاثر دیتی ہو بلکہ واضح طور سے بتاتی ہو کہ اکبر ابتدا میں بہت راسخ العقیدہ مسلمان اور علماء و مشائخ کے لیے ادب و احترام کے سچے جذبات رکھنے والا تھا لیکن علماءِ سوء کی حرکتوں نے اُسے دین اور اہلِ دین سے متنفر کر دیا۔ اور کہیں اس تاثر کی گنجائش بھی نکل آتی ہو کہ اُس کے اندر تبدیلی پہلے آ گئی تھی علماءِ سوء کی حرکتوں سے اُس نے اپنی نئی روش کے لیے جواز فراہم کرنے کا کام لیا۔ عبادت خانہ کے مباحثوں کے سلسلہ میں بدایونی کے حوالے سے ص۴۹ کا یہ بیان کہ مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری کو ان مباحثوں میں حصّہ لینے سے گریز تھا مگر "جب اکبر نے علماء کو دست و گریباں ہوتے ہوئے دیکھا تو مخدوم الملک کو محض تنگ کرنے کی غرض سے عبادت خانہ میں مدعو کیا۔" ہمارے خیال میں (یہ بیان) نہ صرف اتنے ہی تاثر کی گنجائش دیتا ہو بلکہ یہ بھی کہ جو عالم کسی مزلّت کے موقع سے گریزاں رہنا چاہتا تھا۔ اکبر اُسے بھی گھیر کر وہاں لانا چاہتا تھا تاکہ اُس سے بھی کوئی اونچ نیچ بہرحال سرزد ہو جائے۔ اور پھر وہ ایک سرے سے سب کو بے توقیر کر کے آسانی کے ساتھ اپنے راستہ سے ہٹا سکے۔ ہمارے اس خیال کی ایک طرح سے تائید اگلے ہی صفحہ پر مصنف کے اس اظہارِ رائے سے بھی ہوتی ہو کہ "اکبر اگر ابوالفضل حاجی ابراہیم سرہندی اور عبدالقادر بدایونی جیسے منہ زور مناظروں کی پیٹھ نہ ٹھونکتا تو عبادت خانے کے مباحثوں میں اتنی ناخوشگواری نہ پیدا ہوتی۔ اس لیے عبادت خانہ میں پیدا ہونے والی تمام بدمزگی کی ذمہ داری براہِ راست اکبر پر عائد ہوتی ہو" (ص۵۰)

۴۔ کتاب کے باب اوّل "اکبر کی ابتدائی مذہبی زندگی" سے معلوم ہوتا ہو کہ اکبر اپنی شروع زندگی میں ایک راسخ العقیدہ ہی نہیں بلکہ کٹر سُنّی حنفی مسلمان اور علماء و مشائخ کی صحبت کا دلدادہ تھا۔ لیکن پانچواں باب ("اکبر اور ہندو") یہ بتاتا ہو کہ "وہ بچپن ہی سے اُن کی (ہندوؤں کی۔ ع) طرف مائل تھا" اور پھر ہندو بیویوں کی "صحبت میں رہ کر" اُس نے ہندوؤں کی بہت سی رسومات اپنائی تھیں۔" اِن دونوں باتوں میں بظاہر تضاد ہو۔

۵۔ ص۱۱۹ پر بعض اکبری سکوں میں رام اور سیتا کی شبیہہ پائے جانے کے ذکر میں "رام کھڑا ہو" اور "سیتا کھڑی ہو" کا اندازِ گفتگو کسی لحاظ سے بھی اچھا نہیں لگتا۔ اسلام کی تعلیم بھی اس کے برعکس ہو۔

یہ چند باتیں جو تبصرہ نگاری کے فریضہ کے طور پر کہنا لازم ہوئی ہیں ان سے کتاب کی اصل قدر و قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اکبر کے مذہبی رُخ اور اُس کے اسباب و عوامل پر یہ کتاب بلاشبہ اردو لٹریچر میں ایک نادر اضافہ ہو۔ اور مصنف کا حق ہو کہ اُس پر اُنھیں جی کھول کر مبارکباد دی جائے۔

تبصرہ ختم ہوا۔ البتہ ایک دوستانہ گزارش مصنف کی خدمت میں اور ہو کہ مُلّا مبارک کی شیعت سے

متعلق بحث میں کچھ مناظرانہ رنگ آجانے پر گو انھوں نے پیشگی معذرت کرلی ہے۔ مگر یہ کہنا پھر بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ عقائد کے سلسلہ میں اتنی تفصیلات اس موقع پر لانے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ عقائد عموماً مسلمات اور معروفات میں سے ہیں جن کا ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش میں یہ مناظرانہ رنگ خواہ مخواہ آیا۔ یوں بھی جو مشرب ملّا مبارک کا مصنف کی تحقیق سے سامنے آتا ہے وہ اُسے کسی عقیدہ کا وفادار نہیں بتاتا ہے۔ اکبر کو شیعہ عقیدہ کے امام آخر الزماں کی قبا پہنانا خود ہی اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ پھر کیوں اُسے سچ مچ کا شیعہ بنا کر خواہ مخواہ شیعہ فرقہ کو اُس کی طرفداری پر آمادہ کیا جائے۔

تاریخی مقالات | یہ کتاب بھی ڈاکٹر محمد اسلم صاحب کی ہے اور پتہ بھی وہی ہے جو اوپر کی کتاب میں درج ہوا ۔ صفحات ۲۸۸ سائز وہی ۱۸×۲۲ مجلد قیمت ۵۰/۷

یہ مصنف کے چند متفرق تاریخی اور تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے جو گزشتہ چند برسوں میں ہندوستان اور پاکستان کے بعض علمی اور ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالے قرون وسطیٰ کی اسلامی دنیا کے تمدنی حالات مذہبی افکار، ثقافتی میلانات شعر و ادبی رجحانات اور بعض تاریخی مباحث پر اہل ذوق کے لیے مطالعہ کا ایک اچھا سامان فراہم کرتے ہیں۔ مزید اندازہ کے لیے مقالوں کی فہرست پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔

۱۔ کیا سلطان بلبن کی کوئی بیٹی حضرت بابا فرید الدین گنج شکر سے منسوب تھی؟
۲۔ فضل اللہ بن روزبہان اصفہانی اور اُن کا ایک نادر رسالہ۔
۳۔ مبلغ الرجال ۴۔ پیر محمد شاہ اور اُن کا نادر کتب خانہ ۵۔ شاہانہ مغلیہ کا ذوق موسیقی
۶۔ مسلمانوں کی جغرافیائی خدمات ۷۔ خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ ۸۔ فتوحات فیروز شاہی
۹۔ اسلامی ہندوستان میں سکوں پر شاعری ۱۰۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علما و مشائخ کا کردار
۱۱۔ مسجد قبا سے تاج محل تک ۱۲۔ مسلمانوں کی طبی خدمات ۱۳۔ داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد

نذرِ مقبول | مرتبہ: جناب خیر بہوروی ناشر: آل انڈیا شفیق میموریل سوسائٹی جونپور
سائز: ۱۸×۲۲ صفحات ۸۶۶ مجلد قیمت: ۳۰/-

نذرِ غالب، نذرِ عرشی اور نذرِ ذاکر کی طرح میں یہ نئی نذر اُن علمی، ادبی اور تاریخی مقالات کا مجموعہ

ہے جو شفیق میموریل سوسائٹی جونپور نے ادب نوازی کی پرانی نوابی یادوں کو تازہ کرنے والے ایک حوصلہ مند تجارت پیشہ رئیس جناب مقبول احمد لاری نم لکھنوی کے جشن پذیرائی کی تقریب منعقد کرنے کے لیے بہت سے اہلِ علم و ادب اور اربابِ نقد و نظر سے لکھوائے اور اس جشن کے موقع پر ایک ضخیم اور حسین و جمیل کتابی پیکر میں انھیں ڈھال کر ممدوح موصوف کی خدمت میں بطور خراج عقیدت و اعتراف ادب نوازی پیش کیا۔

تقریب کسی کے مذاق سے جیسی بھی ہو یہ چیز بڑے کام کی تیار ہو گئی ہے رسمیات کے اوراق چھوڑ کر جو ایسی تقریب سے شائع ہونے والی کتاب میں لابدی تھے "تقریباً" تمام ہی نگارشات ذوق افزا اور معلومات افزا ہیں اتنی کہ اپنی بھاری بھرکم ضخامت اور مقالوں کی بالعموم طوالت کے باوجود کتاب بار ذرا بھی نہیں ہوتی۔ یوں ہر موضوع ہر ایک کی دلچسپی کا نہیں ہوتا نہ ہر تحریر ہر مذاق سے جوڑ کھاتی ہے چنانچہ پروفیسر مسعود حسن رضوی جیسے نامور فاضل کا مقالہ "سلطان عالم واجد علی شاہ" تبصرہ نگار کے لیے اپنی ایسی ہی نوعیت اور اس پر مستزاد طوالت کے سبب ایسا ہی ثابت ہوا کہ باوجود کوشش کے اول سے آخر تک پڑھا نہ جا سکا مگر اس ایک کے سوا جو مضمون بھی پڑھنے میں آیا اُس کی علمی، ادبی یا تاریخی افادیت نے ایک ذائقہ ہی دیا۔ ہاں ایک مضمون جس سے گویا کچھ ہی نہ ملا وہ پروفیسر مجیب صاحب کا ہے۔ اور تعجب ہے کہ مقالہ کا تعلق موصوف کے خصوصی موضوع ...... سے ہوتے ہوئے یہ بالکل نیا تجربہ اُن کے بارے میں کیسے ہوا! کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ پروفیسر صاحب کہنا کیا چاہتے ہیں۔ ایک ایسا بے ربط اور ابہام پسند اندازِ اظہار جس کی ڈانڈے عجز بیان سے ملنے لگتے ہیں۔

"نذر" کو وقیع اور ایک رئیس ممدوح کے ہر طرح شایانِ شان بنانے کے لیے کاغذ اتنا اعلیٰ درجہ کا دبیز استعمال کیا گیا ہے کہ ہر صفحہ الٹتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ کہیں دو ورق تو نہیں جا رہے ہیں۔ ۸۰۰ سو صفحے کی ضخامت کوئی ایسی غیر معمولی نہیں ہوتی مگر اس ضخامت کے ساتھ اس درجہ بھاری بھرکم ہونے کا راز کہ اسے ایک غیر معمولی پن کے طور پر ہمیں ذکر میں لانا پڑا، کاغذ کی اسی دبازت میں پوشیدہ ہے ــــ مقبول صاحب کی بھاری بھرکم جسامت بھی اگر نظر میں ہو تو نذر کی اس ضخامت میں ایک خاص موزونیت بھی نظر آنے لگتی ہے۔

اس شاندار نذر میں عیب بس دو نظر آئے۔ ایک جو صفحہ صفحہ پر بدمزہ کرتا ہے کتابت کی انتہائی غلطیاں، دوسرا فہرست مضامین میں صفحات کا حوالہ نہ ہونا۔ اگر کہیں ہر صفحہ پر مضمون کا عنوان درج نہ ہوتا تب تو اتنی موٹی کتاب میں مضمون کی تلاش قیامت ہی ہو جاتی۔ ترتیبی صفحات کے بجائے ہر مقالہ کے اپنے مجموعی صفحات جو فہرست میں اُس کے آگے درج کیے گئے ہیں ان سے فائدہ تو کوئی نہیں البتہ ایک اُلجھاؤ بڑھ گیا ہے کہ آدمی ترتیبی صفحات کا دھوکہ شروع شروع میں ان سے کھاتا ہے ــ مولانا [illegible] جیسے تجربہ کار کے مرتب کردہ صحیفہ میں یہ دونوں ہی عیب بڑے حیرت انگیز ہیں۔

بقیہ اداریہ۔ ہمیں نہ تھی لیکن عملاً رویہ اگرچہ تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ہمارے طبقۂ علماء اور ہماری ایک خاص جماعت ہی کا ہے، مگر اس سے متاثر قریب قریب وہ سب ہی مسلمان ہیں جن تک انکا ہو خیالات کی لہریں پہنچتی ہیں اور نظام سے وہ متاثر نہیں ہیں، بلکہ تقسیم ہند سے قبل کی ہندو مسلم کشمکش نے ان کے ذہنوں کو جو رُخ دے دیا تھا اس میں خود ہی اس طرح کے رویہ سے ہم آہنگ ہو جانے کی بڑی صلاحیت تھی اس طرح یہ رویہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت کا رویہ بن گیا ہے اور پھر قدرتی طور سے اس کے دینی اور دنیوی اثرات و نتائج پوری قوم پر مرتب ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اس لیے قوم کے ہر فرد کا حق ہے کہ وہ اس بارے میں سوچے اور کوئی بھی اپنے اندر پائے تو اسے ظاہر کرے۔

ہماری نظر میں صرف یہی ایک ایسا رویہ نہیں ہے جس پر سنجیدگی سے بیٹھ کر سوچنے اور (ہماری رائے کے مطابق) اسے بدلنے کی ضرورت ہے بلکہ اور بھی کچھ معاملات میں جن پر ہمارا قومی رویہ اسی نوعیت کا ہے اور اس ملک میں حالات کی جس ناسازگاری سے ہم دوچار ہیں یا یوں کہیے کہ اس ناسازگاری کی جو اصلاح نہیں ہو پاتی اس میں بہت کافی دخل اس طرح کے رویوں کا بھی ہے۔ اگر خدا کو منظور ہوا اور صحت کی ناہمواری نے جازت دی تو ہم ان پر بھی کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ تحریر گویا اسی سلسلۂ خیالات کی پہلی کڑی ہے جس کے بارے میں یہ اور کہہ دینا چاہیے کہ کسی پر اعتراض بالکل مقصود نہیں ہے، صاحب تحریر خود ایک عرصہ تک

"صحبتے با اہل دل" کے قریباً چار سو عنوانات میں سے صرف ستر بطور نمونہ ذیل میں پڑھئے

قرآن سنجنت کو توڑتا ہے۔
نماز میں جی نہ لگنے کی وجہ
بڑھاپے کی شکایت کرنے والے کی مثال
بڑھاپے میں قفس کی تیلیاں کمزور ہوجاتی ہیں اس لیے طائر روح نکلنے کے لیے بیقرار ہوتا ہے۔
کسی بندہ میں کچھ نہیں سب اللہ کی طرف سے ہے
قبولیت دعا کا راز
سلاسل اربعہ کی تمثیل
تزکیہ اور نظر بندی کا فرق
عالم آخرت سے انس آشنائی کی ضرورت ہے
سلوک کبھی تمام نہیں ہوتا
مشائخ کی تقلید واتباع
انانیت کا کانٹا
بندگی سب سے اونچا مقام ہے
ہم اپنے نفس پر اللہ کی حکومت قائم نہ کرسکے تو دوسروں پر کیا کریں گے۔
اعمال غذا ہیں اور ورد و محبت چٹنی
القاء والہام کی کسوٹی قرآن وحدیث ہے
ائمہ کی تقلید وپیروی کی مثال
انگریزی پڑھ کر دیندار بننا عربی پڑھ کر بے دین بننے سے بہتر ہے۔
جامعہ اسلامیہ (مدینہ طیبہ) میں پڑھنے والے بعض طلبہ کا افسوسناک حال
دم درود میں کلام الٰہی کی تاثیر
بعض درختوں کی حلاوت پھل میں آجاتی ہے بعض مجسم پھل بن جاتے ہیں۔
ذکر کی جگہ خلوت نہیں جلوت ہے۔

شیخ اکبر کی ایک عبارت پر اشکال اور اس کا حل
کبھی عذاب کی شکل میں رحمت آتی ہے اور کبھی رحمت کی شکل میں عذاب
کسی کا دین دیکھنا ہو تو اس کی دنیا دیکھو
دین جب جاپانی ہوتا ہے تو دنیا سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتا ہے۔
جو اہل دل تقریر نہیں کرتے وہ سراپا فیض اور مجسم افادہ بن جاتے ہیں۔
شیخ سعدی کا تصوف
"روح" کی تفسیر اور اس کی بلیغ مثال
قرآن مجید کا بتایا ہوا تھرما میٹر
وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ کا بلیغ ترجمہ
اہل قبور کی حسرت
ولایت ذاتی ہے اور گناہ عارضی
شریعت طریقت پر ہر جگہ مقدم ہے۔
نقشبندیہ مکان بناتے ہیں سنوارتے ہیں چشتی اس کو کھود کر میدان کر دیتے ہیں
اہل نظر تخم میں پورا درخت دیکھ لیتے ہیں۔
قرآن ہر چیز سے مستغنی کر دیتا ہے۔
گم کردہ راہ صوفیہ
حضرت مجدد الف ثانی کا کارنامہ
گناہ اور سرکشی کا فرق
ہمارا اسلام شیخ سعدی کی انگوٹھی ہے
ایک بزرگ کی بے نفسی
کوئی شخص کمال سے خالی نہیں
شادیوں میں سب بلائے جاتے ہیں صرف خدا و رسول کو رخصت کر دیا جاتا ہے۔

ایک چیز ایک محل میں معصیت ہوتی ہے دوسرے محل میں عبادت
طریقہ نقشبندیہ کی ترجیح کے بارہ میں حضرت مجدد صاحب کے کلام کا مطلب
اصلاح و تربیت کے طریقوں میں فرق واختلافات کا سبب
قرآن میں ایسے کوڑے ہیں کہ پہاڑ بھی پاش پاش ہوجائیں۔
بابا تاج الدین یا خداوند قدوس
غیب کی آوازیں سننے کے لیے خاص کان درکار ہیں۔
قرآن کے ذریعہ قبروں کی آوازیں سنی جاسکتی ہیں۔
گنہگاروں ہی کی ضرورت ہے۔
بیعت وارادت کی حقیقت
موت رخصتی نہیں ہے آمد ہے
عبادت میں کیفیت اور اثر پیدا کرنے کا طریقہ
بڑھاپا روحانی جوش اور رعنائی کا زمانہ ہے
موت سے وحشت کوتاہ نظری ہے۔
عبرت وحسرت
قبر والے جیابی کروٹ رہے ہیں۔
فوز عظیم کا مدرسہ
شوق لقاء مولیٰ

صاحب ملفوظات رحؒ کا وصال

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

یہ کتاب مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کے لیے لکھی گئی ہے۔ ۴۰۰ صفحہ کی اس کتاب میں قرآن پاک کی ہدایات و تعلیمات کو کئی سو عنوانات کے تحت اس طرح مرتب کرکے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے مطالعہ سے اسلام کے برحق اور قرآن کے کتاب اللہ ہونے کا یقین بھی پیدا ہوتا ہے اور دل میں نور اور قرآنی ہدایت پر چلنے کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ مجلد ۵/- (انگریزی اور ہندی اڈیشن بھی زیر طبع ہے)۔

دین و شریعت

اس کو اچھے اچھے اصحاب نظر نے اس دور کی عظیم ترین کتاب کہا ہے اسلام کے پورے نظام عقائد و اعمال اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلامی تعلیمات پر ایسی جامع اور اس درجہ یقین آفریں شاید ہی کوئی دوسری کتاب ہو۔ انگریزی اور بعض دوسری زبانوں میں بھی شائع ہو چکی۔ قیمت ۵/۲۳ (انگریزی اڈیشن ۸/-)

اسلام کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو خاص تاثیر اور مقبولیت عطا فرمائی ہے؟ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، برمی، ہندی، گجراتی اور کنڑی وغیرہ بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کاغذ کتابت طباعت اعلیٰ۔ مجلد قیمت ۲/۵۰ انگریزی اڈیشن قیمت ۴/- ہندی اڈیشن قیمت ۴/۵۰

نماز کی حقیقت | نماز کی روح اور اس کی حقیقت سے واقفیت کے لیے اور اپنی نماز کو حقیقی نماز بنانے کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت ۱/۲۰

کلمہ طیبہ کی حقیقت | کلمہ شریف کی ایمان افروز تشریح ۵۰/-

برکات رمضان | رمضان اور روزہ کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی حضرت شاہ ولی اللہ کے طرز پر تشریح قیمت ۱/-

آپ حج کیسے کریں؟

حاجیوں کے لیے بہترین رہنما اور معلم جس کے مطالعہ سے حج کا طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ عاشقانہ جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے جو حج کی روح ہے۔ قیمت ۲/-

آسان حج | کم پڑھے لکھے حضرات کے لیے "آپ حج کیسے کریں" کا آسان زبان میں خلاصہ جیبی سائز ۸/-

سب سے پہلا سفرنامہ حج | دو سو سال پہلے ہندستان کے ایک صاحب دل عالم اور بزرگ نے پورے دو سال میں حج کا سفر کیا تھا۔ یہ سفرنامہ اُن کے اسی سفر عشق کی بڑی دل آویز اور نورانی روداد ہے۔ قیمت ۲/-

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ | الفرقان کے شہرۂ آفاق "مجدد الف ثانی نمبر" ۱۳۵۷ھ کا کتابی اڈیشن۔ قیمت ۵/-

مکتوبات خواجہ محمد معصوم نقشبندی | لفظ لفظ نور سے معمور — ۴/۵۰

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت | مجلد ۳/۵۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ | مجلد ۲/-

شاہ اسمٰعیل شہید پر اہل بدعت کے الزامات کی حقیقت ۱/-

فیصلہ کن مناظرہ | اکابر جماعت دیوبند پر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب۔ ۱/۵۰

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ ۵۰/-

اسلام و کفر کے حدود اور قادیانیت ۵۰/-

کتب خانہ الفرقان - کچہری روڈ لکھنؤ

الفرقان
لکھنؤ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

Regd No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 38 NO. 5 AUGUST 1970

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی ...... ۷۵ پیسے

جلد ۳۸ | بابت ماہ جمادی الاخری ۱۳۹۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۰ء | شمارہ (۶)

اگر اس دائرہ میں ( ) سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ ستمبر تک آجائے، ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجکر ہمیں براہ راست اس کی اطلاع بھی دیں۔ کیونکہ وی پی اب نہیں جا سکے گا لہٰذا ۲۰ ستمبر تک چندہ کی اطلاع نہ ملنے کی صورت میں ہم مجبور ہوں گے کہ رسالہ بھیجنا بند کر دیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔ جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نگاہِ اوّلیں

از ــــــــــــــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی

یہ خبر اب عام ہو چکی ہے کہ مسلم لیگ جو تقسیم ہند کے بعد جنوبی ہند میں سمٹ گئی تھی، اُس نے از سرِ نو آل انڈیا بن جانے اور ملک بھر میں جہاں جہاں ممکن ہو پھیل جانے کا فیصلہ کر لیا ہو ـــــ اس منصوبے کا آغاز دلّی اور یو، پی سے ہو بھی گیا ہو۔ ایک ایک کمیٹی دونوں علاقوں میں لیگ کی باقاعدہ تنظیم کے لیے بنا دی گئی ہے۔

یہ فیصلہ ان مقاصد کی رو سے کیسا ہو جن کے نام پر اُسے عمل میں لایا جا رہا ہو؟ یعنی مسلمانوں کے مسائل حل ہونے میں اس سے کہاں تک مدد ملے گی؟ اور ملے گی بھی یا نہیں ملے گی؟ اس رُخ سے نظر ڈالنا یہاں مقصود نہیں ہے بلکہ اس کے صرف اس پہلو پر ایک نگاہ ڈالنی ہے جو خاص طور پر یو، پی کو بھی اس (فیصلے) کے دائرے میں لیے جانے سے رونما ہوا ہو۔ یعنی یہ کہ ہمارے اہلِ سیاست کا کردار اور ملت کے لیے اُن کے خلوص کا دعوا کہاں تک قابلِ اعتماد ہو؟

یو، پی میں مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت "مسلم مجلس" پہلے سے قائم ہو۔ یہ اس مجلس مشاورت کی یو، پی شاخ کی باقاعدہ جانشین ہو جسکے حصہ داروں میں مسلم لیگ بھی روزِ اول سے شامل ہے اور اس وقت اس کے جنرل سکریٹری کا عہدہ بھی خود مسلم لیگ ہی کے جنرل سکریٹری کے پاس ہو۔ اس مسلم لیگ کے لیڈروں کو چند سال پہلے تک یو، پی میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ اولاً مسلم مجلس مشاورت کی بدولت، ملک کے دوسرے حصوں کی طرح یو، پی میں بھی کسی حد تک ان حضرات کا تعارف ہوا۔ اور بعد میں یہ صرف مسلم مجلس تھی جس نے ان کو یو، پی میں جگہ جگہ لے جا کر اچھی طرح روشناس کرایا۔ مجلس مشاورت کا پیغام یہ تھا اور ہے، کہ مسلمان یکجہتی اختیار کریں، نزاعات کو پس پشت ڈال دیں، نئے نزاعات کو سر اُٹھانے کا کوئی موقع اپنی صفوں میں نہ پیدا ہونے دیں، ان کی جماعتیں اتحاد و اشتراک کے میدان تلاش کریں، اختلافات انگیزی کے بجائے اتحاد پروری کو شعار بنا لیں ـــــ یہ پیغام مشاورت میں شامل کسی جماعت کو آسانی سے اس کی اجازت نہیں دیتا، کہ وہ اپنے حلیفوں ہی سے ٹکراؤ کا سامان پیدا کرے۔ اور کوئی بنائے

اختلاف کسی ناگزیر سبب سے پیدا بھی ہوتی ہو تو آخری حد تک اسے رفع کرنے کی کوشش کیے بغیر کوئی یکطرفہ قدم اُٹھا ڈالے۔ علاوہ ازیں اگر ان حلیف جماعتوں میں سے بعض کا بعض سے کوئی اس طرح کا تعلق ہو جیسا مسلم لیگ اور مسلم مجلس کے درمیان دیکھا گیا تو اس تعلق کا اخلاقی تقاضہ بھی ہو کہ جس نے فائدہ اٹھایا وہ فائدہ پہونچانے والے حلیف کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہ کرے جسے کم از کم بے مروتی ہی کا نام دینے پر دنیا مجبور ہو۔

مسلم مجلس کے کچھ نوجوان افراد اپنی لیڈرشپ سے ناراض ہوئے اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے خواہش کی کہ انھیں یو۔پی میں مسلم لیگ کے نام سے کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ مسلم مجلس کے قائدین کو اس سلسلہ جنبانی کا پتہ چلا تو انھوں نے مسلم لیگی قائدین سے اپنے تعلق کے اعتماد پر اور مجلس مشاورت سے دونوں کی وابستگی کی بنیاد پر بجا طور سے خواہش کی کہ اُن کے ناراض عنصر کی سلسلہ جنبانی کا حوصلہ افزا جواب نہ دیا جائے۔ مسلم لیگ کے قائدین نے ایک طرف اس نوجوان عنصر کی خواہش کو رد کرنے کے بجائے "زیر غور" کے خانہ میں ڈال کر اشارہ اگر نہیں تو حوصلہ ضرور دیا کہ وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ دوسری طرف مسلم مجلس کی قیادت کو لکھ دیا کہ یہ سرگرمیاں ہماری منظوری سے نہیں ہو رہی ہیں۔ اور اس طرح طرفین کو اُمید میں رکھتے ہوئے اتنا وقت لے لیا جس سے اندازہ ہو جائے کہ یو۔پی میں مسلم لیگ کے لیے کچھ اچھے امکانات ہیں یا نہیں۔ اور بس اس مرحلے کے پورا ہوتے ہی ایک دن یہ خبر آ گئی کہ مسلم لیگ نے بشمول یو۔پی ملک گیر پیمانہ پر اپنی شاخیں قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور پھر مسلم مجلس کے ناراض عنصر کو اجازت بھی مل گئی کہ وہ یو۔پی میں اس کارروائی کا باقاعدہ آغاز کرے۔

کوئی خوش گمان آدمی سوچ سکتا تھا کہ مسلم لیگ کے ہاتھوں کسی اور کو نہیں، مسلم مجلس کو، یہ چرکہ لگے گا؟ کوئی سوچ سکتا تھا کہ مجلس مشاورت کے شرکاء میں سے مسلم لیگ جیسی جماعت مشاورت کے پیغام کی اس طرح مٹی خراب کرے گی جس پر مشاورت کی خالی رکنیت ہی کی ذمہ داریاں نہیں، سکریٹری شپ کی بھی ذمہ داریاں ہیں؟ ـــــ مگر یہ سب ایسے ہوا جیسے عین ملّی فریضہ ہو! جیسے مشاورت کی رُوح یہی چاہتی ہو! جیسے کوئی ادنیٰ سی اخلاقی رکاوٹ بھی اس میں نہ ہو!۔

اب ایک نظر مسلم مجلس کے مخلصانہ کردار پر:-

مسلم لیگ والوں نے جو کچھ کیا وہ یقیناً قابل مذمت ہے۔ مسلم مجلس کے رہنما اس پر جتنے شاکی ہوں، بجا ہے، لیکن جس مسلم اتحاد کے نظریہ پر مسلم مجلس قائم ہوئی اُس کا عین تقاضہ ہے کہ اسی طرح کی تنظیم کسی ایک ریاست تک محدود نہ ہو، ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے کہ یہ تنظیم ملک گیر صورت اختیار کرے۔ مسلم لیگ نے طریقہ تو غلط اختیار کیا، مگر مقصدی اعتبار سے وہی کام کرنے کا ارادہ کیا ہے جس پر مسلم مجلس اور وہ، دونوں متفق تھے، چنانچہ مسلم مجلس کی ورکنگ کمیٹی نے مسلم لیگ کے اس اقدام پر جو تجویز مذمت پاس کی ہے، اس میں اصولی اعتبار سے کوئی ایک اعتراض بھی اس کارروائی پر نہیں کیا گیا، بنائے اعتراض صرف یہ ہے کہ اس سے مسلم لیگ اور مسلم مجلس کے درمیان "ٹکراؤ" ہوگا، لیکن یہ وہی صورت حال ہے جسے ایک صحیح مقصد کے لیے جائز رکھنے کا اصول خود مسلم مجلس کے رہنما بنا چکے ہیں۔ یہ اُس وقت ہوا جب یہ رہنما مسلم مجلس کے نہیں مسلم مجلس مشاورت کی صوبائی شاخ کے رہنما تھے، مرکزی مجلس مشاورت نے طے کیا تھا کہ ۶۷ء کے الیکشن میں بلا امتیاز پارٹی ایسے تمام اُمیدواروں کی حمایت کی جائے جو سیکولرزم کے حامی اور بلا تفریق تمام شہریوں کے یکساں حقوق کے قائل ہوں۔ یوپی مجلس مشاورت کے ان رہنماؤں نے کہا کہ الیکشن میں حصہ لینے کا جو اصل مقصد ہے وہ بغیر اس کے حاصل نہیں ہو سکتا کہ کانگریس کے اُمیدواروں کو ووٹ نہ دیا جائے، اس لیے خواہ کچھ بھی ہو ہم کانگریسی اُمیدواروں میں سے کسی کی حمایت نہیں کریں گے ـــ یہ رویہ دو الگ الگ مسلم جماعتوں کے ٹکراؤ کو دعوت دینے والا نہیں تھا بلکہ ایک ہی جماعت کو باہمی افتراق کی آگ میں ڈھکیلنے کے ہم معنی تھا۔ مسلم مجلس کے موجودہ قائدین کہتے تھے کہ ایک صحیح اور متفق علیہ مقصد کے لیے یہ سب کچھ ہمیں گوارا کرنا پڑے گا۔ مسلم لیگ کے قائدین آج بس وہی رویہ دُہرا رہے ہیں جس کی پشت پناہی بھی انھوں نے اُس وقت کی تھی! اب کیا مسلم مجلس کو اس پر کسی اعتراض کا حق حاصل ہے؟

مسلم مجلس کے یہ رہنما جو ۶۷ء میں یوپی مجلس مشاورت کے رہنما تھے، بضد تھے کہ مرکزی مجلس مشاورت اُن سے اتفاق کرے ورنہ اُن کا راستہ چھوڑ دے۔ مسلم لیگ کے قائد بھی یہی چاہتے ہیں کہ یا تو اُن سے انضمام کر لیا جائے ورنہ یوپی کے مسلم عوام پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ کس کو زیادہ مفید اور با معنی سمجھتے ہیں۔ مسلم لیگ خالص مسلم تنظیم اور خالص مسلم سیاست کی قائل ہے، مسلم مجلس اچھوتوں اور ہریجنوں کو بھی ساتھ لے کر چلنا چاہتی ہے۔ قاعدے سے اُسے کوئی حق نہیں ہے کہ ایک قدرے مختلف نظریہ رکھنے والی جماعت کے قیام کو بھی مسلم اتحاد میں رخنہ اندازی قرار دے، خاصکر جب وہ نظریہ بعینہ وہ ہے جس کے مطابق کام کرنے ہی میں "مسلمانوں کی نجات" کو مسلمانوں کا سیاسی عقیدہ بنانے کی کوشش میں کوئی دقیقہ مسلم مجلس کے قائدین نے اٹھا نہیں رکھا تھا اور آج بھی، جبکہ غیر مسلم پست اقوام کو ساتھ

لیکن علاوہ اس نجات کی ایک مزید شرط سمجھ رہے ہیں، یہ جرأت نہیں رکھتے کہ خالص مسلم تنظیم کو غلط کہہ دیں، تب تو اور بھی غلطیاں ہو کہ مسلم لیگ کے یوپی میں قیام کو یہاں کے مسلمانوں کیلئے مضر قرار دیا جائے۔ مسلم مجلس کے لیے مسلم لیگ سے اختلاف کا اگر کوئی راستہ ہے تو صرف یہ ہے کہ خالص مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے نظریے کو غلط قرار دیا جائے۔ یا آل انڈیا سطح پر مسلمانوں کی ایک ہی سیاسی تنظیم کے نظریے سے اختلاف کیا جائے۔ مسلم مجلس یہ دونوں کام نہیں کر سکتی، اس کے لیڈران دونوں ہی باتوں کے حق میں دلائل کا ایک انبار لگا کر اپنے ہاتھ کٹ چکے ہیں، چنانچہ وہ اپنی تجویز مذمت میں ایک حرف ان پہلوؤں سے نہ کہہ سکی لیکن اس کے بعد بھی اگر وہ یوپی میں مسلم لیگ قائم کیے جانے کو مذموم قرار دیتی ہے اور اپنے پیرؤوں کو تلقین کرتی ہے کہ اس کوشش کو ناکام بنا دیا جائے تو اس کے معنی سوائے اس کے کیا ہوتے ہیں کہ مسلم مجلس کے حامی بغیر کسی ایسے اختلاف کے جس کا تعلق عام مسلمانوں کے مفاد سے ہو مسلم لیگ کے حامیوں سے دست بہ گریبان ہو جائیں ــ اور یہ چیز ملت کے ساتھ جیسا خلوص ظاہر کرتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔

جو مسلمان اب تک نہیں سمجھے ہیں، انھیں شاید اب یہ سمجھنے کی ضرورت محسوس ہو کہ اب سیاست اُن کے مرض کی دوا نہیں ہے۔ سیاست ایک مقابلہ بازی کا کھیل ہے۔ اس میں نمایاں ہو کر آدمی ہر وہ کام کرنے کے لیے مجبور سا ہوتا ہے جس سے کم از کم اُس کی اور اُس کی پارٹی کی وہ جگہ بنی رہے جو بن چکی ہے۔ انڈین مسلم لیگ کے لیڈروں کو اس تذکرہ کردار ادا کرنے پر جس چیز نے مجبور کیا وہ یہی تھی کہ کیرلا اور کچھ مجموعی طور پر ملک کے نئے سیاسی حالات نے ان کی بقا کیلئے ضروری بنا دیا کہ کیرلا سے باہر بھی اپنی طاقت بنائیں، چنانچہ تمام ذمہ داریاں اور تمام اخلاقی تقاضے انھوں نے اس ضرورت پر قربان کر دیے۔ علیٰ ہذا مسلم مجلس کیلئے کوئی جواز نہیں، حالانکہ وہ خود اسی نظریہ کی حامی متحد مسلم سیاسی تنظیم کے قیام پر مصر ہیں مسلم لیگ کے لیڈروں نے سب سے زیادہ معقول بنانے کی جد و جہد کی ہے لیکن اس تنظیم کا قیام یا اس سے انضمام دونوں ہی باتوں میں اُن کے اپنے بنے بنائے مقام کے لیے مختلف پہلوؤں سے خطرہ تھا، اس لیے وہ مجبور ہوئے کہ کسی اصولی جواز کے بغیر اس تنظیم کے خلاف جنگ کا اعلان کریں اور جتنا نقصان مسلمانوں کے "اتحاد" کو مسلم لیگ کی توسیع سے پہنچ سکتا ہے اُسے اپنے رویہ سے دو چند کر دیں۔

سیاسی جماعت سازی ہی نہیں کسی بھی طرح کی جماعت سازی میں مسلمانوں کا بھلا نہیں۔ اس لیے کہ جماعت جیسی بھی ہو اس کی اپنے وجود کی مصلحتیں بہرحال کسی نہ کسی وقت عام ملت کی مصلحتوں سے ٹکرا جاتی ہیں اور جماعتی نفسیات مجبور کرتی ہیں کہ جماعت والے ایک وقتی مجبوری کے نام پر اپنی جماعتی مصلحت ہی کو مقدم کریں۔ مسلمانوں کا بھلا صرف اس میں ہے کہ ان کے فرض شناس عناصر کوئی رسمی جماعت بنائے بغیر مسلمانوں کو اپنی دینی اور دنیوی تعمیر کی طرف بلائیں اور مسلسل جد و جہد کے ساتھ بلائیں حتیٰ کہ آج کی نام نہاد ملت بالکل صحیح معنی میں ایک ملت اور

جماعت بنتی چلی جائے۔ مسلمانوں کے مسائل پوری ملت ہی کی اجتماعی ہیئت کو زندہ کرنے سے حل ہو سکتے ہیں نہ کہ اس کے اندر جماعتیں بنانے سے۔

مسلم لیگ اور مسلم مجلس کے اس قضیہ پر نگاہ ڈالتے ہوئے مسلم مجلس مشاورت کا خیال بھی قدرتی طور سے آتا ہے کہ یہ مرکزی وفاق کہاں محو خواب ہے۔ دو شریک جماعتوں میں رن پڑ رہا ہے اور اس وفاقی مرکز کی نگاہوں میں جنبش تک نہیں، اس کی سطح پر کوئی سرگرمی نہیں کہ ان دونوں میں سے جس کا موقف غلط ہو، اُسے اُس سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ آخر ایسے مرکز کے وجود سے کیا فائدہ ہے؟ اور کیوں وہ اپنے کو عبث اور بے جان مان کر خود کو ختم کر دینے یا پھر زندہ فعال بننے میں سے ایک بات کا فیصلہ نہیں کرتا؟ اس سوال کا جواب دینا اس مرکز کے سربراہوں کی ذمہ داری ہے۔

ایک وضاحت، ایک معذرت

۱۔ گزشتہ ماہ کے "نگاہِ اولیں" سے متعلق بعض خطوط اور گفتگوؤں سے اندازہ ہوا کہ اس سلسلہ میں ایک آدھ قسط کا اور انتظار ہے۔ واللہ اعلم یہ غلط فہمی کیوں ہوئی، وہ بحث اپنی جگہ مکمل ہو چکی ہے، اور جو کچھ لکھنے کا ارادہ اس کے آخر میں ظاہر کیا گیا تھا وہ کچھ دوسرے مسائل سے متعلق تھا۔ لہٰذا اُس بحث (سیکولرزم) کے بارے میں جو صاحب اظہار خیال فرمانا چاہتے ہوں وہ الفرقان کی طرف سے مزید کسی قسط کے انتظار میں نہ رہیں۔

۲۔ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی کے مقالے "مولانا کرامت علی جونپوری" سے متعلق ایک تکملہ کا اعلان گزشتہ اشاعت میں کیا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ تکملہ ۔۔بت شدہ مع مسودہ ہمارے کاتب صاحب کے صاحبزادے سے کہیں راستے میں گر گیا جب کہ وہ اُسے پہنچانے کے لیے آرہے تھے ۔۔ الہ نگار کو اس کی اطلاع دی جا چکی ہے۔ اب اگر انھوں نے مکرر زحمت فرمائی تو اس کی اشاعت کی نوبت آسکے گی، ورنہ بجز معذرت و افسوس کوئی چارہ نہیں۔

کِتَابُ الْمُعَاشَرَةِ وَالْمُعَامَلَاتِ

مَعَارِفُ الْحَدِیْث

(مُسَلْسَل)

عَام مخلوقات کے سَاتھ بَرتاؤ کے بارے میں ہدایات

(۲)

جانوروں کے ساتھ بھی اچھے برتاؤ کی ہدایت:۔

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اور آپ سے پہلے آنے والے نبیوں رسولوں نے بھی) اس کی اجازت دی ہے کہ جو جانور سواری یا بار برداری کے لیے یا کسی دوسرے کام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اُن سے وہ کام لیے جائیں۔ اسی طرح جن جانوروں کو حلال طیب قرار دیا گیا ہے اُن کو اللہ کی نعمت سمجھتے ہوئے اُس کے حکم کے مطابق غذا میں استعمال کیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ نے ہدایت فرمائی کہ ان کے ساتھ ایذا رسانی اور بے رحمی کا برتاؤ نہ کیا جائے اور ان کے معاملے میں بھی خدا سے ڈرا جائے۔

عَنْ سُهَيْلِ بْنِ الْحَنْظَلِيَّةِ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَعِيْرٍ قَدْ لَحِقَ ظَهْرُهُ بِبَطْنِهِ فَقَالَ اِتَّقُوا اللّٰهَ فِيْ هٰذِهِ الْبَهَائِمِ الْمُعْجَمَةِ فَارْكَبُوْهَا صَالِحَةً وَّاتْرُكُوْهَا صَالِحَةً

۔۔۔۔۔ رواہ ابوداؤد

حضرت سہیل بن الحنظلیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک
اونٹ کے پاس سے گزرے، جس کا پیٹ (بھوک کی وجہ سے) اس کی کمر سے لگ گیا تھا، تو آپ نے
فرمایا لوگو ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو! (ان کو اس طرح بھوکا نہ مارو)
ان پر سوار ہو تو ایسی حالت میں جب یہ ٹھیک ہوں (یعنی ان کا پیٹ بھرا ہو) اور ان کو
چھوڑ دو تو (اسی طرح کھلا پلا کر) اچھی حالت میں۔ (سنن ابی داؤد)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَأَى النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِمَارًا قَدْ وُسِمَ
فِي وَجْهِهِ فَقَالَ لَعَنَ اللهُ مَنْ فَعَلَ هٰذَا ـــــــ رواہ احمد

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ایک
گدھے پر پڑی جس کے چہرے پر داغ دے کر نشان بنایا گیا تھا تو آپ نے فرمایا وہ شخص
خدا کی رحمت سے دور اور محروم جس نے یہ (بے رحمی کا) کام کیا ہے۔ (مسند احمد)

(تشریح) دنیا کے بہت سے حصوں میں گھوڑوں گدھوں جیسے جانوروں کی پہچان کے لیے ان کے جسم کے کسی حصہ پر گرم لوہے سے داغ دے کر نشان بنا دیا جاتا تھا، اب بھی کہیں کہیں اس کا رواج ہے۔ لیکن اس مقصد کے لیے چہرہ کو داغنا (جو جانور کے سارے جسم میں سب سے زیادہ نازک اور حساس عضو ہے) بڑی بے رحمی اور گنوار پنے کی بات ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گدھے کو دیکھا جس کا چہرہ داغا گیا تھا تو آپ کو سخت دکھ ہوا اور آپ نے فرمایا کہ "لعن اللہ من فعل ھذا" یعنی اس پر خدا کی لعنت جس نے یہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انتہائی درجہ کی ناراضی اور بیزاری کا کلمہ تھا جو ایک گدھے کے ساتھ بے رحمی کا معاملہ کرنے والے کے لیے آپ کی زبان مبارک سے نکلا۔

دنیا نے "انسدادِ بے رحمی" کو اب اپنی ذمہ داری سمجھا ہے، لیکن اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اب سے چودہ سو برس پہلے اس کی طرف رہنمائی فرمائی تھی اور اس پر زور دیا تھا۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُفِرَ
لِامْرَأَةٍ مُومِسَةٍ مَرَّتْ بِكَلْبٍ عَلَى رَأْسِ رَكِيٍّ يَلْهَثُ كَادَ يَقْتُلُهُ
الْعَطَشُ فَنَزَعَتْ خُفَّهَا فَأَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَنَزَعَتْ لَهُ مِنَ الْمَاءِ
فَغُفِرَ لَهَا بِذٰلِكَ ـــ قِيلَ إِنَّ لَنَا فِي الْبَهَائِمِ أَجْرًا؟ قَالَ فِي كُلِّ

أَوْ يَزْرَعُ زَرْعاً فَيَأْكُلُ مِنْهُ إِنْسَانٌ أَوْ طَيْرٌ أَوْ بَهِيمَةٌ إِلَّا كَانَتْ لَهُ صَدَقَةٌ ـ

ــــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی مسلم بندہ کسی درخت کا پودا لگائے یا کھیتی کرے، پھر کوئی انسان یا کوئی پرندہ یا چوپایہ اس درخت یا کھیتی میں سے کھائے تو یہ اس بندہ کی طرف سے صدقہ اور کارِ ثواب ہوگا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث کا بھی پیغام اور سبق یہی ہے کہ انسانوں کے علاوہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے سب جانوروں پرندوں اور چوپایوں کو کھلانا پلانا بھی صدقہ اور کارِ ثواب ہے ـــ اس کے برعکس مندرجہ ذیل حدیث سے معلوم ہوگا کہ کسی جانور کو بلاوجہ ستانا اور اُس کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرنا سخت گناہ ہے جو آدمی کو عذابِ خداوندی کا مستحق بنا دیتا ہے۔

عَنْ ابْنِ عُمَرَ وَأَبِي هُرَيْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِي هِرَّةٍ أَمْسَكَتْهَا حَتَّى مَاتَتْ مِنَ الْجُوعِ فَلَمْ تَكُنْ تُطْعِمُهَا وَلَا تُرْسِلُهَا فَتَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ ــــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے دونوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ظالم عورت کو ایک بلی کو (نہایت ظالمانہ طریقہ سے) مار ڈالنے کے جرم میں عذاب دیا گیا ہے۔ اُس نے اس بلی کو بند کرلیا، پھر نہ تو خود اسے کچھ کھانے کو دیا اور نہ اُسے چھوڑا کہ وہ حشرات الارض سے اپنا پیٹ بھر لیتی (اس طرح اسے بھوکا تڑپا تڑپا کے مار ڈالا۔ اس کی سزا اور پاداش میں وہ عورت عذاب میں ڈالی گئی ہے)۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) یہ چند حدیثیں یہ جاننے کے لیے کافی ہیں کہ جانوروں کے ساتھ برتاؤ کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور تعلیم کیا ہے۔ اور یہ اس کے بالکل منافی نہیں ہے کہ سانپ بچھو جیسے موذی جانوروں کو مار ڈالنے کا خود آپ نے حکم دیا ہے اور حرم میں بھی ان کے مار دینے کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ بھی دراصل اللہ کی مخلوق اور اس کے بندوں کے ساتھ خیرخواہی کا تقاضا ہے۔

اسلام میں مکمل انارکی کی دریافت!

شیخ الجامعہ (جامعہ ملیہ) کے ایک مقالے کا جائزہ

—— عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہندوستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر گجیندر گڈکر نے گزشتہ سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں کو بتائیں کہ شادی اور وراثت جیسے معاملات میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ آج کے لئے برمحل نہیں ہو۔ خدا جانے اسی تلقین کا نتیجہ ہو یا محض اتفاقی ہم خیالی کی اپنی ذاتی تحریک کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس مضمون کو ذرا زیادہ وسیع کر کے ایک طویل مقالہ "اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام" کے زیرِ عنوان گزشتہ دنوں سپردِ قلم فرمایا جو جامعہ ملیہ کے ماہنامہ جامعہ کی مئی اور جون ۱۹۷۰ء کی اشاعتوں میں نکلا ہے۔

اصل مقالہ انگریزی میں لکھا گیا تھا جس کا اردو ترجمہ "جامعہ" میں آیا ہے۔ ترجمہ اتنا تحت اللفظ قسم کا ہے کہ انگریزی کا مزاج پوری طرح برقرار رہا ہے جس سے مضمون کی وہ ابہامیت اور سوا ہو گئی ہے جو مجیب صاحب کے کم از کم ایسے مضامین کا تو لازمی خاصہ ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ ہمارے مطالعہ میں آئے ہوئے ان کے مضامین کی ابہامیت کا راز یہی ہو کہ وہ انگریزی سے ترجمہ ہو کر اردو میں آتے ہیں اور ترجمہ میں اصل کا اسلوب تک برقرار رکھنے کی احتیاط کی جاتی ہو۔ بہرحال یہ مضمون اپنے اسلوب بیان کی بنا پر کافی نامفہوم ہے لیکن کچھ غور و خوض سے تہ میں جو خیال آ رہا ہے ہم نے اسے پوری احتیاط اور ذمہ داری کے

ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس پر اظہار خیال کا قدم اسی وقت اٹھایا جارہا ہے جب یہ اطمینان ہوگیا ہے کہ پروفیسر صاحب کا مافی الضمیر ہم نے سمجھ لیا۔

مضمون کے بارے میں ہمارا خیال اوپر کی سطروں ہی سے ظاہر ہے، لیکن پروفیسر مجیب صاحب کا باوجود ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شیخ الجامعی کے مسلمانوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے جس کے ذریعہ اُن کے افکار و خیالات مسلمانوں میں نفوذ کرسکتے ہوں، اور اس بات کی ضرورت ہو کہ ان خیالات کو چیک کیا جائے، البتہ ایک جامعہ اسلامیہ کی سربراہی کے پہلو سے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ اگر اسلام کے شروع سے اب تک کے متفق علیہ تصور کے خلاف کسی خود ساختہ تصور کی اشاعت کرتے نظر آئیں تو اس پر احتجاج کیا جائے اور خود اُن کے اور اُن کے مسلمان رفقائے کار کے ضمیر سے اپیل کی جائے کہ ایسی حالت میں وہ ایک اسلامی ادارہ کی سربراہی کے اخلاقی جواز اور عدم جواز کے بارے میں سوچیں اور اپنا اپنا فرض ادا کریں ــــ ہماری اس تحریر کا مقصد و محرک یہی ہے۔

مجیب صاحب کے مقالہ کا لب لباب اگر ایک جملہ میں نکالا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ کسی شخص کے لیے اُس کے اسلامی فرائض اور اسلامی اقدار کا تعین اُس کے ضمیر پر چھوڑا جانا چاہیے، ضمیر سے بالاتر اتھارٹی دخل کنندہ نہیں ہونا چاہیے جو اسلامی فرائض و مناسبات کا تعین اور جواز و عدم جواز کا فیصلہ ہمارے لیے کرے۔

ہم اس نقطۂ نظر پر ایک سیدھا سا سوال یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام یا کسی بھی مذہب اور کسی بھی نظام کے بارے میں جب کوئی بات کہی جائے گی کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا، کس چیز کو وہ جائز رکھتا ہے اور کس چیز کو جائز نہیں رکھتا، تو آیا اُس مذہب یا اُس نظام کے مستندات سے بھی استناد کی ضرورت ہوگی یا نہیں؟ اگر اس کی ضرورت تسلیم کی جائے تو پروفیسر صاحب کے مقالے میں کہیں سے کہیں تک بھی ہمیں اس نوعیت کا کوئی حوالہ اور کوئی استشہاد اس نقطۂ نظر کی تائید میں نہیں ملتا۔ اور اسی بنا پر بغیر کسی مزید گفتگو کے اُن کا نقطۂ نظر خواہ وہ فی نفسہٖ کتنا ہی قیمتی، کیسا ہی عقلی اور کیسا ہی نافع کیوں نہ ہو، "ایک اسلامی نقطۂ نظر" کی حیثیت سے قطعاً ناقابل اعتنا ہو جاتا ہے۔ اور بالفرض یہ بدیہی ضرورت بھی تسلیم نہ ہو تو ہم مثال کے طور پر جاننا چاہیں گے کہ کیا جامعہ ملیہ کے نظام میں بھی مجیب صاحب جامعہ سے منسلک افراد کے اپنے اپنے ضمیر

کی یہ بالاتری ماننے کے لیے تیار ہیں کہ جو کچھ انھیں صواب نظر آئے وہ کریں اور جس بات کو خطا جانیں اُسے چھوڑ دیں، قطع نظر اس کے کہ جامعہ کا دستور اساسی کیا کہتا ہو اور اس دستور کے دیے ہوئے اختیارات سے تفصیلی قواعد و ضوابط مرتب کرنے والی اتھارٹیز نے کیا قاعدے اور ضابطے یہاں کے لیے بنا رکھے ہیں؟

اگر جامعہ کے نظام میں مجیب صاحب ضمیر کا یہ مقام تسلیم کر سکتے ہوں تو پھر اُن کی یہ بات قابل فہم ہو گی کہ ایک مسلمان کے بارے میں بھی یہ طے کرنا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے، اسلام اور اس کے مستند ترجمانوں کا کام نہیں بلکہ خود اس فرد کے ضمیر کا کام ہے۔ لیکن ایسا تو ہے نہیں کہ افراد کو یہ آزادی جامعہ میں دی جاتی ہو یا دی جانے والی ہو۔ پھر یہ اسلام غریب ہی کی خیر خواہی اس امر میں کیوں سمجھی گئی ہو کہ اُس میں انارکی کا رواج ہو؟ اور کوئی کسی سے یہ پوچھنے والا نہ ہو کہ آپ مسلمان ہوتے ہوئے کیا کر رہے ہیں؟

ایک جامعہ کیا، دنیا کا کوئی چھوٹا سا انتظامی ادارہ بھی اس کے بغیر نہیں چل سکتا، بلکہ تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ کچھ اصول و ضوابط، کچھ طے شدہ معیار اور کچھ متعین شکلیں کسی کے واجبات اس کا لازمہ ہوں۔ یہ بالکل انسانی ذاتی مسلّمات میں سے ہے جس میں پروفیسر مجیب صاحب جیسے کسی آدمی کا اختلاف تو ہرگز قابل قیاس نہیں۔ پھر کیا اُن کا مطلب یہ ہو کہ اسلام کوئی "نظام" نہیں، محض ضمیر کی اطاعت کا نام ہو؟ یہ وہ دعویٰ مشکل ہے کہ جو بجائے خود حقیقت اور منطق ہر دو کے لحاظ سے کتنی ہی بے ثبات اور بے بنیاد ہو مگر اس کا قائل وہ بات کہنے میں حق بجانب ہوگا کہ اسلامی فرائض اور اسلامی اطوار کا تعین ہر شخص کے اپنے ضمیر کا منصب ہے۔ اس سے بالاتر کوئی اتھارٹی نہیں جو ہم میں سے کسی کے لیے اسلامیات کا فیصلہ کرے ـــ لیکن مجیب صاحب نے اس پورے مقالے میں کہیں یہ دعویٰ بھی کیا ہے، جو ضمیر کے بارے میں اُن کے نقطۂ نظر کی توجیہ اس سے کر لی جائے؟

جہاں تک ہمارے احساس اور تاثر کا تعلق ہے وہ بالکل یہی ہے کہ مجیب صاحب اپنے اس مقالہ میں بنیادی نقطۂ نظر یہی دینا چاہتے ہیں کہ اسلام محض ضمیر کی اطاعت کا نام ہے لیکن جب وہ کھل کر کسی ایک فقرے میں بھی یہ بات نہیں کہتے بلکہ صریح الفاظ میں کہیں اسلام کے معنی بتاتے ہیں تو یہ بتاتے ہیں کہ

"اسلام حکم الٰہی کی اطاعت ہے"[1]

---

[1] قسط دوم جامعہ بابت جون ۱۹۷۰ء ص ۳۰۰

ـــــ تو اولاً تو ہمیں اس کا حق ہی نہیں کہ جو بات وہ کھل کر نہیں کہتے اُس کا مدّعی انھیں ٹھہرائیں۔ دوسرے اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بس اُن کے صاف اور صریح اظہاریے کو سامنے رکھ کر پوچھنا ہے کہ اسلام جب حکمِ الٰہی کی اطاعت کا نام ہے تو اسلامیات کا تعین حکمِ الٰہی سے ہونا چاہیے یا ضمیر کے ارشاد سے؟ ضمیر کا ارشاد ہم میں سے ہر شخص کے یہاں جدا ہو سکتا ہے۔ اور اس کا تو عادةً کوئی امکان نہیں کہ ہم سب کے ضمیر کی گواہی کسی ایک مسئلہ پر بھی ایک ہو کر سامنے آئے۔ تو کیا ہر شخص کے ضمیر کی گواہی کو (جیسا کہ وہ اسے ظاہر کرے) اس کے حق میں حکمِ الٰہی، اور اُس پر عملدرآمد کو حکمِ الٰہی کی اطاعت کہا جائے گا، چاہے اُن میں باہم کیسا ہی بون بعید ہو؟ ـــ ہم نہیں جانتے کہ کس صاحبِ عقل کی عقل اس خیال کو قبولیت کا شرف دے سکتی ہے؟ ـــ یہ کون سا الٰہ ہے جو اپنی اطاعت کے عنوان سے اس مضحکہ خیزی پر راضی ہو جاتا ہے؟ ـــ یہ کسی کے حکم کی کون سی قسم ہے جس میں کسی معنی کا کسی صورت اور کسی شکل کا تعین نہیں ہے جس کا اُلٹا اور سیدھا نہیں؟ اور جس میں کسی شخص پر انگلی نہیں دھری جا سکتی کہ وہ حکم عدولی کا مرتکب ہوا ہے؟ ـــ یہ الٰہ، حکیم و حمید اور علی و عظیم کا ذکر ہے یا لات و منات جیسی پتھر کی مورتوں کا، جو سمیع و بصیر کا بھی سرمایہ نہیں رکھتیں؟ مگر ان کے پرستار بھی تو اس مضحکہ خیزی کا موقع دینے پر کسی زمانہ میں راضی نہ نظر آئے کہ ان کے معبودوں کی رضا کا کوئی اُلٹا سیدھا ہی نہیں، جو کچھ اپنی مرضی سے کر لیجیے وہی ان کی رضا ہے۔ ان لوگوں نے بھی بہرحال کوئی چھوٹا یا بڑا نظامِ عمل بتایا، اوامر و نواہی کی کچھ ٹھوس شکلیں سامنے رکھیں کہ یہ ان معبودوں کے احکام ہیں جن سے مطابقت میں ان کی رضا ہے۔ یہ مجیب صاحب ہیں، ایک صاحبِ جمیع صفاتِ عظمت و کمال اور سچ مچ کے خدا کے بارے میں یہ ماننے کی دعوت دے رہے ہیں کہ اس کی رضا جوئی کی کوئی خاص شکل اور اُس کی پسند و ناپسند کا کوئی ٹھوس معیار نہیں ہے۔ اُس کے احکام و مطالبات بس کچھ ایسے الفاظ ہیں جن کا اپنا کوئی مفہوم اور کوئی لگا بندھا مصداق نہیں، ان میں جو معنی ڈال دیجیے وہ اس حاکم کو منظور ہوں گے، اور جو مصداق اپنے آپ سے ٹھہرا دیجیے وہ قابلِ قبول اور موجبِ رحمت و رضوان! ـــ فکر و دانش کا یہ تحفہ علم و دانش کے چہارم آسمان پہ جا کر نذر کیا جاتا ہے۔ اور وہاں کی سندِ قبول سے صحیفہ بن کر ہم خاک نشینوں پہ نازل ہوتا ہے، کہ اسے نورِ ہدایت جانیں۔

۱؎ پروفیسر مجیب صاحب نے یہ مقالہ ہندوستان ہی کے ایک علمی اجتماع کے لیے لکھا اور وہاں پیش کیا تھا مگر اس کی جامعہ میں اشاعت (جیسا کہ خود "جامعہ" بابت [illegible] سے معلوم ہوا) اس وقت ہوئی ہے جب موصوف نے اسے میکگل یونیورسٹی (مانٹریال۔ کناڈا) میں جا کر سنایا۔

مگر ہم کہاں سے وہ فکر اور وہ نظر لائیں جسے دینیات میں آزادی کا ہر فلسفہ لائق تحسین و آفریں ہو؟ اور اس سے بڑھ کر مسیحیوں اور یہودیوں کا وہ دل کہاں سے لائیں جو اسلامی تاریخ کو اُن کی تاریخ کے مقابلہ میں کم قیمت ٹھہرانے بلکہ زیادہ تر دھبوں ہی دھبوں کا مجموعہ بتانے سے کھل جاتا ہو؟[1] ہم نے تو دین کو قبول ہی ایک طرح بحق پابندی سمجھ کر کیا ہے اور ہیں تو ہی تاریخ سے انتساب کے ساتھ جینا اور مرنا ہو جسے رسوا کرنے کے پہلو نکالنا مجیب صاحب کے نزدیک زندگی کا ایک اچھا مصرف اور زندہ ضمیری کی دلیل ہو۔

خیر یہ بات تو بیچ میں سخن گسترانہ آ گئی۔ گفتگو یہ تھی کہ اسلام اگر مجیب صاحب کے نزدیک بھی حکم الٰہی کی اطاعت کا نام ہو، تو زندگی کے کس رویہ کو اسلام کہا جائے گا اور کون سا رویہ اسلام نہیں کہلائے گا، اس کا فیصلہ بدیہی طور سے احکام الٰہی کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ نہ کہ ہر شخص کا ضمیر جس بات کو اچھا سمجھے وہ اسلام ہو اور جو بُرے بری نظر آئے وہ اُس کے حق میں غیر اسلام ہو۔ اس بدیہی بات کے سلسلہ میں سوچنے کا ایک رُخ سامنے کرتے ہوئے ہم نے مزید کہا کہ ہر شخص کا ضمیر جب جدا جدا فیصلے کر سکتا ہو، اور کسی معاملے میں سب کے ضمیر کا واقعی فیصلہ ایک ہو بھی، تب بھی اُس کا بیان تو ہر شخص کی اپنی مرضی پر ہو، جس میں غلط بیانی سے کوئی کسی کو نہیں روک سکتا اور نہ اس کے امکان سے انکار کیا جا سکتا ہو۔ اسلیے جدا جدا رویوں کا امکان بالکل قطعی ہو جاتا ہے۔ اور ان مختلف اور متضاد رویوں کو بیک وقت اسلام یعنی "حکم الٰہی کی اطاعت" ہی کہا جائے تو یہ کھلا ہوا مذاق ہو۔ ذات الٰہی کے ساتھ بھی اور لفظ حکم کے ساتھ بھی۔ ذات الٰہی تو بڑی چیز ہو اُس کی عاقل مخلوق میں سے بھی کوئی اپنی اطاعت کا یہ ڈھنگ برداشت نہیں کر سکتا۔ اور نہ کسی کے "حکم" کی اطاعت، اس بو قلمونیٔ اعمال کو کہنا کوئی سنجیدگی ہو۔ کسی ذات واحد کے حکم کی اطاعت وحدت و یکسانیت چاہتی اور وحدت و یکسانیت پیدا کرتی ہو۔ بس یہ علامت یہ جاننے کیلیے کافی ہو کہ کسی ذات واحد کی اطاعت ہو یا نہیں۔

---

[1] یہ اس مقالہ کا بہت ہی عبرتناک پہلو ہو کہ اس میں موضوع کی مناسبت سے اسلامی تاریخ کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہو اس کا انداز جا بجا ایسا ہو جیسے اس تاریخ کے عیب دکھانے میں کوئی جذباتی کیفیت بھی شامل ہو۔ چنانچہ بعض جگہ کھلی غلط بیانیوں تک بات گئی ہو۔ اور اس کے برعکس اقوام مغربیہ کے ذکر میں یہ عیب بین نظر سراپا ہنر جو بن کے رہ گئی ہو ـــ مقالے کے اس پہلو پر بھی اپنے موقعہ سے بات آئے گی۔

اب ایک اور رُخ سے سوچیے کہ کسی رویہ کو کسی کے "حکم کی اطاعت" کہنے کے لیے یہ معلوم ہونا بھی تو ضروری ہے کہ اُس کا حکم کیا ہے؟ ضمیر کے حقِ تعیین پر کوئی اور اعتراض نہ بھی ہو تب بھی ـــــ اگر اسلام حکمِ الٰہی کی اطاعت کا نام ہے ـــ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ تعیین حکمِ الٰہی کے مطابق ہے یا نہیں؟ سوائے اس کے کہ ضمیر ہی کو خود اُس کا ذریعہ علم بھی کہیے کوئی اور صورت ایسی نہیں ہے کہ ہر ضمیر کے طے کردہ رویے اور حکمِ الٰہی میں مطابقت قابلِ کلام نہ ہو یعنی کسی خارجی ذریعہ علم کی ضرورت اگر یہ جاننے کے لیے ہے کہ خدا کا حکم فلاں معاملے میں یا یوں ہے، تب کسی کے ضمیر کا فیصلہ حکمِ الٰہی کے ہم معنی نہیں بن سکتا۔ اِن ضمیر ہی کو سب سے برتر یا واحد ذریعہ علم بھی مان لیا جائے تب ہر مدعی کا یہ دعویٰ ٹھیک ہی ماننا پڑے گا کہ وہ اپنے ضمیر کی روشنی میں جو کچھ کر رہا ہے وہی حکم خداوندی بھی ہے۔ پس جو صاحب یہ فرمائیں کہ ہر فرد کے ضمیر ہی کو یہ طے کرنے کا حق ہے کہ کسی معاملہ میں اس کے لیے حکمِ الٰہی کیا ہے اور اسلام اُس سے کیا چاہتا ہے؟ اُنھیں یہ بھی کہنا پڑے گا کہ حکمِ الٰہی معلوم کرنے کا ذریعہ بھی ہر فرد کا ضمیر ہی ہے، اُس سے باہر کچھ نہیں! ـــــ کیا پروفیسر مجیب صاحب نے اپنے نظریے کے اس تقاضے کی تعمیل بھی مقالے میں کی ہے؟ اور اس پر بحث کا موقع دینے کے لیے وہ تیار نظر آتے ہیں؟

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مضمون نے اس تقاضے کو اس طرح پورا کرنے کی کوشش کی ہے کہ بحث کا موقع کسی کو آسانی کے ساتھ نہ ملے۔ وہ اس بات کو قلم پر لانے اور صاف صاف کہہ دینے کی ذمہ داری کا اٹھائے بغیر یہ چاہتے ہیں کہ قارئین کا ذہن بس کچھ مبہم اشاروں سے از خود ہی اس راہ پر لگ جائے۔ اس مقصد سے صفحہ ڈیڑھ صفحہ اس قدر پیچ کر لکھا ہے کہ آدھی بات کہیں اور آدھی چھوڑ دی، ایک جملہ اس پیرے میں کہہ دیا تو دوسرا دوسرے میں جا کر۔ گویا مبتدا کہیں خبر کہیں، صغریٰ کہیں کبریٰ کہیں۔ اس قدر ہیر پھیر اس قدر گھماؤ پھراؤ، اتنے پردے کہ حرفِ مدعا پر انگلی رکھنے کو ترستے رہ جائیے۔ لیکن مضمون کا ڈھال چونکہ پہلے سے ہی بتا دیتا ہے کہ بات کس طرف جارہی ہے اور مضمون نگار کو بالکل فطری تقاضے کے طور پر آگے کیا کہنا ہے، اس لیے پوشیدہ گفتن کی یہ تمام کوششیں یہ سوال تو ضرور پیدا کرتی ہیں کہ رسمی لازمی اور ضروری بات کو صاف کہنے اور مقدور بھر دلنشین استدلال کے ساتھ کہنے میں وہ کیا رکاوٹ پیش آگئی ہے جس کے باعث جانِ سخن ہی کا بے جان رہ جانا مجیب صاحب نے گوارا کر لیا ہے مگر [illegible] ان کوششوں سے یکسر مخفی ہو کر نہیں رہ گیا ہے اور نہ ہی ایسا کرنا مجیب صاحب کا مقصد ہو سکتا تھا۔ وہ تو اگر سمجھا چاہتے تھے تو اس کے متضمنات سے اور اس نفی سے بچنا چاہتے ہوں گے جو وضاحت اور تفصیل کی صورت میں اس اثبات کے ساتھ ضروری

تھی، اور جس پر آگے روشنی پڑے گی۔

بہرحال مجیب صاحب نے اپنے نظریہ کا بالکل قدرتی اور منطقی تقاضہ ایک معنی میں یہ کہہ کر پورا کیا تو ہے، کہ ضمیر انسانی بذات خود اُن احکام الٰہی کا ادراک کرنے کے لیے کافی ہے جن کی اطاعت کا نام اسلام ہے، مگر ایسے ڈھنگ سے کہ نہ اثبات واضح ہے اور نہ نفی۔ جس طرح ان کی عبارت میں کوئی صاف فقرہ اس مفہوم کا نہیں ملتا کہ ضمیر بذات خود احکام الٰہی معلوم کر لینے کے لیے کافی ہے، اس طرح یہ نفی بھی دو ٹوک انداز میں ہاتھ نہیں آتی کہ ضمیر کے علاوہ یا ضمیر سے برتر، کوئی دوسرا ذریعہ احکام الٰہی معلوم ہونے کا نہیں ہے۔ جو رنگ گومگو اور نیمے دروں نیمے بروں کا، اس کلیۂ ضمیر کے اثباتی جزء میں ہے وہی اس کے منفی پہلو کی گفتگو میں بھی ہے، اس کا منفی پہلو ایک مہم سے سوال سامنے لاتا ہے کہ قرآن کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ اس میں احکام الٰہی ہیں یا نہیں؟ اور اگر ہیں تو یہ ذریعہ علم بالاتر ہے یا ضمیر؟ اسلام کے نام پر اظہار خیال کرنے والا جب اس سوال سے کہیں دوچار ہوگا تو کیا حالت اس کی نہ ہو جائے گی؟ مجیب صاحب اس مرحلہ میں اسی حالت سے دوچار ہیں۔ اُن کے نقطۂ نظر کا منطقی تقاضہ یہ ہے کہ نفی میں جواب دیں۔ اُن کا نظریہ کسی کلام الٰہی اور کسی رسول و پیغمبر کو ماننے کا کوئی جواز ہی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ مگر قرآن کے کلام الٰہی ہونے یا اُس کے ضمیر سے برتر ذریعہ علم ہونے کا انکار اگر مجیب صاحب صاف صاف کر دیں تو اسلام کے نام سے اور قرآن کے نام سے وہ کوئی نظریہ کیسے پیش کر سکتے ہیں؟ چنانچہ وہ قرآن کا اقرار بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور ضمیر کی آزاد فرمانروائی کا راستہ بھی اس کے پہلو بہ پہلو بنا لینا چاہتے ہیں۔ آئیے، خود مجیب صاحب کی عبارت میں اس منظر کو دیکھیے! ـــــ فرماتے ہیں:

> "یہاں پھر وہی سوال آتا ہے جو میں پہلے اُٹھا چکا ہوں کہ اسلام کے بارے میں ہمارا تصور کیا ہے؟ کیا وہ ایک جامد چیز ہے یا اُس میں نشو و نما کا امکان بھی ہے؟ اسلام حکم الٰہی کی اطاعت ہے، خدا کے جو احکامات نازل ہوئے، قرآن میں موجود ہیں، لیکن قرآن کے ذریعہ نازل ہونے سے پہلے اور اس کے نزول کے بعد جو کچھ تھا اور جو کچھ ہوا، وہ بھی خدا کے حکم سے ہوا اور ہم سے کہا گیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اُسے مشیت ایزدی سمجھیں۔ ہم واقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتے، خود قرآن میں ایسے واقعات کا ذکر ہے، جو پہلے ہو چکے تھے اور اُن کا بھی جو اس زمانے میں ہوئے۔ قرآن کے نزول کے بعد جو کچھ ہوا، اُس کے لیے یا جو کچھ ہوا، اُس کے باوجود اگر ہم معاملات کو سمجھنے کے

لیے قرآن ہی سے ہدایت حاصل کرنا چاہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کے نزول کے بعد جو کچھ ہوا، اُسے کالعدم سمجھنا چاہیے۔ اگر اسے کالعدم سمجھنا ہو تو اس کے لیے کوئی واضح سند چاہیے اور مجھے کوئی سند نہیں ملی معتزلہ کی رائے تھی کہ قرآن مخلوق ہے۔ اُن کی اس رائے کو صحیح نہیں مانا گیا۔ شاید اس پر جس طرح غور کرنا چاہیے غور بھی نہیں کیا گیا اور اس کا (سبب[1]) دینی سے زیادہ سیاسی تھا۔ اسکے برخلاف وہ رائے مانی گئی جو اس وقت راسخ العقیدہ لوگوں کی ہے۔ قرآن مخلوق نہیں۔ ایک دائمی حقیقت ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر ہم اُسے دائمی حقیقت مان لیں تو رہنمائی کے لیے ہم براہ راست قرآن تک نہیں پہنچ سکتے، بلکہ تشریحوں اور تفسیروں اور ان مسائل میں جن کا تعلق الفاظ کے اصل معانی سے ہے، اُلجھ جاتے ہیں، ایمان اور عمل کے اعتبار سے اسلام کی تکمیل رسول صلعم کی زندگی میں ہو گئی لیکن خود فقہ کی تدوین سے ثابت ہے کہ اس کے بعد بھی بہت سے سوالات تھے جو اس وجہ سے اٹھے کہ حالات بدل گئے تھے اور ان سوالوں کا جواب دینا ضروری تھا۔ بعد میں تقلید کا اصول مان لیا گیا، اس کا سبب جو کچھ بھی رہا ہو لیکن اس کی وجہ سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا حکم کیا ہے اور جو واقعات ہو رہے تھے اُن کے مشاہدے سے کیا نتیجے نکلتے ہیں، خود حالات اور واقعات پر غور نہیں کیا گیا، بلکہ پہلے کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھی جاتی رہیں۔ صوفیوں نے مسلمانوں کے ذہن کو تقلید کے تنگ دائرے سے نکال کر بڑی خدمت انجام دی، لیکن انھوں نے اگر ایک طرف یہ کہا کہ خدا اور انسان کا تعلق براہ راست ہے تو دوسری طرف شیخ کو ایک وسیلہ بھی قرار دیا اور اس طرح بھی ایک پابندی لگ گئی۔ تصوف کی ایک اعلیٰ شکل واردات قلبی اور وجد کی کیفیتوں میں نظر آتی ہے۔ اس کی معمولی شکل سے بس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ واقعات کی دنیا سے پناہ لینا اور واقعات میں خدا کی مرضی جس طرح سے ظاہر ہوتی تھی اُسے سمجھنے کی ذمہ داری سے بھاگنا چاہتے تھے، پھر بھی تصوف مسلمان کے ضمیر کے اثبات خودی کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔" (صلـــ۳۰)

---

[1] یہ لفظ عبارت میں نہیں تھا۔ جناب مجیب صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری (اور غالباً مقالے کے مترجم بھی) عبداللطیف اعظمی صاحب نے راقم کے استفسار پر بتایا ہے کہ یہاں لفظ "سبب" کتابت سے رہ گیا ہے۔

اقتباس کافی طویل ہوگیا۔ مقصد اس سے کم میں بھی پورا ہوجاتا، مگر مناسب تھا کہ پروفیسر صاحب کی پوری بات ہی اُن کے الفاظ میں سامنے آجائے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ موصوف نے کتنے پہلو بدل بدل کر اور کتنے پیچ دے دے کر بات کہی ہے مگر اتنی بات تو بہرحال اس سے نکلتی ہی ہے کہ قرآن اپنے زمانہ نزول کے بعد معاذ اللہ یہ حیثیت کھو چکا ہے کہ اُس سے احکام الٰہی اخذ کیے جائیں۔ اب یہ کام ضمیر انسانی کا ہے کہ وہ زمانہ کی رفتار دیکھ کر از خود اللہ کے حکم اور اُس کی مرضی کا ادراک کرے، اور اس طرح جو کچھ ادراک ہو وہی کسی شخص کے لیے اللہ کا حکم اور فریضہ اسلامی و طریقۂ اسلامی ہے۔

ہم جناب مجیب صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں، کہ وہ کس اسلام میں "فرد کے ضمیر کا مقام" سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش اپنے اس مقالہ میں کر رہے ہیں؟ اُس "اسلام" میں جو قرآن کی اصطلاح ہے اور جس کا آخری پیغامبر اور شارح محمد بن عبداللہ الہاشمی العربی صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا جاتا ہے؟ یا یہ کوئی اُس سے الگ دینی نظام ہے، جس کے لیے "اسلام" کا ہی نام پسند کر کے، اس میں فرد کے ضمیر کا مقام مجیب صاحب تعین کرنا چاہتے ہیں؟ — دوسری صورت ہو تو اس میں گفتگو دوسرے نہج سے ہوگی، لیکن اُن کا مقالہ اول سے آخر تک اس دوسری صورت کا کوئی شائبہ نہیں رکھتا۔ وہ بالکل صاف طور پر اُسی اسلام سے متعلق ایک نقطۂ نظر کا اظہار ہے جو قرآن کا اصطلاحی "اسلام" ہے اور جس کی شرح و وضاحت کے سلسلہ میں قرآن نے اپنے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو واحد سند ٹھہرایا ہے۔ ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس "اسلام" میں کسی چیز کا منصب و مقام اور اُس کی حیثیت اگر بغیر ان دو سندوں میں سے کسی کے حوالے کے طے کی جائے تو اُس کی کیا قیمت اور کیا حیثیت ہے؟ اور کون سی دانشوری اس کی اجازت دیتی ہے کہ آدمی بات قرآن اور محمد عربی کے دین و مذہب کی کرے مگر باتیں اپنی کہے؟ — یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ مجیب صاحب کی اس پوری عبارت میں جو اوپر نقل کی گئی، ایک جملہ نہیں ہے جس پر قرآن یا حدیث سے استشہاد کا شبہ بھی گزر جائے۔

پس ہمیں اس معاملہ میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ضمیر کا یہ مقام بلند جو پروفیسر مجیب صاحب کے نزدیک کسی "معقول" دین و مذہب میں مسلّم ہونا چاہیے، اگر اس کا تسلیم کیا جانا قرآن اور حدیث کہیں بھی نہیں ملتا تو ایک صاحب ضمیر کا راستہ یہ نہیں ہے کہ اسے خواہ مخواہ اسلام کے سر منڈھ کر مسلمان کہلاتے رہنے کا جواز پیدا کرے۔ شیوۂ ارباب ضمیر اس کے برعکس یہ ہے کہ ایسے مذہب کو مجیب صاحب جیسے خیال کا آدمی خیرباد

کیے. اور اپنے دین و مذہب کی دنیا الگ بسائے، چاہے وہ اس کا اکیلا ہی باسی ہو! ــــ مگر یہ راہِ جنوں ہے! اسکی مشکلات، الامان! ــــ فرزانے اس کا حسن بیان کر سکتے ہیں، بلکہ واقعہ سے بھی حسین ترسماں، لفظ و بیان سے باندھ سکتے ہیں، مگر بات اس پہ چلنے کی آجائے تو مسلک وہ ہو جسے حضرت غالب فرما گئے ہیں ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

وہ پورا قبیلہ جس کی نمائندگی پروفیسر مجیب صاحب کرتے ہیں، اُس سے شکایت یہ نہیں ہو کہ دین و مذہب کے معاملہ ایسے خیالات کا اظہار کیوں کرتا ہو جن کی سند قرآن و حدیث سے نہیں ملتی. اُس سے شکایت یہ ہو کہ جب وہ اسلام کی سند نہ پاتے ہوئے بھی ان خیالات پر اصرار رکھتا ہو، تو اس کے ساتھ اُسے اس پر کیوں اصرار ہو کہ اُس کے خیالات کو غیر اسلامی نہ قرار دیا جائے! اور کس ایمانداری سے یہ کوشش جائز ہوتی ہو کہ مسلمان اُن کے خیالات کو اسلامی سمجھ کر قبول کر لیں؟ ایسے لوگوں کو ایمانداری کے تقاضے سے اوّلیں بات یہ کہنی چاہیے کہ اب ہم اسلام کو نہیں مانتے، یہ وقت کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا. وقت کا تقاضہ اب ان افکار و اعمال میں ہو جنھیں ہم صحیح سمجھتے ہیں. اور اس لیے دعوت دیتے ہیں کہ باقی لوگ بھی انھیں کو اختیار کریں! لیکن اس ایماندارانہ پوزیشن کے بجائے یہ حضرات اسلام کی تو مدح سرائی کریں گے کہ وہ تو بڑا ترقی پسند اور دانش پرست ہو اور بیزاری تمامتر اس کے "علماء" اور "ملّاؤں" پر مرکوز کر دیں گے کہ یہ ہیں جو اسلام کے جوہر کھلنے نہیں دیتے. لکیر کے فقیر اور تاریکی کے پرستار ہیں، اسلام کو بھی منجمد کر کے لکیروں اور تاریکیوں کا مجموعہ بنا رکھا ہو. عقل و ہوش سے کام ہی نہیں لیتے، زمانہ کو دیکھتے ہی نہیں، بس اگلوں کی کتابیں دیکھے جاتے ہیں اور ان ہی میں لکھے ہوئے احکام ہر دور میں قائم رکھنا چاہتے ہیں، چاہے ان کے ساتھ سانس لینا بھی کسی زمانے میں مشکل ہو جائے.

مجیب صاحب سے اسلام کی مدح تو نہیں ہو سکی ہو، لیکن یہ بھی نہیں کہ اُس سے بیزاری کا اظہار کر سکے ہوں. بیزاری کا اظہار جو کچھ ہو وہ بس علماء ہی کے خلاف ہو بلکہ اُن کا حقیقی مقصد اور مطمحِ نظر تو اس مقالے میں، سوائے اس کے کچھ نظر آتا ہی نہیں کہ عام ملت اور اسلام کے مصدر و مآخذ کے بیچ سے علماء کے واسطے کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے. مقالہ کو اگر آپ پڑھیں تو صاف محسوس ہوگا کہ "ضمیر کے منصب و مقام" کی گفتگو اس کام کے ایک اچھے عنوان سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے[1] ــــ لیکن جب یہ کام علمی سطح پر انجام دینے

[1] حاشیہ ملاحظہ ہو اگلے صفحہ پر

کی کوشش کی جائے گی، تو یہ اُس وقت تک نامکمل اور بے معنی رہے گا، جب تک کہ قرآن و حدیث کو بھی اُس مقام سے نہ ہٹایا جائے جس کی بنا پر اسلام کی تشریح اور تعبیر کے سلسلہ میں، قرآن و حدیث کو جاننے والے (یعنی علماء) ایک بدیہی ضرورت بن جاتے ہیں۔ اس لیے مجیب صاحب نے قرآن کے بارے میں بھی وہ کہا جو اوپر اُن ہی کے الفاظ میں آپ پڑھ چکے ہیں، کہ یہ اپنے زمانۂ نزول میں صحیفۂ ہدایت تھا، آج نہیں ہے۔ اور حدیث کی بابت بھی ایسے ہی پیچ دار اور گریز آمیز انداز سے یہ سمجھانے کی سعی فرمائی کہ اس سے استفادے کا دور بھی حیات نبوی کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلعم کی مثال اور اُن کی ہدایتوں کی پوری تقلید در اصل وہی لوگ کر سکتے تھے جو اُن کے ہم عصر تھے، جو اُن کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے اور جو بات سمجھ میں نہ آتی اُس کے بارے میں اُن سے سوال کر سکتے تھے۔ ہم تک جو حدیثیں پہنچی ہیں، اُن پر اُس زمانے کے رائج تصورات اور عمل کا اثر پڑ چکا تھا، جب وہ یکجا کی گئیں۔ چاہے ہم سید احمد خاں (سر سید۔ ع) کے اس خیال سے اتفاق نہ کریں کہ تمام حدیثیں رسول اللہ صلعم کے قول اور عمل کے بارے میں دوسروں کے بیانات ہیں اور اس لیے ہمارے اوپر اُن کی پابندی اسی حالت میں لازمی ہے جبکہ ہماری عقل انھیں قبول کرے، لیکن ہم سید احمد خاں کی اس رائے کو بالکل نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ حدیثوں کی جانچ کے لیے شرع کے خاصے سخت قاعدے بن گئے تھے، صرف اس لیے کہ ہر راوی اور ہر روایت قابل اعتبار نہیں تھی۔" (ص ۱۴۲۔ جامعہ، مئی ۱۹۷۰ء)

مجیب صاحب کا یہ نقطۂ نظر، جو وہ اسلام میں قرآن و حدیث کے مقام و منصب کی بابت پیش فرما رہے ہیں، اگر اُن کے استدلال کی طاقت سے قابل قبول ٹھہر جائے، تو پھر علماء اسلام کو طے ہوئے مقام کے خلاف اُن کا جہاد قابل اعتراض نہیں رہتا، اس کے لیے انھیں مکمل جواز مل جاتا ہے۔ مگر یہ نقطۂ نظر کس قدر سطحی، کس قدر بے مغز، کس قدر کم نظرانہ اور بے خبرانہ ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اگر مجیب صاحب کی تحریریں پڑھنے کے

بقیہ ص ۲۰

لے ہو سکتا ہے۔ یہ محض ہمارا تأثر ہو مجیب صاحب کی نیت یہ نہ ہو، مگر جس انداز سے بات کی گئی ہے اُس سے یہ تأثر ناگزیر ہے۔ اور اس لیے اگر غلط ہے تو اس کی ذمہ داری خود مجیب صاحب پر ہے۔

بجائے کسی سے روایتہً سننے میں آتا تو یقین نہیں آسکتا تھا کہ ایک پروفیسر، جو مسلمان ہی نہیں، مولانا محمد علی اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جیسے مسلمانوں کی قائم کی ہوئی ایک مسلم جامعہ کا شیخ بھی ہے، وہ قرآن وحدیث کے معاملات میں، اس درجہ کم نظری اور بے خبری کے ساتھ بھی بولنے اور رائے دینے کی ہمت کر سکتا ہے!

یہ حیرت واستعجاب حدیث سے زیادہ قرآن پر اُن کی گفتگو سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کے بارے میں اپنے خیال کا کوئی سہارا اگر ان کے ہاتھ لگا ہے تو وہ واحد سہارا معتزلہ کا نظریۂ "خلق قرآن" ہے۔ وہ اس نظریہ کا اس طرح پر حوالہ دے رہے ہیں جیسے معتزلہ قرآن کو "مخلوق" کہہ کر یہی کہنا چاہتے تھے کہ قرآن ایک ابدی صحیفۂ ہدایت نہیں ہے۔ لیکن انھیں جاننا چاہیے کہ معتزلہ کے حاشیۂ خیال میں بھی اس طرح کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ یقیناً معتزلہ سے واقف نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے معتزلہ کو اُن کے افکار وعقائد سے جاننے کے بجائے صرف اس نسبت سے جانا ہے کہ وہ امام احمد بن حنبلؒ جیسے (راسخ الاعتقادی میں ضرب المثل) عالم دین کے مقابل تھے اور بس اس سے تصور قائم کر لیا کہ یہ لوگ راسخ الاعتقادی کے حریف تھے۔ حالانکہ اس تصور کی غلطی صرف اس بات سے بھی ظاہر ہو سکتی تھی کہ معتزلہ نے اپنے اعتقاد کو پوری امت پر ٹھونسنے کے لیے حکومت کی ضرب وتعزیر تک سے کام لینے میں دریغ نہیں کیا، جس کا ذکر مجیب صاحب نے بھی اسی مقالے میں ایک دوسرے مقام پر کیا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی راسخ الاعتقادی کا کوئی مظاہرہ ہو سکتا ہے؟ — راسخ الاعتقادی سے بڑھ کر، یہ تو اعتقادی جنون کے درجہ کی بات ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا معتزلہ کا مدعا قرآن کو مخلوق کہنے سے یہ نہیں تھا کہ اسے ایک دائمی حقیقت اور ابدی ہدایت نہ سمجھا جائے؟ تو عرض ہے کہ ہرگز اُن کا مدعا یہ نہیں تھا۔ انتہا درجہ کا ناواقف ہے وہ آدمی جو ایسی بات کہتا ہے — صرف اس نظریے ہی سے ناواقف نہیں، سرے سے معتزلہ ہی کے بارے میں اُس کو صحیح واقفیت نہیں ہے۔ ورنہ معتزلہ سے فی الجملہ صحیح واقفیت بھی اگر کسی کو ہو تو اُن کے اس خاص نظریہ کے بارے میں اچھی طرح واقفیت نہ ہوتے ہوئے بھی وہ یہ بھی نہیں کہہ سکے گا کہ اس سے مطلب قرآن کی ابدیت کی نفی ہے۔ معتزلہ اور اُن کے مقابل علماء کے طرز فکر میں کوئی ایسا فرق نہیں تھا کہ مجیب صاحب اپنے اور علماء کے درمیان کے فاصلے پر اسے قیاس کرنے لگیں۔ یہ خود علماء تھے اور بنیادی طور پر بس وہی فرق تھا جو علماء محدثین اور علماء متکلمین کے مابین رہا ہے۔ یہ متکلمین ہی کا ایک گروہ تھا جو عہد عباسی کے غیر اسلامی عقیدوں اور فلسفوں کے مقابل اسلام کی طرف سے ہجوم اور دفاع میں بعض نصوص قرآنی کی ایسی تاویل اور کچھ عقائد کی ایسی تعبیر

کرکے بیٹھ گیا جو ان امور میں متوارث خیالات سے مختلف یا کم از کم وحشت انگیز تھیں۔ ان ہی میں سے ایک مسئلہ قرآن پاک کو منجملہ مخلوقات ایک "مخلوق" کہنے یا نہ کہنے کا بھی تھا۔ معتزلہ نے عیسائیوں کی یہ مناظرانہ تکنیک دیکھی کہ وہ قرآن پاک میں حضرت مسیح علیہ السلام کو "کلمۃ اللہ" کہے جانے سے فائدہ اٹھا کر آپ کے خدا ہی کی طرح قدیم ہونے کی دلیل اسے ٹھہراتے ہیں، کہ خدا کی صفت کلام اگر اسی کی طرح ازلی اور قدیم ہو تو اس کا کلام اور کلمات بھی قدیم ہوں گے، حادث اور مخلوق انھیں نہیں کہا جا سکے گا ورنہ کہو کہ قرآن بھی حادث اور یکے از مخلوقات ہو۔ معتزلہ نے اس کے جواب میں یہ موقف اختیار کیا کہ ہاں قرآن مخلوق اور حادث ہو کیونکہ قدیم اور ازلی وجود ایک ہی ہو سکتا ہے کئی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے حضرت مسیح (کلمۃ اللہ و روح اللہ) بھی حادث اور مخلوق ہیں اور قرآن اور دیگر کتب الٰہیہ بھی حادث و مخلوق ہیں۔

اس سے زیادہ تفصیل کا یہ موقع نہیں، کہ اور کیا کیا سوال اس بحث میں پیدا ہوتے تھے اور معتزلہ نے اُن پر کیا موقف اختیار کیا، کہنا صرف یہ تھا کہ معتزلہ کے اس قول کو کہ قرآن مخلوق ہو، اس بات سے کوئی تعلق نہ تھا کہ وہ ایک ابدی صحیفۂ ہدایت بھی ہو یا نہیں؟ اُن کا مقصد صرف اس بات کی نفی کرنا تھا کہ حضرت عیسیٰ یکے از مخلوقات اور عبد و بشر نہیں، خدا ہی کی طرح ایک قدیم اور ازلی ہستی ہیں۔ لہٰذا یادہ سے زیادہ یہ کہ مسلمان بھی قرآن کو غیر مخلوق اور ازلی سمجھ کر (ان معتزلہ کے خیال سے) شرک کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ چنانچہ یہ بحث اُن کے اصول پنجگانہ میں سے "توحید" کے ضمن میں آتی ہو۔ کہاں کی بات تھی اور کہاں لیجا کر اسے پروفیسر مجیب صاحب نے دے مارا! کاش وہ یہی جانتے ہوتے کہ معتزلہ قرآن کی ابدیت میں امام احمدؒ سے کم نہ تھے۔ یا کم از کم اتنی ہی بات وہ سوچ سکتے کہ جو اُمت رسولؐ کو مخلوق مانتے ہوئے بھی اُن کی رسالت کو بالاتفاق ابدی مانتی ہو، اس میں سے اگر کچھ لوگ قرآن کو بھی مخلوق کہدیں تو اُس کا یہ مطلب کیسے ہو جائے گا کہ وہ اس کی ہدایت کو ابدی نہیں مانتے!

اب پروفیسر صاحب کی اصل منطق پر آئیے، کہ

"قرآن کے ذریعہ نازل ہونے سے پہلے اور اُس کے نزول کے بعد جو کچھ تھا اور جو کچھ ہوا، وہ بھی خدا کے حکم سے ہوا اور ہم سے کہا گیا ہو کہ جو کچھ ہوتا ہو اُسے مشیئت ایزدی سمجھیں،"

نیز یہ کہ ــــــ

"قرآن کے نزول کے بعد جو کچھ ہوا، اُس کے لیے، یا جو کچھ ہوا اُس کے باوجود اگر ہم معاملات کو سمجھنے کے لیے قرآن ہی سے ہدایت حاصل کرنا چاہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کے نزول کے بعد جو کچھ ہوا، اُسے کالعدم سمجھنا چاہیے۔"

یہ منطق بھی کہیں کی بات کہیں لے جاکر مار دینے ہی کا ایک دوسرا نمونہ ہے۔ قرآن میں بے شک کہا گیا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے اُسے مشیئت ایزدی سمجھنا چاہیے، مگر اس کا یہ مفہوم کہاں سے نکل آیا کہ قرآن نازل ہوچکنے کے بعد جو کچھ ہو، اُس کی بابت رہنمائی کے لیے ہمیں قرآن کی طرف نہیں بس اپنے ضمیر اور عقل کی طرف دیکھنا چاہیے؟ ان دونوں باتوں میں کوئی دور کا بھی منطقی لزوم پروفیسر صاحب بتا سکتے ہیں؟ — اور پھر اسی قرآن میں اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ — پیروی کرو اُس (ہدایت نامہ) کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے نازل کیا گیا ہے — اور ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ الخ — (یہ کتاب ...... ہدایت ہے خدا کا خوف رکھنے والوں کے لیے ......) جیسی پچاسوں آیتیں بھی تو موجود ہیں۔ اور نہ ہی ان آیتوں میں نہ کسی دوسری آیت میں، کوئی تحدید کی گئی ہے کہ بس فلاں وقت تک کے لیے اس کتاب کے اتباع اور اس سے اہتداء کا حکم ہے۔ سو اگر مشیئت والی آیتوں کا وہ مطلب تھوڑی دیر کے لیے قبول کر لیا جائے جو مجیب صاحب ٹھہرا رہے ہیں، تو ان آیتوں کے ساتھ اُن آیتوں کا جوڑ ایک ہی کلام میں کیسے بیٹھے گا؟

ہم نے جو طویل اقتباس مجیب صاحب کی عبارت کا کچھ اوپر دیا ہے، اُس سے اگلے پیرے میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"ہم یہ سوچ کر کہ جو کچھ ہونے والا ہے۔ خدا کے حکم سے ہے، ایسے عمل سے پرہیز نہیں کر سکتے جو عقل یعنی انسانی عقل کو ضروری اور مفید معلوم ہوتا ہو۔"

یعنی مشیئت کے اعلان و اثبات والی آیتوں سے اس بات کے وہ بھی قائل نہیں ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہو اُسی کو خدا کی مرضی بھی سمجھ بیٹھو، بلکہ اپنے رویے اور عمل کے لیے اپنے آپ ہی کو ذمہ دار سمجھتے ہوئے جو طرزِ عمل صحیح اور درست نظر آئے اُس کو اختیار کرنا چاہیے، یہ اُن کا موقف ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اُسے مشیئت ایزدی سمجھتے ہوئے، اگر عقل سے پوچھا جا سکتا ہے کہ میں کیا رویہ اختیار کروں؟ تو قرآن سے کیوں نہیں پوچھا جا سکتا؟ وہ کون سا گناہ ہے جس کی وجہ سے قرآن تو اپنے زمانۂ نزول کے بعد اس لائق

(معاذ اللہ) نہیں رہا، البتہ عقل سزاوار ہے کہ ہدایت دے؟

اور یہ "زمانۂ نزول اور مابعد نزول" کی بھی خوب ہے! کہ اپنے زمانۂ نزول میں تو حکم الٰہی کی بابت رہنمائی قرآن کا منصب تھا، لیکن یہ زمانہ جیسے ہی ختم ہوا، یہ منصب منتقل ہو کر عقلِ انسانی کے پاس آگیا! جب زمانہ کے حالات و واقعات سے احکام الٰہی اخذ کیے جا سکتے ہیں اور یہ آئینہ ہیں خدا کی مرضی کا تو قرآن کے زمانۂ نزول میں کیا خاص بات تھی کہ یہ وسیلہ بے مصرف اور آئینہ زنگ آلود ہو رہا اور حق کو معذور گردان کے یہ باقاعدہ حکم نامہ خدا کو جاری کرنا پڑا؟ — آخر کوئی بھی تک ہے پروفیسر مجیب صاحب کے اس تفلسف کی؟ اقبالؔ سے وہ بہت ناراض ہیں، مگر بات اس موقع پہ اُسی کی یاد آرہی ہے۔ کیسی خدا لگتی کہی تھی اور کیسی برمحل ہے۔ ؎

پُر ہے افکار سے ان مدرسہ[عہ] والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز

صاف صاف یہ کہنا تو مجیب صاحب کو مشکل ہو رہا ہے کہ قرآن کا منصب ہدایت کوئی چیز نہیں، وحی اصطلاحی کوئی چیز نہیں، نبوت اور رسالت کوئی چیز نہیں! یہ سب مولویوں کا رچایا ہوا ڈھونگ ہے تاکہ دینی رہنمائی کے نام سے ایک طاقتور منصب اُن کے ہاتھ رہے، ورنہ حقیقت میں بس خدا ہے اور انسان! اور ان کے درمیان بالکل براہ راست تعلق! اس بات کو سیدھے سیدھے نہ کہہ کر وہ بدیں خم و پیچ سامنے آتے ہیں کہ قرآن کتاب ہدایت ہے تو سہی، مگر بس اپنے زمانہ نزول ہی کے لیے ہو سکتی ہے۔ ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا اور ورنہ وہ ہوگا کیسے ہم قرآن تک براہ راست پہنچ سکتے ہیں، اس کی راہ میں تو تشریحوں اور تفسیروں کا ایک انبار ہے؟ اور فقہ کی تدوین سے تو خود ثابت ہوتا ہے کہ دور مابعد میں اپنی عقل ہی سے کام لینے کا اصول مانا گیا لہٰذا صحیح راستہ یہی ہے کہ اپنے زمانہ کے حالات و واقعات پر خود غور کر کے ان سے اللہ کی مرضی معلوم کی جائے اور اپنے ضمیر کو گواہ بنا کر اسی روشنی میں ہر شخص اپنا طرز عمل متعین کرے! — لیکن اس ورنہ اور ورنہ اور لہٰذا..... کی منطق کا حال کچھ پہلوؤں سے ابھی ہم نے دیکھ لیا کہ کوئی ایک پہلو بھی دھرنے اور اٹھانے کا نہیں ہے۔ جس پل بٹھائیے ٹیڑھا اور جس پل اٹھائیے لنگ! حقیقت میں کوئی ڈھنگ کا راستہ

عہ اقبالؔ کی اصطلاح میں "مدرسہ" کالج اور یونیورسٹی کا نام ہے، کوئی عربی مدرسہ یہاں نہ سمجھ لے۔

مجیب صاحب یا اُن کے ہم فکر اصحاب کو اپنی بات (یعنی "کلمۂ ضمیر") کہنے کے لیے اسکے سوا نہیں ہو کہ وہ صاف صاف قرآن کے منصب ہدایت اور منزل من اللہ ہونے کا انکار کریں اور یہ تکلف بالائے طاق رکھیں کہ وہ اسلام کے اندر ضمیر کے اُس مقام کی جستجو کر رہے ہیں جو فلاں یا فلاں طبقہ کی خود غرضانہ کاوشوں سے نسیاً منسیاً ہوکر رہ گیا ہے۔ اس تکلف بے جا کے بجائے کھل کر کہیں کہ انسانیت کی نجات اپنے ضمیر اور اپنی عقل کا کلمہ پڑھنے میں ہو نہ کہ (خاکم بدہن) کسی اُمی کے نقوش پا تلاش کرنے اور کسی پرانی کتاب کو دلیل راہ بنانے میں!

کوئی سولی تو گڑی نہیں ہو کہ انجام منصور پیش آنے کا اندیشہ ہو۔ نہ کلیسا بھی یہاں نہیں ہو کہ گلیلو کا حشر آنکھوں میں پھر جاتا ہو۔ اور نہ ہی زہر کا پیالہ بڑا سہی کہ اس کے لیے سقراط کا دل گردہ چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ کچھ نجی تعلقات اور بہت ہوا تو جامعہ کی مسند پہ آنچ آسکتی ہو۔ لیکن اتنی متاع بھی اگر ضمیر کے لیے خطرے میں ڈالی نہیں جا سکتی تو اولاً تو ضمیر پرستی کی دعوت لیکے کھڑے ہونا ہی ایک بوالعجبی۔ (بلکہ بوالہوسی) ہو۔ دوسرے، اس کا حاصل بجز اس کے کیا ہو کہ اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کیا جائے؟ جب تک قرآن پہ ایک ہاتھ ایسے لوگوں کا رکھا رہے گا اور کوشش یہ ہوگی کہ اسلام سے باہر کی نہیں، اسلام کے اندر کی بات اس نقطۂ نظر کو ٹھہرایا جائے، اُس وقت تک سوال و جواب کی یہ دلدل ہی ختم نہیں ہوگی جس کا احساس اوپر کی گفتگو سے بخوبی ہو جانا چاہیے۔ پوری فرصت عمر اسی میں تمام ہو جائے گی اور یہ ثابت نہیں کیا جا سکے گا کہ اسلام میں اس طرز فکر کی گنجائش ہو اور قرآن اس نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہو۔ اس لیے کہ

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ	اس کے نہ آگے سے باطل اس میں داخل
بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ	ہو سکتا ہو نہ پیچھے سے (آ جانے کی کوئی
تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ۔	راہ ہو) یہ نازل کیا ہوا ہو ایک سراپا حکمت
	اور ہر ستائش کے سزاوار کا!

— اس مقصد کے لیے جو بات مجیب صاحب کہیں گے وہ غلط ہوگی، واقعہ کے اعتبار سے بھی اور منطق کے اعتبار سے بھی! جتنے مقدمات مرتب کریں گے وہ غلط در غلط کا مجموعہ اور "حاصل جمع بھی غلط" کا مصداق ہوں گے۔ چنانچہ پورا مضمون اسی غلط در غلط کا ایک عبرت انگیز مرقع ہے۔ الّا یہ کوئی بات استطراداً آگئی ہو۔ آفریں ہو اُن لوگوں کو جنھوں نے میکگل یونیورسٹی میں اسے کسی علمی توقیر کے ساتھ سنا — بشرطیکہ وہ اہل علم ہونے کے ساتھ ساتھ علمی دیانت کے بھی قائل ہوں!

اس طویل مقالے کے ایک ایک جزو کا جائزہ لینے کے لیے تو ایک ضخیم رسالے کی وسعت درکار ہو، جس کا یہ موقع بھی نہیں اور نہ ہی ضرورت ہو۔ مقالے میں پیش کیے گئے فکر کے صحیح ہونے کا اوّلین مدار اس بات پر تھا، جیسا کہ ہم نے گزرے ہوئے صفحات میں دکھا بھی دیا ہو، کہ قرآن کو ایک غیر ابدی اور محض ایک وقتی حیثیت کا ہدایت نامہ مجیب صاحب منوا سکیں۔ اُن کی یہ کوشش کامیابی سے کتنی دور ہو؟ اس کا حال اوپر کی گفتگو سے اچھی طرح کھل چکا ہو۔ تب اُن کا یہ فکر اور نقطۂ نظر کہ ایک مسلمان کو زندگی کے معاملات میں خدا کی مرضی، اب قرآن میں نہیں بلکہ زمانہ کی رفتار اور اُس کے واقعات میں ڈھونڈھنی چاہیے۔ اور اس تلاش میں اُس کی عقل، ایک کامل رہبر اور اس کی پرکھ میں اُس کا ضمیر معیارِ مطلق کا حکم رکھتا ہو، بذاتِ خود کیسا ہی قیمتی اور قابلِ اعتنا بھی کیوں نہ ہو، ایک اسلامی فکر اور اسلامی رائے کہلانے کا مستحق ہرگز نہیں رہتا۔ اور اس لیے آگے اُس وقت تک کے لیے بحث ختم ہو جاتی ہو جب تک وہ اس فکر کو "اسلامی" منوانے کی خواہش ترک نہ کریں یا اس کے لیے دوبارہ ایک کامیاب کوشش کا مرحلہ طے کر دیں۔ ہاں اس سلسلہ میں ایک مسئلہ ابھی باقی ہو۔ اور وہ ہو حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ابدیت کا۔ اس پر گفتگو یقیناً ضروری ہو۔

اس سلسلہ میں مجیب صاحب کی عبارت کا اقتباس، جو اوپر گزر چکا ہو، سامنے رکھ لیجیے۔ اُن کی دلیل حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سندی حیثیت کو ایک وقتی حیثیت ٹھہرانے کے سلسلہ میں یہ ہو، ما در بھی منکرینِ حدیث کے اسلحہ خانہ کا یہ مشترک حربہ ہو کہ حدیثیں ہم تک دوسروں کی روایت سے پہنچ رہی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے قابلِ اعتبار نہ ہونے کا ثبوت خود اس بات میں موجود ہو کہ محدثین نے بہت سخت قاعدے ان روایتوں کو قبول کرنے کے لیے بنائے تھے۔ یہ دلیل دوسری باتوں سے قطع نظر "ہنر ہم در چشم عدو عیب است" کی کیسی عبرتناک مثال ہو! کاش کبھی مجیب صاحب اس پہلو پر غور کر سکیں۔

روایت پر تو دنیا کا نظام قائم ہو۔ جس طرح انسان پچھلے قدم کا سہارا نہ لے تو اگلا قدم نہیں اٹھا سکتا، بعینہٖ یہی معاملہ انسانی فکر و عمل کا ہو کہ ماضی سے بے نیاز ہو کر وہ حال کے مرحلۂ حیات میں ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتا۔ اور ماضی سے رشتہ استوار رکھنے کے لیے روایت کے سوا ذریعہ کون سا ہو؟ ماضی کے واقعات اور تجربات کی روایتیں ہی ہیں جو ہر اگلے دور میں انسانی فکر و عمل کے لیے چراغِ راہ کا کام دیتی اور آگے بڑھنے کی اساس فراہم کرتی ہیں۔ پروفیسر مجیب صاحب اور اُن کے ہم مشربوں کی منطق کہتی ہے کہ

روایتوں کا یہ "پلندہ" دیوار سے مار دو اور حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں کی تاریخ دریا برد کر ڈالو، گویا ایک ع دفتر بے معنیٰ" ہے کہ "غرقِ مئے ناب اولیٰ است"ـــ اگر یہ مطلب قبول نہیں ہے تو پھر کیا روایاتِ حدیث ہی نے کوئی گناہ کیا ہے کہ اور سب معاملات میں تو گزرے ہوئے زمانوں کی روایتیں اور بیانات واجب الاعتنا ہوں گے مگر جسے حدیثِ رسول صلعم کہتے ہیں اُس کی روایتوں سے بے نیازی ہی اولیٰ ہو؟

سب ہی روایتیں واسطہ در واسطہ بیانوں سے عبارت ہیں، اور ان واسطوں کے متعلق کم و بیش وہ تمام ہی سوالات ہر جگہ پیدا ہونے کی گنجائش ہے جو روایاتِ حدیث کے باب میں مجیب صاحب نے اٹھائے ہیں اور جن کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ روایت شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہوتی، لیکن اس کی بنا پر مجیب صاحب یا اُن جیسے دوسرے حضرات کبھی یہ کہتے نہیں سنے گئے کہ ماضی سے جو کچھ روایت ہو کر آرہا ہے وہ قابلِ استفادہ نہیں، مگر حدیث کی روایتیں اُن کی نگاہ میں اس لیے بے مصرف ہو جاتی ہیں کہ "اُن کی جانچ کے لیے شروع ہی سے سخت قاعدے بن گئے تھے"ـــ کوئی جواب کسی کے پاس اس نرالی منطق کا ہے؟ ان روایتوں کی خطا یہ ہوئی کہ ان کے جمع کرنے والوں نے اَلَّم غلّم جمع نہیں کیا، ایک ایک روایت کے لیے شدّ رحال کیا، راویوں کی دیانت، امانت اور حفظ و ثقاہت کا حال انتہائی بے رحمی اور بے مروتی سے دریافت کیا، احتیاط کی باریک سے باریک چھلنیوں میں ان کے بیانات کو چھانے اور ہر مشکوک بات کو ساقط الاعتبار کر دینے میں کسی رو رعایت کو راہ نہیں دی، غرض تاریخ و روایت کی دنیا میں وہ ایک نئی طرح ڈالی جس کی نہ پہلے کوئی نظیر تھی، نہ بعد میں ہوئی۔ مجیب صاحب کی نظر میں روایاتِ حدیث کی یہ انفرادیت اعتبار نہیں پیدا کرتی، بلکہ اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ

"ہر راوی اور ہر روایت قابلِ اعتبار نہیں تھی۔" [عہ]

ـــ دل و نظر کے بیمار اور کیسے ہوتے ہیں؟ "چشمِ عداوت میں ہنر کا بھی عیب بن جانا" اور کسے کہتے ہیں؟

عہ شاید اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ حدیث کے ابتدائی راویوں سے زیادہ ناقابلِ اعتبار راوی دنیا میں کسی سلسلۂ روایت کو نہیں ملے، جو ایسے سخت قاعدے بنانے کی ضرورت کہیں پیش آتی!

مجیب صاحب نے نہیں فرمایا کہ انھیں ان روایتوں کے قابلِ استفادہ ہونے سے انکار نہیں ہے اور نہ ہی اُن کا کلام اس خوش گمانی کی گنجائش دیتا ہے کہ وہ دوسرے معاملات کی روایتوں کی طرح "لائق استفادہ" ہونے کی حد تک بھی حدیث کی روایتوں سے کوئی سروکار رکھنا منظور کرتے ہوں لیکن ڈر ہے کہ وہ کہیں ناقد پر ناانصافی کا الزام نہ لگا دیں کہ میں نے تو کامل تقلید سے انکار کیا ہے، مطلق استفادہ زیرِ بحث نہیں تھا، سو اس اندیشے سے عرض ہے کہ یہ حدیثوں کے واجب الاتباع اور ان میں رونما ہونے والے اُسوۂ نبوی کی تقلید لازم ہونے کا تصور ہی تھا جس نے چھان بین کے اتنے سخت قاعدے شروع ہی سے ان روایتوں کے سلسلہ میں بنوائے ورنہ کسی کو کیا پڑی تھی کہ روایت کے اس معاملے میں اس طرح اپنی جان ہلکان کرتا اور ایسے سخت شرائط اپنے اوپر عائد کیے جاتے جن کا تصور بھی اس سے پہلے کسی معاملے کے اہلِ روایت کو نہیں آیا؟ —— یہ تھا وہ پہلو جس پر روایات حدیث کے سلسلہ میں غیر معمولی جانچ پڑتال کا عالم دیکھ کر ایک صحتمند نظر جانی چاہیے تھی۔ اور اس کے بعد اگر اس تصور سے اتفاق نہیں تھا جس کی بدولت اتنا اہتمام اربابِ حدیث نے کیا ہے، تو عدمِ اتفاق کے وہ وجوہ بتانے چاہیے تھے جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے قابلِ لحاظ ہوں، اُن دلائل پر بحث کرنی چاہیے تھی جن کی اساس پر اس تصور کو حق سمجھنے والوں نے حق سمجھا ہے —— یا اگر بنیادی طور پر اس تصور سے اختلاف نہیں تھا، بلکہ روایتوں سے متعلق اس اہتمام کے باوجود یہ بات بحث طلب تھی کہ اہتمام کا مقصد بھی پوری طرح حاصل ہو گیا ہے اور اب کسی معقول شک و شبہ کی گنجائش ان روایتوں کی صحت کے بارے میں نہیں رہی ہے، تو اس بحث کو سامنے لانا چاہیے تھا اور وہ طریقے بھی بتانے چاہیے تھے جن سے جانچ پڑتال کے سابقہ قاعدوں کی رہی سہی کسر پوری ہو جائے۔

مجیب صاحب ان میں سے کوئی کھکیڑ مول نہیں لیتے۔ بلکہ کھلنا ہی نہیں چاہتے کہ اُن کا ذہن ہے کیا؟ اقتباس سامنے رکھ لیجئے۔ اولیں جملے میں بے ساختہ کچھ کھل جاتے ہیں اور ایک معنی میں یہ بات کہہ دیتے ہیں کہ وہ لوگ جو رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہم عصر نہیں، اُن کے بعد میں آئے ہیں، اُن کے لیے آپ کے اقوال و افعال کی پیروی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مگر دوسرے ہی جملے میں ایک ڈھکن اس پر ڈھک دیتے ہیں اور موقف کچھ ایسا لگنے لگتا ہے کہ پیروی تو ہمیں کرنی چاہیے تھی مگر حدیثیں جس زمانہ میں یکجا کی گئی ہیں اُس زمانہ کے خاص تصورات کی ان میں آمیزش ہو جانی یقینی ہے، لہٰذا پیروی کی جائے تو کیسے کی جائے؟ ان کے بعد تیسرے جملے میں ایک اور خول سر سید کی رائے کا اس

طور پر ذکر کر کے چڑھاتے ہیں، جیسے اُن کی رائے تو بہت ہی آگے گئی تھی۔ مجیب صاحب اس وجہ پر نہیں ہیں بلکہ ـــــ یہ کوئی طریقِ گفتگو ہے؟ اس طرح سنجیدہ مباحث طے ہوتے ہیں؟ اہلِ ضمیر اور اہلِ علم کا یہ شیوہ ہے کہ کھل کر بات کہنے کے بجائے بیچ بیچ کر وسوسہ اندازی کریں؟

بہرحال مجیب صاحب کا اگر موقف یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایتوں اور آپ کے اُسوۂ عمل کی پیروی بعد والوں کے لیے دین میں ضروری نہیں، تو انھیں اُن دلائل سے بحث کرنی چاہیے جو ضروری ماننے کے لیے شروع سے اب تک دیے گئے ہیں۔ یہ موقف نہیں ہے بلکہ بات صرف اس اُلجھن کی ہے کہ فلاں فلاں امکانات کی موجودگی میں یہ اطمینان کیسے کیا جائے کہ حدیث جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے وہ واقعی اُسکی اصلی شکل ہے؟ تو عرض ہے کہ اس سے زیادہ اطمینان بخش (مگر قابلِ عمل) طریقہ جو محدثین نے اس سلسلہ میں اختیار کیا، اگر کوئی اور ہو سکتا ہے تو اسے وہ بتائیں۔ ورنہ جب پیروی کی ضرورت تسلیم ہے تو کسی ذمہ دار اور فرض شناس آدمی کے لیے بنیادی طور پر اُس سے آگے یا اُس سے الگ جانے کا کوئی راستہ نہیں جو فقہائے اسلام اور ان میں خاص کر فقہائے احناف نے احادیث کی پیروی کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے ـــــ یہ جب ہے جبکہ آدمی پورے معنیٰ میں کتاب و سنت کا عالم ہو۔ اگر عالم نہیں ہے تو اُسے صبر کرنا چاہیے کہ اُس کا حصہ بس اُن علماء و فقہاء کی تقلید ہے جن کا تقویٰ و تدین ظاہر و باہر اور معروف و مسلّم ہو۔ اور خدا سے توفیق مانگنی چاہیے کہ اُس کا انتخاب درست اور دل اس انتخاب کے تقاضوں سے سازگار ہو۔ اس کے سوا کوئی راستہ معقولیت اور ذمہ داری کا راستہ نہیں۔ غیر ذمہ داری اور معقولیت گریزی کے راستے بے شک ہزار ہیں۔

بات کافی پھیل گئی، نفسِ مدعا کو پھر سامنے رکھ لیجئے، جو یہ تھا کہ پروفیسر مجیب صاحب جس طرح اس بات کی کوئی دلیل (قرآن یا حدیث سے) نہیں لا سکے کہ قرآن کو اپنے زمانۂ نزول کے لیے احکام خداوندی کا مأخذ اور کتاب ہدایت ماننا چاہیے۔ بعد میں اُس کو یہ حیثیت دینا صحیح نہیں۔ اسی طرح اُن کا یہ خیال بھی محرومِ دلیل ہی رہا ہے کہ حدیث کو دورِ نبوت کے بعد دینی رہنمائی کے منصب پر رکھنا غلط ہے (یا رکھا نہیں جا سکتا)، اس لیے اُن کا یہ اصل نظریہ قابلِ اعتناء ہی نہیں رہتا کہ ایک انسان کا ضمیر اصل رہنما ہے، اُسی سے معلوم کرنا چاہیے کہ کسی معاملہ میں کسی آدمی کے لیے خدا کا حکم کس وقت کیا ہے اور کون سا رویّہ اسلامی رویہ ہو سکتا ہے؟ یہ نظریہ ایک اسلامی نظریہ کی حیثیت سے اُسی وقت قابلِ اعتناء ہو سکتا

دُنیا ڈیڑھ ہزار سال پہلے

(مولانا عبدالسلام قدوائی۔ جامعہ ملیہ دہلی)

آج سارے عالم میں جمہوریت کا غلغلہ بلند ہے۔ گوشہ گوشہ سے انسانی مساوات کے نعرے لگائے جارہے ہیں۔ رنگ و نسل کے امتیاز کے خلاف ہر جگہ صدائے احتجاج بلند کی جارہی ہے۔ مزدور سرمایہ داروں کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، کاشتکار جاگیرداروں کو مٹانے کے لیے کمربستہ ہوگئے ہیں۔ خاندانی سیادت کا جوا کاندھوں سے اتار کر پھینکا جارہا ہے، پیدائشی شرافت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جارہا ہے، ذات پات کی تقسیم ختم کی جارہی ہے، پست قومیں صدیوں کی غلامی کا پھندا گلے سے نکال رہی ہیں، سوسائٹی کے دبے ہوئے طبقے ابھر کر اوپر آرہے ہیں اور قوم و وطن کے تنگ دائروں کو توڑ کر ایک عالمگیر برادری کے قیام کی آرزو کی جارہی ہے۔

سلطانیٔ جمہور کے اس دور اور اخوت و مساوات کی اس فضا میں ہم اندازہ نہیں کرسکتے کہ اب سے چودہ [۱۴] پندرہ [۱۵] سو برس پہلے دُنیا کا کیا حال تھا اور اس کرۂ ارضی پر انسانیت کس طرح سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی لیکن تاریخ کے اوراق میں یہ دلخراش داستان ثبت ہے۔ آیئے عہدِ ماضی کے ان نوشتوں کی مدد سے ہم اس دور کے حالات سمجھنے کی کوشش کریں۔

سیاسی نظام

اس زمانے میں سیاسی اعتبار سے ساری دنیا بدترین قسم کی ملوکیت میں مبتلا تھی۔ سلطنت ذاتی جائداد سمجھی جاتی تھی اور باپ کے بعد بیٹا تختِ حکومت پر بیٹھتا رہتا تھا۔ باشندگانِ ملک کو نہ حکمران کے انتخاب میں کوئی دخل ہوتا تھا نہ نظامِ حکومت میں ان کا کوئی حصہ ہوتا تھا۔ بادشاہ کی زبان قانون تھی اور اس کا فیصلہ اعتراض سے بالاتر تھا۔ رعایا کی حیثیت غلام سے

زیادہ نہ تھی، بادشاہ کی خاطر جان و مال کی قربانی ان کی سب سے بڑی سعادت سمجھی جاتی تھی، حکومت کی اصلاح کی کوئی آئینی صورت نہ تھی حکمراں خواہ کیسا ہی ظالم اور نااہل کیوں نہ ہو لیکن اس کے تبدیل کرنے کے لیے خوں ریزی کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا، اور اس خونریزی کے بعد بھی رعایا کو کچھ حاصل نہ ہوتا تھا عزت و آبرو اور جان و مال کی بربادی کے بعد بھی ان غریبوں کے حصہ میں اس کے سوا اور کچھ نہ آتا تھا کہ ایک بادشاہ کے بجائے دوسرا بادشاہ تخت حکومت پر بیٹھ جاتا تھا اور آئندہ کے لیے وہ اور اس کا خاندان لوگوں کی جان و مال کا مالک بن جاتا تھا، اچھے سے اچھے بادشاہ بھی سلطنت کی آمدنی کو اپنی ذاتی آمدنی سمجھتے تھے اور جس طرح ان کا جی چاہتا تھا اسے صرف کرتے تھے۔

معاشی حالات

بادشاہوں کے بعد رعایا کو جاگیرداروں اور زمینداروں سے سابقہ پڑتا تھا، یہ جاگیردار بادشاہ اور اس کے حکام سے بھی بڑھ کر رعایا کے خون کے پیاسے ہوتے تھے وہ صرف زمین ہی کے مالک نہ ہوتے تھے بلکہ لوگوں کے جان و مال پر بھی انھیں قبضہ حاصل ہوتا تھا۔ کاشتکار زمین پر پوری محنت صرف کرتا تھا اور اپنا خون پسینہ ایک کر کے غلہ پیدا کرتا تھا لیکن اسے مشکل ہی سے اپنی محنت کا پھل ملتا تھا، نہ پیٹ بھر کھانا اس کو میسر ہوتا تھا نہ تن ڈھانکنے اور گرمی سردی سے بچاؤ کے لیے خاطر خواہ کپڑا نصیب ہوتا تھا۔ اس کی کمائی کا بڑا حصہ زمیندار اور ساہوکار کی نذر ہو جاتا تھا اور وہ اور اس کے بال بچے مصیبت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ صرف اس کے کھیت اس سے ہر وقت چھینے جا سکتے تھے بلکہ وہ اپنے مکان سے بھی ہر وقت نکالا جا سکتا تھا۔ کاشتکاروں ہی کی طرح تقریباً اہل صنعت و حرفت کا بھی حال تھا وہ سب جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر تھے۔ ان کے اوپر بھی بے تحاشا محاصل کا بوجھ تھا۔ تجارت اور کاروبار میں محنت کی کوئی اہمیت نہ تھی، سرمایہ دار سب کچھ تھا مزدور کو کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ دولتمند اپنی دولت کسی بھی کام میں لگا کر من مانا نفع حاصل کرتے تھے، کارکنوں کو بہت کم معاوضہ ملتا تھا اور اس محدود معاوضہ کے برابر کام لیتے رہنے کی بھی کوئی ذمہ داری نہ تھی بلکہ سرمایہ دار کا جب جی چاہتا تھا اسے کام سے علیحدہ کر دیتا تھا۔ کم سے کم معاوضہ دے کر زیادہ سے زیادہ خدمت لی جاتی تھی اور مزدور کی مجال نہ تھی کہ کمی اور زیادتی یا بدسلوکی پر اف بھی کر سکے۔ قلت آمدنی کی بنا پر انھیں قرض لینا پڑتا تھا اور قرض لینے کے بعد ساہوکار کی غلامی بھی شروع ہو جاتی تھی۔ سود کا عام رواج تھا، شرح سود کا تعین نہ تھا بلکہ مقروض کی پریشانی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی تھی، جس قدر احتیاج شدید ہوتی تھی اسی قدر شرح

سود زیادہ ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان غریبوں کو سود در سود کے چکر سے نکلنا کبھی نصیب نہیں ہوتا بعض اوقات نوبت یہاں تک پہونچتی تھی کہ بال بچے تک مہاجن کے حوالے کر دیے جاتے تھے اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تھا تو خود اپنے آپ کو ساہوکار کی مستقل غلامی میں دیدیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ اور اس کی اولاد ہمیشہ کے لیے غلام بن جاتے اور جانوروں کی طرح پوری زندگی مالک کی خدمت میں گزارتے تھے۔

ان مشکلات کے ساتھ ساتھ ذات پات کی بندشوں اور برادری کے قاعدوں نے غریبوں کے لیے اور بھی ترقی کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ عزت خاندانی اور پیدائشی تھی جو شخص اونچی ذات سے تعلق رکھتا تھا وہ ہر قسم کی عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا لیکن اگر کوئی شخص اتفاق سے کسی ادنیٰ ذات میں پیدا ہوتا تھا تو اس کے لیے ترقی کی تمام راہیں مسدود ہوتی تھیں، وہ خواہ کتنی ہی کوشش کرے لیکن اس کے لیے عزت سے زندگی گزارنا ناممکن تھا، اعلیٰ ذات کے لوگوں کی خدمت اس کا دائمی فرض تھا اور تا دم مرگ اسے گندے اور ذلیل کاموں میں مبتلا رہنا پڑتا تھا۔

رنگ و نسل کے امتیاز ساری دنیا میں جاری تھے۔ گورے کالوں کو ذلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہر جگہ صفات کی بجائے اتفاقات کی قدر تھی اور اندرونی صلاحیتوں کے بجائے ظاہری علامتوں کو باعث عزت سمجھا جاتا تھا۔ قوم و وطن لڑائیوں کی بنیاد تھے ایک قوم دوسری قوم پر بلا تکلف دست ستم دراز کرتی رہتی تھی اور ایک علاقہ کے رہنے والے دوسرے علاقہ کے باشندوں پر حملہ کرنے اور انھیں اپنا غلام بنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

مذہبی حالت

مذہب نفس کی پاکیزگی اور روح کی بالیدگی کا نام نہ تھا بلکہ اوہام و رسوم کا مجموعہ تھا۔ ہر خلاف عقل و تجربہ بات مذہبی عقیدہ بن جاتی تھی اور ہر بے معنی رواج مذہبی رسم کا درجہ حاصل کر لیتا تھا۔ مذہب لوگوں کے اختلافات ختم کرنے کے بجائے ان کے درمیان اور نزاعات کا باعث تھا، تعصب اور ہٹ دھرمی کا دور دورہ تھا اور رواداری کے بجائے مذہبی جبر کا عام رواج تھا۔ ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب والوں پر ہر قسم کی زیادتی نہ صرف جائز بلکہ کار ثواب جانتے تھے۔

اوپر کی سطور میں جو کچھ لکھا گیا ہو اس سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے کا ایک اجمالی خاکہ ذہن میں آگیا ہوگا، لیکن مناسب معلوم ہو رہا ہو کہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ مختلف قوموں اور ملکوں کے حالات پر بھی ایک

نظر ڈالی جائے تاکہ صورت حال اور زیادہ واضح ہو جائے اور تعین کے ساتھ حالات ہمارے سامنے آجائیں۔

اس زمانے میں امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے تو کوئی واقف نہ تھا بہت سے جزیروں اور شمالی و جنوبی برفانی علاقوں اور صحراؤں سے بھی واقفیت نہ تھی صرف ایشیا، یورپ اور افریقہ یہی تین بر اعظم انسانی آبادی کا مرکز تھے۔

رومی شہنشاہی یورپ اور افریقہ کے اہم علاقوں اور مغربی ایشیا کے ایک معتد بہ حصہ پر رومیوں کا قبضہ تھا۔ رومن امپائر (رومی شہنشاہی) اس زمانے میں دنیا کی وسیع ترین سلطنت تھی، دُنیا کی بہت سی قومیں اس کے حدود میں آباد تھیں، اور بہت سے ممالک اس کے ماتحت تھے، دولت و ثروت کے بے شمار ذخائر اس کے قبضہ میں تھے۔ زرعی اور معدنی پیداوار کے اعتبار سے دنیا میں اُسے غیر معمولی اہمیت حاصل تھی، اس کے باشندوں کو صنعت و حرفت میں کمال حاصل تھا اور تہذیب و تمدن کا بھی اچھا خاصا سلیقہ تھا۔ ان حالات میں خیال تھا کہ رومی حکومت کے تحت انسانوں کو امن و سکون، راحت و اطمینان اور خوشحالی و فارغ البالی نصیب ہوگی۔ بلاشبہ قوت و اقتدار اور وسائل و اسباب کی بنا پر انھیں اس کا پورا موقع حاصل تھا کہ وہ نوع انسانی کو ترقی کی راہ پر چلا سکیں اور آرام و آسائش کی منزل تک پہونچا دیں لیکن تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنا یہ فرض انجام نہیں دیا۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت تو وہ راحت رسانی کے بجائے نوع انسانی کے لیے پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ان کا سیاسی نظام خراب ہو گیا تھا، ان کے معاشی حالات ابتر ہو گئے تھے، ان کی اخلاقی حالت بگڑ گئی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ خود بھی قعر ذلت کی طرف تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے اور اپنے ساتھ نوع انسانی کو بھی تباہی و بربادی کے غار میں گرا رہے تھے۔

زوال روما کے مشہور مؤرخ گبن نے ان حالات کا نقشہ حسب ذیل الفاظ میں کھینچا ہے۔

> اس زمانے میں روم انحطاط کی آخری حد تک پہونچ گیا تھا۔ کسی زمانے میں وہ ایک عظیم الشان درخت کی طرح تھا جس کی چھاؤں میں دنیا کی بہت سی قومیں آباد تھیں مگر بالآخر اب اس پر ایسی خزاں آگئی تھی کہ پھل پھول کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا، پتے جھڑ گئے تھے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر شاخیں بھی خشک ہو گئی تھیں۔ تنے میں بھی گھن لگ گیا تھا اور وہ بھی تیزی سے کھوکھلا ہوتا جا رہا تھا۔ ضعف و انحطاط کی انتہا یہ تھی کہ اب دارالسلطنت تک دشمنوں کی

زد میں تھا۔ لوگ غنیم کے حملہ کے خوف سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ دہشت اور سراسیمگی کی بنا پر سارے کاروبار بند ہو گئے تھے، پُر رونق تماشہ گاہیں ویران پڑی تھیں اور وہ بھرے پرے بازار جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا، اب یکسر سنسان تھے لیکن اس حال میں بھی عیاشی و شہوت رانی کا سلسلہ جاری تھا۔[1]

اندرونی بدنظمیوں اور بیرونی حملوں کا سلسلہ شدت سے جاری تھا، آئے دن کے فتنہ و فساد نے ملک کی معاشی حالت برباد کر دی تھی لیکن پھر بھی امراء، سلاطین اور والیان حکومت کی آنکھیں نہیں کھلتی تھیں، ہر شخص کو اپنے حلوے مانڈے کی فکر تھی، ہر طرف جعل سازی، رشوت خوری، فریب دہی اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ سلاطین و امراء عیش و نشاط میں منہمک تھے۔ اور حکام و عمال سلطنت اپنی خواہشوں کی تکمیل میں مبتلا تھے، فوجی افسر اور سپہ سالار ملک کی حفاظت کی جانب توجہ کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں مشغول تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ رومی فوج جو کسی زمانے میں دنیا کی بہترین فوج سمجھی جاتی تھی، اب کسی شمار میں نہ تھی، نہ تعداد کے اعتبار سے اسے کوئی اہمیت حاصل تھی اور نہ سامان جنگ اور فنون حرب کے لحاظ سے اس کا کوئی قابل ذکر مرتبہ تھا۔ تعداد گھٹتے گھٹتے چوتھائی سے بھی کم ہو گئی تھی بلکہ یہ تعداد بھی صرف درج رجسٹر تھی، زنہ کام آنے کے اعتبار سے ان کی تعداد اس سے بھی کم تھی۔ لیکن اتنی تھوڑی فوج کے لیے بھی نہ تو خاطر خواہ سامان میسر تھا اور نہ ان کی گزر معاش کے لیے کوئی اطمینان بخش انتظام تھا۔ تنخواہیں مشکل سے ادا ہوتی تھیں اور مہینوں کا حساب چڑھا رہتا تھا۔

عام رعایا کی حالت ان سے بھی بدتر تھی۔ ابتدائی کارندوں سے لے کر امراء اور مشیران سلطنت تک ہمہ وقت ملک کے محنت کش طبقہ کا خون چوستے رہتے تھے۔ ٹیکس کی مقدار برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ شاہی مطالبات کے علاوہ امراء اور حکام کے مصارف کا بار بھی غریب رعایا کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ حکومت اور کارندے تفریح اور لذت اندوزی میں بے دریغ خرچ کرتے تھے اور زبردستی رعایا سے وصول کرتے تھے۔ اگر لوگ ادائیگی میں کوتاہی کرتے تھے تو ان پر ایسے سخت مظالم ڈھائے جاتے تھے جن کا خیال کر کے آج بھی دل لرز جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا بالکل قلاش ہو گئی۔[2] پھر صرف اس حد پر ظلم و ستم کا خاتمہ نہ

---

[1] تاریخ زوال روما گبن جلد ۲ ص ۳۷۲

[2] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ زوال روما۔ از گبن

تھا بلکہ رعایا کو ستانا اور تکلیف پہونچانا ان کی مستقل تفریح تھی، وہ آدمیوں اور خونخوار درندوں کا مقابلہ کراتے اور درندوں کے ہاتھوں انسانوں کی تکا بوٹی ہوتے دیکھتے اور خوش ہوتے تھے۔ خود انسانوں کے درمیان خونی مقابلے کراتے "دو دو آدمیوں کے درمیان جنگی کشتی ہوتی جس میں بالآخر ایک قتل ہو جاتا تھا۔ جانوروں کی طرح آدمیوں کو باہم لڑاتے محض تفریح کے لیے انسانوں کو قتل کرتے اور ان کے تڑپنے اور سسکنے کا تماشہ دیکھتے، انسانی جسموں کو آگ میں جلاتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے[1]

یہی حالات ملک کے لیے کیا کم پریشان کن تھے کہ مذہبی تعصب نے اور آفت ڈھا رکھی تھی، ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی تباہی و بربادی کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ حکومت عیسائیوں کے ہاتھوں میں تھی وہ یہودیوں اور مجوسیوں کے جانی دشمن تھے۔ ان کی عبادت گاہوں کی بربادی، ان کے مال و اسباب کی لوٹ کھسوٹ، انکی عزت و آبرو پر حملہ اور انھیں گھر سے بے گھر کرنا آئے دن کے واقعات تھے۔ ان مظالم کا سلسلہ اس شدت سے جاری رہتا تھا کہ وہ اپنی جان سے عاجز آ گئے تھے اور انھیں اس سے نجات کی اس کے سوا اور کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی کہ کوئی بیرونی حملہ آور اس ردمی حکومت کا خاتمہ کر دے۔ اس بنا پر وہ مملکت کی تباہی کے دل سے آرزومند تھے اور ہر اس طاقت کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے جو اس حکومت کو ختم کر کے انھیں ان مظالم سے نجات دلائے۔

تعصب کی یہ کیفیت صرف غیر مذاہب ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ خود عیسائیوں کے اقلیتی فرقے بھی اس سے محفوظ نہ تھے۔ فروعی اختلافات بڑے بڑے ہنگاموں کا باعث ہو جاتے تھے، جن میں ہزاروں اشخاص موت کے گھاٹ اتر جاتے تھے۔ بادشاہ رعایا کے محافظ ہوتے ہیں لیکن یہاں وہ بھی فریق بن گئے تھے شاہ جسٹینن اپنے عقیدہ سے اختلاف رکھنے والوں کو قتل کر ڈالنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔ ان حالات میں سرکاری مذہب سے مختلف خیالات و عقائد رکھنے والوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ دور دراز علاقوں میں بھاگ کر جان بچالیں۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سارے ملک میں بےچینی پھیلی ہوئی تھی، رعایا حکومت سے سخت بیزار تھی۔ اور لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف سے ایسی نفرت قائم ہو گئی تھی کہ وہ اس حکومت کے

---

[1] تاریخ ردما

خاتمہ کے خواہشمند تھے اور رومی سلطنت کے مقابلہ میں انھیں وحشیوں کی ماتحتی بھی گوارا تھی۔ اس اندرونی بے اطمینانی اور بیرونی حملوں کی وجہ سے سلطنت کی چولیں ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ رومی شہنشاہی کی عظیم الشان اور فلک بوس عمارت زمین پر ڈھیر ہونے والی تھی اور ہر شخص کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس صدیوں پرانی شہنشاہی کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے۔

ایران اس زمانے میں دنیا کی دوسری بڑی سلطنت ایرانی تھی۔ یہ رومیوں کے مقابلہ کی سلطنت سمجھی جاتی تھی اور دونوں کے درمیان برابر جنگیں ہوتی رہتی تھیں جن میں کبھی ایک غالب آتا تھا کبھی دوسرا۔ ان جنگوں کی وجہ سے ملک تہہ و بالا ہوتا رہتا تھا اور آئے دن بے دریغ رعایا کا خون بہا کرتا تھا۔ اگر درمیان میں کچھ عرصہ کے لیے جنگوں کا یہ سلسلہ بند بھی ہوتا تھا تو بھی عوام الناس کو کوئی آرام نہیں پہونچتا تھا۔ اطمینان کی زندگی ان کی قسمت میں نہیں تھی اور عزت نہ فارغ البالی اکتسابی نہیں بلکہ پیدائشی تھی شریف کا بیٹا پیدائشی شریف اور امیر کا بیٹا پیدائشی امیر ہوتا تھا۔ نسب و جائداد ایسے دو ستون تھے جن پر پوری ایرانی سوسائٹی کی عمارت قائم تھی۔ عوام و خواص کے درمیان مستحکم امتیاز کی حدود قائم تھے۔ شرفاء و امراء کو مکان، سواری، لباس، عورتوں اور خدمت گاروں سب چیزوں میں امتیاز حاصل تھا۔ ساسانی ریاست کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ پیدائشی طور پر جس کو جو رتبہ مل جائے اس کو اس سے بلند رتبہ کا خواہاں نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ خاندانی پیشہ کے علاوہ اور کوئی پیشہ اختیار کرنا ممنوع تھا۔ کسی نیچ ذات کو حکومت کا کوئی کام سپرد نہیں کیا جاتا تھا۔ امراء و شرفا کے خاندانوں کی پاکئی نسب کو قائم رکھنا اور ان کی جائدادوں کی حفاظت قانوناً لازمی تھی۔ عوام الناس کو حق نہیں تھا کہ کسی امیر کی جائداد خرید سکیں۔ امراء اپنے آپ کو رعایا کی زندگی اور موت کا مالک سمجھتے تھے۔ کسی بھی پست قوم کے آدمی کو خواہ وہ کیسا ہی اچھا کام کرے۔ ترقی کا کوئی موقع حاصل نہ تھا۔ اس امر کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

> "خسرو اوّل یعنی انوشیرواں کو ایک دفعہ رومیوں سے جنگ کے لیے روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ ایک مالدار موچی بادشاہ کو ایک بڑی رقم دینے کے لیے آمادہ ہوا۔ ساسانی عہد کی روایات کی رو سے موچی کی ذات بہت پست تھی تاہم معاملہ طے ہو گیا اور موچی نے روپیوں کے توڑے اونٹوں پر لدوا کر بھیج دیے۔ بادشاہ اس کی خدمت گزاری پر بہت خوش ہوا اور وعدہ کیا کہ روپیہ واپس کرتے وقت ایک معقول رقم اسے اصل زر کے علاوہ بھی دی جائے گی لیکن موچی نے خواہش ظاہر

کی کہ اس کے بیٹے کو بادشاہ کے وزیروں میں داخل کر لیا جائے۔ یہ سنتے ہی بادشاہ نے اونٹ واپس کر دیئے اور روپیہ کو ہاتھ تک لگانا نہ چاہا اور کہا کہ ؎

چو فرزند ما بر نشیند بتخت — دبیری بباید شش پیروز بخت
ہنر یابد از مرد موزہ فروشش — سپارد بدو چشم بینا و گوشش
بدست خرد مند مرد نژاد — نماند بجز از حسرت و سرد باد

کسانوں کی حالت سب سے بدتر تھی۔ ان سے ہر طرح کی بیگار اور خدمت لی جاتی تھی۔ کسانوں کا تعلق زمینداروں کے ساتھ غلاموں جیسا تھا۔ ان کے بڑے بڑے گروہ سپاہیوں اور عہدہ داروں کی خدمت پر زبردستی پکڑ کر لگا دیئے جاتے تھے۔ فوج چلتی تھی تو اس کے پیچھے خدمت اور بار برداری کی غرض سے کاشتکاروں کا انبوہ کثیر پیادہ چلتا رہتا تھا۔ انھیں اس محنت شاقہ پر نہ تنخواہ دی جاتی تھی اور نہ کسی قسم کی اجرت ملتی تھی۔

عورتوں کو بہت بری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی مکاری، عیاری، بد چلنی اور بے وفائی ضرب المثل تھی۔ انھیں ایرانی سوسائٹی میں کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں تھا۔ بیوی کی حیثیت غلام کی سی تھی، یہاں تک کہ اگر شوہر کا جی چاہتا تو اسے کسی دوسرے شخص کو دیدیا تھا۔ ایسی بیوی ان کی اصطلاح میں خدمتگار کہلاتی تھی اور ستم یہ ہے کہ اس فعل کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ لوگ اسے قابل تعریف سمجھتے تھے، اور اس دوران میں دوسرے شخص سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی وہ پہلے شوہر ہی کی قرار دی جاتی تھی۔ حقیقی بہن اور بیٹی تک سے جی چاہتا تو نکاح کر لیتے تھے اور اسے بہت بڑا کار ثواب سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ایسی شادی کرنے والے پر خدا کی رحمت کا سایہ پڑتا تھا اور اس سے کبیرہ گناہوں تک کا کفارہ ہو جاتا تھا[1]

اس زمانے میں ایرانی معاشرہ کی حالت اتنی ابتر اور خراب ہو گئی تھی کہ اہل ایران کے پرجوش مداح امّیان مارسلینوس تک کو اعتراف کرنا پڑا ہے کہ

"وہ بے ہودہ کلمات بکثرت استعمال کرتے ہیں اور بے معنی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ وہ شیخی باز اور تند خو ہیں اور خوشحالی و بدحالی میں یکساں دہشت انگیز ہوتے ہیں۔ حیلہ ساز، مغرور اور بے رحم

---

[1] ایران بعہد ساسانیان، ص ۴۲۹ و ۴۳۸ مصنفہ آرتھر کرسٹن سین پروفیسر السنہ شرقیہ کوپن ہاگن یونیورسٹی ڈنمارک بحوالہ دینکرد و شائستہ و ناشائستہ، دبیست ملتون پہلوی

ان کی خصلت میں داخل ہو۔ وہ اپنے آپ کو اپنی رعایا اور غلاموں کی زندگی و موت کا مالک و مختار سمجھتے ہیں کسی نوکر کی یہ مجال نہیں کہ ان کے سامنے کھڑے ہو کر یا دسترخوان پر کھانا کھلاتے ہوئے بات چیت کرنے یا تھوکنے کے لیے منھ کھولے۔ باوجود تعدد ازدواج کے ان کی زندگی باعفت نہیں ہوتی ہے۔[۱]

قباد اول (پدر نوشیرواں) کے عہد میں ایرانیوں کی حالت یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ :-

"ناموس و ادب کا پردہ اٹھ گیا۔ ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن میں شرافت تھی نہ عمل۔ نہ انھیں خاندان اور قوم کا غم تھا۔ نہ ان میں صنعت تھی نہ حرفت، نہ انھیں کسی قسم کی فکر دامن گیر تھی اور نہ ان کا کوئی پیشہ تھا۔ چغلی و شرارت میں مستعد اور دروغ گوئی و تہمت میں مشتاق تھے۔ یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا اور اسی کو وہ تحصیل مال و جاہ کا ذریعہ بناتے تھے"۔[۲]

اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک میں سخت ہنگامے برپا ہوتے رہتے تھے۔ لوٹ مار کرنے والے امراء کی مجلسوں میں گھس جاتے تھے، مال و اسباب لوٹ لیتے۔ جاگیروں پر قبضہ کر لیتے اور عورتوں کو پکڑے جاتے تھے۔ نئے جاگیردار زراعت سے بالکل ناواقف تھے اس لیے زمینیں رفتہ رفتہ غیر آباد ہو گئیں۔

تعصب حد سے بڑھ کر تھا، سرکاری مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ غیر مذاہب میں زیادہ تر عیسائی تھے۔ انھیں آئے دن جس قسم کی ہیبت انگیز سزائیں دی جاتی تھیں ان کا تصور کر کے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

عیسائی قیدیوں کو بعض اوقات کنوؤں میں بند کر دیا جاتا تھا اور ان میں چوہے چھوڑ دیے جاتے تھے، قیدیوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے جاتے تھے تاکہ وہ اپنے آپ کو ان سے بچا نہ سکیں یہ موذی جانور بھوک میں انھیں کاٹ کاٹ کر کھاتے رہتے تھے۔ انھیں زندہ دیواروں میں چنوا دیا جاتا تھا۔

سخت وحشیانہ اور ظالمانہ سزاؤں کا رواج تھا، ملزموں کو ہاتھیوں کے پاؤں کے نیچے روندا جاتا تھا، الٹا لٹکا دیا جاتا اور تانت کے کوڑوں سے پیروں پر ضرب لگا لگا کر انھیں لنگڑا کر دیا جاتا تھا۔ تکلیف کی شدت میں اضافہ کرنے کے لیے زخموں پر ہینگ، سرکہ اور نمک چھڑکا جاتا تھا۔ آنکھوں میں کھولتا ہوا تیل ڈالا جاتا تھا۔ کانوں اور آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا، اور زبان کھینچ کر نکال لی جاتی تھی۔ کبھی

---

[۱] تاریخ ایران صفحہ ۹۹ [۲] تاریخ ایران بحوالہ نامۂ تنسر

گدی میں سوراخ کر کے اس سے زبان نکال لی جاتی تھی اور جب تک وہ مر نہ جائیں ان کے منہ آنکھوں اور نتھنوں میں برابر سرکہ اور رائی ڈالتے رہتے تھے۔ زندہ آدمیوں کی ساری یا آدھی کھال کھنچوانے کا بھی دستور تھا۔ لوہے کی کنگھی سے ملزم کی کھال اُدھیڑی جاتی تھی اور درد کی شدت میں اضافہ کرنے کے لیے ہڈیاں جو نظر آنے لگتی تھیں ان پر روغن نفت ڈال کر آگ لگا دی جاتی تھی۔ زندہ اشخاص کے پاؤں میں رسی باندھ کر پہاڑوں پر گھسیٹنے کا بھی حکم ہوتا تھا تا آنکہ کھال ہڈیوں سے علیحدہ ہو جائے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پتھروں میں رہ جائے اور آخر کار اس میں صرف پاؤں کی رگیں باقی رہ جائیں۔ زندہ جلانے کا بھی رواج تھا۔ کبھی ملزم کو ذلیل ترین غلام کی خدمت پر مجبور کیا جاتا تھا اور اسے اپنی بیوی تک کو اس کے حوالے کرنا پڑتا تھا۔ نو موتوں کی سزا بھی دی جاتی تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ہاتھ کی انگلیاں کاٹی جاتی تھیں پھر پاؤں کی، پھر کلائیوں تک ہاتھ، اور ٹخنوں تک پیر کاٹے جاتے تھے، پھر کہنیوں تک بانہیں اور گھٹنوں تک پیر پھر کان اور ناک اور سب سے

بقیہ ارشادات ص۴۹

اور بعض چشتیوں کا نقشبندی۔ یہ تقسیم ایسی ہی ہے جیسے وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا[1] مگر اب تو ان قیود کو ہی مقصود بالذات سمجھنے لگے ہیں۔ —— حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایک قادری اور ایک چشتی میرے پاس لڑتے جھگڑتے آئے تھے۔ چشتی صاحب حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ پر اس طرح ترجیح دیتے تھے کہ اُن کی تنقیص ہوتی تھی، اور قادری صاحب بالعکس۔ (حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ) میں نے کہا میاں ایک قادریوں کے باپ ہیں اور دوسرے چچا، علیٰ ہذا القیاس ایک چشتیوں کے باپ ہیں دوسرے چچا۔ سو باپ کبھی گوارا نہیں کرے گا کہ کوئی بیٹا اپنے چچا کی اہانت کرے ..... فضولیات کو چھوڑو اور کام میں لگو ورنہ خود باپ بھی ناراض ہو جائے گا۔

---

[1] اور ہم نے بنائیں تمہاری ذاتیں اور گوتیں تاکہ آپس کی پہچان ہو۔

ایران عہد ساسانیاں ص۳۰۲ تا ۳۰۴

ارشاداتِ حکیم الامت حضرت تھانویؒ
مجالسِ لکھنؤ میں

(۴)

تلخیص : ــــــــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

فرمایا کہ ـــــ ایک صاحب بیان کرتے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا گنگوہی حج کے سفر میں تھے جہاز میں کسی مسئلے میں گفتگو ہوگئی۔ مولانا گنگوہیؒ تو دریا کو کوزے میں بند کرتے تھے اور مولانا نانوتویؒ کوزے سے دریا کو نکالتے تھے۔ دونوں بہت ہی ذہین تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں جب کبھی مدرسے میں ان دونوں صاحبوں کی گفتگو ہوتی تھی تو تمام لوگ جمع ہوجاتے تھے۔ ایک صاحب کی گفتگو سُن کر معلوم ہوتا تھا کہ اب اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہوسکتا، پھر دوسرے صاحب کی گفتگو سُن کر حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح اسی میں سے بات نکال کر جواب دے دیا اور یہ معلوم ہوتا کہ اب اس کا جواب نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح سلسلہ چلا کرتا تھا ـــــ .....

فرمایا ـــــ حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ کی خدمت میں ایک شخص کا لڑکا آیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ شخص آیا اور کہنے لگا کہ میرا لڑکا جب سے یہاں آنے لگا بگڑ گیا۔ حافظ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمیں بھی تو کسی نے بگاڑا ہی ہے۔ ہمیں تو بگاڑنا ہی آتا ہے۔ ہم بھی اپنے ماں باپ کے اکلوتے تھے ـــــ

فرمایا ـــــ ہمارے حضرت (حاجی صاحبؒ) کے یہاں مضامین تو بہت عالی تھے مگر اصطلاحات نہ تھیں ہاں کبھی کبھی بشرطِ شے اور بشرطِ لاشے حضرتؒ کی زبان سے نکلا ہے۔ یہ سُن کر ایک معقولی عالم کو تعجب

ہوا کہ اصطلاحات تو علوم کے کسب سے آتی ہیں۔ حضرت کے یہاں کیسے ہیں؟ یہ وسوسہ ہوا تھا کہ حضرتؒ نے فوراً فرمایا کہ معانی کا القاء کبھی بدون الفاظ کے ہوتا ہے اور کبھی مع الفاظ کے۔ یعنی اس وقت اس مضمون کا القاء مع الفاظ کے ہوا ہے ۔۔۔۔۔

اسی سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ حضرتؒ نے کافیہ تک پڑھا تھا۔ پھر فرمایا کہ ہمارے حضرتؒ کے علوم نہایت عالی ہوتے تھے مگر الفاظ بہت سلیس۔ اور فارسی تو اپنی زبان کی سی تھی۔ ضیاء القلوب کی کیسی اچھی فارسی ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اس کا عربی ترجمہ کیا تھا۔ مولوی جمیل الدین صاحبؒ کہتے تھے کہ وہ ان کے پاس ہے اور کہتے تھے کہ مولاناؒ نے اس پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔ میں بھی اس کتاب کی زیارت کا متمنی تھا مگر اتفاق نہیں ہوا اور اب ان کا (مولوی جمیل الدین صاحبؒ کا) انتقال ہو چکا ہے ۔۔۔۔۔

فرمایا۔۔۔ حضرت حاجی صاحبؒ اپنے خادموں کے لیے قیمتی قیمتی چیزیں بھیجا کرتے تھے۔ کہیں تو مرید ہدیہ دیتا ہے پیر کو، وہاں پیر ہدیہ دیتے تھے مریدوں کو ۔۔۔ میرے پاس کئی چیزیں تھیں تبرکات کے طریقے پر، جو حضرتؒ نے عطا کی تھیں ۔۔۔ مگر میں نے وہ سب چیزیں دوستوں کو تقسیم کر دیں تاکہ میرے بعد کوئی دُکان نہ بنا لے ۔۔۔ بس میرے نزدیک تو تبرک وہی باتیں ہیں جو حضرت سے سنیں اور دل میں اتر گئیں ۔۔۔

فرمایا۔ ایک صاحب تھانہ بھون آنا چاہتے ہیں، میں نے ان کو لکھ دیا ہے کہ میاں وہاں کیا رکھا ہے کھنڈر ہی کھنڈر ہیں لکھنؤ آتے (جبکہ میں لکھنؤ میں برائے معالجہ مقیم ہوں) تو سیر بھی ہوتی اور تفریح بھی۔

فرمایا۔۔۔ کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے مجاہدے زیادہ نہیں کیے تھے۔ وہ باتیں بہت کرتے تھے، مگر سراسر علوم ہوتی تھیں۔ جب حضرت حاجی صاحبؒ تھانہ بھون تشریف رکھتے تھے رات کو سب ذاکر و شاغل لوگ اُٹھتے تھے، یہ بھی اٹھتے، مگر حضرت اوروں کو تو منع نہیں فرماتے تھے ان سے فرماتے تھے کہ سو رہو ہم وقت پر خود اُٹھا دیں گے ۔۔۔ اس انداز سے ان کی تربیت فرمائی گئی ہے۔

فرمایا۔۔۔ مولوی (مفتی) محمد شفیع صاحب (دیوبندی) کے والد مولوی محمد یٰسین صاحبؒ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ ایک روز اُن سے فرمایا۔ مولوی یٰسین میں اُدھورا رہ گیا کامل

نہیں ہوا۔ تمہارے شیخ (مولانا گنگوہیؒ) اگر چاہیں تو میری تکمیل کر سکتے ہیں مگر وہ رسید ہی نہیں دیتے مجھے ان پر غصہ آتا ہے میں اُن سے کہتا ہوں کہ مجھے تمہاری پرواہ نہیں، میں اپنے شیخ کے پاس (مکہ معظمہ) چلا جاؤں گا، تو کہتے ہیں کہ مدرسہ چھوڑ کر جاؤ گے تو گناہ ہوگا۔ بس جی معلوم ہوتا ہے کہ میں ادھورا ہی مرجاؤں گا۔ نہ تو جانے ہی دیتے ہیں نہ خود تکمیل کرتے ہیں۔

فرمایا۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی تقریر میں علمی لغات بہت ہوتے تھے مگر بے ساختہ ——— اور اُن کے یہاں اتنے علوم (ومعارف) تھے کہ سبحان اللہ، اُن کی تقریر سن کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک کتبخانہ کھول دیا، مگر پھر بھی جہاں شبہ ہوتا ماتحت مدرسوں سے پوچھ لیتے تھے اور باوجود اس تبحّر و کمال کے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو بجائے مرشد کے سمجھتے تھے، اسی وجہ سے تو ان سے اصلاح (وتکمیل) کرانا چاہتے تھے ——— مگر جب غصہ آتا تھا تو ناز میں اُن کو بھی بہت کچھ کہہ ڈالتے تھے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں ہدایا کے متعلق فرمایا کیا عرض کروں یہ جو مالی خدمت کرتے ہیں ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ خود شرماتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ہدیہ دے کر اپنے کو تمام قواعد سے مستثنیٰ سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ہدیہ دینے والے کو (لوجہ اللہ ہدیہ دینا چاہیے) اور ہدیہ لے لینے والے کا احسان ماننا چاہیے (قرآن مجید میں) حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا ——— یہ تو ہدیہ دینے والے کا ادب ہے۔ اور ہدیہ لینے والے کا یہ ادب ہے (جو حدیث شریف میں آیا ہے) مَنْ صَنَعَ اِلَيْكُمْ مَعْرُوْفًا فَكَافِئُوْهُ فَاِنْ لَّمْ تُكَافِئُوْهُ فَادْعُوْا لَهٗ ——— (یعنی جو شخص تمہارے ساتھ نیک سلوکی (ہدیہ وغیرہ کی شکل میں کرے) تم بھی اس کی نیک سلوکی اور احسان کا بدلہ دو اور اگر نیک بدلہ (ہدیہ کی شکل میں) نہ دے سکو تو اس احسان والے کے حق میں دعائے خیر کرو)

نیز ہدیہ دینے والے کا ایک ادب چھپا کر دینا ہے اور ہدیہ لینے والے کا یہ ہے کہ اعلان کردے (اگر اعلان سے کوئی مصلحت مانع نہ ہو)۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے عرض کیا کہ اصل تہذیب تو حضرت والا کے یہاں آکر معلوم ہوتی ہے۔

عہ ہم جو تم کو کھلاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کو کھلاتے ہیں ہم تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں نہ شکر گزاری چاہتے ہیں۔

جو لوگ تہذیب تہذیب چلا رہے ہیں اُن کو تو تہذیب کی خبر بھی نہیں۔ اگر حضرت والا کے ملفوظات کو کوئی صاحب انگریزی میں ترجمہ کر دیں تو بہت اچھا ہو۔ فرمایا آپ ہی یہ کام کرلیں دوسروں کو آپ کیوں کہتے ہیں ۔۔۔۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ مختصر نویسی سیکھ لوں اور ملفوظات ضبط کیا کروں۔ مگر بڈھا طوطا کیا پڑھے ۔۔۔۔ فرمایا بڈھے طوطے پر یاد آیا، ایک صاحب نے اپنی بیوی کو پڑھنے کے لیے لکھا تھا کہ شوق تو بہت ہے مگر بڈھا طوطا کیا پڑھے ۔۔۔ میں نے لکھا وہ تو بڈھی مَینا ہیں۔ بڈھا طوطا نہیں پڑھتا نہ سہی بڈھی مَینا تو پڑھ لے گی۔

آداب مجلس کے ذکر میں فرمایا کہ میرے یہاں یہ ہے کہ جہاں دو آدمیوں نے کانا پھوسی کی تو میں کہہ دیتا ہوں کہ باہر جاکر باتیں کرو، یہاں تو میری سنو یا مجھے سناؤ، اور آپس میں گفتگو کرنے کی اگر کوئی ضرورت ہی ہو تو باہر جاکر گفتگو کرو ۔۔۔۔

ایک شخص جلال آباد کے رئیس آئے تھے، مجلس کا رنگ دیکھ کر ایک شخص سے کہا کہ میں اور جگہوں پر گیا ہوں۔ سب جگہ ڈپٹیوں کا اجلاس ہوتا ہے اور یہاں جج کا اجلاس ہے۔ یعنی ڈپٹی کے اجلاس میں تو مدعی، مدعا علیہ، گواہ، وکیل وغیرہ وغیرہ کا شور ہوتا رہتا ہے اور جج کے اجلاس میں سکوت اور خاموشی زیادہ رہتی ہے۔

فرمایا ۔۔۔ قلتِ طعام، قلتِ منام اور جسم کی صحت کا ترکِ اہتمام بعض کی تحقیق میں شرائط طریق ہیں اور ہمارے حضرت (حاجی صاحبؒ) کی تحقیق یہ ہے کہ جسم کی صحت بھی ایک نعمت ہے اور خود بدن بھی ایک نعمت ہے، ان نعمتوں کی بھی قدر کرنا چاہیے ۔۔۔ خود ارشاد باری ہے لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُم اور حدیث شریف میں ہے اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا اِنَّ لِعَيْنَيْكَ عَلَيْكَ حَقًّا (تیرے جسم کا بھی تیرے اوپر حق ہے، تیری آنکھ کا بھی تیرے اوپر حق ہے) نیز اب قویٰ کمزور ہیں۔ ان ریاضات کے متحمل نہیں اور نعمائے حسیہ (حسی نعمتیں) مقبولیت کے منافی بھی نہیں۔ خود ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک غزوہ[1] مکشوف ہوا۔ اہلِ غزوہ کی شان یہ بیان فرمائی ہے۔ يَرْكَبُوْنَ الْبَحْرَ مُلُوْكًا عَلَى الْاَسِرَّةِ (جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ شاہانہ شان سے جہاد کے لیے بحری سفر کر رہے ہیں) مولانا جامی (حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی شان میں) فرماتے ہیں ؎

چو فقر اندر لباسِ شاہی آمد ۔۔۔ بہ تدبیرِ عبید اللّٰہی آمد

---

[1] یعنی جنگ۔

(یعنی فقیری اور درویشی حضرت عبید اللہ احرارؒ کی تدبیر سے لباس شاہی میں آگئی) ــــ ان حضرات کو کسی خاص شان کا اہتمام نہ تھا کبھی کمبل ہے تو کبھی دوشالہ ، ان (کمبل و دوشالہ) میں نہ کوئی شرطِ فقر ہے، نہ منافی فقر ــــ

فرمایا ــــ حضرت حاجی صاحبؒ نے مولانا گنگوہیؒ سے دریافت کیا تھا کہ مقاماتِ باطنی میں کہاں تک پہونچ گئے ہو؟ مولاناؒ نے جواب میں لکھا کہ "الحمدللہ ۔ مدح وذم میرے لیے دونوں یکساں ہو گئے" ۔ پھر تو حضرتؒ نے بہت خوشی ظاہر فرمائی ــــ

مصر سے عیادت کا خط حضرت (حکیم الامتہ) کے نام آیا تو فرمایا ــــ کسی نے تحریری کیا کہ قاہرہ میں بھی (میری علالت کی) خبر پہونچادی ۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ مولوی عبدالسمیع صاحب (بیدل مصنف انوارِ ساطعہ) حضرت مولانا گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ (گنگوہ) ایک بارات میں گئے تھے ۔ حالانکہ باہم بہت اختلاف رہ چکا تھا مگر مولاناؒ نے پھر بھی خاطر داری کی اور فرمایا شام کو کھانا میرے ساتھ کھانا ۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اب تو یہ آئے ہوئے ہیں اس مسئلے (قیام میلاد) میں گفتگو کر لی جائے ، فرمایا نہیں ۔ مہمان کی دلشکنی مروّت کے خلاف ہے ۔ اور دعوت کی ۔ کھانا کھلایا ــــ ان حضرات کا اختلاف نیک نیتی پر مبنی تھا اور اب تو ایک دوسرے سے نفرت پیدا کراتے ہیں جس سے اصلاح کی گنجائش ہی نہیں رہتی ــــ

فرمایا ــــ امرتسر کے ایک صاحب نے مجھ کو لکھا کہ تم نے شرّ القرون کے صوفیہ کی اپنی کتابوں میں حمایت کی ہے ۔ میں نے جواب دیا کہ کیا شرّ القرون میں سب ہی شر (والے) ہیں ۔ پھر یہ صاحب تھانہ بھون آئے تھے اور آنے سے پہلے صاف یہ لکھ دیا کہ جانچ کرنے آتا ہوں ــــ مگر یہاں آکر ان ہی کی جانچ ہو گئی ــــ اس طرح سے کہ اُن کے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے پوچھا کہ مجھ پر قوّتِ شہوانیہ کا غلبہ ہے اور نکاح کی وسعت نہیں تو وہ بزرگ مجھ سے پہلے ہی فوراً بول اُٹھے کہ روزے رکھو اور یہ حدیث پڑھی ــــ وَمَنْ لَمْ یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاءٌ ــــ اُس نے کہا کہ میں نے روزے بھی رکھے مگر کچھ نہیں ہوا ــــ بس وہ تو ختم ہو گئے ۔ دخل در معقولات کے بجائے دخل در منقولات کیا تھا ۔ اُن کی قابلیت تو سب ختم ہو گئی ــــ میں نے اُس شخص سے کہا کہ روایت میں فعلیہ بالصوم آیا ہے ،

علیٰ لزوم کے لیے ہے۔ پھر لزوم یا اعتقادی ہے یا عملی۔ اور ظاہر ہے کہ علاج میں اعتقادی مراد نہیں ہوسکتا
تو لزوم عملی مراد ہوا۔ لزوم عملی تکرار سے ہوتا ہے۔ اسلیے حدیث کا مدلول یہ ہے کہ کثرت سے مسلسل روزے
رکھو۔ اس کی کثرت سے قوتِ بہیمیہ منکسر ہوگی ـــــ چنانچہ رمضان میں اول اول، ضعف نہیں ہوتا حالانکہ
صوم کا تحقق ہوا۔ بلکہ اخیر میں ضعف ہوتا ہے کیونکہ کثرت کا تحقق ہوا۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ
ضعف، نفسِ صوم سے نہیں ہوتا بلکہ کھانے کا جو وقت معتاد بدلا جاتا ہے اُس سے ضعف ہوتا ہے۔ کیونکہ کھانا
دوسرے وقت میں پہلے کی طرح جزوِ بدن نہیں ہوتا ـــــ پس مدار ضعف کا، مخالفتِ عادت پر ہے اور
اسی لیے صومِ دہر کی ممانعت ہے کیونکہ روزانہ روزے ہی کی عادت ہوجائے گی تو قوتِ بہیمیہ میں ضعف
نہ ہوگا ـــــ .... غرضکہ ضعف مخالفتِ عادت سے ہوتا ہے۔ مثلاً سحری میں خوب کھالیا لیکن
عادت کے وقت کھانا یاد آیا اور کھانے کو ملا نہیں تو اس سے ضعف ہوا۔ اور اگر کم کھانا روزے کی روح ہوتی
تو حدیث شریف میں صاف ممانعت ہوتی پیٹ بھر کے کھانے کی۔ بلکہ ایک حدیث میں تو روزہ افطار
کرانے کی فضیلت کے سلسلے میں یہ لفظ ہیں مَنْ اَشْبَعَ صَائِماً (جس نے کسی روزے دار کو پیٹ بھر کر افطار
کرایا) اگر شبع (شکم سیری) مذموم عمل ہوتا تو اشباع (شکم سیر کرنا) جو اس کا سبب ہے ضرور مذموم ہوتا ـــــ
تب (اُن) مولانا کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ پڑھنا اور ہے اور جاننا اور ـــــ .س پر فرمایا کہ
حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک پڑھنا ہے ایک گُننا ـــ تو گُننے کی کوشش کرنا
چاہیے، اور گُننے کی مثال میں (حضرت حکیم الامۃ نے) ایک حکایت بیان فرمائی، کہ ایک شخص ہدایہ کے
حافظ تھے اُن سے کسی غیر حافظ ہدایہ کی گفتگو ہوئی۔ غیر حافظ نے وہ مسئلہ (جس پر گفتگو تھی) ہدایہ میں لکھا
ہوا بتایا۔ حافظ ہدایہ نے کہا کہ ہدایہ میں نہیں ہے۔ اُس نے کہا ہدایہ میں ہے لاؤ ـــــ ہدایہ کو لایا گیا
تو اُس نے دکھایا کہ دیکھو یہ مسئلہ اس مقام سے مستنبط ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ (حافظ ہدایہ) رونے لگے کہ
بھائی پڑھا تو ہم نے مگر سمجھا تم نے ـــــ بس بعض لوگوں کی سطحی نظر ہوتی ہے گہری نظر نہیں ہوتی۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ نقشبندیہ، چشتیہ وغیرہ سب نام ہیں، حقیقت سب کی ایک ہے یعنی
اُولٰئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[ع] ـــ نیز بعض نقشبندیوں کا مذاق چشتی ہوتا ہے

ع۔ یہ اللہ والا گروہ ہے اور اللہ والا گروہ ہی فلاح یاب ہوتا ہے۔

ہندوستان میں علمِ حدیث دسویں صدی ہجری سے پہلے

از مولانا تقی الدین ندوی مظاہری
شیخ الحدیث دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر سورت (گجرات)

عام طور پر مشہور ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کا چرچا شیخ عبدالحق محدث دہلوی (المتوفی سنہ ۱۰۵۲ھ) کی ذات گرامی سے ہوا، اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی ذاتِ گرامی سے ہندوستان میں علمِ حدیث کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ورنہ اس عہد سے پہلے ہندستان علمِ حدیث سے بالکل بے گانہ نہیں تھا۔ لیکن آج کل اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ دسویں صدی تک ہندوستان میں معقولات اور فقہ و تصوف کے سوا علم حدیث بالکل عنقا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے مورخین نے دو واقعات ایسے تحریر کیے ہیں، جن سے اس غلط فہمی کو مزید تقویت حاصل ہوئی، اس لیے سب سے پہلے ان دو واقعات کا تجزیہ اور ان سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔

علم حدیث سے بے اعتنائی کے سلسلے میں ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد میں مسئلہ سماع کی تحقیق کے لیے علماء کرام کی ایک مجلس منعقد ہوئی، مناظرہ کے ایک فریق حضرت نظام الدین اولیاء م سنہ ۷۲۵ھ تھے، اور دوسری طرف ترپن بڑے بڑے علماء تھے، گفتگو کا آغاز ہوا، مورخ فرشتہ لکھتا ہے کہ

"اس مجلس مناظرہ میں حضرت شیخ نے اپنے دعوے کے اثبات کے لیے حدیث نبوی "السماع

کمال الدین سند میں یہ الفاظ لکھنے کے بعد کہ

"بان قرأ هذا الاصل المستخرج من الصحيحين على ساطر هذه السطور"

صحیحین سے حدیثوں کا یہ مجموعہ جو منتخب کیا گیا ہے اس کو ان سطروں کے لکھنے والے سے پڑھا ہے۔

یہ الفاظ لکھتے ہیں،

قراءة بحث واتقان وتحقيق معانيه وتنقير مبانيه

یہ پڑھائی کامل بحث، واتقان اور معانی کی تحقیق اور اس کی بنیادوں کی کھوج کرید کے ساتھ ہوئی۔

یہ ساری تفصیلات شہادت دیتی ہیں کہ مورخ فرشتہ نے حضرت کی طرف منسوب کرکے جو روایت بیان کی ہے وہ ان کا تسامح ہے، اس کو کسی طرح صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا، مغالطہ کی وجہ شاید حضرت کے ملفوظات کا وہ مجموعہ بھی ہو جو فوائد الفواد کے نام سے مشہور ہے۔ ان ملفوظات میں بکثرت حدیثیں آپ کی زبان سے مذکور ہیں اور ان کے رموز و اسرار بھی بیان فرمائے گئے ہیں۔ حضرت کے ان ملفوظات کو پڑھنے کے ساتھ ضروری ہے کہ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ افادہ تصنیف، و تالیف کے لیے حضرت نے قلم نہیں اٹھایا تھا علاوہ ازیں فضائل اعمال میں ضعیف روایتوں کا بھی اعتبار کیا جاتا ہے، اس لیے اس طرح کی روایتوں کا ان میں آ جانا ناگزیر تھا۔ تاہم ان ملفوظات کو بیان فرماتے ہوئے کبھی آپ تنبیہ فرما دیتے تھے کہ "ایں قولِ مشائخ است" یہ مشائخ کا قول ہے، حدیث نہیں ہے، ان ملفوظات میں متعدد جگہ اس قسم کے الفاظ موجود ہیں، کہ کسی کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا "ایں حدیث در کتب احادیث کہ مشہور است و معتبر نیامدہ"[۱] اگر کبھی روایات میں اختلاف ہوتا تو آپ فرماتے "اگر در صحیحین است آں صحیح باشد"[۲]۔ کبھی فرماتے کہ یہ حدیث میں نے از خود کسی کتاب میں نہیں دیکھی ہے۔ بلکہ اپنے استاد مولانا علاء الدین اصولی سے سنی ہے۔[۳]

بہر حال حضرت کے یہ حالات شہادت دیتے ہیں کہ آپ کا علم حدیث میں کیا مقام تھا۔ اس لیے مورخ فرشتہ کی ایک غلط عبارت سے اس کے خلاف استدلال کسی طرح درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔

علم حدیث سے بے اعتنائی کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ علاء الدین خلجی (۶۹۵ھ-۷۱۶ھ) کے دور میں مصر کے ایک محدث شمس الدین ترک، حدیث کی ترویج و اشاعت کی دھن میں ہندوستان تشریف

---

[۱] سیر الاولیا، ص۱۰۱ [۲] فوائد الفواد، ص۲۲۵ [۳] ص۱۰۳ [۴] ص۱۹۵

مُبَاحٌ لِاَھْلِہٖ" کو پیش کیا، قاضی رکن الدین جو شیخ کے فریق تھے، انھوں نے کہا کہ حدیث پیش کرنے کی ضرورت نہیں، آپ تو مقلد ہیں امام ابو حنیفہ کی کوئی روایت پیش کیجیے تاکہ قبول کی جائے حضرت شیخ نے فرمایا! میں حدیث صحیح مصطفوی پیش کر رہا ہوں، اور تم امام ابو حنیفہؒ کی روایت چاہتے ہو، شاید حکومت و اقتدار کا نشہ رکھتے ہو، تو بہت جلد تم اپنے عہدہ سے معزول ہو جاؤگے ...

بادشاہ (جو مجلس میں موجود تھا، نظاہری) حدیث پیغمبرؐ کو سُن کر متفکر ہوا اور کچھ نہ کہا[1]

"السماع مباحٌ لاھلہ" یہ جملہ امام غزالی نے احیاء علوم الدین میں بطور فتویٰ کے نقل کیا ہے، اس کو حدیث نبویؐ قرار دینا مورّخ فرشتہ کا تسامح ہے، بہر حال بعض لوگوں نے اسی لطیفہ کو حضرت شیخ کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے کہ امام غزالی کے قول اور حدیثِ رسولؐ میں حضرت امتیاز نہ کر سکے اور اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس دور میں ہندوستان علم حدیث سے ناآشنا تھا۔

مورّخ فرشتہ ہی کی بات دیکھی جائے تو اس نے سلطان الاولیاء کے حالات میں یہ بھی تحریر کیا ہو کہ حضرت فقہ و تفسیرِ و حدیث اور علمِ کلام کا پوری طرح استحضار رکھتے تھے، در فقہ ابو حنیفہ و تفسیر و حدیث و اصولِ کلام استحضار تمام داشت[2]

اور حضرت شیخ کے حالات میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی طالبعلمی کے زمانے میں مقاماتِ حریری کے چالیس مقامے زبانی یاد کیے تھے، اس کے کفائے، کے طور پر دہلی آکر مولانا کمال الدین دہلوی سے مشارق الانوار کا درس حاصل کیا، اور اس کو بھی حفظ کر ڈالا[3]

سیر الاولیا حضرت کے حالات میں ایک بہترین کتاب ہے، اس کے مصنف میر خورد دہلوی ہیں انھوں نے بھی اس مناظرہ کی پوری تفصیل لکھی ہے، مگر انھوں نے کہیں اس فقرہ کا حوالہ نہیں دیا ہے، جس کو مورّخ فرشتہ نے حضرت کی زبان مبارک سے حدیث کہہ کر بیان کیا ہے[4]

غور کرنے کی بات ہے کہ صغانیؒ کی مشارق الانوار جو صحیحین کی دو ہزار چھ سو بیالیس حدیثوں پر مشتمل ہے۔ حضرت کو زبانی یاد تھی۔ آج موجودہ دور میں شاید ہی کوئی ایسا محدث مل سکے جس کو اتنی بڑی تعداد میں حدیثیں زبانی یاد ہوں، یہی نہیں بلکہ میر خورد نے حضرت کی سند بھی نقل کی ہے، کہ ان کے استاد مولانا

---

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۳۹۱ ج۲ [2] صفحہ ۳۹۱ ج۲ [3] نزہۃ الخواطر صفحہ ۱۸۵ ج۲ [4] سیر الاولیا صفحہ ۱۰۱

لائے، کہا جاتا ہے کہ وہ اسی غرض سے حدیث و متعلقات حدیث کی کوئی چار سو کتابیں اپنے ساتھ لائے تھے، ان کا خیال یہ بھی تھا کہ ایک جامع شرح لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کریں، یہ ابھی وہ ملتان ہی تک پہونچے تھے کہ انھیں معلوم ہوا کہ بادشاہ نماز پنجگانہ کا پابند نہیں، اور نہ جمعہ و جماعت کا اسے خیال ہے، رنجیدہ ہوئے اور الٹے پاؤں واپس چلے گئے [۱] اس واقعہ کو نہایت آب و تاب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان محدث کی واپسی کی وجہ سے عرصہ تک ہندوستان علم حدیث سے محروم رہا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ محدث کہاں واپس گئے اور کس حکومت میں پہونچے کہ جس کا بادشاہ متشرع دوراں تھا؟ یہ زمانہ تو عالم اسلام پر تاتاریوں کی یلغار کا تھا، علاء الدین خلجی کے عہد میں تو تاتاری فتنہ وسط ایشیا، خراسان، ایران وغیرہ سب کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔

—— کیا بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں متعدد خلفاء ایسے نہیں گزرے ہیں جن کی زندگیاں دینی معیار پر نہیں تھیں؟ تو کیا ان خلفاء کے زمانے میں محدثین کرام دمشق و بغداد وغیرہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، ممکن ہے کہ کسی خاص شخص کا یہ حال رہا ہو، مگر عام طور پر محدثین و علماء انھیں ناساعد حالات میں اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ علاء الدین خلجی نہیں بلکہ محمد شاہ تغلق (۷۲۵-۷۵۲) جس کے مقابلہ میں علاء الدین خلجی کو فرشتہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے، اسی تغلق کے عہد میں شمس الدین ترک جیسے مجہول الحال عالم نہیں بلکہ علامہ جمال الدین مزی، حافظ شمس الدین ذہبی اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے شاگرد مولانا عبد العزیز اردبیلی دلی تشریف لائے اور تغلق کے دربار میں باریاب ہوئے ہیں۔ صاحب نزہۃ الخواطر ان کے حالات میں تحریر کرتے ہیں:

قرأ بدمشق على شيخ الاسلام تقي الدين ابن تيمية الحراني وبرهان الدين البرزي وجمال الدين المزي وشمس الدين الذهبي وعلى عدد من العلماء ثم قدم الهند وتقرب الى محمد شاه تغلق فاحسن اليه واكرمه [۲]

دمشق میں شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ حرانی اور برہان الدین برزی و جمال الدین مزی و شمس الدین ذہبی وغیرہ علماء سے تعلیم پائی پھر ہندوستان آئے اور محمد شاہ تغلق کے مقربین میں داخل ہوئے، بادشاہ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا اور بڑی عزت کی۔

---

[۱] امام دلی اللہ از مولانا مسعود عالم ندوی۔ [۲] نزہۃ الخواطر صفحہ ۱۶۳ ج ۲

مشہور سیاح ابن بطوطہ کے حوالے سے مؤلف نے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ مولانا عبدالعزیز اردبیلی نے محمد تغلق کو ایک دن چند حدیثیں سنائیں، جو بادشاہ کو بے حد پسند آئیں، بہت خوش ہوا۔

وقبل قدمي الفقيه وأمر أن يؤتى	ان کے دونوں قدموں کو بادشاہ نے بوسہ دیا اور
بصينية ذهب فيها ألف تنكه	حکم دیا کہ سونے کی سینی میں ہزار تنکہ (اس زمانہ کا
فصبها عليه بيده وقال هي لك	سکہ تھا) لایا جائے، خود بادشاہ نے وہ تنکہ ان
مع الصينية [1]	تنکوں کو آپ پر نچھاور کیا، اور کہا کہ یہ تنکے مع
	سینی آپ کے ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جب مولانا شمس الدین ترک جیسے مجہول الحال محدث کی واپسی سے ہندوستان میں علم حدیث کی بیگانگی پر استدلال کیا گیا ہے، تو ابن بطوطہ کی عینی شہادت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جس ملک میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ذہبی، علامہ مزی کا شاگرد آئے، اور قیام کرے، اس کی ایسی زبردست پذیرائی اور قدردانی ہو، بھلا اس ملک میں علم حدیث کا چرچا نہ رہا ہوگا؟

مجھے اس کا انکار نہیں کہ اس ملک میں درہ خیبر سے آنے والے علماء نے عام طور پر معقولات اور فقہ و تصوف کو رواج دیا، اور اس ملک کے نصاب تعلیم میں یہ فنون حاوی رہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان علم حدیث اور اس کے خدام سے بالکل خالی تھا بلکہ تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد سے اس ملک میں حدیث کے خدام کی ایک جماعت نظر آتی ہے، بالخصوص گجرات و جنوبی ہند میں ان کی تعداد نمایاں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سرزمین ہند پر اسلام کی کرنیں قرن اول ہی میں پہونچ چکی تھیں، مگر ۶۰۲ھ کے بعد جو قطب الدین ایبک کا عہد ہے، باقاعدہ اسلام نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا، ایسی صورت حال میں کیا یہ ملک امام بخاری، امام مسلم، اور امام مالک جیسے محدثین کی طرح علم حدیث کی تدوین میں حصہ لیتا، اور فن اسماء الرجال و فنون حدیث کو مرتب کرتا؟ —— یہ تو انھیں بزرگوں کا حصہ تھا۔ خیال کرنے کی بات ہے، کہ بجز ان ملکوں کے جہاں اسلام پہلی صدی ہجری میں پہونچا، دوسرے وہ ممالک

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۲ صفحہ ۱۶۹ و سفرنامہ ابن بطوطہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۲۔

جہاں اسلام صدیوں کے بعد پورے طور پر پہونچا ہو، اُن کو تدوین حدیث میں حصہ لینے کا کیا موقع تھا۔ یہ سعادت تو انھیں خوش نصیب ملکوں کے لیے مقدر تھی جہاں اسلام پہلی صدی میں پہونچ گیا۔ اس لیے آئندہ اقساط میں ان شاء اللہ تفصیل سے بتایا جائے گا کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد سے بتدریج اس ملک میں علم حدیث کا رواج بڑھتا رہا، اور دسویں صدی تک بھی ہر علاقہ میں محدثین کرام کی ایک بڑی جماعت نظر آتی ہے۔

اب تک اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو پیش نظر رکھنے کے علاوہ اپنے استاذ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدفیوضہم کی ایک قلمی کتاب سے بھی جس میں اس موضوع پر بہت کچھ جمع کیا گیا ہے استفادہ کروں گا۔

نشانِ منزل خاص نمبر

[illegible] مجیب [illegible] خان ندوی استاد اسلامک یونیورسٹی لیبیا [illegible]

دارالعلوم تاج المساجد بھوپال [illegible] نشانِ منزل [illegible] حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی کی یاد میں [illegible] خاص نمبر [illegible] اگست [illegible] شائع ہو رہا ہے۔ [illegible] حضرات [illegible]

پیشگی کافی آرڈر ارسال کریں [illegible]

[illegible]

محبّین الفرقان سے

گزشتہ مہینے کی اشاعت میں اپنے پاکستانی خریداروں سے خطاب کرتے ہوئے جو ایک صفحہ لکھا گیا تھا وہ شاید آپ کی نظر سے بھی گزرا ہو [illegible] اس میں صورت حال کا تذکرہ تھا کہ پاکستان کے لیے ہمارا وہ انتظام چھ سات ماہ سے معطل ہو گیا ہے جس کے ذریعہ وہاں کے خریداروں سے چندہ بروقت وصول ہو کر ایک مقام پر جمع ہو جاتا تھا اس انتظام کے عادی خریداروں میں سے بہت کم حضرات ایسے ہیں جو از خود اپنا چندہ بروقت بھیج دیں یا ہمیں اطلاع ہی دے دیں کہ چندہ جمع کر دیا جائے گا رسالہ آپ جاری [illegible] حالات میں اگر یہ ہو گیا ہے کہ ایک دو یاد دہانیوں کے بعد بھی جن [illegible] فہرست سے خارج کر دیا جائے اور اس کا مطلب [illegible] الفرقان [illegible] تعداد میں [illegible] بھی خاصی کمی۔

یہ صورت الفرقان جیسے [illegible] برداشت نہیں ہو سکتی اس لیے ضروری ہے کہ اس خسارہ کی تلافی جلد از جلد ہو [illegible] الفرقان کے جو محسن اسے برابر نکلتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ [illegible] کا وقت ہے اور اس کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ جس جس کی مقدرت میں جتنے نئے خریداروں کی فراہمی ہو وہ اتنے خریدار قریب ترین وقت میں الفرقان کو فراہم کرنے کی زحمت اٹھائیں۔

الفرقان کو جب کبھی مشکلات پیش آئی ہیں [illegible] حل ہوئی ہیں۔ امید ہے کہ اس بار بھی یہ توقع پوری ہوگی .... والسلام

عتیق الرحمن سنبھلی

نئی مطبوعات

تذکرۃ الخلیل (جدید اڈیشن) مؤلفہ حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھیؒ مع اضافہ و اصلاحات از حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

مجلد، صفحات ۴۶۰، سائز ۱۸×۲۲، قیمت ۹/۵۰

ناشر کتب خانہ اشاعت العلوم۔ محلہ مفتی۔ سہارن پور۔ (یو۔ پی)

شیخ المشائخ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۶۹ھ تا ۱۳۴۶ھ) بزرگان دیوبند میں ایک ممتاز مرتبہ کے مالک ہیں۔ علم دین (بالخصوص علم حدیث) تقویٰ و طہارت، تصوف و سلوک، اتباع سنت اور عمل بالعزیمت کے وہ تمام اوصاف آپ کی زندگی میں نمایاں ہیں جو اسلاف دیوبند کا امتیاز ہیں۔ حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مصنف تذکرۃ الرشید وغیرہ آپ سے فیض یاب ہونے والے معروف بزرگوں میں ہیں۔ اپنے شیخ کا یہ تذکرہ آپ نے نہایت شرح و بسط اور جزئی تفصیلات کے ساتھ لکھا تھا، جو اب دوسری بار حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی نظر ثانی کے بعد کتب خانہ اشاعت العلوم سہارنپور نے شائع کیا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ نہایت سبق آموز اور ایمان افروز واقعات پر مشتمل ہے۔ مصنف خود صاحب نظر عالم تھے اس لیے مجرد واقعات اور حالات کا بیان نہیں ہے بلکہ ان سے نہایت مفید نتائج اور اعلیٰ درجہ کے نکات بھی نکال کر وہ قارئین کے سامنے رکھتے چلے جاتے ہیں۔

کتب خانہ اشاعت العلوم نے اس مبارک تذکرہ کو دوبارہ شائع کر کے ایک اچھی خدمت انجام دی ہے لیکن اور بھی اچھا ہوتا کہ اس میں ذیلی عنوانات کی جو کمی ہے اُسے پورا کرنے کا اہتمام بھی کر دیا جاتا۔ ساڑھے چار سو صفحے کی یہ کتاب جو بڑی گنجان کتابت کے ساتھ ہو اس میں فہرست عنوانات نام سے صرف ایک صفحہ آدمی کو اندازہ ہی نہیں کرا تا کہ کتاب میں کیا کچھ ہے۔ مؤلف کا بھی مختصر سا تذکرہ شروع میں آجاتا۔ اس دوسرے اڈیشن میں ضروری تھا۔ موجودہ حالت میں تو یہ بھی نہیں ظاہر ہوتا کہ کتاب انھوں نے کب لکھی اور کب تک بقید حیات رہے۔ اگر تیسرا اڈیشن چھاپنے کا موقع ناشر کو ملے تو ان باتوں کا خیال ہماری نظر میں بیحد ضروری ہے۔

ہمارے محترم ناشر کی خواہش تھی کہ کتاب پر تبصرہ جلدی ہی ہو جائے اسلیے کتاب کو پوری طرح دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا ورنہ اس کتاب میں کتابت کی غلطیوں کی تفصیل بتائی جاتی

Price Rs. 5/-

Regd No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 38 NO. 6 SEPTEMBER 1970

مرتبہ

عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۸/۰
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی .... ۷۵/ پیسے

جلد (۳۸) | بابت ماہ رجب ۱۳۹۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۰ء | شمارہ (۷)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۸ اکتوبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجکر ہمیں براہ راست اسکی اطلاع بھی دیں، کیونکہ وی پی اب نہیں جا سکے گا لہٰذا ۲۸ اکتوبر تک چندہ کی اطلاع نہ ملنے کی صورت میں ہم مجبور ہوں گے کہ رسالہ بھیجنا بند کر دیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہو۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ــــــــــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی

پروفیسر مجیب (جامعہ ملیہ) کے ایک مقالے کا جائزہ جو گزشتہ اشاعت سے شروع ہوا تھا، زیرِ نظر اشاعت میں اس کی دوسری اور آخری قسط آگئی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک بات یہاں بھی کہنا ہے اور اس کے مخاطب خاص طور سے ہندوستان کے علماء اور طالبانِ علمِ دین ہیں۔

مجیب صاحب کے مقالے کے مقصدی نکات میں دلائل کے لحاظ سے کوئی وزن نہیں، ایک عام صاحبِ دانش کے مقام سے بھی وہ فروتر ہیں، اور قرآن پاک کی دعوت سے ایک فی الجملہ باخبر آدمی بھی انھیں حیرت انگیز اور مضحکہ خیز کے سوا کچھ نہیں قرار دے سکتا، مگر جو چیز اس طرح کی "اصلاحی" تجاویز کا محرک ہوتی ہے یا موقع فراہم کرتی ہے، مجیب صاحب کا یہ مقالہ اس کی پوری غمازی کر رہا ہے۔ اور وہ یقیناً اس کی مستحق ہے کہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی جائے، ورنہ جب تک یہ چیز باقی رہے گی، ہمارے اس طرح کے جائزے اور جوابات اس خطرے کا سدِباب نہیں کر سکتے جو ایسی "اصلاحی" تجاویز کی صورت میں ایک عرصے سے ملتِ اسلامیہ کے سر پر منڈلا رہا ہے اور ہر آئندہ دن میں وہ اپنے لیے زمین کو زیادہ سازگار ہی پاتا ہے۔

وہ چیز خواہ ہمارے لیے کیسی ہی تلخ ہو، علماء کا فکری جمود اور عصری مسائل کے بارے میں اُن کا فرار اور گریز والا رویہ ہے۔ زیادہ تفصیل کا یہ موقع نہیں، مثال کے طور پر صرف مسلم پرسنل لا کے مسئلے کو سامنے رکھ لیا جائے۔ صحیح یا غلط (اور جہاں تک ہم سمجھتے ہیں صحیح) یہ تاثر بن چکا ہے کہ پرسنل لا کے معاملات میں فی الجملہ قانونی ردوبدل کی ضرورت علماء کو تسلیم ہے۔ مجلسیں اور کمیٹیاں اس پہلو سے معاملات کا جائزہ لینے کے لیے بنائی جاتی ہیں لیکن پھر ٹال مٹول کے سوا کوئی دوسرا اثر نہیں پیدا کرتیں۔ اب تک کتنی ہی ایسی کارروائیاں ہو چکی ہیں لیکن لوگ یہ اطمینان حاصل کرلینے سے ہنوز محروم ہیں کہ علماء اور نمائندگانِ دین کا کوئی بھی حلقہ کسی نتیجہ پر پہونچ گیا۔

نہ حالات میں گنجائش ہے کہ اس طرح لیت و لعل سے کام لیا جائے اور نہ علماء کی ذمہ داری اس کی اجازت

دیتی ہے۔ اگر ابتک کے سوچ بچار نے اس نتیجہ پر پہونچایا ہے کہ حالات جوں کے توں رہنے چاہئیں تو اسے صاف طور سے کہہ کر یہ تاثر ختم کیا جانا چاہیے کہ ضرورت کے تو علماء بھی قائل ہیں مگر رہنمائی سے عاجز ہیں اور اس کے ساتھ دلائل سے اپنے موقف پر لوگوں کو مطمئن کرنا چاہیے۔ یہ نہیں ہے، تو جو کچھ بھی [illegible] اپنی ذمہ داریاں دیکھتے ہوئے سمجھ میں آتا ہے اسے حتمی اور قطعی انداز میں نہ سہی ایک رائے کے طور پر بہرحال ان لوگوں کو پیش کر دینا چاہیے جو اس معاملے میں کچھ بتا کے دینے کی ذمہ داری نمایاں طور پر اٹھا چکے ہیں۔ نہ یہ کیا جائے، نہ وہ کیا جائے تو پھر اس کا نتیجہ مجیب صاحب کے جیسے مقالے ہی ہوں گے۔ اور یہ اپنے تمام بے تکے پن کے باوجود بہرحال ہمارا حلقہ اثر بنائیں گے۔ کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا (حدیث نبویؐ) کی روشنی میں ایسے تمام واقعات اور امکانات ایک فطری پہلو رکھتے ہیں۔

مجیب صاحب کے مقالے کا ایک بڑا حصہ علماء کو [illegible] کرنے کی کوشش پر مشتمل ہے، ہم نے اس پر بحث کرنے کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں سمجھی اس لحاظ سے یہ کوئی اتنا [illegible] جتنے ان کے دوسرے مقصدی مباحث۔ تاریخ کو بھی انھوں نے کافی غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ مگر ان کا یہ الزام ہمیں زرا گراں نہیں گزرا ہے کہ عمومی طور پر علماء اجتماعیات میں اپنا وہ کردار [illegible] نہیں کر رہے ہیں، جو ان کے دعوے کی رو سے ان کا منصب ہے۔ علماء کے حق اور دین میں ان کے مقام کا دفاع تو ہمیں دین اور حق کی حفاظت کا [illegible] جانے والی کوئی [illegible] تو وہ کسی کے بھی منہ سے نکلے اس پر برافروختگی حق پسندی نہیں ہے اور نہ (ہماری ناقص رائے میں) کوئی صحیح مصلحت اندیشی مجیب صاحب کے اس مقالے کے اس جزو کو تسلیم کیا جانا چاہیے [illegible] مصلحت اندیشی جس سے وار [illegible] امید نہیں [illegible] ایک صاف حقیقت ہے جسے مصلحت اندیشی [illegible] کی کوشش [illegible] اعتبار [illegible] دینے کی ایک کاروائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہمارے بزرگ ہمیں معاف کریں کچھ مثالیں خود ہمارے علم میں ہیں جو عرصہ سے سوہان روح بنی ہوئی ہیں۔ ابھی دو ماہ قبل اگست کے الفرقان کا اداریہ لکھ کر ایک معنی میں اسی دائرے کی ایک مثال کو ہم نے چھیڑا تھا۔

پانچ چھ سال قبل جب مسلم پرسنل لا اور اس پر پارلیمنٹ کی دخل اندازی کا مسئلہ پہلی بار زور و شور سے اٹھا تو لکھنؤ میں مجلس تحقیقات شرعیہ کے نام سے ملک کے چیدہ اور مختلف حلقوں کے نمائندہ علماء کی ایک مستقل مجلس خاص اسی مسئلہ کی تحریک سے وجود میں آئی۔ لیکن سب سے پہلا جو کام اس مجلس نے پہلی ہی نشست میں کیا وہ یہ تھا کہ اس مسئلہ کو کسی دوسرے مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھا جائے اور آغاز کار ایک دوسرے مسئلے سے ہو لیکن وہ مناسب وقت تو آج تک نہ آیا جس میں پرسنل لا کا مسئلہ زیر غور آتا۔ اور دوسرا مسئلہ (انشورنس کا) جو ہاتھ میں

لیا گیا تھا، اس کے بارے میں جو رہنمائی اس مجلس نے کافی غور و خوض کے بعد دی، وہ مسئلہ کا منھ چھو لینے کے علاوہ اور کسی معنی میں رہنمائی نہیں تھی۔ اور غالباً اس پہلی کوشش ہی کا شعوری یا غیر شعوری اثر تھا کہ مجلس معطل ہونا شروع ہو گئی۔ اور آج دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک چھوٹے سے بورڈ اور مختصر سے کمرے کے سوا، عملاً اس کا کوئی وجود نہیں رہ گیا ہے۔

کیا نتیجہ ان باتوں کا ہوگا؟ کیا یہ محبیب صاحب یا ان سے زیادہ دانشمند اور سلیقہ مند لوگوں کے لیے اس بات کی دعوت نہیں ہو کہ وہ اس خانۂ خالی میں اپنا رنگ آ جمائیں؟

ہم اپنے بزرگوں سے نہایت ادب کے ساتھ ایک بار پھر کہتے ہیں کہ ہمارے جیسوں کی یہ جائزہ نگاری قطعاً بے کار ہو اگر ہم یہ کہنے کے قابل نہ ہو سکیں کہ علماء کی مشینری اپنا کام ٹھیک طور سے کر رہی ہے۔

جامعہ ملیہ کا ذکر آ رہا ہے تو ایک ضروری بات اس کے سلسلے میں کہہ دینے کا بھی اچھا موقع ہے۔ جامعہ کی آبادی اپنی مسجد سے محروم ہے۔ گو تعمیرات میں اس کا منصوبہ کافی پرانا ہے۔ گزشتہ سال ارباب جامعہ نے اس مسجد کی تعمیر کا عزم کیا اور اپیل کی کہ ہندوستان کے مسلمان اس ضرورت کے لیے مجوزہ رقم فراہم کریں۔ ستمبر کے رسالہ جامعہ سے معلوم ہوا کہ اس اپیل پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ـــــ ہمیں معلوم نہیں کہ اس اپیل کو بارآور کرنے کے سلسلے میں جو جد و جہد اہل جامعہ کو کرنا چاہیے تھی وہ کس حد تک کی گئی۔ لیکن اگر اپیل کے کارگر نہ ہونے میں صاحب استطاعت مسلمانوں کی سرد مہری کو دخل ہو تو ہمارے خیال میں ان کا یہ رویہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ جامعہ کی مسجد بہرحال تعمیر ہونی چاہیے۔ خدا کے فضل سے وہاں نماز پڑھنے والے اس تعداد میں موجود ہیں کہ مسجد کی تعمیر وہاں کوئی کار عبث نہیں ہوگی۔ ہم جب پہلے سے بھی سوچتے ہیں مسجد کی تعمیر وہاں ضروری ہی نظر آتی ہے۔

دنیا ڈیڑھ ہزار سال پہلے

مولانا عبد السلام قدوائی جامعہ ملیہ دہلی

(۳)

ایرانی تاریخ میں نوشیرواں کے عدل و انصاف کا بڑا شہرہ ہے لیکن جسم میں میخیں ٹھکوانے اور کھال کھنچوانے کے واقعات اس کے ہاتھوں بھی ہوئے۔ اس زمانہ میں شاہی رعب داب کچھ ایسا تھا کہ رعیت اور زیردستیوں پر امراء کی حکمرانیاں جاری تھیں۔ بادشاہ کو خدائی کا مرتبہ حاصل تھا، دربار میں ہر شخص کو بادشاہ کو سجدہ کرنا پڑتا تھا، اور جب اسے مخاطب کرنا ہوتا تو آپ خدا ہیں کہہ کر خطاب کرنا ضروری تھا۔

نوشیرواں اپنا ذکر ان القاب سے کرتا تھا "وجود ربانی" "زبردستوں کا زبردست، خداؤں کا ہم شکل"[1]

کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ بادشاہ کی رائے سے اختلاف کر سکے۔ ذرا سا اختلاف بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے مرادف تھا۔ اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

اپنے عہد حکومت میں اس نے زمین کا نیا بندوبست کرایا تھا جب یہ کام ختم ہو گیا تو اس نے "ایک کونسل منعقد کی اور دبیر خراج کو حکم دیا کہ لگان کی نئی شرحیں باواز بلند پڑھ کر سنائے۔ جب وہ پڑھ چکا تو خسرو (نوشیرواں) نے حاضرین سے دو دفعہ پوچھا کہ کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ سب

---

[1] قیصر قسطنطین کے نام نوشیرواں نے جو خط لکھا ہے اس میں اپنے بہت سے القاب کے ساتھ مذکورہ بالا الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو تاریخ ایران صہ ۳۲۸

چپ رہو۔ جب بادشاہ نے تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو ایک شخص کھڑا ہوا اور تعظیم کے ساتھ پوچھنے لگا کہ آیا بادشاہ کا یہ منشا ہو کہ نا پائیدار چیزوں پر دائمی ٹیکس لگائے جو بمرور زمانہ نا انصافی پر منتہی ہوگا۔ اس پر بادشاہ للکار کر بولا کہ اے مرد ملعون و گستاخ! تو کن لوگوں میں سے ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں دبیروں میں سے ہوں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو قلمدانوں سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالو۔ اس پر ہر ایک دبیر نے اس کو اپنے اپنے قلمدان سے مارنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ بیچارہ مرگیا۔ اس کے بعد سب نے کہا، اے بادشاہ جتنے ٹیکس آپ نے ہم پر لگائے ہیں، ہمارے نزدیک وہ سب انصاف پر مبنی ہیں۔[1]

بقول رومن مؤرخ "کوپروکوپیوسس" اسے اس بات میں کمال حاصل تھا کہ جو بات وجود نہیں رکھتی اسے بیان کرے اور جو وجود رکھتی ہو اسے چھپالے اور اپنے مظالم کی ذمہ داری مظلوموں پر ڈال دے۔[2] طاقتور کمزوروں کو دباتے تھے، اور ان کے ساتھ بہت ظلم اور بے رحمی کا سلوک کرتے تھے۔[3] ذات پات کی تمیز حد سے بڑھی ہوئی تھی، سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابل عبور فاصلہ تھا۔ نچلے طبقہ کے لوگ نہایت خستہ حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ نوشیرواں کی مالی اصلاحات میں رعایا کی بہ نسبت خزانے کے مفاد کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا تھا۔ گوکہ ادب و تہذیب کی ترقی ہوئی تھی لیکن عوام الناس بدستور عسرت و جہالت کی زندگی گزار رہے تھے۔

اس زمانہ کی حالت کا صحیح نقشہ نوشیرواں کے معاصر ایرانی مفکر اور حکیم بزرویہ نے حسب ذیل الفاظ میں کھینچا ہے۔

"ہمارا زمانہ جو کہنہ سال اور از کار رفتہ ہو چکا ہے اگرچہ ایک روشن پہلو رکھتا ہے تاہم حقیقت میں وہ بیحد تاریک ہے، اگرچہ خدا نے بادشاہ کو اقبال مندی اور کامیابی بخشی ہے اور بادشاہ خود بھی مآل اندیش، توانا، عالی ہمت، متجسس، عادل، رحم دل، فیاض، صداقت پسند، دانا، ذی فہم، فرض شناس، جفاکش، عاقل، امداد کرنے کو ہر وقت آمادہ، حلیم الطبع، معقول پسند، مہربان، ہمدرد، واقف کار، علم دوست، نیکی اور نیکوں کو پسند کرنے والا، ظالموں پر سختی کرنے والا، بے خوف، اہل امداد دینے والا، رعایا کی مرادوں کو بر لانے

---

[1] طبری صفحہ ۹۶۱ [2] ایضاً [3] اگاتھیاس ۳۰، ۳۲

والا، اور اس کی تکالیف کو دور کرنے والا ہے۔ لیکن باوجود اس کے ہمارا زمانہ ہر پہلو سے روبہ تنزل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے صداقت سے ہاتھ اٹھالیا ہے۔ جو چیز مفید ہے وہ موجود نہیں ہے اور جو موجود ہے وہ مضر ہے۔ جو چیز اچھی ہے وہ مرجھائی ہوئی ہے اور جو بری ہے وہ سرسبز ہے۔ دروغ کو فروغ ہے اور نیکی بے رونق ہے۔ علم پستی کے درجہ میں ہے اور بے عقلی کا درجہ بلند ہے۔ بدی کا بول بالا ہے اور شرافت نفس پامال ہے۔ محبت متروک ہے اور نفرت مقبول ہے۔ فیض و کرم کا دروازہ نیکوں پر بند ہے اور شریروں پر کھلا ہے۔ غداری بیدار ہے اور وفا خوابیدہ ہے۔ دروغ مثمر ہے اور راستی بے ثمر ہے۔ حق منادب ہے اور باطل غالب ہے۔ حکام کا فرض صرف عیاشی کرنا اور قانون کو توڑنا ہے۔ مظلوم اپنی ذلیل پر قانع ہے اور ظالم کو اپنے ظلم پر فخر ہے۔ حرص اپنا منہ کھولے ہوئے ہے اور دور و نزدیک کی ہر چیز کو نگل رہی ہے۔ قناعت ناپید ہے۔ شریروں کا سر عرش پر ہے اور نیک قعر مذلت میں ہے۔ شرافت قلب بلندی سے پستی میں آگری ہے اور دنائت کو عزت و طاقت نصیب ہے۔ تسلط لائقوں سے نالائقوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مسرت کے نشے میں یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے نیکی کو مقفل اور بدی کو رہا کر دیا ہے[1]

۵۷۹ء میں نوشیرواں کا انتقال ہوا، اس کے بعد حالات اور خراب ہوتے گئے، اس کا بیٹا ہرمز چہارم کے نام سے تخت نشین ہوا لیکن اس سے امراء، پیشوایان مذہب اور شرفاء قوم ناراض تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال کی مختصر بادشاہی کے بعد ۵۹۰ء میں معزول ہوا اور چند دن بعد قتل کر دیا گیا، اس کی جگہ خسرو دوم تخت پر بٹھایا گیا لیکن بیرونی لڑائیوں، اندرونی بدنظمیوں اور خانہ جنگیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، اور ملک کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ خسرو دوم کے خلاف شروع میں بڑی بغاوت ہوئی جس کے نتیجہ میں اسے تخت و تاج سے ہاتھ دھونا پڑا لیکن پھر قیصر روم ماریس (MAURICE) کی مدد سے دوبارہ ایران پر قابض ہوا۔ اور ایک طویل زمانہ (۶۲۸ء تک) بادشاہت کرتا رہا۔ لیکن رعایا کی حالت میں کوئی ترقی نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیونکر؟ نہ بادشاہ کو اس کی فکر تھی نہ امراء کو۔ خسرو دوم انتہائی درجہ کا خود پسند اور متکبر تھا۔ وہ بڑا حریص تھا۔ لوگوں کی جائداد و مال پر حرص

---

[1] ایران بعہد ساسانیان بحوالہ کلیلہ و دمنہ دیباچہ برزویہ۔

کرتا تھا۔ اس کے افسر خراج کے وصول کرنے میں بڑی سختی کرتے تھے۔ اور جبر و تعدی کے ساتھ لوگوں کے مال چھین لیا کرتے تھے خسرو کی طبیعت کی نمایاں ترین خصوصیت حرص و زر پرستی تھی۔ اس نے ہر ممکن طریقہ سے بے اندازہ دولت جمع کی اور اسے رفاہ عام کے کاموں سے بچا کر اپنے خزانوں میں بھرا۔ وہ اس قدر کینہ پرور اور بدگمان تھا کہ جو لوگ سرگرمی کے ساتھ اس کی خدمت کرتے تھے اُن کو مروانے کے لیے بھی مواقع ڈھونڈھتا رہتا تھا۔ بڑے بڑے وفادار افسروں کو محض وہم پر قتل کروا دیتا تھا۔ اس طرح اس نے لوگوں کی زندگی دشوار کر دی تھی اور وہ اس سے سخت نفرت کرنے لگے تھے۔ وہ لوگوں کو ذلیل سمجھتا تھا۔ اس کی سیاہ دلی اور ناخداترسی اس درجہ تھی کہ اس نے اپنے باڈی گارڈ کے افسر کو حکم دیا کہ جیل خانوں میں جتنے قیدی ہیں سب قتل کر دیے جائیں جن کی تعداد چھتیس ہزار تھی۔ الغرض خسرو کے جو حالات مختلف ماخذوں سے ہمیں معلوم ہوئے ہیں ان کو دیکھ کر اس کے ساتھ کوئی محبت یا ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کینہ پرور مکار، حریص اور بزدل بادشاہ کے خصائل میں کوئی دلکش چیز تلاش کرنا بے سود ہے۔ اس نے اپنی رعایا پر جو ناقابل برداشت بوجھ ڈال رکھا تھا اس کا صحیح اندازہ صرف سونے چاندی اور زیورات کے ان ڈھیروں سے نہیں ہو سکتا، جو اس کے خزانے میں بھرے ہوئے تھے بلکہ ان کے ساتھ ان کثیر رقموں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو بادشاہ اور اس کے دربار کے سامان عیش و عشرت میں صرف کی جاتی تھیں، فیشن پرستی اور فضول خرچی کا یہ حال تھا کہ اس کے محل میں باندیوں کے علاوہ تین ہزار بیویاں تھیں، خدمت کے لیے تین ہزار نوکر، سواری کے لیے آٹھ ہزار پانچسو گھوڑے اور سات سو ساٹھ ہاتھی تھے۔ اور بار برداری کے لیے بارہ ہزار خچر تھے۔ پیشکار ... نام اور محلات کی آراستگی پر بیدریغ روپیہ صرف ہوتا تھا اور اس کے بوجھ سے غریب رعایا پسی جا رہی تھی۔[1]

ان حالات کی اصلاح کی کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی، امراء و وزراء سب اسی رنگ میں تھے۔ علماء اور دینی رہنماؤں سے توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے پند و نصائح اور اثر و رسوخ سے اس صورتحال کو تبدیل کریں، لیکن ان کی حالت خود ہی قابل اصلاح تھی۔ ایران کا اصل مذہب زردشتی تھا لیکن زردشت کی تعلیم صدہا سال کے تغیرات سے بہت بدل گئی تھی۔ اوستا کے نسخوں میں کافی تحریف ہو چکی تھی اور اس کے

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ ایران بعہد ساسانیان ص ۶۰۵، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۲۴، ۶۶۱

مناسب کچھ سمجھے جانے لگے تھے۔ پھر مانوی، عرفانی اور مزدک کے خیالات و عقائد کی آمیزش نے صورتحال اور زیادہ ابتر کر دی تھی اور نہ صرف عقائد خراب ہو گئے تھے بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی اخلاقی قدریں کمزور ہوتی جا رہی تھیں، زندگی بے مقصد ہو گئی تھی، نفس کی پاکیزگی کا خیال برائے نام ہی رہ گیا تھا اور انسانیت کی بے غرض خدمت کا جذبہ کہیں مشکل ہی سے دکھائی دیتا تھا ہر جگہ عیش پرستی اور ہوس رانی کا دور دورہ تھا۔ بقول عصر حاضر کے ایک نامور مؤرخ کے "فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی۔ زرتشت کی آگ کی گرمی ختم ہو گئی تھی، نور و ظلمت کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کر دی تھی یزداں و اہرمن کی دوعملی حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت برباد کر دی تھی۔ اندرونی بدنظمی، باہمی خانہ جنگی بادشاہوں کی تغافل شعاری، امراء کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہوتی جا رہی تھی"[1]

چین سیاسی اعتبار سے روم و ایران کا ہم پلہ کوئی اور ملک نہ تھا لیکن بعض اعتبارات سے چین اور ہندوستان بھی قابل ذکر ہیں۔ چین کو دنیا کی تمدنی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے کسی زمانے میں اس نے تہذیب و تمدن کی بڑی خدمت انجام دی تھی، لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت اسے دنیا میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ نہ اس کا کوئی سیاسی وزن تھا، نہ اس کی تہذیب و ذہنیت کی کوئی قدر و قیمت تھی نہ اس کے روحانی فلسفہ اور مذہبی نظام کی کوئی قیمت سمجھی جاتی تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانچسو۵ برس پہلے حکیم کنفیوشس (Confucius) نے اصلاح و تعمیر کا ایک اہم پروگرام پیش کیا تھا لیکن اب اس کی وفات کو ایک زمانہ ہو گیا تھا ہزار برس کی طویل مدت میں اس کی حقیقی تعلیمات نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ اخلاقی و معاشرتی اصول کی وضاحت کرنے والا اس کا مرتب کردہ کوئی لٹریچر موجود نہ تھا۔ اس کی تعلیمات پر سب سے قدیم کتابیں اس کے پوتے (Tze - Sze) کی "DOCTRINE OF THE MEAN" اور اس کے شاگرد (Tasang - Sin) کی "THE GREAT LEARNING" سمجھی جاتی ہیں لیکن ان کی بھی تاریخی تفتیش کے بعد کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی ہے، اور اس کا کوئی قطعی ثبوت

---

[1] سیرت النبی جلد چہارم مصنفہ مولانا سید سلیمان ندویؒ

بہم نہیں پہونچتا جس سے یہ یقین ہوسکے کہ یہ کتابیں زمانے کی دست برد سے محفوظ رہی ہیں بلکہ اس کے برخلاف اس کا پورا امکان معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر بہت کچھ تحریف ہوگئی ہو، کیونکہ حکیم کنفیوشس کے انتقال کے ۲۲۵ برس بعد چین میں بادشاہ "TSIN" کا غلبہ ہوگیا تھا۔ یہ شخص حکیم کنفیوشس کا بڑا سخت مخالف تھا۔ اس نے چین پر تسلط ہوجانے کے بعد ان کی تمام یادگاریں مٹادیں، ان کے معتقدوں کو زندہ جلادیا اور سب قدیم تحریریں اور کتابیں پھونک دیں جن پر کنفیوشس کے خیالات وعقائد کی بنیاد قائم تھی۔ ایک عرصہ کے بعد چین میں دوسرا حکمراں خاندان ہان "HAN" برسراقتدار آیا۔ یہ حکیم کنفیوشس کا بڑا معتقد اور قدردان تھا۔ اس نے برباد شدہ آثار اور کتابیں پھر سے مرتب کرانے کی کوشش کی اور اب کنفیوشسی عقائد و اصلاحات کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے وہ اُن عہد ہی کا مرتب کردہ ہے لیکن محققین کے نزدیک تاریخی طور پر ان کی صحت ثابت نہیں بلکہ زیادہ تر جعلی سمجھی جاتی ہیں۔[1]

تفصیل بالا سے ظاہر ہے کہ حکیم کنفیوشس کے انتقال کے سوا دو سو (۲۲۵) برس بعد ہی اس کی تعلیمات دنیا سے مٹ گئی تھیں پھر جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں یعنی چھٹی صدی عیسوی وہ تو اور بعد کا دور ہے۔ اس وقت تو حکیم موصوف کا صرف نام ہی ذہنوں میں رہ گیا تھا۔ ان کی حقیقی تعلیمات سے واقفیت کا کوئی امکان باقی نہ رہا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ عقائد کی گرفت ڈھیلی ہوگئی تھی اور اعمال ان کی رہنمائی سے آزاد ہوگئے تھے۔

حکیم کنفیوشس کے علاوہ ایک زمانے میں چین میں بدھ مذہب کا بھی اثر تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ڈھائی سو برس پہلے بدھ مذہب کے مبلغ چین پہونچے تھے اور انھوں نے اپنے خیالات پھیلائے تھے لیکن اب بدھ کی حقیقی تعلیم بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ اس وقت صرف عمل میں کچھ رسوم اور ذہن میں چند نقوش باقی رہ گئے تھے، ایمان صحیح اور اعمال صالحہ کے بجائے مقدس مقامات کی زیارت اور برکات سے اکتساب فیض جدوجہد کا مقصد بن گیا تھا ۔۔۔ الغرض چھٹی صدی عیسوی میں چین میں بھی دین و آئین اور اخلاق و معاشرت کا کوئی مستحکم نظام نہ تھا نہ کوئی ایسا ضابطۂ حیات موجود تھا جو زندگی کی کشاکش میں دلیل راہ کا کام دیتا، انسانیت کی صحیح خدمت

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، عنوان CONFUTIUS

کی راہ دکھاتا، جمہوریت و مساوات کا درس دیتا، نوع انسانی کے اختلافات مٹاتا اور ایک عالمگیر برادری کی بنیاد مستحکم کرتا۔

ہندوستان ہندوستان ایک زمانہ میں انسانی تہذیب و تمدن اور اخلاق و کمالات کا مرکز تھا، کبھی یہاں قدم قدم پر نفس کی پاکیزگی اور روح کی بالیدگی کا سامان تھا لیکن اب ہر جگہ سناٹا تھا، علم و حکمت کی مسندیں خالی تھیں، گیان دھیان کے استھان سونے پڑے تھے، عدل و انصاف کے مرکز ویران تھے، زندگی کے ہر گوشہ میں انتشار برپا تھا، حکومت وجہاں بانی کے تخت چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی آماجگاہ تھے، موریا اور گپت خاندان کے طاقت ور فرمانروا مدت ہوئی ختم ہو چکے تھے اب چندر گپت، اشوک، کنشک اور وکرماجیت کے صرف افسانے زبانوں پر تھے، سیاسی طور پر ملک سیکڑوں ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا اور آئے دن جنگ و جدل کا بازار گرم رہتا تھا۔ گپت خاندان کے زوال کے بعد ۵۲۰ھ سے ۶۰۴ھ تک ہندوستان کی حالت انقلابی رہی، اس عرصہ میں نہ کوئی بڑا بادشاہ ہوا اور نہ کوئی اہم واقعہ پیش آیا، شمالی ہند کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔[1]

۶۰۴ھ کے بعد راجہ ہرش وردھن نے ان حالات کو سنبھالنے کی جد و جہد کی لیکن بندھیاچل کے اسی پار تک اس کا اثر ہو سکا جنوبی ہند پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور چالوکیہ خاندان کے راجہ پل کیسن ثانی نے ایک زبردست لڑائی کے بعد اسے سخت شکست دی۔ اس کے بعد جنوبی ہند کی طرف اس کی پیش قدمی رک گئی اور اس کا دائرۂ حکومت شمالی ہند تک محدود ہو گیا۔ ہرش کی زندگی تک شمالی ہند کا شیرازہ بندھا رہا لیکن اس کے انتقال کے بعد یہ شیرازہ ایسا بکھرا کہ پھر کسی طرح کوئی نظم قائم نہ ہو سکا اور سارے ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا تھا۔

مذہب کی اصلی تعلیم نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی، رام اور کرشن کی حقیقی زندگی افسانوں میں چھپ گئی تھی۔ ویدوں کی صحیح تعلیم پر رسوم و رواج کا پردہ پڑ گیا تھا۔ ویدوں کی اصلی تعلیم توحید کی تھی[2] لیکن رفتہ رفتہ اس کا اصلی مطلب ذہن سے محو ہوتا گیا اور تشبیہہ و استعارے حقیقت سمجھے

---

[1] تاریخ قدیم ہند مصنفہ کے۔ ایم۔ پائینکار [2] مورخوں کی تاریخ

جانے لگے، بیرونی اثرات سے متاثر ہونے سے پہلے ویدک مذہب میں بُت پرستی کا وجود نہ تھا۔ شاعرانہ الفاظ میں کبھی خدا کی صفات انسانی شکل و صورت میں بیان کی جاتی ہیں مگر اس عہد کے لوگوں نے کبھی بت نہیں بنائے، جو اب دیوتا کہے جاتے ہیں وہ اس ذات واحد کے مختلف نام تھے[1] لیکن آثار قدرت کا بیان فطرت پرستی تک لے گیا اور فطرت پرستی نے دیوتا پرستی تک پہونچا دیا اور آریا مذہب رسوم و قربانی کے ڈھکوسلوں میں پھنس کر سحر اور افسانہ ہوکر رہ گیا۔ ہر دلعزیز شعائر مذہبی سحر شیطانی میں تبدیل ہو گئے۔ اس وقت اگرچہ ارباب مذہب اس غلط روی کو روکنے کی کوشش کر سکتے تھے لیکن ماہرین الٰہیات، ارباب فلسفہ اور مذہب پر غور و خوض کرنے والوں نے عام مروجہ مذہب کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی[2] مذہبی رہنما رشک و حسد میں مبتلا تھے۔ ان کے دل باہمی غیظ و غضب سے بھرے ہوئے تھے۔ انھیں نہ اپنے نفس پر قابو حاصل تھا اور نہ صفائی قلب میسّر تھی[3] مندروں کے محافظ بداخلاقی کا سرچشمہ تھے جو لاکھوں کروروں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام پر خوب لوٹتے تھے[4] ویدک عہد میں اصنام پرستی کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانے میں مندروں میں بت پرستی علی العموم رائج ہوگئی تھی اور دیوتاؤں کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ تک پہونچ گئی تھی[5] ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی، لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہوگئی تھی جو نظام معاشرت کے لیے تباہ کن تھی[6] عورتوں کو محکومیت اور غلامی کا درجہ دیا گیا تھا[7] قوانین نامنصفانہ وضع کیے گئے تھے جن میں علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری اور بعض پر جور و ستم ہوتا تھا۔ برہمن خواہ کتنے ہی سنگین جرائم کا ارتکاب کرے سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اچھوت کا کسی اعلیٰ ذات والے کو چھونا جرم تھا، اگر نیچی ذات والا اونچی ذات والے کو مارے تو حکم تھا کہ اس کے اعضاء کاٹ لیے جائیں۔ اگر گالی دے تو زبان کاٹ دی جائے،

---

[1] ملاحظہ ہو "ویدک ہند" مصنفہ میڈم زیڈ۔ اے۔ راگوزن صفحہ ۸۲ [2] تاریخ ہند قدیم کے۔ ایم۔ پانکا
[3] ملاحظہ ہو مکالمہ گوتم بدھ اور ندا ایتا برہمن۔ کے۔ ایم۔ پانکار [4] ہندوستان قدیم جلد ۳ صفحہ ۲۸۳ مصنفہ آر۔ سی۔ دت۔ [5] ایضاً صفحہ ۲۷۶ و صفحہ ۳۸۱ [6] ایضاً جلد ۳ صفحہ ۳۰۷
[7] ایضاً صفحہ ۳۳۱

اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو اس کے منھ میں گرم تیل ڈال دینا چاہیئے[1]۔ راجاؤں کے محل میں شراب نوشی بکثرت رائج تھی۔ شاہراہوں پر آوارہ گرد اور جرائم پیشہ لوگوں کا مجمع لگا رہتا تھا[2]۔ راجا کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی۔ قانون کی بنیاد مساوات انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی۔ عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔ بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت نہ تھی۔ وہ زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لیے محروم کر دی جاتی تھی۔ الغرض مؤرخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور وہ آخری دور ہے جو تقریباً ۶۰۰ء سے شروع ہوتا ہے[3]۔

ان حالات کی اصلاح مذہبی نوشتوں کی مدد اور مذہبی رہنماؤں کی جدوجہد سے ہو سکتی تھی لیکن اتفاق سے اس عہد میں دونوں صورتیں ممکن نہ تھیں۔ مذہبی رہنماؤں کی سیرت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے مذہبی نوشتے امتداد زمانہ کی وجہ سے نہ اپنی اصلی ابتدائی حالت میں باقی رہ گئے تھے نہ ان کا صحیح مفہوم متعین کرنا ممکن تھا۔ ویدک عہد کو بہت زمانہ گزرا اس وقت کی تاریخ موجود نہیں ہے۔ زبان، رسوم اور طرز بیان بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اس لیے پس منظر کو پیش نظر کرنے اور مطالب کو صحیح سمجھنے میں بہت دقت ہوتی ہے[4]۔ مطالب و نتائج تحقیق ہنوز قطعی اور متعین نہیں ہیں۔ ابھی تک تلاش و جستجو جاری ہے۔ علماء اپنے قیاسات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے ہیں اور اپنی غلطیوں کی تصحیح کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں حالت یہ ہے کہ مستشرقین میں ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ہند قدیم کے متعلق اگر کوئی کتاب لکھی جائے تو آخری باب تک پہونچتے پہونچتے پہلے باب کی نظر ثانی کی ضرورت ہو جاتی ہے[5]۔ وید لاکھوں ذی فہم انسانوں کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہیں، جن میں ہزارہا تغیرات کی گنجائش ہے[6]۔ ادبی اور ترتیبی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ویدوں کی تصنیف کا زمانہ بہت طویل تھا[7]۔ رگ وید کی تکمیل بھی عرصہ دراز میں ہوئی ہے، پھر اس کی شرح و تفسیر کی گئیں جنھوں نے اس کے مطالب کو عجیب شکل دیدی۔

لوگ معاشرہ کی حالت بدلنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ حتی المقدور اس کے لیے کوشش بھی

---

[1] ہندوستان قدیم۔ آر۔ سی دت صفحہ ۲۴۲، ۲۴۳ [2] ایضاً صفحہ ۴۶۹ [3] سیرت النبی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ جلد چہارم صفحہ ۲۳۰ مطبوعہ ۱۹۳۵ء تقطیع متوسط۔ [4] راگوزن۔ [5] ویدک ہند صفحہ ۱۷۳ [6] ایضاً صفحہ ۸ [7] تاریخ ہند قدیم مصنفہ کے۔ ایم۔ پانکار۔

کرتے تھے لیکن مذکورہ بالا تفصیلات کی بناء پر کسی معتدل اور معتد بہ اصلاح کا امکان نہ تھا، اصل تعلیم نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی، رسوم و رواج مقصود بالذات بن گئے تھے اور مذہب کے مستند صحیفوں کے بجائے قصص و روایات پر علم کی بنیاد تھی۔

بدھ کی مقدس ہستی نے دھرم کے بجھتے ہوئے چراغ کو پھر سے روشن کیا۔ ظلم و جور کے خلاف پرزور آواز بلند کی، طبقوں اور ذاتوں کی اونچ نیچ کو ختم کرنے کا پرچار کیا اور خود راج پاٹ چھوڑ کر غریبوں، دکھیاروں اور مصیبت کے ماروں کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی، دیس بدیس پھر کر سچے دھرم کی تعلیم دی اور رحم و کرم، ہمدردی و غم گساری، حق و صداقت، عدل و انصاف، محبت و سلوک اور اخوت و مساوات کی تلقین کی، لیکن مدت ہوئی کہ وہ دنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ اس وقت (چھٹی صدی عیسوی میں) ان کی وفات کو ایک ہزار سال گزر چکے تھے ــ اس طویل عرصہ میں ان کے پیرو ان کی تعلیم بھول گئے تھے۔ ان کی محبت و عقیدت تو دلوں میں تھی اور کچھ رسوم و رواج بھی باقی تھے لیکن دین کی روح اور تعلیم کا مقصد ذہنوں سے نکل گئے تھے۔ عقیدت بڑھتے بڑھتے پرستش تک پہونچ گئی تھی اور خدا پرستی کے بجائے بدھ پرستی کا رواج عام ہو گیا تھا۔ بدھ کے ہزاروں بت بن گئے تھے اور جگہ جگہ نصب کر دیے گئے تھے لیکن دین کی تعلیم سے غفلت کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے مذہبی فاضلوں کو بھی صحیح طور پر پتہ چلانا دشوار تھا۔ بدھ کی وفات ۵۴۴ء (ق م) میں ہوئی تھی[1] دور زیر بحث یعنی چھٹی صدی عیسوی میں تقریباً گیارہ سو برس ان کی وفات کو گزر چکے تھے اور ایک طرف ان کی تعلیمات رسوم و رواج سے متاثر ہو گئی تھیں اور دوسری طرف مذہبی کتابوں میں ایسے اختلافات رونما ہو چکے تھے کہ بڑے بڑے مذہبی فاضلوں کی جد و جہد سے بھی دور نہیں ہو سکے۔ بدھ کے انتقال کے سو برس بعد ہی اختلافات کا حل کرنا ناممکن ہو گیا۔ علماء مذہب کی ایک بڑی کانفرنس منعقد ہوئی لیکن انتہائی کوشش کے باوجود کسی ایک اصول پر سب متفق نہ ہو سکے اور کئی فرقے بن گئے[2] ــ راجہ اشوک نے اپنے زمانے میں ان اختلافات کو حل کرنے کی پھر کوشش کی اور اپنی نگرانی میں بڑے رہنماؤں

---

[1] یہ سن پالی کتاب DIPAVANSA کے مطابق ہے دوسرے ذرائع ۴۸۳ء ق م بتاتے ہیں۔
[2] ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، عنوان "بدھ"

اور علماء مذہب کی ایک بڑی کانفرنس منعقد کی تاکہ غور وفکر کے بعد بدھ کی مستند تعلیمات مرتب کی جائیں۔ لیکن پوری کوشش کے بعد کوئی ایسا مجموعہ مرتب نہ ہو سکا جس سے سب متفق ہوتے۔ دوسری صدی (ق۔م) میں اختلافات بہت گہرے ہو گئے اور مہایانہ (کشتیٔ بزرگ) ہینیانہ (کشتیٔ خورد) کے نام سے دو بڑے فرقوں میں مذہب کے ماننے والے منقسم ہو گئے۔ ہینیانہ گروہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ دوسرے مذاہب کے اثرات سے بدھ مذہب کو محفوظ رکھا جائے اور سختی کے ساتھ انھیں تعلیمات پر قائم رہنے کی کوشش کی جائے جو بانیٔ مذہب نے پیش کی تھیں لیکن حالات اتنے بدل چکے تھے زمانے کے اثرات نے ذہنوں کو اس قدر متاثر کر دیا تھا اور دوسرے مذہبوں کے عقائد و خیالات اس درجہ جڑ پکڑ چکے تھے کہ ہینیانہ گروہ کی رائے قبول عام نہ حاصل کر سکی اور قوم کے ایک چھوٹے سے طبقہ کے سوا زیادہ لوگوں نے اس اصول کو تسلیم نہیں کیا۔ زیادہ رجحان یہی رہا کہ عقائد و خیالات اور اعمال واطوار پر نظر ثانی کی جائے اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ان میں بھی ترمیم کی جائے۔ مہایانہ فرقہ تعداد کے اعتبار سے بہت بڑی اکثریت رکھتا تھا اور ہمیشہ اسے قبول عام حاصل رہا پہلی صدی عیسوی میں راجہ کنشک نے بدھ مذہب کے نامور علماء کی ایک کانفرنس ان مسائل پر غور کرنے کے لیے منعقد کی۔ اس کانفرنس نے غور و بحث کے بعد مہایانہ خیالات کو ترجیح دی، اس اصول کے مطابق بدھ مذہب کے قوانین پر نظر ثانی کی گئی اور انھیں تین حصوں میں منضبط کیا گیا۔ اصول مذہب، اعلیٰ تعلیمات اور قوانین کے الگ الگ مجموعے مرتب کیے گئے یہ تینوں مجموعے (۱) "سوٹا پٹاکا" (اصول مذہب) (۲) "ابھیدھما" (اعلیٰ تعلیمات) اس "ونالے پٹاکا" (قوانین وضوابط) کے نام سے آج کل بدھ مذہب کی بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں[1]۔ لیکن جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ یہ فرقہ بندی ہو چکنے کے بعد کی مرتب کردہ ہیں اور ایک فرقہ کے نقطۂ نظر کی ترجمانی ہیں۔ علاوہ ازیں تفصیلات بالا سے یہ بھی واضح ہے کہ مذہب کی مستند اور قطعی تعلیمات سے واقفیت کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ بڑے بڑے علماء ماہرین فن اور شاہی سرپرستی اور توجہ کے بعد بھی بدھ مذہب کا کوئی متفق علیہ مجموعہ مرتب نہ ہو سکا۔ اصل مذہبی صحیفے کی عدم موجودگی کے بعد بدھ دھرم کو تحریفات سے محفوظ رکھنا ناممکن تھا چنانچہ وہ محفوظ نہ رہ سکا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ بنیادی عقائد تک پر اتفاق نہیں رہ گیا اور کائنات کے آغاز و انجام کی گتھی بھی لاینحل ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بدھ مذہب کے اعتبار سے اس دنیا کا خالق کون ہے۔ مذہبی نوشتوں کی اس تغیر حالت کے بعد صحیح نتائج تک پہونچنا ناممکن تھا۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور تاریخ تہذیب ہند۔ الیشور دت

ایک طرف یہ حالت تھی دوسری طرف مال و جائداد کے خواہش مند اور حکومت و ریاست کے طلبگار اس مذہب کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ طاقتور کمزوروں کو غلام بنانا چاہتے تھے۔ مالدار غریبوں کا خون چوسنا چاہتے تھے۔ راجہ دوسروں کے ملک پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ مذہبی اجارہ دار اپنے اثرات کو قائم رکھنے اور اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے طویل اور پیچیدہ رسوم جاری رکھنا چاہتے تھے، دین کی سادگی میں انھیں اپنے اقتدار کا خاتمہ نظر آتا تھا۔ الغرض تمام خودغرض اور اقتدار پسند طبقے بُدھ مذہب کو مٹانے پر تل گئے تھے۔ مذہب اپنی اصل روح پہلے ہی کھو چکا تھا اور اپنے عقیدتمندوں کے ہاتھوں بے روح رسوم اور بے معنی روایات کا مجموعہ بن گیا تھا اس لیے مخالفانہ کوششوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور آہستہ آہستہ ملک سے فنا ہو گیا۔

الغرض پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں تہذیب، تمدن، معیشت و معاشرت، سیاست و حکمرانی، عقائد و خیالات اور احکام و اعمال ہر اعتبار سے اس ملک میں غیر معمولی اصلاح کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، نہایت بےچینی کے ساتھ ہر شخص کو انقلاب حال کی تمنا تھی۔ (باقی)

اسلام میں مکمل انارکی کی دریافت!

شیخ الجامعہ (جامعہ ملیہ) کے ایک مقالہ کا جائزہ

(از عتیق الرحمٰن سنبھلی)

(۲)

اگر صرف علمی اور منطقی نقد ہمیں مقصود ہوتا تو یہاں تک کی گفتگو بالکل کافی تھی۔ مگر مقصود تو دراصل یہ دکھانا ہے کہ پروفیسر مجیب صاحب، جو "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی شیخ الجامعی کے سبب کم ازکم غیر مسلم دنیا میں تو ایک معتبر اسلامی نمائندہ سمجھے ہی جائیں گے، انھوں نے اسلام کی نمائندگی اپنے اس مقالے میں کسقدر غیر ذمہ داری کے ساتھ کی ہے۔ کسقدر گمراہی کا سامان ناواقفوں کے لیے فراہم کر دیا ہے اور ضمنی طور پر کتنی بری تصویر دُنیا کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کی "ایک ایسے انداز سے پیش کی ہے جسے ناواقف تو ضمیر پرستی اور حق دوستی سمجھ سکتے ہیں مگر حقیقت میں وہ اسلام بیزاری کے سوا کچھ نہیں۔ علاوہ ازیں خالص منطقی بحث کبھی کبھی باعثِ شکایت بھی بن جاتی ہے، خصوصاً جبکہ فریقِ ثانی کا اندازِ گفتگو منطقی نہیں کچھ وجدانی اور "وارداتی" ہو، جیسا کہ مجیب صاحب کا اس مقالے میں عام حال یہی ہے ــــ ان دونوں باتوں کا تقاضہ یہ ہے کہ اوپر کی منطقی تنقید پر بس نہ کی جائے بلکہ مقالے پر کچھ اور بھی نظر ڈالی جائے کہ کیا کیا فرمایا ہے اور کیا کیا نتائج اس سے نکلتے ہیں؟ خاص کر وہ محرکات کیا ہیں جو مجیب صاحب کی اس کاوشِ قلم میں کارفرما نظر آتے ہیں؟

جہاں تک مجیب صاحب کے کہنے کا تعلق ہے' اُن کی اس کاوش کا محرک یہ خیال ہے کہ مسلمان جس جمود و انحطاط کی دلدل میں عرصہ دراز سے پھنسے ہوئے ہیں وہ نتیجہ ہے دین کو ایک تقلیدی نظام سمجھ لینے' کچھ افراد اور طبقات کو اس کی تشریح کا مخصوص حقدار مان لینے اور کچھ روایتی تصورات کے آگے اپنے ذہن اور ضمیر کو سرنگوں کر دینے کا۔ اور اس کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس تقلید اور روایت پرستی کے نظام کو توڑ کر ہر حساس اور عاقل فرد آزادانہ فیصلے کی ذمہ داری سنبھالے۔

اپنی اس مجمل شکل میں یہ محرک کچھ برا نہیں ہے۔ کتنی ہی تقلیدیں آج ایسی رائج ہیں اور کتنے ہی ایسے تصورات' روایت بن گئے ہیں جن کے توڑ دیے جانے کی ضرورت میں کسی ذمہ دار اور صاحب علم آدمی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اور اُن کے توڑ دیے جانے کی دعوت بھی کم و بیش ان ہی الفاظ سے شروع کی جا سکتی ہے۔ سوال تفصیل اور تشریح کا ہے کہ کن تقالید کو موجب فساد سمجھا جا رہا ہے؟ کن افراد و طبقات کے حق تشریح میں کلام ہے؟ اور کون سے تصورات کی پابندی میں ذہن و ضمیر کی ہلاکت سمجھی جا رہی ہے؟ اس تفصیل ہی کے مرحلے میں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ مجیب صاحب تو میدان ہی صاف کیے دے رہے ہیں۔ دوسرے افراد تو درکنار' انھیں رسولؐ ہی کی تقلید سے انکار ہے۔ وہ قرآن ہی کے عملی احکام کی دائمی پابندی کو ایک جمود اور اسے ابدالاباد کے لیے ایک کامل ہدایت نامہ سمجھنے کو بھی تباہ کن تصورات ہی کی قسم سے بتاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ رسولؐ کی تقلید بھی صرف آپؐ کے ہمعصر مسلمانوں کے لیے تھی۔ بعد میں تقلید تو کیا آپؐ کی ہدایتوں کے ریکارڈ سے عام استفادہ بھی اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ریکارڈ مشتبہ ہے۔ علیٰ ہذا قرآن کے بارے میں صحیح یہ ہے کہ وہ اتباع و اطاعت اور استفادہ حوالے کی کتاب نہیں کچھ "واردات قلبی" عطا کر دینے والی کتاب ہے۔ اور یہ واردات قلبی ہمارے ضمیر کو ایک طاقت اور تحریک مہیا کرتی ہیں کہ زندگی کے ہر دائرے میں اچھی راہ پہ چلیں[1]۔

ہمیں اس میں شبہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ مجیب صاحب کا جذبہ بہت اچھا اور خالص اصلاحی ہو لیکن اس میں کسی شبہ اور شک کی گنجائش نہیں کہ اُن کا نقطۂ نظر اور اُن کی دعوت اس درجہ غلط اور لائق اعتراض ہے کہ جذبے کی اچھائی کا کھلے دل سے امکان تسلیم کرتے ہوئے بھی کوئی

---

[1] جامعہ مئی ۱۹۷۰ء ص ۳۴۴-۴۳ ۲

عذر اور جواز اُن کے لیے نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ قرآن کی حیثیت کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ جس پر وہ نازل ہوا اور جو مامور ہوا کہ اس کی تبلیغ و رسالت کا فرض انجام دے اُس کا منصب ایمان سے آنے والوں کے لیے کیا ہے؟ اور کیا نہیں ہے؟ اس پر گفتگو اگر کوئی غیر مسلم بھی کرے تو جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے علم اور منطق، دیانت اور امانت ہر چیز کا تقاضہ ہے کہ جو کچھ نقطۂ نظر پیش کرے قرآن یا قول رسولؐ سے اس کی سند لائے۔ اور اگر یہ گفتگو کرنے والا اپنے کو مسلم کہتا اور اسی طور پر جانا بھی جاتا ہے، تب تو وہ از روئے ایمان و اسلام بھی پابند ہے کہ اس سند کے بغیر کوئی نقطۂ نظر ان معاملات میں نہ بنائے۔ لیکن مجیب صاحب نہ صرف خود ان تمام ذمہ داریوں کو پامال کر رہے بلکہ بڑے ہی جوش اور جذبے سے صلائے عام بھی دے رہے ہیں کہ جس مسلمان کہلانے والے کو بھی کچھ احساس و شعور اور عام عقل و علم کی نعمت بارگاہ خداوندی سے عطا ہو گئی ہو، اُسے بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ اب تک مسلمان کس طرح سوچتے اور عمل کرتے رہے ہیں، بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ قرآن میں کیا لکھا ہے اور بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ رسولؐ نے کیا رہنمائی چھوڑی ہے، بس وہ کرنا چاہیے جسے وہ اچھی بات سمجھتا ہے، جسے اُس کی عقل کہتی ہے کہ ضروری ہے اور جس کے بارے میں تاریخ کا مطالعہ اُسے بتاتا ہو کہ اس میں بھلائی ہے۔

اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں مجیب صاحب، باوجود یہ کہنے کے قرآن سند اور حوالے کی کتاب نہیں ہے، قرآن کی "شہادتیں" بھی لائے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ اگر ہم اُن کی نیت پر شبہہ کریں تو بیسوں[۲۰] صدی کی باطنیت کہہ سکتے ہیں۔ اور بصورت دیگر، وہ ایک ایسے شخص کا قرآن سے استشہاد ہے، جس نے اگر قرآن فہمی کے لیے کچھ علمی استعداد بہم پہنچائی بھی ہو تو قرآن نے اپنے دروازے اس پر بند کیے ہیں مگر وہ اپنے جوش میں محسوس ہی نہیں کر پاتا کہ یہ سب جو وہ قرآن سے نکال رہا ہے قرآن میں نہیں ہے ارشاد ہوا ہے کہ

"قرآن میں پوری ذمہ داری اچھے اور برے اعمال کی فرد پر ڈالی گئی ہے۔"[۱]

اور پھر اس کی شہادت میں قرآن کی یہ آیت آئی ہے۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَ　　جس دن آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور

---

[۱] مئی سنہ ۱۹۷۰ء ص ۲۴۲۔

وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (سورہ عبس آیت ۳۴۔ ۳۷)	اپنے باپ اور اپنی جورو اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص کو اس دن فکر لگا ہوگا کہ وہ بس کرتا ہو (ترجمہ شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی)

اسی طرح ایک دوسری آیت ہے۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (سورۂ النجم آیت ۳۸۔ ۴۰)	کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں لے گا اور یہ کہ انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی اور یہ کہ اس کی کوشش آگے چل کر دیکھی جائے گی۔ (ترجمہ ایضاً)

یہاں تک تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی، جتنی بات دعوے میں کہی گئی آیتیں اُس کے مطابق نہیں مگر آگے جو دعوے (یا مدعا) کی توضیح آئی ہے وہ حیران کرتی ہے کہ یہ بات اِن آیتوں میں کہاں تھی! فرماتے ہیں کہ

"اگر فرد پر اس طرح سے صاف صاف ذمہ داری ڈالی گئی ہو تو پھر وہ رہنمائی کے لیے دوسرں کے پاس کیسے جا سکتا ہے ......"

کوئی ہے جو ہمیں یہ بتلائے کہ ہر شخص پر اپنے اعمال کی ذمہ داری اور جواب دہی کی جو بات ان آیتوں میں کہی گئی ہے، اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آتا ہے کہ کسی شخص کو دوسرے سے رہنمائی بھی نہیں حاصل کرنا چاہیے؟ کوئی شخص اپنی ذمہ داری دوسرے کے سر نہیں ڈال سکے گا، اپنے اعمال کی جوابدہی کسی اور پر نہیں ٹال سکے گا، رشتہ داریاں اور گروہ بندیاں آخرت میں کوئی سہارا نہیں دے سکیں گی، یہ سب باتیں ان آیتوں کا مدعا ہیں۔ مگر یہ کہ رہنمائی کے لیے دنیا میں کسی دوسرے کی طرف دیکھو گے تو بُرا کروگے، کسی کا اتباع کرتے ہوئے خدا کے حضور میں پہنچو گے تو پچھتاؤ گے، یہ مفہوم اور مدعا بھی کوئی شخص ان

---

[1] آیتوں کا ترجمہ ہر جگہ وہی ہوگا جو مجیب صاحب نے درج کیا ہے۔

آیتوں کے سر منڈھتا ہو تو سوائے اس کے کیا کہا جائے ہ کہ قرآن فہمی تو درکنار عام فہم بھی یہاں اُس کا ساتھ چھوڑ گئی ہو۔ اور زیادہ جان بوجھ کر قرآن کی غلط تاویل پر تلا ہوا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ آیتوں کو اس مفہوم سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ کتنی ہی دوسری آیتیں اسی قرآن میں ایسی موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ کچھ لوگ رہنمائی کے اہل ہوتے ہیں اور اُن سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ مثلاً

(۱) فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

سو اگر تم کو علم نہیں تو دوسرے اہل علم سے پوچھ دیکھو۔

(سورۂ انبیاء، سورۂ نحل) (ترجمہ مولانا تھانوی)

(۲) وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ج ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔

اور اسی کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہو۔ پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہو پھر میں تم کو تبلا دوں گا جو کچھ تم کرتے تھے۔

(سورۂ لقمان آیت ۱۵) (ایضاً)

(۳) يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ٥

اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے اور رسول کے، اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔ یہ بات اچھی ہو اور بہت بہتر ہو اس کا انجام۔

(سورۂ النساء آیت ۵۹) (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ)

(۴) اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبَّانِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ

ہم نے اتاری تورات کہ اس میں ہدایت اور روشنی ہو۔ اس پر حکم کرتے تھے پیغمبر جو کہ حکم بردار تھے اللہ کے یہود کو اور حکم کرتے تھے درویش اور عالم اس واسطے کہ وہ نگہبان

كِتَابِ اللّٰهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ　　ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب پر اور اسکی

(المائدہ۔ آیت ۴۴)　　نگہبانی پر مقرر تھے۔　　(ایضاً)

یہ اُن آیتوں میں سے چار ہیں جو فوری طور سے ذہن میں گھوم گئیں۔ تھوڑا سا وقت صرف کر کے قرآن پاک میں تلاش کی جائے تو اور بہت سی آیتیں اسی مفہوم کی بآسانی مل جائیں گے جن میں کسی نہ کسی طور پر کچھ لوگوں کے قابل رہنمائی اور قابل پیروی ہونے کا مذکور ہو۔

اور ہاں مجیب صاحب تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی رہنما اور مقتدیٰ کا مقام دینا نہیں چاہتے (یا ممکن نہیں سمجھتے کہ اب اُن کی پیروی کی جا سکے) اس لیے وہ آیت بھی یہاں آجانی چاہیے جس میں فرمایا گیا ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○　　تو کہہ کہ اگر محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ پر چلو تاکہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہو۔

(آل عمران ۳۱)　　(ایضاً)

اور وہ آیت، جس میں آنحضرت کی بعثت کے بعد اہل کتاب کی نجات و فلاح کا بھی دارو مدار آپ کے اتباع پر بتاتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ .... أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○ (سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷)　　وہ جو تابع ہوتے ہیں اُس رسول کے جو نبی ہو امّی، جس کو پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں..... وہی لوگ پہنچے مراد کو (ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ)

الغرض پیغمبر کے اتباع اور اُس سے رہنمائی حاصل کرنے کی صریح ہدایت بھی قرآن میں موجود ہے۔ اور اس انداز سے یہ ہدایت دی گئی ہو کہ اس کو کسی بھی لحاظ سے "ناممکن" کہہ کر آدمی چھوٹ نہیں سکتا۔ اور پیغمبر کی امانت کے حاملوں سے رہنمائی لینے اور کتاب و سنت سے مطابقت کی کی شرط کے ساتھ اُن کا کہا ماننے کی ہدایت بھی کی گئی ہے۔ کیا مجیب صاحب نے یہ آیتیں

قرآن میں نہیں پڑھیں؟ یا ان کا بھی کچھ اور ہی مفہوم انھوں نے قرار دے لیا ہے؟

کسی امتحان میں پاس ہونے کی استعداد بہم پہنچانا' ایک امیدوار کی ذاتی ذمہ داری ہوتی ہے۔ امتحان کے وقت نہ وہ کسی کی مدد لے سکتا ہے اور نہ یہ کہہ کر چھوٹ سکتا ہے کہ مجھے رہنمائی دینے والوں نے غلط رہنمائی دی اور میری تعلیم کے سلسلہ میں اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ لیکن جو محکمۂ تعلیم یا یونیورسٹیاں یہ قانون بناتی ہیں' وہی تعلیم کے اسکول اور کالج بھی امیدواروں کے لیے قائم کرتی ہیں' بلکہ بعض بعض امتحانوں میں تو کوئی شخص اس کے بغیر بیٹھ ہی نہیں سکتا کہ باقاعدہ کسی تعلیمی ادارہ کا وہ طالب علم رہا ہو۔ تو کیا مذکورہ قانون کی بنا پر کوئی صاحب کہہ سکیں گے کہ یہ تعلیمی اداروں کا نظام اور اساتذہ کا انتظام لغو ہے۔ جب پوری ذمہ داری اس طرح امیدواروں ہی پر ڈالی گئی ہے تو پھر وہ کیسے تیاری اور رہنمائی کے لیے دوسروں کے پاس جا سکتے ہیں؟ ___ مجیب صاحب ایک تعلیمی ادارے ہی کے سربراہ ہیں۔ مدت سے وہ یہ قانون بھی چلا رہے ہیں اور طلباء کے لیے تعلیم اور اساتذہ کا بھی نظم کرتے ہیں' ان دونوں باتوں میں کوئی منافاۃ انھیں محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن دین کا معاملہ آتا ہے تو انھیں بڑی بدعقلی اس بات میں محسوس ہوتی ہے کہ آدمی اپنے اعمال کی جوابدہی کے لیے تو ذاتی طور پر ذمہ دار ہو مگر ان اعمال کے سلسلہ میں رہنمائی کے لیے وہ کسی دوسرے کی طرف بھی دیکھے۔ عقل حیران ہے کہ یہ اگر سفسطہ طرازی نہیں تو کون سا طرز فکر ہے کہ جو بات دنیاوی معاملات میں عین عقل ہے' وہ دین کے معاملات میں بدعقلی بن جاتی ہے! نہ سہی کہ قرآن کی وہ آیتیں مجیب صاحب نے دیکھی ہوں جو کچھ لوگوں کی پیروی اور اُن سے رہنمائی کا حصول عام لوگوں پر دینی معاملات میں واجب کرتی ہیں' مگر عقل تو ایک دانشور اور معلّم کی اُن کے پاس ہے' کیا وہ خود ہی اس بات کے لیے کافی نہیں کہ اس طرز فکر سے انھیں روکے؟

ایک اور "قرآنی" استشہاد دیکھیے۔

سورۂ محمد کی آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ[1] ___ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"انسان کے ضمیر کی حیثیت اور اُس کے منصب پر ہمیں اسی آیت کی روشنی میں غور

---

[1] ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمائے رکھے گا۔

کرنا چاہیے نہ اس خوف میں کہ ہم کوئی غلط رائے قائم کرلیں گے۔ عام طور پر جسے غلطی سمجھا جاتا ہے، وہ دینیات کی ایک اصطلاح ہے یعنی قانون میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے ہٹ جانا اور جو قانون کے الفاظ پر ایمان لاتے ہیں[1] وہ ایسی غلطیوں سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں تاکید نہ کریں تو اُن کا بنا بنایا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ قرآن کا نقطۂ نظر بالکل دوسرا ہے:

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ	اور جو کوشش کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے کوشش
لِنَفْسِهِ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ	کرتا ہے۔ خدا تو دنیا جہان کے سب لوگوں
الْعَالَمِينَ ٥ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَ	سے بے نیاز ہے، اور جو لوگ ایمان لائے
عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ	اور انھوں نے نیک عمل کیے، ہم ضرور اُن
سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ	کے گناہ اُن سے دور کر دیں گے اور جو
الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ.	(نیک) عمل کرتے رہے ہیں ان کو ان کا
	بہتر سے بہتر بدلہ دیں گے۔
(سورہ العنکبوت آیت ۶،۷)	(ترجمہ شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی)

سورۂ محمد کی مذکورہ آیت (إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ الخ) سے انسانی ضمیر کے مقام اور منصب پر کیا روشنی پڑتی ہے؟ اس کے لیے تو باطنیت فہمی کی وہ مقدار چاہیے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ یا کہیے کہ غالب کے اُس دور کا ایک شعر ہے جب خود شعراء بھی سن کر کہنے لگے تھے ۔

....

مگر اُن کا کہا، وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

لیکن آگے جو آیتیں سورۂ عنکبوت کی رقم ہوئی ہیں، اُن سے مجیب صاحب کے مدعا پر غور کرنے کی جرأت ہم بھی کر سکتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ قرآن نے کسی لگے بندھے قانون کی پیروی انسانوں پر فرض نہیں کی ہے، وہ بس "ایمان" اور "عمل صالح" کی ہدایت دیتا ہے۔ جو شخص صدق دلی کے ساتھ ان بنیادی قدروں کو ذہن میں رکھتے ہوئے زندگی کے معاملات انجام دیتا ہے، اُسے پھر کوئی خوف نہیں، غلطی بھی کر جائے گا تو خدا معاف کر دے گا۔

کوئی صاحب بتا سکتے ہیں کہ مذکورہ آیتوں کو اس مدعا سے کیا واسطہ ہے؟ "ایمان" اور "عمل

---

[1] یعنی مجیب صاحب الفاظ پر ایمان نہیں لائے ہیں اور یہی باطنیت کی اصل اساس ہے۔

صالح" کے الفاظ اس میں ضرور آئے ہیں، بخشائش و بندہ نوازی کا بھی اس میں بے شک تذکرہ ہے، مگر کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان الفاظ پر مشتمل کوئی بھی ضابطہ مرتب کر کے کہہ دیجئے کہ یہ اس آیت سے نکلتا ہے؟ اللہ کی بے نیازی بھی اس آیت میں بیان ہوئی ہے اور "اِنَّمَا یُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ" کے الفاظ بھی یقیناً ہیں، مگر اللہ کا بے نیاز ہونا اور انسان کے اعمال کا خود اُسی کے لیے ہونا' یہ بیان اس نظریہ کی اساس فراہم کر دینے کے لیے کیونکر کافی ہے کہ اللہ کو کوئی قانون حیات بنانے یا اس کی لفظ بلفظ پیروی کرانے کی ضرورت نہیں، معاملہ انسان کا ہے وہ خود اپنا اچھا برا سمجھ کر ضمیر کی روشنی میں طے کرے کہ کون عمل، عمل صالح ہے اور کون غیر صالح؟ کیا ایمان کا تقاضا ہے اور کیا اس کے خلاف؟

قرآن مجید ایک جگہ کہتا ہے کہ اس کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک مُحکمات ـــ جو اصل کتاب اور اصل ہدایت ہیں، هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ ـــــ اور دوسری مُتَشَابِهَات۔ جن کی مراد واضح نہیں۔ اور پھر کہتا ہے کہ

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ۔ (سورۂ آل عمران آیت ع ۱)	پس جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ پیچھے پڑتے ہیں (محکمات کو چھوڑ کر) اُس حصے کے جو از قبیل متشابہات ہے، تلاش میں فتنہ انگیزی کی اور تلاش میں اُس کی (من چاہی) مراد (بیان کرنے) کی ـــ حالانکہ اس کی (تحقیقی) مراد اللہ کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں۔

لیکن مجیب صاحب کی توفیق کا کمال یہ ہے کہ جو آیتیں متشابہات میں سے بھی نہیں ہیں وہ اُنھیں بھی متشابہ بنائے دے رہے ہیں۔ اور اُن کے بالکل صاف اور واضح مدعا کو مشکوک کر کے ایک قطعی ملحدانہ خیال ان میں رکھ دینا چاہتے ہیں۔

سورۂ عنکبوت کی زیر نظر آیتیں (وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ الخ) اپنے مدعا میں اس قدر صاف اور واضح ہیں کہ اس طرح کا کوئی خیال اُن سے برآمد کر لینے کی ادنیٰ گنجائش نہیں، جس طرح کا خیال برآمد کر کے مجیب صاحب ایک پورا نظریہ اس پر کھڑا کیے دے رہے

ہیں. سیدھا سادا مطلب ان آیتوں کا بس یہ ہو کہ جو لوگ خدا کی اتاری ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اُس کے اتباع اور اس کی نصرت میں اپنی جان کھپاتے ہیں. اُن کی یہ تمام کارگزاری اُنھیں کو نفع دے گی خدا کو اس کی کوئی حاجت نہیں ہو. اور وہ نفع یہ ہو کہ آخرت میں اُن کے اچھے اعمال کا بہتر سے بہتر بدلہ خدا کی بارگاہ سے ملے گا اور جو کوتاہیاں بتقاضائے بشریت ہوئی ہوں گی انھیں رحم و کرم سے دھو ڈالا جائے گا ــ ان آیتوں سے پہلے صرف پانچ ہی آئتیں سورت میں ہیں. اگر قرآن میں کچھ اور بھی آدمی نے غور سے نہ پڑھا ہو، تب بھی ان پہلی آیتوں کو سمجھ کر پڑھتا ہوا جب وہ اس چھٹی اور ساتویں آیت پر پہونچے گا، سوچ بھی نہیں سکے گا کہ ان میں اس طرح کی کوئی بات کہی گئی ہو جیسی پروفیسر مجیب صاحب بتا رہے ہیں. آئیے ان آیتوں کو پڑھیے.

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ـ الٓمّٓ ۝	کیا لوگوں نے گمان کیا ہو کہ وہ چھوڑ دیے
اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا	جائیں گے اتنا کہنے پر کہ "ہم ایمان لائے"
اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا	اور وہ آزمائے نہ جائیں گے. اور ہم نے
يُفۡتَنُوۡنَ ۝ وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِيۡنَ	ضرور آزمایا ہو اُن لوگوں کو جو ان سے پہلے
مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ	(ایمان لائے) تھے پس اللہ جان کر
الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَلَيَعۡلَمَنَّ	رہے گا اُن لوگوں کو جنھوں نے سچ کہا کہ
الۡكٰذِبِيۡنَ ۝ اَمۡ حَسِبَ الَّذِيۡنَ	(ہم ایمان لائے) اور اُن کو جو کہ جھوٹے
يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ اَنۡ يَّسۡبِقُوۡنَا ؕ	ہیں. کیا گمان کیے ہیں وہ لوگ جو برائیوں
سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ ۝ مَنۡ كَانَ	پر عمل پیرا ہیں کہ وہ ہم سے نکل جائیں گے؟
يَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ	کیا ہی برا ہو جو یہ سوچ بیٹھے ہیں. جو کوئی
اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝	امید کرتا ہو اللہ سے ملنے کی تو اللہ کا مقررہ
وَمَنۡ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ	وقت بے شک آنا ہو اور وہ خوب سننے
لِنَفۡسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ عَنِ	اور جاننے والا ہو. اور جو مشقت اٹھاتا
الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا	ہو وہ بس اپنے لیے مشقت اٹھاتا ہو. اللہ
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ	تو بے نیاز ہو تمام جہان والوں سے. اور

عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ○
(العنکبوت آیت ۷۔ پارہ ۲۱)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل انھوں نے کیے ہم ضرور محو کر دیں گے اُن پر سے اُن کے گناہ اور بدلہ دیں گے بہت ہی بہتر اُن کے کاموں کا۔

اس سیاق و سباق میں کسی کو وہم کرنے کی بھی گنجائش ہو کہ یہاں انسان کو کسی خاص قانون پر چلنے کے بجائے اپنی صوابدید سے کام لینے کی آزادی کا خیال دیا جا رہا ہو؟ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ!

ایک آیت کی تاویل اور سنیے:۔

ایک اور آیت میں کہا گیا ہے:

إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا ○
(سورۃ النساء، آیت ۳۱)

جن بڑی بڑی برائیوں سے تمہیں روک دیا گیا ہے، اگر تم ان سے بچتے رہو گے تو ہم تمہاری لغزشوں اور غلطیوں کے اثرات تم پر سے محو کر دیں گے اور تمہیں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیں گے جو عزت اور خوبی کا مقام ہوگا۔
(ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد)

یہاں جن گناہ کبیرہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ مذکورہ بالا آیت کے علاوہ دوسری آیتوں سے بھی اخذ کیے گئے ہیں، لیکن یہاں اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے جو اپنے ارادہ سے اور اپنی زندگی کے معاملات کو پوری طرح سمجھ کر، خدا کے دوست بنتے ہیں[1] اور اُس کے کاموں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس معنی میں کہ جس طرف ان آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ
(سورۂ یونس (۱۰) آیت ۱۴)

پھر ان امتوں کے بعد ہم نے تمہیں ان کا جانشین بنایا، تاکہ دیکھیں تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں۔
(ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد)

---

[1] حاشیہ اگلے صفحے پر درمیان صفحے میں ملے گا۔ ع

(اس کے بعد اسی مضمون کی ایک دوسری آیت (سورۂ انعام ۱۹۵) درج ہوئی ہو، جسے بخیال طوالت ہم اس لیے چھوڑ رہے ہیں کہ محض تکرار مضمون ہو۔ اس آیت کے بعد مجیب صاحب فرماتے ہیں)

"اور یہاں مراد تمام مرد اور عورتیں ہیں، صرف وہ لوگ نہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں بلکہ وہ تمام لوگ جن کا ضمیر بیدار ہے اور جو ہر کام کو اپنے ضمیر کے مطابق کرتے ہیں، مگر اس میں اُن سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی ہدایت ہو کہ انھیں ان غلطیوں کے خوف سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ اپنے بس بھر جدوجہد کرنا چاہیے۔"

لہ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (سورہ یونس (۱۰) آیت ۶۲)

یاد رکھو جو اللہ کے دوست ہیں، اُن کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

(ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد) عہ

سچی بات یہ ہو کہ مجیب صاحب کا یہ مقالہ علمی اور منطقی اعتبار سے (اور یہ لکھتے ہوئے مجھے احساس ہو کہ مجیب صاحب کا ایک علمی مرتبہ ہو) اس قدر ذلیل اور لایعنی ہو کہ اگر اُن کے ساتھ "شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی حیثیت لگی ہوئی نہ ہوتی تو ادنیٰ التفات کے قابل بھی یہ نہ تھا۔ بیان اور طرز ادا کے لحاظ سے دیکھنے والے دیکھ ہی رہے ہوں گے کہ ماشاءاللہ ایسا ہو کہ اُن کے ہم مشرب اور ہم مذاق لوگوں کے سوا مشکل ہی سے کسی کے پلے کچھ پڑے گا، اس لیے "فسادِ خلق" کا اندیشہ بھی کچھ خاص نہیں۔ اور مزید برآں وہ بات جو شروع میں ہم نے کہی تھی، کہ خلق میں سے کم از کم مسلمانوں کا تو ایسا رابطہ ہی موصوف سے نہیں کہ اُن میں بھی کچھ عام نفوذ ان نگارشات کا ہو سکے۔ لیکن ان سب باتوں کے ساتھ، چونکہ وہ جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ ہیں اس لیے کم از کم اہل جامعہ اور منتسبین جامعہ سے یہ کہنا ناگزیر ہو کہ ذرا وہ دیکھیں کہ یہ جامعہ کی مسند سے کیا ہو رہا ہو؟ اور اس کے لیے ضرورت ہو کہ صرف اتنا کہہ کر نہ چھوڑ دیا جائے کہ شیخ الجامعہ صاحب محض زبردستی قرآن پاک کے ساتھ کر رہے ہیں اور صریح باطنیت والے انداز میں قرآن کے حوالے دیکر لوگوں کی گمراہی پر

عہ یہ حاشیہ مجیب صاحب ہی کی طرف سے ہو، اس لیے اُن کی عبارت کے ساتھ ہی دیدیا گیا ہو۔ ن

کمربستہ ہیں، بلکہ کسی حد تک اس زبردستی اور باطنیت کو کھول کر بھی سامنے رکھ دیا جائے۔ لہٰذا اُن کے مذکورہ بالا اقتباس پر بھی کچھ کہنا ہی ہے۔

اس اقتباس میں مجیب صاحب نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے، جو اُن کے اس نظریہ کا قدرتی تقاضہ تھا کہ انسان کا ایمانداری کے ساتھ اپنے ضمیر کی تابعداری کرنا ہی خدا کی رضا پانے کا حقیقی ذریعہ ہے۔ وہ تمام انسانوں کو، بغیر اس کے کہ وہ اپنے آپ کو "اہل اسلام" میں شامل کریں، سورۂ نساء کی اس آیت کا مخاطب ٹھہراتے ہیں جو اس اقتباس میں سب سے پہلے آئی ہے (یعنی اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَائِرَ مَا الخ) اور جس میں بشارت دی گئی ہے کہ اگر تم لوگ اُن بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے جن کی ممانعت کر دی گئی ہے تو پھر جنت تمہارا ٹھکانا اور مغفرت تمہارا انجام ہے۔ قرآن میں صریح طور پر یہ خطاب اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا سے ہے اور قرآن کا کوئی طالب علم اس سے ناواقف نہیں رہ سکتا کہ یہ اسلام کو پورا پورا قبول کر لینے والوں کے لیے قرآن کی مخصوص اصطلاح ہے، جہاں مختلف دینی گروہوں کا ذکر آتا ہے وہاں قرآن اسی (وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا) کے نام سے مسلمانوں کو یاد کرتا ہے۔ اسی عرف کے ماتحت سورۂ نساء کی انتیسویں [۲۹] آیت سے، یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کہہ کر ایک خطاب شروع ہوتا ہے۔ زیر بحث آیت جو اکتیسویں [۳۱] آیت ہے، اسی خطاب کا ایک جزء ہے۔ مجیب صاحب اس سامنے کی اور سیدھی بات کو چھوڑ کر رہنمائی دیتے ہیں کہ

"یہاں اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے جو اپنے ارادے سے اور زندگی کے معاملات کو پوری طرح سمجھ کر، خدا کے دوست بنتے ہیں اور اُس کے کاموں میں شریک ہوتے ہیں۔"

اور پھر اس "دوست بننے اور شریک کار ہونے" کے معنی بتانے کے لیے قرآن کی اُن آیتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں "ثُمَّ جَعَلْنَاکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ .... لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ — کا مضمون بیان ہوا ہے۔ ان آیتوں میں خدا کی "دوستی اور شرکت کار" کا کیا عملی مفہوم کھلتا ہے؟ اسے کوئی سمجھ لے تو یہ اس کی ژرف نگاہی ہے، خود مجیب صاحب نے اس معاملہ میں کوئی مدد نہیں کی ہے، وہ تو بس ایکدم سے اس پر آئے ہیں کہ دیکھئے۔

"یہاں مراد تمام مرد اور عورتیں ہیں، صرف وہ لوگ نہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں بلکہ وہ تمام لوگ جن کا ضمیر بیدار ہے اور جو ہر کام اپنے ضمیر کے مطابق کرتے ہیں مگر ان

میں ان سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔"

اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ "ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ"۔ کے خطاب میں صرف مسلمان نہیں اُن کے ہم عصر تمام بنی نوع انسان شامل ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوا؟ یہ بشارت ان کو ان آیتوں میں کہاں دی گئی ہو کہ اگر تم اپنے ضمیر کے مطابق اس خلافت کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہو تو مقبولِ بارگاہ ایزدی ہو، غلطی بھی کر جاؤ تو فکر کی بات نہیں؟ — مگر مجیب صاحب کو ان باتوں سے کہاں مطلب؟ وہ قرآن کو استدلال اور استناد کی کتاب کب مانتے ہیں۔ اُن کے نزدیک تو یہ واردات قلبی عطا کرنے والی کتاب ہو۔ اور واردات قلب میں قیاس و منطق کا کیا ہیچ؟ وہ تو ان آیتوں میں ایک قلبی واردات کے طور پر یہ "ہدایت" پا رہے ہیں کہ:

"انھیں غلطیوں کے خوف سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہیں رہنا چاہیے بلکہ اپنے بس بھر جدوجہد کرنا چاہیے۔"

اور جب یہ ہدایت ہو، تو وہ بشارت آپ ہی لازم ہو جاتی ہو۔ وہ اسی ہدایت کے مطابق عمل کو خدا کی "دوستی" قرار دیتے ہیں اور یاد دلاتے ہیں کہ "أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ"۔ قرآن کا اعلان ہو۔ یہ سب زبان و بیان کے کس قاعدے، لغت کے کس نکتے، استنباط و استخراج کے کس اصول اور قیاس و منطق کے کس قرینے سے ہوا؟ اسے اگر آپ نہ سمجھیں، تو آپ کو خدا سمجھے، مجیب صاحب کو مطلق ضرورت نہیں کہ وہ آپ کو سمجھائیں۔ انھوں نے تو اس طرح اپنی بات کہدی ہو جیسے سر چول سے ٹھیک اور ایک جانی اور مانی حقیقت ہو، بس کسر یہ تھی کہ لوگ اس کی روشنی میں تمام معاملے کو نہیں دیکھ رہے تھے، اس کسر کو مجیب صاحب نے پورا کر دیا ہو اور اب اسی تنگ نظری کے لیے کوئی گنجائش نہیں کہ ایک خاص نظام عمل ہی میں (جسے اسلام کہا جاتا ہو) انسانوں کی فلاح، از روئے قرآن سمجھی جائے، مغفرت اور درگزر انھیں لوگوں کا حق مانا جائے جو "الاسلام" کو اپنا دین بناتے ہیں اور خدا کی دوستی بس انھیں کا حصہ قرار دی جائے جو کہ نبی امی کا نقش قدم لے کے چلتے ہیں۔

یہ قرآن کے نام پر دین کی ایک ایسی روشن اور منقح حقیقت کو جسے ذہن نشین کرانے سے قرآن کے سیکڑوں میں سے کم ہی صفحات بچے ہیں، اُلٹ ڈالنے کی کوشش جس قدر بے سوادی، کم نگاہی اور مضحکہ خیزی کے پہلو لیے ہوئے ہے اُن سے کوئی مطلب کسی کو نہ بھی ہو تب بھی کیا یہ بات قابل برداشت ہے کہ ایک ایسے تعلیمی ادارے کا سربراہ اسلام کی بنیادیں اُلٹ ڈالنے کی کوشش کرے جس پر "جامعہ ملیہ

اسلامیہ" کا بورڈ لگا ہو اور ہندوستان بھر سے کتنے ہی مسلم طلبہ جہاں ایک اسلامی ادارہ سمجھ کر آتے ہیں؟ جس کے لیے مسلمانوں سے امید کی جاتی ہو کہ اس کے کاموں میں ملّی جذبہ سے حصہ لیں گے؟ یہ بات اُن تمام مسلم افراد کے سوچنے کی ہو جو جامعہ سے کسی قسم کا علاقہ بھی رکھتے ہیں!

اب تک لوگ وحدتِ ادیان ہی کا فتنہ اٹھاتے اور مختلف دینوں کو خدا کی رضا پا لینے کا یکساں ذریعہ از روئے قرآن ٹھہرادیا کرتے تھے۔ مگر مجیب صاحب اس سے کہیں آگے کی فتنہ آرائی کے درپے ہوئے ہیں۔ وہ خدا کی رضا حاصل کرنے اور اُخروی کامیابیوں سے سرفراز ہونے کے لیے سرے سے اُس چیز کی ضرورت کا احساس ختم کردینے اُٹھے ہیں جسے اب تک اصل دین و مذہب سمجھا جاتا رہا ہے۔ اُن کا کہنا ہے ___ اور خدا پناہ میں رکھے ___ قرآن کو "گواہ" بنا کر کہنا ہے کہ بس اپنے ضمیر کے مطابق ذاتی زندگی گزارنا اور دنیا کے معاملات میں سرگرم حصہ لینا ہی خدا کو انسان سے مطلوب ہو اور اسی میں تمام وہ اُخروی کامیابیاں پنہاں ہیں جن کا وعدہ قرآن مجید میں اہل ایمان سے کیا گیا ہو۔ "لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ" سے اخذ کی ہوئی اُن کی ہدایت اور بشارت سامنے ہو، جس میں اس بات کی نفی لفظوں میں تو نہیں کی گئی ہو کہ زندگی کے معاملات کو اپنے بس بھر ضمیر کے مطابق انجام دینے کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو انسان کو "اولیاء اللہ" کے زمرہ میں شامل کرنے کے لیے ضروری ہو، مگر جو کچھ الفاظ اور پیرایہ بیان ہے اس میں ضرورت ہی اس بات کی کہاں تھی کہ نفی کا پہلو بھی اُجاگر کیا جائے؟ جو آدمی بھی مجیب صاحب کے فکر کو قبول کر لینے کے قابل ہوگا یہ نفی تو آپ سے آپ اس کے دل میں بیٹھے گی، پھر اسے کھول کے وہ ایک شورش عام کا خطرہ کیوں مول لیں۔

یہی ایک مقام نہیں ہو جس سے مجیب صاحب کا یہ نقطۂ نظر ظاہر ہوتا ہو، جگہ جگہ اس کا اظہار مقالے میں ہوتا گیا ہو اور کوئی شک رکھنے کی گنجائش نہیں کہ وہ اسی کو ذہنوں میں اتارنا چاہتے ہیں۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا یا مزید کی ضرورت محسوس کی جاتی تو اس طرح کے کئی اقتباس اور سامنے لائے جا سکتے تھے۔

ہاں تو مجیب صاحب داعی ہیں اس بات کے کہ اصل دین داری اور اصل "اسلام"

دنیا کا ہر کام اپنے ضمیر کی روشنی میں کرنے اور خوب سے خوب تر کرنے کا نام ہے۔ اور ضمیر کی روشنی میں خوب اور خوب تر کی تلاش جب آدمی کو کرنا پڑے تو اس کا لازمی مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی خاص پیمانہ اس کے سامنے نہیں ہے جو دو ٹوک فیصلہ کردے۔ اسی بنا پر مجیب صاحب نے جہاں یہ کہا تھا کہ اولیاء اللہ کے زمرے میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو ہر کام اپنے ضمیر کے مطابق کرتے ہیں اور غلطیوں کا خوف دور کرنے کے لیے انھیں قرآن کی ہدایت ہے کہ اس خوف سے بیٹھ نہیں رہنا چاہیے بلکہ اپنے بس بھر جدوجہد کرنی چاہیے۔ وہیں انھوں نے یہ صراحت بھی کر دی تھی کہ

"اس جدوجہد کی نوعیت کیا ہوگی۔ یہ وضاحت سے نہیں بتلایا گیا ہے کہ، بلکہ صرف نیک اور صالح عمل کا ذکر ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا۔ یہ خود ایمان لانے والے کا کام ہے کہ اپنے ضمیر کے مطابق ان حالات میں کہ جن میں وہ زندگی گزار رہا ہے، طے کرے کہ نیک عمل کیا ہے اور معروف اور منکر سے مراد کیا ہے۔" (جامعہ مئی ۱۹۷۰ء ص ۲۴۸)

گویا زندگی کے عام معاملات میں بھی جن کی بہتر طریقے سے انجام دہی، اصل دین اور اصل اسلام مجیب صاحب کے نزدیک ہے، خوب و ناخوب اور قبول و ناقبول کا کوئی پیمانہ قرآن نہیں دیتا، کسی حد تک وضاحت بھی نہیں کرتا کہ اُس کے "عمل صالح" اور "معروف" و "منکر" کا کیا تصور ہے۔ یعنی ــــ شریعت اور اُس کی ہمہ گیری کا تصور غلط ہے! ــــ اور اسے بھی مجیب نے تھوڑی سی احتیاط سے کہہ ہی دیا ہے، لکھا ہے:

"اُن کا (درمنا ...) کے عالموں کا) معیار ایسے میدان میں کام نہیں آتا جہاں انسان کو خود اپنے لیے فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اُن کی یہ رائے قائم ہو گئی ہے کہ ایسا کوئی میدان ہے نہیں اور ہماری شریعت کامل اور ہمہ گیر ہے۔ یہاں پر ہمیں اس کو اور شریعت کے اس بے لوچ تصور کو جو وہ پیش کرتے ہیں، خیرباد کہہ دینا چاہیے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے ضمیر کے مطابق عمل کریں اور ان تمام ذمہ داریوں کا حق ادا کریں جو قرآن نے ہم پر ڈالی ہیں اور جن کے لیے ہم میں سے ہر ایک انفرادی طور پر خدا کے سامنے جواب دہ ہے"

کیا چاہتے ہیں مجیب صاحب، شریعت کی ہمہ گیری کا تصور ختم کر کے اور "ضمیر" کے فیصلے کے میدان کو اس قدر وسیع کر کے کہ نماز روزے کے سوا زندگی کا کوئی معاملہ اس سے باہر نہ رہ جائے؟ یہ کہ تمام مسائل پر ہمیں صرف تاریخ اسلام کے پس منظر میں نہیں بلکہ تاریخ عالم کے پس منظر میں

غور کرنا چاہیے۔ مسلم اور غیر مسلم کی تفریق زندگی کے اس وسیع میدان میں ختم کر دینی چاہیے۔ اور ایک ایسی وحدت میں، غیر مسلم دنیا کے ساتھ ہمیں خود کو شامل کر دینا چاہیے، جس میں بس انسانی ضمیر رہنما ہو، مذہبی کتابوں کے حوالوں اور مذہبی عالموں کے تفریق انگیز معیاروں کا اس میں گزر نہ ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "ملت کے" ہر فرد کو اس وسیع میدان میں آزادی ہونی چاہیے کہ جو چاہے رائے رکھے اور جو چاہے کرے ــــ یہ سب باتیں اب انھیں کی زبان سے سُنیے:۔

مقالے کی دوسری قسط میں، وہ اسلام کے ایک عالمی دین اور عالمی ہدایت ہونے کی حقیقت واقعی کو ایک خاص رنگ میں پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

"اگر اسلام ایک عالمی مذہب ہے اور انسانوں یعنی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ایسے لوگ تھے جو ایک خدا اور اس کی ہدایت پر دل سے ایمان لائے، ایسے جو خالی زبان سے ایمان لائے، اور ایسے بھی جو ایمان لائے ہی نہیں تو ہمیں تمام مسائل پر صرف تاریخ اسلام کے پس منظر میں نہیں بلکہ تاریخ عالم کے پس منظر میں غور کرنا چاہیے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ انسان کے ضمیر نے تمام قوموں اور تمام حالات میں کس طرح اپنا اثر دکھایا ہے۔" (جامعہ جون ۱۹۶۸ء صلہ ۲۹۱)

اس کے بعد کچھ آگے بڑھ کر" اقوام عالم" کے ایک خاص معنی بھی سامنے آتے ہیں:۔

"ہمیں ماننا پڑے گا کہ مغربی قوموں نے، چاہے ہماری دینیات کے مطابق وہ صحیح معنوں میں عیسائی نہ ہوں، غلامی کو مٹانے کا بڑا نیک کام انجام دیا ہے۔ غلامی کو مٹانا ایک ایسا کام ہے، جسے مسلمانوں کو اس سے بہت پہلے کر دینا چاہیے تھا، لیکن ہم نے اپنے آپ کو ساتویں صدی کے سماجی نظام میں گرفتار کر لیا اور اس کا خیال نہ کیا کہ غلاموں کو آزاد کرنا ثواب کا کام اسی نیت سے ٹھہرایا گیا ہے کہ غلامی کا سد باب ہو جائے۔ یہی مغربی قومیں تھیں، جنھوں نے بالآخر جمہوری نظام قائم کیا، اس لیے نہیں کہ یہ اُن کا مذہبی عقیدہ تھا بلکہ اس لیے کہ اُن کے ضمیر نے اُن کو مجبور کیا۔ اس کے برخلاف ہم شخصی حکومت پر راضی رہے، اگرچہ وہ استبدادی تھی اور ایسی حکومت کی قرآن میں اجازت نہیں ہے۔" (ص ۲۹۳-۲۹۲)

پھر یہ لکھ کر کہ قرآن میں زکوٰۃ کو حاجت مندوں پر صرف کرنے کا حکم تھا لیکن حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے بعد، صرف حضرت عمر بن عبد العزیز کے دو سالہ دور کو مستثنیٰ کر کے یہ رسم، یعنی زکوٰۃ کو سرکاری طور

پر محتاجوں کی مدد اور رفاہ عام کے کاموں کے لیے استعمال کرنے کی رسم "اٹھ گئی" آگے لکھتے ہیں۔

"آج کل جو ویلفیر اسٹیٹ قائم ہوئی ہے، اُس پر مسلمانوں کے سماجی تصورات یا اُن کے ضمیر کا کوئی احسان نہیں ہے اور یہ بات بھی صاف ظاہر ہو کہ پہلے دونوں خلفاء کو چھوڑ کر مسلمانوں کا قائم کیا ہوا کوئی سیاسی نظام اسلام کے نصب العین کے اتنا قریب نہیں تھا جتنی آج کل کی ویلفیر اسٹیٹ۔" (ص ۴۹)

اور پھر ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہوئے کہ اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہونے اور اسلامی مقاصد کو بروئے کار لانے کی اہلیت صرف وہی لوگ نہیں رکھتے جو اپنے آپ کو مسلمان بنا لیں، بلکہ غیر مسلموں میں بھی، غیر مسلم رہتے ہوئے، اس کی پوری صلاحیت ہو، مسلمانوں کو اس پس منظر میں یہ سوچنے کی دعوت دیتے ہیں کہ

"ہمیں اپنے ضمیر کو گواہ اور رہنما بنا کر موجودہ سیاسی اور سماجی حالات میں کیا کرنا چاہیے"؟

پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں کہ:-

"اگر اسلام کا منصب صرف انسانوں کو متحد کرنا ہے اور اُن میں تفریق پیدا کرنا نہیں ہے تو ہمیں ہر مسلمان کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق طے کرے کہ مسلم اور غیر مسلم کا فرق قائم رکھنا کس حد تک ضروری یا مناسب ہے اور ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ مسلمان کا ضمیر ہی یہ طے کر سکتا ہے کہ وہ اسلام کے روحانی، اخلاقی اور سماجی مقاصد کی خدمت کس طرح کر سکتا ہے۔"

اسی سلسلۂ کلام میں فرماتے ہیں:-

"آج کل کے حالات میں یہ تقریباً ناممکن ہے کہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا ایک دینی و سیاسی محاذ ہو، غالباً ہم اپنی قوت کو یکجا کرنے کے معاملے کو اپنی فلاح کا ذریعہ نہ مانتے۔ اگر ہمیں ہر مسلمان کے ضمیر کی سلامت روی پر اتنا بھروسہ ہوتا کہ اپنی طاقت کو منتشر کر دیں اور یہ سمجھیں کہ ہر شخص اور ہر چھوٹی بڑی جماعت اپنے ضمیر پر بھروسہ کر کے صداقت، عدل

ص ۹

ع یہاں ہمیں سیاسی معاملات سے مطلب نہیں ہو، دکھانا صرف یہ مقصود ہو کہ دینی معاملے میں مجیب صاحب کیا فرماتے ہیں۔

اور فیاضی کا حق ادا کر سکے گی۔"

اور اس کی مزید تشریح کے طور پر کہتے ہیں:۔

"ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ملّت کے تصور کو ذہن نشین کرنے کے لیے جو کچھ کہا گیا ہے اس کے باوجود اسلام دراصل انفرادی مذہب ہے...... اسلام کا اصل منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملت کا ہر فرد اپنے ارادے سے ملت کو قائم رکھے، یہ نہیں کہ ملت ہر فرد کے ارادے کو سلب کر لے۔"

تو شریعت کی ہمہ گیری کے تصور کو مجیب صاحب نے غلط ٹھہرا دیا، اہل ایمان کے ضمیر اور صرف ضمیر کا یہ منصب بتایا کہ زندگی کے تمام معاملات میں اُسی کا فیصلہ ناطق ہو، غیر مسلموں کے بارے میں ذہن نشین کرایا کہ اسلام میں داخل نہ ہونے کے باوجود وہ اسلام کے اخلاقی، سماجی اور سیاسی مقاصد کو پورا کرنے میں۔ جو اصل اسلام ہے ۔ اتنے ہی ناقابل اعتماد ہو سکتے ہیں جتنا کہ کوئی اچھے سے اچھا مسلمان، اُن کے ساتھ ایک سیاسی اور سماجی وحدت میں منسلک ہونا عین اسلام کا تقاضہ ٹھہرایا جس میں ہر فرد اور ہر جماعت کے ضمیر کا مقام یکساں ہو اور سب ایک دوسرے سے روشنی حاصل کریں۔ اور اس کے بعد بھی اگر کوئی کسر اب تک کے اسلام کا بستر لپیٹ دینے میں رہ سکتی تھی تو اس کا امکان ختم کرنے کے لیے اس انفرادی آزادی کو اسلام کی عین فطرت بنا دیا گیا کہ ملت کا ہر فرد اسلام کے اصولوں کی متابعت اور اُس کے مقاصد کی خدمت میں اپنے طرزِ عمل کا مختار ہو، کوئی کسی سے پوچھنے کا حق نہ رکھتا ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کس دلیل سے کر رہا ہے!

اور اس اتنی بڑی اکھیڑ پچھاڑ کے پیچھے ہے کیا؟ ــــ کیا مجرد ایک عرفانِ حقیقت؟ اور ایک بے لاگ تلاشِ حقیقت کا اوّل سے آخر تک معروضی نتیجہ؟

ہو تو سکتا تھا کہ واقعہ یونہی ہو۔ مگر جس قدر بڑے بڑے جھول، خاص طور پر قرآن سے استدلال اور قرآن و حدیث کی حیثیت پر گفتگو والے جھول، مجیب صاحب کے پیش کردہ اس فکر میں پائے جاتے ہیں، اُن کو دیکھ کر یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ ایک خالی الذہن آدمی کی بس تلاشِ حقیقت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ مجیب صاحب جیسا پڑھا لکھا اور معمر آدمی جو معلم بھی ہو اُس کا اتنے بڑے بڑے جھول لیے ہوئے آگے بڑھنا ذرا بھی سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اس کے بجائے جو

بات قرین قیاس ہے، گو قطعی اُسے کہنا مشکل ہو، وہ یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا کے مسئلہ میں تجدد پرستوں کا جو راستہ علماء روکے ہوئے ہیں بس اُسے صاف کرنے کے لیے یہ کوہ کاوی مجیب صاحب نے کی ہے اور اُس درخت ہی کو جڑ سے اُڑا دینے کی ٹھان کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں جس پہ ان علماء کا آشیانہ بنا ہے۔

قطعیت کی دلیل تو ہم کہہ چکے ہمارے پاس نہیں ہے لیکن اسے محض اتفاق اور خالی از علت بات کیسے سمجھ لیا جائے کہ مسلمانوں کے ملی محاذ بنانے کی قابل تنقید اور مضرت رساں کوششوں کی مثالوں کے سلسلہ میں جو واحد معاملہ اُن کے انتخاب میں آیا ہے، وہ پرسنل لا ہی کا معاملہ ہے اس کے سوا یا اس کے علاوہ کسی دوسری مثال کا نام تک لینا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا۔

اوپر جو آخری اقتباس مجیب صاحب کا گزرا ہے اُس کے معاً بعد لکھتے ہیں۔

"میری نظر میں بعض معاملے ہیں، جن میں ایک ملی محاذ قائم کرنے کی کوشش بیجا طور پر کی گئی ہے۔ اور جن میں ہم نے اپنی عقل اور ضمیر سے کام لینے کے بجائے دینیات کی کتابوں پر بھروسہ کیا۔

جب مرکزی اسمبلی میں شاردا بل پہ بحث ہو رہی تھی تو وہ مسلمان جو جانتے تھے کہ مسلمانوں میں بچپن کی شادیوں کا رواج ہے۔ اور اس سے مضر نتیجے نکلتے ہیں، یا تو خاموش رہے یا مسلمانوں کی عام رائے سے دب کر انھوں نے اس تحریک کی تائید کی کہ مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ اس کے لیے سب سے اہم دلیل یہ تھی کہ ایسی اسمبلی جس کے اکثر رکن غیر مسلم ہوں اس کا حق نہیں رکھتی کہ شرعی معاملات میں مسلمانوں کے لیے قاعدے اور قانون بنائے ......

...... یہ دلیل کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے شرعی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے' بہت کمزور تھی' اس لیے کہ لڑکیوں کے حق وراثت کے بارے میں عدالتوں میں فیصلے ہو چکے تھے' جو شریعت کے خلاف تھے اور قانون تعزیرات اور دوسرے قوانین میں جو برطانوی حکومت نے نافذ کیے تھے' شریعت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں نے جس طرح شاردا بل کی مخالفت کی' اُس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ دوسروں کی نظر میں اُن کی عزت کم ہو گئی۔

اسلام پہلا مذہب ہے' جس نے نکاح کو ایک روحانی اور دائمی تعلق کے بجائے ایک قانونی معاہدے کی شکل دی ہے۔ اب مسلمان بجائے اس کے اصرار کریں کہ نکاح

کے بارے میں اُن کا تصور جو اخلاقی اور سماجی اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، عام طور پر صحیح تسلیم کیا جائے، رفتہ رفتہ اپنے رویہ سے اپنے اوپر یہ الزام اوڑھ رہے ہیں کہ وہ یک زوجگی کے مخالف ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عقل سلیم رکھنے والے مسلمان اور خاص طور سے وکیل ایسے معاہدے مرتب کریں کہ جن سے عملی طور پر عورتوں کو اُن کے جائز اور پورے حقوق مل سکیں۔ لیکن اس کے برخلاف یہ کہا جا رہا ہے کہ اس معاملے میں صرف علماء کی متفقہ رائے ہی سند ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس کا بھی یقین ہے علماء متفق نہ ہوں گے، چاہے اُن سب کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے ......"

تو یہ صرف اتنا سا مقصد تھا جس کے لیے پروفیسر نجیب صاحب نے تمہید اور لپیٹ تک کی قید سے بھی بے نیاز ہو کر، اسلام کے پورے درخت ہی کو نشانہ پر دھر لیا اور پھر علماء کی اُن کے عرفی مقام اور مرتبہ کو نظر انداز کر کے ایک بے رحم تنقید کے سپرد انھیں کرنا پڑا۔ انھیں اگر اپنی جماعت (ملّت) کو ایک بہتر جماعت بنانے کا حوصلہ "خدا نے دیا ہے، ایک "بیدار ذہن" بھی (بلا طنز) عطا ہوا ہے جو علماء کی بے حسی اور لیت و لعل سے نالاں ہے، تو آخر یہ کون سی مشکل بات ہے، خاص طور سے اُن جیسے ذی علم کے لیے کہ دین کا وہ علم حاصل کر لیں جو انھیں ایک عالم دین کا بھی مرتبہ دلا سکے۔ اب تو وہ زمانہ نہیں رہا کہ کسی مدرسے سے فراغت حاصل کرنا ہی عالم دین شمار کیے جانے کی شرط ہو۔ ایسی مثالوں پر یقیناً اُن کی بھی نظر ہو گی کہ بغیر کسی سند فراغ کے اتنے ہی مستند عالم بعض اشخاص مانے جاتے ہیں جتنا مستند کوئی فارغ التحصیل ہو سکتا ہے، بلکہ ایسے بعض اشخاص کا سکہ تو ایسا رواں ہے کہ مشکل ہی سے کسی فارغ التحصیل عالم کا نام اُن کے مقابلے پر لیا جا سکتا ہے۔ پھر نجیب صاحب اسی نئی وسعت کی قدر کرتے ہوئے آخر کیوں وہ منصب حاصل نہیں کر لیتے جس پر پہنچ کر وہ کسی دوسرے عالم دین ہی کی طرح ملت کی رہنمائی کے حقدار ہوں۔

یہ بات کہ جب تک تمام علماء متفق نہ ہوں کچھ نہیں ہو سکتا، واقعات کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں اور قرآن و حدیث نے کوئی اس طرح کی اجارہ داری بھی علماء کے لیے قائم نہیں کی ہے۔ ایک عالم اگر مطمئن ہے کہ اُس کا موقف کتاب و سنت کی روشنی میں برحق ہے، تو اسے حق ہے کہ امت کو اس کی طرف دعوت دے۔ اور امت اگر اسی اطمینان کے ساتھ سب کو

ایک طرف چھوڑ کر اُس اکیلے کی طرف آجائے تو ذرا بھی اپنے اس فعل میں گنہگار نہیں ہے کسی عالم کا صرف قول یا تمام علماء کا متفق ہو جانا کوئی شرعی حجت نہیں ہے۔ حجت کتاب وسنت سے استدلال ہے۔ اور اس استدلال میں اگر ایک اکیلا شخص بھی زیادہ صحیح ہے تو وہی کتاب وسنت کا صحیح ترجمان ہے اور کسی عالم کی مجال نہیں کہ وہ اس استدلال کے مقابلے میں محض ایک باقاعدہ عالم کے قول یا علماء کے مجرد اتفاق کو قابل ترجیح قرار دے۔ مجیب صاحب اس کے خلاف کوئی ایک بھی معتبر شہادت پیش نہیں کر سکتے۔ اور اس لیے یہ محض ایک بہانہ سازی ہے کہ علماء کبھی متفق ہوں گے نہیں' لہٰذا قرآن وحدیث سے دلیل کا راستہ اختیار کرنے اور علماء کے مانے ہوئے معیاروں پر اپنی رائے صحیح ثابت کر دکھانے میں کوئی فائدہ نہیں۔ حقیقت صرف یہی ہے کہ مجیب صاحب جو کچھ چاہتے ہیں اُس کے لیے دلیل کتاب وسنت سے فراہم نہیں ہو سکتی اور اس لیے انھیں سودمند راستہ یہی نظر آتا ہے کہ اُس دائرے کے تمام معاملات میں جس کے اندر وہ کوئی نئی بات چاہتے ہیں' قرآن وحدیث سے دلیل کی شرط کا خاتمہ کرا دیا جائے۔

مگر اس طریق علاج میں وہ جماعت ہی کہاں باقی رہے گی اور اُس ملت کا وجود ہی کب ڈھونڈے سے بھی ملے گا' جس کی خیرخواہی میں یہ طریقہ اپنایا جا رہا ہے؟ ضمیر کا بھی ایک مقام ہے اور بہت بڑا مقام ہے لیکن اُس کی حیثیت باطن کی "ایک آنکھ" سے زیادہ تو نہیں ہے۔ ظاہر کی آنکھ بھی دو چیزوں کے بغیر ذرہ برابر سودمند نہیں۔ ایک یہ کہ خارج میں کچھ روشنی اُس کی مددگار ہو۔ دوسرے یہ کہ اشیاء عالم کے بارے میں کچھ علم وآگاہی بھی اُس شخص کو ملی ہو جس کے چہرے پر آنکھ لگی ہوئی ہے۔ باطن کی آنکھ بھی اسی طرح خودکفیل نہیں ہے۔ وہ صرف خیرپسندی کا ایک جذبہ ہے جو گمراہ بھی ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہی نہیں ہوتا بھی ہے ___ اقوام عالم کی تاریخ کا کوئی ادنیٰ طالبعلم بھی اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ اس جذبے کو خیر اور خوب کی صحیح صحیح شناخت کے لیے خود ایک معیار چاہیے جو اسے بھٹکنے نہ دے۔ خدا نے یہ جذبہ خیرپسندی (یعنی ضمیر) انسان کے اندر رکھا اور اس کی خبر بھی دی مگر انسان کو صرف اس کے سپرد کرکے کارگاہ حیات میں نہیں اتار دیا بلکہ

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ	ہم نے حکم دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب
مِنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا	پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی

خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ○ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ○

(البقرۃ ع ۴)

ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو وہ ہیں دوزخ میں جانے والے وہ اسمیں ہمیشہ رہیں گے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

کے الوداعی الفاظ میں یہ وصیت بھی کی کہ اُس کی طرف سے ہدایتیں آتی رہیں گی اُن کے اتباع ہی میں، انسان کو اپنی فلاح و نجات مضمر جاننا ہے — یہ صرف اسی لیے تو کہ ضمیر انسانی خود کفیل نہیں تھا' ورنہ اور معنیٰ اس کے کیا ہیں؟ مجیب صاحب بھی شریعت الٰہی کی ہمہ گیری اور ابدیت کا انکار کرتے ہوئے ہر فرد بلکہ ہر جماعت کے ضمیر کو بھی خود کفیل بہر حال نہیں کہہ سکتے ہیں۔ انھیں بھی اقوام عالم کی تاریخ سے استفادے اور دوسری جماعتوں کے ضمیر کی کارگزاریوں سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت تسلیم کرنی پڑی ہے کیونکہ وہ ضمیر جو رہنمائی کا کردار ادا کر سکے' دراصل تیار ہی اُس وقت ہوتا ہے جب خارج سے علم کی غذا بھی اُسے پوری پوری مل جائے اور وہ ہضم ہو کر اُس کا جزو بن جائے۔ اب جیسی وہ غذا ہوگی ویسی ہی ضمیر کی رہنمائی بھی ہوگی۔ خدا نے پیغمبری کا نظام قائم کر کے ایک علمی غذا کا انتظام ضمیر انسانی کے لیے کیا تھا تاکہ پھر کوئی بڑی ٹھوکر اُسے نہ لگے، مجیب صاحب اس کے بجائے اقوام عالم کی تاریخ سے غذا حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، جس میں ہر طرح کی ٹھوکروں کا اندیشہ بھی انھیں تسلیم ہے۔ یہ اپنی اپنی پسند ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس ترک و اختیار کا محرک بس یہ ہے کہ اقوام عالم کی تاریخ سے استفادے کی صلاحیت تو مجیب صاحب کو حاصل ہے' اس لیے اس باب میں نہ صرف یہ کہ انھیں کسی دقت کا سامنا نہیں بلکہ رہنمائی کا مقام بھی آسانی سے پا سکتے ہیں جب کہ خدا کی ہدایت سے استفادے کے معاملے میں اُن کا حال دوسرا ہے اور اس حال کو بدلنے کے لیے ایک لمبی مشقت اور ایک نئی طالبعلمانہ زندگی ناگزیر ہے۔

علماء کے جمود کی شکایت ہمیں تسلیم ہے۔ یہ تجزیہ بھی بہت حد تک صحیح ہو کہ غلطیوں کے خوف سے وہ اپنے فرائض میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ لیکن پھر جو کچھ مجیب صاحب فرما رہے ہیں وہ اگر اس کا ردِ عمل ہے' تو یہ کوئی دانشورانہ ردِ عمل نہیں ہو سکتا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی جو مثال مجیب صاحبؒ

پیش کی ہے، کہ انھوں نے اصلاح کی کوشش کی مگر جب علماء سے تنگ ہوئے تو ممکن ہے اسی باعث پیغمبری کا دعویٰ کیا ہو کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کی کون چلنے دیتا، اُن کی تحریک دماغوں میں ایک بال سا پیدا کر کے ختم ہو جاتی۔[۱] معلوم ہوتا ہے کہ ملت کی اصلاح کے لیے پیغمبری کے دعوے تک میں مضائقہ مجیب صاحب نہیں دیکھتے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ انداز فکر ہو تو اُن باتوں میں کیا مزید قباحت وہ محسوس کریں گے جن کی دعوت اس مقالے میں انھوں نے دی ہے۔ لیکن یہ انداز فکر اگر واقعۃً اسلام اور ملت کے لیے اخلاص اور خیر خواہی کبھی اپنے ساتھ رکھتا ہے، تو اسے عقل و دانش سے سروکار نہ ہونا بھی اتنا ہی ظاہر ہے۔ ہاں اگر مقصد اسلام اور ملت کی تخریب ہو تو یہ ضرور ایک دانشورانہ بات ہے کہ ملت کو اُس کے اصلاح حال کا وہ راستہ بتایا جائے جو مجیب صاحب نے بتایا ہے۔

مقالے کا ایک اچھا خاصہ حصہ رہ گیا جس پر ہم کچھ نہیں کہہ سکے مگر جتنا ضروری تھا وہ بہرحال زیر بحث آگیا ہے۔ باقی کے لیے بشرط فرصت ایک الگ مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا فی الحال اسے چھوڑ کر صرف اُن باتوں کی نشاندہی ہمیں اور کر دینی ہے جن کی طرف پہلی قسط میں اشارہ کیا گیا تھا کہ بعض غلط بیانیوں سے بھی مجیب صاحب نے کام لیا ہے۔

ان مقامات میں ۱۔ مجیب صاحب کا یہ بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد صرف حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مثال ملتی ہے جنھوں نے زکوٰۃ سے حاجت مندوں کی حاجت پوری کی لیکن اسکے بعد سے زکوٰۃ کو سرکاری طور پر محتاجوں کی مدد اور رفاہ عام کے کاموں کے لیے استعمال کرنے کی رسم اٹھ گئی۔[۲] اس غلط بیانی کو ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس کی کچھ بھی نظر اسلامی خلافت کی تاریخ پر ہو۔

۲۔ قرون مظلمہ کے عیسائی راہبوں کی بابت لکھا گیا ہے کہ انھوں نے خدمت اور رفاہ عام کے جو کام کیے اُن کے مقابلے میں مسلمانوں کے کارہائے خیر کی تاریخ اس بے لوث خدمت کا جواب نہیں پیش کرتی جو ان راہبوں کے خدمتی سلسلوں میں نظر آتی ہے۔[۳] مجیب صاحب اسے تاریخ سے ثابت کر دیں تو دوسری بات ہو ورنہ ہمیں اصرار ہے کہ وہ اپنی تاریخ سے ناواقف یا برگشتہ خاطر اور عیسائیت کی تاریخ کے ضرورت سے زیادہ گرویدہ ہیں۔

۳۔ اور آخری غضب یہ ڈھایا گیا ہو کہ "ہدایہ" جو ہمارے عربی مدارس کے نصاب فقہ کی ایک معروف اور فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں ہو، اُس پر مجیب صاحب نے تہمت دھری ہو کہ اس کتاب میں "غیر مسلموں کے خلاف ہر جنگ کو جہاد قرار دیا گیا ہے"۔[۴] اس موقع کی مجیب صاحب کی عبارت میں طنز اور تعریض کا جو زہر ہے وہ جگر کے پار ہی تو ہو جاتا ہے، خیر یہ اُن کی خو ہو گی، مگر کوئی حوالہ تو*

---

[۱] جامعہ مئی ۱۹۶۸ء ص ۲۸۴ [۲] جامعہ جون ۱۹۶۸ء ص ۲۹۳ [۳] ایضاً ص ۲۹۴ [۴] ایضاً ص ۲۹۶

(ختم)

میری طالب علمی

دار العلوم دیوبند کے طلبہ سے ایک خطاب

دار العلوم دیوبند کی ایک خدمت کے سلسلہ میں گزشتہ مہینے جمادی الاُخریٰ کے آخری ہفتہ میں دو دن کے لیے دیوبند حاضری ہوئی تھی، ایک دن عصر کی نماز کے بعد دار العلوم کی مسجد ہی میں طلبہ سے اس ناچیز نے خطاب کیا، بعد میں بعض حضرات نے اصرار اور تاکید سے فرمائش کی کہ اس کو قلمبند کرا کے شائع کر دیا جائے، چنانچہ حافظہ پر زور ڈال کے ممکن حد تک الفاظ کی بھی پابندی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو قلمبند کرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ناظرین کے لیے نافع بنائے۔

—— نعمانی

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق صلوات اللہ تعالیٰ علیھم وعلیٰ کل من تبعھم باحسان ٥

میرے عزیز بھائیو! میں اس وقت آپ کو اپنی طالب علمی کے سلسلے کے کچھ واقعات اور تجربات سنانا چاہتا ہوں، مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ آپ کے لیے کارآمد اور نفعمند ہوں گے۔ میری طالب علمی کی سرگذشت بعض پہلوؤں سے بڑی سبق آموز ہے۔

آپ میں سے کچھ بھائیوں کو معلوم بھی ہوگا کہ میرا اصل وطن ہمارے اسی صوبۂ یو، پی کے ضلع مرادآباد کا مشہور اور قدیم قصبہ سنبھل ہے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے دُنیوی دولت و ثروت اور وجاہت بھی دی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے خاص رنگ میں گہرے دیندار بلکہ بڑے ذاکر شاغل تھے۔ اور ایک زمانہ میں انھوں نے بہت سخت صوفیانہ ریاضتیں بھی کی تھیں،

اس لیے وہ "صوفی جی" کے نام ہی سے معروف تھے۔ بہت سے لوگ ان کا اصل نام جانتے بھی نہیں تھے ــــ وہ عالم نہیں تھے، علماء حق سے ان کا تعلق بھی نہیں رہا تھا، بلکہ کچھ ایسے غلط صوفیوں کی صحبت سے متاثر ہوئے تھے جو غالباً تھے تو مخلص اور نیک نیت لیکن ان کے بعض عقیدے بڑے گمراہانہ تھے۔ میرے والد صاحب کا بھی اس دور میں یہی حال تھا، مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ اپنی عملی زندگی میں بڑے پکے دین دار، شریعت کے نہایت پابند، ذاکر، شاغل اور شب بیدار تھے، دُنیا کا کام بھی خوب کرتے تھے اور اس میں بھی بہت کامیاب تھے۔ لیکن دین اور آخرت کی فکر دنیا کی فکر پر غالب تھی اسی لیے وہ اپنی اولاد کو صرف دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے اور پوری وسعت اور استطاعت کے باوجود اپنے کسی بچہ کو خالص دنیاوی تعلیم یعنی انگریزی تعلیم دلانے کے بالکل روادار نہیں تھے، اسی واسطے انھوں نے مجھے بھی ناظرہ قرآن شریف اور تھوڑی سی اُردو تعلیم کے بعد فارسی اور پھر عربی پر لگا دیا، لیکن میں کچھ تو اس وجہ سے کہ میری عمر بہت کم تھی اور ابھی میں صرف و نحو سمجھنے اور پڑھنے کے لائق نہیں ہوا تھا (اور خاص کر میزان منشعب اور پنج گنج اور نحو میر جیسی کتابوں کے ذریعہ تو صرف و نحو سمجھنے اور پڑھنے کے قابل بالکل ہی نہیں تھا) اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ میرے اندر اس تعلیم کا کوئی شوق اور داعیہ نہیں تھا، میں نہایت بے دلی سے پڑھتا رہا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بس پٹائی کے ڈر سے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، وقتی طور پہ یاد کر کے سنا دیا کرتا، سمجھتا کچھ نہیں تھا، مجھے یاد ہے کہ کئی سال تک میرا یہی حال رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سال میری میزان نئے سرے سے شروع ہوتی تھی۔ ہمارے سنبھل میں اس وقت تین عربی مدرسے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ ایک سال تک میں ایک مدرسے میں پڑھتا رہتا، سال ختم ہونے تک میزان منشعب ختم ہو کر کبھی پنج گنج اور نحو میر بھی شروع ہو جاتی۔ لیکن والد ماجد اور گھر والے محسوس کرتے کہ میری پڑھائی ٹھیک نہیں ہو رہی ہے تو دوسرے سال مجھے دوسرے مدرسہ میں بھیج دیا جاتا ــــ وہاں کے استاد جب میرا یہ حال دیکھتے کہ مجھے کچھ بھی نہیں آیا ہے تو وہ پھر سے وہی میزان شروع کرا دیتے، اور پھر میں سال بھر میں میزان منشعب ختم کر کے پنج گنج اور نحو میر تک یا کچھ اور آگے تک پہونچ جاتا، لیکن مجھے آتا کچھ نہیں تھا۔ اس لیے اگلے سال پھر میں تیسرے مدرسہ میں بھیج دیا جاتا۔ وہاں کے اُستاد بھی میری خیر خواہی میں یہی طے کرتے کہ مجھے پھر میزان سے پڑھایا جائے اور پھر میری میزان شروع ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ یہ چکر برسوں

تک اسی طرح چلتا رہا اور ہر سال میری تعلیم "بدان اسعدک اللہ فی الدارین" سے شروع ہوتی رہی۔

اسی زمانہ میں جبکہ میرے غالباً دو تین سال اسی طرح برباد ہو چکے تھے اور میری عمر قریباً ۱۲ سال کی ہو چکی تھی، ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ ہمارے ضلع مراد آباد کے اس وقت کے انگریز کلکٹر نے جو کسی خوش گمانی کی بنا پر میرے والد ماجد کا بہت قدرشناس تھا ایک ملاقات میں والد صاحب سے ان کی اولاد کے بارے میں پوچھا۔ والد ماجدؒ نے بتایا کہ خدا کے دیئے ہوئے میرے ۵ لڑکے ہیں۔ اُس نے تعلیم کے بارے میں دریافت کیا تو اسے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی ہے اور نہ کوئی اب انگریزی پڑھ رہا ہے ــــ اس وقت میری عمر اور تعلیم کی منزل ایسی تھی کہ میرے ہی بارے میں اس طرح کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ کلکٹر نے اصرار سے کہا کہ کل ہی اس بچہ کو مقامی ہائی اسکول میں بھیج دیا جائے اور ساتھ ہی کہا کہ میں ہیڈ ماسٹر سے کہہ دوں گا کہ وہ پانچ سال میں انٹرنس کرا دے، اور والد صاحب سے کہا کہ پھر میں اس کو نائب تحصیلداری دے دوں گا ــــ اس زمانہ میں نائب تحصیلداری بڑی چیز تھی۔ پہلی ترقی کر کے آدمی تحصیلدار ہو جاتا تھا اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہو جاتا تھا۔ بس یہی ہندوستانیوں کی معراج تھی۔ اس سے آگے کلکٹر اور کمشنر تو صرف انگریز ہوتے تھے ــــ تو کلکٹر نے والد صاحب کو بہت اصرار کے ساتھ یہ مشورہ دیا۔ والد صاحب نے گھر آکر یہ قصہ سنایا اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا کہ انھوں نے اس کی بات ماننے کا فیصلہ نہیں کیا۔ لیکن اُن کے بعض ملنے والوں کی اور گھر کے بھی بعض لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے اور مجھے اسکول میں ضرور داخل کر دیا جائے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے والد صاحب کو اس کے لیے راضی کرنے کی کوشش کی ــــ لیکن وہ کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔ اُن کا آخری جواب یہ تھا کہ "مجھے اللہ تعالیٰ سے پوری اُمید ہے کہ اپنی زندگی میں اپنی اولاد سے مجھے کچھ لینے کی ضرورت نہ ہوگی، انشاءاللہ ہمیشہ ان کو کھلاتا اور دیتا رہوں گا، ہاں مرنے کے بعد قبر میں مجھے ضرورت ہوگی، اس لیے میں تو ان کو وہی تعلیم دلانے کی کوشش کروں گا جس سے مجھے قبر میں اور اس کے بعد کچھ ملتا رہے، الغرض انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔

مجھے یاد ہے کہ اُس وقت والد صاحب کے اس فیصلہ کا مجھے بڑا رنج اور صدمہ ہوا تھا جس کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ میں سوچا تھا کہ اگر مجھے اسکول میں داخل کر دیا گیا تو تھوڑے دنوں کے بعد میں نائب تحصیلدار اور پھر تحصیلدار اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر بن جاؤں گا اور دوسری اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی کہ مجھے کرکٹ کھیلنے کا بیحد شوق تھا، حالانکہ قریباً روزانہ پٹائی ہوتی تھی لیکن کھیل نہیں چھوٹتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اسکول میں داخلہ کے بعد مجھے اس کی بھی آزادی مل جائے گی ـــــــ لیکن والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے قطعی فیصلہ سنا دیا کہ وہ مجھے انگریزی پڑھنے کے لیے اسکول میں داخل نہیں کریں گے۔

اس واقعہ کے بعد بھی غالباً کئی سال تک میرا وہی چکّر چلتا رہا کہ پڑھنے کے ارادہ کے بغیر پڑھتا رہا۔ مدرسہ جاتا آتا رہا اور ہر سال مدرسہ کی تبدیلی ہوتی رہی اور نئے سرے سے میری میزان شروع ہوتی رہی۔

پھر سنہ ۳۸ھ کی بات ہے جس کو اب باون سال گزر چکے ہیں اُس وقت میری عمر پندرہ سال کی ہو چکی تھی۔ والد صاحب کو معلوم ہوا کہ فلاں مدرسہ میں ایک نئے پنجابی اُستاد آئے ہیں اور وہ بہت توجہ سے پڑھاتے ہیں۔ والد صاحب نے مجھے ان کے پاس بھیجنے کا فیصلہ فرما لیا میں ایک حکیم صاحب کا تعارفی خط لے کر اُن کے پاس بھیج دیا گیا۔ یہ مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے۔ (جو اب مغربی پاکستان میں ہیں اور میرے خاص محسن اُستادوں میں ہیں) انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کب سے پڑھ رہا ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں اتنے دنوں سے اس طرح پڑھ رہا ہوں۔ اب میں کچھ سمجھدار ہو چکا تھا، انھوں نے مجھ سے باتیں کیں تو اندازہ کیا کہ میں غبی اور کند ذہن بھی نہیں ہوں۔ اس سے انھوں نے سمجھ لیا کہ میرا اتنا وقت صرف اس لیے برباد ہوا اور ہو رہا ہے کہ میں نے خود پڑھنے کا ارادہ نہیں کیا ہے بلکہ صرف جبراً قہراً پڑھ رہا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے بتا دیا کہ واقعہ بالکل یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے اور اُن کے درجے بلند فرمائے، اُنھوں نے بڑی شفقت اور بے تکلّفی سے فرمایا کہ بھئی اب تم خود ہی اپنے بارے میں فیصلہ کر دو! اگر اب بھی تمہارا ارادہ پڑھنے کا نہ ہو تو ہمیں صاف بتا دو، ہم خود تمہارے والد صاحب سے مل کر اُنھیں سمجھائیں گے کہ وہ تمہارا وقت برباد نہ کریں کسی اور لائن میں لگائیں ـــ اور اگر تمہارا ارادہ پڑھنے کا ہو تو پھر ہم تمھیں پڑھائیں گے اور انشاء اللہ

تم بہت جلدی پڑھ لوگے۔ اُس وقت اللہ نے میرے دل میں ڈالا، اور میں نے اُن سے کہا کہ اچھا! انشاء اللہ اب میں پڑھوں گا۔ انھوں نے مجھے اس طرح پڑھانا شروع کیا کہ میزان کے چند صفحات مقرر کر کے فرمایا کہ ان کو غور سے دیکھ لو اور ان کا مضمون یاد کر لو۔ جو بات سمجھ میں نہ آئے مجھ سے پوچھ لو، دوسرے اسباق سے فارغ ہو کر میں تمھاری جانچ کر لوں گا۔ اس طرح انھوں نے ۸۔۱۰ دن میں میری میزان منشعب ختم کرادی۔ اور میں نے اب سمجھا کہ میزان منشعب میں کیا ہے، پھر اسی طرح مہینے دو مہینے میں پنج گنج اور نحو میر ختم کرادی۔ میں درمیان سال میں اُن کے پاس گیا تھا۔ اور شعبان تک اُنھوں نے علم الصیغہ اور ہدایۃ النحو تک پہونچا دیا۔ اب میں جی لگا کر اور اپنے ارادہ سے پڑھنے لگا۔ لیکن اس کے بعد مولانا مفتی محمد نعیم صاحب سنبھل تشریف نہیں لائے اور مجھے پڑھنے کے لیے سنبھل سے باہر بھیج دیا گیا، اس کے بعد چار سال میں، میں نے تمام متوسطات پوری کرلیں، اس وقت ہمارے مدرسوں میں منطق و فلسفہ کا بہت زور تھا اس لیے میں نے سب سے زیادہ کتابیں منطق و فلسفہ کی پڑھیں، اور اب اس کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اللہ کے فضل و کرم سے میں اپنے ساتھیوں میں ممتاز رہتا تھا۔

یہاں تک میں نے جن اساتذہ سے پڑھا تھا وہ سب اسی دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ اور فیض یافتہ تھے، اس لیے میرا ذہن بالکل دیوبندی تھا اور آگے کی تعلیم میں دارالعلوم ہی میں حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے اپنے والد صاحب کے بارے میں ابھی بتایا تھا کہ اُن کے عقائد کچھ دوسری طرح کے تھے، ان کو ہمارے اکابر دیوبند سے بہت بُعد تھا۔ لیکن نہ معلوم کس طرح اُن کے دل میں یہ بات اللہ نے بٹھادی تھی کہ حدیث دیوبند والے ہی اچھی پڑھاتے ہیں اس لیے جب میں نے اُن سے یہ عرض کیا کہ میں اب حدیث شریف پڑھنے کے لیے دارالعلوم دیوبند جانا چاہتا ہوں تو انھوں نے مجھے اجازت دے دی —— جب یہ بات عام طور سے مشہور ہوئی کہ میں پڑھنے کے لیے دیوبند جاؤں گا تو والد صاحب کے گیارھویں شریف، بارھویں شریف اور عرسوں کی محفلوں والے یارانِ طریقت نے اُن سے کہا کہ صوفی جی کیا غضب ہے! سنا ہے آپ کا لڑکا دیوبند پڑھنے جائے گا؟ تو وہ صرف یہ فرما دیتے کہ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے ہی راستہ پر رہے گا، الغرض انھوں نے اپنی رائے نہیں بدلی اور میں

شوال ۱۳۲۲ھ میں دارالعلوم آکر داخل ہوگیا، میں یہاں صرف دو سال باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے رہا۔ پہلے سال مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ اخیرین وغیرہ چند کتابیں پڑھیں اور اگلے سال دورہ!۔

میں یہاں کے زمانۂ قیام کا اس وقت کا صرف ایک واقعہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں جس کا تعلق میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے ہے ــــ یہ مکان جس میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام تھا اور اب حضرتؒ کے گھر کے لوگوں کا قیام ہے، ہمارے زمانۂ طالب علمی میں اس میں مطبع قاسمی اور کتب خانۂ قاسمی تھا جن بے چارے طالب علموں کو مدرسہ میں حجرہ نہیں مل سکتا تھا، اُن کو اس کے ایک خستہ سے کمرے میں رہنے کی اجازت دے دی جاتی تھی، میں بھی انہی بیچارے کسمپرس طالب علموں میں سے ایک تھا۔ دونوں سال میرا قیام اسی میں رہا۔ پہلے سال ربیع الاول کا مہینہ تھا اور خوب یاد ہے چودھویں تاریخ تھی اور اتفاق سے جمعہ کا دن تھا، عشاء کی جماعت کا وقت قریب تھا، میں اسی مطبع قاسمی میں بیٹھا وضو کر رہا تھا کہ [illegible] رحمۃ اللہ علیہ مطبع قاسمی کا پتہ پوچھتے ہوئے تشریف لے آئے، پہلے سے کوئی اطلاع بھی نہیں تھی گمان بھی نہ تھا، لیکن میرا ذہن منتقل ہوا کہ یہ ربیع الاول کا مہینہ ہے، ان ہی تاریخوں میں پیران کلیر کا عرس ہوتا ہے، یہ وہاں عرس میں تشریف لائے ہوں گے اُن کی پیران کلیر میں عرس میں حاضری کبھی قضا نہیں ہوتی تھی، چنانچہ دریافت کرنے پر بھی بتایا کہ میں کلیر شریف عرس میں آیا ہوا تھا، خیال ہوا کہ دیوبند قریب ہی ہے اس لیے وہاں سے فارغ ہو کر آ گیا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ عشاء کی جماعت کا وقت ہو چکا ہے۔ وہ باوضو تھے ہم لوگوں کے ساتھ فوراً ہی مسجد تشریف لے آئے ــــ اُس زمانہ میں حوض وہاں تھا جہاں اس وقت مسجد کے فرش کا آخری حصہ ہے اور چونکہ مسجد میں تنگی ہوتی تھی اس لیے حوض کو لکڑی کے تختوں سے پاٹ دیا گیا تھا۔ اس پر بھی کئی صفیں ہوتی تھیں، ہم لوگ ایسے وقت مسجد میں داخل ہوئے کہ نماز شروع ہو چکی تھی، ہمیں آخری صفوں میں حوض پر جگہ ملی۔ چودھویں رات کی چاندنی کھلی ہوئی تھی اور جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے عام طور سے تمام طلبہ صاف سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے، جب رکوع یا سجدہ کا وقت ہوتا تو ہم لوگوں کو جو حوض کے اوپر بلندی پر کھڑے تھے ایسا معلوم ہوتا جیسے آسمان سے اُترے ہوئے فرشتوں کی صفیں ہیں، مجھے خوب یاد ہے بڑا ہی نورانی منظر تھا، میں والد صاحب کے بالکل برابر میں کھڑا تھا، میں نے محسوس کیا کہ والد صاحب پر اس منظر کا کچھ خاص اثر پڑ رہا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم

لوگ اپنی قیام گاہ یعنی مطبع قاسمی میں آگئے۔ والد صاحب کی باتوں سے میرے اس احساس کی تصدیق ہوگئی کہ وہ دارالعلوم کی نماز کے اس منظر سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

صبح کو فجر کی نماز کے بعد حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کا اسی مسجد میں قرآن مجید کا درس ہوتا تھا، وہ اگرچہ دارالعلوم کے بڑے اساتذہ میں سے نہیں تھے، عمر بھی کم تھی، لیکن اپنی صلاحیت اور قابلیت کی وجہ سے ممتاز سمجھے جاتے تھے اور طلبہ میں مقبول اور محبوب تھے، اُس زمانہ میں ترجمۂ قرآن دارالعلوم کے نصاب میں داخل نہیں تھا، مولانا کا یہ درس گویا پرائیوٹ اور اُن کے ذاتی ذوق شوق کا نتیجہ تھا، بڑی وسیع نظر تھی اور خوب بولتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ درس قرآن کا حق ادا فرماتے تھے۔ طلبہ کی بہت بڑی تعداد پابندی سے شرکت کرتی تھی بڑا علمی نفع ہوتا تھا، میں نے موقع نکال کر مولانا کے کان میں اُس دن عرض کر دیا کہ میرے والد صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں، وہ عرس اور قوالی کے دلدادگان میں سے ہیں، اُن کے عقائد وخیالات اس طرح کے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کے بارے میں انھیں سخت بدگمانیاں ہیں اور ناواقفی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان دیوبند والوں کو تصوف اور بزرگان دین سے کوئی تعلق نہیں، میرا مقصد یہ تھا کہ آج کے درس میں اس کا لحاظ فرمالیا جائے۔

حُسنِ اتفاق سے اُس دن سورۂ یوسف کا وہ مقام زیر درس تھا جہاں یہ ذکر آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے (غلہ وغیرہ لانے کے لیے) جب اپنے صاحبزادوں کو مصر کے لیے رخصت کیا اور چھوٹے صاحبزادے حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یامین کو بھی ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تو اُس وقت یہ ہدایت بھی فرمائی کہ تم سب مصر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا (یَابَنِیَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَۃٍ) جس کا مقصد اکثر مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ دیکھنے والوں کی نظر نہ لگے۔ تو آخر میں یہ بھی فرمایا تھا "وَمَآ اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَعَلَیْہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ" ۝ ـــــ مولانا کاندھلوی نے اِن آیات پر تقریر کرتے ہوئے توکل کی حقیقت اور توکل اور اسباب کے تعلق پر بہت خوب روشنی ڈالی۔ اور اُس دن عارف رومی کے [illegible] اس سلسلے میں سُنائے ـــــ اس کے علاوہ بھی کئی مضامین تصوف ومعرفت [illegible] مولانا نے اُس دن کے درس میں ایسے بیان فرمائے جو والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے بہت ہی حسب حال تھے، اس درس سے [illegible] والد صاحب

بہت متاثر ہوئے ــــ رات کی نماز میں انھوں نے جو منظر دیکھا تھا اور جو نورانی کیفیات اس مجمع میں انھوں نے محسوس کیں اور پھر صبح کے درس میں جو کچھ سُنا اُس سے ان کا ذہن ہمارے اکابر اور ہماری جماعت کے بارے میں بہت کچھ بدل گیا۔

درس سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ اُٹھے تو والد صاحب نے فرمایا کہ میں یہاں کے بزرگوں کے مزارات پر جانا چاہتا ہوں، ہم لوگ ان کو قبرستان لے گئے۔ وہ پہلے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر مراقب ہو کر بیٹھے اور دیر تک بیٹھے رہے۔ اُس کے بعد حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر مراقب ہو کر بیٹھے اور بہت دیر تک بیٹھے اور اُن کے چہرے کے رنگ سے ہم محسوس کرتے رہے کہ ان پر کوئی خاص اثر پڑ رہا ہے۔ وہاں سے واپسی پر فرمایا کہ "ان حضرات کا مقام بہت ہی بلند ہے"۔ اس کے بعد ہم لوگوں سے فرمایا کہ یہاں کے استادوں میں جو اللہ والے ہوں، مجھے ان کے پاس لے چلو۔ ہم سب سے پہلے حضرت میاں صاحب یعنی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہونچے۔ حضرت میاں صاحب کی زیارت و ملاقات سے بھی والد صاحب بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی۔ ان حضرات کی زیارت سے بھی بہت متاثر ہوئے اور اُن کے بارے میں فرمایا کہ یہ ہر وقت ذکر میں مشغول اور صاحب نسبت ہیں ــ الغرض ہمارے اکابر اور ہماری جماعت کے بارہ میں اُن کو جو بدگمانیاں ہمیشہ سے تھیں وہ غالباً اسی دن ختم ہو گئیں، اور اُس کے بعد تو ان پر اللہ تعالیٰ کا بہت ہی بڑا فضل ہوا ــــ لیکن اس وقت میرا مقصد اپنی طالب علمی کے کچھ واقعات سنانا ہے اپنے والد صاحب کی سوانح عمری بیان کرنا مقصود نہیں ہے، مگر جب ان کا ذکر آ گیا ہے تو اُن کی ایک بات اور سنا دینا مناسب سمجھتا ہوں، انشاء اللہ آپ بھائیوں کو اس سے بھی نفع ہو گا۔

غالباً ۱۳۴۵ھ میں یعنی اب سے ۳۵-۳۶ سال پہلے میرے والد صاحب کو حج نصیب ہوا۔ واپسی پر مجھ سے تنہائی میں فرمایا کہ میں تیرے لیے کوئی چیز نہیں لایا۔ میں نے ایک دُعا تیرے واسطے کی ہے اور وہ یہ کہ تیرے پاس کبھی دولت نہ ہو اور تجھے کبھی تنگی اور تکلیف نہ ہو۔ اور مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ قبول ہو گی۔ اس بات کو ۳۵-۳۶ سال ہو گئے، میں آپ کے سامنے اس بات کا اظہار بہتر سمجھتا ہوں کہ اب تک اللہ تعالیٰ کا معاملہ میرے ساتھ بالکل یہی ہے، میرے پاس دولت کبھی نہیں ہوئی اور الحمد للہ زندگی کی اُن تکلیفوں سے مجھے کبھی واسطہ نہیں پڑا جو افلاس اور تنگی کی وجہ سے اللہ کے بندوں کو ہوتی ہیں۔ مالک کے

فضل و کرم سے میری زندگی بڑی راحت اور عافیت کے ساتھ گزرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر بالفرض میں ڈپٹی کلکٹر ہوتا اور میری تنخواہ ہزار یا اس سے بھی اوپر ہوتی تو زندگی کی وہ راحتیں مجھے نصیب نہ ہوتیں جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھے نصیب ہیں۔

میرے عزیز بھائیو! خدا گواہ ہے کہ میرے پاس کوئی ہنر اور کمال نہیں ہے۔ بس وہی ہے جو اسی دار العلوم سے اور یہاں کے اپنے اساتذہ سے نصیب ہوا ہے۔

میں نے ابھی ذکر کیا تھا کہ جب میری عربی تعلیم شروع ہوئی تو میرے اندر اس کا کوئی داعیہ اور شوق نہیں تھا اور بعد میں جب ارادہ کے ساتھ اور جی لگا کر پڑھنا شروع کیا، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت بھی خدا طلبی اور آخرت کی کامیابی کا واضح تصور مجھے نصیب نہیں تھا۔ لیکن الحمد للہ جب دار العلوم میں حاضری ہوئی تو یہ نعمت بھی کسی درجہ میں یہاں کی برکت سے نصیب ہو گئی تھی۔ مگر جیسا کہ میں نے بتایا تھا، میرے والد ماجد نے مجھے صرف اسی نیت سے دینی تعلیم کے راستہ پر لگایا تھا کہ اُن کو قبر میں اور اُس کے بعد کی آخرت کی منزلوں میں، اس سے فائدہ پہونچے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے اس عمل کو ضرور قبول فرمائے گا۔ یہ اُن کی ایک قربانی تھی اور اُنھوں نے گویا مجھے اللہ کی نذر کیا تھا اور دین کے لیے وقف کیا تھا۔

میں یاد کرتا ہوں ایک دن وہ تھا جب والد صاحب نے کلکٹر کے کہنے کے باوجود مجھے انگریزی پڑھانے سے انکار کر دیا تھا اور مجھے اپنی نادانی سے بڑا رنج اور صدمہ ہوا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ میرا مستقبل تاریک ہو گیا، اور اب میرا حال یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ وہی دن میرے لیے سب سے زیادہ مبارک دن تھا جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ وہ اپنی آخرت بنانے کے لیے مجھے صرف دینی تعلیم دلائیں گے[1] ــــــ مجھے جب قرآن شریف کی تلاوت نصیب ہوتی ہے اور جب حدیث کی کتابوں کا

---

[1] میں اللہ کے ایسے بہت سے بندوں سے واقف ہوں جنھوں نے صرف انگریزی تعلیم حاصل کی اور ایک دن بھی وہ ہمارے کسی دار العلوم میں طالب علم بن کے نہیں رہے لیکن ان پر کسی اور راستہ سے اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور اُنکی دینی حالت خود میرے لیے باعث رشک ہے اور میں ان کو اللہ کے مقبول بندوں میں سے سمجھتا ہوں۔ لیکن اپنے بارہ میں میرا اندازہ یہی ہے کہ اگر مجھے انگریزی تعلیم دلائی جاتی تو شاید میرا تعلق دین سے اور اللہ و رسول سے برائے نام ہی ہوتا ۱۲۔

مطالعہ کرتا ہوں اور کچھ سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کیا ارشاد فرما رہے ہیں اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کیا ہدایت فرمائی، تو میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے جو کسی بندہ کو حاصل ہو سکتی ہے۔ اور زمین و آسمان کی کوئی چیز بھی اس کے برابر قیمتی نہیں، اور والد ماجدؒ کے اس فیصلہ کے صدقہ میں یہ مجھے نصیب ہوئی ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے والد ماجد نے سب سے بڑا احسان مجھ پر یہی فرمایا، انھوں نے میرے لیے مکان بھی چھوڑا جو آج بڑی قیمت کا ہے اور اس کے علاوہ خاصی جائداد بھی چھوڑی جس میں سے بہت کچھ فروخت کر چکا ہوں اور اب بھی کچھ باقی ہے، لیکن اس سب سے بڑا احسان اُن کا مجھ پر یہی ہے کہ اُنھوں نے مجھے وہ دینی تعلیم دلائی جو در اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیمتی میراث ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل اور اس احسان کا صلہ قبر میں اور آخرت میں ان کو اپنی شانِ عالی کے مطابق عطا فرمائے ـــــ

میرے عزیز بھائیو! آپ میں سے بہت سے وہ ہوں گے جن کے والدین نے میرے والد کی طرح اپنی اور اُن کی آخرت بنانے کے لیے سوچ سمجھ کے دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا ہوگا، لیکن خود ان کا ذہن اس بارہ میں صاف نہ ہوگا جیسا کہ ایک عرصہ تک خود میرا حال تھا ـــــ اور کچھ آپ میں وہ ہوں گے جنھوں نے خاندانی رواج کے طور پر یا حالات کے تقاضے سے یا دنیوی تعلیم حاصل نہ کر سکنے کی مجبوری سے دینی تعلیم کا یہ راستہ اختیار کر لیا ہوگا۔ لیکن میں آپ کا مخلص بھائی ہوں، آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آپ اس علم دین کی قدر و قیمت کو اور اپنے مقام اور اپنی حقیقت کو سمجھئے ـــ آپ جو چیز حاصل کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں وہ تمام انبیاء علیہم السلام کا ترکہ اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ورثہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اخلاص نصیب فرمائے اور نیت اور عمل صحیح ہو تو آپ سے اور ہم سے بڑا دولتمند اور خوش نصیب کوئی نہیں، آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے علمبردار اور حضور کے سپاہی اور لشکری ہیں ـــــ اگر آپ اس حقیقت کو اور اپنے مقام کو سمجھ لیں تو پھر آپ کو کسی دُنیوی اعزاز اور عہدہ کی طمع نہ ہوگی اور اہلِ دُنیا اور دولتمندوں کی شاندار کوٹھیاں اور موٹریں دیکھ کے آپ کو کوٹھی اور موٹر نہ ہونے کی حسرت نہ ہوگی، پھر آپ کا احساس اور اذعان یہ ہوگا کہ قرآن مجید کی ایک چھوٹی سی سورت بلکہ ایک ایک آیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث جس کا آپ کو علم ہے وہ ان کوٹھیوں اور موٹروں سے ہزاروں درجہ زیادہ قیمتی ہے ـــــ ہمیں اپنے قصوروں، اور کوتاہیوں اور گناہوں کے لحاظ سے تو اپنے کو سب سے کمتر سمجھنا چاہیے لیکن

علم نبوئی اور ورثۂ نبوی کی نسبت سے برتر اور بالاتر سمجھنا چاہیے اور اس نعمت پر خدا کا سچا شکر ادا کرنا چاہیے۔

بخدا میں کچھ نہیں ہوں، نہایت گنہگار بندہ ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ چیز محض اپنے فضل سے کسی درجہ میں نصیب فرما دی ہے کہ جو تھوڑا سا علم اس دار العلوم کے صدقہ میں اور اسکے فیض یافتہ اپنے اساتذوں کے صدقہ میں حاصل ہو گیا ہے اُس کو اس دُنیا کی سب سے بڑی دولت سمجھتا ہوں۔

میرے بھائیو! یہی ہمارے بزرگوں کا خاص ترکہ اور ورثہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ سب کو نصیب فرمائے اور مجھ سے زیادہ نصیب فرمائے! ـــــ اس کے لیے میں آپ کو تین باتوں کی نصیحت کرتا ہوں۔

اوّل یہ کہ اپنے مقام اور مقصد کو سمجھئے اور اگر اب تک نیت اور مقصد کے بارہ میں ذہن صاف نہیں تھا تو اب اپنے دل کے رُخ کو صحیح کر لیجئے، تنہائیوں میں بیٹھ بیٹھ کے سوچا کیجئے کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں، اور آپ کون ہیں اور جو علم آپ حاصل کر رہے ہیں وہ کتنی عظیم دولت اور نعمت ہے ـــــ یہ آپ کے لیے بہترین مراقبہ ہے۔

دوسری بات یہ کہ دل لگا کر اور پوری محنت اور توجہ سے پڑھیے، یہ علم دین کی قدر اور عظمت کا حق ہے اسکے بغیر کسی کو نہ کچھ آیا ہے نہ آئے گا، نہ ملا ہے نہ ملے گا۔

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ جو علم آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں اپنی زندگی اور اپنا عمل بھی اسکے مطابق بنائیے، تقویٰ اختیار کیجئے، تقوے کے ساتھ علم نور ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا میراثِ نبوت ہے اور تقوے کے بغیر علم ظلمت ہے اور سراسر وبال ہے۔

میرے عزیز بھائیو! اللہ تعالیٰ نے علم کی اور دین کی جو دولت ہمارے اکابر حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند، حضرت تھانوی، حضرت کشمیری، اور حضرت مولانا مدنی کو عطا فرمائی تھی وہ اُسکے خزانہ میں اب بھی بھرپور موجود ہے۔ یہ دار العلوم اس کا دروازہ ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دروازہ تک پہونچا دیا ہے، اگر آپ اخلاص نیت، اور محنت اور تقوے کی شرطوں کے ساتھ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو میں اللہ تعالیٰ کی کریمی پر یقین کر کے قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو آپ کی استعداد اور استحقاق کے مطابق اللہ تعالیٰ وہی دولت ضرور عطا فرمائے گا ـــــ اور قبر اور آخرت سے پہلے اس دُنیا میں بھی آپ کو اس کا ذائقہ حاصل ہوگا۔ وَآخر دعوٰنا اَنِ الحمد للہ رب العٰلمین

کچھ غلطیاں اور استدراکات

متعلقہ "مولانا کرامت علی جونپوری اور ان کا ترجمہ شمائل ترمذی"

(از مولانا حبیب اللہ صاحب ندوی)

[ہم مولانا حبیب اللہ صاحب کے شکرگزار ہیں کہ اس مضمون کو از سرِ نو لکھ کر دینے کی زحمت اٹھائی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کا جو خلافت نامہ اس میں شامل ہے اس کی نقل دوبارہ مہیا کرنے کے لیے مولانا کرامت علی صاحبؒ کے فردِ خاندان مولانا ظفر احمد صاحب جونپوری کا شکریہ واجب ہے۔ خلافت نامہ کا ترجمہ بھی انہی کے قلم سے ہے ——————— الفرقان]

راقم نے مولانا جونپوری کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے اس میں کچھ فاش غلطیاں ہوگئی ہیں، جن کی تصحیح اور کچھ نئی باتیں سامنے آگئی ہیں، وہ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

مضمون کی پہلی قسط میں لکھا گیا تھا کہ "مولانا اپنے والد کی تنہا اولاد تھے۔" اس غلطی پر انکے اہل خاندان مولانا ظفر احمد صاحب اور مولانا عبد الباطن صاحب وغیرہ نے توجہ دلائی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مولانا کرامت علیؒ کے والد شیخ ابراہیم امام بخش اپنے والدین کی تنہا اولاد تھے اور شیخ امام بخش کی دو شادیاں ہوئیں اور ان سے کئی اولادیں بھی ہوئیں۔ مولانا کرامت علی کے علاوہ ان کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ مولانا کرامت علی کے ایک چھوٹے حقیقی بھائی مولانا رجب علیؒ تھے جو اپنے وقت کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ یہ حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت اور ان کے ممتاز خلفاء میں تھے۔ مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی مدظلہ نے سیرت سید احمد شہیدؒ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

ان کے علاوہ مولانا کی ایک حقیقی بہن اور تین سوتیلے بھائی اور ایک سوتیلی بہن بھی تھیں۔

مولانا کے اہل خاندان نے دوسری جس غلطی کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یہ کہ "راہِ نجات" کے

مصنف مولانا سخاوت علی جونپوری نہیں بلکہ اس کے مصنف حافظ محمد علی صاحب تھے جو مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ کے ہم عصر تھے۔ "مالا بد منہ" کے آخر میں قاضی صاحب کا جو وصیت نامہ درج ہے اس میں حافظ محمد علی صاحب کا ذکر ہے اور محشی نے ان کے نام کے آگے لکھا ہے کہ یہ "راہ نجات" کے مصنف ہیں۔

یہ در اصل غلط فہمی ہے جو اس لیے ہوئی ہے کہ "راہ نجات" پر مصنف کا نام درج نہیں ہے عموماً ہمارے اسلاف اپنی تصانیف پر اپنا نام درج نہیں کرتے تھے اس لیے ان کی بہت سی کتابیں دوسروں کی طرف منسوب ہو گئی ہیں یہی صورت حال غالباً "راہ نجات" کے ساتھ پیش آئی ہے کہ مولانا سخاوت علی صاحب نے اس پر اپنا نام درج نہیں کیا ہے اسی وجہ سے بنگال میں اسے مولانا کرامت علیؒ کی تصنیف سمجھا جاتا ہے مگر پورے شمالی ہند میں مولانا سخاوت علی صاحب ہی کو اس کا مصنف سمجھا جاتا ہے۔ مولانا ظہور احمد صاحب نے اوپر جس دلیل کی بناء پر اس کو حافظ محمد علی صاحب کی تصنیف بتایا ہے اس دلیل کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ حافظ محمد علی صاحب نے اس نام سے کوئی دوسری کتاب لکھی ہو۔ علاوہ ازیں "راہ نجات" کی زبان قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کے وقت کی زبان معلوم نہیں ہوتی بلکہ اس کے پچاس برس بعد کی زبان معلوم ہوتی ہے نیز ان کے دور میں اردو نثر نے اتنی عمومیت اختیار نہیں کی تھی کہ اس میں علمی کتابیں لکھی جا سکیں، یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب نے خود "مالا بد منہ" فارسی میں لکھی حالانکہ یہ کتاب انھوں نے عوام کے لیے لکھی تھی۔

پھر مولانا سخاوت علی جونپوریؒ اردو کی اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں جبکہ حافظ محمد علی صاحب کی کوئی دوسری کتاب سامنے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ عربی سے اردو میں فقہ کے مسائل کو منتقل کرنا جبکہ اس کا کوئی نمونہ نہ ہو آسان نہیں تھا اس کے لیے بہر حال مہارت کی ضرورت تھی اس لیے صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پنجاب کے بجائے یو۔پی کے کسی حصہ میں لکھی گئی ہے۔ اردو زبان بھی اسی دیار کی استعمال ہوئی ہے۔ عام طور پر اردو کتابیں اس وقت یو پی اور بہار میں مقبول تھیں پنجاب میں بہت کم ان کا رواج تھا۔

مولانا کرامت علی صاحب کے کارناموں میں ایک کارنامہ ۱۸۵۷ء کی تحریک انقلاب میں شرکت بھی ہے۔ اس کی کچھ تفصیل مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے اپنی کتاب "ایسٹ انڈیا کمپنی اور

باغی علماء" میں کی ہو مگر اتفاق سے یہ کتاب راقم کے سامنے نہیں ہو اس لیے اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہو کہ ۱۸۳۱ء میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے فرائضی کے نام سے جو تحریک شروع کی گئی تھی جس میں تقریباً ۸۰،۰۰۰ ہزار ہندو مسلمان شریک تھے، مولانا جونپوری نے اس تحریک کی کئی مقام پر سربراہی بھی کی[1] مولانا کے ایک شاگرد مولانا سرفراز علی صاحب تھے جو برابر عیسائیوں کے خلاف لوگوں کو ابھارتے اور انگریزوں سے جہاد پر اکساتے رہتے تھے[2] آج بھی بنگال میں کہیں کہیں "فرائضی" کی نسبت لوگوں کے ناموں کے ساتھ ملتی ہو۔ مولانا کی اس تحریک میں شرکت کی دوسرے ذرائع سے ایسی تصدیق نہیں ہوسکی ہے اس لیے اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہو۔

آخر میں ہم مولانا کا وہ خلافت نامہ پیش کرتے ہیں جو حضرت سید احمد بریلوی صاحب نے انھیں عطا کیا تھا۔ اس کا متن مع ترجمہ یہ ہو۔

مرقومہ دوم ماہ شعبان ۱۲۳۹ ہجری بسم اللہ الرحمن الرحیم

از فقیر سید احمد بر ضمیر صفا پذیر طالبان راہ حضرت حق و سالکین طریق آن ہادی مطلق عز اسمہ آنکہ بایں فقیر لله و فی الله حاضرانہ و یا غائبانہ محبت میدارند خصوصاً پوشیدہ نماند که مقصود از بیعت بر دست شائخ طریقت ہمیں است کہ راہ رضامندی حضرت حق بدست آید و راہ رضامندی حضرت حق منحصر در اتباع شریعت غرا است ہر کہ سوائے شریعت مصطفویہ راہ طریق تحصیل رضامندی حضرت حق انگارد پس بیشک آن شخص کاذب و گمراہ است و دعوی او باطل و نامسموع و اساس شریعت مصطفویہ دو امر است اول ترک اشراک ثانی ترک بدعات اما ترک اشراک پس بیانش آنکہ ہیچکس را از ملک و جن و پیر و مرشد و استاذ و شاگرد و نبی و ولی حلال مشکلات خود نہ پندارد و حاجات خود را از کسے

---

[1] الفرقان: مفتی انتظام اللہ صاحب کی کتاب میں یہ تذکرہ دیباچہ میں ہو اور اس سے کچھ زیادہ نہیں ہو جس کا ذکر اس مضمون میں آگیا۔ البتہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں شرکت کا ذکر مفتی صاحب نے نہیں کیا ہو۔

[2] الفرقان: مفتی انتظام اللہ صاحب ہی نے ان مولانا سرفراز علی صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہو کہ جنرل بخت خاں ان کے مرید تھے اور ان کی ہی ترغیب پر انگریزی ملازمت چھوڑ کر جہاد آزادی میں آگئے تھے۔

ازایشاں طلب نہ نماید وہیچکس را قادر بر حل مشکلات و دفع بلیات وتحصیل منافع نداند وہمہ را
مثل خود در جنب قدرت وعلم حضرت حق عاجز ونادان شمارد و ہرگز بنا بر طلب حوائج خود نذر
و نیاز کسے از انبیاء و اولیاء وصلحاء و ملائکہ بجا نیارد آرے ایں قدر داند کہ ایشان مقبولان
بارگاہ صمدیت اند وثمرہ مقبولیت ایشاں ہمیں است کہ درباب تحصیل رضامندی پروردگار اتباع
ایشاں باید کرد وایشاں را پیشوایان ایں طریق باید شمرد نہ آں کہ ایشان را قادر بر حوادث
زمان وعالم السر والاعلان داند کہ ایں امر محض کفر وشرک است ہرگز مومن پاک را ملوث
بآں شدن جائز نیست وآما ترک بدعات پس بیانش آنکہ در جمیع عبادات ومعاملات
وامور معاشیہ ومعادیہ طریق خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم را بکمال قوت و
علو ہمت باید گرفت وانچہ مردمان دیگر بعد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم از قسم رسوم اختراع
نمودہ اند مثل رسوم شادی وماتم وتجمل قبور وبنائے عمارات بر آنہا واسراف در مجالس اعراس
وتعزیہ سازی وامثال ذلک ہرگز پیرامون آن نباید گردید وحتی الوسع سعی در محو کردن
آن باید کرد اول خود ترک باید نمود بعد ازاں ہر مسلمان را بسوئے آں دعوت باید کرد چنانکہ
اتباع شریعت فرض است ہمچنیں امر بالمعروف ونہی عن المنکر نیز فرض است چون
این امر ذہن نشین شد پس جمیع طالبین حق را باید کہ ہمیں امور را پیش نظر خود ساختہ
بایکدیگر بیعت نمایند خصوصاً مولوی صاحب مستعد ہدایت مسلمین چالاک میدان ارشاد
وتلقین مولوی کرامت علی صاحب جونپوری اعانہم اللہ تعالی کہ بر دست ایں فقیر
بیعت نمودہ اند وایں فقیر ایں امور را روبروئے ایشاں کما حقہ اظہار نمودہ وایشان
را اجازت باخذ بیعت وتعلیم اشغال از جانب خود نمودہ پس بر ذمہ ایشاں لازم است
کہ اول خود تمسک بہ امور مذکور الصدر نمایند وقلب وقالب خود را متوجہ بسوئے حق
کنند ودر اتباع شریعت غرا ظاہراً وباطناً پیش گیرند وتمامی انجاس اشراک والواث
بدعات را از خود دور نمایند وبعد ازاں جمیع طالبین حق را بسوئے آں ترغیب کنند ودر اخذ
بیعت بر دست خود ازخود ساعی شوند وترغیب وافر نمایند ہرگز انجام آنان نہ نمایند چہ دریں بیعت
کہ بر دست یاران فقیر واقع خواہد شد فائدہ شدنیست ان شاء اللہ تعالی کلمہ گویان از رسوم

شرک پاک خواہند شد و تعظیم شرع شریف در دل ایشان جا خواہد گرفت و نقیر دعا ہا خواہد کرد که آن بیعت مثمر ثمرات حمیدہ جزیلہ گردد در تعلیم و تفہیم طالبان سعی بدل و جان نمایند و از ایشان اخذ بیعت کنند و ایشان را تعلیم اشغال فرمایند حق جل و علیٰ این نقیر را و جمیع مخلصین و محبین ما را در زمرهٔ موحدین مخلصین و متبعین شریعت غرا گرداناد آمین۔ (اسمہ احمد)

ترجمہ

فقیر سید احمد کی طرف سے حضرت حق کی راہ کے طالبوں اور طریق آں ہادی مطلق کے سالکوں پر عموماً اور اس فقیر کے ساتھ للہ فی اللہ حاضرانہ و غائبانہ محبت رکھنے والوں پر خصوصاً پوشیدہ نہ رہے کہ مشائخ طریقت کے ہاتھ پر بیعت سے مقصود یہی ہے کہ حضرت حق کی رضامندی کا طریقہ میسر ہو اور حضرت حق کی رضامندی کا طریقہ شریعت غرا کی اتباع میں منحصر ہے۔ جو شخص شریعت مصطفویہ کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ حضرت حق کی رضامندی کا گمان کرے بے شک وہ شخص کاذب و گمراہ ہے اور اس کا دعویٰ باطل اور ناقابل سماع ہے۔ اور شریعت مصطفویہ کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ اوّل ترک اشراک اور ثانی ترک بدعات۔ ترک اشراک کا مطلب یہ ہے کہ فرشتہ و جن، پیر و مرشد، استاد و شاگرد اور نبی و ولی میں سے کسی کو اپنی مشکلات کا حل کرنے والا نہ سمجھے اور ان میں سے کسی سے اپنی مرادیں اور ضرورتیں نہ مانگے اور کسی کو بھی نفع پہنچانے اور بلاد مصیبت دور کرنے اور مشکلات کے حل کرنے پر قادر نہ سمجھے اور سب کو اپنی طرح حضرت حق کے علم و قدرت کے مقابلہ میں عاجز و نادان جانے اور ہرگز اپنی حاجت روائی کے لیے انبیاء و اولیا وصلحا و ملائکہ میں سے کسی کی نذر و نیاز نہ کرے۔ ہاں اس قدر سمجھے کہ یہ سب جناب صمدیت کے مقبول ترین بندے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا ثمرہ بس یہ ہے کہ اللہ رب العزة کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کی اتباع کریں۔ اور پیشوائے طریق انھیں سمجھیں۔ یہ نہیں کہ ان کو حوادث زمانہ پر قادر اور ہر غیب و شہود کا عالم سمجھا جائے۔ اس لیے کہ یہ امر محض شرک و کفر ہے اور ہرگز مومن پاک کو اس "بد اعتقادی" کے ساتھ ملوث ہونا جائز نہیں اور ترک بدعات کا مطلب یہ ہے کہ تمام عبادات و معاملات اور امور معاشیہ و معادیہ میں حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو پوری قوت اور بلند ہمتی کے ساتھ پکڑا جائے اور جو کچھ دوسرے

لوگوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد از قسم رسومات کے گڑھ لیا ہو جیسے شادی اور غمی کی رسمیں اور قبروں کا آراستہ کرنا اور اس پر عمارتیں بنانا اور عرس کی مجلسوں میں اسراف کرنا اور تعزیہ سازی نیز اسی قبیل کے دوسرے مخترعات، ہرگز ان کے گرد و پیش نہیں نہ گھومنا چاہیے اور حتی حتی الوسع ان چیزوں کے مٹانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ پہلے تو خود چھوڑنا چاہیے پھر اس کے بعد ہر مسلمان کو اس بات کی دعوت دینی چاہیے اس لیے کہ جیسے شریعت کا اتباع فرض ہو اسی طرح اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے منع کرنا بھی فرض ہو۔ جب یہ بات ذہن نشین ہو گئی تو تمام طالبین حق کو چاہیے کہ ان ہی امور کو اپنے پیش نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے بیعت کریں خصوصاً مولوی صاحب کہ ہدایت مسلمین میں چست تبلیغ و ارشاد کے شہسوار ہیں یعنی مولوی کرامت علی صاحب جونپوری (اللہ تعالیٰ ان کا مددگار ہو) جنھوں نے کہ اس فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہو اور فقیر نے ان امور کو ان کے روبرو کما حقہ واضح کر دیا ہو اور ان کو بیعت لینے اور اشغال کی تعلیم دینے میں اپنی جانب سے مجاز کیا ہو، اُن کے ذمہ لازم ہو کہ پہلے خود امور مذکور الصدر پر مضبوطی سے عمل کریں اور اپنے قلب و جسم کو حق تعالیٰ کی جانب متوجہ کریں اور شریعت غرا کی اتباع کو ظاہراً و باطناً سامنے رکھیں اور شرک کی تمام نجاستوں اور بدعات کی گندگیوں کو اپنے سے دور کریں اور اس کے بعد تمام طالبین حق کو اس کی طرف راغب کریں اور اپنے ہاتھ پر بیعت لینے میں اپنی جانب سے کوشش کریں اور پورے طور پر رغبت دلائیں، ہرگز اس میں دریغ نہ کریں کیونکہ اس بیعت میں جو کہ فقیر کے دوستوں کے ہاتھ پر واقع ہوگی فائدہ کی کامل توقع ہو انشاء اللہ تعالیٰ کلمہ گو رسوم شرک سے پاک ہوں گے اور شرع شریف کی عظمت ان کے دل میں جاگزیں ہوگی اور فقیر دعائیں کرتا رہیگا کہ وہ بیعت گراں قدر نیک ثمرات کی باعث ہو۔ مریدین و طالبین کی تعلیم و تزکیہ میں دل و جان سے کوشش کریں اور ان سے بیعت لیں اور ان کو تزکیۂ نفس کے طریقے تعلیم فرمائیں۔ حق بزرگ و برتر اس فقیر اور ہمارے سلسلہ کے تمام مخلصین و محبین کو موحدین مخلصین اور متبعین شریعت غرا کے زمرہ میں کر دے۔ آمین۔

مہر (احمد یا اسمہ)

نئی مطبوعات

"نشانِ منزل" خاص نمبر۔ بیادگار حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی رح
مرتبہ: مولوی حبیب ریحان صاحب ندوی
صفحات ۱۰۸۔ سائز ۲۰×۳۰/۴ (اخباری) کاغذ گلیز۔ قیمت درج نہیں۔

"نشانِ منزل" دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کا آرگن ہے۔ مہینے میں دو بار آٹھ یا دس صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ عام چندہ چار روپے سالانہ ہے۔ ادارۂ نشانِ منزل اور دارالعلوم تاج المساجد کے ذمہ داروں اور کارکنوں کو حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب رح (متوفی ربیع الاول ۱۳۹۰ھ) کے ساتھ جو خاص تعلق تھا، اُس کے ماتحت عین توقع کے مطابق یہ خاص نمبر آپ کی یاد میں اس اخبار نے شائع کیا ہے ـــــ ہمارے محترم مولانا محمد عمران خاں صاحب (بھوپال) کے فاضل صاحبزادے مولوی حبیب ریحان صاحب (استاذ جامعہ اسلامیہ لیبیا) اپنی سالانہ تعطیل کے سلسلہ میں وطن آکر نشانِ منزل کا ایک خاص نمبر ہر سال پیش کرتے ہیں۔ اس بار اس کے لیے حضرت شاہ صاحب رح کے سوا کسی دوسرے موضوع کا سوال ہی کیا تھا۔ اسی موضوع پر نکلا ہے اور خوب نکلا ہے۔ مرتب کے علاوہ بھوپال اور بھوپال سے باہر کے بہت سے ایسے اہلِ قلم اور بزرگوں کی نگارشات اس میں شامل ہیں جن کا کسی طور پر حضرت مرحوم سے تعلق یا تعارف تھا۔ باہر کے معروف حضرات میں مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث سہارنپور، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے نام خاص طور سے لیے جا سکتے ہیں۔

ہماری نظر میں نمبر کی سب سے قیمتی چیز خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر "اضغاثِ احلام" ہے جو منتسبین کے لیے ایک مفصل ہدایت نامے کے طور پر تحریر فرمائی گئی تھی، یہ نمبر کے ۱۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ گویا ایک مکمل رسالہ ہے، حرف حرف پڑھنے اور فائدہ اٹھانے کے لائق ـــــ تقریباً نو صفحے پر حضرت کے مکتوبات بھی ہیں جو زیادہ تر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام ہیں۔

منیجر کتب خانہ الفرقان کی طرف سے

اپنے کرم فرما حضرات کی خدمت میں!

عرصہ سے ہمارے اکثر کرم فرما حضرات اصرار کر رہے تھے کہ ہم اپنے یہاں قرآن پاک کا اسٹاک بھی رکھیں۔ اب ہم نے آپ ہی کے اصرار پر قرآن پاک کا اچھا خاصا اسٹاک فراہم کرلیا ہے، ذیل میں ہم قرآن پاک کی ایک مختصر فہرست درج کر رہے ہیں۔

قرآن شریف مترجم

اشرف الشان عکسی محشیٰ مع مقدمہ

حسین وجمیل، دلکش و دلآویز، خوبصورت و خوشنما قرآن مجید ترجمہ از حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ مطبوعہ آفسٹ مشین دو رنگہ، سائز ۱۰×۱/۲ ۷ انچ۔ صفحات ۷۰۰، ہدیہ مجلد ریگزین صرف ‎-/۱۵

قرآن مجید رحمانی مترجم ۹۶

ترجمہ از حضرت مولانا تھانویؒ

سائز ۳۰×۲۰، طباعت دو رنگہ کاغذ سفید

ہدیہ مجلد ریگزین ‎-/۱۱

قرآن مجید مترجم بددو ترجمہ ۹۱

بے مثل و بے نظیر دو ترجمہ اور بے شمار خوبیوں والا قرآن مجید ترجمہ اول۔ تحت اللفظ از حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ دوسرا ترجمہ۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ حاشیہ پر خلاصہ تفسیر بیان القرآن۔ سائز ۱۰×۱/۲ ۶ انچ خوبصورت جلد۔ ہدیہ مجلد ریگزین ‎-/۱۵

قرآن مجید مع تفسیر کشف الرحمان

از سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ

سائز ۲۲×۳۲ پلاسٹک جلد دو جلدوں میں مکمل عام اردو خوانوں کیلئے بہترین تحفہ نہایت عام فہم ترجمہ و تفسیر

خوبصورت طباعت، سفید کاغذ عمدہ، ہدیہ صرف ‎-/۳۰

قرآن مجید عکسی مصری حلبی قلم ۳

طباعت بذریعہ فوٹو آفسٹ، سب سے زیادہ مشہور و مقبول مصری قرآن، سائز ۱۰×۱/۲ ۷ انچ۔ ایک صفحہ میں ۱۳ سطریں۔ ہر سطر کے درمیان باریک لکیر صفحات ۸۵۲ بڑے بڑے حروف، ہر حرف جدا جدا۔ خاص طور پر بچوں اور عورتوں اور بوڑھوں کے لیے۔

ہدیہ مجلد ریگزین ‎۹/۵۰

عکسی قرآن مجید مصری چوگلہ ۵۳

سائز ۲۰×۲۶، صفحات ۸۲۰، ہر صفحہ میں ۱۴ سطریں ہر سطر کے درمیان باریک لکیر، کاغذ سفید گلیز، خوبصورت جلد، شروع کے صفحات دو رنگی چھپائی سے آراستہ۔

ہدیہ مجلد ریگزین ‎-/۹

حافظی قرآن مجید نظامی

حوالہ ۱۲۲، سائز ۱۰×۱/۲ ۷ انچ، ۶۱۲ صفحات، ہر صفحہ آیت پر ختم۔ ایک صفحہ میں ۱۵ سطریں۔ ہر سطر کے درمیان باریک لکیر، کتابت موتیوں کی طرح آب دار اور بہت دلکش، کتابت اتنی واضح کہ بچے بوڑھے آسانی سے تلاوت کر سکتے ہیں۔ حفاظ کرام کیلئے خاص تحفہ۔ ہدیہ مجلد ریگزین ‎۷/۵۰

(ساڑھے سات روپے)

پھول کی طرح تروتازہ
اگر جلدی امراض یا فساد خون کی
شکایت ہو تو چہرہ پژمردہ نظر آتا ہے
خون صفا
پھوڑے پھنسی خارش اور داد سے نجات دے
کر جسم اور چہرے کو پھول کی طرح تروتازہ رکھتا ہے
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

Regd No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 38 NO. 7 OCTOBER 1970

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی .... ۸۵ پیسے

جلد (۳۸) | بابت ماہ شعبان سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۷۰ء | شمارہ (۸)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ر نومبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: اس ماہ (نومبر سنہ ۷۰ء) سے صرف اُن خریداران پاکستان کو رسالہ جا رہا ہو جنھوں نے ہمارے خط کے جواب میں اطلاع دی ہو کہ رسالہ برابر پہونچتا ہو۔ باقی تمام حضرات کا رسالہ فی الحال بند رہے گا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہو۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پراپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

______ عتیق الرحمٰن سنبھلی

بنگلور سے ایک تجویز اظہار رائے کے لیے موصول ہوئی ہے کہ مسلمان اس بات کا التزام کریں کہ ہر ہر محلہ کی مسجد میں بچوں کی پیدائش کا رجسٹر رکھا جائے جس میں ہر نو مولود کی بر وقت تاریخ پیدائش لکھا دی جایا کرے

اس تجویز کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں بچوں کی تاریخ پیدائش کی یادداشت رکھنے کا رواج ایک تو یونہی بہت کم ہے۔ اور جو ہے بھی تو اس میں اتنی باقاعدگی نہیں ہوتی کہ اسکولوں میں داخلے یا ملازمت وغیرہ کیلئے مطلوبہ پیدائش سرٹیفکٹ بآسانی پیش کیا جا سکے۔ مذکورۂ بالا تجویز کے مطابق اگر ہر مسجد میں باقاعدہ رجسٹر رکھا جانے لگا تو اس اندراج کو سرٹیفکٹ کے لیے حکومت سے تسلیم کرایا جا سکتا ہے جیسا کہ عیسائیوں کے گرجا گھروں کا پیدائش سرٹیفکٹ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہماری رائے میں یہ تجویز بہت مناسب ہے۔ مسجد سے زیادہ کوئی اور جگہ ایسی نہیں ہو سکتی جہاں ہر مسلمان آسانی سے آ سکے اور جسے مرکز بنا کر یہ توقع کی جا سکے کہ زیادہ سے زیادہ عوامی پیمانے پر یہ تجویز عمل میں آ جائے گی۔ تجویز کا یہ فائدہ بھی، جو مجوزین کے پیش نظر ہے، کچھ کم قیمتی نہیں ہے کہ یہ رواج اگر عام ہو گیا تو مسلمان اپنی مردم شماری بھی آپ کر سکیں گے۔ البتہ اس مقصد کے لیے دو ایک خانے اس رجسٹر میں بڑھانا ہوں گے اور ساتھ میں ایک وفات کا رجسٹر بھی رکھنا ہوگا ــــ اور سب سے بڑا نقد فائدہ تو ہوگا کہ مسجدوں کے لیے جس وسیع پیمانے کی مرکزیت کا سبق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین کی سنّت سے ہمیں ملا ہے اور اب بالکل بھولا بسرا ہو گیا ہے، اس کی تجدید کی داغ بیل اس کام سے پڑ جائے گی۔ کتنے ہی مسلمان جو مسجد کی صورت تک ٹھیک سے نہیں دیکھ پاتے ان کے قدم اس بہانے وہاں پڑنے لگیں گے اور ایک ربط خدا کے گھر سے پیدا ہو جائے گا۔

بڑی مسرت کی بات ہے کہ تجویز صرف کاغذ پر نہیں ہے، بلکہ عبداللطیف خاں بی اے بی ایل اور

عبدالکریم صاحب بی اے، بی ایل، بنگلور کے دو نوجوان دوست جو اس کے بانی ہیں، نے اس پر عملدرآمد کے لیے کام بھی شروع کر دیا ہے۔ ہندوستان کے ہر علاقے کے باشعور مسلمانوں کو یہ تجویز اپنا لینی چاہیے۔ انشاء اللہ اس سے بڑے فوائد حاصل ہوں گے۔[1]

اصل میں اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے کرنے کے دو ہی کام ہیں۔ ایک دینی اس طرح کی ملی ضروریات کے لیے سرگرم ہونا جن سے ملت، جو آج ایک منتشر اور ایک دوسرے سے بے خبر قوم ہے، واقعی معنی میں ملت بنے اور جن سے اس میں وہ سچی صحیح کی توانائی پیدا ہو جو کشمکش حیات میں اس کے قدم مضبوط رکھ سکے۔ دوسرا یہ کہ دنیا کے ساتھ ساتھ یہ ملک بھی جس طرح خدا فراموشی اور اخلاقی فساد کے سیلاب میں بہتا جا رہا ہو اسکے خلاف پُرعزیمت جدوجہد کی جائے۔ یہی مسلمانوں کا اصل کام ہے اور اسی کے لیے انھیں اپنی تعمیر اور استحکام کے منصوبے بھی مرتب کرنے اور بروئے کار لانے چاہئیں، یعنی ان دونوں کاموں میں وہی نسبت اور وہی مناسبت ہونی چاہیے جو مقصد اور ذریعہ میں ہوتی ہے۔ اس دوسرے کام کو اصل مقصد زندگی سمجھے بغیر اور ہر وقت اور ہر حال کے امکانات کے بقدر اسے انجام دیئے بغیر اپنی تعمیر اور اپنے استحکام کی جدوجہد بھی اسلامی زندگی نہیں جاہلی زندگی ہے۔ اور ملت کی تاریخ کی گواہی یہ ہے کہ جب سے اس نے اپنا اصل وظیفۂ حیات چھوڑا ہے جاہلی زندگی کا یہ درجہ بھی اس کے نصیب میں نہیں رہا کہ خود اپنے ہی استحکام اور ترقی کے کاموں میں بھی لگی رہ سکے۔ وہ صرف لایعنی اور بے کار باتوں میں ذائقہ باقی ہے۔ تعمیر و ترقی کی بڑی بڑی اچھی اسکیمیں اس کے تغافل اور بے حسی کی نذر ہو جاتی ہیں۔ بڑی قیمتی زندگیاں اس کی خیر خواہی اور دردمندی میں محض ضائع ہو کر رہ جاتی ہیں۔ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ کے بے لاگ الٰہی قانون کا یہ بھی ایک رنگ ہے جو اس ملت کے نصیب میں آتا ہے جو خدا کی طرف سے ڈیوٹی پر ہو مگر ڈیوٹی ادا نہ کرتی ہو۔

ایک استدعا اور تشکر

الفرقان کے بیشتر ناظرین کو غالباً اس حادثہ کا علم ہو چکا ہوگا کہ میری اہلیہ جو ایک طویل عرصہ سے علیل تھیں ۲۰ شعبان مطابق ۲۰ اکتوبر کو ان کا انتقال ہو گیا انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ناظرین سے استدعا ہے کہ مرحومہ کے لیے مغفرت و رحمت کی اور ان کے بچوں اور جملہ متعلقین کے لیے صبر و اجر کی دعا فرمائیں۔ اس عاجز پر احسان ہوگا۔

احباب و مخلصین کے تعزیتی خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ فرداً فرداً خطوط لکھنا مشکل ہے۔ اسلیے الفرقان کے ذریعہ واحد ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب حضرات کو ان کی مخلصانہ ہمدردی کی بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔ والسلام

محمد منظور نعمانی　-　۲ رمضان ۱۳۹۰ھ

کتابُ المعاشرۃ والمعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

آدابِ ملاقات

یہاں تک جو حدیثیں درج ہوئیں اُن سے انسانوں کے مختلف طبقات اور اللہ کی عام مخلوقات کے ساتھ برتاؤ کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات معلوم ہوئیں، آگے آداب ملاقات اور اس کے بعد آداب مجلس کے سلسلہ کی جو احادیث درج کی جا رہی ہیں وہ بھی دراصل زندگی کے ایک خاص دائرہ میں آپس کے برتاؤ ہی سے متعلق ہدایات ہیں۔

تحیۂ اسلام "سلام":-

دُنیا کی تمام متمدن قوموں اور گروہوں میں ملاقات کے وقت پیار و محبت یا جذبۂ اکرام و خیراندیشی کا اظہار کرنے اور مخاطب کو مانوس و مسرور کرنے کے لیے کوئی خاص کلمہ کہنے کا رواج رہا ہے اور آج بھی ہے، ہمارے ملک ہندوستان میں ہمارے برادرانِ وطن ہندو ملاقات کے وقت "نمستے" کہتے ہیں، کچھ پرانے قسم کے کم پڑھے لکھوں کو "رام رام" کہتے ہوئے بھی سُنا ہے، یورپ کے لوگوں میں صبح کی ملاقات کے وقت "گڈ مارننگ" (اچھی صبح) اور شام کی ملاقات کے وقت "گڈ ایوننگ" (اچھی شام) اور رات کی ملاقات میں "گڈ نائٹ" (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عربوں میں بھی اسی طرح کے کلمات ملاقات کے وقت کہنے کا رواج تھا۔

سنن ابی داؤد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عمران بن حُصَین کا یہ بیان مروی ہے کہ ہم لوگ اسلام سے پہلے ملاقات کے وقت آپس میں "اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْناً" (خدا آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب کرے) اور "اَنْعِمْ صَبَاحاً" (تمھاری صبح خوشگوار ہو) کہا کرتے تھے، جب ہم لوگ جاہلیت کے اندھیرے سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آگئے تو ہمیں اس کی ممانعت کر دی گئی یعنی اس کے بجائے ہمیں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کی تعلیم ہوئی گئی۔

آج بھی کوئی غور کرے تو واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی کلمہ محبت و تعلق اور اکرام و خیراندیشی کے اظہار کے لیے سوچا نہیں جا سکتا ـــــ ذرا اس کی معنوی خصوصیات پر غور کیجیے، یہ بہترین اور نہایت جامع دُعائیہ کلمہ ہے، اس کا مطلب ہے کہ اللہ تم کو ہر طرح کی سلامتی نصیب فرمائے۔ یہ اپنے سے چھوٹوں کے لیے شفقت اور مرحمت اور پیار و محبت کا کلمہ بھی ہے اور بڑوں کے لیے اس میں اکرام اور تعظیم بھی ہے، اور پھر "السَّلام" اسماءِ الٰہیہ میں سے بھی ہے۔ قرآن مجید میں یہ کلمہ انبیاء و رسل علیہم السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور اکرام اور بشارت کے استعمال فرمایا گیا ہے اور اس میں عنایت اور پیار و محبت کا رس بھرا ہوا ہے۔ ـــــ ارشاد ہوا ہے سَلَامٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ ٥ ـــــ سَلَامٌ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ ٥ ـــــ سَلَامٌ عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ٥ ـــــ سَلَامٌ عَلٰى اِلْيَاسِيْنَ ٥ ـــــ سَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ٥ ـــــ سَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ٥ ـــ

اور اہل ایمان کو حکم ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی اسی طرح سلام عرض کریں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ الخ" ـــــ اور ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جب ہمارے وہ بندے آپ کے پاس آئیں جو ایمان لا چکے ہیں تو آپ اُن سے کہیں کہ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ" (السَّلامُ علیکم، تمھارے پروردگار نے تمھارے لیے رحمت کا فیصلہ فرما دیا ہے!) ـــــ اور آخرت میں داخلۂ جنت کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان سے فرمایا جائے گا "اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ" ـــــ اور سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ـــــ

الغرض ملاقات کے وقت کے لیے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" سے بہتر کوئی کلمہ نہیں ہو سکتا ـــــ اگر ملنے والے پہلے سے باہم متعارف اور شناسا ہیں اور ان میں محبت و اُخوت یا قرابت کے قسم کا کوئی

تعلق ہے تو اس کلمہ میں اس تعلق اور اس کی بنا پر محبت و مسرت اور اکرام و خیراندیشی کا پورا اظہار ہے اور اگر پہلے سے کوئی تعارف اور تعلق نہیں ہے تو یہ کلمہ ہی تعلق و اعتماد اور خبرگیری کا وسیلہ بنتا ہے اور اس کے ذریعہ ہر ایک دوسرے کو گویا اطمینان دلاتا ہے کہ میں تمہارا خیراندیش اور دعا گو ہوں، اور میرے اور تمہارے درمیان ایک روحانی رشتہ اور تعلق ہے۔

بہرحال ملاقات کے وقت "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" اور "وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ" کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت مبارک تعلیمات میں سے ہے اور یہ اسلام کا شعار ہے اور اسی لیے آپ نے اس کی بڑی تاکید فرمائی اور بڑے فضائل بیان فرمائے ہیں ـــــ اس تمہید کے بعد اس سلسلہ کی احادیث پڑھیے!۔

سلام کی فضیلت و اہمیت :-

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُعْبُدُوا الرَّحْمٰنَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَأَفْشُوا السَّلَامَ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ ـــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، لوگو خداوند رحمٰن کی عبادت کرو اور بندگان خدا کو کھانا کھلاؤ، اور سلام کو خوب پھیلاؤ تم جنت میں پہونچ جاؤ گے سلامتی کے ساتھ۔ (جامع ترمذی)

تشریح) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین نیک کاموں کی ہدایت فرمائی ہے، اور ان کے کرنے والے کو جنت کی بشارت دی ہے۔ ایک خداوند رحمٰن کی عبادت، (یعنی بندہ پر اللہ کا جو خاص حق ہے اور جو دراصل مقصد تخلیق ہے کہ اس کی اور صرف اسی کی عبادت کی جائے اسکو ادا کیا جائے) دوسرے اطعام طعام یعنی اللہ کے محتاج اور مسکین بندوں کو بطور صدقہ کے اور دوستوں عزیزوں اور اللہ کے نیک بندوں کو بطور ہدیہ اخلاص و محبت کے کھانا کھلایا جائے (جو دلوں کو جوڑنے اور باہم محبت و الفت پیدا کرنے کا بہترین وسیلہ ہے، اور بخل جیسی مہلک بیماری کا علاج بھی ہے) تیسرے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" اور "وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ" کو جو اسلامی شعار ہے اور اللہ تعالیٰ کا تعلیم

فرمایا ہوا دعائیہ کلمہ ہو اس کو خوب پھیلایا جائے اور اس کی ایسی کثرت اور ایسا رواج ہو کہ اسلامی دنیا کی فضا اس کی لہروں سے معمور رہے۔ ان تین نیک کاموں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت سنائی ہے "تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ" (تم پوری سلامتی کے ساتھ جنت میں پہونچ جاؤ گے)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الْاِسْلَامِ خَيْرٌ؟ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَئُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ حضرت! اسلام میں (یعنی اسلامی اعمال میں) کیا چیز (اور کون سا عمل) زیادہ اچھا ہے؟ آپ نے فرمایا (ایک) یہ کہ تم اللہ کے بندوں کو کھانا کھلاؤ اور (دوسرے) یہ کہ جس سے جان پہچان ہو اس کو بھی اور جس سے جان پہچان نہ ہو اس کو بھی سلام کرو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی اعمال میں اطعام طعام اور اِفشاء سلام کو خیر اور بہتر قرار دیا ہے۔ بعض دوسری حدیثوں میں (جو گزر بھی چکی ہیں) دوسرے بعض اعمال صالحہ کو مثلاً ذکر اللہ یا جہاد فی سبیل اللہ کو یا والدین کی خدمت و اطاعت کو "خیر اعمال" اور "افضل اعمال" قرار دیا گیا ہے، لیکن جیسا کہ اسی سلسلہ میں بار بار واضح کیا جا چکا ہے، اس میں کوئی تضاد نہیں ہے آپ کے جوابات کا یہ فرق در اصل پوچھنے والوں کی حالت وضرورت اور موقع محل کے فرق کے لحاظ سے ہے۔ اور اسلامی نظام حیات میں ان سب ہی اعمال کو مختلف جہتوں سے خاص اہمیت اور عظمت حاصل ہے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا، اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَيْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ ——— رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم جنت میں نہیں جا سکتے تا وقتیکہ پورے مومن نہ ہو جاؤ (اور تمہاری زندگی ایمان والی زندگی

نہ ہوجائے) اور یہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ تم میں باہم محبت نہ ہوجائے، کیا میں تمھیں وہ عمل نہ بتادوں جس کے کرنے سے تمھارے درمیان محبت و یگانگت پیدا ہوجائے، (وہ یہ ہے کہ) سلام کو آپس میں خوب پھیلاؤ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے صراحۃً معلوم ہوا کہ ایمان جس پر داخلۂ جنت کی بشارت اور وعدہ ہے وہ صرف کلمہ پڑھ لینے کا اور عقیدہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اتنی وسیع حقیقت ہے کہ اہلِ ایمان کی باہمی محبت و مودت بھی اس کی لازمی شرط ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اہتمام کے ساتھ بتلایا ہے کہ ایک دوسرے کو سلام کرنے اور اس کا جواب دینے سے یہ محبت و مودت دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ کسی عمل کی خاص تاثیر جب ہی ظہور میں آتی ہے جبکہ اس عمل میں رُوح ہو، نماز، روزہ اور حج اور ذکر اللہ جیسے اعمال کا حال بھی یہی ہے۔ بالکل یہی معاملہ سلام اور مصافحہ کا بھی ہے کہ یہ اگر دل کے اخلاص اور ایمانی رشتہ کی بناپر صحیح جذبہ سے ہوں تو پھر دلوں سے کدورت نکلنے اور محبت و مودت کا رس پیدا ہوجانے کا یہ بہترین وسیلہ ہیں۔ لیکن آج ہمارا ہر عمل بے روح ہے۔

سلام کا اجر و ثواب:-

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَجُلاً جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَرَدَّ عَلَيْهِ ثُمَّ جَلَسَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ، ثُمَّ جَاءَ آخَرُ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ فَقَالَ عِشْرُوْنَ ثُمَّ جَاءَ آخَرُ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ، فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ فَقَالَ ثَلَاثُوْنَ۔

رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" آپ نے اس کے سلام کا جواب دیا، پھر وہ مجلس میں بیٹھ گیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا دسؔ (یعنی اس بندہ کے لیے اس کے سلام کی

وجہ سے دس نیکیاں لکھی گئیں) پھر ایک اور آدمی آیا، اُس نے کہا "السَّلَامُ علیکم ورحمۃ اللہ" آپ نے اُس کے سلام کا جواب دیا، پھر وہ آدمی بیٹھ گیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا بیس (یعنی اس کے لیے ۲۰ نیکیاں لکھی گئیں) پھر ایک تیسرا آدمی آیا اس نے کہا "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ" آپ نے اُس کے سلام کا جواب دیا، اور وہ مجلس میں بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا تیس (یعنی اُس کے لیے تیس ۳۰ نیکیاں ثابت ہو گئیں)

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

تشریح) اللہ تعالیٰ کا یہ کریمانہ قانون ہے کہ اُس نے ایک نیکی کا اجر اس آخری اُمت کے لیے دس نیکیوں کے برابر مقرر کیا ہے، قرآن پاک میں بھی فرمایا گیا "مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا" اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے حق میں جس نے صرف ایک کلمہ "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" کہا تھا فرمایا کہ اس کے لیے دس نیکیاں ثابت ہو گئیں۔ اور جس شخص نے اس کے ساتھ دوسرے کلمہ "وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ" کا بھی اضافہ کیا، اُس کے لیے آپ نے فرمایا کہ ۲۰ نیکیاں ثابت ہو گئیں اور تیسرے شخص کے لیے جس نے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ" کے ساتھ تیسرے کلمہ "وَبَرَکَاتُہٗ" کا بھی اضافہ کیا، آپ نے فرمایا کہ اس کے لیے ۳۰ نیکیاں ثابت ہو گئیں ـــ اسی حساب سے سلام کا جواب دینے والا بھی اجر و ثواب کا مستحق ہو گا۔

اللہ تعالیٰ ان حقیقتوں کا یقین نصیب فرمائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت حاصل کرنے کے جو راستے معلوم ہوئے ہیں، اُن کی قدر اور استفادے کی توفیق دے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اُبی بن کعب کے صاحبزادے طفیلؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ان کا طریقہ تھا کہ وہ ہمیں ساتھ لے کر بازار جاتے اور جس دوکاندار اور جس کباڑیے اور جس فقیر و مسکین کے پاس سے گزرتے ان کو بس سلام کرتے (اور کچھ خرید و فروخت کے بغیر واپس آجاتے)، ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو معمول کے مطابق مجھے ساتھ لے کر بازار جانے لگے، میں نے عرض کیا کہ آپ بازار جا کے کیا کریں گے، نہ تو آپ کسی دوکان پر کھڑے ہوتے ہیں، نہ کسی چیز کا سودا کرتے ہیں، نہ بھاؤ ہی کی بات کرتے ہیں اور بازار کی مجلسوں میں بھی نہیں بیٹھتے (پھر آپ بازار کس لیے جائیں؟) یہیں بیٹھئے باتیں ہوں اور ہم استفادہ کریں، حضرت ابن عمر نے

فرمایا کہ ہم تو صرف اس غرض اور اس نیت سے بازار جاتے ہیں کہ جو سامنے پڑے اُس کو سلام کریں (اور ہر سلام پر کم از کم دس نیکیاں کما کر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور بندگانِ خدا کے جوابی سلاموں کی برکتیں حاصل کریں)

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاللّٰہِ مَنْ بَدَأَ بِالسَّلَامِ ۔ —— رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں میں اللہ کے قرب اور اُس کی رحمت کا زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔ (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْبَادِیُٔ بِالسَّلَامِ بَرِیٌٔ مِنَ الْکِبْرِ —— (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ سلام میں پہل کرنے والا کبر سے بری ہے۔

(شعب الایمان للبیہقی)

تشریح یعنی سلام میں پہل کرنا اس بات کی علامت اور دلیل ہے کہ اس بندہ کے دل میں تکبر نہیں ہے۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ سلام میں پہل کرنا کبر کا علاج ہے جو بدترین رذیلہ ہے۔ جس پر احادیث میں عذابِ نار کی وعید ہے۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا! ۔ اس کے بعد چند وہ حدیثیں پڑھیے جن میں خاص خاص موقعوں پر سلام کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

عند الملاقات، سلام

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ سِتٌّ قِیْلَ مَا ھُنَّ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اِذَا لَقِیْتَہٗ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ وَاِذَا دَعَاکَ فَاَجِبْہُ وَاِذَا اسْتَنْصَحَکَ فَانْصَحْ لَہٗ وَاِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللّٰہَ فَشَمِّتْہُ وَاِذَا مَرِضَ فَعُدْہُ وَاِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْہُ ۔

—— رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ (خاص) حق ہیں ـــــ اول یہ کہ جب ملاقات ہو تو
سلام کرے، اور جب وہ مدعو کرے تو اُس کی دعوت قبول کرے (بشرطیکہ کوئی شرعی محذور
اور مانع نہ ہو) اور جب وہ نصیحت (یا مخلصانہ مشورہ) کا طالب ہو تو اُس سے دریغ نہ کرے،
اور جب اُس کو چھینک آئے اور وہ "الحمد للہ" کہے تو یہ اُس کو "یرحمک اللہ" کہے (یہ دعائیہ
کلمہ ہے) اور جب بیمار ہو تو اُس کی عیادت کرے اور جب وہ انتقال کر جائے تو اُس کے
جنازہ کے ساتھ جائے۔ (صحیح مسلم)

تشریح اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر سب
پہلا حق یہ بتایا ہے کہ ملاقات ہو تو سلام کرے۔ یعنی السلام علیکم کہے ـــ (حضرت ابوہریرہ
ہی کی روایت سے قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث ("اسلامی رشتہ کے چند حقوق" کے زیرِ عنوان)
صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے حوالہ سے چند ہی ورق پہلے گزر چکی ہے وہاں ضروری تشریح بھی کی جا چکی
ہے اس لیے یہاں اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا لَقِیَ
اَحَدُكُمْ اَخَاهُ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْهِ فَاِنْ حَالَتْ بَیْنَهُمَا شَجَرَةٌ اَوْ جِدَارٌ اَوْ حَجَرٌ
ثُمَّ لَقِیَهُ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْهِ ـــــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کی اپنے کسی مسلمان بھائی سے ملاقات ہو تو چاہیے کہ اُس کو
سلام کرے، اگر اسکے بعد کوئی درخت یا کوئی دیوار یا کوئی پتھر ان دونوں کے درمیان حائل
ہو جائے (اور تھوڑی دیر کے لیے ایک دوسرے سے غائب ہو جائیں) اور اس کے بعد پھر سامنا
ہو تو پھر سلام کرے۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح مطلب یہ ہے کہ اگر ملاقات اور سلام کے بعد دو چار سکنڈ کے لیے بھی ایک دوسرے سے غائب
ہو جائیں اور اس کے بعد پھر ملیں تو دوبارہ سلام کیا جائے اور دوسرا اُس کا جواب دے۔
ـــــ اس حدیث سے سمجھا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور شریعتِ اسلام میں

مسلام کی کتنی اہمیت ہے۔

اپنے گھر یا کسی مجلس میں آؤ یا جاؤ تو سلام کرو:۔

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا بُنَیَّ اِذَا دَخَلْتَ عَلٰی اَھْلِکَ فَسَلِّمْ یَکُوْنُ بَرَکَۃً عَلَیْکَ وَعَلٰی اَھْلِ بَیْتِکَ۔

——— رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بیٹا! جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو سلام کرو یہ تمہارے لیے بھی باعث برکت ہوگا اور تمہارے گھر والوں کے لیے بھی۔ (جامع ترمذی)

عَنْ قَتَادَۃَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلْتُمْ بَیْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰی اَھْلِہٖ وَاِذَا خَرَجْتُمْ فَاَوْدِعُوْا اَھْلَہٗ بِسَلَامٍ۔

——— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت قتادہ (تابعی) سے (مرسلاً) روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم کسی گھر میں جاؤ تو گھر والوں کو سلام کرو، اور پھر جب گھر سے نکلو اور جانے لگو تو وداعی سلام کرکے نکلو۔ (شعب الایمان للبیہقی)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا انْتَھٰی اَحَدُکُمْ اِلَی الْمَجْلِسِ فَلْیُسَلِّمْ فَاِنْ بَدَا لَہٗ اَنْ یَّجْلِسَ فَلْیَجْلِسْ ثُمَّ اِذَا قَامَ فَلْیُسَلِّمْ فَلَیْسَتِ الْاُوْلٰی بِاَحَقَّ مِنَ الْاٰخِرَۃِ ——— رواہ الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی کسی مجلس میں پہونچے تو چاہیئے کہ اولاً اہل مجلس کو سلام کرے، پھر بیٹھنا مناسب سمجھے تو بیٹھ جائے، پھر جانے لگے تو پھر سلام کرے ——— اور پہلا سلام بعد والے سلام سے اعلیٰ اور بالا نہیں ہو (یعنی بعد والے رخصتی سلام کا بھی وہی درجہ ہے جو پہلے سلام کا ہے۔ اس سے کچھ کم نہیں) (جامع ترمذی)

سلام کے متعلق کچھ احکام اور ضابطے :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام اور جواب سلام کے کچھ احکام اور ضابطے بھی تعلیم فرمائے ہیں، اُن کے لیے ذیل کی چند حدیثیں پڑھیے!

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُسَلِّمُ الصَّغِیْرُ عَلَی الْکَبِیْرِ وَالْمَارُّ عَلَی الْقَاعِدِ، وَالْقَلِیْلُ عَلَی الْکَثِیْرِ ـــــــ رواہ البخاری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ چھوٹا بڑے کو سلام کیا کرے اور راستے سے گزرنے اور چلنے والا بیٹھے ہوؤں کو سلام کیا کرے اور تھوڑے آدمی زیادہ آدمیوں کی جماعت کو سلام کریں۔ (صحیح بخاری)

(اور حضرت ابوہریرہ ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ سوار آدمی کو چاہیے کہ وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے۔)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جب ایک چھوٹے اور بڑے کی ملاقات ہو تو چھوٹے کو چاہیے کہ وہ پیشقدمی کر کے بڑے کو سلام کرے، اور اسی طرح جب کسی چلنے والے کا گزر کسی بیٹھے ہوئے آدمی پر ہو تو چلنے والے کو چاہیے کہ وہ سلام میں پیشقدمی کرے، اور اگر دو جماعتوں کی ملاقات ہو تو جس جماعت میں نسبتہً کم آدمی ہوں وہ دوسری زیادہ آدمیوں والی جماعت کو سلام کرنے میں پیشقدمی کرے اور جو شخص کسی سواری پر جا رہا ہو وہ پیشقدمی کر کے پیدل چلنے والوں کو سلام کرے ـــ اس ہدایت کی یہ حکمت ظاہر ہے کہ سوار کو بظاہر ایک دنیوی بلندی اور بڑائی حاصل ہے اس لیے اس کو حکم دیا گیا کہ وہ پیدل چلنے والوں کو سلام کر کے اپنی بڑائی کی نفی اور تواضع اور خاکساری کا اظہار کرے۔

عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ مَرْفُوْعًا قَالَ یُجْزِئُ عَنِ الْجَمَاعَةِ اِذَا مَرُّوْا اَنْ یُسَلِّمَ اَحَدُهُمْ وَیُجْزِئُ عَنِ الْجُلُوْسِ اَنْ یَّرُدَّ اَحَدُهُمْ۔

ـــــــ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت علی بن ابی طالب سے روایت ہے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف نسبت کر کے بیان فرمایا کہ گزرنے والی جماعت میں سے اگر کوئی ایک سلام کہے تو پوری جماعت کی طرف سے کافی ہے اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک جواب دے دے تو سب کی طرف سے کافی ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

بعض حالتوں میں سلام نہ کیا جائے:۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلاً سَلَّمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَبُوْلُ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّلَامَ۔

——— رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس حالت میں سلام کیا جب آپ پیشاب کے لیے بیٹھے ہوئے تھے تو آپ نے اُس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایسی حالتوں میں سلام نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر کوئی آدمی ناواقفی سے سلام کرے تو اس کا جواب نہ دینا چاہیے۔

عَنْ مِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ فِيْ حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ قَالَ فَيَجِيْئُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ اللَّيْلِ فَيُسَلِّمُ تَسْلِيْماً لَا يُوْقِظُ النَّائِمَ وَيُسْمِعُ الْيَقْظَانَ ..... الحدیث

حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ ایک طویل حدیث کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو ہم اصحاب صفہ کے پاس تشریف لاتے تو آپ اس طرح آہستہ اور احتیاط سے سلام کرتے کہ سونے والے نہ جاگتے اور جاگنے والے سن لیتے..... (جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کرنے والے کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ اس کے سلام سے کسی سونے والے کی آنکھ نہ کھل جائے یا اس طرح کی کوئی دوسری اذیت اللہ کے کسی بندہ کو نہ پہونچ جائے ——— اللہ تعالیٰ ہمیں یہ آداب سیکھنے اور برتنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مُصَافحہ

ملاقات کے وقت محبت و مسرت اور جذبۂ اکرام و احترام کے اظہار کا ایک ذریعہ سلام کے علاوہ اور اس سے بالاتر مصافحہ بھی ہے جو عموماً سلام کے ساتھ اور اس کے بعد ہوتا ہے اور اس سے سلام کے ان مقاصد کی گویا تکمیل ہوتی ہے۔ بعض احادیث میں صراحتہً یہی بات فرمائی گئی ہے۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْ تَمَامِ التَّحِيَّةِ الْاَخْذُ بِالْيَدِ ــــــــــ رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سلام کا تکملہ مصافحہ ہے۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

[قریب قریب یہی مضمون جامع ترمذی ہی میں ایک دوسری حدیث کے ضمن میں مشہور صحابی حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے]

مصافحہ کا اجر و ثواب اور اس کی برکتیں :-

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ فَتَصَافَحَا وَحَمِدَا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَاهُ غُفِرَ لَهُمَا ــــــ

ــــــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب دو مسلمانوں کی ملاقات ہو اور وہ مصافحہ کریں اور اس کے ساتھ اللہ کی حمد اور اپنے لیے مغفرت طلب کریں تو ان کی مغفرت ہو ہی جائے گی۔ (سنن ابی داؤد)

عَنْ عَطَاءِ الْخُرَاسَانِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَصَافَحُوْا يَذْهَبُ الْغِلُّ وَتَهَادُوْا تَحَابُّوْا وَتَذْهَبُ الشَّحْنَاءُ۔

ــــــــــ رواہ مالک ۔ مرسلاً

عطاء خراسانی تابعی سے (بطریق ارسال) روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا تم باہم مصافحہ کیا کرو اس سے کینہ کی صفائی ہوتی ہے، اور آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو اس سے تم میں باہم محبت پیدا ہوگی اور دلوں سے دشمنی دور ہوگی۔

(موطا امام مالک)

[یہ روایت امام مالک نے اسی طرح عطا خراسانی سے مرسلاً روایت کی ہے یعنی انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کو یہ حدیث کس صحابی سے پہونچی ـــ ایسی حدیث کو مرسل کہا جاتا ہے اور اس طریقہ سے روایت کرنے کو ارسال]

(تشریح) یہاں بھی اس بات کو یاد کر لیا جائے کہ ہر عمل کی تاثیر اور برکت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس میں روح ہو، جو دانہ بیجان ہو چکا اُس سے پودا نہیں اُگیگا۔

معانقہ و تقبیل ـــــ اور قیام

محبت و تعلق کے اظہار کا آخری اور انتہائی ذریعہ معانقہ اور تقبیل (چومنا) ہے لیکن اسکی اجازت اُسی صورت میں ہے جبکہ موقع محل کے لحاظ سے کسی شرعی مصلحت کے خلاف نہ ہو اور اس سے کسی بُرائی یا اس کے شک شبہ کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ جامع ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ جب اپنے بھائی یا عزیز دوست سے ملاقات ہو تو کیا اس کو اجازت ہے کہ اس سے لپٹ جائیں اسے گلے لگائیں اور اس کو چومیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس کی اجازت نہیں ہے، اُس شخص نے عرض کیا تو پھر اس کی اجازت ہے کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیں اور مصافحہ کریں؟ آپ نے فرمایا ہاں اسکی اجازت ہے ـــــ اس حدیث سے معانقہ اور تقبیل کی جو ممانعت مفہوم ہوتی ہے اس کے بارہ میں شارحین حدیث کی رائے دوسری بہت سی حدیثوں کی روشنی میں یہی ہے کہ اس کا تعلق اُس صورت سے ہے جبکہ سینہ سے لگانے اور چومنے میں کسی بُرائی یا اُس کے شک و شبہ کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ـــ ورنہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معانقہ اور تقبیل کے بہت سے واقعات مروی اور ثابت ہیں۔ ان میں سے بعض ذیل کی حدیثوں سے معلوم ہوں گے۔

عَنْ اَيُّوْبَ عَنْ بُشَيْرٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ عَنَزَةَ اَنَّهُ قَالَ قُلْتُ لِاَبِيْ ذَرٍّ هَلْ

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَافِحُكُمْ إِذَا لَقِيتُمُوْهُ قَالَ مَا لَقِيْتُهُ قَطُّ إِلَّا صَافَحَنِيْ وَبَعَثَ إِلَيَّ ذَاتَ يَوْمٍ وَلَمْ أَكُنْ فِيْ أَهْلِيْ فَلَمَّا جِئْتُ أُخْبِرْتُ فَأَتَيْتُهُ وَهُوَ عَلٰى سَرِيْرٍ فَالْتَزَمَنِيْ فَكَانَتْ تِلْكَ أَجْوَدَ وَأَجْوَدَ۔ ——— رواہ ابوداؤد

ایوب بن بُشیر قبیلہ بنو عنزہ کے ایک آدمی سے روایت کرتے ہیں اُس نے بیان کیا کہ میں نے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کے وقت آپ لوگوں سے مصافحہ بھی کیا کرتے تھے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ میں جب بھی حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے ملا تو آپ نے ہمیشہ مجھ سے مصافحہ کیا اور ایک دفعہ آپ نے مجھے گھر سے بلوایا میں اُس وقت اپنے گھر پر نہیں تھا، جب میں گھر آیا اور مجھے بتایا گیا (کہ حضور نے مجھے بلوایا تھا) تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ اپنے سریر پہ تھے (جو کھجور کی شاخوں سے ایک تخت یا چارپائی کی طرح بنا لیا جاتا تھا) آپ (اُس سے اٹھ کر) مجھ سے لپٹ گئے اور گلے لگایا اور آپ کا یہ معانقہ بہت خوب اور بہت ہی خوب تھا (یعنی بڑا لذت بخش اور بہت ہی مبارک تھا) (سنن ابی داؤد)

عَنِ الشَّعْبِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَلَقَّى جَعْفَرَ بْنَ أَبِيْ طَالِبٍ فَالْتَزَمَهُ وَقَبَّلَ مَا بَيْنَ عَيْنَيْهِ ——— رواہ ابوداؤد والبیہقی فی شعب الایمان مرسلاً

امام شعبی تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعفر بن ابی طالب کا استقبال کیا (جب وہ حبشہ سے واپس آئے) تو آپ ان کو لپٹ گئے (یعنی معانقہ فرمایا) اور دونوں آنکھوں کے بیچ میں (اُن کی پیشانی کو) بوسہ دیا۔ (سنن ابی داؤد، شعب الایمان للبیہقی)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا رَأَيْتُ أَحَدًا كَانَ أَشْبَهَ سَمْتًا وَهَدْيًا وَدَلًّا بِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ فَاطِمَةَ كَانَتْ إِذَا دَخَلَتْ عَلَيْهِ قَامَ إِلَيْهَا فَأَخَذَ بِيَدِهَا فَقَبَّلَهَا وَأَجْلَسَهَا فِيْ مَجْلِسِهٖ وَكَانَ إِذَا دَخَلَ عَلَيْهَا قَامَتْ إِلَيْهِ فَأَخَذَتْ بِيَدِهٖ فَقَبَّلَتْهُ وَأَجْلَسَتْهُ

فِی مَجْلِسِهَا ـــــــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو شکل و صورت، سیرت و عادت اور چال ڈھال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ زیادہ مشابہ ہو صاحبزادی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے (یعنی ان سب چیزوں میں وہ سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ تھیں) جب وہ حضور کے پاس آتیں تو آپ (جوش محبت سے) کھڑے ہو کر ان کی طرف بڑھتے، ان کا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لے لیتے اور (پیار سے) اُس کو چومتے اور اپنی جگہ پر اُن کو بٹھاتے (اور یہی ان کا دستور تھا) جب آپ اُن کے یہاں تشریف لے جاتے تو وہ آپ کے لیے کھڑی ہو جاتیں آپ کا دست مبارک اپنے ہاتھ میں لیتیں، اُس کو چومتیں اور اپنی جگہ پر آپ کو بٹھاتیں۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) یہ روایات اس کی واضح دلیل ہیں کہ محبت اور اکرام کے جذبہ سے معانقہ اور تقبیل (یعنی ہاتھ یا پیشانی وغیرہ چومنا) جائز اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، اس لیے حضرت انس کی اُس حدیث کو جس میں معانقہ اور تقبیل کی ممانعت کا ذکر ہے اسی پر محمول کیا جائے گا کہ وہ حکم ان مواقع کے لیے ہے جب سینے سے لگانے اور چومنے میں کسی برائی یا اس کے شک و شبہ کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ حضرت عائشہ والی آخری حدیث میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی آمد پر حضور کے کھڑے ہو جانے اور حضور کی تشریف آوری پر حضرت فاطمہ کے کھڑے ہونے کا بھی ذکر ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محبت اور اکرام و احترام کے جذبہ سے اپنے کسی عزیز، محبوب یا محترم بزرگ کے لیے کھڑا ہو جانا بھی درست ہے۔ لیکن بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے تشریف لانے پر اگر صحابہ کرام کبھی کھڑے ہو جاتے تو آپ اس کو ناپسند فرماتے اور ناگواری کا اظہار فرماتے تھے، غالباً اس کی وجہ آپ کی مزاجی خاکساری اور تواضع پسندی تھی ـــــ واللہ اعلم۔

دنیا ڈیڑھ ہزار سال پہلے

(از مولانا عبد السلام صاحب قدوائی)

(۴)

مناسب ہوگا کہ اس موقع پر دنیا کے دو عالمگیر مذہب یعنی یہودیت اور عیسائیت پر بھی ایک نظر ڈالی جائے اور دیکھا جائے کہ ان کے اندر اصلاح حال کی کتنی صلاحیت تھی۔

یہودیوں کی حالت یہودی ایک زمانہ میں دنیا کی بڑی معزز اور صاحب اثر و اقتدار قوم تھے لیکن صدیوں سے ان کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی اور اب ان کا انحطاط آخری درجہ پر پہونچ گیا تھا۔ ان کے اندر بڑے بڑے مصلح پیدا ہوئے۔ بہت سے اولوالعزم پیغامبروں نے ان کی اصلاح کی کوشش کی لیکن ساری تدبیروں کے باوجود ان کی حالت گرتی ہی گئی۔ اعمال کی اصلاح اور اخلاق کی بہتری کی انھیں کوئی فکر نہ تھی۔ مال و دولت کی حرص نے انھیں اندھا کر دیا تھا۔ باہم قتل و غارتگری ان کا مشغلہ تھا۔ اپنے بھائی کی مدد کے بجائے اس کی غربت و بیچارگی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اعانت کی بجائے زیادہ سے زیادہ سود وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دنیا میں نیک نامی کا خیال تھا نہ آخرت میں نجات کی فکر تھی۔ شریعت کے خلاف ورزی اور قوانین الٰہی کی اطاعت سے گریز ان کا شیوہ بن گیا تھا۔ اللہ کی کتاب اور انبیاء علیہم السلام کی ہدایات پر عمل کے بجائے سحر و طلسمات کے چکر میں مبتلا رہتے تھے۔ اور لوگوں کو نقصان پہونچانے کی تدبیروں میں مصروف رہتے تھے۔ حسد و کینہ ان کا مزاج بن گیا تھا۔ کسی کو اچھے حال میں دیکھنا انھیں گوارا نہ تھا۔ ہر اصلاحی تحریک کی سب سے پہلے مخالفت کرتے تھے اور ہر مصلح کی جان کے درپے ہو جاتے تھے۔ طرح طرح سے دق

کرتے اور جب موقع پا جاتے تو قتل کر ڈالتے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے کوسوں دور ہو گئے تھے۔ اور نہ صرف یہ کہ عمل میں کوتاہی کرتے بلکہ آیات الٰہی کو بدل دیتے تھے اور اپنی طرف سے جھوٹی آیتیں بنا کر توراۃ میں شامل کر دیتے تھے۔ عقائد میں بھی شرک کی آمیزش ہو گئی تھی۔ ان کے ظاہر و باطن میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔ ساری زندگی پر نفاق چھایا ہوا تھا۔ بقول حضرت مسیح علیہ السلام "وہ سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند تھے جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ناپاکیوں سے بھری ہوتی ہیں[1]۔ اور بقول حضرت داؤد "ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن تھا، وہ اپنے منھ سے خدا کے ساتھ ریاکاری کرتے تھے، اپنی زبان سے اس سے جھوٹ بولتے تھے اور اس کے عہد میں وفادار نہ تھے[2]" اپنی خواہشات کے بندے تھے۔ توراۃ کے جو احکام ان کی مرضی کے موافق ہوتے انھیں مانتے اور جو ان کی خواہشات کے خلاف ہوتے انھیں تسلیم نہ کرتے[3] اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کو قتل کر ڈالتے تھے۔

الغرض شاید ہی کوئی انفرادی یا اجتماعی خرابی ایسی ہو جو ان کے اندر نہ پائی جاتی ہو۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عزت و سربلندی کے بجائے وہ ذلت و خواری میں مبتلا تھے۔ اور غضب الٰہی ان پر نازل تھا۔ قرآن مجید میں ان کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ	ان پر ذلت اور بیچارگی مسلط کر دی گئی اور
وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۝	وہ اللہ کی جانب سے غضب کے مستحق ہوئے
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ	یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں سے
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ	انکار کرتے تھے اور ناحق نبیوں کو قتل کرتے تھے۔ اور یہ اس
بِغَيْرِ الْحَقِّ ۝ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ	سبب سے پیش آیا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ زیادتی
كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝	کیا کرتے تھے۔

درد مند لوگ ان حالات سے بےچین تھے لیکن اصلاح کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ سب سے

---

[1] سیرت النبی جلد چہارم بحوالہ انجیل متی [2] ایضاً بحوالہ زبور، ص ۵۰، ۸۰، [3] ملاحظہ ہو قرآن مجید پہلا پارہ [4] ایضاً

بڑی مشکل یہ تھی کہ توراۃ اس قدر محرف ہو چکی تھی کہ اس سے دین کے صحیح احکام کا پتہ چلانا اور انبیاء علیہ السلام کے سچے حالات کا معلوم کرنا ناممکن تھا۔

توراۃ کی بربادی کی تاریخ حضرت سلیمانؑ کے بعد اسباطِ اسرائیل میں اختلافات رونما ہوئے اور دو بڑی سلطنتیں بن گئیں۔ حضرت سلیمان کے صاحبزادے احبعام کو یا تحت یہوداور بنیامین کی اولاد نے بیت المقدس میں ایک سلطنت قائم کی اور باقی دس اسباط نے یربعام کی سرکردگی میں سماریہ کی شمالی سلطنت قائم کی۔ یربعام پہلے حضرت سلیمانؑ کی طرف سے سبطِ یوسف پر عامل مقرر ہوا تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس نے احیاہ کاہن کی سازش سے فساد برپا کرنا چاہا اور بغاوت کی تیاری کی۔ اس کی اس حرکت کی بناء پر حضرت سلیمان نے اسے قتل کرنا چاہا لیکن وہ مصر بھاگ گیا اور حضرت سلیمانؑ کی وفات تک وہیں رہا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے کے خلاف بغاوت کی اور دس اسباط کو اپنے ساتھ ملا کر سماریہ میں الگ سلطنت قائم کرلی۔ اس نے سونے کے بچھڑے کی پرستش کو رواج دیا۔ اور اس غرض سے مندر بنوائے۔ اپنی بت پرستی اور رسوم بیجا کو صحیح ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی غلط روایات وضع کیں اور حضرت سلیمان کے متعلق بہت سی بے سروپا حکایات لکھیں اور پھیلائیں۔[1] یہ توراۃ میں بڑے پیمانے پر تحریف کی ابتدا تھی لیکن ابھی بیت المقدس میں توراۃ کے صحیح نسخے موجود تھے۔ اس لیے ان غلط روایات کی تردید کی جاسکتی تھی مگر ۵۸۶ق م میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کرکے اس میں آگ لگادی۔ اس آتشزنی میں توراۃ کی الواح اور دوسرے تبرکات جل گئے۔ بیت المقدس کو اس طرح تباہ و برباد کرنے کے بعد جو لوگ باقی بچے ان کو گرفتار کرکے "بابل" لے گیا۔ پچاس برس اسیری کی حالت میں گزر گئے۔ بالآخر خورش شاہ ایران نے بابل فتح کرکے بنی اسرائیل کو آزاد کیا اور تعمیر بیت المقدس کی اجازت دی اس زمانے میں "عزرا" اور "نحمیا" دو نامور علماء نے یادداشت سے پھر توراۃ مرتب کی۔[2] ۱۶۸ق م میں شاہ انطاکیہ انٹونیس یونانی کے ہاتھوں پھر بیت المقدس کی تباہی آئی اور مقدس صحیفے جلاکر راکھ کردیے گئے۔ کچھ عرصہ بعد یہود اعقابی

---

[1] تاریخ صحف سماوی بحوالہ توراۃ، ملوک ۱۲/۲۸-۳۰

[2] تاریخ صحف سماوی بحوالہ نحمیا باب ۸ و کتاب تعامان دوم ۲/۱۳

کی ہمت سے پھر بنی اسرائیل کو فتح ہوئی اور از سر نو تورات کے نسخے مرتب کیے گئے۔ ۷۰ ق م میں ٹائٹس رومی کے ہاتھوں پھر بیت المقدس برباد ہوا، وہ چلتے وقت توراۃ کے نوشتے اپنے ہمراہ روما لیتا چلا گیا۔ اس کے بعد پھر لفظ بلفظ تورات مرتب نہ کی جا سکی اور صرف یادداشت سے اس کا مفہوم لکھا گیا۔ اب امتداد زمانہ کی بنا پر بنی اسرائیل عبرانی زبان سے زیادہ واقف نہ رہ گئے اور مختلف قوموں کے ساتھ مختلف علاقوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی زبان بدل گئی تھی اور عبرانی کے بجائے آرامی زبان زیادہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے اب علماء عبرانی عبارت کا ترجمہ سنانے لگے[1]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اختلافات بڑھنے لگے اس کے ساتھ غضب یہ ہوا کہ یہ عقیدہ بھی دلوں میں جاگزیں ہو گیا کہ حضرت موسیٰ پر توراۃ کے علاوہ زبانی وحی بھی آتی تھی جو بعد کو حضرت ہارونؑ کی اولاد کے ذریعہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی تا آنکہ احبار اور ربیّوں تک یہ روایات پہونچیں[2]۔ اس خیال کے عقیدہ بن جانے کی وجہ سے احبار اور ربیوں کے اقوال وحی الٰہی کے ہم پلہ سمجھے جانے لگے اور حسب منشا قسم قسم کی روایات اور افسانے مذہب کے اندر داخل ہو گئے جن کے اندر توراۃ کی اصل تعلیمات اور احکام دب کر رہ گئے۔ یہی قصص و روایات تھے جو دوسری صدی عیسوی کے آخر میں ربی یہوداہ نے "مشنا" کے نام سے جمع کیے۔ اس کی شرح جمرا اور یہ سارا مجموعہ "تالمود" کہلاتا ہے۔

تفصیل بالا سے ظاہر ہے کہ تورات میں کس قدر تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ کتابت و تراجم کی غلطیوں کی وجہ سے تحریف میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ عبرانی زبان میں عہد عتیق کا کوئی ایسا نسخہ باقی نہیں رہا جسے الہامی لکھنے والوں نے لکھا تھا[3]۔ صرف وہی نسخے موجود رہ گئے جو نقل در نقل ہو کر رائج تھے۔ لیکن ان میں بھی وہ پرانے نسخے موجود نہیں رہے جو یہودیوں میں معتبر سمجھے جاتے تھے۔ صرف بعد کے لکھے ہوئے نسخے موجود رہے، ان میں مذکورہ بالا پرانے تغیرات کے علاوہ احبار اور ربیوں کے وہ تغیرات بھی ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کے مطابق کرتے رہے ہیں۔ ان وجوہ سے ان نسخوں میں بکثرت اختلافات

---

[1] تاریخ صحف سماوی بحوالہ نحمیا $\frac{12}{22-25}$

[2] دیباچہ تالمود بابلی ص۲ مترجمہ پادری اسٹرن

[3] تاریخ صحف سماوی بحوالہ دیباچہ علوم بائبل جلد دوم از ریورنڈ ہارن

ہیں. توراۃ کے موجودہ نسخوں کی جس عبرانی نسخہ پر بنیاد ہے. وہ دوسری عیسوی صدی کا مرتب کیا ہوا ہے. اس میں بہت سی تحریفیں صاف نظر آتی ہیں[1]۔

ان حالات میں جب اصل کتابوں کی تحریف کا یہ حال ہو اور علما، مذہب کا وہ حال ہو جو اوپر گزر چکا ہے تو قوم کی اصلاح کی کیا توقع ہوسکتی تھی یہی وجہ ہے کہ یہودی حالات سے بہت پریشان تھے مگر اپنے گرد وپیش میں انھیں کوئی ایسا سامان نہ نظر آتا تھا کہ جس کے سہارے وہ اس صورت کو بدلنے کی فکر کرسکتے ــــــ بےچین ہو ہو کر وہ توراۃ کی ان پیشینگوئیوں کو یاد کرتے تھے جن میں نبی آخرالزماں کی آمد کی خبر دی گئی تھی. اور دعائیں مانگتے تھے کہ وہ وقت جلد آجائے جب ان کی آنکھیں آخری نبی کی زیارت سے ٹھنڈی ہوں اور وہ ان کے زیر سایہ صدیوں کی خواری وزبوں حالی کے بعد پھر عزت وسرفرازی حاصل کرسکیں۔

عیسائیوں کی حالت

اس زمانے میں دنیا کا دوسرا اہم اور وسیع مذہب عیسائیت تھا لیکن یہ بھی اپنی اصل حالت پر باقی نہ رہا تھا. نہ مقدس کتاب انجیل محفوظ رہی تھی نہ صاحب کتاب کی سیرت اور مواعظ مستند طور پر قلمبند ہوسکے تھے. حضرت عیسیٰؑ کے کچھ ہی عرصہ بعد ردوبدل کا سلسلہ شروع ہو گیا. پال کے عیسائی ہونے کے بعد اس میں اور اضافہ ہوا کیونکہ حضرت عیسیٰؑ نے توراۃ کے احکام تبدیل نہیں کیے تھے. اس سے شروع میں ان کے متبعین حواری پطرس کی رہنمائی میں توراۃ کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے. لیکن پال کے عیسائی ہونے کے بعد جب غیر قوموں کو عیسائیت میں داخل کرنے کا جذبہ بڑھا تو شریعت موسوی میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی. حواریوں نے اس صورتحال کے پیش نظر عارضی طور پر غیر اسرائیلی اقوام کے لیے شریعت موسوی کی بعض پابندیاں ختم کردیں لیکن رفتہ رفتہ اس رخصت نے آگے چل کر اباحت کا خیال پیدا کردیا اور طرح طرح کی بدعات رائج ہوگئیں. ۳۲۵ء میں شاہ قسطنطین کے عیسائی ہونے کے بعد دین عیسوی میں اور بھی تبدیلیاں ہوئیں اور مشرک وبت پرست اقوام کو عیسائیت میں داخل کرنے کے لیے بہت سے مشرکانہ خیالات مذہب میں شامل کر لیے گئے. ۳۲۵ء میں نیقیہ میں جو مسیحی علماء کی

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد دوم

کونسل منعقد ہوئی اس میں حضرت عیسیٰ کو الوہیت کا درجہ دیدیا گیا اور اس عقیدہ کو شاہ قسطنطین نے بزور شمشیر نافذ کر دیا[۱] تثلیث کا عقیدہ پورے طور پر دین میں داخل کر لیا گیا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مذہبی عقائد متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا۔ عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا، اور مریم عذرا کو خدا کی ماں کا لقب دیا گیا[۲] مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی، رومی بت پرستانہ عقائد نے مذہب کا روپ بھر لیا تھا۔ قبر پرستی عام ہو گئی تھی، پادریوں اور بطریقوں کو سجدے کیے جاتے تھے۔ حضرت مسیح و مریم، روح القدس، حواریین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش کثرت سے ہونے لگی تھی، گرجا کے پادریوں نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا۔ اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے رہتے تھے۔ انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں عام تھیں۔ مغربی چرچ میں بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لیے قتل تک نوبت پہونچ گئی تھی۔ اس سلسلہ میں بعض اوقات سیکڑوں آدمی قتل ہو جاتے تھے۔ ان عہدوں کے حصول کی اتنی خواہش اس لیے تھی کہ اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تحفے ملتے تھے، وہ اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ نکلتے تھے اور ان کے دسترخوانوں پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی۔

شاہ جسٹینین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہو گئی، اس کے نزدیک اپنے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم نہ تھا ـــــ بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں ان کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی مبتذل ہو گئی ان کا مقصد صرف روپیہ کمانا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہو اس روپے کو وہ نفاست و عیاشی میں اڑاتے تھے[۳]

اس موقع پر چوتھی صدی عیسوی کے ایک سربرآوردہ شامی عیسائی کا بیان بھی پڑھنے کے لائق ہے وہ کہتا ہے:۔

"پیشوایان دین مسیح کو قوم کی بہبودی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ وہ احکام دین کی

---

[۱] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن جلد پنجم۔
[۲] سیرۃ النبی بحوالہ معرکۂ مذہب و سائنس ڈریپر ص ۶۲-۶۵۔ [۳] سیرۃ النبی جلد چہارم بحوالہ دیباچہ ترجمۂ قرآن انگریزی از سیل

پرواہ کرتے ہیں بلکہ اپنی ذاتی اغراض کو پورا کرنے میں منہمک اور جاہ طلبی میں مصروف ہیں مشرقی عیسائیت کے یہ پیرو غرور، حسد اور حرص میں مبتلا ہیں[1]"

پانچویں صدی تک یونانیوں اور مصریوں کے توہمات اور رسوم دین عیسوی میں شریک غالب ہو گئے تھے، حلول کا اعتقاد بھی پیدا ہو گیا تھا، مجوسی عقائد بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہ خیال بھی پیدا ہو گیا تھا کہ توراۃ کے ظاہری معنی کے علاوہ اس کے باطنی معنی بھی ہیں۔ الغرض سینکڑوں نئے نئے فرقے پیدا ہو گئے تھے جن کے درمیان مناظروں اور جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہا کرتا تھا اور باہم کشت و خون ہوتا رہتا تھا۔ پادریوں کا مذہبی منصب حصول جاہ کا ذریعہ بن گیا تھا اور حبّ جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ رشوت ستانی کا بازار گرم تھا اور یہ حالت ہو گئی تھی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ رکھتا تھا اسی قدر اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی تھی، سلاطین اور حاملین مذہب کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑا اور بداخلاقی، اسراف اور ہوس پرستی مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی[2] پوپوں نے خدائی اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ جو لوگ نیک اور دیندار تھے وہ بھی دین کی صحیح روح سے ناآشنا تھے۔ عبادت سے فضائل اخلاق پیدا کرنے کے بجائے صرف نفس کشی اور جسم کو تکلیف پہونچانا مقصود تھا۔ دینداری کا سب سے اہم جز تجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی۔ ہر قسم کی آسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کی تکلیف اور عذاب میں اپنے کو مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے اپنے اوپر سایہ میں بیٹھنا حرام کر لیا تھا، کوئی اپنے آپ کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا، کسی نے خود کو اندھیری کوٹھری میں بند کر لیا تھا۔ ماں باپ، اہل و عیال اور اعزا و اقربا دینداری و تقویٰ شعاری کی راہ میں کانٹے تھے جن سے پرہیز بلکہ نفرت کمال تقویٰ سمجھا جاتا اور اس پر فخر کیا جاتا تھا[3]

مقدس مذہبی نوشتے بھی صحیح حالت میں موجود نہ تھے۔ اصل انجیل کا کوئی نسخہ موجود نہ رہ گیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک صدی تک کوئی چیز قلمبند نہیں کی گئی تھی دوسری صدی میں جب

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں بحوالہ لاہور ص۱۸۲ [2] سیرۃ النبی جلد چہارم بحوالہ سیل و تاریخ صحف سماوی بحوالہ تاریخ زوال روما از گبن اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن جلد پنجم [3] سیرۃ النبی جلد چہارم بحوالہ تاریخ اخلاق یورپ لیکی جلد دوم

اسرائیلی اور غیر اسرائیلی عیسائیوں کے اختلافات رونما ہوئے تو سینہ بہ سینہ روایات کو مرتب کرنے کا خیال ہوا۔ لیکن چونکہ فرقہ بندی شروع ہو چکی تھی اس لیے ہر فرقہ نے اپنی علیحدہ انجیل مرتب کی جن میں خاصا اختلاف تھا۔ حضرت مسیحؑ اور ان کے حواریوں کے ملفوظات بھی اسی طرح مرتب کیے گئے۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کی اصل زبان مغربی آرامک تھی جس سے ان کے معتقدین عموماً ناواقف تھے اس لیے زیادہ تر انجیلیں رائج الوقت یونانی زبان میں لکھی گئیں۔ صرف ایک انجیل یہودی آرامک زبان میں لکھی گئی، اسے بھی قبول عام نہ ہو سکا اور ۱۵۰ء کے بعد دنیا میں اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کلام الٰہی جو حضرت عیسیٰؑ پر ان کی مادری زبان میں نازل ہوا تھا بجنسہٖ محفوظ نہ رہا بلکہ روایت بالمعنیٰ یا ترجمہ کے طور پر باقی رہا اس وجہ سے ابتدا ہی سے انجیلوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور ہر فرقہ نے اپنے اپنے طور پر روایات قلمبند کیں۔ کلام الٰہی کی طرح حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں کے ملفوظات اور خطوط کا بھی یہی حشر ہوا اور انجیل کی طرح ان کے مضامین بھی آپس میں سخت مختلف ہو گئے۔ شاہ قسطنطین کی سرپرستی میں نیقیہ میں جو کونسل منعقد ہوئی تاکہ مختلف فیہ مسائل کا تصفیہ کرے اور عیسائی تعلیمات کا تعین کرے۔ اس کونسل نے متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی چار انجیلیں تسلیم کیں باقی کو جعلی قرار دیا۔ ۴۹۶ء میں پوپ گلاسیوس نے بھی باضابطہ طور پر اسے تسلیم کر لیا۔[۱]

مذکورہ بالا تفصیلات سے صاف ظاہر ہے کہ اناجیل نہ کلام الٰہی ہیں نہ حضرت مسیحؑ اور ان کے حواریوں کے مستند ملفوظات ہیں بلکہ فرقوں اور اشخاص کے خیالات کا مجموعہ ہیں جن میں ممکن ہے کہ کلام الٰہی اور ملفوظات عیسوی بھی پائے جاتے ہوں لیکن یہ معلوم کرنا کہ واقعی اللہ کا کلام اور حضرت عیسیٰ کا ملفوظ کون سا ہو ناممکن ہے لیکن پھر بھی عرصہ تک پادری اپنی ہٹ دھرمی سے انھیں لفظاً و معناً کلام الٰہی قرار دیتے رہے مگر علم و تحقیق کی روشنی میں ان کی ہٹ دھرمی چل نہ سکی اور بالآخر حقیقت واضح ہو گئی کہ موجودہ اناجیل تاریخی حیثیت سے ناقابل اعتبار ہیں۔ اور ان کا اکثر حصہ جعلی ہے۔[۲]

سلاطین، پیشوایان مذہب، عوام الناس اور کتب مقدسہ کے جو حالات اوپر کی سطور میں بیان کیے جا چکے ہیں ان کے ملاحظہ کے بعد مؤرخین کا یہ بیان حرف بحرف صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے وہ اس کے لیے باعث ننگ ہے"۔[۳] ان حالات میں نہ انسانیت کی کوئی خدمت ممکن تھی اور نہ اصلاح حال کا کوئی امکان تھا۔ لوگ سخت پریشان تھے اور بےچینی کے ساتھ ایسے نجات دہندہ [illegible] جو انکو ان کے مصائب سے نجات دے اور اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شمع ہدایت روشن کرے

(ختم)

۱؎ تاریخ صحف سماوی بحوالہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا و تاریخ انجیل برکٹ و تاریخ کلیسا یوسی۔ لبن ۲؎ تاریخ الصحف سماوی بحوالہ واٹسن، برکٹ، ہارنک، بائیل اور ولہاسن ۳؎ سیرۃ النبی جلد چہارم ص ۲۲۵

رِفاہی خِدمات میں مُسلمانوں کا حِصّہ

اِسلامی تاریخ کا ایک دل آویز باب

ازڈاکٹر مصطفےٰ السباعی (مرحوم)[1]

قوموں کی ترقی اور شائستگی، زندگی کے لیے اُن کے حق اور عالمی قیادت کے لیے اُن کی صلاحیت کا سب سے بڑا ثبوت اُن کے افراد کا وہ انسانی جذبہ فراہم کرتا ہے جو کسی امتیاز کے بغیر سماج کے ہر طبقے کو اپنی آغوش میں جگہ دے، بلکہ روئے زمین کے ہر انسان ہی نہیں، ہر جاندار تک کے لیے اس کا فیض عام ہو۔ کسی قوم کی تہذیب کا یہی وہ عنصر ہے جو اُسے بقائے دوام عطا کرتا ہے اور دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں افضلیت کا مقام اس کے حصہ میں آتا ہے۔

ہماری قوم اس میدان میں جس بلندی تک پہونچی ہے، بلاکسی استثناء کے اُس سے پہلے کی قوموں اور اُمتوں میں سے کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہوئی ہے اور بعد والوں میں سے بھی اب تک بہرحال وہاں کوئی نہیں پہنچ پایا ہے۔

گزشتہ زمانوں میں قوموں اور تہذیبوں کا رفاہی اور خدمتی تصور اس قدر تنگ تھا کہ مدرسوں اور عبادت گاہوں سے زیادہ کوئی بات ذہن میں نہیں آتی تھی۔ اور زمانۂ حاضر میں اگرچہ مغربی قومیں،

---

[1] ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی جنھوں نے اب سے چند سال پہلے وفات پائی، دمشق یونیورسٹی کے پروفیسر اور جدید عالم عربی کے بلند پایہ مصنفین میں تھے۔ اُن کی ایک کتاب "مِن روائعِ حضارتِنا" دمشق ریڈیو سے نشر کی گئی تقریروں کے ایک سلسلے پر مشتمل ہے۔ ذیل کا مضمون اسی سے لیا گیا ہے۔ ع

اجتماعی اور عوامی اداروں کے ذریعہ اجتماعی ضروریات کی کفالت کرنے میں بہت دور تک آگے بڑھ گئی ہیں مگر وہ بے لوث انسانی جذبہ جو محض اللہ کی خوشنودی کے لیے حرکت میں آئے اور جو ہمارا اپنے دور عروج اور دور انحطاط دونوں میں امتیاز رہا ہے وہ ان کی دست رس سے ہنوز باہر ہے۔ اہل مغرب کے رفاہی اور خدمتی کاموں میں سب سے بڑا محرک جاہ طلبی، شہرت پسندی اور نام رہ جانے کی خواہش ہی ہوتی ہے جبکہ ہماری قوم میں اعمال خیر کا اوّلیں محرک اللہ عزوجل کی رضا جوئی تھی اور اس کے آگے اس بات کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ دوسروں کو ان کاموں کا علم ہوتا ہے یا نہیں۔

اس دعوے پر بس ایک ہی دلیل کفایت کر سکتی ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے تمام اموال امور خیر میں لٹائے، شام اور مصر کو خیراتی اداروں سے بھر دیا، مساجد مدارس اور مسافر خانوں کی کوئی شمار نہ رہی۔ لیکن کسی ایک پر بھی جو اپنا نام کندہ کرایا ہو، نام لکھوائے تو اپنے سپہ سالاروں کے، وزراء کے، دوستوں اور اعوان حکومت کے!

نفس کی آمیزش سے کارہائے خیر کے پاک ہونے کا اس سے بلند تر درجہ بھی کوئی تصور میں آ سکتا ہے؟

دوسرا مابہ الامتیاز ہمارے اور اہل مغرب کے درمیان یہ ہے کہ اہل مغرب اپنے رفاہی اداروں سے فیض یابی کو عموماً اپنے اہل ملک تک محدود رکھتے ہیں، جبکہ ہمارے ایسے اداروں کے دروازے ہر انسان کے لیے کھلے ہوتے تھے، نہ نسل کا کوئی امتیاز تھا، نہ وطن کا اور نہ زبان اور مذہب کا۔

تیسرا ایک فرق اور ہے۔ ہم نے اپنے دور میں امور خیر کے ایسے ایسے پہلو نکالے اور ان کے لیے ادارے قائم کیے جن تک آج بھی اہل مغرب کا خیال نہیں پہنچا ہے۔ یہ پہلو آج بھی سامنے آتے ہیں تو نظر حیران رہ جاتی ہے۔ اور اس امر کی ایک تابناک دلیل فراہم ہوتی ہے کہ انسان دوستی کے جذبے کی لطافت اور وسعت میں مسلمانوں کا مرتبہ دوسروں سے کس قدر بڑھا ہوا تھا

امور خیر کے لیے اپنے دور کے اجتماعی اداروں کا، جو تھوڑا سا تذکرہ ہم یہاں کرنا چاہتے ہیں اس سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس میدان میں اپنی تہذیب کے مبادیات کا تعارف کرا دیا جائے ہم نے جو کچھ بھی نقوش اس میدان میں ثبت کیے ہیں وہ سب انھیں بنیادی افکار اور بنیادی تربیت کا فیض ہے۔

اسلام نے جب امورِ خیر کے لیے پکار دی تو ایسے فکری عناصر اُس میں شامل کر دیے کہ انسان کے دل میں بخل وحرص کا جو جذبہ سر اٹھا سکتا تھا اور فقر کے خوف کا جو وسوسہ شیطان کی کارفرمائی سے دخل انداز ہو سکتا تھا وہ وہیں بیدم ہو کر رہ گیا، قرآن نے جب انفاق کی ترغیب دی تو ساتھ ہی کہا۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝	شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا ہے اور حکم دیتا ہے تمہیں بخل کا۔ اور اللہ وعدہ کرتا ہے تم سے اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے اور زیادہ دینے کا۔ اور اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا جاننے والا ہے۔
البقرہ۔ آیت ۲۶۸)	

اس دعوت کا رُخ قرآن میں ہر انسان کی طرف ہے، چاہے غنی ہو چاہے فقیر، غنی اگر اپنے مال اور اپنی وجاہت سے کارِ خیر میں حصہ لے سکتا ہے تو فقیر اور بے زر کے لیے بھی اُس کا ہاتھ ہے، اُس کا دل ہے، اُس کی زبان ہے اور اُس کی محنت ہے جسے وہ اس دعوت کی نذر کر سکتا ہے۔ اس طرح اسلام کسی انسان کو یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتا کہ وہ کارہائے خیر میں حصہ لینے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

قرآن میں جب انفاق کی دعوت شروع ہوئی تو فقرائے اسلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گلہ کیا کہ یہ میدانِ سعادت تو تمام تر اہلِ ثروت کے ہاتھ رہے گا۔ آنحضرت نے جواب میں فرمایا کہ نہیں کارِ خیر کا وسیلہ صرف مال ہی نہیں ہے کیونکہ ہر وہ بات جس سے لوگوں کو نفع پہنچے وہ کارِ خیر ہے۔

"تمہارے لیے ہر کلمۂ تسبیح میں صدقہ کا ثواب ہے، ہر نیکی کی وصیت میں صدقہ کا ثواب ہے، ہر برائی کی روک ٹوک میں صدقہ کا ثواب ہے۔ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹا دینے میں صدقہ کا ثواب ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان صفائی کرا دینے میں صدقہ کا ثواب ہے، کسی کو سواری پر سوار ہونے میں مدد دیدو تو یہ بھی کچھ کم صدقہ نہیں ہے۔"

(بخاری ومسلم)

اسلام کی اس تعلیم نے کارِ خیر کے دروازے بلا کسی امتیاز کے ہر انسان پر کھول دئے۔ اب ایک

مزدور بھی اس میں حصہ لے سکتا ہے۔ ایک تاجر اور کاشتکار بھی لے سکتا ہے۔ استاذ بھی لے سکتا ہے اور طالب علم بھی لے سکتا ہے۔ عورت بھی لے سکتی ہے۔ بوڑھا اور معذور بھی لے سکتا ہے۔ ان کے اقتصادی احوال ذرا بھی اس میں مزاحم نہیں کہ نیکی اور بھلائی کی خدمت اپنے سماج میں کریں۔

ایک دوسری بات جو اسلام اپنے ماننے والوں کے دل میں بٹھا کر انھیں انسان دوستی کے بلند ترین افق تک اٹھا دیتا ہے۔ اس کی یہ دعوت ہے کہ نیکی اور بھلائی کے معاملے میں کوئی تفریق بندگان خدا کے ساتھ مت کرو۔ پس ارشاد ہوتا ہے کہ

"مخلوق سب اللہ کا کنبہ اور عیال ہے۔ اس لیے اللہ کو سب سے محبوب وہ آدمی ہے جو اس کے عیال کے لیے زیادہ نفع بخش ہو۔"

(طبرانی و مسند عبدالرزاق)

اور آخری بات جو ان مبادیات اور ذہنی تربیت کے سلسلہ میں دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ اسلام نے اُس تمام صرف و انفاق کو جو ایک آدمی راہِ خیر میں کرتا ہے اُس کے ذاتی نفع کا کام ٹھہرا کر ایک محبوب ترین کام اُسے بنا دیا ہے۔ وہ کہتا ہے

(۱) وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ — اور جو کچھ مال خرچ کرو گے تم سو اپنے ہی
(البقرہ آیت ۲۷۲) — واسطے۔

(۲) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ — جو شخص اچھا عمل کرے گا سو اپنے ہی
(سورۂ فصلت ۴۶) — واسطے۔

انسان فطرۃً خود ... ہے۔ ہر چیز سے پہلے اپنے آپ پر اُس کی نظر جاتی ہے۔ اس فطری پس منظر میں دیکھیے کہ یہ اسلوب ترغیب تاثیر کی کیسی صلاحیت رکھتا ہے۔ اب بخیل بھی آمادۂ سخاوت ہو سکتا ہے۔ ایک حریص کی گرہ بھی اب کھلے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور جہاں اولاد و اقارب مدد کے روادار نہ ہوں گے وہاں یہ حریص اور بخیل طبیعت لوگ غیر ہوتے ہوئے بہت کچھ کر گزریں گے۔

قرآن کی جب یہ آیت نازل ہوئی کہ

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا — کون ایسا ہے جو اللہ کو اچھا قرضہ قرض دے پھر اللہ اُسے بڑھا کر اس کے لیے

كَثِيرَةً (البقرہ۔ ۲۴۵) کئی گنا کر دے۔

تو صحابی ابو الدحداح رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا اللہ بھی اپنے بندوں سے قرض چاہتا ہے؟ آپ نے فرمایا' ہاں! ابو الدحداح نے عرض کیا حضور اپنا ہاتھ لائیے۔ اور آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر، آپ کو گواہ بنایا کہ انھوں نے اپنا وہ باغ صدقہ کر دیا ہے جو بلا شرکت غیرے اُن کا تھا اور جس میں سات سو پھلدار کھجور کے درخت ہیں۔ یہ کر کے وہ اپنی بیوی کے پاس گئے جو مع بچوں کے اسی باغ میں رہائش رکھتی تھیں۔ بیوی کو اس کارروائی کی خبر دی، اور انھوں نے یہ سنتے ہی باغ چھوڑ دیا اور بڑے اطمینان سے کہا کہ ابو دحداح آپ نے بڑے نفع کا سودا کیا ہے۔[1]

ایک اور آیت

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا	جب تک تم اپنی محبوب چیزیں خرچ نہ
تُحِبُّوْنَ (آل عمران)	کروگے کامل نیکی کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکوگے۔

نازل ہوئی تو صحابی ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور، میرا کنواں بَيْرُحَاء میرا سب سے زیادہ محبوب مال ہے اور یہ اللہ کے لیے صدقہ ہے میں اس کا نفع اللہ کے یہاں چاہتا ہوں۔ آپ اس کو جہاں چاہیں لگادیں — آنحضرتؐ نے فرمایا' رکو رکو! یہ بڑے کام کا مال ہے۔ یہ بڑے کام کا مال ہے ایسا کرو کہ ملکیت باقی رکھو' نفع صدقہ کردو۔ — یہ اسلام میں پہلا وقف تھا اور یہیں سے "وقف" کا ادارہ وجود میں آیا' جو ہمارے اجتماعی اداروں کی ریڑھ کی ہڈی تھی۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میدان میں اپنی اُمت کے لیے ایک بہترین مثال قائم کی۔ بعض صحابیین نے مرتے وقت سات باغوں کے بارے میں وصیت کی تھی کہ ان کا مصرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ آپ نے ان کو فقراء اور مجاہدین اور دوسرے اہل حاجت کے لیے وقف قرار دیا۔ آپ کی پیروی میں حضرت عمرؓ نے بھی اپنی خیبر کی زمین وقف کی۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ' حضرت عثمانؓ' حضرت علیؓ' حضرت زبیرؓ' حضرت معاذ وغیرہ نے وقف کیے۔ بلکہ کوئی صاحبِ استطاعت صحابی ایسا نہ رہا تھا جس نے کچھ نہ کچھ وقف نہ کیا ہو۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر

اس کے بعد حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک بار پھر وقف کرنے کا عمل زور شور سے شروع ہوا سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے ایک زمین وقف کی اور مہاجرین و انصار میں سے چند اصحاب کو بلا کر اس کا گواہ بنایا ان میں سے حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کا بیان ہے کہ میں کسی صاحبِ مقدرت صحابی رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نہیں جانتا جس نے اس کے بعد اپنا کوئی مال صدقۂ موقوفہ نہ قرار دیا ہو۔

وقف علی الخیر کا یہ دستور مسلمانوں میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہا، زمینیں، باغات، مکانات اور پن بداریں امورِ خیر کے لیے وقف کی جاتی تھیں، جس کے نتیجہ میں اسلامی معاشرے نے اتنی عام ضرورت کی چیزوں اور رفاہی اور خدمتی اداروں کا بندوبست کیا کہ شمار مشکل ہے۔

یہ ادارے دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک وہ جنھیں حکومت قائم کرتی تھی اور بڑے بڑے وقف حکومت کی جانب سے اُن کے لیے ہوتے تھے۔ دوسرے وہ جنھیں اعیان سلطنت، امراءِ جیش اور عام اغنیاء، جن میں خواتین بھی شامل ہیں، ذاتی طور پر وجود میں لاتے تھے۔ اس مختصر گفتگو میں ان اداروں کی تمام قسمیں بیان کرنے کا وقت نہیں۔ بس جو زیادہ اہم ہیں اُن کا کچھ تذکرہ یہاں ہوگا۔

۱۔ اس فہرست میں مساجد کا نمبر سب سے پہلا ہے۔ لوگ اس کام میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بادشاہوں تک کو ذوق تھا کہ مساجد کی عظیم الشان تعمیرات میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہیں۔ اس ضمن میں صرف ولید بن عبدالملک کی طرف اشارہ کافی ہوگا۔ جس نے جامع اُموی (دمشق) کی تعمیر میں اس قدر مال خرچ کیا اور اتنے آدمیوں نے اس تعمیر کا کام انجام دیا کہ یقین آنا مشکل ہوتا ہے۔

دوسرا نمبر مدارس اور شفا خانوں کا ہے۔ جس کے لیے الگ ایک بیان کی ضرورت ہے اور اس کی تفصیل ہم وہیں کریں گے[1]

مدرسوں اور شفا خانوں کے علاوہ سرائیں اور مسافر خانے بنائے جاتے۔ تکیے اور خانقاہیں اُن بندگانِ خدا کے لیے قائم کی جاتی تھیں جو یادِ الٰہی کے لیے گوشۂ عزلت کے خواہاں ہوں۔ ان غریبوں کے لیے مکانات بنائے جاتے تھے جو نہ مکان خرید سکتے ہوں نہ کرائے پر لے سکتے ہوں

---

[1] کتاب میں مدارس اور شفا خانوں کا بیان الگ موجود ہے۔ (مترجم)

عام راستوں پر سبیلوں کا بند و بست کیا جاتا تھا۔ عوامی لنگر خانے قائم کیے جاتے تھے جہاں سے روٹی، گوشت اور کوئی میٹھا ضرورتمندوں کو تقسیم ہوتا۔ سلطان سلیم کے تکیے اور شیخ محی الدین کے تکیے میں ابھی قریبی زمانے تک ایسے لنگر خانے دمشق میں موجود تھے۔ حاجیوں کے لیے مکہ مکرمہ میں اقامت گاہیں اسی ضمن میں بنوائی جاتی تھیں اور اس کثرت سے بنوائی جاتی تھیں کہ سرزمین مکہ پر کوئی چپہ مشکل سے باقی رہا ہوگا۔ بعض فقہاء نے اسی بنا پر ایک زمانے میں مکہ کے مکانات کرائے پر اٹھانا باطل قرار دیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ سب حجاج کے لیے وقف ہیں۔ جنگلوں میں کنوئیں کارخیر کے طور پر کھدائے جاتے تھے تاکہ اہل حاجت کی کھیتیاں، مویشی اور راہ گیر سیراب ہوسکیں۔ بغداد اور مکہ کے راستے پر، دمشق اور مدینے کے راستہ پر اور مختلف اسلامی شہروں، قریوں اور خاص کر راجدھانیوں کے درمیانی راستوں پر اس کارخیر کی اس قدر کثرت تھی کہ شاذ و نادر ہی کبھی کوئی مسافر ان ایام میں پیاس اور پانی کی نایابی سے دوچار ہوا ہوگا۔ بیرونی حملوں کی روک تھام کے لیے جو سپاہ اسلامی سرحدوں پر جگہ جگہ متعین ہوتی تھی، اس کے لیے قیام گاہیں لوگ فی سبیل اللہ بنواتے تھے۔ اور یہاں صرف قیام ہی کا نہیں، کھانے پینے سے لیکر اسلحہ اور رسد کے ذخیروں تک کا بند و بست کیا جاتا تھا۔ عباسی دور میں رومی حملوں کی مدافعت اور جنگہائے صلیبی کے دور میں شام و مصر پر فرنگیوں کی یورشیں روکنے میں ان فی سبیل اللہ انتظامات کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ مستقل اوقاف مجاہدین کو گھوڑے، تلواریں اور نیزے وغیرہ آلات حرب مہیا کرنے کے لیے قائم تھے۔ جس سے ہمارے دیار میں جنگی صنعت کو بڑا فروغ ہوا، حتیٰ کہ صلیبی لڑائیوں کے دور میں جب کوئی صلح کا وقت ہوتا تو اہل فرنگ خاص طور سے ہتھیار خریدنے کبھی ہمارے ہی پاس آتے تھے۔ اور علماء کو فتویٰ دینا پڑا تھا کہ ان کے ہاتھ اسلحہ کی فروخت حرام ہے۔

کچھ خاص وقف اس ضمن میں ایسے بھی تھے، جن کی آمدنی ایسی اتفاقی صورتوں میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف تھی جبکہ مملکت اُن تمام لوگوں کے لیے بند و بست سے قاصر ہو جو جہاد پر جانا چاہیں......

بہت سے اوقاف راستوں اور پُلوں کی درستی کے لیے ہوتے تھے۔ بہت سے لوگ قبرستان کے لیے زمینیں وقف کرتے تھے۔ نادار میتوں کی تجہیز و تکفین اور مصارف دفن کے لیے بھی اوقاف تھے۔

ان سب کے علاوہ اہل ضرورت کی پوری پوری سماجی کفالت کے نقطۂ نظر سے جو خیراتی ادارے ہمارے یہاں وجود میں آئے اُن میں پڑے ملے بچوں اور یتیموں کی پرورش کے ادارے تھے۔ نابیناؤں

معذوروں اور از کار رفتہ بوڑھوں کی کفالت کے ادارے تھے جہاں اُن کی زندگی کے دن ہر ممکن عزت اور سہولت کے ساتھ گزر جاتے تھے۔

بعض ادارے مخصوص طور سے قیدیوں کی خبر گیری کے لیے تھے جن سے دوسری اعانتوں کے علاوہ اُن کی صحت برقرار رکھنے کے لیے مناسب غذا کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔ حد یہ ہے کہ نابیناؤں کی رہبری اور معذوروں کی خدمت کے لیے اُن کے گھروں پر آدمی مقرر کرنے والے ادارے بھی ہمارے یہاں قائم کیے گئے ہیں۔

جوان لڑکے اور لڑکیاں جو نہ خود شادی کا بار اُٹھا سکتے ہوں اور نہ اُن کے سرپرست اس قابل ہوں اُن کی ضروری مدد کرنے کے لیے ادارے تھے جو مہر تک کی ادائیگی کا بندوبست کرتے تھے۔

بچوں کے لیے مفت دودھ فراہم کرنے والے ادارے آج کی دین سمجھے جاتے ہیں، لیکن ہمارے یہاں اس سے کہیں پہلے دودھ اور شکر دونوں کا انتظام کرنے والے ادارے رہ چکے ہیں جنمیں للّٰہیت کا عنصر مزید تھا۔ سلطان صلاح الدین کا جو قلعہ آج بھی دمشق میں موجود ہے اُس کے ایک دروازے پر ایک طرف ایک پرنالہ تھا جس سے دودھ بہایا جاتا تھا، دوسری طرف دوسرا پرنالہ، جس سے پانی میں گھلی ہوئی شکر بہہ کر آتی تھی۔ ہفتہ میں دو دن مقرر تھے کہ مائیں آئیں اور بچوں کے لیے جس قدر دودھ اور شکر کی ضرورت ہوتی یہاں سے لے جائیں۔

اور اس ندرت خیال کا تو جواب ہی امور خیر کی تاریخ میں نہیں کہ وقف کی ایک قسم نازک پلیٹوں اور تشتریوں کے لیے تھی کہ کسی بچے یا خادم سے راستے میں کوئی قیمتی پلیٹ یا تشتری گر کر ٹوٹ جائے تو وہ سیدھا اس ادارے میں چلا آئے اور ٹوٹی ہوئی کی جگہ نئی لیکر اس طرح گھر واپس جائے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

سب سے آخر میں ان اداروں کی ایک قسم اور سن لیجیے۔ یہ وہ ادارے تھے جو بیمار اور کمزور جانوروں کے علاج اور پرورش کے لیے قائم تھے۔ دمشق کا ادارہ "مرج اخضر" جس کی جگہ پر آج اسٹیڈیم بن گیا ہے اسی نوعیت کا ایک ادارہ تھا۔ الغرض عمر رسیدہ اور کمزور و بیمار جانوروں کے لیے مستقل وقف تھے جن سے اُن کے آخر دم تک اُن کی ضروریات پوری کی جاتی تھیں۔

تو یہ تھیں قسم کے خیراتی اور کفالتی ادارے ہوئے جن کا یہاں ذکر کیا گیا کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن نے انکو وجود دیا کیا انکی واقعی معنٰی میں کوئی مثال ہم سے پہلے ملتی ہے؟ اور کیا آج بھی انھیں سے بہت سوں کی نظیر موجودہ تمدن کے پاس ہے؟

اِسلام یا عیسائیت؟

موجودہ دور میں رہنمائی کے قابل کون!

(از مولانا محمد تقی امینی، ناظم سنّی دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا اپنی تمام تر ترقیات کے باوجود عقل کو جذبات پر فتحمند بنانے کے لیے اب تک کوئی "آلہ" ایجاد نہیں کر سکی۔ اسی طرح قومی و وطنی حد بندیوں سے بلند ہو کر عقل کو محبت و مروّت کا "زاویۂ نگاہ" دینے کے لیے کوئی معقول تدبیر نہیں سوچ سکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آئے دن فطرت انسانی کو چیلنج دینے والے بے شمار مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں اور انسانیت کی نئی تعبیر و توجیہ کے باوجود وہ حل ہوتے نہیں نظر آ رہے ہیں۔ نیز رفتہ رفتہ زندگی میں ایسے جراثیم سرایت کرتے جا رہے ہیں جن کی وجہ سے موجودہ تہذیب بوسیدہ اور تمدن خود تمدن کا دشمن بن رہا ہے۔

اس صورت حال کو ظاہر بیں اور سطحی نظریں اگرچہ ابھی نہیں محسوس کر رہی ہیں لیکن حقیقت بیں نظروں سے یہ پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ اس سے سخت مضطرب اور انجام سے نہایت خائف ہیں جیسا کہ وقتاً فوقتاً ان کے بیانات سے وضاحت ہوتی رہتی ہے۔ یہ صورت حال زیادہ دن نہ برداشت ہو سکے گی۔ چار و ناچار آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھی ہوئی انسانیت کے تحفظ و بچاؤ کی فکر ہو گی۔ اور پھر ایسی رہنمائی کی تلاش ہو گی جو جذبات کی سرمستیوں اور شعلہ باریوں کو روک لگا سکے نیز عقل کو قلب کی تربیت گاہ میں لے جا کر عمومی محبت و مروت کی چاشنی اس کو عطا کر سکے۔

اس قسم کی رہنمائی مذہب کے دامن میں پناہ لینے ہی سے میسر آ سکتی ہے کہ اس میں انسان کو حقیقت بینی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور زندگی کے باریک تاروں کے عمل و ردِ عمل کا جائزہ لے کر

حالات و مسائل میں رہبری کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں تاریخ و فلسفۂ تاریخ کی شہادت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ انسان اپنی زندگی اور اس سے متعلق مسائل حل کرنے میں مسلسل گردش سے گزرتا رہا ہے۔ افراط و تفریط کی مختلف راہوں سے گزر کر بالآخر اس منزل پر پہونچا ہے جہاں سے گردش کی ابتدا ہوتی تھی۔

اس دور کا انسان بھی مختلف راہوں اور "ازموں" کا تجربہ کر کے انتہا کے قریب آپہونچا ہے۔ جب یہ انتہا اپنے تکمیلی مراحل طے کرے گی تو پھر ابتدا اسی مقام سے ہوگی جس کا نقطۂ آغاز "مذہب" تھا اور اس میں انسان کی اصل "نورانی" تھی۔ یہی مقام ہوگا کہ انسان کی رہنمائی کے لیے مذہب کی روشنی میں عقل و قلب کا "آمیزہ" تیار ہوگا۔ اور پھر موجودہ مادیت، روحانیت کی چاشنی حاصل کر کے انسان کو معراج کمال پر پہونچانے کے قابل بن سکے گی۔ جیسا کہ دور اول میں اس وقت کے لحاظ سے یہ کمال حاصل ہو چکا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عرصہ سے مذہب کے نام پر عمومی حیثیت سے اس کی جس طرح نمائندگی ہو رہی ہو وہ واقعی اس قابل نہیں کہ انسان کے اندر افادیت و صلاحیت کے جوہر نمایاں کر کے اقدام، عزم، شجاعت وغیرہ زندگی کے عناصر پیدا کرے اور کسی خوش آئند حال و مستقبل کی نشان دہی کرے۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ موجودہ سیاست نے انسان کے کل پرزے اس قدر ڈھیلے کر دیے ہیں کہ وہ حد سے زیادہ خود غرض اور ناعاقبت اندیش بن گیا ہے۔ اس کے اندر انتہائی سطحیت اور خود فریبی آگئی ہے جس کی بنا پر مذہب کی گہرائی وعالی حوصلگی کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

لیکن یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں" ہے زندگی کے بہت سے مسائل حل کرنے کے لیے ایمان و وجدان کی نگاہ کے بغیر چارہ نہیں رہ گیا ہے جس کی سچی نمائندگی سچا مذہب ہی کر سکتا ہے جو غیر شعوری طور پر حقیقت کا احساس پیدا کر کے اس تک پہونچاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ دنیا نے کسی ناگہانی و اتفاقی حادثہ کی بنا پر نہیں بلکہ فطری رفتار کے مطابق بتدریج مادی ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ معلومات و انکشافات کے نئے وسائل و ذرائع نے انسان کے ذہن و مزاج میں بڑی حد تک تبدیلی کر دی ہے۔ اب وہ ہر چیز کو تجربہ کی کسوٹی پر کسنے اور افادیت و صلاحیت کے پیمانے سے ناپنے لگا ہے ایسی حالت میں یہ توقع رکھنا

فضول ہے کہ جب وہ مذہب کی طرف مائل ہوگا تو ہر مذہب یا اس کی ہر بات کو بغیر سوچے سمجھے قبول کرلے گا۔ اور ٹکراؤ کی صورت میں علم و تحقیق کے مسلمہ ذخیرہ کو نذر آتش کردے گا۔ بلکہ اس کی نظر میں وہی مذہب قابل قبول بن سکے گا۔ جو علم و حکمت کا علمبردار اور افادیت و صلاحیت کے پیمانہ پر ٹھیک اترتا ہو اور وہی بات قابل وقعت بن سکے گی جو عقل و تجربہ کی کسوٹی پر کسے جانے کے لائق ہو۔

مذاہب عالم کی موجودہ تعلیمات کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مذکورہ معیار کے مطابق ہونے کی صلاحیت آخری مذہب (اسلام) کی تعلیمات ہی میں ہے۔

اس نے اپنے دور اوّل میں انسان کی داخلی تبدیلی کے ذریعہ زندگی کے ان "تاروں" کو چھیڑنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی جو عقل کو جذبات پر فتحمند بناتے اور اس کو عمومی محبت و مروت کی چاشنی عطا کرتے ہیں۔ اس کی تعلیم زندگی کے کسی ایک گوشہ تک محدود نہ تھی بلکہ اجتماعی و تمدنی زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی تھی اور وہ ان کے مسائل کو عدل و رحمت کی فضا میں حل کرتا تھا نیز وہ مطالعۂ فطرت کا داعی اور "معجزات" کے ذریعہ بعد کے سائنٹفک دور کی نشاندہی کرنے والا تھا۔

چنانچہ جن لوگوں نے اسلامی تعلیمات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے انھیں اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ سائنٹفک دور کا آغاز چودھویں صدی عیسوی سے نہیں بلکہ نزول قرآن کی تاریخ (چھٹی صدی عیسوی) سے ہوا ہے اسی نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کی ساری چیزیں (ذرہ سے لے کر آفتاب و ماہتاب تک) اپنی اصلی ساخت اور مقصد کے لحاظ سے انسان کی خدمت گزاری کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ اور انسان کو یہ اہلیت دی گئی ہے کہ وہ عقل و تجربہ کی رہنمائی سے ان پر قابو حاصل کرکے اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ دنیا کے دیگر مذاہب سائنس کے عناصر کو انسانی قوت سے زیادہ اور مقدس اشیاء سمجھ کر ان کی پرستش کرتے تھے یا مطالعۂ فطرت کو مذموم سمجھ کر اس کی جانب توجہ کرنے والے کا بھوت پلید سے تعلق جوڑتے تھے۔

اسلام کے اسی نظریہ کے تحت بعد کے ہر دور میں اس کی صلاحیت و ضرورت کے لحاظ سے کام ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ یورپ کو یہ نظریہ دے کر اس قابل بنایا کہ وہ "نشأۃ ثانیہ" کی بنیاد رکھ سکے اس سلسلہ میں یورپ کے مختلف محققین و مؤرخین مثلاً جان ڈیون پورٹ، رینان اور ڈاکٹر جوزیف ہیل وغیرہ نے اس قدر مواد فراہم کردیا ہے کہ ثبوت کے لیے مزید شہادت کی ضرورت نہیں

باقی رہ گئی[1]

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مطالعۂ فطرت کی طرف دعوت کے باوجود اسلام کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ سائنس و طبیعیات کے نئے نئے فارمولے وضع کر کے نوع بہ نوع رازہائے فطرت کے انکشاف کو اپنے ذمہ لے۔ بلکہ اس کا اصل منصب یہ ہے کہ خود انسان کو اس کے اصلی رنگ و روپ میں پیش کرے۔ اس کی تخلیقی توتوں کو فطری صداقتوں کی شاہراہ دکھائے۔ غیر فکری و عملی زندگی کے صحیح حدود متعین کر کے نظم و ضبط اور صلاحیتوں کے استعمال کرنے کے اصول سمجھائے تاکہ انسان دنیا میں اپنے مقام اور کام کی سمتوں کا تعین کر کے اپنے فرائض کی ٹھیک بجاآوری کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مادی ترقیات میں صرف مرکز اور سمت متعین کرنے پر اکتفا کیا اور حالات و زمانہ کے تقاضہ کی مناسبت سے عقل و تجربہ کی رہنمائی کو کافی قرار دیا کہ مرکز اور سمت کے تعین کے بعد استعمال کے مضر اثرات سے تحفظ کا بڑی حد تک اہتمام ہو سکتا ہے۔

مذہب عیسائیت کی اصل تعلیم میں بے شک اپنے دور کے تمدنی و اجتماعی مسائل حل کرنے کی صلاحیت تھی جیسا کہ ڈاکٹر جوزیف ہیل کی تحقیق ہے۔

"انبیاء و رسل اور بانیان مذہب نے اپنے زمانہ اور اپنی قوم کی تہذیب و تمدن میں حصہ لیا ہے لیکن جو عالمگیر تبدیلیاں اسلام سے براہ راست نہایت سرعت کے ساتھ مرتب ہوئی ہیں ان کی نظیر اور کسی مذہب میں نہیں ملتی۔"[2]

مذہب کی تاریخ میں بھی اس کی شہادت موجود ہے چنانچہ۔

وكذالك كل نبي استخلفهم في عمارة الارض وسياسة الناس وتكميل نفوسهم وتنفيذ امره فيهم[3]

(اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو زمین کی آبادکاری میں لوگوں کی سیاست میں ان کے نفوس کی تکمیل میں اور ان میں اللہ کا حکم نافذ کرنے میں اپنا خلیفہ بنالیا)

---

[1] اس سلسلہ میں راقم الحروف کی کتاب "عروج و زوال کا الٰہی نظام" کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔

[2] تمدن عرب صفحہ ۲۳ [3] بیضاوی ص ۵۹

ان تصریحات کی موجودگی میں "روسو" کا یہ قول بے بنیاد ہے کہ

حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں ایک روحانی سلطنت قائم کرنے کے لیے تشریف لائے جس نے مذہبی اور سیاسی نظام کو جدا کر کے ریاست کی وحدت ختم کر دی اور اندرونی تفرقے پیدا کر دیے جنھوں نے عیسائی اقوام کو کبھی چین نہ لینے دیا۔[1]

دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں دین اور دنیا مذہب اور سیاست کی تفریق نہ تھی بعد میں اُن کے ماننے والوں نے تفریق پیدا کی، اس بنا پر روسو کا الزام حضرت عیسیٰ پر نہیں بلکہ اُن کے ماننے والوں پر درست ہو سکتا ہے۔ مغالطہ کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت کے نام پر مروجہ مذہب کو اصل مذہب سمجھ لیا گیا اور پھر اس پر الزام کی ایک مستقل عمارت تعمیر کر دی گئی، حالانکہ اصل عیسائیت کو ابتدا ہی میں یہودی مذہب و ذہنیت نے نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ادھر رومن حکومت کی بروقت پشت پناہی میسر نہ آنے کی وجہ سے تہذیب و تمدن میں اس کی تعلیمات جاری نہ ہو سکی تھیں۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت معتقدین و متبعین کے لیے نہایت روح فرسا اور مایوس کن تھی، حالات سے مجبور ہو کر "پولوس" نے یہی طریقہ کار آسان سمجھا کہ وہ مسیحی تعلیم کے صرف روحانی و اخلاقی حصہ پر زیادہ زور دیں اور شرعی و معاشرتی یا تہذیبی و تمدنی پہلو کو نظر انداز کر دیں۔ پھر یہودیوں کے مزاج میں جس قدر "سختی" پیدا ہو گئی تھی اور انھوں نے دین کی اصلی تعلیم اور روح کو پس پشت ڈال کر محض "مراسم" کی پرستش کو جس طرح اصل مذہب سمجھ لیا تھا اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ روحانیت پر اتنا زیادہ زور صرف کیا جائے کہ آنے والے دور میں اعتدال کے لیے راہیں ہموار ہو سکیں۔ چنانچہ موجودہ عیسائیت میں عفو و درگزر اور رحم و کرم وغیرہ کی بعض مثالیں اس قسم کی موجود ہیں جنھیں معتدل معاشرہ کے لیے کسی طرح موزوں نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ مسیحی تعلیم کے ساتھ ایک زیادتی یہ ہوئی کہ اس کی تدوین و حفاظت کا کوئی معقول بندوبست نہ ہو سکا۔ مسیحی مذہب کے بارے میں معلومات کے مستند ترین ذرائع چار انجیلیں مانی جاتی ہیں۔ (۱) متی (۲) مرقس (۳) لوقا (۴) یوحنا۔ ان کی

---

[1] معاہدہ عمرانی ص ۲۳۸

حیثیت کلام الٰہی یا کلام مسیح علیہ السلام کی نہیں بلکہ انسائیکلوپیڈیا کی تصریح کے مطابق ان چار تذکروں کی ہے جو عہد نامہ جدید میں مسیح کی زندگی، تعلیمات اور کردار کے متعلق ملتے ہیں۔ پھر ان کے مصنفین کی زندگی کے بارے میں اب تک تفصیلی تحقیق نہ ہو سکی کہ یہ کون لوگ تھے؟ ان کو حضرت مسیح یا ان کے کسی حواری کی صحبت میسر آئی تھی یا نہیں؟ ویسے بھی یہ کتابیں نہ سریانی زبان میں تھیں اور نہ عبرانی زبان میں (یہ اس وقت کی مذہبی زبانیں تھیں) بلکہ مسیح علیہ السلام کے زمانہ کو ایک مدت گزرنے کے بعد یونانی زبان میں لکھی ہوئی ملیں۔ بغرض یہ وجوہ و اسباب تھے جن کی بنا پر مسیح علیہ السلام کی اصلی تعلیم کے کل حصے منظر عام پر نہ آسکے۔ اور موجودہ دنیا کے "قاموس نگاروں" کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ "وہ صرف روحانی سلطنت قائم کرنے آئے تھے اور مذہبی و سیاسی نظام میں جدائی کر کے ریاست کی وحدت مادی اور اندرونی تفرقہ پیدا کر گئے"

اس میں شک نہیں کہ "لوتھر" کی اصلاحی تحریک سے بعض اصلاحات ضرور ہوئیں لیکن یہ اصلاحات بھی عیسوی مذہب کو جدید زندگی کی رہنمائی کے قابل نہ بنا سکیں۔

یہ تحریک دراصل پوپ کے خلاف صدائے احتجاج پر مبنی تھی اور ردِ عمل کے طور پر چند خرابیوں کے دور کرنے ہی میں اس کا اثر ظاہر ہوا تھا۔ مثلاً پوپ کی غلامی کا جوا اتار پھینکا گیا تھا، گرجا سے حضرت مریم و عیسیٰ علیہ السلام کے مجسّمے نکالے گئے تھے اور بعض اس قسم کے مسائل کی اصلاح ہوئی تھی جن کا زندگی کے حقائق سے زیادہ تعلق نہ تھا، اس تحریک نے نہ فکر و عمل کا مستقل نظام پیش کیا تھا اور نہ اس نے عیسوی مذہب کا تعلق عوام کی ضرورتوں اور اُن کے اجتماعی و تمدنی مسائل سے جوڑا تھا۔ اس بنا پر اس کے ذریعہ جدید زندگی کی رہنمائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن خوش قسمتی سے اس تحریک کو ایسا دور نصیب ہوا جبکہ یورپ میں زندگی کے آثار نمایاں تھے اور اس کی اندرونی قومیں زوال کی انتہائی منزلوں سے گزر کر مائل بہ عروج تھیں اس بنا پر عمومی حیثیت سے اس کے اثرات خوش آئند ثابت ہوئے ـــــ پھر قوم جب ابتدائی مرحلوں سے گزر کر اپنی ضرورتوں اور اجتماعی و تمدنی مسائل حل کرنے کی طرف متوجہ ہوئی تو اس کی تنگ دامنی حائل ہوئی اور مجبوراً اس کو سیکولرزم و کمیونزم وغیرہ کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔ اگر عیسائیت میں رہنمائی کی صلاحیت ہوتی تو جدید زندگی کو کسی "ازم" میں پناہ لینے کی ضرورت نہ ہوتی[1]

---

[1] مزید تفصیل کے لیے راقم کی کتاب "لا مذہبی دور کا تاریخی پس منظر" مطالعہ کرنا چاہیے۔

ارشاداتِ حکیم الامت حضرت تھانویؒ

مجالسِ لکھنؤ میں

تلخیص ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

——(۳)——

ایک مدرسے میں طلباء کی شورش کا حال سُن کر فرمایا، کہ مدرسے والے بھی بہت ڈھیلے ہیں سب کو نکال باہر کریں ——— مدرسے والوں کا سب کا یہی حال ہوتا ہے۔ جب میں ایک مدرسے میں تھا تو مجھے بھی کچھ کچھ خیال ہوتا تھا کہ چندہ بند ہو جائے گا (در چندہ ہوتا ہے تکثیر سواد سے (جماعت طلباء کی کثرت سے) لیکن تکثیر سواد خود مقصود ہی نہیں۔ مقصود تو (رضائے الٰہی کو نحو نظر رکھتے ہوئے) یہ ہے کہ آدمی کام کے پیدا ہوں اور جو کام نہ کریں اُن کو نکال باہر کرنا چاہیے۔ اگر کم ہو جائیں گے ——— ہو جائیں ......
ہمارے اکابر کے زمانہ میں بڑے بڑے مدرسوں میں ساٹھ ستر طلبہ سے زیادہ نہ ہوتے تھے۔ مگر ان میں سے ایسے ایسے نکلتے تھے کہ جُنیدِ وقت ہوتے تھے ——— سادگی اتنی تھی کہ اگر کسی کتاب کی غلطی درست کرنی ہوتی تھی تو دفتر سے قلم دوات مانگ کر غلطی بناتے تھے، اور اب تو تقریباً ہر حجرے کے سامنے سائیکل نظر آتی ہے اور کتابیں طاق میں سجی رکھی رہتی ہیں، اور کئی کئی طرح کے قلم مع روشنائی مہیا رہتے ہیں۔ مگر کام کے لیے نہیں بلکہ یہ بھی ایک فیشن ہو گیا ہے۔

اسی سلسلے میں فرمایا کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے زمانۂ شورش میں حضرات مدرسہ (دیوبند) کو ایک رائے تحریر فرمائی تھی کہ مدرسین، مہتمم کے کاموں میں دخل نہ دیں اپنا کام کیے جائیں۔

مگر اب تو طالب علم، مہتمم کے کاموں میں دخل دیتا ہے۔ یہ حریت ہے۔ لوگوں کا مذاق ہی بگڑ گیا ہے۔ اور ایسا بگڑا ہے کہ شور و شر کو حیات سمجھتے ہیں اور سکون کو موت۔ یعنی وہ زندہ ہی کیا ہوا جو حرکت نہ کرے۔ اور حرکت بھی کرے تو ایسی ——— ان کے نزدیک جس طرح سکون منافی ہے حیات کے، اسی طرح حرکت مستقیمہ (سیدھی سادی) بھی (منافی حیات ہے) بس حرکت غیر مستقیمہ کو حیات سمجھتے ہیں۔

فرمایا کہ ایک صاحب کا خط آیا کہ میں نے ایک رسالہ لکھا ہے، اس پر نظر اصلاح کر دو۔ میں نے جواب لکھا کہ مجھے تو فرصت نہیں اور دوسروں سے بلا معاوضہ کام نہیں لیتا۔ اگر معاوضہ دو گے تو کسی سے کام کرا دوں گا۔ انھوں نے لکھا کہ بہت دین فروشی کر چکے ہو اب تو ایسا نہ کرو ——— پھر فرمایا کہ ایسے لوگوں سے رنج نہیں ہوتا ہے، رنج تو ہوتا ہے خلاف توقع سے۔ سو ان سے توقع ہی کیا تھی؛ اور جب کسی سے توقع ہی نہ رکھی جائے تو رنج بھی نہ ہوگا۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

پھر فرمایا کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت ہے کہ عجب کا علاج ہو جاتا ہے، جیسے بخار میں گولی مل جائے کنین کی تو بہت ہی اچھا ہے۔ اور یہاں تو (نعمت) کو مین کی ہے ـــ غرض ایسے اعتراضوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم ایسے ہیں۔ جیسے کوئی اختلافی مسئلہ (کہ اس صورت میں) اگر ایک معتقد ہے تو ایک غیر معتقد، اور یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ صواب (صحیح) کس کی رائے ہے۔ تو اس تردد سے عجب کا تو علاج ہو جاتا ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میں نے ۔۔۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے ایک دفعہ عرض کیا کہ حضرت حاجی صاحبؒ کی کچھ کرامتیں بیان کر دیجئے۔ جواب میں فرمایا کہ تم نے ایسی چیز کی فرمائش کی کہ میں نے حضرتؒ کو کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں پھر (حضرت مولانا گنگوہیؒ نے) فرمایا اگر ہم تتبع کرنا چاہتے تو ہزاروں کرامتیں جمع کر لیتے ـــ ۔ اصل میں صحیح پہچاننے والے اپنے بزرگوں کے یہ حضرات تھے۔

فرمایا ـــ مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحبؒ کبھی کبھی دہلی تشریف لاتے تھے اور یہ مولانا کی طالب علمی کے زمانے کا قصہ ہے ـــ مولانا اس وقت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے والد ماجد مولانا مملوک علی صاحبؒ سے پڑھتے تھے۔ مولانا مملوک علی صاحبؒ، درس کے بہت پابند تھے،

کبھی ناغہ نہ فرماتے تھے، مگر ایک بار حضرت حاجی صاحبؒ تشریف لائے تو مولانا نے فرمایا لو بھائی! حاجی صاحب آگئے اب سبق نہ ہوگا۔ ہم کو بڑا غصہ آیا کہ یہ کہاں کے حاجی صاحب آ گئے کہ (آج) سبق ہی کا حرج ہوگیا (یہ خبر نہ تھی کہ آئندہ ان سے تعلقِ بیعت قائم ہوگا اور سبق مقام فنا" لیا جائے گا)

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ مولوی (شاہ) سلیمان صاحب (پھلواروی مرحوم) مثنوی خوب پڑھتے تھے اور لوگ زیادہ تر اسی شوق میں ان کے وعظ میں بیٹھتے تھے، ان کا طرز اور آواز دونوں چیزیں اچھی تھیں ــــــ اسی سلسلے میں فرمایا کہ شاہ تجمل حسین، جو مولانا فضل الرحمٰن (گنج مرادآبادیؒ) کے خادموں میں سے تھے اور بڑے ظریف تھے وہ ہر چیز کی رجسٹری کیا کرتے تھے (یعنی اُن کا تکیہ کلام تھا کہ کسی چیز کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے یہ کہا کرتے تھے کہ میں اس چیز کی رجسٹری کرتا ہوں۔ (چنانچہ) ایک بار فرمانے لگے کہ میں مولانا احمد حسن صاحب (مُحدّث) امروہیؒ کے تو حسن کی رجسٹری کرتا ہوں (واقعی حضرت مُحدّث امروہیؒ بہت زیادہ حسین و جمیل تھے) اور مولانا (شاہ) سلیمان صاحب کی خوش آوازی کی رجسٹری کرتا ہوں۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا۔ ایک بزرگ تھے نازوالے، شکستہ حال پراگندہ (بال) ایک شہر کے دروازے پر پہونچے تو شہر پناہ بند، لوگوں سے پوچھا کہ دن میں شہر پناہ کیوں بند ہے؟ جواب ملا کہ بادشاہ کا باز چھوٹ گیا ہے اس لیے دروازے بند کردیے کہ کہیں نکل نہ جائے۔ آپ نے (بارگاہ خداوندی میں) عرض کیا کہ حضور ایسیوں کو تو سلطنت دے رکھی ہے جن میں اتنی بھی عقل نہیں۔ ایک ہم ہیں کہ عقل بھی، علم بھی، مگر ضروریات سے بھی تنگ۔ اس پر عتاب ہوا اور (بطور الہام) ارشاد ہوا کہ تم اس پر راضی ہو کہ تمھارا علم و وَرَع اور افلاس اس کو دے دیا جائے، اور اس کی سلطنت اور بے عقلی تم کو دے دی جائے؟ ـــــــ بس کانپ اٹھے اور توبہ کی۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا ـــــــ ایک تحصیلدار میرے دوست تھے اُنھوں نے مجھ کو بلایا تھا۔ وہاں ایک اہلمد ملے، بوڑھے اور بہت نیک، قرآن کی تلاوت کے پابند، تہجد کے پابند، مترجم قرآن شریف لائے اور یہ آیت نکالی یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا الآیۃ ـــــــ (اے ایمان والو رسولِ اکرم کو مخاطب کرکے "راعنا" نہ کہو (اس میں لہجے کے تھوڑے سے تغیر سے معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں گے) اُنْظُرْنَا کہا کرو۔)

اور (وہ اہلِ مدینہ) کہنے لگے کہ کیا تلاوت میں لفظِ راعنا کو پڑھنا چھوڑ دیا جائے؟ کیونکہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ نہ کہو راعِنا۔ میں نے کہا کہ میں اس واقعہ کو دیکھ کر فتویٰ دیتا ہوں کہ تم کو ترجمہ دیکھنا ناجائز ہے اور ایسے شخص کے لیے ایسا فتویٰ کیوں کر نہ دوں جس نے یہ معنیٰ لیے لاتقولوا کے کہ قرآن شریف میں بھی (راعِنا) نہ پڑھو۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میں نے ایک دفعہ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے ایک مسئلہ دریافت کیا۔ اخیر عمر میں حضرت کی ظاہری بینائی نہیں رہی تھی اور آواز سے پہچانا نہیں۔ اس لیے دریافت فرمایا کہ کون دریافت کرتا ہے؟ میں نے عرض کیا اشرف علی، حضرت کو میرا نام سُن کر اپنے حسنِ ظن کی وجہ سے تعجب ہوا۔ فرمایا تم پوچھتے ہو؟ میں خاموش ہو گیا اور پھر دریافت نہیں کیا کیونکہ میں نے قرائن سے سمجھ لیا کہ حضرتؒ کو اس وقت جواب میں نشاط نہیں۔ لہٰذا دوبارہ سوال کر کے بار ڈالنا ادب کے خلاف ہے۔

پھر اسی سلسلے میں فرمایا کہ تحصیلِ درسیات میں بھی میرا یہی معمول رہا ہے کہ استاذ کو جب بشاش نہیں دیکھتا تو کوئی بات دریافت نہیں کرتا تھا اور دوسرے وقت پر اُٹھا رکھتا تھا۔ استاذ تو استاذ ہو میرا تو یہ دستور ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان پر بھی کسی قسم کا بار ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اپنے ذاتی تنخواہ دار ملازموں سے کہہ رکھا ہے کہ اگر تم کو کوئی ایسا کام بتلایا جائے جس کا تم سے بسہولت تحمل نہ ہو اور گرانی ہو تو فوراً مجھے اطلاع کر دینا میں دوسرا انتظام کر لوں گا۔ چنانچہ بعض ملازمین بعض دفعہ صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ کام ہم سے نہیں ہو سکتا۔ ....

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ایک صاحب اچھے خاصے نیک، اور بزرگ آدمی تھے۔ اُن کا دستور تھا کہ جب کوئی دعوت کرتا تو قبول فرما لیتے اور گھر سے جب روانہ ہوتے تو راستے میں جو شناسا بھی ملتا تھا اس سے بلا تکلف فرماتے تھے کہ بھائی دعوت سے چلو۔ غرض دعوت ہوتی ایک کی اور جمع ہو جاتے دس بیس ـــــ میزبان اس ہجوم کو دیکھ کر بہت گھبراتا تھا اور فوری انتظام یہ کرتا تھا کہ بازار سے پوری کچوری لا کر ان ناخواندہ مہمانوں کی مصیبت ٹالتا تھا، اس پر لطف یہ تھا کہ میزبان کی تو گرہ کھلتی تھی (یعنی اس کا خرچ ہوتا تھا) اور مرید و معتقد یہ اڑاتے تھے کہ پیر صاحب بڑی برکت والے ہیں کہ ایک آدمی کا کھانا دس بیس کو کافی ہو گیا۔ تعجب ہے کہ ان بزرگ کی نظر اس امر پر نہ

گئی کہ دعوت میں اپنے ہمراہ غیر مدعو کو بلا اجازتِ میزبان لے جا! ... ناجائز ہے۔
ان احتیاطوں کو لوگوں نے بالکل چھوڑ ہی دیا ہے۔

فرمایا — ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ اپنا کسی قسم کا بار دوسروں پر نہ ڈالتے تھے بلکہ خود بقدرِ استطاعت دوسروں کی اعانت فرماتے تھے — اپنے حواشی کی مثنوی کی اشاعت کے لیے مولانا احمد حسن صاحب کانپوریؒ کو اپنی جیب سے ایک ہزار روپیہ نقد مرحمت کیا اور فرمایا کہ فی الحال اس رقم سے کام شروع کرو پھر ان شاء اللہ اور انتظام ہو جائے گا۔ نیز حصۂ اول کی اشاعت کی رقم سے بھی کام چلنے کی امید ہے — اس کے چند روز بعد مولوی صاحب سے فرمایا کہ میں یہ رقم ہبہ کرتا ہوں تاکہ حساب اور واپسی کا جھگڑا ہی نہ رہے ...

اسی طرح حضرتؒ نے ارشادِ مرشد میری معرفت چھپوانا چاہا۔ اور فرمایا چھپائی کے دام میں دوں گا۔ عبدالرحمن خاں صاحب مالکِ مطبع نظامی (کانپور) نے چھاپ کر پیش کیا اور کہا کہ میں لاگت نہیں لینا چاہتا۔ چونکہ مخلص اور معتقد تھے اس لیے میں نے بھی اصرار نہیں کیا، بلکہ حضرتؒ کو اطلاع کر دی اور بطور سفارش عرض کیا کہ وہ بہت سخی ہیں اُن کو گرانی نہ ہوگی۔ (بلکہ دام نہ ملنے پر وہ خوش ہوں گے) حضرتؒ نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرحمن خاں صاحب بہت حریص ... ہیں کہ دین و دُنیا دونوں کی دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں، کسی کو ثوابِ آخرت بھی نہیں کمانے دیتے — حضرت حاجی صاحبؒ اگر کسی سے کوئی فرمائش کرتے تھے تو دام ضرور ادا فرماتے تھے وہ دوسرے پیروں کی طرح (فقط) لینے والے پیر نہ تھے بلکہ اوروں کے برخلاف (خرچ کرنے والے اور) دینے والے پیر تھے — ایک مرتبہ ایک دم چھ ہزار روپیہ حضرتؒ کے پاس آیا۔ آپ نے فوراً اس خطیر رقم کو ایک حاجت مند کو یک مشت دے دیا — پھر اسی سلسلے میں فرمایا کہ ایک مولوی صاحب حضرتؒ کی خدمت میں مختلف ہدایا لائے لیکن ایک دم پیش نہیں کیے روزانہ ایک ہدیہ پیش کیا کرتے تھے۔ حضرتؒ کو یہ تصنع اور روز کا اظہار ناگوار ہوا مگر لطف سے فرمایا کہ مولوی لوگ بڑے عقلمند ہوتے ہیں روزانہ ایک ہدیہ دیتے ہیں تاکہ ہر دن دُعا ملے۔ مولوی صاحب اس لطیف اشارے کو سمجھ گئے اور باقی اشیاء ایک ساتھ پیش کر دیں۔

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک بزرگ کسی صاحب کے یہاں مہمان ہوئے انھوں نے

کئی قسم کے کھانے ایک وقت میں تیار کرائے۔ اُن بزرگ نے فرمایا کہ کھانا تو بہت اچھا تھا لیکن آپ کو کھلانا نہیں آیا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ ایک ایک وقت ایک ایک کھانا کھلاتے تاکہ میں زیادہ قیام کرتا۔ اب میں جلدی چلا جاؤں گا کیونکہ ان تکلفات سے گرانی ہوتی ہے۔

اسی سلسلے میں فرمایا کہ جونپور میں مولوی ابوبکر (شیث) صاحب نے میری دعوت کی اور دریافت کیا جو کھانا مرغوب ہو بتا دیجئے تاکہ وہی پکوا دیا جائے۔ یہ بات سب سے پہلے میں نے انھیں سے سُنی، میرا جی بہت خوش ہوا۔ ماشاءاللہ بہت سلیم الطبع شخص ہیں۔ میں نے کہا گوشت خواہ بکری کا ہو خواہ گائے کا اُس میں لوکی ڈلوا دیجئے۔ روٹی سادی بغیر گھی کے ہونا چاہیے — پھر پوچھا دال میں گھی کیسا ہو؟ میں نے کہا تھوڑا، میں زیادہ گھی نہیں کھاتا ہوں۔ پھر کہا مرچ کیسی ہو؟ میں نے کہا کہ کسی قدر تیز ہو۔ انھوں نے فرمائش کے مطابق کھانا کھلایا — اگر صرف ایک کھانا پکایا جائے، تو عمدہ بھی پکتا ہے اور بے فکری سے کھایا جاتا ہے، اور زیادہ قسم کے کھانوں کی تیاری میں بعض اوقات سب کے سب خراب ہو جاتے ہیں ..... زیادہ ہانڈیاں پکانے والوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ ایک کی اصلاح میں لگے دوسری بگڑ گئی، پھر دوسری کی طرف توجہ کی پہلی بگڑ گئی اور خود کھانے والے کو جو کثرتِ الوانِ اطعمہ (رنگ برنگ کے کھانوں کی کثرت) سے حیرت ہوتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے — (طب کی کتاب موجز میں تصریح ہے۔ کثرۃ الالوان محیّرٌ للطبیعۃ ———

مُراسلات

مسلمانوں کی سیاسی جماعت

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

"خاکسار الفرقان کا خریدار ہے اور اس اعتبار سے نگاہ اولیں" ماہ ستمبر ۷۰ء نظر سے گزرا۔ مجھے آپ کے مشورے کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے صحیح اور ضروری بات کہدی جو آج مسلمانوں کو از حد ضروری ہے۔ مسلمان اپنی دینی اور دنیوی تعمیر کی طرف بلائیں اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ رسمی جماعتیں، شور وغل اور دکھاوا ہمیں کہاں سے کہاں لے گیا ہے۔ وہ ہمیں اچھی طرح جاننا چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ جماعت کے بغیر ہم کہاں تک کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جماعت کے بغیر سیاسی گتھیاں سلجھانا ذرا مشکل کام ہے۔ آپ نے مسلم مجلس اور مسلم لیگ کا رول بھی مشاہدت کے رشتہ سے گنوایا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ مسلم مجلس اچھوتوں کی ترقی کے لیے بھی کام کرے گی اور مسلم لیگ خالصاً مسلمانوں کی بہبودی کے لیے کام کر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کیرالا میں غیر مسلم بھی اس کے ممبر ہیں۔ اور یہ جماعت تمام فرقوں کے لیے اور بالخصوص اقلیتی فرقہ کے لیے کام کر رہی ہے۔ مسٹر محمد کویا بحیثیت وزیر تعلیم نے جہاں ریاست کے دیگر فرقوں کے لیے کام کیا ہے، عربی، مسلم مدارس اور مسلمانوں کے لیے بھی کام کیا ہے۔ بنگلور کارپوریشن کے انتخابات ۶۵-۱۹۶۴ء میں مسٹر مائیکل نے ایک حلقہ سے مسلم لیگ کے امیدوار کی حیثیت سے الکشن لڑا تھا۔

ہمارے سامنے مسلمانوں کے چند مشورے موجود ہیں۔ بعض مسلمانوں نے سوچا ہوگا کہ چونکہ مسلم لیگ ایک بدنام جماعت اور تقسیم کی ساری ذمہ دار ٹھہرائی گئی ہے اور (اس نام سے) وہ اگلا مقام حاصل نہیں کرسکتے ہیں اس لیے کیوں نہ یکسر نام بدل دیں یا نئی جماعت اس نام کے بغیر وجود میں لایا جائے۔ حالانکہ یہ مشورہ بالکل غلط تھا۔ جماعت اسلامی جو سیاست سے دور اور تقسیم

سے قبل اور بعد اس کی کوئی تخریبی کارروائی یا سیاسی ہنگامہ نہیں ہوا۔ آج اُس جماعت کو منع یا ختم کر دینے کے لیے سوچ بچار ہو رہا ہے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ نام بدل دینا، اچھوتوں کے لیے کام کرنا ہماری کامیابی ہو نہیں سکتی۔ یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ بابائے قوم گاندھی جی نے ——— (UNTOUCHABILITY) چھوت چھات ختم کر دینے کے لیے بہت کچھ کیا ہے حکومت کی ساری مشینری اُن کے لیے کام کر رہی ہے۔ ہندوستان کے دستور میں اُن کے لیے ہر قسم کی سہولتیں، مراعات رکھے گئے ہیں۔ ملازمت، تعلیم میں رعایت رکھی گئی ہے۔ لہٰذا اگر ایک جماعت اپنی بے بس قوم کو اول اور ساتھ ساتھ دوسرے فرقوں کی خدمت کے لیے کوشاں ہے تو کیا قباحت ہے؟ میں آپ کی خدمت میں عرض کروں کہ یہ چھوت چھات کی بیماری صرف ہندو قوم میں موجود تھی یا ہے۔ اس معاملہ کا کسی دوسرے مذاہب کے لوگوں سے واسطہ نہیں ہے۔ مسلمانوں میں اس قسم کی تفریق یا نیچ ذات موجود نہیں ہے۔ لیکن فرض شناس، نبض شناس بابائے قوم گاندھی جی نے ہندوؤں کے ایک بڑے طبقہ کو عیسائی یا دوسرے مذہب اختیار کرنے سے روکا اور ہریجن کو ایک بہتر سے بہتر مقام دلانا چاہا۔ یہاں تک کہ دستور میں اس کی ضمانت مل گئی۔

ان حالات کے پیشِ نظر آل انڈیا سطح پر خالص مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کو غلط بتا دینا اچھا نہیں ہے اور یہ نیک مشورہ ہو نہیں سکتا۔

شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے ۱۵ سال پہلے یہ مشورہ دیا تھا کہ مسلمان صرف کانگریس کو ووٹ دیں۔ یہ حقیقت تھی کہ ہندوستان کی دیگر جماعتوں سے کانگریس ایک بہتر جماعت تھی اور مسلمانوں کے خدمات اس جماعت سے وابستہ تھیں۔ لیکن آج وہی مسلمان کس کانگریس کو ووٹ دیں، حکمراں یا تنظیمی؟ یہی کانگریس دو حصوں میں بٹ کر فرقہ وارانہ جماعت کی طرف جھک گئی ہے۔ لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ مسلمانوں کی جماعت بنانا، دستور کی حدود کے اندر پہلے مسلمانوں کے مشکلات کو دور کرنا اور اُن کو عزت کا مقام دلوانا اور ساتھ ساتھ دیگر فرقوں کی خدمت کے لیے کوشاں رہنا اور علیٰ اعلان یہ کہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں، کوئی برا نہیں ہے اور بہتر یہ ہوگا کہ مسلمان جذبات سے کام نہ لے کر اس کا پہلا مقصد یاد رکھیں کہ دینی اور دنیوی تعمیر کیلئے بلائیں۔"

محمد عبد اللطیف خاں (منگلور)

الفرقان: مراسلہ نگار نے جس مسئلہ پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک آل انڈیا سیاسی تنظیم ہونی چاہیے یا نہیں؟ الفرقان کے اداریہ کا تعلق بنیادی طور پر اس مسئلہ سے نہیں تھا وہاں اصل گفتگو صرف یہ تھی کہ مسلم لیگ اور مسلم مجلس کی کشمکش ملی خلوص اور باہمی اخلاقیات کے پہلو سے ان دونوں جماعتوں کا کیا کردار سامنے لاتی ہے؟ اور اس ضمن میں موقع کی مناسبت سے اپنا یہ خیال بھی بہت اجمال کے ساتھ قلم پر آگیا تھا کہ ملت کے موجودہ حال میں رسمی جماعت سازیوں کا یہ نتیجہ نکلنا بالکل لازمی ہے جو مثال کے طور سے مسلم لیگ اور مسلم مجلس کی کشمکش کی شکل میں سامنے آرہا ہے۔ مراسلے میں ان دونوں باتوں سے چونکہ کوئی بحث نہیں ہے جن سے اصلاً یا ضمناً الفرقان کے اداریہ کا تعلق تھا اس لیے ہمیں اس پر کچھ کہنا نہیں ہے اور پورے مراسلے میں جو ایک فقرہ ہمارے ضمنی خیال پر ایک اشکال کی حیثیت رکھتا ہے کہ سیاسی معاملات کا سلجھانا بغیر جماعت کے کیوں کر ممکن ہے، تو یہ اشکال اسی وقت حق بجانب ہو سکتا ہے جب کہ سرے سے اس بات ہی کی مخالفت کی گئی ہو کہ مسلمان ایک جماعت کی شکل اختیار کریں لیکن بات تو یہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں وہ اجتماعی شعور پیدا کیا جانا چاہیے جو انھیں خود بخود ایک جماعت بنے تک پہنچا دے اور مختلف لوگوں کے مختلف نعروں پر وہ کسی قابل ذکر انتشار کا شکار نہ ہو سکیں ورنہ جو جماعتیں بنیں گی وہ مسئلے کو سلجھائیں گی نہیں، الجھانے کا باعث بنیں گی۔ اور یہ وہ بات ہے جو تجربے میں آرہی ہے۔ البتہ کسی علاقے کے مسلمانوں میں اجتماعی شعور پایا جاتا ہو تو وہاں کسی رسمی جماعت کی تشکیل بالکل مناسب ہے کیونکہ اُس سے جماعت کے قیام کا اصل مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

مضمون آرہا ہے

دفتر شیخ الجامعہ - جامعہ ملیہ اسلامیہ - جامعہ نگر - نئی دہلی - ۲۵

محترمی۔ السلام علیکم

کل شام کی ڈاک میں الفرقان کا تازہ شمارہ ملا، شکریہ قبول فرمائیے۔ میں نے آپ کے مضمون کی دوسری قسط رات پڑھ لی۔ کوشش کروں گا کہ آج میں اپنے تاثرات قلم بند کرلوں اور کل بذریعہ رجسٹری آپ کو بھیج دوں۔ چونکہ رجسٹری کا وقت کم ہوتا ہے اس لیے اگر اتفاق سے کل نہ بھیج سکا تو پرسوں ۹ اکتوبر کو ضرور بھیج دوں گا۔ پہلی صورت میں آپ کو میرا

مضمون انشاء اللہ سنیچر کو (۱۰ اکتوبر) مل جائے گا۔ اور دوسری صورت میں ۱۲ اکتوبر یعنی دوشنبہ کو ملے گا۔ آپ میرا یہ مضمون اگلی ہی اشاعت میں دے سکیں تو عنایت ہو گی۔ میری کوشش ہو گی کہ میرا مضمون ۱۰، ۱۲ صفحے سے زیادہ نہ ہو۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔ والسلام

خاکسار۔ عبداللطیف اعظمی
۷ اکتوبر ۱۹۷۰ء

مضمون نہیں آرہا ہے

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۵

محترمی السلام علیکم

کل آپ کی خدمت میں میں نے ایک کارڈ بھیجا ہے، جس میں لکھا تھا کہ کل یا پرسوں آپ کے جوابی مضمون کے متعلق اپنے تاثرات لکھ کر بھیجوں گا، چنانچہ میں نے اپنے تاثرات لکھ لیے، مگر جب دوستوں سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے اس سے سختی سے اختلاف کیا، ان کا کہنا ہے کہ جس مضمون کا لہجہ اتنا خراب اور انداز اتنا غیر علمی اور غیر سنجیدہ ہو اور جس کا مقصد افہام و تفہیم نہ ہو، اس کا جواب صرف خاموشی سے دینا چاہیے۔

جامعہ کی ہمیشہ سے یہ پالیسی رہی ہے کہ بحثوں اور نزاعی مسائل میں اُلجھنے سے پرہیز کیا جائے۔ میں ذاتی طور پر کبھی کبھی مسلمانوں کے سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی مسائل پر لکھتا ہوں جن سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہوتا ہے، مگر اس کا بہرحال ہمیشہ خیال رکھتا ہوں کہ جامعہ ملیہ یا جامعہ کی کسی اہم شخصیت پر کوئی اعتراض کیا جائے تو اس بحث میں نہ پڑوں۔ زیر بحث مضمون کا تعلق اگرچہ علمی بحث سے ہے، مگر چونکہ آپ نے اس کا تعلق شیخ الجامعہ سے جوڑ دیا ہے اور ان کی شخصیت بھی زیر بحث آگئی ہے، اس لیے مجھے اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے تھا مگر اتفاق سے زیر بحث موضوع سے مجھے ذاتی طور پر دلچسپی ہے اور میں نے اس کے ترجمے پر اصرار کیا تھا، اس لیے بغیر سوچے ہوئے آپ کے اعتراضات کے جواب کے لیے تیار ہو گیا، بلکہ لکھ بھی لیا، لیکن جب دوستوں کا مشورہ سامنے آیا تو اپنی غلطی محسوس ہوئی

اس لیے اب آپ کو یہ مضمون نہیں بھیج رہا ہوں۔ اطلاعاً عرض ہے۔

اس مضمون کے بارے میں یا اس موضوع پر اظہار خیال کے لیے میں نے بہت سے لوگوں کو دعوت دے رکھی ہے' ان میں علماء بھی شامل ہیں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اہل قلم بھی۔

اگر ان لوگوں نے اپنے وعدوں کو پورا کیا تو انھیں جامعہ میں شائع کیا جائے گا۔ اس موقع پر اگر مناسب ہوا' تو اپنے اس مضمون کو بھی شامل کروں گا' فی الحال اس کی اشاعت روک دی ہو۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام

خاکسار۔ عبداللطیف اعظمی

(۸ر اکتوبر ۱۹۷۰ء)

اعظمی صاحب کا بہت بہت شکریہ کہ وہ پروفیسر مجیب صاحب کے مقالے پر تنقید کے سلسلے میں اپنے اور اپنے دوستوں اور بزرگوں کے حسن ردعمل سے مجھے بعض خطوط میں آگاہ کرتے رہے تھے اُس پر الفرقان میں کچھ عرض کرنے کا موقع' یہ آخر کا خط لکھ کر انھوں نے عنایت فرمایا۔

اعظمی صاحب سے کوئی خواہش نہیں کی گئی تھی کہ وہ الفرقان کی تنقید پر اپنے تاثرات ظاہر فرمائیں۔ نہ کوئی چیلنج تھا کہ جواب دیا جا سکتا ہو تو دیا جائے۔ موصوف نے اطلاع دی تھی کہ جواب بھیج رہے ہیں۔ اگر آجاتا تو شائع کر دیا جاتا۔ نہیں آرہا تھا تو کوئی اصرار نہیں تھا۔ مگر یہ دوسری اطلاع' کہ جوابی مضمون نہیں آرہا ہے' انھوں نے ایسے انداز میں دی ہے جیسے ادھر سے کوئی بڑا اصرار ہو رہا تھا کہ آپ اپنا مضمون کیوں نہیں بھیج رہے ہیں؟ ضرور بھیجئے!

مہذب لوگوں کا دستور یہ دیکھا ہے کہ وہ کسی معذرت کے سلسلے میں ایسے اسباب جو مذکورہ بالا خط کی ابتدائی سطروں میں تحریر فرمائے گئے ہیں کسی چیلنج یا اصرار ہی کی صورت میں زبان قلم پر لاتے ہیں مگر شیخ الجامعہ کے پی اے' عبداللطیف اعظمی صاحب نے ایک نئی تہذیب سے واقف کرایا ہے کہ خود ہی کچھ لکھ کر بھیجنے کا ارادہ کرو' پھر خود ہی اس ارادہ کو بدل دو۔ اور پھر اس کی اطلاع میں اس طرح کے اسباب بھی' کہ دوستوں کی رائے میں تمہارا مضمون اس قدر نامناسب اور غیر سنجیدہ انداز کا ہے کہ اس کا جواب صرف خاموشی سے دینا چاہیے' اتنی بے تکلفی سے لکھ دو جتنی بے تکلفی سے کسی اصرار پر بھی لوگ لکھنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ اس تہذیب مراسلت اور شائستگی لہجہ کے ساتھ' یہ خاموشی بھی کسی نے کہاں دیکھی ہوگی جس کا نمونہ اس خط

میں دیکھنے کو مل گیا ہے! سبحان اللہ و بحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔

پتہ نہیں اعظمی صاحب کو احساس ہے یا نہیں کہ ان کی معذرت دو متضاد قسم کے اسباب پر مشتمل ہے۔ ایک طرف وہ لکھتے ہیں کہ دوستوں کی رائے میں الفرقان کا مضمون نہایت خراب لہجے کا ہے، اس لیے ان دوستوں کے مشورہ پر انھوں نے جواب بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دوسری طرف اس کے آگے ان کا ارشاد ہے کہ جامعہ یا جامعہ کی کسی اہم شخصیت پر اعتراض کیا جائے تو ایسی بحث میں پڑنے سے وہ اجتناب کیا کرتے ہیں، اس دفعہ محض بے خیالی میں وہ الفرقان کے مضمون کا جواب دینے کا ارادہ کر بیٹھے تھے، دوستوں کے مشورہ سے انھیں احساس ہوا کہ وہ غلط کام کرنے جا رہے ہیں۔ گویا الفرقان کے مضمون کا لہجہ اُن کے نزدیک "خراب" نہ بھی ہوتا تب بھی انھیں یہی فیصلہ کرنا تھا کہ جواب نہ بھیجا جائے! تو اب اس ترک ارادہ کا سبب کیا سمجھا جائے؟ یہ کہ الفرقان کے مضمون میں مجیب صاحب کی شخصیت کو بھی زیر بحث لے آیا گیا تھا؟ یا یہ کہ اس بحث کا لہجہ بہت خراب تھا؟ —— پتہ نہیں کس عالم میں مجیب صاحب کے محترم بی لے نے یہ گرامی نامہ لکھا ہے!

خیر چھوڑیئے اس مسئلہ کو۔ ذرا اس تاثر پر بات ہو جائے کہ الفرقان کے مضمون کا لہجہ بجید غیر علمی اور غیر سنجیدہ ہے۔ اور مقصد افہام و تفہیم نہیں ہے، ایک خالص علمی بحث کا تعلق خواہ مخواہ شیخ الجامعہ کی شخصیت سے جوڑ دیا گیا ہے۔

جی ہاں! بحث کا تعلق شیخ الجامعہ کی شخصیت سے تو ضرور جوڑا گیا ہے۔ بلکہ بحث میں حصہ لینے کا محرک ہی یہ ہے کہ شیخ الجامعہ جیسی ایک شخصیت نے یہ بحث اُٹھائی ہے۔ اور یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ مضمون کے شروع میں واضح کر دی گئی ہے، اس کو صحیح سمجھنے کے وجوہ بھی مضمون میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ ان وجوہ پر کوئی کلام جب تک نہ فرمایا جائے اُس وقت تک اس اعتراض کی کیا معقولیت سمجھی جا سکتی ہے؟۔

رہا افہام و تفہیم کا مقصود نہ ہونا، تو یہ بھی بجا ہے۔ واقعی افہام و تفہیم مقصود نہیں تھی، مقصود دراصل تردید تھی۔ افہام و تفہیم کی جاتی ہے کم سمجھ لوگوں سے یا ایسے لوگوں سے، جن کے متعلق یہ سمجھا جا سکے کہ غیر شعوری طور پر غلطی ہو گئی ہے۔ مجیب صاحب ان دونوں میں سے کسی خانے کی شخصیت نہیں ہیں۔ پہلے خانے کا تو سوال ہی نہیں۔ دوسرے خانے میں اس لیے نہیں رکھے جا سکتے کہ اُن کے زیر بحث مضمون کا بنیادی فکر، اُن کا بہت پختہ فکر

ہے۔ کوئی بہت ہی کم سمجھ ہوگا جو یہ سوچے کہ اس موضوع پر انھیں سمجھایا بھی جا سکتا ہے۔ موضوع وہ ہو جو دین کی جڑ بنیاد سے تعلق رکھتا ہے۔ پس جس کسی کی نظر میں مجیب صاحب کا فکر کھلے انحراف کا اور اس کی تبلیغ اسلام پر ایک بنیادی وار کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ اگر افہام و تفہیم کا کوئی محل نہیں دیکھتا تو تردید کے سوا چارہ کار کیا ہے؟ ہاں اس تردید میں مواد وہ سب موجود ہے جس کے پیش کرنے کا انداز اگر بدل دیا جائے تو تردید کے بجائے تفہیم اُس کا نام ہو جائے گا اور مجیب صاحب سمجھنا چاہیں تو ایک مرحلہ تو اسکے ذریعے سمجھنے کا بخوبی طے ہی کر سکتے ہیں ــــ اور یہ سفر اگر شروع ہو جائے تو ایک ہم کیا مسافر نواز بہتیرے

لہجہ کی "ضرابی" اور "غیر علمیت" کوئی جدا گانہ بات نہیں ہے۔ اسی تردید کی سختی اور احساسات کی صراحت کی یہ تعبیر ہے۔ یہ حضرات یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح یہ اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے دین کا کوئی مسئلہ بھی بحث کے لیے کھولنے اور نئے نئے موقف بنانے میں کوئی باک نہیں محسوس کرتے۔ اس طرح اور مسلمانوں کے اندر بھی کوئی جذباتی ہیجان اس سے نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ نہایت ٹھنڈے رہ کر اور اس طرح کی باتوں کے لیے ان کا (از روئے دانشوری) حق مان کر ان کی بات سننی چاہیے۔ کوئی بحث کرنی ہو تو اصولی طور پر انھیں کا ہم مسلک بن کر بحث کرنی چاہیے۔ ورنہ یہ "غیر علمی" رویے کی قرار داد اُس آدمی کے خلاف پاس کر دیں گے جو ان کی اس خواہش سے منحرف ہو ــــ لیکن ہمیں ان "علمیت پسندوں" کی یہ گالی کھانا منظور ہے، یہ منظور نہیں ہے کہ "علمیت پسند" کہلانے کے لیے انھیں نہایت سکون و آرام کے ساتھ دین میں جدت طرازیوں کا موقع دیدیں۔

یہ تو ہوئی ایک اصولی بات۔ لیکن جہاں تک مجیب صاحب کے مضمون کا تعلق ہے، اُس پر تنقید میں ہمارے لہجے کی سختی اور احساسات کی وہ صراحت جس سے اُن کی تنقیص ہو گئی ہے، تو اس کی بنیاد اُن کے مضمون کی وہ غیر علمیت ہے جس پر شاندار علمی لب و لہجے اور مفکرانہ اسلوب کی چادر چڑھی ہوئی ہے۔ اس غیر علمیت کی تشریح کے لیے ہماری تنقید چھپی ہوئی موجود ہے۔ ایک آدمی جب اتنی بے تک باتیں اتنی افراط سے کہے تو اس پر ہنسی کیسے نہ آئے اور کہاں تک ان باتوں کو مضحکہ خیز نہ کہا جائے؟ پھر جب معاملہ دین کا ہو اور اس میں اس قدر غیر ذمہ دارانہ جسارت ایک انتہائی ذمہ دار منصب والا آدمی کرے تو کیسے کوفت نہ ہو اور کہاں تک ان باتوں کو کوئی مہمل نہ کہے؟ ــــ مجیب صاحب کی کوئی کسر شان اگر ہماری تنقید سے ہوئی ہے تو اس کے ذمہ دار تو وہ خود ہیں۔ علمی لہجہ میں

دنیا بھر کی غیر علمی باتیں کرکے آپ چاہتے ہیں کہ سننے اور پڑھنے والوں کو آپ کا مقام اور آپ کے لہجے کا وقار ملحوظ رہے، یہ اثر کسی پر نہ پڑے کہ کس مقام اور کس لہجے کو آپ کتنے غلط صرف میں لا رہے ہیں!

اعظمی صاحب اور اُن کے دوست اگر اس معاملے میں ہم سے متفق نہیں ہیں تو ایک ذرا سی گزارش اور بھی ہے۔ کیا انھوں نے مجیب صاحب کے مقالے کے وہ مقامات نہیں دیکھے ہیں جہاں موصوف نے دوسروں پر تنقید فرمائی ہے؟ کونسی وہ تلخی اور تنقیص آمیزی اُن کے لہجے میں اُن مقامات پر نہیں آئی ہے جس کی شکایت اِن حضرات کو مجیب صاحب کے ناقدین سے ہے؟ موٹی موٹی مثالوں کے لیے موصوف کے مقالے کے صفحات ۲۳۷، ۲۳۹، ۲۴۰ اور ۲۹۵ ہی ملاحظہ فرما لیے جائیں۔ اگر گنجائش ہوتی تو ہم ان مقامات کے چند فقرے یہاں نقل ہی کر دیتے مگر افسوس ہے کہ اس ضرورت کو اسوقت نظرانداز ہی کرنا پڑے گا۔ ہماری تنقید ایک خاص سمت میں مرکوز رہی تھی اس لیے مقالے کے اس پہلو کا کوئی تذکرہ وہاں نہیں آیا، اس لیے اگر محض ہماری تنقید پڑھنے والے کسی صاحب نے اس طرح کا اعتراض کیا ہوتا تو بات سمجھ میں آسکتی تھی لیکن جو لوگ ماہنامہ جامعہ نکالتے ہیں یا جن کے یہاں سے وہ نکلتا ہے انھیں تو انجان نہیں بننا چاہیے مجیب صاحب کو جن کی باتوں پہ کوفت ہوئی یا ہنسی آئی، اُن پر تنقید میں ان دونوں اثرات کے تقاضے پوری طرح نمایاں ہو کر رہے ہیں۔ پھر الفرقان ہی کے مضمون کی کیا خطا ہے کہ اس میں یہ باتیں قابل نکیر بن گئیں؟

"ع"

تعمیرِ مسجد جامعہ

[اکتوبر کے الفرقان میں ایک نوٹ جامعہ ملیہ میں مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ اس پر ناظرینِ الفرقان میں سے ایک صاحب نے اپنے مکتوب میں حسب ذیل خیال کا اظہار کیا ہے۔ ع]

مکرمی! السلام علیکم

"........ تعمیر مسجد جامعہ کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ ابھی چند سال ہوئے میں نے جا کر دیکھا، عصر و مغرب کی نماز میں شریک رہا، عصر میں آٹھ تک آدمی شریک تھے اور تقریباً سو بچے رہے ہوں گے۔ مغرب میں ۱۵ تا ۲۰ نفر شریک رہے اور لڑکے تقریباً ڈیڑھ سو۔ ایسی صورت میں تعمیر مسجد کی تحریک کچھ بھاتی نہیں۔ شریک نماز ہونے

والوں میں کچھ ملازمین تھے اور دو تین عربی درجہ کے استاد وغیرہ۔"

حکیم نسیم آسی۔ بمبئی

مشاہدہ اپنا بھی تقریباً ڈیڑھ سال پیشتر ایسا ہی رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہی خیال تھا اور اب بھی ہے جس کا اظہار نوٹ میں کیا گیا۔ یعنی مسجد تعمیر ہونی چاہیے۔ ع

نئی مطبوعات

نقوش اقبال
از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی. ترجمہ: مولوی شمس تبریز خاں
ناشر: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ
صفحات ۲۳۲　سائز ۱۸×۲۲/۸　مجلد. قیمت ۴/۵۰

یہ مولانا علی میاں کی عربی کتاب "رَوائعِ اِقبال" کا اردو ترجمہ ہے جس میں بعض مستقل اور بعض ضمنی اضافے خود مترجم کے قلم سے ہوئے ہیں۔

مولانا علی میاں کو شاعر اسلام اقبالؔ سے بڑی مناسبت ہے اور بچپن ہی سے وہ اُن کے کلام کے گرویدہ ہیں! ایک خاص تحریک پر انھوں نے عالم عربی میں اقبالؔ اور اُن کے پیغام کے تعارف کے لیے "رَوائعِ اِقبال" مرتب کی جس میں چند مضامین میں اقبالؔ اور اُن کے بعض اہم افکار و نظریات کا تعارف اُن کے کلام کی روشنی میں کرایا گیا ہے اور پھر اُن کی کچھ منتخب نظموں کے مضامین عرب قارئین کے سامنے رکھے ہیں۔ نقطۂ نظر یہ ہے کہ کلام اقبال کے دینی اور ملّی عناصر اور اُن کا ذوقی جذب و سوز سامنے آئے اور ناظرین پر اثر ڈالے اور اس نقطۂ نظر سے کتاب اُتنی ہی کامیاب ہے جتنی مولانا علی میاں مدظلہٗ سے توقع ہونا چاہیے۔

ترجمہ بجائے خود بہت قابل داد ہے۔ اس کی بدولت اصل اشعار کے کتاب میں آجانے سے اصل کے مقابلے میں ترجمے کی تاثیر یقیناً بڑھی ہے۔ مولانا کے یہاں اگر مروت اور چھوٹوں کے جذبات کی پاسداری کا عنصر ضرورت سے زیادہ نہ ہوتا تو جو تھوڑی بہت اصلاح کی ضرورت کہیں کہیں محسوس ہونے لگتی ہے، اُن کی نظرثانی کے بعد یقیناً وہ بھی نہ رہی ہوتی۔

جن لوگوں کو کلام اقبالؔ کے مطالعہ سے ذوق حاصل ہوتا ہے ہماری رائے میں وہ اس کتاب کو بہت "خوش وقت" کرنے والی پائیں گے۔ راقم سطور کو تو یہ ایک ایسے وقت ہاتھ آئی جب طبیعت صحت کی دگرگونی سے بہت ہی بے کیف ہو رہی تھی۔ ان کٹھن دنوں کو کاٹنے میں جیسی

مد داس کتاب نے کی وہ ابھی بہت دن یاد رہے گی۔

کتابت، طباعت، کاغذ اور گٹ اپ کے لحاظ سے بھی کتاب کا معیار بہت اچھا ہے۔ پروف ریڈنگ کی ایک چوک البتہ بہت بڑی سامنے آتی ہے "ابوجہل کی نوحہ گری" کا ایک حصہ اس سے قبل کے مضمون "ساقی نامہ" میں جڑ گیا ہے۔ اس کی درستی کے لیے صہ ۱۸۹ تا صہ ۱۹۱ اور صہ ۱۹۵ کو دیکھ لینا چاہیے۔

تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہ رائے بریلویؒ

از جناب مولوی محمد الحسنی، ایڈیٹر البعث الاسلامی
ناشر مکتبۂ اسلام. گوئن روڈ. لکھنؤ
صفحات ۱۸۴. سائز ۲۲×۱۸/۱۶
کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ   مجلد. قیمت   ۴/-

رائے بریلی کا حسنی خانوادہ جو حضرت سید احمد شہید کی یادگار شخصیت کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں، اُس کے سر سلسلہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی ہیں۔ اس خانوادے کا مسکن "تکیہ شاہ علم اللہ" آپ ہی کے نام نامی سے منسوب ہے۔ زیر نظر تذکرہ میں اسی عالی مرتبہ شخصیت کے ذاتی اور خاندانی حالات پیش کیے گئے ہیں ۱۰۳۳ھ تا ۱۰۹۶ھ آپ کا دور حیات ہے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے معاصر اور خود بادشاہ نیز اعیان سلطنت کی نگاہ میں محترم تھے۔ معاصر علماء اور مشائخ کے حلقوں میں بھی آپ کی عظمت مسلّم تھی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس تذکرے کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "افسوس ہے کہ اس عالی مرتبہ شخصیت کے حالات، ملفوظات اور تحقیقات بہت کم ملتی ہیں اور جو کچھ ملتا ہے اس سے اس مرتبے کا پہچاننا بہت مشکل ہے جس کا اعتراف اُن کے نامور معاصرین نے بڑی فراخدلی کے ساتھ کیا ہے"

افسوس ہے کہ یہی احساس اس کتاب کو پڑھ لینے کے بعد بھی ہوتا ہے کہ صاحب تذکرہ کے جن مراتب و فضائل کا اظہار مصنف کے قلم نے کیا ہے کتاب کا مواد، اس کی شہادت بہم پہنچانے کے لیے بہت ناکافی ہے۔ شاید کہ خاندانی یادداشتوں اور مخطوطوں اور چند سامنے کی کتابوں سے بڑھ کر تلاش و تحقیق کا دائرہ کچھ اور وسیع کیا جاتا تو یہ کمی کسی حد تک پوری ہو جاتی

بزرگوں کے تذکروں کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ عام دلوں کو مناسبت، محبت، وحرارت کا کم سے کم ایک

ذائقہ ہی تھوڑی دیر کے لیے مل جائے۔ اور اس لحاظ سے کتاب میں جتنا بھی ہے وہ کم نہیں ہے مگر ایک ایسا آدمی جو اس خانوادے سے عقیدت رکھتا ہو جب وہ معاملے کو اس پہلو سے دیکھتا ہے کہ بہتیروں کے لیے یہ سلسلۂ اہل حق مستحق طعن و انکار بھی ہے تب اُسے یہ احساس ہونا ناگزیر ہے کہ واقعات کی ٹھوس شہادت بہم پہنچائے بغیر مراتب و فضائل کا وارفتہ اظہار ان بزرگوں کے حقوق ادا کرنے کا کوئی بہتر طریقہ نہیں ہے۔

مصنف کا نسبی تعلق ان ہی بزرگوں سے ہے اور حق ہے کہ وہ اس تعلق کو سرمایۂ فخر جانیں اور غایت عقیدت کی نظر سے انھیں دیکھنے میں اپنی سعادت سمجھیں مگر اس طرح کی باتوں کو ایک نقصان دہ غلو ہی کہنا پڑے گا کہ "عزیمت جہاد اور تنفیذ شریعت کا جذبہ" حضرت شاہ صاحب کے واسطے ثابت کرنے کے لیے وہ واقعہ لایا جائے جو صلا پر اسی عنوان کے تحت درج ہوا ہے۔ مصنف کا جو اپنا تصور ان بزرگوں کے متعلق ہے اور ثقہ معاصرین کے بیانات کی بنا پر ہونا ہی چاہیے، اُس کے مطابق وہ ان کے فضائل و کمالات کا ذکر نہایت وسیع اور بلند الفاظ میں کرتے ہوئے جب واقعات اور حالات اس درجے کے پیش نہیں کر پاتے تو خواہ مخواہ کتنے ہی ذہنوں میں مبالغہ آرائی کے خیال کو راہ پانے کا موقع میسر آتا ہے۔ خصوصاً جس انداز استشہاد کی طرف ابھی صلا کے حوالے سے اشارہ کیا گیا ہے وہ تو اس خیال کو جتنا بھی پختہ نہ کرے کم ہے۔

خود ان بزرگوں کے حق میں بہتر ہونے اور نہ ہونے سے قطع نظر، مصنف جو بالکل نئے ادبی ماحول کے پروردہ ہیں اُن کا اُس اسلوب تذکرہ نگاری کا اسیر ہو جانا بھی بہت تعجب خیز ہے جو گزرے زمانوں ہی میں بھلا معلوم ہوتا تھا۔

العقد الجمیل فی تجوید التنزیل

از الاستاذ عبد الوہاب بن زاہد ہندی الحلبی
صفحات ۴۸۔ سائز $\frac{20\times30}{16}$ قیمت ۸۰ پیسے
ناشر محمد قمر علی ندوی۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ۔

یہ عربی زبان میں تجوید قرآنی کے مسائل پر ایک مختصر رسالہ ہے مصنف شامی ہیں گزشتہ سال تک دار العلوم ندوۃ العلماء میں اپنے سلسلۂ تعلیم کی تکمیل کر رہے تھے۔ اسی دوران میں یہ تالیف انھوں نے کی۔ رسالہ بڑی صاف

اور سلیس زبان میں لکھا گیا ہے۔ فنی اعتبار سے کوئی صاحب فن ہی رائے دے سکتا ہے لیکن اس معیار پر اگر لائق قبول ہو تو زبان و بیان کے اعتبار سے بلاشبہ اس قابل ہے کہ عربی مدارس میں تجوید کی ابتدائی تعلیم کے لیے جس کا بعض جگہ رواج ہے اس کو داخل نصاب کیا جائے۔

ISLAM'S ACHIEVEMENTS | از جناب محمد سمیع صاحب صدیقی۔ ایم۔ اے بی۔ ٹی۔ علیگ۔

ناشر: سینٹرل جمعیۃ تبلیغ الاسلام۔ ۲/۷/۹۸ ناظر باغ۔ کان پور۔ صفحات ۸۰۔ سائز $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ غیر مجلد ۲/

یہ رسالہ انگریزی زبان میں تبلیغی مقصد سے لکھا گیا ہے۔ مضامین میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مختصر خاکہ، آپ کی جد و جہد اور تعلیم کے اُس وقت کی سوسائٹی پر انقلابی اثرات، اسلام کا تصور زندگی اور علوم و فنون میں مسلمانوں کا حصہ جیسے عنوانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

رسالہ فائدے سے خالی تو نہیں لیکن زبان کے اعتبار سے بھی کسی مشاق کی نظر ثانی کا محتاج تھا اور اسلام کی ترجمانی کے اعتبار سے بھی ضرورت تھی کہ کسی اچھے واقف کی نظر اس پر پڑی ہوتی۔ موجودہ دور کی پسند پر اسلام کو پورا اتار کے دکھانے کا جو رجحان ہمارے نئے تعلیم یافتہ طبقے میں پایا جاتا ہے اس رجحان سے یہ کتابچہ بھی خالی نہیں ہے۔ اس کی بنیادی کمزوری یہی ہے۔

قوم یہود اور ہم
قرآن کی روشنی میں

(از مولانا عبد الکریم پاریکھ)

۴۸۰ صفحات کی یہ کتاب قرآن مجید کی اُن بے شمار آیتوں کی تفسیر ہے جو یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہیں معلومات سے بھرپور یہ کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی صدر مسلم مجلس مشاورت نے اپنی تقریظ میں تحریر فرمایا ہے کہ "میری رائے میں یہ خدمت انجام دے کر پاریکھ صاحب نے وقت کی ایک اہم اور شدید ضرورت کو پورا کیا ہے انشاء اللہ یہ کتاب عوام و خواص سب کے لیے سبق آموز ثابت ہوگی۔"

یہ مصنف کے سالہا سال سے درس قرآن کے سلسلہ میں مطالعہ قرآن کا نتیجہ ہے۔ ترجمہ اور تفسیر میں آزاد رائی سے کام لینے کے بجائے قدیم و جدید مفسرین کے فکری دائرہ میں رہ کر یہ خدمت انجام دی گئی ہے۔

قیمت مع جلد — سات روپے

ملنے کا پتہ:
(۱) عبد الکریم پاریکھ۔ لکڑ گنج ناگپور ۸
(۲) تاج آفس۔ محمد علی روڈ بمبئی ۳

Regd No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 38 NO. 8 NOVEMBER 1970

الفرقان لکھنؤ

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۷۵ صفحات
قیمت
فی کاپی .... ۵۰ پیسے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(اس شمارہ کی قیمت .... ایک روپیہ)

سالانہ چندہ
دیگر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد (۳۸) | بابت ماہ رمضان و شوال ۱۳۹۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۰ء | شمارہ ۹-۱۰

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۵ جنوری تک آ جائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہو گا۔

پاکستان کے خریدار: جن حضرات نے ہمارے خط کے جواب میں اطلاع دی ہے کہ رسالہ پہونچ جاتا ہے ان کا رسالہ جاری رکھا گیا ہے وہ اپنا چندہ حسب معمول سکریٹری صاحب ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج کر ہمیں اطلاع دیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہو گی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

خدا خدا کر کے یہ موقع بھی اہلِ پاکستان کو مل گیا کہ وہ ہر بالغ کے حق رائے دہی کی بنیاد پر اپنے ملک کا دستور بنانے اور حکومت چلانے کے لیے اپنے نمائندے منتخب کریں۔ اس انتخاب میں کوئی پچیس کے قریب پارٹیاں اپنے اپنے منشور کے ساتھ میدان میں آئیں۔ کئی ایک ان میں شریعت کے مطابق دستور اور قانون کی علمبردار تھیں جن میں جماعتِ اسلامی جیسی مشہور و معروف جماعت بھی شامل ہے۔ مگر نتائج مشرقی پاکستان میں تو تقریباً سو فیصدی اُس پارٹی کے حق میں نکلے جس کا اصل نعرہ مشرقی پاکستان کی داخلی خودمختاری تھا اور دستور کے معاملے میں وہ سیکولر نقطۂ نظر کی حامی ہے۔ اور مغربی پاکستان میں بھی اگرچہ اس حد تک نہیں مگر قطعی اکثریت پالینے کی حد تک کامیابی ایک ایسی ہی پارٹی کو ملی جس کے پاس شرعی دستور اور قانون کی نہیں بلکہ سوشلزم کی اپیل تھی۔

مشرقی پاکستان کے نتائج بہت زیادہ خلافِ توقع نہیں ہیں۔ کیونکہ وہاں کے جو حالات سامنے تھے اُن کے پیشِ نظر یہ بات یقینی تھی کہ اکثریت اُسی پارٹی کو حاصل ہوگی جو وہاں کی علاقائی خودمختاری کا علم اُٹھائے گی۔ خلافِ توقع بات بس اتنی ہے کہ کسی اور کا تھوڑا بہت چراغ بھی وہاں نہ جل سکا۔ دستور ساز اسمبلی کی ۱۵۳ اسیٹوں میں سے بس دو سیٹیں اس کے قبضے سے بچ سکیں اور صوبائی اسمبلی کی ۳۰۰ سیٹوں میں سے صرف ۱۰۰ مقابلے میں آنے والی متعدد پارٹیاں پا سکیں۔ پاکستان سے اخبارات نہ آنے کی وجہ سے تفصیلی اور قطعی معلومات میں بڑی کمی ہے۔ مگر جتنا کچھ علم ہے اُس کی رو سے غالباً جماعتِ اسلامی اس پارٹی (عوامی لیگ) کی اصل اور قابلِ ذکر حریف تھی۔ مگر دستور ساز اسمبلی کے الکشن میں تو ایک بھی نہیں اور صوبائی اسمبلی کے الکشن میں بس ایک سیٹ اُسے حاصل ہوئی ہے۔ عوامی لیگ اس حد تک مشرقی پاکستان کے لوگوں کی نمائندہ ہے، اس کا غالباً کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ ورنہ یہ بات تو طے ہی تھی کہ اکثریت اسی کو حاصل ہوگی۔

زیادہ تعجب خیز بلکہ اول سے آخر تک تعجب خیز معاملہ مغربی پاکستان کے نتائج کا ہے۔ مسٹر بھٹو کی شخصیت کا

سحر مسلم تھا۔ انھوں نے پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے بڑا نام کمایا تھا۔ وہ گمنامی کے گوشے سے نکل کر آئے اور پھر بڑھتے ہی چلے گئے۔ حتیٰ کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان روس کی کوششوں سے ہونے والے معاہدۂ تاشقند سے اختلاف کی بنا پر صدر ایوب خاں نے انھیں وزارت سے سبکدوش کر دیا۔ مگر اس سے ان کی شخصیت ماند نہیں پڑی اور نہ وہ دوبارہ اپنے گوشۂ خمول میں لوٹ جانے پر راضی ہوئے۔ معاہدۂ تاشقند نے صدر ایوب خاں کو اپنے ملک خصوصاً مغربی حصے میں جو نقصان پہونچایا تھا اُس کا اندازہ مسٹر بھٹو نے غالباً اچھی طرح کر لیا تھا اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حقدار یقیناً ان سے زیادہ کوئی نہیں تھا۔ انھوں نے کچھ دن خاموشی سے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ اور نوجوان عنصر ان کے گرد جمع ہونے لگا۔ وہ آجکل کے نوجوانوں کا ہیرو بننے کی تمام صلاحیتیں رکھتے تھے۔ ان صلاحیتوں سے انھوں نے بھرپور کام لیا۔ ایوب خاں کے تمام ہی سیاسی مخالفین اور ناقدین معاہدۂ تاشقند اور ہنگامی حالات کا قانون ختم ہو جانے کے بعد سرگرم ہو گئے تھے۔ مگر وہ سب عموماً ایک دوسرے کا سہارا لے کر اور ایک طرح کا متحدہ محاذ بنا کر چل رہے تھے مسٹر بھٹو نے اپنی انفرادیت کو اس مجمع میں ضم نہیں کیا۔ اور ایک وقت وہ آیا کہ انھیں جو چمک دمک اپنی وزارت کے زمانے کے کارناموں کی بنا پر حاصل تھی اُس سے کہیں زیادہ اپنے آپ کو چمکا لینے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ ایوب خاں کی مخالفت سے گرم فضا میں ایک دن انھوں نے بڑے مناسب موقع سے نوجوانوں کو نعرہ دیا کہ ایوب خاں کی آمریت کا تخت لرز چکا ہے بڑھ کر اسے اُلٹ دو۔ مسٹر بھٹو کے اس بانکپن نے مغربی پاکستان کے اس عام سیاسی مجمع کا رنگ پھیکا کر دیا جو آئینی حدود سے باہر نکل کر ایوب خاں کو للکارنے کی یا تو ہمت نہیں رکھتا تھا یا اسے مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس مرحلے پر یہ بات تو طے ہو گئی تھی کہ ڈکٹیٹرشپ کا خاتمہ ہونے پر (جو یقینی نظر آ رہا تھا) جمہوری انتخابات کی بساط اگر بچھی تو مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی بالکل نوزائیدہ ہونے کے باوجود مسٹر بھٹو کی شخصیت کے اثر سے کافی اہم کردار ادا کرے گی۔ مگر یہ بات وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ مغربی پاکستان کی اصل نمائندگی کا اعزاز ہی اس کو مل جائے گا۔ اور مدتوں سے محنت کرنے والے منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ خیال یہ تھا کہ بشمول پیپلز پارٹی تین چار جماعتیں زیادہ تر سیٹوں پر قابض ہوں گی اور تھوڑا تھوڑا حصہ دوسری پارٹیوں اور آزاد امیدواروں کو مل جائے گا یعنی مشرقی پاکستان کے برعکس یہاں کوئی ایک پارٹی اکثریت کی پوزیشن میں آنے والی نہیں ہو گی۔ مگر نہ صرف یہ کہ یہ اندازہ غلط ہوا۔ بلکہ ایک طرف وہ پیپلز پارٹی اکثریت جیتنے میں کامیاب ہوئی جو چند نوزائیدہ پارٹیوں میں سے ایک تھی اور دوسری طرف وہ جماعتِ اسلامی جس کا اس میدان میں سب سے زیادہ کام تھا، جس کے برابر کوئی مضبوط اور منظم جماعت کل پاکستان سطح پر دوسری نہیں تھی۔ جسے جدید اور قدیم تعلیم یافتہ دونوں ہی طبقوں پر مشتمل ہونے اور اُن کی سرگرم ہمدردیاں رکھنے کا وہ امتیاز حاصل

تھا جس میں کوئی اور پارٹی اس کی ہمسری نہیں کر سکتی تھی اور جس کی عالمگیر شہرت اور عالم اسلامی میں اس کے قائد کی قدر و منزلت کا کوئی کم سے کم درجے کا جواب بھی کسی دوسری پارٹی کے پاس نہیں تھا۔ وہ جماعت اسلامی الکشن کے اس معرکے میں ایسی حقیر ثابت ہوئی کہ مولانا غلام غوث ہزاروی کی جمعیۃ علماء اسلام اور خواجہ قمرالدین سیالوی (بریلوی) کی جمعیۃ علماء پاکستان نے بھی تو ان سے زیادہ کارگزاری کر دکھائی۔ مشرقی پاکستان میں تو جو کچھ اس کے حصے میں آیا اُس کا اوپر ذکر آ چکا۔ مغربی پاکستان میں دستور ساز اسمبلی کی ۱۳۸ سیٹوں میں چار اسے ملی ہیں۔ اور صوبائی اسمبلیوں کی ۲۹۲ سیٹوں میں تو چار بھی نہیں تین ہی اسے حاصل ہو سکیں۔ پاکستان کے الکشن کا یہ پہلو دراصل مسٹر بھٹو کی غیر متوقع کامیابی سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ہے۔ کوئی بھی ایسی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی جس سے حیرت کی یہ گتھی حل ہو سکے۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی کے اپنے اخبارات و رسائل اور دوسرے بعض ہمنوا اخبارات و رسائل میں پاکستانی جماعت کے لیڈروں کے جو بیانات اور وہاں کے عوام میں جماعت کی سیاسی مقبولیت کی جو جھلکیاں ادھر دیکھنے میں آتی رہی تھیں اُن پر نظر کرتے ہوئے تو بے اختیار صدر ناصر اور اسرائیل کی وہ معرکہ آرائی یاد آتی ہے جس سے پہلے صدر ناصر اور اُن کے ساتھیوں نے ایسا سماں باندھ دیا تھا جیسے اسرائیل مصر سے بس ٹکرایا اور چور چور ہوا۔ لیکن جب واقعی ٹکراؤ ہوا تو معلوم ہوا کہ صدر ناصر کی فوجی طاقت ایک بھولے ہوئے غبارے سے زیادہ کچھ ہی نہ تھی ـــــــ انتظار ہے کہ حقائق سامنے آئیں اور پتہ چلے کہ یہ ہوا کیا؟۔

معذرت:- الفرقان کا یہ شمارہ شروع دسمبر میں شائع ہونا چاہیے تھا مگر کچھ خود مرتب کی خرابی صحت اس میں حائل ہوئی اور کچھ سبب یہ تھا کہ اس شمارہ کی ضخامت بڑھا کر اسے رمضان و شوال کا مشترک شمارہ بنانا تھا تاکہ شمسی اور قمری مہینوں کی مطابقت صحیح ہو جائے جس میں رفتہ رفتہ ایک ماہ کا فرق آ گیا تھا۔ جنوری کا شمارہ انشاء اللہ ۲۰؍ جنوری تک شائع ہو گا۔

كِتَابُ الْمُعَاشَرَةِ وَالْمُعَامَلَاتِ

مَعَارِفُ الْحَدِيث

آدابِ ملاقات و آدابِ مجلس

(مسلسل)

ملاقات یا گھر یا مجلس میں آنے کے لیے اجازت کی ضرورت :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ جب کسی سے ملاقات کرنے کے لیے یا اُس کے گھر یا اس کی مجلس میں کوئی جانا چاہے تو پہلے سلام کرے اور اجازت مانگے، اس کے بغیر ہرگز اچانک داخل نہ ہو، معلوم نہیں وہ اس وقت کس حال اور کس کام میں ہو، ممکن ہے کہ اُس وقت اس کے لیے ملنا مناسب نہ ہو۔

عَنْ كَلَدَةَ بْنِ حَنْبَلٍ اَنَّ صَفْوَانَ بْنَ اُمَيَّةَ بَعَثَهُ بِلَبَنٍ وَجِدَايَةٍ وَضَغَابِيسَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَعْلَى الْوَادِي، قَالَ فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ وَلَمْ اُسَلِّمْ وَلَمْ اَسْتَاذِنْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِرْجِعْ فَقُلْ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَاَدْخُلُ؟ ——— رواہ الترمذی و ابوداؤد

کلدہ بن حنبل سے روایت ہے کہ (ان کے اخیافی بھائی) صفوان بن امیہ نے ان کو دودھ اور ہرنی کا ایک بچہ اور کچھ کھیرے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، یہ اُس وقت کی بات ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادیٔ مکہ کے بالائی حصہ میں تھے،

(کلدہ کہتے ہیں کہ میں یہ چیزیں لے کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچ گیا اور میں نے پہلے سلام کیا اور نہ حاضری کی اجازت چاہی، تو آپ نے فرمایا کہ تم واپس جاؤ اور (قاعدہ کے مطابق) "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ؟" کہہ کے اجازت مانگو۔

(جامع ترمذی سنن ابی داؤد)

تشریح) یہ صفوان بن اُمیہ مشہور دشمن اسلام اور دشمن رسول اُمیہ بن خلف کے لڑکے تھے۔ یہ اللہ کی توفیق سے فتح مکہ کے بعد اسلام لے آئے، اور یہ واقعہ جو اس روایت میں ذکر کیا گیا ہو غالباً فتح مکہ کے سفر ہی کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام وادیٔ مکہ کے اُس بالائی حصہ میں تھا جس کو مَعْلٰی کہتے ہیں، صفوان بن اُمیّہ نے اپنے اخیافی بھائی کلدہ بن حنبل کو ہدیہ کے طور پر یہ تین چیزیں لے کر حضورؐ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ کچھ دودھ تھا، ایک ہرنی کا بچہ تھا اور کچھ کھیرے تھے، یہ اس سے واقف نہیں تھے کہ جب کسی سے ملنے کے لیے جانا ہو تو سلام کر کے اور پہلے اجازت لے کر جانا چاہیئے۔ اس لیے یوں ہی حضورؐ کے پاس پہونچ گئے۔ آپ نے اس ادب کی تعلیم کے لیے اُن سے فرمایا کہ باہر واپس جاؤ اور کہو "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ" (السلام علیکم، کیا میں اندر آسکتا ہوں) اور جب اجازت ملے تو آؤ۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا ۔۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام اور استیذان (یعنی اجازت چاہنے) کا طریقہ صرف زبانی بتا دینے کے بجائے اُن سے عمل بھی کرا دیا۔ ۔۔۔ ظاہر ہے کہ جو سبق اس طرح دیا جائے اُس کو آدمی کبھی نہیں بھول سکتا۔

عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَسْتَأْذِنُ عَلٰى اُمِّيْ؟ فَقَالَ نَعَمْ، فَقَالَ الرَّجُلُ اِنِّيْ مَعَهَا فِي الْبَيْتِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا، فَقَالَ الرَّجُلُ اِنِّيْ خَادِمُهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا، اَتُحِبُّ اَنْ تَرَاهَا عُرْيَانَةً؟ قَالَ لَا، قَالَ فَاسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا ۔۔۔۔۔۔ رواہ مالک مرسلاً

عطاء بن یسار (تابعی) سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا میں اپنی ماں کے پاس جانے کے لیے بھی پہلے اجازت طلب کروں؟ آپ نے

ارشاد فرمایا کہ اِن ماں کے پاس جانے کے لیے بھی اجازت لو، اُس شخص نے عرض کیا کہ میں ماں کے ساتھ ہی گھر میں رہتا ہوں، (مطلب یہ کہ میرا گھر کہیں الگ نہیں ہے، ہم ماں بیٹے ایک ہی گھر میں ساتھ رہتے ہیں، تو کیا ایسی صورت میں بھی میرے لیے ضروری ہے کہ اجازت لے کر گھر میں آؤں؟) آپ نے ارشاد فرمایا ہاں اجازت لے کر ہی آؤ، — اُس شخص نے عرض کیا کہ میں ہی اس کا خادم ہوں (اُس کے سارے کام کاج میں ہی کرتا ہوں اس لیے باربار جانا ہوتا ہے، ایسی صورت میں تو ہر دفعہ اجازت لینا ضروری نہ ہوگا) آپ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں اجازت لے کر ہی جاؤ، کیا تم یہ پسند کروگے کہ اس کو برہنہ دیکھو، اُس شخص نے عرض کیا کہ یہ تو ہرگز پسند نہیں کروں گا، آپ نے ارشاد فرمایا تو پھر اجازت لے کر ہی جاؤ۔ (موطا امام مالک)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ بغیر اجازت اور اچانک اپنی ماں کے گھر میں جانے کی صورت میں بھی اس کا امکان ہے کہ تم ایسی حالت میں گھر میں پہونچو کہ تمہاری ماں کسی ضرورت سے کپڑے اتارے ہوئے ہو۔ اس لیے ماں کے پاس بھی اجازت لے کر ہی جانا چاہیئے۔

عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَاذَنُوا لِمَنْ لَمْ يَبْدَأْ بِالسَّلَامِ ——— (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اجازت لینے سے پہلے سلام نہ کرے اُس کو اجازت نہ دو۔

(شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اجازت لینے کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ پہلے السلام علیکم کہے اُس کے بعد کہے کیا میں آسکتا ہوں، اگر کوئی آدمی بغیر سلام کہے اجازت چاہے تو اُس کو اجازت نہ دو بلکہ اس کو بتادو کہ پہلے السلام علیکم کا دعائیہ کلمہ کہہ کے جو اسلامی شعار بھی ہے اسلامی اُخوت اور قلبی رشتہ کا اظہار کرے اس کے بعد اجازت طلب کرے — جب وہ اس طریقہ پر اجازت طلب کرے تو اس کو اجازت دے دو۔

عَنْ رِبْعِيِّ بْنِ حِرَاشٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ فَاسْتَأْذَنَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَأَلِجُ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِخَادِمِهٖ

اُخْرُجْ إِلَى هٰذَا فَعَلِّمْهُ الْإِسْتِئْذَانَ فَقُلْ لَهُ: قُلْ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ؟ فَسَمِعَهُ الرَّجُلُ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ؟ فَأَذِنَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلَ ــــــ رواہ ابوداؤد

ربعی بن حراش (تابعی) روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاضری کی اجازت چاہی اور عرض کیا "أَأَلِجُ" (میں اندر آسکتا ہوں؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم سے فرمایا کہ اس شخص کے پاس جاؤ اور اسے اجازت طلب کرنے کا طریقہ بتاؤ، اُس سے کہو کہ وہ یوں کہے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ؟" اُس شخص نے آپ کی یہ بات خود سن لی اور عرض کیا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ؟" تو آپ نے آنے کی اجازت دے دی تو وہ آپ کے پاس حاضر ہو گیا۔ (سنن ابی داؤد)

عَنْ قَيْسِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ زَارَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَنْزِلِنَا فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، فَرَدَّ أَبِي رَدًّا خَفِيًّا، فَقُلْتُ أَلَا تَأْذَنُ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَقَالَ ذَرْهُ حَتّٰى يُكْثِرَ عَلَيْنَا السَّلَامَ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" فَرَدَّ سَعْدٌ رَدًّا خَفِيًّا ثُمَّ قَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" ثُمَّ رَجَعَ، فَاتَّبَعَهُ سَعْدٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنِّي كُنْتُ أَسْمَعُ تَسْلِيمَكَ وَأَرُدُّ عَلَيْكَ رَدًّا خَفِيًّا لِتُكْثِرَ عَلَيْنَا مِنَ السَّلَامِ، فَانْصَرَفَ مَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَمَرَ لَهُ سَعْدٌ بِغُسْلٍ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ نَاوَلَهُ مِلْحَفَةً مَصْبُوغَةً بِزَعْفَرَانٍ أَوْ وَرْسٍ، فَاشْتَمَلَ بِهَا، ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ وَهُوَ يَقُولُ "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ عَلٰى آلِ سَعْدٍ، ثُمَّ أَصَابَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الطَّعَامِ، فَلَمَّا أَرَادَ الْإِنْصِرَافَ قَرَّبَ لَهُ سَعْدٌ حِمَارًا قَدْ وَطَّأَ عَلَيْهِ بِقَطِيفَةٍ فَقَالَ لِي سَعْدٌ إِصْحَبْ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَحِبْتُهُ، فَقَالَ لِي إِرْكَبْ مَعِي فَأَبَيْتُ، فَقَالَ إِمَّا أَنْ تَرْكَبَ وَإِمَّا أَنْ تَنْصَرِفَ فَانْصَرَفْتُ ــــ رواہ ابوداؤد

حضرت سعد بن عبادہ کے فرزند قیس بن سعد (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک دن) ہمارے گھر پہ تشریف لائے اور آپ نے (قاعدہ کے مطابق باہر سے) فرمایا "السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ" تو میرے والد (سعد بن عبادہ) نے بجائے اس کے کہ آپ کے سلام کا آواز سے جواب دیتے اور اندر تشریف لے آنے کے لیے عرض کرتے) بہت خفی آواز سے کہ حضورؐ سن نہ سکیں) صرف سلام کا جواب دیا، تو میں نے کہا کہ آپ حضورؐ سے اندر تشریف لانے کے لیے کیوں عرض نہیں کرتے، میرے والد نے فرمایا کہ بولو مت ایسے ہی رہنے دو، تاکہ آپ بار بار ہمارے لیے سلام فرمائیں (اور ہمیں اس کی برکتیں حاصل ہوں) — تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ ارشاد فرمایا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ" حضرت سعد نے پھر (اسی طرح) چپکے سے سلام کا جواب دیا (جس کو حضور نے نہیں سنا) تو پھر (تیسری بار) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ" (اور جب اس کے بعد بھی حضرت سعد کی طرف سے کوئی جواب آپ نے نہیں سنا) تو آپ واپس لوٹنے لگے — تو حضرت سعد آپ کے پیچھے پیچھے آئے اور عرض کیا کہ حضرت میں آپ کا سلام سنتا تھا اور (دانستہ) چپکے سے جواب دیتا تھا تاکہ آپ بار بار ہمارے لیے سلام فرمائیں (اور ہمیں اس کی برکات حاصل ہوں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد کے ساتھ اُن کے گھر لوٹ آئے۔ حضرت سعد نے اپنے گھر والوں کو حکم دیا کہ حضورؐ کے غسل کا انتظام کیا جائے، چنانچہ حضورؐ نے غسل فرمایا، پھر حضرت سعد نے حضورؐ کو ایک چادر دی جو زعفران یا ورس سے رنگی ہوئی تھی جسے آپ نے "اشتمال" کے طریقہ پر باندھ لیا، پھر آپ نے ہاتھ اٹھا کے اس طرح دعا فرمائی "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ عَلٰى آلِ سَعْدٍ" اے میرے اللہ اپنی خاص نوازشیں اور رحمتیں فرما سعد کے گھر والوں پہ۔ اس کے بعد آپ نے کچھ کھانا تناول فرمایا۔ پھر جب آپ نے واپسی کا ارادہ فرمایا تو میرے والد سعد بن عبادہ نے سواری کے لیے اپنا حمار پیش کیا جس کی کمر پہ چادر کا گدّا بنا کر رکھ دیا گیا تھا اور مجھ سے فرمایا کہ تم حضورؐ کے ساتھ جاؤ، تو میں آپ کے ساتھ ساتھ چلا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم بھی میرے ساتھ سوار ہو جاؤ، میں نے معذرت

کردی اور سوار نہیں ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ یا تو میرے ساتھ تم بھی سوار ہو جاؤ یا پھر واپس چلے جاؤ (یعنی مجھے یہ گوارا نہیں کہ میں سوار ہو کر چلوں اور تم ساتھ ساتھ پیدل چلو۔ واقعہ کے راوی قیس بن سعد کہتے ہیں کہ جب حضور نے یہ فرمایا) تو میں واپس لوٹ آیا۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کسی کے ہاں ملاقات کے لیے جائے تو السلام علیکم کہہ کے اندر آنے کی اجازت چاہے، اور جب کوئی جواب نہ ملے تو دوسری دفعہ اور پھر جواب نہ ملے تو تیسری دفعہ السلام علیکم کہہ کے اجازت مانگے، اور بالفرض اگر تیسری دفعہ بھی جواب نہ ملے تو پھر واپس ہو جائے۔

حضرت سعد بن عبادہ نے حضور کے بار بار سلام اور اس کی برکات حاصل کرنے کے لیے جو رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے حضور کو تین دفعہ سلام کرنا اور واپسی کا ارادہ کرلینا پڑا، بظاہر ایک نامناسب بات تھی، لیکن ان کی نیت اور جذبہ بہت مبارک تھا اور حضور کی مزاج شناسی کی بنا پر انھیں یقین تھا کہ آپ اس سے ناراض نہ ہوں گے اس لیے انھوں نے یہ جرأت کی، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضور نے کسی گرانی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ ان کے جذبہ اور نیت کی قدر فرمائی جیسا کہ آپ کی دُعا سے ظاہر ہے۔

اس روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے غسل فرمانے کے بعد ایک ایسی چادر لپیٹ لی جو زعفران یا ورس سے رنگی ہوئی تھی۔ حالانکہ دوسری بعض حدیثوں میں اس کی سخت ممانعت وارد ہوئی ہے کہ کوئی مرد زعفران یا ورس سے رنگا ہوا کپڑا پہنے (ورس بھی زعفران ہی کی طرح کی ایک نبات ہے جو رنگ دار بھی ہوتی ہے اور خوشبو دار بھی) اب یا تو یہ سمجھا جائے کہ یہ واقعہ جو زیر تشریح حدیث میں ذکر کیا گیا ہے اس ابتدائی زمانہ کا ہے جبکہ مردوں کے لیے زعفران وغیرہ سے رنگے ہوئے کپڑوں کی ممانعت کا حکم نہیں آیا تھا یا یہ کہا جائے کہ جو چادر حضور نے استعمال فرمائی وہ کبھی پہلے رنگی گئی تھی لیکن بعد میں اچھی طرح دھودی گئی تھی اور ایسی صورت میں اس کا استعمال مردوں کے لیے بھی جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

ملاقات کو آنے والے کا حق ہے کہ اُس کو پاس بٹھایا جائے :-

عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ دَخَلَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ قَاعِدٌ فَتَزَحْزَحَ لَهُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ اِنَّ فِي الْمَكَانِ سَعَةً فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلْمُسْلِمِ لَحَقًّا اِذَا رَاٰهُ اَخُوهُ اَنْ يَّتَزَحْزَحَ لَهٗ

——— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

واثلہ بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے ایک شخص آپ کے پاس آئے تو آپ اُن کے لیے اپنی جگہ سے کھسک گئے، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت! اپنی جگہ تشریف رکھیں، جگہ میں کافی گنجائش ہے (مطلب یہ تھا کہ میرے لیے اپنی جگہ سے ہٹنے کی حضرت زحمت نہ فرمائیں) حضور نے ارشاد فرمایا کہ مسلم کا یہ حق ہے کہ جب کوئی بھائی اس کو (اپنے پاس آتا) دیکھے تو اُس کے لیے اپنی جگہ سے کچھ ہٹے (اور اپنے قریب بٹھائے)۔ (شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی بڑے سے بڑے کے پاس بھی کوئی مسلم آئے تو اُس کو بھی اُس کے ساتھ اکرام کا یہی برتاؤ کرنا چاہیے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب و جانشینی کی نسبت رکھنے والے بزرگوں کے لیے خاص سبق ہے۔

مجلس سے کسی کو اٹھا کر اُس کی جگہ نہ بیٹھنا چاہیئے:۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُقِيْمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَجْلِسِهٖ ثُمَّ يَجْلِسُ فِيْهِ وَلٰكِنْ تَفَسَّحُوْا وَتَوَسَّعُوْا۔

——— رواہ البخاری و مسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کوئی آدمی ایسا نہ کرے (یعنی کسی کو اس کا حق نہیں ہے)، کہ کسی دوسرے کو اُس کی جگہ سے اُٹھا کر خود اس جگہ بیٹھ جائے، بلکہ لوگوں کو چاہیے کہ آنے والوں کیلئے کشادگی اور گنجائش پیدا کریں (اور ان کو جگہ دے دیں)۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں اس بات سے ممانعت فرمائی گئی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو اسکی

جگہ سے اُٹھا کر خود اس جگہ بیٹھ جائے۔ لیکن اگر خود بیٹھنے والا ایثار کر کے کسی کے لیے اپنی جگہ خالی کر دے تو اپنی نیت کے مطابق وہ اجر کا مستحق ہوگا۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَامَ مِنْ مَجْلِسِہٖ ثُمَّ رَجَعَ اِلَیْہِ فَھُوَ اَحَقُّ بِہٖ ۔—— رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص (اپنی جگہ سے کسی ضرورت سے) اُٹھا اور پھر واپس آگیا تو اس جگہ کا وہی شخص زیادہ حقدار ہے۔ (صحیح مسلم)

مجلس میں دو آدمیوں کے بیچ میں اُن کی اجازت کے بغیر نہ بیٹھنا چاہیے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَجْلِسْ بَیْنَ اِثْنَیْنِ اِلَّا بِاِذْنِھِمَا۔

—— رواہ ابوداؤد

عمرو بن شعیب اپنے والد شعیب سے اور وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دو آدمیوں کے بیچ میں ان کی اجازت کے بغیر نہ بیٹھو۔

(سنن ابی داؤد)

تشریح) یہی حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے سنن ابی داؤد ہی میں اور اس کے علاوہ جامع ترمذی میں بھی ایک دوسرے طریقہ سے ان الفاظ میں بھی روایت کی گئی ہے "لا یحل لرجل ان یفرق بین اثنین الا باذنھما" (کسی کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ (قریب قریب بیٹھے ہوئے) دو آدمیوں کے درمیان اُن کی اجازت کے بغیر بیٹھ کر انھیں ایک دوسرے سے الگ کر دے۔

سبحان اللہ العظیم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات و ہدایات میں لطیف انسانی جذبات اور نازک احساسات کا کتنا لحاظ فرمایا گیا ہے۔

اپنی تعظیم کے لیے بندگان خدا کا کھڑا ہونا جسے اچھا لگے وہ جہنمی ہے:۔

عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَّتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔

——— رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس آدمی کو اس بات سے خوشی ہو کہ لوگ اس کی تعظیم میں کھڑے رہیں، اُسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) ظاہر ہے کہ اس وعید کا تعلق اس صورت سے ہے جبکہ کوئی آدمی خود یہ چاہے اور اسی سے خوش ہو کہ اللہ کے بندے اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں۔ اور یہ تکبر کی نشانی ہے اور تکبر والوں کی جگہ جہنم ہے جس کے حق میں فرمایا گیا ہے "بِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ" (وہ دوزخ متکبرین کا بُرا ٹھکانا ہے) لیکن اگر کوئی آدمی خود بالکل نہ چاہے مگر دوسرے لوگ اکرام اور عقیدت و محبت کے جذبہ میں اس کے لیے کھڑے ہوجائیں، تو یہ بالکل دوسری بات ہے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لیے اس کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لیے تعظیمی قیام کو ناپسند فرماتے تھے:۔

عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئًا عَلٰى عَصًا فَقُمْنَا لَهُ فَقَالَ لَا تَقُوْمُوْا كَمَا يَقُوْمُ الْاَعَاجِمُ يُعَظِّمُ بَعْضُهَا بَعْضًا

——— رواہ ابوداؤد

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصا کا سہارا لیتے ہوئے باہر تشریف لائے تو ہم کھڑے ہوگئے، آپ نے ارشاد فرمایا تم اس طرح کھڑے مت ہو جس طرح عجمی لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔

(سنن ابی داؤد)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَمْ يَكُنْ شَخْصٌ اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانُوْا اِذَا رَأَوْهُ لَمْ يَقُوْمُوْا لِمَا يَعْلَمُوْنَ مِنْ كَرَاهِيَتِهِ لِذٰلِكَ

رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کے لیے کوئی شخصیت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب نہیں تھی اس کے باوجود ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حضور کو دیکھ کر کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ جانتے تھے کہ یہ آپ کو ناپسند ہے۔ (جامع ترمذی)

صاحب مجلس کے اُٹھنے پر اہل مجلس کا کھڑا ہو جانا نادرست نہیں:۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْلِسُ مَعَنَا فِي الْمَسْجِدِ يُحَدِّثُنَا فَاِذَا قَامَ قُمْنَا قِيَامًا حَتّٰى نَرَاهُ قَدْ دَخَلَ بَعْضَ بُيُوْتِ اَزْوَاجِهِ

رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ مسجد میں تشریف فرما ہوتے تھے اور ہم سے باتیں فرماتے تھے، پھر جب آپ (گھر تشریف لے جانے کے لیے مجلس سے) اُٹھتے تو ہم سب لوگ بھی کھڑے ہو جاتے اور اُس وقت تک کھڑے رہتے جبکہ ہم دیکھ لیتے کہ ازواج مطہرات کے گھروں میں سے کسی گھر میں آپ داخل ہو گئے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) صحابہ کرام کو اس طریقہ عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منع نہ فرمانا اسکی دلیل ہے کہ اسکو آپ نے گوارا فرمایا حالانکہ ابھی معلوم ہو چکا کہ مجلس میں تشریف آوری کے وقت لوگوں کے کھڑے ہونے کو آپ ناپسند فرماتے تھے، اس عاجز کے نزدیک ان دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ مجلس میں تشریف آوری کے وقت اہل مجلس کا کھڑا ہونا صرف تعظیم ہی کے لیے ہوتا تھا جو آپ کے لیے گرانی کا باعث ہوتا تھا، اور مجلس سے حضور کے اُٹھ جانے کے وقت کھڑا ہونا مجلس کے برخواست ہو جانے کی وجہ سے بھی ہوتا تھا، اس کے بعد خود اہل مجلس بھی اپنے اپنے ٹھکانوں پر جانے والے ہوتے تھے، اس لیے اس کھڑے ہونے کو حضور گوارا فرما لیتے تھے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عمرؓ کی معاشی اصلاحات

(از مولانا محمد تقی امینی ناظم سنی دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

جدید دور میں معاشیات کا مسئلہ اسقدر اہم بن گیا ہے کہ دنیا کی ہر تنظیم اسی پیمانہ سے ناپی جاتی ہو. ذیل میں حضرت عمرؓ کی معاشی اصلاحات ذکر کی جاتی ہیں تاکہ اندازہ ہو کہ حالات کے لحاظ سے اسلامی تنظیم میں کس قدر وسعت ہے ؟.

حضرت عمرؓ نے عراق و شام فتح ہونے کے بعد زمینیں اصل باشندوں کے پاس رہنے دیں، فوجیوں میں تقسیم نہیں کیں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل حالات کے لحاظ سے تقسیم و عدم تقسیم کے معاملہ میں مختلف تھا.

اس موقع پر مجلس شوریٰ کی کارروائی کا خلاصہ یہ ہے.

حضرت عمرؓ کی تقریر:-

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ لوگوں میں تقسیم کردوں اور بعد کے لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ رہے. کیا آپ لوگوں کا یہ مقصد ہے کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے اور نسلاً بعد نسلٍ اسی طبقہ میں منتقل ہوتی رہے. اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی؟ بیواؤں اور حاجتمندوں کی کفالت کہاں سے ہوگی؟ مجھے اس کا بھی اندیشہ ہے کہ بعض لوگ پانی کے بارے میں فساد کرنے لگیں گے"

حضرت علیؓ کی تائیدی تقریر

"میری رائے ہے کہ کاشت کار اور آراضی کو جوں کا توں رہنے دیجیے تاکہ یہ سب لوگوں کے لیے یکساں معاشی قوت کا ذریعہ ہوں (فوجوں میں زمین تقسیم کر دینے سے انھیں میں سمٹ کر رہ جائے گی")۔

حضرت معاذؓ کی تائیدی تقریر

"اگر آپ نے زمینیں تقسیم کر دیں تو زرخیز زمینوں کے بڑے بڑے ٹکڑے فوج میں بٹ جائیں گے، پھر ان کے مرنے کے بعد کسی کی وارث کوئی عورت ہوگی اور کسی کا وارث کوئی اکیلا مرد ہوگا۔ اس کے علاوہ سرحدوں کی حفاظت اور فوجوں کی کفالت کے لیے حکومت کے پاس کچھ نہ رہ جائے گا اس لیے آپ کو وہ کام کرنا چاہیے جس میں آج کے لوگوں کے لیے فائدہ و سہولت ہو اور بعد والوں کے لیے بھی ہو۔"

مخالفت میں حضرت بلالؓ و حضرت عبدالرحمٰنؓ کی تقریر

"جو مال اللہ نے ہمیں غلبہ سے عطا فرمایا ہے وہ ہم لوگوں میں تقسیم ہونا چاہیے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر تقسیم کر دیا تھا یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں ہیں ان کے بیٹوں اور پوتوں کے خیال سے ہماری حق تلفی کی جائے۔ ہم اپنی اولاد کے لیے ہیں اور بعد والے اپنی اولاد کے لیے ہوں گے۔"

مہاجرین و انصار کی اس پہلی میٹنگ میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ مجبور ہو کر حضرت عمرؓ نے دوبارہ مجلس شوریٰ طلب کی۔ اس میں انصار کے دس معزز آدمیوں کو بھی بلا بھیجا اور سب کو جمع کر کے حضرت عمرؓ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔

"میں نے آپ حضرات کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ جس بار امانت کو آپ لوگوں نے میرے سر پر رکھا ہے اس میں میرے شریک بنیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت

خلیفہ کی نہیں بلکہ آپ میں کے ایک فرد کی ہے۔ ہر شخص کو اپنی رائے پیش کرنے کا پورا اختیار ہے۔ اس معاملہ میں پہلے مشورہ ہو چکا ہے۔ کچھ لوگوں نے میری مخالفت کی ہے اور کچھ نے موافقت کی ہے۔

"میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ لوگ میری مرضی کی اتباع کریں اور حق بات چھوڑ دیں، میں تو حق بات ہی کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس طرح میرے پاس اللہ کی کتاب ہے ویسے ہی آپ کے پاس ہے جو ناطق بالحق ہے اس کو سامنے رکھ کر مجھے جواب دیجئے، جو کچھ اس میں موجود ہے اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہے۔"

"کیا آپ حضرات نے ان لوگوں کی باتیں نہیں سنیں جو اس معاملے میں مجھے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شاید ان کا خیال ہے کہ میں حق تلفی کرنا چاہتا ہوں حالانکہ کسی فرد کی بھی حق تلفی کرنا میرے نزدیک صریح ظلم ہے۔ "معاذ اللہ" خدا شاہد ہے کہ میں نے کبھی کسی معاملہ میں ان پر ظلم کیا ہو، یا اب کسی پر ظلم کرنے کا ارادہ ہو، یہ بات ضرور ہے کہ کسریٰ کی زمین (عراق و شام) فتح ہونے کے بعد اور کوئی سی زمین رہ گئی ہے کہ جس کی آمدنی سے خلافت کا انتظام سنبھالا جا سکے گا۔ محض اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے کسریٰ کے اموال، زمین، جائداد اور جفاکش کام کرنے والوں پر ہمیں غلبہ عطا فرمایا ہے۔"

"یہ لوگ (مخالفین) خود شاہد ہیں کہ اموال منقولہ میں نے فوجیوں میں تقسیم کر دیئے خمس (پانچواں حصہ) بھی اس کے مناسب موقع پر صرف کر دیا ہے۔ اب زمین (جائداد غیر منقولہ) باقی رہ گئی ہے۔ اس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ آتش پرست مالکوں ہی کے پاس رہنے دوں، زمین پر ٹیکس (خراج) اور مالکوں پر مال و جان کی حفاظت کا معاوضہ (جزیہ) مقرر کر دوں تاکہ یہ سب آمدنی اجتماعی مفاد کے کام میں لائی جا سکے اور اس کے ذریعہ فوجیوں کی تنخواہوں نیز موجودہ و بعد کے لوگوں کا بندوبست کیا جا سکے۔ آپ حضرات غور کیجئے، کیا یہ ممالک سرحدوں کی حفاظت کے بغیر بیرونی حملوں سے محفوظ رہ سکیں گے؟ کیا جزیرہ، کوفہ، بصرہ، عراق، شام، مصر وغیرہ کے بڑے بڑے شہروں میں ان کی حفاظت کے لیے فوجی چھاؤنیوں کی ضرورت نہ پڑے گی؟ آخر فوجیوں

کی تنخواہیں، ان کے بھتے، اور دیگر تمام لوگوں کے وظیفوں کی رقم کہاں سے آئے گی؟
حضرت عمرؓ نے تقریر کے درمیان آیات "فے" سے استدلال کیا تھا اور انداز استدلال یہ تھا کہ دشمن سے حاصل کیے ہوئے مال میں صرف فوجیوں کا حق نہیں مذکور ہے بلکہ اس میں سب لوگوں کو شریک کیا گیا ہے، اس بناء پر آراضی کی تنظیم و تقسیم میں خلافت کے اختیارات وسیع ہیں۔
وہ آیتیں یہ ہیں۔

مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ	اللہ تعالیٰ نے جو فے بستی والوں سے
الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي	اپنے رسول کو عطا فرمایا ہے وہ اللہ و رسولؐ
الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ	کے لیے اور اقربا، یتیم مسکین اور مسافر کے لیے
وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً	ہے تاکہ تم میں سے دولت مندوں کے درمیان
بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَا	ہی سمٹ کر نہ رہ جائے اور جو کچھ رسولؐ تمہیں
آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا	دیں اس کو لے لو، اور جس سے وہ منع کریں۔
نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا	(نہ دیں) اس کو چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو۔
اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ	بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔ وہ مال ان
لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ	مفلس مہاجروں کے لیے بھی ہے جو اپنے گھروں
أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ	اور اموال سے نکالے ہوئے اللہ کا فضل اور
يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا	اس کی رضامندی ڈھونڈھنے کے لیے اور اللہ
وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ	و رسول (دین) کی مدد کرنے کے لیے تمہارے
هُمُ الصَّادِقُونَ ۝ وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا	پاس آئے ہیں۔ وہی لوگ سچے ہیں، اور ان
الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ	لوگوں کے لیے بھی ہے جو اس گھر (مدینہ) میں
يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ	ایمان کی حالت میں مہاجرین سے پہلے
فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا	سے ٹھہرے ہوئے ہیں، وہ لوگ ان مہاجرین
وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ	سے محبت کرتے ہیں۔ اُن کے آنے اور ان کی
كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُوقَ	خاطر تواضع کرنے سے اپنے دلوں میں تنگی نہیں

شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

(سورۂ حشر۔ رکوع ۱)

محسوس کرتے ہیں اور اپنی جانوں پر انکو مقدم رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان پر فاقہ ہی کی نوبت آجائے اور ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ان کے بعد یہ کہتے ہوئے آئے۔ اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں مومنوں کی طرف سے کینہ نہ رکھ اے ہمارے رب آپ ہی نرمی کرنے والے اور مہربان ہیں۔

شوریٰ میں حضرت عمرؓ کی اس بصیرت افروز تقریر اور استدلال کے انداز نے ممبروں پر اثر ڈالا اور ان الفاظ میں تائید کی گئی۔

فَقَالُوا جَمِيعًا الرَّاى رَائِيكَ فَنِعْمَ مَا قُلْتَ وَمَا رَأَيْتَ

لوگوں نے کہا کہ آپ کی رائے اس معاملہ میں درست ہے۔ جو آپ کہہ رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں وہی ٹھیک ہے۔"

(۲) حالات کے لحاظ سے مسلمانوں کو زمین و جائداد رکھنے سے قانوناً منع کر دیا۔ جب کہ اس سے پہلے برابر ان کے پاس زمینیں رہتی رہیں اور "امین" کی حیثیت سے وہ جائدادوں پر قابض رہے۔

علامہ طنطاوی جوہری لکھتے ہیں۔

فلما كثرت الاموال فی ایام عمر و وضع الديوان فرض الرواتب للعمال والقضاة ومنع ادخار المال وجزم على المسلمين اقتناء الضياع والمزارعة والمزايعة لان

حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں جب مال زیادہ ہوگیا اور دفاتر قائم کیے گئے تو لوگوں کے وظیفے مقرر ہوئے۔ عاملوں اور قاضیوں کی تنخواہیں مقرر ہوئیں نیز سرمایہ جمع کرنے، زمین رکھنے، کاشتکاری کرنے اور دوسروں سے کرانے سے روک دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس

ارزاقھم وارزاق عیالھم تدفع	ہے ہوا کہ لوگوں کے بال بچوں تک کے وظیفے
لھم من بیت المال[1]	سرکاری خزانہ سے مقرر کر دیے گئے تھے۔

ممانعت کے اس قانون نے یہاں تک ترقی پائی کہ

"اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر لیتا تو اس کی جائداد (غیر منقولہ) ضبط کر کے بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی تھی اور نو مسلم کا سرکاری خزانہ سے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا[2]"

(۳) ریاست کی طرف سے دی ہوئی زمینیں واپس لے لیں، چنانچہ خالصہ زمین کا کچھ حصہ قوم بجیلہ کو دیا گیا تھا۔ دو تین سال تک ان لوگوں نے زمین کو اپنے قبضہ میں رکھا لیکن بعد میں مفاد عامہ کے پیش نظر اس کو واپس لے لیا۔

قیس بن حازم کہتے ہیں۔

"جنگ قادسیہ (ایرانیوں سے ہوئی تھی) میں شامل ہونے والے لوگوں میں قوم بجیلہ کے لوگ چوتھائی تھے۔ حضرت عمرؓ نے "سواد" کا چوتھائی انھیں دیدیا۔ دو تین سال تک یہ زمین ان کے قبضہ میں رہی۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے اس قبیلہ کے چند افراد (عمار بن یاسرؓ اور جریرؓ وغیرہ) حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے تو انھوں نے کہا کہ آپ لوگ اس زمین کو مفاد خلق کے لیے خلافت کے حوالہ کر دیجیے۔ اُن لوگوں نے حکم کی تعمیل کی اور زمین خلافت کے حوالہ کر دی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے جریرؓ کو اسی دینار عطا فرمائے۔ جب واپسی کی خبر قوم بجیلہ کی ایک عورت "ام کرز" کو ہوئی تو اس نے اپنے حصہ کی زمین واپس کرنے میں پس و پیش کیا اور عمرؓ کے پاس آکر عرض کیا۔

یا امیر المومنین ان ابی ھلک و	اے امیر المومنینؓ میرے والد فوت ہو
سھمہ ثابت فی السواد وانی لم	گئے ہیں۔ سواد کی زمین میں ان کا بھی حصہ
اسلم فقال لھا یا ام کرز ان قومک	تھا (جو ترکہ میں مجھے ملا ہے) میں اس کو

[1] نظام العالم والامم ج ۲ ص ۱۸۳ و ۱۸۴ [2] ایضاً

قد صنعوا ما قد علمت وقالت ان كانوا قد صنعوا ما صنعوا فانی لست اسلم حتی تحملنی علی ناقة ذلول عليها قطيفة حمراء وتملأ كفی ذهباً قال ففعل عمر ذلك فكانت الدينار نحوا من ثمانين [1]

ہرگز نہ واپس کروں گی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ "اے ام کرز" تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری قوم نے بلا چوں و چرا زمین واپس کر دی ہے۔ ام کرز نے جواب دیا کہ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں۔ میں تو اس وقت تک نہ واپس کروں گی جب تک آپ مجھے ایک فرمانبردار اونٹنی نہ دیں جس پر سرخ رنگ کی گرم چادر پڑی ہو اور زر و مال سے میرا ہاتھ نہ بھریں۔ حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا۔ اور جو نقدی آپ نے "ام کرز" کو دی وہ تقریباً اسی دینار تھی۔

اس واقعہ کی مزید تفصیل کے لیے راقم کی کتاب "اسلام کا زرعی نظام" دیکھنا چاہیے۔

(۴) مفاد عام کے پیش نظر بلال بن حارث سے پوری وادی عقیق یہ کہہ کر واپس لے لی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے نہیں دیا تھا کہ نہ خود آباد کرو اور نہ دوسروں کو آباد کرنے دو جتنی زمین آباد کر سکتے ہو اپنے پاس رکھو اور بقیہ خلافت کے حوالہ کر دو۔ یہ سُن کر بلالؓ نے کہا کہ میں رسول اللہ کی دی ہوئی زمین کبھی نہ واپس کروں گا۔ خواہ اسے میں آباد کروں یا نہ کروں۔ حضرت عمرؓ نے واپسی پر اصرار کیا اور بالآخر آباد شدہ حصہ چھوڑ کر بقیہ زمین لے لی۔[2]

(۵) رسول اللہؐ نے ایک اور شخص کو زمین دی تھی لیکن حضرت عمرؓ نے زمین کے آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین واپس لے لی۔[3]

---

[1] کتاب الاموال ص۲۸۵، ۲۸۶ و کتاب الخراج لابی یوسف ص۲۵، ۲۶ باب ما عمل بہ فی السواد و کتاب الخراج یحییٰ بن آدم قریشی جزء ثانی ص۲۳، احکام القرآن للجصاص ج۳ سورۂ حشر ص۴۳۳

[2] کتاب الاموال ص۲۲ و کتاب الخراج یحییٰ جزء ثانی ص۹۳ [3] الخراج یحییٰ ص۸۰

(۶) اہل مدینہ کی چراگاہ کو ان کی مرضی کے بغیر سرکاری تحویل میں لے کر اس کا کوئی معاوضہ نہیں دیا، چنانچہ ایک بدوی نے آکر حضرت عمرؓ کی خدمت میں عرض کیا۔

یا امیر المومنین بلاد نا قاتلنا علیها	اے امیر المومنینؓ ہم نے اس کے لیے ایام جاہلیت
فی الجاهلية واسلمنا علیها فی	میں جنگیں لڑی ہیں اور اسی پر ہم اسلام لائے
الاسلام تحمی علینا[1]	ہیں۔ آپ ہمارے اوپر اس کی نگرانی کرتے ہیں۔

یہ سُن کر حضرت عمرؓ غصہ میں بھر گئے۔

فجعل عمر ینفخ ویفتل شاربه[2]	عمر غصہ میں بھر گئے اور مونچھوں پر تاؤ دینے لگے۔

دارقطنی کی روایت ہے کہ بدوی کے زیادہ اصرار پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

المال مال الله والعباد عباد الله	مال اللہ کا ہے اور بندے خدا کے بندے ہیں
ما انا بفاعل[3]	میں ایسا نہ کروں گا (واپس نہ کروں گا)

(۷) ضحاکؓ بن خلیفہ کو آبپاشی کے لیے محمد بن مسلمہ سے ان کی مرضی کے بغیر پانی لے جانے کا حکم دیا، اور فرمایا۔

لو لم اجد للماء سبیلاً الا علی	پانی لے جانے کے لیے اگر تیرے پیٹ کے سوا
بطنك لاجریته[4]	اور کوئی راستہ نہ ملے گا تو تیرے پیٹ کے
	اوپر سے پانی گزاروں گا۔

(۸) زکوٰۃ کے سلسلہ میں درج ذیل انتظام کیے۔

(الف) زیتون پر زکوٰۃ (عشر) مقرر کیا جس کے شام اور جزیرے میں بہت سے باغ تھے۔

عشره عمر بن الخطاب بالشام[5]	"شام" میں زیتون پر عشر مقرر کیا۔

دوسری جگہ ہے۔

ان عمر بن الخطاب اخذ من الزیتون	حضرت عمرؓ نے زیتون سے صدقہ وصول کیا۔
الصدقة الخ[6]	

---

[1] بخاری ج ۱ باب اذا اسلم قوم فی دار ص ۴۳۰ [2] فتح الباری ج ۲ باب اذا اسلم فی دار ص ۱۲۲
[3] الخراج لیحییٰ ص ۱۱۱ [4] کتاب الاموال دحاشیہ ص ۸ [5] احکام القرآن للجصاص ج ۳ ص ۱۲ مطلب فی المکرو...

(ب) تالیف قلب کی مد کو یہ کہہ کر ختم کر دیا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم دونوں (دو صحابی)
کان یتألفکما والاسلام یومئذ	کی اس وقت تالیف کیا کرتے تھے جبکہ اسلام کمزور
قلیل و ان اللہ قد اغنی الاسلام	تھا اور مسلمان تعداد میں کم تھے۔ اب اللہ نے
اذھبا فاجھدا جھدکما لہ	اسلام کو غنی کر دیا۔ تم لوگ جاؤ اور اپنی والی محنت کرو۔

(ج) بعض حالات میں زکوٰۃ کے مصرف کو ایک ہی قسم یعنی جہاد فی سبیل اللہ میں محدود کیا۔

انہ کان یاخذ الغرض فی الصدقۃ	فرض صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرتے اور اس کو
ویجعلہا فی صنف واحد [۲]	ایک مصرف (جہاد) میں صرف کرتے تھے۔

(۹) ریاست کی آمدنی بڑھانے کے لیے نئے ٹیکس لگائے۔ مثلاً

(الف) تجارتی ٹیکس لگائے جس کی شرح حربیوں کے لیے دس فیصد، ذمیوں کے لیے پانچ فیصد، اور مسلمانوں کے لیے ڈھائی فیصد تھی۔[۳] (حربی جس قدر مسلمان تاجر سے دار الحرب میں وصول کرتے تھے۔ اسی قدر مسلمان، حربی تاجر سے دار الاسلام میں وصول کرتے تھے)

زیاد بن جدیر پہلے شخص ہیں جن کو عراق و شام میں اس اہم کام کے لیے مقرر کیا۔

ان اول من بعث عمر بن الخطاب	میں پہلا شخص ہوں جس کو عمرؓ نے اس جگہ
علی العشور ھھنا انا۔	عشور پر مقرر کیا۔

زیاد بن جدیر کو یہ حکم تھا کہ

فلا افتش احداً وما مرّ علی من	میں کسی کی تلاشی نہ لوں۔ جو کچھ میرے سامنے
شیئ اخذت من حساب۔ [۴]	سے گزرے، اس سے حساب کے مطابق لے لوں۔

(ب) دریا کی پیداوار (عنبر وغیرہ) پر ٹیکس لگایا اور یعلی بن اُمیہ کو محصل مقرر کیا۔

---

[۱] تفسیر طبری ص ۱۰۲ [۲] کتاب الاموال ص ۵۳۳ [۳] ص ۴۲۳ ازالۃ الخفا مقصد دوم سیاست فاروق اعظم ص ۶۲

استعمل یعلی بن امیۃ علی البحر[1] — یعلی ابن امیہ کو دریا پر عامل مقرر کیا۔

(ج) خراج مقرر کیا اور اس میں رومی و ایرانی دنیا سے زیادہ استفادہ کیا۔

(۱۰) معیار زندگی پر پابندی لگائی اور روزانہ گوشت کھانے سے لوگوں کو روک دیا۔ چنانچہ ذبح خانہ خود تشریف لے جاتے اور جس کو دو دن متواتر گوشت خریدتے دیکھتے، درّے سے سزا دیتے تھے۔

فاذا رای رجلاً اشتری لحماً یومین متتابعین ضربه بالدرة[2] — جب کسی شخص کو دیکھتے کہ وہ مسلسل دو دن گوشت خرید رہا ہے تو اس کو درّے سے مارتے

اور یہ فرماتے تھے۔

الا طویت بطنك لجارك وابن عمك[3] — تو نے اپنے پڑوسی اور چچیرے بھائی کے لیے کیوں کفایت نہیں کی۔

(۱۱) مستقل ذریعہ آمدنی بنانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ خالدؓ نے "قادسیہ" کے عطایا و ذخائر دیکھ کر کہا کہ بعض لوگوں کے اخراجات زیادہ نہیں ہیں، کھانے والے افراد بھی کم ہیں۔ ایسی حالت میں زیادہ دینے سے فضول خرچی کے جذبات اُبھرنے کا اندیشہ ہے۔

یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"جب ان لوگوں کو سرکاری عطایا ملیں تو کچھ بھیڑیں خرید لیں اور ان کی پرورش کرتے رہیں پھر مزید عطایا ملنے پر اور بھیڑیں خرید لیں۔ اس طرح ان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ ممکن ہے میرے بعد کے حکمراں اس نظام کو قائم نہ رکھ سکیں۔ اگر یہ ذریعۂ آمدنی باقی رہے گا تو غریبوں کے کام آئیگا۔ اور لوگ اس کے سہارے اپنی زندگی گزار سکیں گے۔

خالد یہ جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں اس کے مخاطب دور نزدیک کے سب لوگ ہیں۔ جو شخص بالکل آخری سرحد پر بیٹھا ہوا ہے وہ بھی میری ذمہ داری میں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو حکمراں اپنی رعایا کی خبرگیری سے غافل رہتا ہے اس کو فردوس کی بُو تک نہ آئیگی"[4]

(۱۲) وارد و صادر کے لیے سرکاری انتظام کیا چنانچہ خاص اس مقصد کے لیے مال؛ گودام

---

[1] احکام السلطانیہ للماوردی صفحہ ۳۴۲ و کتاب الخطط للمقریزی صفحہ ۳ [2] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الثالث والثلثون صفحہ [3] ایضاً [4] ابوبکر صدیق و فاروق بارھواں باب

بنایا جس میں ضرورت کی مختلف چیزیں رہتی تھیں۔

فجعل فیها الدقیق والسویق والتمر والزبیب ومایحتاج الیه یعین به المنقطع به والضیف[1]

مال گودام میں آٹا ستو، کھجور، کشمش اور دوسری ضرورت کی چیزیں تھیں جن کے ذریعہ مسافروں اور مہمانوں کی مدد کی جاتی تھی۔

(۱۳) معلموں، اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔

ان عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان کانا یرزقان المؤذنین والائمة والمعلمین والقضاة[2]

حضرت عمرؓ و عثمانؓ اماموں، مؤذنوں اور قاضیوں کو تنخواہیں دیتے تھے۔

(۱۴) ہر شخص کو خود کفیل بننے کا حکم دیا۔ اور خاص طور سے مذہبی پیشواؤں کو دوسروں کے لیے بار بننے سے منع کیا۔ چنانچہ فرمایا

یامعشر القراء ارفعوا رؤسکم فقد وضح الطریق واستبقوا الخیرات ولاتکونوا عیالا علی المسلمین[3]

اے علماء کی جماعت اپنے سروں کو اونچا رکھو۔ راستہ کھلا ہوا ہے۔ مال کمانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاؤ اور مسلمانوں پر بوجھ نہ ہو۔

(۱۵) آپ کو نچلے طبقہ کے وظیفہ (تنخواہوں) کی کمی کا شدید احساس تھا اور فرمایا کرتے تھے۔

لئن عشت لاجعلن عطاء سفلة الناس الفین[4]

اگر میں زندہ رہا تو نچلے طبقہ کے لوگوں کی تنخواہ دو ہزار درہم سالانہ (ایک درہم تقریباً چار آنہ کے برابر) مقرر کروں گا

دوسری جگہ ہے۔

لئن عشت حتی یکثر المال لاجعلن عطاء الرجل المسلم ثلاثة آلاف الف

اگر میں زندہ رہا اور مال زیادہ ہوگیا تو ایک مسلمان مرد کا وظیفہ تین ہزار مقرر کروں گا۔

---

[1] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الثلاثون [2] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب تاسع والثلاثون [3] ایضاً الباب الستون [4] ابن سعد ج ۳ ص۲۰۴

لکراعہ وسلاحہ والف نفقۃ لہ	ایک ہزار گھوڑا اور ہتھیار کے لیے، ایک ہزار ذاتی
والف نفقۃ لاھلہ[1]	خرچ کے لیے اور ایک ہزار اہل و عیال کے لیے۔

(۶) "راشن" کا نظم قائم کیا تھا جس کی مقدار میں کوئی تفاوت نہ تھا۔

فکان یرزق الناس والرجل والمرءۃ	مرد، عورت، غلام سب کو ہر ماہ دو جریب غلہ
والمملوك جریبین کل	دو قسط سرکہ اور دو قسط زیتون کا تیل دیتے تھے۔
شہر[2] وقسطی خل وقسطی زیت[3]	

جریب تقریباً ساڑھے بائیں سیر اور قسط پونے دو سیر کا ہوتا ہے۔
راشن کی مقدار مقرر کرنے کی یہ شکل تجویز کی کہ ایک دن ساٹھ آدمیوں کو بلا کر کھانا کھلایا جس میں دو جریب کی مقدار آٹا خرچ ہوا اور تقریباً، سیر کی مقدار سرکہ اور روغن زیتون خرچ ہوا۔ اس کے بعد ہر شخص کے ساٹھ وقت (ایک ماہ) کا غلہ دو جریب (ایک من ۵ سیر کی مقدار) اور ساڑھے تین تین سیر سرکہ اور روغن زیتون مقرر کیا۔[4]

(۷) قحط کے زمانہ میں ہر گھر کے افراد کے برابر ضرورتمندوں کو شریک کرنے کا خیال ظاہر کیا اور قسم کھا کر فرمایا۔

فواللہ لوان اللہ مایفرجہا	اگر اللہ اس صورت سے نجات نہ دے گا تو خدا
ما ترکت باھل بیت من المسلمین	کی قسم میں ہر مسلمان کے گھر میں اس کے افراد
لھم سعۃ الا ادخلت معھم اعدادھم	کے برابر ضرورتمندوں کو داخل کر دوں گا جتنی تعداد
من الفقراء فلم یکن اثنان یھلکان	ایک کے لیے کافی ہوتی ہے اس میں دو کی شرکت
علی مایقیم واحدا۔[5]	سے کوئی بھی ہلاک نہ ہوگا۔

ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ اسلام کی معاشی تنظیم میں حالات کے لحاظ سے کس قدر وسعت ہے۔

---

[1] ابن سعد صفحہ ۳۰۲ ج ۳ [2] [3] ؟ فتوح البلدان صفحہ ۴۶۹ و کتاب الاموال صفحہ ۲۴۷ [5] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الثالث والثلاثون۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علما، و مشائخ کا کردار

(از ڈاکٹر محمد اسلم۔ استاذ تاریخ۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور)

شاہجہاں کی تخت نشینی کے لیے اُس کے بیٹوں میں جنگ ناگزیر تھی اس لیے وہ حصولِ تخت کے لیے علما، اور عوام کی حمایت حاصل کرنے میں کوشاں تھے۔ تخت نشینی کے لیے جنگ اورنگ زیبؒ اور داراشکوہ کے درمیان نہ تھی بلکہ اصل معرکہ راسخ العقیدہ اور آزاد خیال مسلمانوں، شریعت اور آزاد تصوف، وحدت الشہود اور وحدت الوجود، پابند شریعت نقش بندیوں اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ہر ے رام کے نظریات کے درمیان تھا۔ اگر اورنگ زیب اول الذکر گروہوں کا نمائندہ تھا تو داراشکوہ مؤخر الذکر گروہوں کا علمبردار تھا۔ سا ہو گڑھ کی جنگ حصول تخت کے لیے نہیں بلکہ ہندوستان کے آئندہ شہنشاہ کی مذہبی حکمت عملی کا فیصلہ کرنے کے لیے لڑی گئی تھی۔

اورنگ زیب کے سوانح نگار ظہیر الدین فاروقی کے خیال میں ہندو اکبر جیسا بادشاہ تخت پر دیکھنا چاہتے تھے اور مسلمان اس کوشش میں تھے کہ وہ کسی طرح ایسے حالات سے دوچار ہونے سے بچ جائیں۔[۱]

اس لیے فطری طور پر ہندوؤں نے داراشکوہ کی حمایت کی اور راسخ العقیدہ مسلمانوں نے

۱۔ فاروقی، ظہیر الدین، اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز۔ مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۵ء ص ۲۰۔

اورنگ زیب کا ساتھ دیا کیونکہ وہ راسخ العقیدہ اور پابندِ شریعت مسلمان تھا[۵۱]۔ مشہور مستشرق لین پول رقمطراز ہے کہ اسلام کی خدمت کے لیے اورنگ زیب بڑا متشدد اور سخت گیر نظر آتا ہے۔ اُس نے بڑی سختی اور جرأت کے ساتھ اگر ایک طرف اکبر اور دارا شکوہ کے وحدت الوجودی نظریات کے خلاف ردِّ عمل شروع کیا تو دوسری طرف جہانگیر کی ناؤنوش اور شاہجہاں کی عیش کوش پالیسی کے خلاف جنگ لڑی[۵۲]۔ جب دارا شکوہ کے کفر و الحاد کی خبریں عوام کے کانوں تک پہونچیں تو قدرتی طور پر اس کا فائدہ اورنگ زیب کو پہونچا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ میں ایسے آثار نظر آتے تھے کہ وہ بڑھ کر دوسرا اکبر ثابت ہوگا۔ اسے ولی عہدِ سلطنت سمجھا جاتا تھا اور امورِ سلطنت میں اسے اتنا دخل تھا کہ راسخ العقیدہ گروہ کی اکثر کوششیں اس کی وجہ سے کالعدم ہوجاتی تھیں۔ اس لیے وہ لوگ جو راسخ الاعتقادی کے مخالف تھے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرسکتے تھے اور یہ امید بھی کرسکتے تھے کہ آئندہ کسی زمانے میں حکومت میں اُن کا اقتدار قائم ہوجائیگا۔ راسخ الاعتقاد طبقہ کی امیدیں اورنگ زیب پر مرکوز تھیں جو اپنے عقائد و اعمال میں نہ صرف راسخ الاعتقاد تھا بلکہ زاہد و متقی بھی تھا۔ اس کی پارسائی اور اس کے کردار میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو راسخ الاعتقادی کے خیر خواہوں کو اس کے گرد جمع کرنے کے لیے ضروری ہوسکتی تھیں[۵۳]۔ شاہجہاں کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خاں نے بھی اورنگ زیب کی حمایت پر کمر باندھی اور متعدد بار اس نے بھرے دربار میں اورنگ زیب کی حمایت کی اور اس وجہ سے اس نے دارا شکوہ کی ناراضگی مول لی۔ جب نواب موصوف نے اچانک وفات پائی تو بعض لوگوں نے دارا شکوہ پر زہر خورانی کا الزام بھی لگایا۔ شاہجہاں کے راسخ العقیدہ درباری اُمراء نے بھی دارا شکوہ کے مقابلہ میں اورنگ زیب کی حمایت کی[۵۴]۔

اورنگ زیب حضرت امام ربانی مجدّد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا معتقد تھا[۵۵]۔ ان کے علاوہ وہ ان کے بھائیوں اور بیٹوں کا بھی بڑا لحاظ کرتا تھا۔

---

۵۱ لین پول۔ اسٹانلے۔ اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا ان دی مڈل ایجز۔ مطبوعہ بمبئی ۱۹۱۷ء۔ ص ۱۱۱ ۔ ۵۲ ایضاً

۵۳ قریشی، اشتیاق حسین۔ برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۵

۵۴ فاروقی، اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز، ص ۲

۵۵ یوسف حسین۔ گلمپسز آف مڈیول انڈین کلچر۔ مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۷ء۔ ص ۵۹۔ ۵۶ مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء جلد اول، مطبوعہ کانپور ۱۹۰۲ء، ص ۶۴۰۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے فوراً بعد خواجہ محمد معصومؒ اور ان کے برادر بزرگ حضرت محمد سعیدؒ شاہی دربار میں باریاب ہوئے۔ اورنگ زیب نے تین سو طلائی مہریں پیش کیں[1]۔ اس کے بعد بھی اورنگ زیب نے متعدد موقعوں پر خواجہ صاحب کو اپنے دربار میں بلایا اور ہر بار اُن سے بڑی عقیدت سے پیش آیا[2]۔ ان کے صاحبزادوں کی بھی شاہی دربار میں بڑی عزت کی جاتی تھی[3]۔ مرآۃ العالم کے مصنف کے بیان کے مطابق اورنگ زیب نے اپنے چوتھے سال جلوس میں حضرت محمد سعیدؒ کو شاہی دربار میں بلایا اور اُن کی بڑی تکریم کی[4]۔ ان کی باریابی کے بعد ان کے صاحب زادہ شیخ عبدالاحدؒ اور شیخ محمد فرخؒ اورنگ زیب سے ملے اور رخصت کے وقت بادشاہ نے اُن کی خدمت میں بڑے تحائف پیش کیے[5]۔ حضرت مجدد الف ثانی کے سب سے چھوٹے صاحب زادے شیخ محمد یحییٰ سے بھی اورنگ زیب کی اکثر ملاقات رہتی تھی اور ہمیشہ انھیں نقد اور تحائف دیا کرتا تھا[6]۔

اورنگ زیب دہلی سے لاہور جاتے اور واپس آتے وقت، سرہند میں خواجہ محمد معصوم اور خاندان مجددؒ کے دیگر افراد سے ملا کرتا تھا۔ عہد عالمگیر کے ایک ہندو مورخ ایشر داس نے اورنگ زیب کے اٹھارویں سال جلوس کے واقعات میں خانقاہ مجددیہ کے قریب نولکھا باغ میں بادشاہ کے قیام کا ذکر کیا ہے[7]۔ اورنگ زیب نے خواجہ محمد معصوم سے متعدد بار استدعا کی کہ وہ سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہا کریں لیکن انھوں نے اپنے والد بزرگوار کی نصیحت کے مطابق بادشاہ کے ساتھ رہنا پسند نہیں فرمایا[8]۔

---

[1] i۔ ابوالفتح۔ آداب عالمگیری، قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لنڈن۔ ایتھے ۳۱۷ ورق ب ۱۳۱۔ ii۔ محمد کاظم، عالمگیر نامہ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء ص ۲۹۳۔

[2] محمد بقا، مرآۃ العالم، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لنڈن۔ ایتھے ۳۲۴ ورق ب ۵۲۵۔ [3] ایضاً [4] ایضاً

[5] ایضاً [6] ایضاً

[7] ایشر داس، فتوحات عالمگیری۔ مخطوطہ برٹش میوزیم لنڈن۔ ایڈیشنل ۲۳۸۸۴ ورق ۲۷ الف۔

[8] i۔ مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیا، جلد اول ص ۶۴۰۔ ii۔ محمد مراد، مناقب الحضرات، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لنڈن۔ ایتھے ۶۵۲ ورق ۱۷۰ الف۔

آپ نے اپنی جگہ اپنے فرزند پنجم حضرت سیف الدینؒ کو دہلی بھیج دیا، جہاں وہ بقول محمد ساقی مستعد خاں قلعہ کے اندر شاہی محل کے جوار میں رہنے لگے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بادشاہ کاروبار سلطنت سے فارغ ہو کر رات گئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا۔[1] مآثر عالمگیری میں ایسی ایک صحبت کی تفصیل درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب حضرت سیف الدین سے توجہ لینے کے علاوہ ان کی نگرانی میں منازل سلوک بھی طے کیا کرتا تھا۔[2] تھوڑے ہی عرصہ میں بادشاہ نے سلوک کی کئی منازل طے کر لیں۔ حضرت سیف الدین نے اپنے والد مکرم کے نام ایک خط میں بڑی مسرت کے ساتھ اس بات کا ذکر کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں

> بادشاہ دین پناہ را در خدمت حضرت اخلاص بنوع دیگر است از ذکر لطائف و ذکر سلطانی گزشتہ بہ ذکر نفی و اثبات مقیدات و ظاہری سازد کہ بعضے اوقات خطرہ مطلقاً نمی آید و گاہے کہ می آید استقرار نمی گرد ازیں راہ خیلے محظوظ است وی گوید کہ پیش ازیں من از ہجوم خواطر دل تنگ بودم و شکر ایں نعمت بجا می آرد۔[3]

حضرت سیف الدین کے خط کے جواب میں خواجہ محمد معصوم نے جو خط تحریر فرمایا تھا وہ اُن کے مکتوبات میں موجود ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے مکتوب میں خدا کا شکر ادا کیا ہے جس نے بادشاہ کو روحانی مراتب عطا فرمائے ہیں۔ اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو فنائے قلبی کا مقام حاصل ہو چکا تھا جو ولایت میں ایک اعلیٰ مقام سمجھا جاتا تھا۔[4] اورنگ زیب نے اپنے بارھویں سال جلوس میں اپنے بیٹے اعظم کی جو شادی کی اس تقریب میں جو علماء و مشائخ موجود تھے ان میں حضرت سیف الدین کا نام نامی بھی شامل ہے۔[5] اورنگ زیب کے دل میں حضرت سیف الدین کے برادر بزرگ اور خواجہ محمد معصوم کے جانشین خواجہ محمد نقشبندؒ کی بڑی عزت تھی۔ بسنہ ۱۰۹۰ھ میں آپ بادشاہ کے ساتھ موجود تھے۔[6] خواجہ

---

[1] محمد ساقی مستعد خاں، مآثر عالمگیری مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۷۱ء ص ۸۲ [2] ایضاً

[3] مکتوبات سیفیہ۔ مطبوعہ سعید آرٹ پریس حیدرآباد۔ مکتوب نمبر ۱ ص ۱۱

[4] مکتوبات خواجہ محمد معصوم (اردو ترجمہ) مطبوعہ لکھنؤ سنہ ۱۹۶۰ء۔ مکتوب ۲۲ ص ۲۸۰، ۲۸۱

[5] [illegible] مستعد خاں، مآثر عالمگیری ۸۰، [6] ایضاً۔

محمد نقشبند کے مکتوبات وسیلۃ القبول الی اللہ والرسول کے نام سے پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی سعی و کاوش سے دو جلدوں میں ۱۹۶۳ء میں حیدرآباد سے شائع ہو چکے ہیں اس مجموعہ میں خواجہ موصوف کے کئی خطوط بادشاہ کے نام موجود ہیں جن سے ان کے باہمی تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ۱۰۹۹ھ میں اورنگ زیب کے حکم سے خواجہ موصوف کے صاحب زادہ محمد عمر کی شادی ابوالحسن تاناشاہ کی بیٹی کے ساتھ ہوئی[۵] اگر روضۃ القیومیہ کی روایت پر اعتماد کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ خواجہ محمد معصوم کے صاحب زادے حضرت محمد اشرف اور بھتیجے شیخ سعد الدین اورنگ زیب کے زمانۂ شہزادگی میں اس کے ساتھ دکھن میں مقیم تھے[۶] اور جب اورنگ زیب داراشکوہ کے مقابلہ پر نکلا تو شیخ محمد اشرف اس کی فوج میں موجود تھے[۷]

حضرت سیف الدینؒ نے بادشاہ کے ساتھ رہ کر ترویج شریعت اور احیاء سنت کے لیے بڑا کام کیا۔ موصوف کے خطوط کا مجموعہ مکتوبات سیفیہ کے نام سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی محنت اور کوشش سے حیدرآباد سے طبع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں بادشاہ کے نام حضرت سیف الدین کے دو درجن کے قریب مکتوبات موجود ہیں جن میں بادشاہ کی توجہ رفع بدعت اور احیاء سنت کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔ موصوف کی انہی خدمات کی بنا پر نقشبندی حلقوں میں آپ کو محی السنت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے[۸]۔

میری ناقص رائے میں یہ خاندان مجددؒ ہی تھا جس نے اورنگ زیب کو محی الدین بنایا۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد ان کے تیسرے صاحب زادے خواجہ محمد معصوم ان کے جانشین ہوئے۔ آپ اپنی علمیت، تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے عوام میں بے حد مقبول تھے۔ اپنے والد کی طرح آپ بھی عمر بھر ترویج شریعت اور احیائے سنت کے لیے کوشاں رہے۔ آپ کی اپنے مریدوں کو ہمیشہ یہی نصیحت ہوا کرتی تھی کہ وہ حتی الوسع سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلیں[۹]۔ اپنے ایک مکتوب میں آپ اپنے ایک مخلص مرید مولانا محمد حنیف کے نام تحریر فرماتے ہیں کہ

---

[۱] ایضاً [۲] کمال الدین محمد احسان، روضۃ القیومیہ، رکن دوم مطبوعہ لاہور ۱۳۳۵ھ ص ۱۰۷۔ [۳] ایضاً [۴] دکیل احمد، ہدیۂ مجددیہ مطبوعہ دہلی ۱۳۰۹ھ ص ۳۳۲۔ [۱۱] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۶۲۶۔ [۱۱۱] سید امام الدین، برکات اولیا، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ ص ۱۳۲۔ [۸] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (فارسی) مطبوعہ کان پور۔ مکاتیب نمبر ۲۳، ۴۰، ۸۹، ۱۶۶، ۱۶۸، ۲۲۰۔

ایک صوفی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کیے بغیر اپنے مقصود تک پہونچ سکے[۵۱] اسی طرح آپ اپنے ایک دوسرے مرید محمد صدیق کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مردہ سنت کو زندہ کرتا ہے اُسے قیامت کے دن سو شہیدوں کا ثواب دیا جائے گا[۵۲] حضرت مجدد صاحب کی طرح خواجہ محمد معصوم نے بھی اپنے مکتوبات میں ترویج شریعت اور احیائے سنت پر بہت زور دیا ہے۔

جب دارا شکوہ نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے دلچسپی ظاہر کی اور اُن کے ترجمہ اور نشر و اشاعت میں سرگرمی دکھلانے کے علاوہ اس نے ہندوؤں کے کئی عقائد بھی اپنا لیے تو مذہبی طبقوں میں اس کے خلاف ردعمل پیدا ہوا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تحریر فرماتے ہیں کہ دارا شکوہ کے تخت نشین ہونے کی صورت میں راسخ الاعتقاد گروہ کے لیے بہت خطرات درپیش تھے۔ کیونکہ اکبر کے آخری زمانے کے بعد سے اس گروہ کو جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ سب ملیامیٹ ہو جاتی، دارا شکوہ ہندومت اور اسلام کے بالکل ایک ہونے پر پکا عقیدہ رکھتا تھا اور اس نے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ اگر دارا شکوہ بادشاہ ہو جاتا تو اس میں اور اکبر میں خاص فرق یہ ہوتا کہ اکبر کا دماغ تو رسمی تعلیم کے ذریعہ تربیت یافتہ نہیں تھا اور دارا شکوہ ایک لائق و فائق فاضل تھا۔ اس طرح وہ راسخ الاعتقادی کے مفادات کو اور زیادہ نقصان پہونچا سکتا تھا[۵۳] ہمارے خیال میں اس موقع پر راسخ الاعتقاد مسلمان دارا شکوہ کے اثر و رسوخ کو ختم کرنا اپنا فرض اولین سمجھنے لگے۔ انہی ایام میں خواجہ محمد معصومؒ اپنے ایک مرید حسن علیؒ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

برادر عزیز! آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان دنوں بدعات عام ہوتی جا رہی ہیں اور سنت پس پشت ڈالی جا رہی ہے۔ اس تاریک زمانے میں فوری اور اہم ترین کام علوم شریعت کی تحصیل اور اُن کی نشر و اشاعت ہے۔ اسی طرح ترویج شریعت اور احیاء سنت نبوی بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ علوم شریعت کی نشر و اشاعت اور احیاء سنت کے لیے بڑھ چڑھ کر کوشش کریں[۵۴] اسی طرح اپنے

---

[۵۱] ایضاً مکتوب نمبر ۲۱۔ [۵۲] ایضاً مکتوب نمبر ۲۲۰۔ [۵۳] برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء ص ۲۰۵۔
[۵۴] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (فارسی) مطبوعہ کانپور ۱۸۸۰ء مکتوب نمبر

ایک مکتوب میں آپ مولانا جمال الدین کو نصیحت فرماتے ہیں کہ وہ پوری تندہی سے ترویج شریعت اور احیار سنت کے لیے کام کریں[1]

ان امثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواجہ محمد معصومؒ ترویج شریعت اور احیار سنت کے لیے کس قدر کوشاں رہتے تھے۔ مفتی غلام سرور لاہوری کے قول کے مطابق آپ کے سات ہزار کے قریب خلفار اور نو لاکھ کے قریب مرید سلطنت مغلیہ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے جو اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اپنے پیر و مرشد کے مشن کی تکمیل میں دل و جان سے لگے رہتے تھے[2] خواجہ احمد اعظم دیدہ مریؒ کی روایت کے مطابق عالمگیری فوج میں بھی آپ کے خلفار موجود تھے[3] مناقب الحضرات کی روایت کے مطابق سینکڑوں کی تعداد میں خوانین اور اُمرار آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے جو گاہے گاہے آپ سے ملتے رہتے تھے[4] علاوہ ازیں علمار اور طلبار کا ایک جم غفیر ہمہ اوقات آپ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا[5]

معتبر روایت کے مطابق خواجہ محمد معصومؒ کے ۹ لاکھ کے قریب مرید تھے جن میں سے سات ہزار کو خرقۂ خلافت عطا ہوا تھا[6] شیخ محمد بقار رقمطراز ہیں کہ عہد جہانگیری میں ملک کے طول و عرض میں آپ کے بے شمار مرید پھیلے ہوئے تھے[7] مغلیہ حکومت کے دائرۂ اقتدار سے باہر بھی آپ کے مریدوں کی کافی بڑی تعداد تھی۔ جب آپ حج بیت اللہ کے لیے حجاز تشریف لے گئے تو وہاں بے شمار لوگوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی[8] علاوہ ازیں آپ نے محمد صدیق بخاریؒ کو خرقۂ خلافت دے کر حرمین شریفین میں سلسلۂ عالیہ کی ترویج کے لیے بھیجا تھا[8]

خواجہ محمد معصومؒ اور شیخ آدم بنوریؒ کے مریدوں کی اس قدر تعداد باعث تعجب نہیں، صرف اتنی سی بات ذہن میں رکھنی کافی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات عام ہو رہی تھیں اور ان کا سلسلہ اندرون اور بیرون ملک آکاس بیل کی طرح پھیل رہا تھا۔ جن ایام میں ہندوستان کا شہنشاہ اپنے

---

[1] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (فارسی)، مکتوب نمبر ۱۰۱۔ [2] خزینۃ الاصفیار، جلد اول ص ۶۴۰۔ [3] تاریخ کشمیر (قلمی) مطبوعہ سری نگر ۱۹۴۵ء ص ۱۶۳۔ [4] محمد مراد، مناقب الحضرات (مائیکروفلم عندی) ورق ۷۰ الف۔ [5] ایضاً [6] رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۴ء ص ۶۱۲۔ [7] شیخ محمد بقار، مرأۃ العالم ورق ۵۲۵ ب۔ [8] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیا، جلد اول ص ۶۴۰۔ [9] مکتوبات خواجہ محمد معصوم (اردو) مطبوعہ لکھنؤ، مکتوب نمبر ۲۲ ص ۲۲۷

دار الحکومت میں تخت طاؤس پر بیٹھ کر وسط ایشیا پر اپنا تسلط قائم رکھنے میں ناکام رہا، سرہند اور بنور کے بوریہ نشین فقیر وسط ایشیا کے باشندوں کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے۔ اس کا اندازہ خواجہ محمد معصوم سرہندی اور شیخ آدم بنوری کے خلفاء کی فہرستیں دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ جن میں اکثر و بیشتر نام ماوراء النہریوں کے ہیں۔

اورنگ زیب اپنے عنفوان شباب ہی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے متاثر ہو چکا تھا۔ اور اس نے ان کے جانشین خواجہ محمد معصومؒ کے ساتھ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ زمانۂ شہزادگی میں اس کی خط و کتابت اکثر خواجہ صاحب سے رہتی تھی۔ خواجہ صاحب کے مکتوبات میں ایسے مکاتیب موجود ہیں جو "شہزادۂ دین پناہ" کے نام لکھے گئے تھے[1]۔ جب خواجہ صاحب حج بیت اللہ کے ارادہ سے سورت روانہ ہوئے تو اورنگ زیب ان دنوں دکن میں مقیم تھا۔ اس نے اس موقع پر آپ کی ملاقات کو غنیمت جانا اور نربدا عبور کر کے آپ سے ملنے آیا اور آپ کی دعائیں حاصل کیں[2]۔ مفتی غلام سرور لاہوری کی روایت کے مطابق آپ نے مدینۂ منورہ میں روضۂ رسولؐ پر اورنگ زیب کی کامیابی کے لیے دعا کی تھی[3]۔

"شہزادۂ دین پناہ" کے نام ایک مکتوب میں خواجہ صاحبؒ اسے جہاد شروع کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ بتلاتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں ایک گھڑی کا جہاد حرم مکہ میں حجر اسود کے پاس لیلۃ القدر کے قیام سے افضل ہے[4]۔

جب اورنگ زیب برہان پور سے فوج لے کر نکلا تو خواجہ صاحب نے اسے ایک خط ارسال کیا، جس میں اسے دار الحکومت پر فوج کشی پر تحسین پیش کی، اسی مکتوب میں آپ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یاد دلاتے ہیں جس میں انھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہدوں کو اجر عظیم کی بشارت دی ہے[5]۔ اس مکتوب سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواجہ محمد معصومؒ دارا شکوہ کے خلاف اورنگ زیب کی یلغار کو محض تخت نشینی کے لیے شہزادہ کی جنگ نہیں بلکہ جہاد سمجھتے تھے۔

---

[1] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (فارسی) مکتوب ۴۲، ص ۱۷۱۔ [2] کمال الدین محمد احسان، روضۃ القیومیہ رکن دوم ص ۱۰۷
[3] خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۴۴۰ [4] مکتوبات خواجہ محمد معصوم (فارسی) مکتوب ۹۹، ص ۱۱۳ [5]

سطور بالا سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ دارا شکوہ کے خلاف فوج کشی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خاندان اور اُن کے عقیدت مندوں کی ہمدردیاں اورنگ زیبؒ کے ساتھ تھیں۔

دارا شکوہ، جسے اورنگ زیب رئیس الملاحدہ، ملحد نامقبول اور ملحد نکو سیدہ خیال کیا کرتا تھا[۱] کے مقابلہ پر نکلنے سے پہلے اورنگ زیب نے ایک ماہ برہان پور میں فوجی تیاریوں میں بسر کیا[۲] یہ شہر ان دنوں مغلیہ سلطنت کے آباد ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا اور عوام اسے دار السرور کہا کرتے تھے[۳] یہ شہر نقشبندیوں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے خلیفۂ اول میر محمد نعمان کو نقشبندیہ سلسلے کی ترویج کے لیے برہان پور بھیجا تھا۔ میر صاحب ترک سکونت کر کے اکبر آباد چلے گئے تو اُن کی جگہ حضرت مجددؒ نے خواجہ محمد ہاشم کشمی کو برہان پور بھیجا[۴]۔ خواجہ موصوف کے شہزادۂ عالی مرتبہ کے ساتھ بڑے خوشگوار تعلقات تھے اور ان کی فرمائش پر آپ نے متعدد غزلیں کہی تھیں جو ان کے دیوان میں موجود ہیں[۵] مجدد الف ثانیؒ کے بعد یہ شہر خواجہ محمد معصومؒ کی توجہ کا بھی مرکز رہا اور آپ نے اپنے متعدد خلفاء کو عوام کے رشد و ہدایت کے لیے برہان پور روانہ کیا۔ ان خلفاء میں ابو المظفر صوفیؒ نے بڑا نام پایا۔ سید امام دین کے قول کے مطابق صوفی صاحبؒ برہان پور کے عوام میں بہت مقبول ہوئے اور بے شمار لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے[۶] نقشبندیوں کے علاوہ دیگر سلاسل کے جو بزرگ برہان پور میں رہائش پذیر تھے انھوں نے بھی اورنگ زیب کی حمایت کا اعلان کیا[۷]

اورنگ زیب کی تعلیم و تربیت اس دور کے بڑے جید اور دیندار علماء کی نگرانی میں ہوئی تھی اور وہ سب کے سب اپنے علم و تقویٰ کی بنا پر عوام میں بے حد مقبول تھے اور فطری طور پر انھوں نے دارا شکوہ

---

[۱] عنایت خان، عنایت نامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن اورئینٹل: ۱۴۱ ورق ۱۲۲ الف تا ۱۲۷ الف [۲] محمد کاظم، عالمگیر نامہ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء ص ۴۰ [۳] بھیم سین، نسخۂ دلکشا، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن اورئینٹل: ۲۳ ورق ۶ الف تا ۸ ب [۴] محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات مطبوعہ لاہور ص ۳۱۹۔ [۵] ماہنامۂ المعارف لاہور بابت ۱۰ مئی ۱۹۶۹ء۔ ملاحظہ ہو راقم السطور کا مضمون بعنوان خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ [۶] این چار غزل را کہ در اول بیت بیان عزت آخرات در ردیف مشکل باشارۂ شاہزادہ اے عالی مرتبہ دظلہم نظم نمودہ اند۔ دیوان خواجہ محمد ہاشم کشمی، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری۔ مائکرو فلم عندی۔

[۷] امام الدین، برکات اولیاء، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ۔ ص ۱۲۰۔ [۸] یوسف حسین، گلمپسز آف دی میڈیول انڈین کلچر ص ۶۰-۵۱۔

جیسے رئیس الملا احمد، ملا محمد ناصقبول اور ملا محمد نکو سیدہ فعال کے خلاف اورنگ زیب کا ساتھ دیا تھا منوچی لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کا ایک استاد شیخ میرک خوانی ۱۶۵۹ء میں اجمیر کے قریب دارا شکوہ کے خلاف میدان کارزار میں کام آیا۔[۱]

شیخ آدم بنوری نے اپنی وفات سے کافی عرصہ پہلے اپنے مریدوں کو اورنگ زیب کی حمایت کرنے کی نصیحت فرمائی تھی۔[۲] شاہ نعمت اللہ ولی کے اخلاف میں سے خلیل اللہ خاں نے اپنے ساتھیوں سمیت جنگِ تخت نشینی میں اورنگ زیب کی حمایت کی۔[۳] قصور کے افغانوں نے شیخ آدم بنوری کے خلیفہ شیخ عبدالخالق کی خدمت میں استدعا کی کہ وہ اورنگ زیب کی کامیابی کے لیے دعا فرمائیں۔[۴] ان امثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس جنگ میں نقشبندیوں کا عام رجحان اورنگ زیب کی طرف تھا۔

شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے اخلاف میں سے شیخ الاسلام خواجہ عابد جن کا شمار ماوراء النہر کے جید علماء میں ہوتا ہے، اورنگ زیب کی حمایت میں دارا شکوہ کیخلاف لڑے۔ دارا شکوہ کی شکست کے فوراً اورنگ زیب نے انھیں سہ ہزاری ذات اور پانصد سوار کا منصب اور "خان" کا خطاب عطا کیا۔[۵] جب دوبارہ دارا شکوہ اور راجہ جسونت سنگھ اورنگ زیب کے مقابلے کو نکلے تو اس جنگ میں بھی خواجہ عابد نے اپنی بہادری کے جوہر دکھلائے۔ اورنگ زیب نے اس بار انھیں ترقی دے کر چار ہزاری ذات اور ہفت صد سوار کا منصب عطا کیا۔ چوتھے سال جلوس میں اورنگ زیب نے انھیں صدر کے عہدہ پر فائز کیا۔ اس کے دو سال بعد آپ اجمیر کے گورنر بنے اور چند سال بعد آپ کا ملتان تبادلہ ہو گیا۔[۶] چوبیسویں سال جلوس اورنگ زیب نے رضوی خان کی جگہ خواجہ عابد کو "صدر کل ہندوستان" بنایا۔[۷]

شہرۂ آفاق محدث شیخ طاہر پٹنی کے پوتے شیخ عبدالوہاب سے زمانہ شہزادگی میں اورنگ زیب کی راہ و رسم تھی۔[۸] جب اورنگ زیب برہان پور سے دارا شکوہ کے مقابلہ کے لیے نکلا تو شیخ عبدالوہاب نے

---

[۱] منوچی سٹوریا ڈو مگر، مطبوعہ لندن ۱۹۰۷ء، ص ۲۲۰۔ [۲] محمد مراد۔ مناقب الحضرات، ورق ۲۰۲ الف [۳] محمد شفیع، مرآت واردات، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن ایڈیشنل ۶۵۷۹ ورق ب ۸۶ [۴] محمد مراد مناقب الحضرات ورق ۲۰۱ الف [۵] شاہنواز خاں، مآثر الامراء، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۸ء جلد سوم ص ۱۲۰ [۶] ایضاً ص ۱۲۱ [۷] ایضاً ص ۱۲۲ [۸] شاہنواز خاں۔ مآثر الامراء، مطبوعہ کلکتہ۔ جلد سوم۔ ص ۱۲۰۔

فتویٰ دیا کہ شاہجہاں بیماری اور ضعف کی بنا پر کاروبار سلطنت چلانے سے معذور ہے اس لیے اورنگ زیب کی دارالحکومت پر فوج کشی شرعاً جائز ہے[51]۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے فوراً بعد اس صلہ میں آپ کو قاضی عسکر کے عہدہ پر فائز کیا گیا[52]۔

اسی طرح برہان پور کے ملا قطب ہانسی کے ساتھ بھی اورنگ زیبؒ کے بڑے عمدہ مراسم تھے انھوں نے بھی اس مہم میں اورنگ زیب کی دل وجان سے مدد کی جس کے صلہ میں اورنگ زیب نے تخت نشین ہوتے ہی انھیں ایک گاؤں بطور جاگیر اور چار لاکھ دام نقد عطا کیے[53]۔

مسلمانوں کے دیندار اور دینی حمیت رکھنے والے طبقے نے دل وجان کے ساتھ اس جنگ میں اورنگ زیب کا ساتھ دیا۔ کیونکہ وہ حصولِ تخت کے لیے ان کا نمائندہ تھا۔ مشہور ہندو مؤرخ مکھن لال رائے چودھری رقمطراز ہے کہ اورنگ زیب نے "مذہب خطرہ میں ہے" کا نعرہ لگایا جو بڑا سود مند ثابت ہوا اور اس طرح اُس نے اپنا سیاسی مقصد حاصل کیا[54]۔ فاروقی صاحب کے خیال میں اورنگ زیب کی تخت نشینی پر دیندار طبقوں میں بڑی مسرت کا اظہار کیا گیا اور لوگ اسے نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ کیونکہ انھیں یہ اندیشہ دامنگیر تھا کہ دارا شکوہ کی کامیابی سے اکبر کا زمانہ واپس لوٹ آئے گا[55]۔

تخت نشینی کے بعد بھی اورنگ زیب نے خواجہ محمد معصوم کے ساتھ اپنے تعلقات قائم رکھے[56] اور بسا اوقات وہ مذہبی امور میں ان سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ خواجہ صاحبؒ کے بعض مکتوبات سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ مذہبی امور میں ان کی ہدایات کا منتظر رہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خواجہ صاحب بھی اورنگ زیب کی پالیسی سے متفق تھے اور اس کے لیے اکثر دُعا کیا کرتے تھے[57]۔ اورنگ زیب نے اپنے دورِ حکومت میں اکبر اور دارا شکوہ کی جاری کردہ بدعات کو ختم کرنے کی دل وجان سے کوشش کی اور اس طرح اُس نے حضرت مجدد الف ثانیؒ اور خواجہ محمد معصومؒ کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔

---

[51] ڈاکٹر پی سرن۔ دی پراونشل گورنمنٹ آف دی مغلز۔ مطبوعہ الہ آباد سنہ ۱۹۴۱ء ص ۳۲۵ [52] آثر الامراء جلد اول ص ۳۲۶۔ [53] محمد بقا، مرآت جہاں نما، مخطوطہ برٹش میوزیم اورنٹیل ۱۹۹۸ ورق ۲۴۴ الف [54] دی اسٹیٹ اینڈ ریلیجن ان مغل انڈیا۔ مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۹۵۱ء ص ۲۱۹۔ [55] فاروقی، ظہیر الدین، اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز۔ مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۵۳ء ص ۵۶۴ [56] مکتوبات خواجہ محمد معصوم (اردو) مکاتیب نمبر ۶، ۶۴، ۲۲۱، ۲۲۷ [57] ایضاً مکتوب نمبر ۲۲۷۔ ص ۲۸۶۔ ۲۸۵۔

قوم یہود اور ہم — قرآن کی روشنی میں
(از مولانا عبد الکریم پاریکھ)
۲۸۰ صفحات کی یہ کتاب قرآن مجید کی ان بے شمار آیتوں کی تفسیر ہے جو یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہیں معلومات سے بھرپور یہ کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔
حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی صدر مسلم مجلس مشاورت نے اپنی تقریظ میں تحریر فرمایا ہے کہ "میری رائے میں یہ خدمت انجام دے کر پاریکھ صاحب نے وقت کی ایک اہم اور شدید ضرورت کو پورا کیا ہے۔ انشاء اللہ یہ کتاب عوام و خواص سب کے لیے سبق آموز ثابت ہوگی۔"
یہ مصنف کے ۔۔۔ سال درس قرآن کے سلسلے میں مطالعہ قرآن کا نتیجہ ہے۔ ترجمہ اور تفسیر میں آزادی رائے سے کام لینے کے بجائے قدیم و جدید مفسرین کے فکری دائرہ میں رہ کر یہ خدمت انجام دی گئی ہے۔
قیمت مع جلد..... سات روپے
ملنے کا پتہ:- (۱) عبد الکریم پاریکھ۔ لکڑ گنج، ناگپور ۲
(۲) تاج آفس۔ محمد علی روڈ، بمبئی ۳

ایک نیا سنگِ بنیاد رکھیے!
ماء اللحم خاص
قبل از وقت بوڑھوں اور غیر صحت مند نوجوانوں کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ تازہ پھلوں قیمتی دواؤں اور بہترین غذاؤں سے جدید طریقہ پر تیار کیا جاتا ہے
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

اِرشاداتِ حکیم الاُمّت حضرت تھانویؒ

مجالس لکھنؤ میں

تلخیص ـــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

(آخری قسط)

فرمایا۔ حضرت حاجی صاحبؒ ذکر و عمل کے عاشق تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہیں کام کرو اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔ ـــــ

فرمایا ـــ مریض کو چاہیے کہ اپنے آپ کو بالکل طبیب کے سپرد کر دے اور طبیب کو چاہیے کہ بیجا رعایت نہ کرے ورنہ نفع نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر مُصلح ' مریضِ باطن کی بیجا رعایت کرے اور مُناسب روک ٹوک نہ کرے تو فائدہ نہیں ہوگا۔ اور ایسے طبیب و مُصلح خائن ہو جائیں گے ـــــ

فرمایا ـــ مشائخ کا قول ہے کہ اگر شیخ کی کوئی تعلیم سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھے کہ میری سمجھ کی کوتاہی ہے اور اُس پر عمل شروع کر دے۔ شیخ پر اعتراضات نہ کرے ورنہ نفع نہیں ہو سکتا۔ جیسے طبیب نسخہ لکھے تو گو اس کی علت سمجھ میں نہ آئے مگر اُس پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر طبیب پر نکتہ چینی کرے گا تو اس سے نفع نہ ہوگا۔ پہلے نسخے کو استعمال کرے پھر دیکھے کیا ہوتا ہے ' بس یہی حال تعلیمِ شیخ کا ہے۔ عمل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر نفع ہوا۔ البتہ اگر دلیلِ شرعی سے وہ معصیت ہو تو ادب کے ساتھ عذر کر دے ـــــ

فرمایا ـــ غیر ضروری سوالات کے جوابات کا قصد نہ کرنا چاہیے۔ آج کل اکثر اہلِ علم

ہر سوال کے جواب کا قصد کرتے ہیں۔ خواہ سوال معقول ہو یا نامعقول ۔ اسکی وجہ سے بہت گڑبڑ ہوتی ہے ۔

فرمایا ۔ میں نے اس سفر میں بیعت کرنے سے انکار کر دیا ہے مگر عورتیں بشرط اذن شوہر اس سے مستثنیٰ ہیں ..... مجھے اُن پر بہت رحم آتا ہے۔ باقی تعلیم کے لیے (مردوں کو) سفر میں بھی خط بھیجنے کی اجازت ہے۔

فرمایا ۔ مجھے مسلمان کے ایک ایک پیسے کا خیال رہتا ہے کہ بیجا صرف نہ ہو اور میں اس معاملے میں بہ نسبت غربا کے اُمرا کی زیادہ رعایت کرتا ہوں کیونکہ اُمرا بظاہر تو ٹھاٹھ سے رہتے ہیں لیکن حال یہ ہوتا ہے کہ اکثر خرچ اُن کی آمدنی سے زائد ہوتا ہے اور غریب بیچارے عموماً حسب حیثیت خرچ کرتے ہیں بلکہ آمدنی سے کم ہی خرچ کرتے ہیں۔ اس لیے بھی ہدیہ میں اُمرا کے لیے زیادہ قیدیں لگاتا ہوں۔ غربا کے لیے اتنے قیود کی ضرورت نہیں .....

فرمایا ۔ میرٹھ میں سلامت علی نامی ایک بہت متقی طبیب تھے۔ نبض دیکھنے کے وقت سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۔ پڑھا کرتے تھے۔ اور نسخہ لکھ کر آیاتِ شفا اُس پر دَم کیا کرتے تھے۔ اُس سے بہت نفع ہوتا تھا ۔ اسی سلسلے میں فرمایا کہ مولوی سید محمد صاحب مچھلی شہری سب جج جب اجلاس پر بیٹھتے تھے وہ بھی سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ پڑھا کرتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ قلم سے حق ہی نکلے۔ متقی اور پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے پھر اِن سب جج صاحب کا ایک اور واقعہ بیان فرما کر فرمایا کہ پہلے دنیادار بھی ایسے دیندار ہوتے تھے کہ آج کل کے بعض مشائخ و علماء وہاں تک بمشکل پہونچتے ہیں ۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ دُنیاوی تعلیم کے لحاظ سے غیر تعلیم یافتہ عورتیں گو عرفی تہذیب سے عاری ہوتی ہیں لیکن آج کل کی تعلیم یافتہ عورتوں سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ بعضی

عہ پاک ذات ہے تیری اے اللہ ۔ ہم کو اتنا ہی معلوم ہے جتنا تو نے ہم کو سکھایا۔ تو ہی ہے اصل دانا اور حکمت والا۔

تعلیم یافتہ عورتیں اپنے شوہر سے بھی نفاق برتتی ہیں۔ اُن کی تہذیب صرف دکھاوے کی ہوتی ہے اور غیر تعلیم یافتہ اپنے شوہروں پر دل و جان سے فدا ہوتی ہیں ...... اکثر جو عورت جس قدر پھوہڑ اور بد سلیقہ ہو گی اُسی قدر عفیف اور باعصمت ہو گی اور شریر عورتیں اکثر عرفی طور پر مہذب و تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تہذیب اور عفت (ایک جگہ) جمع نہیں ہوتیں۔

فرمایا کہ بعض بعض بزرگوں کی بیویاں بہت بد مزاج و تند خو ہوئی ہیں مگر وہ اُن کی بدمزاجی پر صبر فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ جو انتہا درجے کے نازک مزاج اور لطیف الطبع مشہور ہیں اُن کی بیوی اِسی درجے کی تند خو اور تیز مزاج تھیں۔ پھر اُن کی تند خوئی کا ایک واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ جب حضرت مرزا صاحب (شہیدؒ) کے انتقال کا وقت قریب آیا تو اِن بیوی سے فرمایا کہ تم قاضی ثناء اللہ صاحب کے یہاں پانی پت چلی جانا ...... قاضی صاحبؒ حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ چنانچہ وہ پانی پت چلی آئی تھیں ــــ میں جب پانی پت گیا تو وہاں کے ایک رئیس کی والدہ نے جو قاضی صاحبؒ کی اولاد میں تھے مجھ کو کچھ پوچھنے پاچھنے کے لیے بلایا تھا۔ مکان میں ایک کوٹھری کی جانب اشارہ کر کے مجھے بتایا گیا کہ حضرت مرزا صاحب شہیدؒ کی بیوی دہلی سے آ کر اس میں رہا کرتی تھیں۔ بچیوں کو کلام اللہ اور مسائلِ ضروریہ کی حسبۃً للہ تعلیم دیا کرتی تھیں۔ بڑی عبادت گزار تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ بہت نیک اور عابدہ تھیں۔ باقی تند خوئی ایک دوسری چیز ہے ــــ اسی سلسلے میں فرمایا کہ ایک لکھنوی بزرگ کی بیوی بہت بد خو اور تیز مزاج تھیں۔ ایک دفعہ اُن بزرگ نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم بہت بد قسمت ہو کہ مجھ سے کچھ نفع حاصل نہیں کرتیں حالانکہ ایک بڑی مخلوق اللہ کے فضل سے نفع اٹھا رہی ہے۔ بیوی نے جواب دیا میں کیوں بد قسمت ہوتی۔ بد قسمت تم ہو کہ تم کو مجھ جیسی تند خو بیوی ملی۔ میں تو بہت خوش قسمت ہوں کہ تم جیسا شوہر ملا ــــ ......

فرمایا ــــ اکثر غلطیوں کا منشاء قلتِ فکر ہے۔ اگر تفکر و تدبر سے کام لیا جائے تو غلطیاں بہت کم ہو جاتی ہیں۔ اگر شاذ و نادر کوئی غلطی سرزد بھی ہوتی ہے تو اس کا اثر بہت خفیف ہوتا ہے اسی واسطے میں انسان کی تعریف کے بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ متفکر کہا کرتا ہوں ......

فرمایا ــــ فیروز پور کے ایک صاحب نے لکھا تھا کہ میں کوٹ پتلون اور ہیٹ بالوضع

میں آنا چاہتا ہوں میں نے لکھ دیا کہ شوق سے آئیے۔ آپ اگر ظاہری امراض میں مبتلا ہیں تو میں باطنی امراض میں گرفتار ہوں۔ ایک مریض کی دوسرے مریض سے ملاقات میں کیا حرج ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ خانقاہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ دوسری جگہ مناسب انتظام کر دیا جائے گا۔ تاکہ نہ آپ کو خانقاہ والوں سے اذیت ہو اور نہ اُن کو آپ کی حالت سے وحشت۔ لیکن جب وہ آئے تو بالکل ملا بن کر آئے۔

فرمایا۔ جو لوگ محض ملاقات کے لیے آتے ہیں اُن سے خشونت برتنا نافع نہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص مُرید ہو یا زیر تربیت ہو تو اُس پر بقدر ضرورت سختی بھی کرنا نافع ہے۔

فرمایا۔ کہ مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے آنے کو لکھا تھا۔ یاد نہیں رہا کہ آج کا دن مقرر کیا تھا یا کل کا۔ ایک صاحب نے کہا کہ آج ہی کا دن مقرر کیا تھا۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ اپنے بھولنے پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ تھانہ بھون سے قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر ایک برات گئی مگر طے شدہ تاریخ سے ایک روز بعد میں پہنچی۔ لڑکی والے بہت بگڑے کہ قرارداد کے خلاف کیا۔ انتظام میں ابتری ہوئی، نقصان ہوا۔ یہ دیکھ کر براتی گھبرا گئے۔ براتیوں میں ایک ظریف بھی تھے وہ بولے کہ بھائیو ہم تھانہ بھون سے تو اسی مقررہ دن خلاً بدھ کو چلے تھے لیکن یہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ آج بدھ نہیں جمعرات ہے۔ لڑکی والوں نے کہا کہ تھانہ بھون سے یہاں تک کا راستہ چند گھنٹوں میں قطع ہو جاتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہاں سے بدھ کو چلے اور یہاں جمعرات کو پہونچے۔ ظریف صاحب نے فرمایا تو پھر زمین کا پھیر معلوم ہوتا ہے۔ اُن لوگوں نے کہا کہ انھوں کا کیا مطلب ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ظریف صاحب نے کہا کہ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو تھانہ بھون جاکر دریافت کر لیجئے وہاں ہر شخص آج بُدھ ہی بتائے گا بس یہ صرف زمین ہی کا پھیر ہے۔ یہ سُن کر سب ہنس پڑے اور ناراضی دور ہو گئی۔

ایک معمر معزز صاحب نے دریافت کیا "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَأْنٍ" کے کیا معنیٰ ہیں؟ فرمایا گستاخی معاف اِس وقت اس سُوال کی کیا ضرورت ہے؟.... اس قسم کے سُوالات کو بذریعہ خط وطن سے بھی کیے جا سکتے ہیں۔ قرآن شریف اتنا سہل نہیں ہے کہ منہ اٹھا کر اُس کے معانی بلا تکلف بیان کر دیے جائیں۔ اگر کوئی شخص تمام عمر بھی خدمت قرآن میں صرف کرے اور تفاسیر کا مُطالعہ

رکھے تب بھی جب اُن کی کوئی آیت آئے گی اس کو ضرور غور و فکر اور تتبع کی ضرورت پڑے گی۔ آپ کو کم ازکم میری بیماری کا خیال کرنا چاہیے تھا کہ غور و فکر اور طویل تقریر سے تکلیف ہوگی۔ خصوصاً اس حالت میں کہ میری تفسیر بیان القرآن موجود ہے اس میں ملاحظہ فرما لیتے اور مجھ کو خود تفسیر کے مضامین ہر وقت مستحضر نہیں رہتے۔ بعض اوقات میں خود اپنی تفسیر دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں ۔۔۔

فرمایا۔ جس قدر کام جوش کے ہوتے ہیں، سب کے سب غیر مستقل اور ناپائدار ہوتے ہیں۔ اور کچھ دنوں میں ختم ہو جاتے ہیں اور جو کام تدبر و تفکر کے ساتھ تدریجاً انجام دیے جاتے ہیں۔ وہ محکم اور مثمر ہوتے ہیں۔ دیکھیے تیز بارش سے (زیادہ) پیداوار نہیں ہوتی اور ہلکی بارش سے کھیتی خوب لہلہاتی ہے ۔۔۔

فرمایا۔۔ آج کل اکثر لوگوں کو دینی رسائل اور دینی مسائل کی طرف بالکل توجہ نہیں۔ صرف ایسے رسالوں کی قدر ہے جن میں حسن و عشق کے مخرب اخلاق قصے ہوں۔ جھوٹے اور دین سوز افسانے ہوں۔ مہمل اور غیر مثمر نظمیں ہوں۔ لوگوں کی ناجائز عیب جوئی اور غیبت ہو۔ بس ان باتوں کی قدر ہے اور دینی باتوں کو خشک بتایا جاتا ہے۔ جس زمانے میں القاسم دیوبند سے شائع ہوتا تھا اُس میں میرا مضمون تربیت السالک بھی مدتوں تک مسلسل نکلتا رہا۔ اسی اثناء میں ایک پنجابی صاحب کا میرے نام خط آیا کہ ہم کو ایسے خشک مضامین کے رسالے کی ضرورت نہیں۔ کوئی تاریخی مضمون ہونا چاہیے۔ یہ خط پڑھ کر مجھ کو وہم ہوا کہ شاید اس قسم کا کوئی خط دیوبند بھی آیا ہو جس سے ارکانِ القاسم کو اندیشہ ہوا ہو کہ ایسے مضامین سے رسالے کو نقصان پہونچے گا مگر میری رعایت کی وجہ سے مجھ کو مطلع نہ کیا ہو۔ اسی لیے میں نے فوراً لکھ دیا کہ لوگ اس قسم کے مضمون پسند نہیں کرتے ہیں۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ اِس مضمون کو بند کر دیا جائے۔ وہ ارکان بخوشی اِس پر راضی ہو گئے۔ دیکھیے میرا وہم صحیح نکلا .....

فرمایا۔۔ مجھ کو شاگردوں سے جتنی محبت ہے مریدین و معتقدین سے اتنی نہیں۔ شاگرد تو اولاد کی طرح ہوتے ہیں ۔ شاگردی و اُستاذی کا تعلق نہایت مستحکم و پائدار ہوتا ہے اور عقیدت کا تعلق اکثر ناقابل اعتبار۔ ارادت کا تعلق ادنیٰ شبہ سے انسان قطع کر دیتا ہے لیکن شاگردی کا تعلق قطع نہیں کیا جاتا ۔۔۔

فرمایا ــــ انسان کا کام ہر شے میں کوشش وسعی اور جدوجہد کرنا ہے۔ اگر خدانخواستہ ناکامی ہو تو صبر کرے اور عمل و کوشش کو نہ چھوڑے۔ ہم نتائج اور غایات کے ترتب کے مکلف اور ذمہ دار نہیں ہیں ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ شرعی ہدایات کے مطابق کوشش میں لگے رہیں خواہ کامیابی ہو یا ناکامی..... دیکھئے اگر کوئی شخص بیماری میں مایوسی کی حالت تک پہنچ جاتا ہے تب بھی اُس کی دوا دارو نہیں چھوڑی جاتی سینے میں بلکہ ناک میں دم آجاتا ہے مگر کوشش جاری رہتی ہے۔ تیماردار اور اعزا آرام سے نہیں بیٹھتے بس یہی حال، قوم کے ساتھ بھی ہونا چاہیے کہ اُس کی خیر خواہی اور ترقی کے لیے اخیر دم تک کوشش میں لگا رہنا چاہیے اور اگر کسی کو قوم سے اِس قدر تعلق نہیں ہے تو وہ محب قوم نہیں کہلا سکتا۔

فرمایا مبلغین کو صرف تبلیغ میں سرگرم رہنا چاہیے ثمرات و نتائج سے بالکل قطع نظر کرلیں، جو کام اپنے کرنے کے ہیں اور اختیاری ہیں وہ کیے جائیں ثمرات چونکہ اختیاری نہیں ہیں اور نہ انسان اُن کا مکلف، اِس لیے اُن کی طرف بالکل توجہ نہ کرنا چاہیے۔

فرمایا ــ مسلمان اپنی قوت سے کام نہیں لیتے۔ استقلال سے اور جم کر کوئی کام نہیں کرتے۔ بہت جلد پژمردہ اور بددل ہو جاتے ہیں اسی لیے اُن کی تحریکات غیر مکمل اور اُن کے اعمال ادھورے رہ جاتے ہیں۔ یہ بات دین کی کمی اور ایمان کی کمزوری کی وجہ سے ہے جتنی دین میں کمی ہوگی اُسی قدر بزدلی پیدا ہو جائے گی۔ دل میں مطلوب طاقت، صرف روحانیت و ایمان سے پیدا ہوتی ہے اور دل کی طاقت ہی کا نام دلیری و شجاعت ہے۔

ایک مجلس میں بڑھاپے اور ضعف کے ذکر پر فرمایا کہ مولانا رومیؒ نے مثنوی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک معمر شخص، طبیب کے پاس گئے اور ضعف بصر کی شکایت کی۔ طبیب نے کہا کہ بڑھاپے کی وجہ سے ہے۔ بڑے میاں نے ضعف معدہ کا ذکر کیا۔ طبیب نے کہا یہ بھی بڑھاپے کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے ثقل سماعت اور درد اعصاب کا تذکرہ کیا۔ طبیب نے اپنے اُسی سابق جواب کا اعادہ کردیا غرض یہ بوڑھے جو شکایت بھی کرتے۔ طبیب یہی کہہ دیتا کہ بڑھاپے کی وجہ سے ہے ــ حتیٰ کہ بڑے میاں کو غصہ آگیا اور طبیب کے ایک دھول رسید کی اور کہا بس تو نے یہی پڑھا ہے کہ جو مرض ہو وہ بڑھاپے کی وجہ سے۔ طبیب نے ہنس کر کہا کہ بڑے میاں مجھے آپ کی اِس حرکت سے کبیدہ نہیں ہوا۔ یہ حرکت بھی بڑھاپے کی وجہ سے ہے۔ واقعی یہ جو مشہور ہے کہ پیری وصد عیب ــــ بالکل دُرست ہے ــــ حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب میں یہ سنتا تھا کہ جوانی جانے سے زندگانی جاتی رہتی ہے تو تعجب ہوا کرتا تھا مگر جب

(باقی ص ۱۱ پر)

نئی نسلوں کا ذہنی انتشار

(جناب سید جمال احمد امین آبادی)

مادّہ پرست نظریات کا تعمیر کردہ نیا سماجی نظام اب تیزی سے شکست و ریخت کا سامنا کر رہا ہے۔ تہذیب نو کی وہ ساری ریگ آسا عمارتیں منہدم ہو رہی ہیں جنھیں تجدید پسند نئی نسلوں نے اپنی عافیت کی پناہ گاہ سمجھ رکھا تھا۔ مذہب و اخلاق سے بغاوت کر کے اہل مغرب نے اپنی دانست میں جن عشرت کدوں کی بنیاد رکھی تھی اب وہ خود اپنے ہاتھوں انھیں مسمار کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ دنیا کی تاریخ کے کسی بھی دور میں نوع انسانی ایسے بھیانک مستقبل کا تصور بھی نہ کر سکی ہوگی۔ آج کا ہر ذہین انسان اس بات سے پریشان ہے کہ اس کی زندگی کی عمارت جن بنیادوں پر کھڑی ہوئی ہے وہ اپنی جگہ سے ہل چکی ہیں۔ اینٹ اور گارے کے بوسیدہ تودے گرتے جا رہے ہیں اور معلوم نہیں کہ کب پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہے۔

نئے یورپ کا مشہور ماہر نفسیات سی جی ینگ (C.G.YUNG) جس کی طرف لوگ اپنی نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کے لیے دیکھا کرتے ہیں۔ سگمنڈ فرائڈ کی طرح یہ بھی علوم نفسیات میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اپنی عمر کے اسّی سنگھائے میل طے کرنے کے بعد مایوسی اور بے اطمانی کے عالم میں پکار اٹھا کہ میں اپنے اور اپنی زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتا۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ جس کے بارے میں میں وثوق سے کہہ سکوں۔ میرے کوئی قطعی معتقدات نہیں ہیں میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ پیدا ہوا اور موجود ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کشاں کشاں کہیں لے جایا جا رہا ہوں، میرا وجود چند ایسی بنیادوں پر قائم ہے جنھیں میں نہیں جانتا۔ؔ انسان کے

ؔ MEMOIRS, DREAMS AND REFLECTIONS
BY MR. C. G. YUNG.

ذہنی افلاس اور اُس کے افکار و اعمال کی بے چارگی کی ٹھیک اسی منزل کی نشان دہی کرتے ہوئے قرآنِ کریم حقائق پر سے پردہ اٹھاتا ہے

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ	جو لوگ اپنے پروردگار کا انکار کرتے ہیں
اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اِشْتَدَّتْ بِهِ	اُن کی حالت باعتبار عمل یہ ہے جیسے کچھ راکھ
الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا	ہو جس کو تیز آندھی کے دن ہوا تیزی سے
يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ	اڑا لے جائے۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا کرایا ہے
ذٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيْدُ ○	اس کا کچھ حصہ بھی انھیں حاصل نہ ہوگا۔ یہی
(ابراہیم - ع ۳)	دور دراز کی گمراہی ہے۔

جو لوگ انکارِ خدا کی اساس پر اپنی زندگی کی تعمیر کرتے ہیں اور سطح بینی کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارا کوئی خالق و مالک ہی نہیں۔ نظامِ کائنات پر انسان کی سرسری نظر انھیں ایک زعم باطل میں مبتلا کر دیتی ہے لیکن تجربات و مشاہدات کی فراوانی جب ان کے ذہنوں کے پردے اٹھاتی چلی جاتی ہے تو انھیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کی زندگی ایک ایسی سمت پر رواں دواں ہے کہ جس کی کوئی منزل موجود نہیں ہے۔ انھیں اپنی زندگی کے رائگاں ہو جانے کا شدید احساس ہونے لگتا ہے ایسے افراد کی مثال قرآن کریم میں ایک اور عجیب انداز سے بیان کی گئی ہے۔

مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ	کلمۂ خبیثہ (یعنی دعوئے کفر) کی مثال ایسی
خَبِيْثَةِ اِجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ	ہے جیسے ایک خراب درخت ہو وہ زمین کے
مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ - (ابراہیم ع ۴)	اوپر سے اکھاڑ لیا جائے اس کو کچھ ثبات نہ ہو

وجود باری تعالیٰ جیسی عظیم حقیقت کا انکار اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک غیر صالح ذہن ہی کی پیداوار ہو سکتا ہے۔ حقائق سے آنکھیں بند کر لینے کے بعد شجر حیات کی حیثیت اس طرح ہو جاتی ہو جس طرح کسی درخت کی جڑوں کے زمین کے اکھڑ جانے کے بعد اس کا انجام ہوتا ہے۔

نئی تہذیب خاردار پودوں کی طرح سطح زمین پر پھیل چکی ہے۔ خدا بیزار فلسفوں اور نظریات کے کڑوے کسیلے پھل اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔ اب ان کا زہر تلخی کام و دہن کے مرحلے سے گزر کر رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے اور انسانی اعصاب پر تشنج کے شدید دورے پڑنے لگے ہیں۔

انگلینڈ کے ایک رسالہ دی پلین ٹرتھ (THE PLAIN TRUTH) کی دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں مسٹر میکنیر (R.E. MCNAIR) کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ تاریخ عالم انسانی میں کبھی نوجوان نسل اتنی بڑی تعداد میں کاہلی، بے چینی، مایوسی اور بغاوت کے جذبات کا شکار نہیں ہوئی تھی جیسا کہ آج دیکھا جا رہا ہے۔ آج کی نئی نسل کو نہ تو اس بات کا ہوش ہے کہ وہ کس چیز کے خلاف بغاوت کر رہی ہے اور نہ وہ یہ جانتی ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

مقالہ نگار نے خصوصاً ہپیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ دنیا کی ہر چیز کے مخالف ہیں ہر شے سے ناراض ہیں، ہر اصول سے برگشتہ ہیں، ہر اخلاق سے منحرف ہیں اور ہر قانون سے بغاوت پر آمادہ ہیں۔ وہ خاندان سے، دولت سے، سماجی نظام سے، غرض ہر چیز سے مایوس بھی ہیں اور بیزار بھی۔ وہ سارے بندھنوں کو توڑ چکے ہیں حتیٰ کہ ان کے پاس لباس بھی ایک بے معنے شے ہے اور صفائی کا تصور بھی فرسودہ روائتی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ ان کا مختصر تعارف یہ ہے کہ وہ ہر شے کے مخالف ہیں۔ مقالہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ اس وطیرہ کے لیے صرف نوجوانوں ہی کو ملزم قرار دینا صحیح نہیں ہے جبکہ خود بڑوں کا نمونہ بھی یہی کچھ ہے۔ یہی آوارگی، یہی بداخلاقی، یہی لاقانونیت، یہی جنسی ہوس رانی پورے سماج میں رچی بسی ہوئی ہو تو پھر نوجوانوں کو کیا کہا جا سکتا ہے۔

لندن کے ہائیڈ پارک (HYDE PARK) میں ۵ جولائی ۱۹۶۹ء کو ہپیوں نے ایک تقریب منائی جس میں ۵ لاکھ سے زائد ہپی لڑکے اور لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ ان کی مرغوب موسیقی لڑھکتے پتھروں (ROLING STONES) کے ساز پر ان لڑکے لڑکیوں نے بے معنے آوازوں، شور و غل، جسم کی بے ہنگم حرکتوں، رونے، چیخنے چلانے اور کراہنے کا ایک ایسا طوفان برپا کیا کہ سارا شہر لرز اٹھا گویا عریانی، فحاشی اور گندگی کا سیلاب آ گیا ہو۔ جب یہ تقریب ختم ہوئی تو ہائیڈ پارک سے ۱۵ ٹن غلاظت برآمد ہوئی۔ اسی طرح ۱۵ اگست ۱۹۶۹ء کو نیویارک میں یہ تقریب منائی گئی جس میں ۴ لاکھ سے زیادہ ہپی جمع تھے۔ حسب معمول الجھے ہوئے بالوں، گندے کپڑوں میں ملبوس بدبودار جسموں نے گندگی اور فحاشی کا بازار گرم کیا۔ اس مرتبہ تو نشہ آور دواؤں کا استعمال پورے عروج پر تھا۔ بارش کی وجہ سے اس تقریب کے لیے منتخب کردہ پلاٹ گندے کیچڑ اور پانی سے لبریز ہو چکا تھا۔ گویا ہپیوں کے ذوق کے لیے یہ ماحول مئے دو آتشہ ثابت ہوا اور اب کی مرتبہ غلاظت کے ساتھ ساتھ کچھ لاشیں بھی برآمد ہوئیں، جو

حالت نشہ میں موت کا سبب (ذمہ دار) بنی تھیں۔

امریکہ کا اخبار نیویارک ٹائمز پکار اٹھا ہے "آخر یہ کس طرح کی تہذیب ہے جو وجود میں آرہی ہے"۔ لندن کے اخبارات چیخ اٹھے ہیں کہ "سوسائٹی کا کاروان کس غلط راہ پر چل پڑا ہے"۔ لیکن آج کون ہے جو بڑھ کر تہذیب جدید کے پرستار اہل مغرب کو بتلائے کہ اِلَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا (کہف) جن کی آنکھوں پر ہماری یاد سے (یعنی دین حق کے مشاہدے سے) پردہ پڑا ہوا تھا اور وہ سن ہی نہ سکتے تھے۔

اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی کا اب مزہ چکھو۔ تم نے اپنے خالق و مالک کے بتلائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر جن پر فریب راہوں کو اختیار کیا تھا، تمہارا اس منزل پر پہنچنا ناگزیر تھا۔

آزاد جنسی اختلاط، اخلاقی قدروں سے بغاوت اور خدا بیزاری کے جذبے سے معمور معاشرے کا انجام اور کیا ہو سکتا ہے؟[۱]

---

[۱] راقم الحروف کے درس قرآن کی ایک محفل میں لندن کا ایک نوجوان شریک ہوا۔ یہ نوجوان بنگلور کے ایک ٹیکنالوجیکل کالج میں کسی ٹریننگ کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ درس کے بعد اس نوجوان سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوا۔ دوران گفتگو راقم الحروف نے دریافت کیا کہ ہپیوں کی سرگرمیوں کا مذہبی حلقوں میں کیا ردعمل پایا جاتا ہے۔ نوجوان اگرچہ خود ہپی نہیں تھا لیکن بہت خوب صورتی سے ہپیوں کے طرز عمل کی حمایت کرنے لگا۔ اس نے کہا اگر کچھ نوجوان نئے اقدار حیات کی تلاش میں نکلیں تو اس پر چرچ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جب اس سے دریافت کیا گیا کہ لندن کے ہپیوں کے ایک ترجمان اخبار نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے (نعوذ باللہ) حضرت عیسٰی پہلے ہپی تھے۔ اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نوجوان نے کہا حضرت عیسٰی نے بھی رائج الوقت سوسائٹی کے خلاف آواز بلند کی تھی، ہپی بھی یہی کر رہے ہیں۔ اس طرح دونوں میں مناسبت پائی جاتی ہے۔ جب اس نوجوان سے کہا گیا کہ ہپیوں اور حضرت عیسٰیؑ میں دو بنیادی فرق ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عیسٰی کچھ نئے اقدار کی تلاش میں نہیں نکلے تھے بلکہ خدا کی طرف سے انسانوں کو دیئے ہوئے پیغام حیات کی اشاعت فرما رہے تھے۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے نئے اقدار حیات کی تلاش میں رائج الوقت اخلاقی قدروں کو بھی مسمار نہیں کیا بلکہ اچھی باتوں کی تصدیق کی، بری باتوں کو رد کیا اور جن خدائی تعلیمات کو لوگوں نے بھلا دیا تھا اس کی طرف دعوت دی۔ کیا ان باتوں میں سے کسی بات میں بھی ہپیوں کی حضرت عیسٰیؑ سے مناسبت ہے؟ تو اس کے جواب میں نوجوان چپ ہو گیا۔

ہپیوں اور آوارہ مزاج موسیقار بیٹلز کی آماج گاہیں انسانیت کو ہلاکت و تباہی کے ہولناک گڈھے میں ڈھکیل چکی ہیں۔ سماجی نظام پوری طرح گندگی و خباثت سے معمور ہو چکا ہے۔ پلین ٹرتھ کے ستمبر ۱۹۶۹ء کے شمارے میں کئی اور انکشافات سامنے آئے ہیں امریکہ کی سوشل ہیلتھ الیوسی ایشن ڈاکٹر لی یلجن (DR. LEE ELGIN) ڈاکٹر ولیم براؤن (DR. WILAM BROWN) وغیرہ کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ یو ایس اے (U.S.A) میں سالانہ ۵ لاکھ مریض امراض خبیثہ کے علاج کیلئے ہسپتالوں میں رجوع ہوتے ہیں۔ اور انگلینڈ میں اس مرض کی بنا پر رجوع ہونے والوں کی تعداد ۴۶ ہزار ہے۔ جبکہ ایک اندازے کے مطابق نوے فیصدی مریض اپنی بیماری کو چھپاتے اور خانگی علاج کرواتے ہیں۔ یہی رسالہ لکھتا ہے کہ ان علاقوں میں چلنے پھرنے والی عورتیں امراض خبیثہ کے جراثیم منتقل کرتی رہتی ہیں۔ نیز اب کسی بھی دلہن کو گھر لیتے جاتے ہوئے دوھا طبی معائنہ کروائے گا تو اس نئی دلہن کے خون میں گنوریا کے جراثیم ضرور موجود ہوں گے۔ ڈاکٹر آر ایس مارٹن (DR. MORTON) نے جو انگلینڈ میں امراض خبیثہ کے ماہر خصوصی اور پبلک ہیلتھ آفیسر ہیں۔ ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ "ہمارا آج کا سب سے اہم مسئلہ امراض خبیثہ ہے"۔ نیز اس ڈاکٹر نے بتلایا کہ یہ مسئلہ آج ہی کا نہیں بلکہ ہمارے مستقبل کا بھی ہے کیونکہ آئندہ نسلیں اپنی ماؤں اور باپوں کے خون سے امراض خبیثہ کے جراثیم لیے ہوئے اندھی بہری اور ناکارہ پیدا ہوں گی۔

بڑھتی ہوئی فکری و ذہنی آوارگی نے دلوں کے سکون و اطمینان کو ختم کر دیا ہے۔ عائلی زندگی کا کوئی تصور موجود نہیں۔ مایوسی کی بنا پر خودکشی ایک عام بات ہے۔ نیز مستقبل کے خطرات سے بچنے کے لیے فیملی پلاننگ کے نام سے نسل کشی کی وبا بھی بڑے پیمانے پر پھیل چکی ہے۔ امریکہ کے نیوز ویک (NEWS WEEK) کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک امریکی ڈاکٹر (DR. MRY) نے بتلایا کہ گزشتہ چند سالوں میں تنہا صرف انہیں کی کلینک میں تین ہزار سے زائد لڑکیوں نے اپنا حمل ساقط کروایا۔ ہر ہفتے پچاس کے لگ بھگ لڑکیاں حمل ساقط کروانے کے لیے رجوع ہوتی ہیں[۱]۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پورے شہر نیویارک میں اسقاط حمل کس بڑے پیمانے پر ہو رہا ہوگا۔

اسقاط حمل کے لیے رجوع ہونے والی ایک امریکی لڑکی نے کہا کہ "مجھے معلوم ہے کہ یہ کام کتنا خطرناک

---

[۱] WEWS WEK 13TH APR 70

ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اخراج خون سے میری موت واقع ہوجائے لیکن اس سے زیادہ میں اس حمل سے ڈرتی ہوں جو میرے شکم میں ہے۔ آخر میں بچے کو کیا کروں میں کس طرح اس کی دیکھ بھال کرسکوں گی۔

اس لڑکی کی عمر ۱۹ سال تھی لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کے ہاں بارہ تیرہ سالہ لڑکیاں اسقاط حمل کے لیے رجوع ہوتی ہیں۔ طبی معائنہ سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد جنسی اختلاط اور جنسی معلومات کی فراوانی کی بنا پر ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ پانچ چھ سال کی عمر کی لڑکیوں کے جسم میں ایسی تبدیلیاں واقع ہوئیں کہ استقرار حمل کے لیے موزوں ہوسکے۔ ایک طرف یہ جنسی آوارگی اور دوسری طرف قبل از وقت بلوغ اور تیسری طرف ذمہ داریوں کے قبول کرنے سے گریز۔ اس صورت حال نے مانع حمل گولیوں کے استعمال کی کثرت، اسقاط حمل کے ذریعہ سے تباہی اور پھر امراض کی شدت نے مغربی سماج کو جس مقام پر پہونچا دیا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ قدرت سرکش انسانوں سے انتقام لے رہی ہے۔ اللہ کو کسی سرکش قوم کو سزا دینے کے لیے آسمان سے کسی لشکر کے اتارنے کی ضرورت نہیں کبھی تو صاعقۂ آسمانی قوموں کا کام تمام کردیتا ہے اور کبھی سانحۂ ارضی ہی کسی قوم کو سزا دینے کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جہاں انسانوں نے اپنے ہاتھوں اپنی سماجی تباہی کا اتنا وسیع انتظام کرلیا ہے تو دوسری طرف نیوکلیر ہتھیاروں کا دور، نیوکلیر خودکشی (NUCLEAR - SUICIDE) ثابت ہو رہا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا۔ (یونس۔ رکوع ۳) — اور جن لوگوں نے برے کام کیے ان کی برائی کی سزا اس کے مطابق ملے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جب صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے تو پھر ساری سوجھ بوجھ ختم ہوجاتی ہے۔ کوئی تدبیر بھی کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے قرآنِ کریم گم کردہ انسانوں کو تنبیہ کرتا ہے۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (یونس ع ۴) — پھر امر حق کے بعد بجز گمراہی کے اور کیا رہ گیا ہے۔ پھر تم کہاں پھرے جاتے ہو۔

(بشکریہ "زندگی" رام پور)

صِرَاطِ مُسْتَقِيم

از حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی رحمۃ اللہ علیہ

[ذیل کا مضمون حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے "اضغاث احلام" کے عنوان سے اپنے متوسلین کے لیے تحریر فرمایا تھا۔ صاحب زادہ مولانا محمد سعید صاحب مجددی کی عنایت سے وہ "نشان منزل" بھوپال کے خاص نمبر میں شائع ہوا۔ الفرقان اسے معاصر کے شکریہ کے ساتھ اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ عنوان میں تبدیلی کر دی گئی ہے ——— مرتب]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْكَرِیْمِ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ اَجْمَعِیْنَ ○

اس ناکارہ غفلت شعار معصیت آلودہ سے بعض حضرات اپنی خوش اعتقادی اور نیک نیتی سے وابستہ ہو کر تائب ہوئے۔ میں نے بھی ان کے روبرو توبہ کی اور ہم نے دعا کی رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔ بعد اس کے یہ خواہش ظاہر کی کہ شجرہ خاندان ہم کو ملے۔ حسب دستور سلف، عاجز نے وقت و حال کے مناسب ضروری سمجھا کہ عقائد کی درستی اور اعمال کی پابندی کتاب اللہ اور فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کرنے کی کوشش ضروری ہے جو ہر ذی شعور کا اولین فرض ہے۔ اکثر حضرات اس سے غافل رہ کر دوسرے امور میں

مشغول ہو رہے ہیں۔ جو اتنے اہم اور ضروری نہیں۔

اب میں اپنے احباب کو اس طرف متوجہ کرکے یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اول اس پر غور فرمائیں کہ اسلامی اعتقاد اور دیگر اعتقادات میں کیا فرق ہے؟

اسلامی اعتقادات کا امتیاز

ہر فرقہ اور ہر اہلِ مذہب نے اپنے خیال اپنی تحقیق اپنی معلومات اور اپنے اسلاف کی پیروی میں کوئی روش اور راہ اختیار کرکے اس کو نجات اور فلاح کا سبب قرار دے رکھا ہے: اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ○ ۔ (سورۂ انعام۔ رکوع ۱) ترجمہ:۔ وہ تو محض خیالی باتوں ہی کی پیروی کرتے ہیں اور محض قیاس آرائیاں ہی کرتے ہیں۔ اسلامی راہ و روش اور دیگر راہ و روش میں کیا فرق ہے۔ تحقیق اور تجسّس کے بعد ظاہر ہوگا کہ اوہام فرضیہ اور تقلید بلا تحقیق کی پیروی ہو رہی ہے۔ اسی پر مضبوط ہیں اور اسی کا نام دین رکھ چھوڑا ہے۔ کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (سورۂ مومنون رکوع ۳) ترجمہ: ہر گروہ اپنی خود ساختہ رسوم پر خوش ہے۔

لیکن اسلامی اعتقادات کی بنیاد نے تحقیق و تجسّس و تلاش کے بعد اور عقل و نقل سے مطابق نیز دلائل و ثبوت کامل کے بعد اپنے دل و دماغ میں محقق راہوں اور روشوں کو قبولیت کی جگہ دی ہے۔

وہ بابرکت ہستی جو مخالفین میں ظاہر ہوئی، انسانی دل و دماغ کو صحیح راہوں پر لانے والی تھی۔ ان کی رسم و راہ تمام رسموں اور راہوں اور طریقوں سے نرالی تھی۔ سب ہی نے ان کو گھٹانے اور مٹانے کی کوششیں ختم کر دیں، مگر سب کے خیالات اور روش اور راہوں پر ان کی روش اور راہ اور طریقہ پسندیدہ ثابت ہوتا گیا۔ جو بہت زیادہ مخالف تھے وہی زیادہ مؤید دین ہو گئے کیونکہ انسانی کمالات سے ان کو مکمل پایا اور طاقت اور رسائی اور بلندیٔ انسانی سے بلند تر ہو نکلنے والا پایا۔ یہ ہے بنیادِ اعتقاداتِ اسلامی۔ اس درست اور صحیح راہ میں تخیلات اور ایجادات نے جب سے راہ پائی اس کی بنیاد درست نہیں رہی۔ اور وہ من مانے اعتقاد سے اور دوسروں کے اعتقاد سے مشابہ ہو گیا۔

آج بھی بہت سے اعتقادات ایسے موجود ہیں جن کو اسلام کی طرف نسبت دے کر صحیح اسلام کو دھبّہ لگایا جاتا ہے اور باہمی کشاکشوں میں وقت ضائع کرکے اصلی اور ضروری مقصد سے دور ہوتے

جاتے ہیں۔ کس قدر مضبوط اور صحیح راہ ہمارے سامنے موجود ہے جس میں ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے۔ اسی راہ روشن نے اپنی روشنی سے تاریکیٔ عالم کو روشن و منور کیا ہے۔ کتنی بے انصافی اور ناقدری کی بات ہے کہ وہ تسلیم شدہ اور فیصل کن راہِ روشن جو ہمارے دل و دماغ کو کجی اور ظلمتوں سے بچاتی ہوئی انسانی کمالات سے اور انسان کی قوت اور طاقت سے بڑھ کر ترقی کی راہیں ہم پر کھول رہی ہو اس میں کجی پیدا کر کے ہدایت کے بعد ضلالت اختیار کی جائے۔

میرے احباب! ہم اس برہانِ روشن کو اس طرح مضبوطی سے پکڑیں کہ پھر کجروی اور ضلالت سے ہم کو نقصان نہ پہنچ سکے۔ مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر رکوع ۱) ترجمہ: "رسولؐ جو کچھ تمہارے پاس لائے ہیں اس کو لے لو اور جس چیز سے انھوں نے تم کو روکا ہے اس سے باز رہو۔"

اقوال و احوال سلف کتاب اللہ کے تابع ہیں

میرے احباب! اگر کوئی بات کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سلف کے قول اور فعل میں نظر آئے تو خوب یقین کر لیں کہ یہ اُن کے علوِ مرتبت کی دلیل ہے۔ مثلاً سماع کے متعلق اکثر لوگ یا تو اعتراض کرنے لگتے ہیں یا اس کو ان بزرگوں سے نسبت دے کر جواز کے درجہ میں برتنے لگتے ہیں۔ حقیقت حال ان دونوں سے جدا کچھ اور ہی اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ فلاں مریض آیا ہے اور اسکے جسم پر زخم ہے اور ایسا زخم ہے کہ بغیر نشتر دیے ٹھیک نہیں ہو سکتا تو انھوں نے سماع کا نشتر دیدیا۔ زخم اچھا ہو گیا۔ عرب میں عام طریقہ پر داغ دینے کا رواج قدیم سے چلا آرہا ہے کہ بچوں کو بھی اور بڑوں کو بھی داغ دیتے تھے۔ وہ داغ دینا ان کے امراض دور کرنے کا اور دائمی صحت کا باعث ہوتا تھا۔ درحقیقت داغ دینا جسکو کَی کہتے ہیں خود ایک سخت مرض اور تکلیف کا باعث ہے مگر کیونکہ وہ حکیم حاذق تھے انھوں نے زہر سے شفا کا کام لے لیا۔ ہم ہرگز نہیں لے سکتے۔ یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ بعض برادران ان حضرات پر اعتراض کر کے نقصان میں پڑے، اور بعض ان کی پیروی کر کے "صراطِ مستقیم" سے دور ہو گئے۔ خوب یاد رکھیے کہ اس قسم کی جہاں گفتگو ہو یا کوئی عبارت ایسی دیکھنے میں آئے جس میں اسلاف پر اعتراض اور حرف گیری ہو تو اس کو نظر انداز کر کے اس مجلس سے اُٹھ جائیے اور یہ کہیے "تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (بقرہ۔ رکوع ۱۶) ترجمہ: وہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ ان کے

لیے انکے اعمال ہیں، اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں اور تم سے انکے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔

فرقِ مراتب ہماری بعض بزرگ ہستیوں نے اپنی تحقیق اور علم کو اتنا وسیع فرمایا کہ انھوں نے سلف سے بھی کہیں آگے تجاوز کر کے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بلکہ انبیاء معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی خطاؤں کو ثابت کرنا ایک ضروری امر خیال فرمایا۔ میں تم کو بہت زیادہ تاکید سے روکتا ہوں کہ اپنے خیال کو بھی اس طرف رسائی دینے کی گنجائش ہرگز کبھی نہ دینا۔ ادب جو دین کا ایک رکن ہے کبھی اُس کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ ایک محقق چیز اور موجودہ شئی کو زبان پر نہ لانا اور خیال میں بھی اُس کو گنجائش نہ دینا اسی کا نام "ادب" ہے اور فضل الٰہی ادب پر ہی موقوف ہے۔

از خدا جوئیم توفیق ادب   بے ادب محروم ماند از فضل رب

ترجمہ: خدا سے ہم توفیق ادب مانگتے ہیں کیونکہ بے ادب فضل ایزدی سے محروم رہتا ہے۔

اب اس کی مثالیں خود سوچ لو اور واقعات پر چسپاں کر کے صحیح اور غلط کا موازنہ کرلو۔ کوئی بات کسی بڑی ہستی نے اپنے چھوٹے سے کہی ہے تو ہم کو اُس کا دُہرانا زیبا نہیں ہے۔ ہم اُس کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ مثلاً امر کے حقیقی معنی یا امر کی حقیقت "طلب فعل" ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں، اپنے ماتحت، خادم اور اپنے چھوٹے سے طلب فعل کو امر کہتے ہیں۔ اسی طلب فعل کو جب بادشاہ یا افسر سے کرتے ہیں تو اس کو عرض کہتے ہیں مثلاً ہم کو نوکر رکھ لیجیے، یا ہمارا فلاں کام کر دیجیے، حالانکہ یہ بھی طلب فعل ہے، مگر اس کو باعتبار ادب کے درخواست یا عرضی کہتے ہیں۔ اسی طلب فعل کو جب اللہ جل شانہٗ سے طلب کرتے ہیں تو اس کو دعا کہتے ہیں۔ یا اللہ ہم کو روزی دے، یا اللہ ہماری مصیبتوں کو دور فرما۔ حالانکہ یہ بھی طلب فعل ہے، مگر اس کو بھی باعتبار ادب کے دُعا کہتے ہیں کیونکہ یہ مقام انتہائے ادب کا ہے۔ دیکھیے ابراہیم علیہ السلام نے مقام عبدیت کے ادب کو ملحوظ رکھ کر نسبت مرض اپنی ذات کی طرف کرلی ہے اور شفاء کو خدائے تعالیٰ کی طرف منسوب فرما کر ارشاد فرمایا ہے۔

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۝ (شعراء رکوع ۵) ترجمہ: "اور جب میں بیمار ہوجاتا ہوں تو وہ مجھ کو شفاء دیتا ہے۔" حالانکہ بیماری بھی وہی دیتا ہے اور شفاء بھی اُسی کی عطاء ہے۔ لیکن ادب اسی کا متقاضی ہوا کہ عارضہ کی نسبت اپنی ذات کی طرف ہو اور شفاء جو پسندیدہ شے ہے اس کی نسبت خالق کی طرف کی جائے۔

ہم کو قرآن پاک نے اُن ہستیوں کے ساتھ جس قسم کا ادب تعلیم فرمایا ہے اسی پر عمل پیرا ہونا

شعائر دین میں سے ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ o (ج رکوع ۱۳)
ترجمہ: "اور جو دین کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے یہ اُس کے دل کے تقویٰ کی دلیل ہے۔

مطالعۂ قرآن مجید قرآن پاک کے مطالعہ کے لیے بہت سے اُمور درکار ہیں۔ زبان عربی کی مکمل استعداد و واقفیت اور اس کی اصطلاحات پر آگاہی جس کا طرز بیان سے تعلق ہے۔ صرف عربی لغت دانی ہی کافی نہیں ہے۔ ایک واقعہ کا اظہار شاید یہاں کارآمد ثابت ہو میں ایک ضرورت کی وجہ سے کسی غیر آباد جگہ پر جا رہا تھا۔ چند لڑکے پتنگ اڑا رہے تھے۔ میں نے ایک لڑکے کو کہتے ہوئے سنا کہ "اگر میری ڈور اور پتنگ کو اب کسی نے ہاتھ لگایا تو میں "اچھی اچھی" سنا دوں گا۔ اب یہاں "اچھی اچھی" کا مطلب وہی سمجھے گا جو اہل زبان ہے۔ صرف اردو تعلیم یافتہ اُس سے مطلب اخذ نہیں کر سکتا۔ ان الفاظ نے قرآن پاک کی آیت کو سمجھا دیا جو برسوں تک غور کرنے سے بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ارشاد ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ o (توبہ۔ رکوع ۵) ترجمہ: پس ان کافروں کو عذاب الیم کی خوشخبری سُنا دیجیے۔ عذاب الیم اور خوشخبری متضاد چیزیں ہیں مگر اس لڑکے کی فصاحت نے اس کو کھول دیا کہ "اچھی اچھی" سے مطلب بہت بُری بُری سُنانا ہے۔ اسی طرح ایک وقت میں کہیں سے آرہا تھا کہ ایک لڑکے نے دوسرے کو مخاطب کر کے کہا کیوں میاں آپ بھی اتنے روپے ٹھکانے لگا آئے۔ یہاں بھی ٹھکانے لگانے کا مطلب اہل زبان ہی سمجھے گا کہ برباد کر آئے ورنہ لغت میں ٹھکانے لگانے کا مطلب محل پر صرف کرنا ہوگا۔ ایسے ہی بہت سے اُمور ہیں جن کا تعلق تشریح قرآن پاک سے ہے۔

پھر شان نزول اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے واقفیت اور حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سراپائے زندگی سے آگاہی یہ تو لازمی امور ہیں۔ اس کے بعد قرآن پاک خود ہی وہ باتیں کھول کھول کر بیان فرما رہا ہے جن کا تعلق قرآن پاک سے مزید ہے جیسے کہ ارشاد ہوتا ہے:
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ o (ق۔ رکوع ۳)
ترجمہ: بے شک اس قرآن میں نصیحت ہے اس شخص کے لیے جس کو قلب حاصل ہے یا وہ جو دلی توجہ سے اس کو سنتا ہے۔ پھر یہ فیصلہ بھی قرآن مجید ہی سے ہوگا جس کو قلب کہا گیا ہے وہ کیا چیز ہے؟ چنانچہ دوسری جگہ اسی کی تشریح میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔
لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ

بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ٥ (سورۂ اعراف رکوع ۲۲)
ترجمہ:۔ ان لوگوں کے دل ہیں مگر وہ اُن سے سمجھتے نہیں۔ آنکھیں ہیں جن سے حق دیکھتے نہیں۔ کان ہیں جن سے حق بات سُنتے نہیں۔ ایسے لوگ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ غافل ہیں۔

قرآن پاک میں جہاں اللہ تبارک و تعالیٰ نے پستیوں، دنائتوں اور گمراہیوں کا ذکر فرمایا ہے وہیں ترقیات منازل اور برکات کی راہیں بھی واضح فرمادی ہیں، جہاں زخم لگایا ہے وہیں مرہم بھی موجود ہے۔ جہاں بیماری ہے وہیں نسخۂ شفا بھی عطا فرمایا ہے۔ جس عالم میں ہمارے اذہان پہنچنے سے عاجز اور قاصر ہیں اُس عالم کو قرآن پاک نے نمایاں فرما کر اُس کے ذریعہ سے ہمارے دل و دماغ کو روشن اور منور فرمادیا ہے۔ تھوڑی سی غور و فکر درکار ہے۔ مگر وہی غور و فکر جو قرآن شریف کے پاک اور پختہ رنگ میں رنگی ہوئی ہو، جس کو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ٥ ترجمہ: اللہ کے رنگ کو اختیار کرو۔ اللہ کے رنگ سے اچھا رنگ کس کا ہو سکتا ہے؟

ترتیب قرآن پاک اصولی طریقہ پر جس طرح اللہ نے چاہا (اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں) اُسی طرح مرتب ہو چکی ہے۔ اس میں مداخلت کی گنجائش کسی کو نہیں رہی۔ یہی قرآن پاک ہے جو کثافتوں، دنائتوں، پستیوں اور ظلمتوں کے دور کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔ اب اس کی تلاوت میں جو نتیجے واقع ہوتے ہیں وہ ہر قلم تو اُن کو واضح نہیں کر سکتا مگر وہی قلم جو قرآن پاک کے رنگ میں خوب رنگ چکا ہو اور دوسرا رنگ قبول کرنے کی اس میں صلاحیت اور قابلیت ہی نہ رہی ہو۔ امید ہے کہ وہ کچھ واضح کر سکے۔

کیسی عظیم نعمت ہے کہ ایک بڑی مشکل کو اللہ تعالیٰ نے آسان فرمادیا۔ وہ یہ کہ قرآن پاک کو کھولتے ہی اُس کے پڑھنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ ارشاد ہے: ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ٥ (بقرہ رکوع ۱) ترجمہ: یہ وہ کتاب ہے جس کے برحق ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یعنی خط اور تار کو جس طرح یقین کر کے پڑھتے ہو اور اُس پر ہنستے یا روتے ہو، حالانکہ وہ خبر ہے واقعہ نہیں۔ جھوٹا بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک کو یقین کے ساتھ پڑھو کیونکہ قرآن پاک میں اس کی بالکل گنجائش نہیں کہ اس کے بیان پر خیال میں بھی شک اور تذبذب آئے۔ اس ارشاد مبارک سے صاف اخذ ہو رہا ہے کہ تلاوت قرآن پاک "لاریب طریقہ پر" اسی وقت ہو سکے گا جب کہ ظلمتوں، شکوک اور تذبذب سے اذہان پاک ہو کر تیار ہو جائیں اور قرآن پاک کے رنگ سے مزین ہو جائیں۔ اس کے بعد تلاوت کرنے سے معلوم ہوگا کہ سطر سطر اور آیت آیت میں نوع

انسانی کی مشکلات کا حل اور ظلماتِ عالم سے نکلنے کی راہیں صاف طور سے واضح فرمادی گئی ہیں تلاش کرنے والا خود ہی ان باتوں کو تلاش کر کے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ تحریر میں لانا کبھی کبھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا جس کو پیاس اور تشنگی نہ ہو اس کے لیے دریا کے دریا ـــ پانی کے بیکار ہیں۔ اور جس کو پیاس اور تشنگی ہے اس کے لیے ایک گلاس پانی بھی بڑی قدر و منزلت کی چیز ہے۔

بہت سی خوبیاں اور برکات حضرات مفسرین سالقین و موجودہ نے ظاہر فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن پر رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔ اب جو کچھ بھی تفکر یا تدبر قرآن کیا جائے۔ اُن ہی اُصولوں کو سامنے رکھ کر کیا جانا صحیح اور کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

طلبِ صادق ضروری ہے

ایک بات اور بھی سمجھ لی جائے تو بہتر ہے جس کا اشارہ اوپر کی بات میں بھی آ گیا ہے لیکن پھر اسی کو دُہرانا مناسب سمجھتا ہوں انشاءاللہ فائدہ مند ثابت ہوگی سخت گرمیوں کے رمضان میں کوئی شخص کسی ضرورت کے لیے افطار کے قریب غروب آفتاب سے کچھ قبل بستی یا شہر سے دور پہنچ جائے اور واپسی کے وقت اسباب واپسی مسدود ہو جائیں اور یہ شخص جس طرف نظر ڈالے سوائے ریگستان کے سبز پتا بھی نظر نہ آئے اور زبان ایڑی کی طرح خشک ہو جائے۔ ہر طرف سے مایوسی کے آثار نمایاں ہو جائیں اور ہلاکت اور موت کا سامنا قریب آ جائے اور رمق جان رہ جائے۔ اس آخری وقت میں اس کے سامنے ایک کوزہ پانی کا لائے تو اس سے جو کچھ چاہے قیمت لے سکتا ہے۔ اس کی نظر میں ایک کوزہ پانی کی کیا کچھ عظمت اور وقعت ہوگی اور کتنا مرغوب اور محبوب وہ پانی ہوگا اور اس کے پینے سے کس قدر لذت اور ذوق حاصل ہوگا اور وہ پانی فوراً مسامات سے ظاہر ہونا شروع ہو جائے گا۔ حالانکہ یہی پانی اپنے گھر میں یا حوض کے کنارے وہ لذت اور تاثیر نہیں دے سکتا۔ پانی یہ اور وہ یکساں ہیں۔ وہ کم پانی بہت قدر کا تھا اور یہ بہت سا پانی بے قدر ہے۔ پینے والے کی تشنگی پانی کی قدر و منزلت اور لذت کو بڑھاتی ہے۔ اسی طرح جس میں تشنگی اور طلب نہ ہو اس کو نصیحت کرنا بے سود ہے اور جس میں تشنگی ہے اس کے نزدیک تھوڑی سی بات بھی قابل قدر ہوتی ہے۔

یہ بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت بھی اُسی پیاسے کو لذت دے گی اور برکات بڑھائے گی جس کو اس کی طرف انتہائی شغف، انہماک اور عشق پیدا ہو چکا ہو اور اس پر یقین ہو کہ "فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا" (کہف

رکوع ۱۲۔ ترجمہ: پس جو کوئی لقاء خداوندی کا امیدوار ہے اُس کو چاہیے کہ وہ عمل صالح کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اللہ جل شانہ کی ملاقات کا اشتیاق اور انتظار اُخروی نعمات کا جویا اور طالب بناتا ہے۔ آیت شریفہ میں اسی طرف رہبری کی جارہی ہے پھر دُنیاوی زندگی کی درستگی اور نوعِ انسانی کے کمالات کو بھی قرآن پاک نے مکمل فرمایا ہے۔ اور ان عبادات اور مجاہدات کی طرف رہبری فرمائی ہے جو کمالاتِ انسانی کو نہ مٹائیں بلکہ کمالات انسانی کو اپنی جگہ قائم رکھ کر، بڑھا کر نیز بلندی پر پہنچا کر مقصد عالی تک رہبری فرمائی ہے۔

لذّات اور منافع کے مواقع

لذّات اور منافع ہر وقت اور ہر موقع کے اعتبار سے جدا گانہ ہیں صغیر سن نابالغ بچہ کی نشوونما اور ترقیات جن چیزوں سے وابستہ ہیں، جوان لوگوں کی زندگی ان سے جدا ہے۔ جوان لوگوں کے جو لذّات اور ترقیات ہیں کبر سن حضرات اُن سے مُبرّا ہیں۔ اب ہر ایک سے فائدہ اُٹھانے کی اور ہر ایک کو فائدہ پہنچانے کی صورت بھی ظاہر ہے کہ الگ ہوگی۔ کبر سنوں سے فائدہ اٹھانے کی صورت الگ ہے، جوانوں سے فائدہ اٹھانے کی نوعیت جدا ہے۔ بچوں سے فائدہ اٹھانے کی کیفیت علیحدہ ہے۔

یہ بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک وقت کے لذّات دوسرے وقت کے کمالات کو مٹا دیتے ہیں۔ بعض بچپن کے لذّات جوانی کے اوقات کو برباد کردیں گے اور بعض جوانی کے اوقات کبر سنی میں تباہی کا باعث ہوں گے۔ قرآن پاک نے بھی بعض وقت لذات عاجلہ سے روکا ہے اور اس لحاظ سے روکا ہے کہ آئندہ کی زندگی پر وبال نہ آئے۔ بعض ناعاقبت اندیش حضرات اپنی تعجیل اور کم حوصلگی اور ناواقفیت سے بے موقع حصول لذّات کے خواہاں ہوکر آئندہ کی زندگی میں تباہ کن بلاؤں میں پھنس جاتے ہیں۔ شفیق ماں باپ اور مہربان اساتذہ کسی وقت بچہ کو کھیل کود کی چیزیں از قسم کھلونے وغیرہ دیتے ہیں اور کسی وقت کھیل سے روکتے ہیں اور کسی وقت تعلیم اور مدارس کی کشاکشی اور صعوبتوں کو اُس کی آئندہ زندگی کی فلاح وبہبود کا زینہ سمجھتے ہیں۔ ان خیالوں کو ملحوظ رکھ کر اور دل ودماغ میں اُن کو جگہ دے کر قرآن پاک کا مطالعہ کرنا ترقیات اور برکات کا موجب ہوتا ہے حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ ایسی نعمت اور اتنی بڑی دولت جن کے گھروں میں اور جن کے ہاتھوں میں موجود ہے، کس امر نے ان کو اس سے بے التفات بنا رکھا ہے؟

حلم و صداقت اور صبر و استقلال کا اثر

غور و فکر کا مقام ہے کہ ایک ذات مقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیاوی ہتھیار اور اسباب سے خالی رہ کر کس چیز سے ان تمام قوموں گروہوں اور قبیلوں پر فتح حاصل کرلی جو اسباب دنیا اور ساز و سامان جنگ اور ہتھیاروں سے مکمل تھے۔

ایک دن دو دن نہیں، ایک ماہ دو ماہ نہیں، ایک سال دو سال نہیں، بلکہ دس برس تک تمام صعوبات اور مصائب راحتوں کی صورت میں برداشت کرتے رہے جس سے ان کے دل و دماغ متاثر ہوتے گئے اور ہم خیال ہوتے چلے گئے، سوائے ان ازلی اشقیاء کے جن کی قسمت میں ہدایت نہ تھی ان کی مثال تو ایسی ہے کہ جس طرح کہ بڑ باگل اور چھچھوندر جو آفتاب سے کنارہ کرتے ہیں گھبراتے ہیں اور آفتاب ان کو برا معلوم ہوتا ہے، اسی طرح وہ ازلی اشقیاء تھے جو آفتاب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے گھبراتے اور کنارہ کرتے رہے۔ حالانکہ آفتاب سب کی آنکھوں کو روشن کرتا ہے اور سب کی معیشت اور معاشرت کو وسیع کرتا ہے مگر بڑ باگل اور چھچھوندر کو تنگی اور گھبراہٹ کے گوشہ میں محصور کر دیتا ہے اور اُن کو اسباب زندگی سے مجبور رہنا پڑتا ہے۔ انسانوں میں بھی سورج مکھی لوگ ہوتے ہیں جن کو آفتاب برا معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ اُن کی بصارت کا سُقم ہے آفتاب پر اس میں قصور عائد نہیں ہوتا۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

ترجمہ: اگر چمگادڑ کو دن میں دکھائی نہ دے تو سرچشمہ روشنی آفتاب کا کیا قصور؟

ایسی بھی ہستیاں اخیر تک رہیں جن کو ذات اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیگانگی ہی رہی، ان کو اپنی کور باطنی اور گمراہی اس قدر پسند تھی کہ اُس کے مقابلے میں یہ روشنی ان کے واسطے مُضر ثابت ہوئی۔ وہی صداقت اور سچائی، حلم و بردباری، صبر و استقلال تھا جس نے اغیار کو احباب بنالیا۔ ہمارے بہت سے احباب ان ہتھیاروں سے غافل ہو کر اپنی دنائتوں اور پستیوں کو ترقی کی صورت میں دیکھ کر نقصان میں پڑ چکے ہیں اور پڑتے جارہے ہیں مگر ان کی غور و فکر اس طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ اس تحریر میں جو آپ کے سامنے ہے باہمی ارتباط کا قائم رہنا یا جو کلام ایک دفعہ آجائے اس کو مکرر نہ لانا جو بات ایک دفعہ کہدی گئی اس کو دوبارہ نہ کہنا۔ ان چیزوں

کا بالکل لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کیونکہ ربطِ عبارت مقصود نہیں ہے بلکہ اصلاح ظاہری اور باطنی مقصود ہے۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی کلام کئی نوع سے مکرر ظاہر ہوگا۔ اور بار بار آئے گا۔ اور قصداً لانا پڑے گا کیونکہ اس کلام کو یاد رکھنا ضروری ہے۔

قوت متضادہ اور استعدادِ نامکمل

آپ نے اس پر بھی کبھی غور فرمالیا ہوگا کہ آیت شریف "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" (جو کہ صفات خداوندی رحمٰن و رحیم سے متصف ہے اور حقیقت میں بھی بڑے درجہ کی چیز ہے اس پر) "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" کا مقدم کرنا کس مصلحت سے ہے؟ اور اس میں کیا نکتہ ہے۔ دیکھیے قوت متضادہ اور استعداد نامکمل جب تک درست نہ ہو، انسان جس کام کو بھی شروع کرے گا اس کا تکمیل کو پہنچانا یا تو مشکل ہوگا یا ناممکن ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بول و براز کا مقدم کرنا نماز اور وضو پر لابُد اور ضروری ہے کیونکہ یہ چیزیں وضو کو ناقص اور نماز کو خراب کرنے والی ہیں۔ اُن سے تزکیہ حاصل کیے بغیر عبادت میں مشغول ہو جانا یقیناً عبادت کو ناقص کر دے گا۔ یہ مسئلہ انشاء اللہ ہر جگہ فائدہ دہ ثابت ہوگا۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ غرض سب عبادتوں میں اس مسئلہ کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ نماز سے پہلے بھی یہی صورت ہے اور حج سے پہلے بھی منافی حج جو چیزیں ہیں ان کو دور کر کے ایک روحانیت پیدا کرنا ضروری ہے جو اس راہ میں کار آمد ہے اور اس عبادت کو صحیح بنانے والی ہوتی ہے۔

آپ حضرات پر یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک شخص صابن سے ہاتھ دھویا ہوا ہے مگر جُنبی ہے اور دوسرا مٹی میں ہاتھ بھرا ہوا ہے تو اول کو قرآن شریف سے ہاتھ لگانے اور پڑھنے سے منع کرتے ہیں اور دوسرے کو منع نہیں کرتے۔ ظاہر بیں حضرات جو ان مسائل سے واقف نہیں ہیں ان کو تعجب ہوگا کہ دُھلے ہوئے صاف ہاتھوں کو برا بنانا اور مٹی میں بھرے ہوئے ہاتھوں کو صاف سمجھنا کس قدر مشاہدہ اور عقل سے دور بات ہے بس معلوم ہوا کہ ہر چیز کے سمجھنے کے لیے عقل اور نظر ہی کافی نہیں بلکہ کچھ اور قوتیں عقل و نظر سے بالاتر بھی ہیں جن سے اچھا اور بُرا تمیز کیا جاتا ہے۔ قرآن شریف کی تلاوت میں بھی کسی نظر عالی کی ضرورت ہے جو قرآن شریف ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اور تتبع نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حالات بابرکت کی تلاش سے۔

"حصول فیض اور ازالۂ کدورت"

ایک اور بات بھی بہت قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ تمام متقدمین عارفین کی تحقیق ہو چکی ہے کہ جو شخص جس سے فیض حاصل

کرے اس سے اگر فیض حاصل کرنے والے کے دل میں تھوڑی سی کدورت آجائے تو فیض کا دروازہ مسدود ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر فیض اُٹھانے والا بے ارادہ بھی اس شخص سے جس سے فیض اُٹھاتا ہے۔ فیض اُٹھائے لیکن اس کا اعتقاد اور محبت اس کے ساتھ صحیح ہو تو فیض پہنچانا ممکن ہے۔ یہ فیض اٹھانا اور فیض پہنچانا موجودہ زمانہ کی ایجادات سے عیاں ہوچکا ہے۔ آج کوسوں کی آواز یہاں سُن کر اس سے فیض اُٹھا رہے ہیں لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جو ان آلات کے درمیان میں اگر تھوڑی سی بھی حائل ہوجاتی ہیں تو صحیح آواز کے آنے میں فرق پیدا ہوجاتا ہے اور اگر زیادہ حائل ہوجاتی ہیں تو آواز رُک بھی جاتی ہے۔ ہمارے برادران غور کریں اور اچھی طرح غور کریں کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہمارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایسا واسطہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض حاصل فرما کر ہم کو فیض پہنچانے والے ہیں یعنی حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو قرآنی فیض ہم تک آرہا ہے وہ ان ہی حضرات کے ذریعہ سے آرہا ہے۔ اب ان بزرگ ہستیوں سے جن کے فضائل میں قرآن مجید اور حدیث مبارک ناطق ہیں اگر تھوڑی سی بھی کدورت اور ذرا سا بھی میل دل و دماغ میں خدانخواستہ متمکن ہوا یا شبہہ بھی پیدا ہوا تو فیض قرآنی اور برکات رحمانی کا مسدود ہونا ضرور ہے۔ صرف لغت دانی اور معانی شناسی باقی رہے گی جو حصول مقصود میں زیادہ کارآمد نہیں۔

بہت سے احباب اپنی تحقیق اور معلومات اور تاریخی واقعات اور اپنے جذبات اور محبتوں کو بھی کارآمد سمجھ کر اور ان سے ذاتی طور پر کوئی نتیجہ نکال کر اور بابرکت ہستیوں سے کدورت رکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں بتقاضائے محبت اہل بیت رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین ہے۔ حالانکہ اہل بیت کی عظمت کا علم بھی ان ہی اصحاب کرام کے واسطہ سے ہم کو پہنچا ہے۔ اس کی تفصیل تو عقائد کی کتابوں میں مفصل موجود ہے۔ مگر یہاں اس کو اشارتاً بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے برادران اور محبین کو یہ آگاہی ہو کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے معاملات اور مناقشات سے ذاتی طریقہ پر کوئی نتیجہ نکالنا یا کوئی غلط خیال بھی کسی قسم کا کرنا برکات قرآن پاک کو مسدود کر دیتا ہے۔

یہ مختصر بات جو ہم لکھ رہے ہیں اس کی تفصیل بہت ہے اور اس پر بڑی بڑی تحریریں اور رسالے لکھے ہوئے ہیں۔ ہم کو وقت کم مل رہا ہے اور تحریر کو مختصر لانا ہے اور صرف اپنے احباب کو وہ صورتیں مجمل طریقہ پر بتانا ہے جو تلاوت قرآن پاک سے اخذ برکات میں حاجب اور مانع نہ ہوں۔

تمام ہی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بلندی و برتری علوِ مرتبت قرآن پاک میں تجسس اور تلاش کے بعد ظاہر ہوگی اور احادیث شریفہ سے ہر ایک کی شانِ علویت الگ الگ پائی جائے گی اگر ان کو جمع کر کے یہاں لکھا جائے تو مستقل ایک ضخیم رسالہ مرتب ہو جائے۔

اچھا اور مناسب یہی معلوم ہوا، بہت غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہر ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے اور ہر اُن صاحب سے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے، آپ کی زیارت سے مشرف ہو چکے تھے اور آپ کے زمانہ میں تشریف رکھتے تھے یا اُن کے بعد والوں سے۔ ان تمام حضرات سے محبت اور تعلق جتنا بڑھتا جائے گا۔ اتنے ہی فیوض و برکات قرآن مجید میں حاصل ہوتے جائیں گے۔ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔

یہ مختصر بیان عقائد کی کتابوں میں، قرآن کریم کی آیات کی تفسیروں میں اور احادیث شریفہ کے ابواب میں واضح طور پر موجود ہے۔

سابق میں یہ تو ہم لکھ ہی چکے ہیں کہ ایک بات حسب ضرورت کئی دفعہ لکھیں گے تاکہ پڑھنے والے حضرات اس سے غافل نہ ہوں کہ یہ بہت ضروری بات ہے۔ چنانچہ ہم پھر سابقہ عبارت کو دہراتے ہیں کہ بعض واقعات موجود اور صحیح کو خیال میں نہ لانا اور زبان سے کبھی ادا نہ کرنا، اس کا نام ادب ہے۔ اب اُس کی مثالیں خود غور فرمالیں۔ کتنی ایسی چیزیں موجود ہیں اور روزمرّہ ایسے واقعات صادر ہوتے رہتے ہیں جن کے بیان کرنے اور خیال میں لانے سے ادب مانع ہوتا ہے۔ بچی کی شادی ہو کر اولاد ہونا واقعہ صحیح ہے مگر کوئی اس کو بیان نہیں کرتا۔ اسی طرح کی اور بہت سی روزمرّہ کی باتیں ہیں، واقعہ میں ہوتی ہیں لیکن بیان نہیں کی جاتیں، پس اس قسم کی چیزوں کو ملحوظ رکھنا صراطِ مستقیم پر قائم رہنے والے کا عقلمند کا اور برکات کے متلاشی کا اوّلین فرض ہے۔

در اصل ہم کو تو اس طرف توجہ دلانا اور اسی کوشش کو بڑھانا مقصود ہے کہ قرآن پاک سے اپنی زندگی کو بالکل مطابق کرنے کی کوشش کی جائے امکانی صورت میں تاکہ فیضانِ قرآنی سے محروم نہ رہیں۔

یقین کیجیے کہ اگر آپ نے کوئی بھی کتاب نصیحت، ہدایت اور وعظ کی نہیں پڑھی اور صرف قرآن شریف ہی کو احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اور خود قرآن پاک کے انوار میں پڑھتے تھے تو انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو سب سے استغنا حاصل ہو کر وہ چیز حاصل ہوگی جو بہت زیادہ کار آمد

ہوگی اور زندگی کو بہت ہی منظم اور بلند کرنے والی ہوگی اور اُخروی زندگی حاصل کرنے کا سبب بنے گی۔

ہر امر میں اعتدال کا لحاظ ضروری ہے

ہمارے محترم احباب کو اس طرف توجہ کرنا انشاء اللہ مفید ثابت ہوگا کہ ایک چیز ایک حد تک مفید اور لذیذ اور کار آمد ہوتی ہے اور وہی چیز جب مقدار اور حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو مضر اور بدذائقہ ہو جاتی ہے مثلاً نمک کے بغیر کوئی چیز لذیذ نہیں ہوتی لیکن جب وہ حد سے زیادہ ڈالدیا جائے تو بے مزگی اور خرابی پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح شکر بھی مفید اور لذیذ چیز ہے مگر اس کی زیادتی بھی لذت اور فائدہ کو مٹا دیتی ہے۔ اسی طرح ہر چیز پر غور فرمائیے۔ مثلاً محبت، اخلاص اور اعتقاد ان چیزوں کی بھی حدود ہیں اگر ان ہی حدود پر یہ رہیں تو مفید اور کار آمد ہیں اور اگر بڑھ جائیں تو مضر اور نقصان دہ ہو جاتی ہیں۔ اس کا موازنہ کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے صحیح طور پر کیا جا سکتا ہے کہ کس چیز کی کیا حد ہے۔

اسی طرح الہامات اور انکشافات اگرچہ بہتر چیزیں ہیں اور اُن کے ذریعے عالم والوں نے بہت سے برکات اور فیضان حاصل کیے ہیں۔ مگر ان کے بھی کچھ حدود ہیں۔ ان ہی حدود تک رہ کر اُن سے فائدہ اٹھانا اور اس کے بعد اُن سے سکوت اختیار کرنا دانشمندی اور سمجھداری ہے۔ لیکن یہ بھی خوب یاد رکھیے کہ جو باتیں ہماری سمجھ سے باہر اور ہمارے علوم و مسلمات سے بالا ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں وہ اسرار پوشیدہ ہوں جن کو حل کرنے سے ہماری عقول عاجز ہیں۔ بہرحال الہامات اور انکشافات میں اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ شریعت کی مخالفت نہ ہو اور یہ بھی یاد رہے کہ الہام غیر پر حجت نہیں ہے اور نہ غیروں پر اُس کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔ ایسا نہ کرے کہ ان ہی کو شمع راہ بنالے کہ کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تردید اور تنسیخ ہو اور شریعت غرّا کی مخالفت ہو۔ بہت سے ارشادات سالقین کے ایسے ہوئے ہیں جن کو ہم نے بالکل نہیں سمجھا اور ہماری عقلوں نے ان کو بالکل نہیں پایا اور جو پایا اور سمجھے وہ ان کا مطلب ہرگز نہیں تھا۔ پس جو انھوں نے لکھا ہم نہیں سمجھے اور جو ہم سمجھے وہ انھوں نے ہرگز نہیں لکھا۔ اس لیے ان کی عبارتوں اور اشارات کو لے کر اس پر اپنا عقیدہ کر لینا اور اپنی سیدھی راہ کو چھوڑ دینا صراطِ مستقیم سے بہت دور کر دیتا ہے۔ اس کی تفصیل غور و فکر سے آپ حضرات کو خود معلوم ہو جائے گی۔ زیادہ مثالوں اور تشبیہات سے تحریر طویل ہو جاتی ہے اور سمجھ منتشر ہو جاتی ہے۔

ہمارا ایمان قرآن و حدیث کی تعلیمات پر ہے!

ایمان کا انحصار تو صرف دو چیزوں پر ہی لازمی ہے۔ اول کتاب اللہ اور اس کی وہ تاویلات و تشریحات جو قرن اول میں حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود فرمادی ہیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اُن ہی کو واضح فرمایا ہے اور تابعین اور تبع تابعین تک ان چیزوں کی صحیح تاویل ہوئی ہے اور درست بیان ہوا ہے۔ وہ بحمد اللہ تعالیٰ معتبر تفسیروں میں موجود ہے۔ دوسرے احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کے علاوہ ادھر اُدھر ہٹنا۔ دیکھنے اور سمجھنے میں تو چھوٹی سی بات ہے مگر اس کے نتیجہ میں بڑی خرابی ہے۔ بعض بات دیکھنے میں چھوٹی ہوتی ہے مگر اس کا نتیجہ بڑی خرابی کا باعث ہوتا ہے۔ دیکھیے حضرت مکرمہ محترمہ اُم المومنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی جناب پاک میں چھوٹی سی گندہ دہانی کو اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں: وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ (نور۔ رکوع ۲) ترجمہ: تم اس کو معمولی بات خیال کرتے ہو۔ حالانکہ خدا کے نزدیک وہ بڑی ہے"۔ اسی طرح ہمارے خیال میں اور عمل میں بعض باتیں بہت چھوٹی ہوتی ہیں اور ہم ان کو حقیر سمجھتے ہیں مگر اللہ کے نزدیک وہ بڑی ہوتی ہیں۔ نیکی میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں اور بدی میں بھی۔ اچھے اور بُرے کا تمیز اپنی تحقیقات و معلومات اور علم پر ہرگز نہ ہونا چاہیے خواہ علم کتنا ہی وسیع ہو جائے اور عقل کتنی ہی بلند ہو جائے مگر اس میں خطا ضرور ہو سکتی ہے اور ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال آپ کے سامنے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ آپ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ دیا سلائی کی ڈبیہ (ماچس) کس قدر حقیر اور چھوٹا سا بکس ہے اور اسکی ایک کاڑی کس قدر حقیر در حقیر اور پھر اس کا منہ جس میں مسالہ لگا ہے کس قدر حقیر چیز ہے مگر بارود اور پیٹرول کے کارخانہ میں کتنا بڑا فساد پھیلانے والی چیز ہے۔ اس حقیر اور بے مقصد چیز سے تمام کارخانہ برباد ہو سکتا ہے۔

اسی طرح میرے برادران! منہ سے ایسا کوئی لفظ بلا سوچے سمجھے اور بلا تحقیق کے نکالنا یا خیال میں لانا جو ظاہر اً کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں ہے بلکہ اس میں ایجاد ہے اور اس کی مخالفت ہوتی ہے بڑے ظلم کی بات ہے۔ اگرچہ وہ مخالفت تھوڑی ہوتی ہے مگر کارخانہ اسلام کو جس میں بڑے بڑے اعمال موجود ہیں اور بڑی بڑی عبادتیں موجود ہیں وہ خراب اور برباد کر دیتی ہے اور ہم کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کیا ہوا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ

وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ۝

(حجرات، رکوع ۱) ترجمہ: اے ایمان والو اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر بلند مت کرو اور نہ گفتگو میں اس طرح چیخو جس طرح آپس میں چیختے ہو ورنہ اس بے ادبی سے تمہارے نیک اعمال برباد ہو جائیں گے اور تم کو احساس بھی نہ ہونے پائے گا ___ آواز کا بلند کرنا بہت چھوٹا فعل ہے مگر نتیجہ اس کا بڑے بڑے اعمال کی بربادی کا سبب ہو سکتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ چھوٹی اور حقیر اور معمولی چیز کو چھوٹا سمجھ لینا صحیح نہیں ہے۔ بعض وقت یہی چھوٹی شے بڑی چیزوں کو منہدم کرنے والی ہو جاتی ہے۔

ایمان کی بلندیاں برکات اور وسعت جو اس وقت ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں اور حقیقت میں وہ اس عالم میں موجود ہیں ان کو صحیح و سلامت رکھنے والی چیز صحیح پیروی قرآن پاک ہے اور اس کے وہ معانی ہیں جو احادیث اور تفاسیر معتبرہ نے ظاہر فرمائے ہیں۔ اسی سے ایمان کی بلندیاں سلامت اور قائم رہ سکتی ہیں۔ مختصر عبارت ہے جو مثالوں اور تشبیہات سے اگر مفصل کی جائے اور وضاحت بڑھائی جائے تو دیکھنے والوں پر گراں گزرے گا اور وقت کثیر صرف ہوگا اور اس مختصر میں تھوڑے فہم والے حضرات بھی بڑی سے بڑی چیزیں اور بہت سی کارآمد باتیں اخذ فرما لیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

تشریح سنت کے لیے عمل صحابہ کا دیکھنا بھی ضروری ہے!

احادیث مبارکہ میں ایسی چیزیں بھی ملیں گی جو حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات مبارک میں یا عمل مبارک میں پائی جاتی ہیں مگر ان کی کوئی خاص مصلحت اور خاص ضرورت ایسی ہوتی ہے جس کا ایک خاص وقت اور خاص موقع سے تعلق ہے۔ اس کی شناخت کے لیے بہتر یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمل کو دیکھا جائے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر نقل و حرکت پر فدا و نثار رہتے۔ اگر اس قولی و فعلی سنت کو انھوں نے جاری رکھا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ سنت مبارکہ جاری رہنا چاہیے اور اس میں کوئی وقتی مصلحت نہ تھی بلکہ یہ عام ارشاد اور عام قابل عمل حکم ہے۔ محض حدیث مبارکہ کو لے کر اپنے علم کی قوت اور تحقیق سے اس پر عمل کر لینا مناسب نہیں۔ اکثر دیکھا جا رہا ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو فعل کبھی اختیار نہیں کیا اور اس کو ناپسند رکھا۔ کیونکہ حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی مصلحت اور کسی موقع سے کسی شخص کو اس کی خاص اجازت عطا فرمائی تھی۔ اس کے بعد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کو سمجھ لیا کہ یہ حضور صلی اللہ

ـــ کذا فی الاصل۔ (الفرقان)

علیہ وسلم کی اجازت خاص ہے. موقع خاص کے لیے. لہٰذا اس کو اپنے عمل میں جاری نہیں رکھا. بس یہی توضیحات انشاء اللہ کافی ہوگی. مثالیں تلاش کیجیے اور غور کیجیے اگر اس قول پر چسپاں ہیں تو اختیار کیجیے ورنہ رد کر دیجیے کیونکہ یہ تو ہم لکھ ہی چکے ہیں کہ ہمارا قول تسلیم نہ فرمائیے جب تک کہ کتاب اللہ اور احادیث رسول صلعم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین اور تبع تابعین اور آثار سلف صالحین میں اس کا ثبوت نہ پایا جائے کیونکہ ہم خاطی اور محدود معلومات رکھنے والے ہیں.

ظاہر کی درستی باطن کی درستی کے لیے ضروری ہے!

تحریر سابق کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر کی درستگی حصول باطن کا بڑا رکن اور جزو ہے. اگر درستگی ظاہر میں کوئی نقص رہے گا تو باطن پر اس کا اثر پڑنا لابد اور ضروری ہے. ایک چھوٹی سی بات یاد آگئی. ایک صاحب جن کا ظاہر غیر متشرع تھا خانقاہ میں تشریف لاکر فرمانے لگے مجھے ایک بزرگ کا ارشاد ہوا ہے کہ آپ سے بیعت کروں اور اس وقت اسی لیے حاضر ہوا ہوں اور بار بار اسی پر اصرار کرنے لگے کہ آپ سے بیعت کر کے باطن حاصل کرنے کی کوشش کروں. میں بہت انکار کرتا رہا مگر وہ مسلسل مختلف جلسوں اور مختلف موقعوں پر آ آکر اصرار کرتے رہے بالآخر میں نے ان کو یہ سمجھایا کہ شکستہ برتن میں اگر دودھ دیا جائے تو تھوڑی دیر میں وہ دودھ غائب ہو جائے گا اور الزام یہ رکھا جائے گا کہ دودھ خراب ہے اور جلدی خشک ہو جاتا ہے اور برتن کی شکستگی پر خیال بھی نہیں کیا جائے گا. اس لیے اوّل برتن کا درست ہونا لازمی اور ضروری ہے اس کے بعد اگر طلب کریں تو کہیں سے دودھ طلب کیجیے. اس کہنے پر یہ ارشاد کیا کہ کرم فرما کر برتن بھی آپ ہی عطا فرما دیں. میں نے عرض کیا کہ ساڑھے نو سو برس تک حضرت نوح علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دودھ ہی عطا فرمایا. برتن کو خود ثابت رکھنا ضروری ہے. اس لیے کہ اللہ نے مکلف بنایا ہے جو چیز کہ خود کے اختیار میں ہو اس کو دوسرے پر ڈالنا مناسب نہیں ہے. یہ اس لیے لکھا گیا کہ ظاہر کی درستگی کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں اور کمالاتِ باطن کے حصول کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ــــ یہ بھی ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ ایک امر کی طرف ہمت تام اور کوشش بلیغ صرف کر دینا اس کے دفعیہ کے لیے سردست کافی ہو جاتا ہے. قوت سے باہر اور طاقت سے زیادہ اگر کوئی کام ہو تو اس میں اتنی قباحت واقع نہیں ہوتی جتنی قباحت اس کام سے بے اعتنائی میں واقع ہوتی ہے یہ بہت مختصر چیزیں ہیں اور بہت ہی کم ہیں مگر ان ہی پر اکتفا کرنا مناسب وقت و حال ہے اور سہولت کو اختیار کرنا مناسب ہے.

حقیقت بیعت اور عالم باطن

مختصر طریقہ پر اب وہ چیز بھی سامنے لانا ضروری ہے جس کے لیے بیعت کی جاتی ہے اور ایمان کو تازہ کیا جاتا ہے۔ توبہ کی تجدید کی جاتی ہے۔ موجودہ دنیا کے مشاہدات اسکو واضح کر چکے ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ فیض اٹھانے کے طریقے مختلف مقرر ہیں۔ خطوط کے ذریعہ تاروں اور ہواؤں کے ذریعہ ایک جگہ کے فیض سے لوگ دوسری جگہ مستفیض ہو رہے ہیں۔ اسی طریقہ پر کچھ فیوض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو ہمارے خیال اور دل سے بڑا تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک غیر معروف صاحب کسی مجلس میں ہمارے درمیان میں تشریف رکھتے ہیں بلکہ ہم کئی ملاقاتیں نادانستگی میں ان سے کر چکے ہیں، لیکن جب ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب ایک بڑے عہدہ دار اور صاحب اختیار دولت اور قدر رکھنے والے ہیں تو اس وقت ہم لوگ ان کو دوسری نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں اور ہم پر ان کے کچھ اور ہی اثرات طاری ہونے لگتے ہیں دوسرے نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں حالانکہ مرتبہ کی شناخت سے قبل بھی وہی صاحب تھے اور بعد میں بھی وہی صاحب تھے لیکن علم ہے کے بعد کیفیت میں تغیر پیدا ہو گیا۔ اسی طریقہ سے انتقال فیض اور اخذ برکات کی کیفیت ہے جس کا بڑا تعلق شروع شروع میں خیالات سے پھر یقینیات سے ہوتا ہے۔ پہلے ہمارے خیال میں پھر یقین میں ایک صاحب دولت اور صاحب قدرت ہوتا ہے تو ہم پر اس کا فیض طاری ہونے لگتا ہے۔ پیر کے ساتھ بھی جب حسن ظن اور حُسن اعتقاد شامل ہو جائے تو فیض کا دروازہ کھلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جس کے ہاتھ پر توبہ کی ہے اس کو باری تعالیٰ کی جناب میں ملتجی اور متضرع ہو کر یہ عرض کرنا لازم ہے کہ اے ہادیٔ مطلق آپ مجھ کو اور اس توبہ کرنے والے کو اور تمام عالم کو ہدایت فرمانے والے ہیں مجھ کو وہ راستہ تعلیم فرمائیے جس کے ذریعہ سے میں اس کو یہ بتلا سکوں کہ جس عالم میں تم موجود ہو اسی عالم میں ایک اور بھی دنیا ہے جو تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ جب اس دنیا کے آثار و احکام تم پر ظاہر ہونا شروع ہوں گے تو خود بخود اس عالم سے بے التفاتی شروع ہو جائے گی کیونکہ وہ عالم اس عالم کثیف سے اس قدر زیادہ لطیف اور خوش منظر اور دلکش ہے کہ فطرت انسانی بے قابو اس کی طرف مائل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اسی کو عالم باطن کہتے ہیں۔

اُس عالم کا آنکھوں سے چھپنا اور اس عالم کا ظاہر ہونا کوئی اجنبی اور انوکھی بات نہیں ہے۔
ایک جگہ ایک محفل میں ہم بیٹھے رہتے ہیں، ہم سب کی طرف مخاطب اور متوجہ ہوتے ہیں ....
.... اس مجلس میں ایک ممتاز ہستی

کچھ اعلیٰ سے اعلیٰ گفتگو کرتی ہو اور ہم اس کو بغور سُن رہے ہوں اسی اثنا میں ہم کو یہ خیال آجائے کہ ہم اپنے مکان پر دس پانچ ہزار روپیہ بے حفاظت چھوڑ کر چلے آئے ہیں اور وہاں بے احتیاط لوگ بھی آجا رہے ہیں تو اس خیال کے بعد ہم پر ایک ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ یہ سب لوگ ہماری نظر سے چھپ جاتے ہیں اور وہ باتیں کہ جن کو ہم بہت غور و شوق سے سُن رہے تھے اب ہم کو سنائی نہیں دیتیں۔ مجبوری اور بے چینی سے ہم تھوڑا سا وقت گزارنے کے بعد وہاں سے اُٹھ کر اپنے گھر پہنچکر جب ان روپوں کو دیکھ لیتے ہیں تو تسکین حاصل کرتے ہیں۔ بعد اس کے جب ہم واپس آتے ہیں تو صاحب مجلس یہ کہتے ہیں کہ وہ باتیں جو میں نے اس وقت کارآمد کہی تھیں آپ نے ان کو اچھی طرح سے سُن لیا؟ تو ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو اس وقت کچھ بھی سُنائی نہیں دیا، وہ ہم سے پوچھتے ہیں کہ اچھا وہ صاحب جو تشریف لائے تھے اور انھوں نے سلام بھی کیا تھا۔ آپ نے ان کو بھی پہچانا۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم کو تو اس کا بھی ہوش نہیں۔ اس کیفیت کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ ترجمہ حدیث:۔

"حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر آپ کے اصحاب میں سے کچھ لوگ نہایت غمگین تھے اور بعض کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے اور میں بھی ان ہی لوگوں میں سے تھا اسی حال میں بیٹھا ہوا تھا کہ عمرؓ میرے پاس سے گزرے اور مجھ کو سلام کیا، لیکن محویت میں مجھ کو خبر نہ ہوئی۔ عمر نے میری اس بے رُخی کی ابوبکر سے شکایت کی اور پھر دونوں میرے پاس آئے اور دونوں نے مجھ کو سلام کیا اس کے بعد ابوبکرؓ نے کہا عثمان کیا بات ہے تم نے اپنے بھائی عمر کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا: میں نے تو ایسا نہیں کیا۔ عمر نے کہا خدا کی قسم تم نے ایسا ہی کیا۔ میں نے کہا خدا کی قسم نہ تو مجھ کو تمہارا ادھر سے جانا یاد ہے اور نہ تمہارے سلام کرنے کا خیال ہے۔ ابوبکر نے کہا اے عمر عثمان نے سچ کہا۔ اے عثمان تم کو کسی شغل نے سلام کے جواب سے باز رکھا ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ ابوبکر نے پوچھا کہ تم کس خیال میں تھے؟ میں نے کہا نہ خدا نہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو وفات دی اس سے پہلے کہ ہم ان سے اس امر یعنی خطرات و وساوس سے نجات کا کوئی راستہ دریافت کرتے تو ابوبکر نے کہا میں نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیا ہے۔ یہ سُن کر میں کھڑا ہو گیا اور کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ اس امر کے پوچھنے

کے ہر طرح کے مستحق تھے۔ ابوبکر نے کہا میں نے ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ اس امر کے نجات کا کیا ذریعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہمارے اس کلمہ کو قبول کرے جس کو میں نے اپنے چچا ابو طالب کے سامنے پیش کیا تھا اور انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا تو وہی کلمہ اس کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔ یعنی کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (مشکوٰۃ شریف)

یہ حدیث شریف اس لیے لکھی گئی کہ اس سے معلوم ہو جائے کہ کامل توجہ باطن کی طرف مبذول ہونے کی وجہ سے محسوسات اور معقولات دونوں معلق ہو گئے۔ اسی طرح جب عالم باطن کا یقینات کی صورت میں دل و دماغ میں متمکن ہو جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ فنا ہونا لازمی ہے پھر اس ظہور باطن میں معاصی دنائتیں پستیاں اور غلطتیں نظر آنی شروع ہوتی ہیں۔ یہ علامت ہے باطن کی طرف ترقی کی۔ پھر اللہ کی عام مخلوق جمادات، حیوانات، انسان ان سب کی عظمت ان کے تخلیقی اسرار و برکات مختلف صورتوں سے نمایاں ہونا شروع ہوتے ہیں۔ کسی بُری سے بُری چیز کو اور بُرے سے بُرے شخص کو جس کو تمام مخلوق ذلّت اور خواری سے دیکھے اور سب اس کو برا سمجھیں سالک کی نظر میں اس میں بھی کچھ اسرار اور خوبیاں نظر آنے لگیں اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ جو برکات، ترقیات اور خوبیاں اس میں موجود ہیں میں ان سے خالی ہوں اور جو برائیاں اور پستیاں اس کی نظر آویں ان کے واسطے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ان پستیوں سے نکال کر بلندیوں تک پہنچا دے اور ان بیماریوں سے جن میں یہ مبتلا ہے اور جو بشکل معاصی اس پر عارض ہو گئی ہیں اللہ جل شانہٗ اس کو ان سے شفا عطا فرما کر ان جواہر لطیفہ اور ان برکات عظیمہ کی قدر دانی نصیب فرمائے جو اس وقت اس کے پاس حیات میں موجود ہیں۔ آنکھ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس نعمت کا مشاہدہ نابینا کو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ کان، عقل، ہوش، زبان وغیرہ یہ سب نعمات ہیں اور جن سے یہ نعمتیں سلب کی جا چکی ہیں اور جو ان نعمات سے خالی ہو چکے ہیں ان کو دیکھ کر ان نعمات کی قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور قدر کی جا سکتی ہے۔ اللہ جل شانہٗ سب کو اور مجھ کو ان نعمات کو محل و موقع پر برتنے کی توفیق خیر عطا فرمائے کہ اسی کا نام شکر ہے اور لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (ابراہیم۔ رکوع ۲) ترجمہ: اگر تم شکر کروگے تو میں تم کو زیادہ نعمتیں عطا کروں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو یاد رکھو میرا عذاب سخت ہے۔

حقیقت شکر کیا ہے؟ شکر نعمت سے مراد ہر شے کو اپنے محل پر برتنا یعنی واضع جل شانہ نے جس محل کے لیے جس شے کو وضع فرمایا ہے اسی محل وقوع پر اس کو برتنا اس نعمت کا شکر ہے۔ آنکھ کو جن لذتوں کے حصول کے لیے واضع جل شانہ نے وضع فرمایا ہے اس سے وہ لذات حاصل کرنا آنکھ کا شکر ہو علیٰ ہذا القیاس کان و زبان عقل و ہوش اور اعضائے ظاہری و باطنی کا حال ہے سب کو ان کے محل و موقعوں پر صرف کرنا اسی کا نام شکر ہے۔ اس کی مثالیں و تشبیہات خود تلاش کر لیں واضح امر ہے پوشیدہ نہیں۔

(ایسا نہ ہو اور خدا اس سے بچائے کہ کسی معصیت آلود یا سراپا معصیت میں مبتلا شخص کو دیکھ کر یہ خیال اور بڑائی دل میں پیدا ہو کہ میں تو ان معاصی سے مبرّا اور پاک و صاف ہوں اور یہ ان معاصی میں مبتلا ہے اور کیسا برا ہے۔ بلکہ اس کو ایک قسم کا بیمار سمجھے اور جذبۂ رحم سے اس کے لیے دعائے خیر کرے کہ خداوندا یہ بیمار معاصی ہے اس کو شفائے ہدایت سے نواز دے اور اپنی ذات پر محض فضل الٰہی اور کرم خداوندی کے ظہور کا خیال کرے کہ جس نے اس کو نیکی اور ہدایت کی طرف آمادہ کر رکھا ہے اور اس سے نیکی اور ہدایت کے کام لے رہا ہے۔ بس اسی کو سمجھے اور یقینی سمجھے۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (یوسف رکوع ۷) ترجمہ: اور میں اپنے نفس کو بری نہیں بتلاتا۔ نفس تو بری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس کے جس پر میرا رب رحم کرے۔ اللہ کی رحمت کا ہر آن اور لحظہ منتظر رہنا اور اس کی عطا کردہ نعمات کو ان کے محل وقوع پر صرف کرنے کی کوشش میں لگے رہنا یہ ایسی سعادت ہے جس کے ذریعہ سے اللہ جل شانہٗ ترقیٔ درجات اور منازل عالیہ عطا فرماتے ہیں لازیدنکم کی آیت شریفہ کا مژدہ اسی طرف ہے۔ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے جب بھی شکر نعمت عطا ہوگا اسی وقت سے خود بخود بے ارادہ اور بے محنت ترقی عطا ہونا شروع ہو جائے گی۔ یہ وعدۂ خداوندی ہے انشاء اللہ پورا ہو کر رہے گا۔

بطور مثال کے ایک بڑی جلیل القدر ہستی کا ارشاد یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور اس سے بڑے بڑے فائدوں کی اُمید ہے۔ اگر اس کو مدِ نظر رکھا جائے اور یہ ارشاد عالی تحریر سابق کا مؤید بھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

بلندی دریں راہ پستی ست و پستی بلندی، ہر کہ پست شد بلند گشت و ہر کہ خود را بلند ساخت در افتاد، عجب کاروبار است کہ خاک با وجودیکہ از عناصر دیگر فروتر است،

محل تجلیات پروردگار است و ہیچ عنصرے را از عناصر دیگر تجلیات ذاتی دائمی نصیبہ نیست الا خاک را

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ　　خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

ترجمہ: اس راہ میں بلندی پستی اور پستی بلندی کا ہے جس نے پستی اختیار کی وہ بلند ہوگیا اور جس نے خود کو بلند بنایا وہ گر گیا، عجیب کاروبار ہے کہ تمام عناصر میں خاک اس کے باوجود کہ فرد تر ہے تجلیات پروردگار کا گہوارہ ہے اور خاک کے سوا تمام دوسرے عناصر کو تجلیات ذاتی دائمی نصیب نہیں ہیں۔

موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتا ہے، خاک بن جا تاکہ (تجھ پر) رنگ برنگ کے پھول پیدا ہوں۔

یہ سالبقہ تحریرات باطنی تعلیم کی شروط کو واضح کرتی ہیں۔ جیسے کہ نماز کی تیاری کے لیے کچھ شروط اور لوازمات ہوتے ہیں ان کو پورا کرنے کے بعد انسان میں یہ استعداد پیدا ہوتی ہے کہ وہ نماز پڑھ سکے یعنی کچھ ظاہری کثافتوں کا دور ہونا اور حکمی برکات کا حاصل ہونا اس کے بعد گویا استعداد نماز پیدا ہوئی۔ اسی طرح ظاہری کثافتوں کے دور کرنے کے بعد رہبر کامل سالک راہ کو ذکر الٰہی کی تعلیم کرتا ہے۔ اب چاہے وہ ذکر جہر ہو چاہے ذکر خفی ہو یہ ہر ایک کی استعداد کے لحاظ سے درست اور بہتر ہوتا ہے اور رہبر کامل دکمل کی رہبری بحکم الٰہی برکات کے نزول کا سبب ہوتا ہے۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ (الاعراف رکوع ۲۴) ترجمہ اپنے رب کا ذکر دل سے کیجئے۔

تلاوت قرآن پاک کا اہتمام ہو اور اس میں اتنا انہماک ہو کہ جو عشق کے درجہ پر پہنچ چکا ہو اور عشق میں زوال عقل شرط ہے اسباب دنیا کی تلاش اور اسباب دنیا پر بھروسہ اور اس پر نازاں ہونا اور فخر کرنا یہ عقل دنیا ہے اس عقل کو یہ عشق مٹائے اور قرآن پاک کے ارشادات کو مشاہدہ کی صورت میں نمایاں کرے بہت سے اذکار و اشغال بہت سے مراقبات اور بہت سے درجات اسی میں حاصل ہونا شروع ہونگے جنکو اولیاء اللہ رحمہم اللہ اجمعین نے مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے۔ کہیں ولایات فرمایا ہے کہیں کمالات فرمایا ہو اور کہیں حقائق فرمایا ہو یہ سب چیزیں اور یہ سب اصطلاحیں اسی قرآن پاک میں انشاء اللہ معلوم ہونا شروع ہوں گی جب غور و فکر ایک ہو جائے گی اور انہماک اور تفکر تدبر کے ساتھ قرآن مجید کیطرف حسب امکان اور حسب استعداد مشغول اور مصروف ہونگے۔

(باقی آئندہ)

بقیہ ارشادات حضرت تھانویؒ

بڑھاپا آگیا تو اس کی تصدیق ہو گئی — اور معلوم ہو گیا کہ واقعی یہ مقولہ بالکل درست ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا۔ مسلمان کفار کے طریقوں سے راہ ترقی پر گامزن نہ ہو سکیں گے مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کا راز اعمال صالحہ اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں مضمر ہے لہٰذا اسپر مداومت کیجئے اور رحمت خداوندی سے ثمرات و نتائج کے امیدوار رہیئے۔

رفیقۂ حیات کے انتقال پر

إِنَّا لِفِرَاقِكَ لَمَحْزُونُونَ وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يُرْضِي رَبَّنَا إِنَّا لِلّٰهِ وَ

إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○

محمد منظور نعمانی

میرے خانگی حادثہ پر بزرگوں، مخلص دوستوں اور عزیزوں کے تعزیتی خطوط کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ان میں سے بعض نے جو بہت ہی دردمندی سے لکھے گئے ہیں، دل میں داعیہ پیدا کیا کہ مرحومہ اہلیہ کے متعلق چند باتیں حوالۂ قلم کروں۔ جن کے بارے میں اُمید ہے کہ ان شاء اللہ ان سے واقفیت اللہ کے بہت سے بندوں اور بندیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن اور اس کے کرم پر اعتماد و یقین میں اضافہ کا ذریعہ اور خود مرحومہ کے لیے بھی ان شاء اللہ خیر و رحمت کا وسیلہ بنے گی۔

مرحومہ رفیقۂ حیات کی حیثیت سے تقریباً ۲۸ سال میرے ساتھ رہیں، اس پوری مدت میں برابر یہ تجربہ رہا کہ اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ خاص فضل کا ہے۔ اِس کا بہت ہی نمایاں اور ایک درجہ میں محیر العقول ظہور اُن کے سفرِ حج اور سفرِ آخرت کے بعض واقعات میں ہوا۔ اس وقت اسی سلسلہ کے چند واقعات سپردِ قلم کرتا ہوں۔

وہ میرے والد ماجد مرحوم کی حقیقی بھانجی کی لڑکی تھیں، دیندار اور عبادت گزار اپنے بچپن سے تھیں، میرے گھر آنے سے بہت پہلے اپنی ابتدائی عمر ہی میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ سے بیعت ہوئی تھیں، پھر حضرت کے وصال کے بعد خود میرے ساتھ سہارنپور حاضر ہو کر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم سے بیعت کی تجدید کی تھی۔

قدرتی طور پر ان کی بڑی آرزو اور تمنا تھی کہ ان کو حج کی سعادت نصیب ہو لیکن اس کا

رہا ماں نہ اُن کے پاس تھا نہ میرے پاس۔ اور وہ اس لحاظ سے میرا حال اچھی طرح جانتی تھیں اُس لیے اُس سلسلہ میں کبھی انھوں نے مجھ سے ایک حرف بھی نہیں کہا ــــــــ مگر میرے لیے اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے کئی بار اس کا سامان فراہم کیا اور پھر اِدھر چند برسوں سے "رابطۂ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ)" کی رکنیت کے طفیل قریباً ہر سال حرمین پاک کی حاضری نصیب ہونے لگی تو میرے جانے کے وقت ان کے دل کا جو حال ہوتا تھا اس کو میں محسوس کرتا تھا لیکن وہ مجھ سے اس سلسلہ میں کبھی کچھ نہ کہتیں، بس اللہ تعالیٰ سے عرض کرتیں ــــ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کی بالکل آخری مہلت میں یعنی ان کے مرض الموت کے شروع ہونے سے صرف چند ہفتے پہلے بے وہم وگمان بالکل "لایحتسب" طور پر ان کے اور میرے دونو کے ہوائی سفر کا ایسے عجیب و غریب طریقہ سے انتظام فرمایا کہ اس کی کوئی توجیہہ رب کریم کے خاص الخاص فضل کے سوا نہیں کی جاسکتی۔

اس کے بعد مرحلہ یہ تھا کہ ہم دونوں کے لیے حج والے پاسپورٹ سے سفر کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا، انٹرنیشنل پاسپورٹ ہی سے سفر کرسکتے تھے۔ اور اہلیہ کے لیے انٹرنیشنل پاسپورٹ حاصل کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اندیشہ بلکہ گمان یہی تھا کہ پاسپورٹ جلدی نہ مل سکے گا، اور وقت میں گنجائش بالکل نہیں تھی لیکن اللہ تعالیٰ کی کارسازی کہ حیرت انگیز طریقہ پر صرف ۳۔۴ دن میں ان کا پاسپورٹ تیار ہوا اور مل گیا۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ سامنے آیا کہ انٹرنیشنل پاسپورٹ سے سفر کرنے والوں کو صرف ۷۵ روپے ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے جو ہم جیسوں کے لیے جدّہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے سے مکہ مکرمہ پہنچنے تک کے لیے بھی مشکل ہی سے کافی ہوسکتے تھے۔ اس مسئلہ نے اچھا خاصا تردد پیدا کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے رہنمائی فرمائی اور ہم نے اپنے دل سے کہا کہ اس سفر کا انتظام رب کریم نے محض اپنے لطف و کرم سے فرمایا ہے اس لیے بس اُسی کے لطف و کرم پر بھروسہ کرکے چلنا چاہیے چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اور پھر پورے سفر میں اس کا بے حساب لطف و کرم شامل حال رہا۔ اور ہاتھ بالکل خالی ہونے کے باوجود وہ راحتیں اور نعمتیں نصیب رہیں، جو کبھی کسی سفر میں میسر نہ ہوئی تھی اور جن کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بالکل ایسا معاملہ رہا کہ گویا گھر سے قدم نکالتے ہی کسی کریم میزبان نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ حج کے مسافروں کی پہلی منزل بمبئی ہوتی ہے۔ وہاں ہم جیسے لوگوں کے لیے قیام کی اچھی سے

اچھی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی مخلص دوست اپنا مہمان بنا لیں اور خود تکلیف اٹھا کے اپنے گھر کے کسی حصہ میں ٹھہرا لیں. لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم نے اِس سفر میں اس سے بہت زیادہ آرام دہ انتظام یہ فرمایا کہ ہمارے نہایت مخلص دوست حاجی احمد صاحب (زمزمی) نے ہمیشہ کے معمول کے مطابق مہمان تو اپنا بنایا لیکن اپنے گھر میں قیام کی دلی خواہش کے باوجود خاص کر اہلیہ کی راحت کے خیال سے اپنی خوشدامن صاحبہ کے وسیع مکان میں قیام کرایا جو خود اُس وقت حج پر گئی ہوئی تھیں اور اپنا وہ مکان پورے ساز و سامان کے ساتھ حاجی صاحب موصوف ہی کے پاس سپرد کر گئی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بمبئی میں قیام کے ایسے آرام دہ انتظام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلاشبہ یہ محض فضلِ ربی تھا۔ پھر بمبئی کے احباب و مخلصین کے گھروں کی خواتین نے اُن کی آمد کو گویا ایک تقریب بنا لیا اور انکے ساتھ انتہائی خلوص و محبت اور اکرام کا معاملہ کیا۔ پھر جدہ پہنچنے پر مخلص مکرم الحاج محمد ولی عبداللہ نورولی اور اُن کے اہل خانہ نے ایسی ہی میزبانی کی۔ بلاشبہ یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم اور اسی کی طرف سے تھا۔

میں نے مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ میں قیام کرنا طے کیا تھا، مجھے معلوم تھا کہ ایامِ حج میں ہندوستان و پاکستان کے سینکڑوں حجاج جن میں خواص کی بھی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے، صولتیہ میں قیام کرتے ہیں. اس لیے سوچ لیا تھا کہ بس گزارے کی جگہ پر قناعت کرنا ہوگا اور اس مجاہدہ کے لیے دل پوری طرح بلکہ خوشی کے ساتھ آمادہ و مطمئن تھا. لیکن جب ہم لوگ مدرسہ پر جا کر اترے تو معلوم ہوا کہ مدرسہ کے خاص دفتر کے اوپر جو ایک صحن دار اور ہم جیسوں کے لیے نہایت آرام دہ کمرہ حال ہی میں بن کر تیار ہوا ہے۔ ہمارے عنایت فرما حضرت مولانا شیخ محمد سلیم صاحب نے (جو مدرسہ کے سربراہ ہیں) وہ ہمارے لیے مخصوص کر رکھا ہے، فوراً ہمارا سامان وہیں پہنچوا دیا گیا۔ خود ہم پہونچے تو دیکھا کہ اس کمرہ میں رہائش ہی کے نہیں بلکہ آسائش کے بھی ضروری سامان ہمارے لیے پہلے سے فراہم کر دیے گئے ہیں. پلنگ بچھے ہوئے ہیں، ان پر ہمارے لیے بستر بھی لگے ہوئے ہیں. الغرض وہ سب کچھ تھا جو راحت کے لیے ضروری تھا اور جس کا پہلے سے وہم و گمان نہیں تھا ــــ ہم دونوں اپنا سامان کمرہ میں رکھنے کے بعد عمرہ ادا کرنے کے لیے حرم شریف جانے لگے، مرحومہ اہلیہ میرے پیچھے پیچھے تھیں. حضرت مولانا شیخ محمد سلیم صاحب کے پاس سے گزر ہوا تو میں نے اُن کی اِس غیر معمولی عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے دلی احساس و تاثر کا اظہا

کیا تو مولانا نے حسب عادت بڑی صفائی کے ساتھ فرمایا، مولانا! سچی بات یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ہے آپ کے لیے اور آپ کی خاطر بالکل نہیں ہوا، آپ تو آتے ہی رہتے ہیں، بلکہ ان کے لیے کیا گیا ہے جو آپ کے ساتھ آئی ہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ کبھی پھر آئیں گی یا نہیں۔

ایک نہایت مخلص دوست قاری محمد سلیمان صاحب نے (جو اصلاً سورتی ہیں لیکن مکہ معظمہ میں مقیم ہیں) مولانا شیخ محمد سلیم صاحب سے اجازت لے کر ہم دونوں کو اپنا مستقل مہمان بنا لیا اور سوائے اُن دنوں کے جب کہیں خصوصی دعوت ہوتی روزانہ ممدوح کے یہاں سے کھانے کا خوان ہمارے کمرہ میں آتا رہا۔ اسی طرح مدینہ طیبہ کے پورے زمانۂ قیام میں ایک دوسرے نہایت عزیز دوست صوفی محمد اقبال صاحب نے ہم دونوں کی میزبانی کی۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اُس پورے سفر میں وہ سہولتیں اور راحتیں نصیب فرمائیں جو اس سے پہلے کسی سفر میں نصیب نہیں ہوئی تھیں اور جن کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

ان سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہوا کہ اگرچہ مرحومہ کی عمر سفر حج کے وقت پچاس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی لیکن وہ فطری طور پر بہت کمزور تھیں اور کئی برس پہلے سے اُن کے ضعف جسمانی اور ناتوانی کا حال یہ تھا کہ اگر ان کو سو دو سو قدم بھی پیدل چلنا پڑ جاتا تو اختلاج کی سی کیفیت ہو جاتی اور سانس کا نظام بگڑ جاتا اور بہت دیر تک آرام کرنے کے بعد حالت درست ہو پاتی اور کبھی کبھی تو دوا استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جاتی اس لیے میرا خیال تھا کہ یہ بیچاری حج اور عمرہ کے سلسلہ کے طواف بھی بہ مشکل کر سکیں گی اور صفا مروہ کے درمیان سعی تو سواری ہی سے کر سکیں گی لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اُس کے فضل خاص کا معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ مکہ معظمہ پہونچتے ہی اُن میں وہ توانائی آگئی جو شاید کبھی جوانی میں رہی ہو۔

جدّہ سے بذریعہ کار روانہ ہو کے ہم لوگ مدرسہ صولتیہ پہونچے تھے، سامان اپنے کمرہ میں محفوظ کر کے وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر عمرہ ادا کرنے کے لیے حرم شریف کو چلے، مدرسہ سے حرم شریف کا فاصلہ قریباً ۲ فرلانگ ہے، میں نے مدرسہ سے باہر سڑک پہ آکر اُن کی وجہ سے ٹیکسی کرنی چاہی، انھوں نے کہا کہ ہم پیدل ہی چلیں گے، لیکن چونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ نہیں چل سکیں گی اس لیے میں نے اُن کی بات نہیں مانی اور ٹیکسی سے ہم دونوں حرم شریف گئے، وہاں پہونچ کے پہلے طواف کیا، طواف کے بعد ہم سعی کے لیے صفا پہ آئے، وہاں وہ ہاتھ گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں جن پر وہ بیچارے ضعیف

اور معذور لوگ کرایہ ادا کرکے سعی کرتے ہیں جو پیدل چل کر نہیں کرسکتے ہیں۔ میں نے اہلیہ سے کہا کہ تم گاڑی سے سعی کرلو، انھوں نے کہا کہ نہیں میں پیدل ہی کروں گی! میں نے بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فضل دیکھ کے کہ طواف کے سات چکروں کا اور پھر مطاف سے صفا تک آنے کا اُن پر ذرا بھی اثر نہیں پڑا، یہی مناسب سمجھا کہ وہ اگر کرسکیں تو میرے ساتھ پیدل ہی سعی کرلیں، چنانچہ انھوں نے پوری سعی میرے ساتھ پیدل کی، اور اُن پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا، حالانکہ سعی کے سات پھیروں کی مسافت پونے دو میل کے قریب ہو جاتی ہے پھر اس کے بعد وہ میرے ساتھ پیدل ہی مدرسہ صولتیہ واپس ہوئیں۔ پہلے دن کے اس تجربہ کے بعد مجھے احساس ہوگیا کہ یہ ان پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ پھر تو مکہ معظمہ کے پورے زمانۂ قیام میں یہ معمول رہا کہ وہ اکثر پانچوں وقت کی نماز کے لیے میرے ساتھ پیدل حرم شریف آئیں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بالکل تندرست خواتین کی طرح بکثرت نفلی طواف بھی کریں۔

مدینہ طیبہ میں ہمارا قیام عزیز محترم صوفی محمد اقبال صاحب کے پاس باب التمار میں تھا، وہاں سے مسجد نبوی کا فاصلہ بھی قریب قریب اتنا ہی ہے جتنا کہ مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ سے حرم شریف کا فاصلہ ہے، وہاں بھی وہ نمازوں کے اکثر اوقات میں میرے ساتھ پیدل ہی مسجد آئیں، ہم دونوں بار بار اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کو یاد کرتے اور اس کا شکر ادا کرتے۔

مجموعی طور پر تقریباً چالیس دن حرمین پاک میں قیام رہا، انھیں ایک دن بھی اُس ضعف و ناتوانی کا احساس نہیں ہوا جو برسوں سے لازمۂ زندگی بنا ہوا تھا، بمبئی واپسی تک یہی حال رہا، البتہ بمبئی سے لکھنؤ آتے ہوئے ٹرین ہی میں محسوس ہوا کہ اس کیفیت میں کمی آرہی ہے، پھر گھر پہنچنے کے چند ہی روز بعد وہ اپنے پچھلے حال پر واپس آگئیں اور معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح غیر معمولی طور پر اپنے خاص الخاص فضل سے اُن کے سفر کا سامان فراہم کرکے ان کی ایک بڑی آرزو اور تمنا پوری کی تھی اسی طرح خارقِ عادت طور پر اُن کو صرف سفر حج کے لیے یہ طاقت اور توانائی بخش دی گئی تھی۔

پھر چند ہی روز کے بعد اُن کے اُس مرض کا سلسلہ شروع ہوگیا جس کو ان کی زندگی کے خاتمہ کا ذریعہ بننا تھا ــــــ اور ۲۶ شعبان کو ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سفر حج دراصل اُن کے سفر آخرت کی تمہید اور اس کی تیاری کا ذریعہ و وسیلہ تھا ــــــ اللہ تعالیٰ کے جس فضل و کرم کا تجربہ ان کی زندگی میں اور خاص کر اُن کے سفر حج میں ہوا۔ اُس رب کریم سے پوری اُمید ہے کہ سفر آخرت کی ساری

منزلوں میں بھی اللہ تعالیٰ کا وہی فضل و کرم مرحومہ کو نصیب رہے گا۔ انہ رؤوف رحیم ٥

مرحومہ کے انتقال اور مفارقت کا طبعی صدمہ تو فطری بات ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو حسن ظن اور اس کی شان کرم پر جو اعتماد نصیب ہے اس کی بنا پر الحمد للہ دل کو یہ اطمینان ہے کہ اس وقت ان کا اس دنیا سے چلا جانا ہی ان کے لیے بہتر ہوا۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے (جب اُن کی طبیعت ناساز تھی) فرمایا تھا "لوکان وانا حیٌّ فاستغفر الله وأدعو لك" (یعنی اے عائشہ! اگر تمہارا انتقال میری زندگی میں ہو گیا تو میں تمہارے واسطے اللہ سے خوب مغفرت طلب کروں گا اور دعائیں کروں گا)۔۔۔ اس حدیث پاک کے اشارہ کے مطابق مرحومہ اہلیہ کے لیے استغفار اور دعا کے اہتمام کی توفیق الحمد للہ اس عاجز کو نصیب ہے۔ اور چونکہ اہل دین کی ایک وسیع برادری سے تعلق ہے اور اللہ والوں سے محبت ہے اس لیے اپنے حلقۂ تعلق و تعارف میں، جہاں جہاں بھی ان کے انتقال کی اطلاع ہوئی، اللہ کے مخلص اور صالح بندوں نے اہتمام سے ان کے لیے استغفار فرمایا اور ایصال ثواب کیا۔ جو سیکڑوں خطوط اس سلسلہ میں اب تک مل چکے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ انھیں پڑھ کر خود مجھے مرحومہ پر رشک آتا ہے۔ اہل دین اور اللہ والوں سے تعلق کی تنہا یہی کتنی بڑی برکت ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر و قیمت سمجھنے کی توفیق دے۔ اگر میرے پاس ساری دنیا کے خزانے ہوتے تو میں اُن کو صرف کر کے بھی مرحومہ کے لیے اتنی دعا و استغفار اور اتنا ایصال ثواب نہ کرا سکتا۔ یہ محض للّٰہی دینی تعلق کی برکت ہے کہ اللہ کے بے شمار بندوں نے حرمین پاک تک میں ان کے لیے مغفرت و رحمت کی دعائیں کیں اور ایصال ثواب کیا۔ مکہ معظمہ سے ایک مخلص عزیز کا خط ملا ہے کہ ان کو جب اس حادثہ کی خبر ملی تو انھوں نے مرحومہ کی طرف سے عمرہ بھی کیا، اور حدیث شریف میں ہے کہ رمضان مبارک میں عمرہ حج کے برابر ہے۔۔۔ یہ سب دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا مرحومہ پر فضل و کرم ہے اور بلاشبہ بڑی ہی خوش نصیبی کی علامت ہے۔

اُن کے انتقال کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ ان کی علالت کا سلسلہ تقریباً ڈھائی سال سے سفر حج کے بعد ہی سے جاری تھا اور پہلے کافی عرصہ تک ان کی حالت بہت تشویشناک اور بظاہر مایوس کن رہی تھی لیکن ادھر تقریباً ۵۔۶ مہینے سے حالت بظاہر

قابلِ اطمینان حد تک بہتر ہو گئی تھی، اُن کے معالج بھی مطمئن تھے ___ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے لیے ۲۲ شعبان (۲۴ اکتوبر) کی تاریخ مقرر تھی اور میں نے اُس کی شرکت کے لیے روانگی کا پروگرام بنا لیا تھا کہ دو ہی چار دن پہلے دارالعلوم کے دفتر سے اطلاع آئی کہ فلاں وجہ سے مجلس کی تاریخ دو دن مقدم کر دی گئی ہے اور اب شوریٰ کا جلسہ ۲۰ شعبان سے ہوگا۔ اور دارالعلوم ہی کے فلاں ضروری کام کے لیے مجھے ایک دن پہلے یعنی ۱۹ شعبان کی صبح تک دارالعلوم پہونچ جانا چاہیے ___ مجھے تاریخ کی یہ تبدیلی (جو ضابطہ کے خلاف بھی تھی) سخت ناگوار گزری اور میں نے وہاں پہونچ کر اس پر سخت احتجاج اور اعتراض بھی کیا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا انتظام تھا کہ میں مرحومہ کے انتقال سے پہلے مکان پہونچ جاؤں اور اُن کی دلی آرزو کے مطابق اُن کا انتقال میرے سامنے ہو۔ اگر مجلس شوریٰ کی تاریخ میں یہ تبدیلی نہ ہوئی ہوتی تو میں ۲۶ شعبان کو مرحومہ کے انتقال کے وقت لکھنؤ نہیں پہونچ سکتا تھا ___ مجھے مجلس کی کارروائی کے سلسلے میں پورے پانچ دن دیوبند میں قیام کرنا پڑا، وہاں سے فارغ ہو کر میں سہارنپور حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک شب و روز وہاں قیام کیا۔ جب وہاں سے لکھنؤ کے لیے روانگی کا ارادہ کیا تو حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ نے بالکل خلافِ معمول اور خلافِ عادت[1] فرمایا کہ اگر کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو فلاں مقصد سے دو دن اور ٹھیر جاؤ۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسی مجبوری نہ تھی کہ میں ایک دو دن مزید سہارنپور قیام نہ کر سکتا۔ اور حضرت شیخ مدظلہٗ سے جس طرح کا نیازمندانہ تعلق ہے، اس کا تقاضا تھا کہ میں دو دن اور حضرت ممدوح کی خدمت میں قیام کا فیصلہ کر ہی لیتا، لیکن اُس وقت بغیر کچھ زیادہ سوچے سمجھے زبان سے یہی نکلا کہ رمضان مبارک شروع ہونے میں دو ہی چار دن باقی ہیں اس لیے چاہتا ہوں کہ میں جلدی لکھنؤ پہونچ جاؤں۔ حضرت سے یہ عرض کرنے کے بعد لکھنؤ روانہ ہونے کے لیے رخصتی مصافحہ کر کے باہر نکل آیا۔ اور اب سوچنے لگا کہ مجھے حضرت کے فرمانے کے مطابق دو دن اور ٹھہر جانا چاہیے تھا لیکن حضرت سے رخصتی مصافحہ کر کے چلا آیا تھا اس لیے لکھنؤ واپسی ہی کا ارادہ کر لیا۔ ۲۶ شعبان کو میرے لکھنؤ پہونچنے کے صرف ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب مرحومہ کے انتقال کا حادثہ پیش آیا تو معلوم ہوا مجلس شوریٰ دارالعلوم کی تاریخ کی خلافِ ضابطہ تقدیم اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کے فرمانے کے باوجود میرا سہارنپور نہ ٹھہرنا یہ سب منجانب اللہ اس کا انتظام تھا کہ میں مرحومہ کے آخری وقت میں اُن کے پاس موجود رہوں، وہ اس کی بڑی آرزومند تھیں۔

جیسا کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا۔ مرحومہ کی حالت کئی مہینے سے بہ نسبت سابق کے کافی بہتر تھی اور

---

[1] حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کا یہ اصول اور معمول ہو کہ وہ اپنے مخلصوں بلکہ بزرگوں سے بھی کبھی مزید قیام کے لیے نہیں کہتے۔ معلوم نہیں ان کی [illegible]

میں ان کو اسی حال میں چھوڑ کر دیوبند گیا تھا۔ جب ۲۶ر شعبان کو ۱۲ بجے وہاں سے واپس ہو کر مکان پہونچا تو معلوم ہوا کہ ایک دو دن سے درد کی تکلیف ہے جس کا تعلق گردہ سے سمجھا جا رہا ہے۔ اُس وقت بھی میں نے ان کی حالت تشویشناک نہیں سمجھی لیکن قریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اچانک ان کی حالت میں تغیر ہوا غالباً قلبی دورہ ہوا اور صرف ۴۔۵ منٹ میں روح اور جسم کا رشتہ منقطع ہو گیا۔

لله ما اعطیٰ وله ما اخذ وعلینا الصبر والرضیٰ بالقضاء۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ درد کی شدید تکلیف کی حالت میں وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا اور استغفار کرنے کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی کوثر سلمہا سے کہتی تھیں کہ دیکھو کوثر اس کا خیال رکھنا کہ تکلیف کی شدت میں میری زبان سے کوئی غلط کلمہ نہ نکل جائے۔

اللہ تعالیٰ اپنی اس بندی کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائے، ہر قسم کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرماتے ہوئے حسنات کو قبول فرمائے — اور جن بندوں نے ان کے لیے مغفرت و رحمت کی دعائیں کیں اور اُن کے پسماندگان کی تعزیت کی اور مخلصانہ ہمدردی کا اظہار فرمایا ان کو بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے اور دنیا اور آخرت میں فضل و انعام سے نوازے یہ عاجز تو دل سے اُن حضرات کا شکر گزار اور دُعا گو ہے۔

Regd No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 38 NO. 9 DECEMBER 1970

الفرقان لکھنؤ

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

چندہ سالانہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
مصولڈاک کا اضافہ

چندہ سالانہ
ہندوستان سے ۸/-
پاکستان سے ۱۰/-
صفحات ۶۰ صفحات
قیمت
فی پرچہ ...... ۷۵ پیسے

شمارہ (۱۱)	بابت ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۰ھ مطابق جنوری ۱۹۷۱ء	جلد ۳۸

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۵ فروری تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجکر اس کی اطلاع ہمیں دے دیں۔ جن حضرات نے سالانہ خط کے جواب میں اطلاعات دی ہو کر رسالہ یا برابر پہنچ رہا ہو ان کے علاوہ باقی تمام حضرات کا رسالہ فی الحال بند رہے گا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

مخدوم و مشائخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ نے (جو ماہ رواں ذیقعدہ کے اسی آخری ہفتہ میں حجاز مقدس تشریف لے گئے ہیں) اب سے کچھ عرصہ پہلے مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے حضرات اساتذہ و متعلقین و کارکنان کیلئے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اپنے قریبی اسلاف و اکابر کے کچھ واقعات ذکر کر کے دکھلایا تھا کہ مدارس کے معاملات میں ان حضرات کا کیسا کتنا احتیاط و تورع کا تھا اور وہ خاص اس باب میں آخرت کے محاسبہ سے کس قدر لرزاں و ترساں رہتے تھے ۔۔۔ ابھی حال ہی میں حضرت ممدوح نے اپنی زندگی کے کچھ واقعات بطور املا بعض عزیزوں سے قلمبند کرائے تھے جو قریباً دو سو صفحے کی ایک چھوٹی سی کتاب کی شکل میں "آپ بیتی"[1] کے نام سے شائع ہو گئے ہیں۔ اسکے شروع میں حضرت ممدوح کا وہ مضمون بھی شائع کر دیا گیا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ۔۔۔ آج کی صحبت میں اسی سے اخذ کر کے اپنے اکابر کے چند واقعات نذر ناظرین کیے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب لوگوں کو جو دینی مدارس سے یا دینی خدمت کے کسی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں توفیق دے کہ ان سے نصیحت و عبرت حاصل کریں۔

(۱) حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ (بخاری و ترمذی کے محشی) جب مظاہر علوم کی قدیم تعمیر کے چندہ کے سلسلہ میں کلکتہ تشریف لے گئے (کہ وہاں کے قیام کی وجہ سے لوگوں سے حضرت مولانا کے خصوصی تعلقات تھے) تو مولانا مرحوم نے سفر سے واپسی پر اپنے سفر کی آمد و خرچ کا مفصل حساب مدرسہ میں داخل کیا تو وہ رجسٹر میں نے خود پڑھا ۔۔۔ اسمیں ایک جگہ لکھا تھا کہ کلکتہ میں فلاں جگہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا اگرچہ وہاں چندہ خوب ہوا لیکن میری نیت دوست سے ملنے کی تھی چندہ کی نہیں تھی اسلئے وہاں کی آمد و رفت کا اتنا کرایہ حساب سے وضع کر لیا جائے۔"

(۲) حضرت اقدس سیدی مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہ جب بحیالہ قیام حجاز کے بعد ۱۳۲۳ھ کے آخر میں مظاہر علوم میں واپس تشریف لائے تو میرے والد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب نور اللہ مرقدہ کا شروع ذیقعدہ میں انتقال

۱؎ "آپ بیتی" کتب خانہ یحیوی سہارنپور سے شائع ہوئی ہے۔ کتب خانہ الفرقان لکھنؤ سے بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

ہو چکا تھا، حضرت نے مدرسے سے تنخواہ لینے سے یہ تحریر فرماکر انکار کر دیا کہ میں اپنے ضعف و پیری کی وجہ سے کئی سال سے مدرسہ کا کام پورا نہیں کر سکتا لیکن اب تک مولانا محمد یحییٰ صاحب میری نیابت میں دورہ کے اسباق پڑھاتے تھے اور تنخواہ نہیں لیتے تھے وہ میرا ہی کام سمجھ کر کرتے تھے، اور میں اور وہ دونوں مل کر ایک مدرس سے زیادہ کام کرتے تھے اب چونکہ ان کا انتقال ہو چکا ہے اور میں مدرسہ کی تعلیم کا پورا کام نہیں کر سکتا اس لیے قبول تنخواہ سے معذور ہوں ....

(۲) مظاہر علوم کا جب سالانہ جلسہ ہوتا تھا میں نے اکابر مدرسین و ملازمین میں سے کبھی کسی کو جلسہ کے کھانے میں جاتے یا ان کو کھاتے نہیں دیکھا، جملہ مدرسین حضرات اپنا اپنا کھانا کھاتے تھے البتہ حضرت قدس سرہ مدرسہ کے خصوصی مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے لیکن حضرت کے مکان سے دس بارہ آدمیوں کا کھانا آتا تھا جو متفرق مہمانوں کے سامنے رکھ دیا جاتا تھا اسی میں سے حضرت نوش فرماتے تھے، مدرسہ کی کوئی چیز کھاتے نہیں دیکھا ــــ مولانا عنایت الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ روز و شب روزانہ مدرسہ کے اندر رہتے اور دن کو ظہر کے وقت اور رات کو ۱۰ بجے اپنے دفتر کے کوٹے میں بیٹھ کر اپنا ٹھنڈا اور معمولی کھانا تنہا کھا لیتے تھے

(۴) میرے والد صاحب (حضرت مولانا محمد یحییٰ) قدس سرہٗ کے زمانے میں مدرسہ کا مطبخ جاری نہیں ہوا تھا، نہ مدرسہ کے قریب کسی طباخ کی دوکان تھی، جامع مسجد کے قریب ایک طباخ کی دوکان سے کھانا آیا کرتا تھا، سردی کے زمانہ میں وہاں سے آتے آتے خصوصاً شام کو ٹھنڈا ہو جاتا تھا، تو سالن کے برتن کو مدرسہ کے حمام کے سامنے اندر نہیں بلکہ باہر رکھوا دیتے تھے اس کی تپش سے وہ تھوڑی دیر میں گرم ہو جاتا تھا، تو ہر ماہ دو تین مدرسے یہ فرما کر چندہ میں داخل کرتے تھے کہ مدرسہ کی آگ سے انتفاع ہوا ہے ــــ تنخواہ تو میرے والد صاحب نے اپنے سات سالہ قیام مدرسہ میں کبھی لی ہی نہیں۔

(۵) حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحبؒ مدرسہ (مظاہر علوم) کے مہتمم بھی تھے، مفتی بھی تھے اور عدالتی تمام کاروبار ان ہی کے ذمہ تھا لیکن دفتر میں ان کے پاس دو قلمدان رہتے تھے ایک ذاتی ایک مدرسہ کا، ذاتی قلمدان میں کچھ ذاتی کاغذ بھی رکھے رہتے تھے اپنے گھر کوئی ضروری پرچہ بھیجنا ہوتا تو اپنے قلمدان سے لکھتے تھے مدرسہ کے قلمدان سے کبھی نہیں لکھتے تھے......

(۶) حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحبؒ کو اخیر زمانہ میں ضعف پیری کے علاوہ شدید امراض کا ابتلا رہا (اسی حال میں) صبح کو ڈولی میں بیٹھ کر مدرسہ آتے اور بعد عصر ڈولی میں بیٹھ کر واپس تشریف لے جاتے، اس مشقت کو دیکھ کر مجھے ترس آتا تھا۔ میں نے تفصیلی حالات لکھ کر حضرات سرپرستانِ[1] مدرسہ کی خدمت میں

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

مرحوم کی خدمات جلیلہ کے پیش نظر خصوصی طور پر پنشن کی تجویز پیش کی گئی، حضرت اقدس مولانا تھانوی سرپرست مدرسہ (قدس سرہٗ) نے تحریر فرمایا کہ مدرسہ کے موجودہ چندہ سے پنشن جائز نہیں ہے اس کے لیے آپ ایک مستقل مد قائم کرکے چندہ کریں اس میں سے پنشن دی جاسکتی ہے..... مہتمم صاحب کے لیے جو تم مناسب سمجھو تنخواہ تجویز کرکے مخصوص احباب سے چندہ مقرر کرالو، پانچ روپے ماہانہ میں اپنی ذات سے دوں گا۔

(۷) قدوۃ الاتقیاء حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب نوراللہ مرقدہ (سرپرست دارالعلوم دیوبند و مظاہر علوم سہارنپور) کا یہ مقولہ بہت ہی مشہور تھا اور خود سنا گیا ہے کہ مجھے مدارس کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا کسی چیز سے نہیں لگتا، اگر کوئی شخص کسی کے یہاں ملازم ہو وہ مالک کے کام میں کچھ کوتاہی کرے خیانت کرے، کسی قسم کا نقصان پہونچائے تو ملازمت سے علیٰحدہ ہوتے ہوئے یا مرتے وقت مالک سے معاف کرالے تو معاف ہوسکتا ہے، لیکن مدرسوں کا روپیہ جو بیچارے عوام کے چندہ سے آتا ہے ہم سرپرستان مدرسہ اس کے مالک تو ہیں نہیں امین ہیں۔ اگر اس کے صرف و استعمال میں افراط و تفریط ہو تو ہم لوگوں کے معاف کرنے سے معاف تو ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ دوسرے کے مال میں ہم کو معافی کا کیا حق ہے، اتنا ضرور ہے کہ اگر بمصالح مدرسہ چشم پوشی کریں تو اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ ہم سے درگذر فرمائے۔ لیکن اگر اپنے ذاتی تعلقات سے ہم لوگ تسامح کریں تو ہم بھی جرم کے اندر شریک ہیں، لیکن جرم کرنے والے سے کسی حال میں بھی معاف نہیں ہوسکتا کہ حقوق العباد ہے اور جن کا مال ہے وہ اتنے کثیر کہ ان سے معاف نہیں کروایا جاسکتا۔

ان فی ذالک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شہید۔

۱؎ (حاشیہ صفحہ گزشتہ) مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) کے نظام میں اعلیٰ با اختیار جماعت کے ارکان کو "سرپرست" کہا جاتا ہے مظاہر علوم کے معاملات میں فیصلہ کا آخری اختیار انہی حضرات کو حاصل ہے۔ (د، الفرقان)

افسوس ہے کہ یہ شمارہ ۲۰ جنوری تک شائع کردینے میں کامیابی نہیں ہوسکی اس لیے فروری کا شمارہ بھی کم سے کم ۱۵ دن لیٹ ضرور ہوجائے گا۔ ناظرین کرام ۱۵ فروری کے بعد اس کا انتظار فرمائیں۔

منیجر

كِتَابُ الْمُعَاشَرَةِ وَالْمُعَامَلَاتِ

مَعَارِفُ الْحَدِيث

(مُسَلسَل)

لیٹنے، سونے اور بیٹھنے کے بارے میں حضورؐ کی ہدایات اور آپؐ کا طریقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیٹنے، سونے اور بیٹھنے کے بارے میں بھی اُمت کو ہدایات دی ہیں اور اپنے طرزِ عمل سے بھی رہنمائی فرمائی ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ کی چند احادیث پڑھیے اور آپؐ کی تعلیم و ہدایت کی جامعیت کا اندازہ کیجئے!۔

سپاٹ چھت پر سونے کی ممانعت:-

عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّنَامَ الرَّجُلُ عَلٰى سَطْحٍ لَيْسَ بِمَحْجُوْرٍ عَلَيْهِ ——— رواه الترمذی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ایسی چھت پر سونے سے منع فرمایا جو (دیواروں یا منڈیروں سے) گھیری نہ گئی ہو۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) ظاہر ہے کہ جو چھت دیواروں یا منڈیروں سے گھیری نہ گئی ہو اس پر سونے سے اس کا اندیشہ ہے کہ آدمی نیند کی غفلت میں چھت سے نیچے گر جائے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

عَنْ عَلِيِّ بْنِ شَيْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَنْ بَاتَ عَلٰى ظَهْرِ بَيْتٍ لَيْسَ عَلَيْهِ حِجَابٌ (وَفِيْ رِوَايَةٍ حِجَارٌ)
فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ الذِّمَّةُ ———— رواہ ابو داؤد

علی بن شیبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی گھر کی ایسی چھت پر سوئے جس پر پردہ اور رکاوٹ کی دیوار نہ ہو تو اس کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) یہ بھی دراصل ممانعت کا ایک بلیغ انداز ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی حفاظت کے جو غیبی انتظامات ہیں، جن کا اشارہ قرآن مجید میں بھی کیا گیا ہے (قُلْ مَنْ يَكْلَؤُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ الآية) (اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر ایسی چھت پر سوتا ہے جس کے گرد رکاوٹ کے لیے کوئی دیوار یا منڈیر نہیں ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس حفاظتی انتظام کا استحقاق کھو دیتا ہے اور ملائکہ محافظین کی کوئی ذمہ داری نہیں رہتی۔ اور اگر خدانخواستہ وہ گر کے ہلاک ہو جاتا ہے یا اس کو سخت جسمانی صدمہ پہونچ جاتا ہے تو کسی دوسرے پر اس کی ذمہ داری نہیں وہ خود ہی ذمہ دار ہے۔

کھڑی ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے لیٹنے کی ممانعت اور اس کی وجہ:-

عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَرْفَعَ الرَّجُلُ اِحْدٰى رِجْلَيْهِ عَلَى الْاُخْرٰى وَهُوَ مُسْتَلْقٍ عَلٰى ظَهْرِهٖ۔
———— رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی چت لیٹنے کی حالت میں اپنی ایک ٹانگ اٹھا کے دوسری ٹانگ پر رکھے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) حضورؐ کے زمانہ میں عربوں میں عام طور سے تہبند باندھنے کا رواج تھا اور ظاہر ہے کہ اگر تہبند باندھ کے اس طرح چت لیٹا جائے کہ اپنا ایک زانو کھڑا کر کے دوسرا پاؤں اس کے اوپر رکھا جائے تو بسا اوقات ستر کھل جائے گا۔ غالباً اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح

بیٹھنے سے منع فرمایا، لیکن اگر پاس ایسا ہو کہ اس طرح لیٹنے سے ستر کھل جانے کا اندیشہ نہ ہو تو ظاہر یہی ہے کہ اس کی ممانعت نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

پیٹ کے بل اوندھے لیٹنے کی ممانعت:۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ رَأَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلاً مُضْطَجِعاً عَلَى بَطْنِهِ فَقَالَ إِنَّ هٰذِهِ ضِجْعَةٌ لَا يُحِبُّهَا اللهُ.

——— رواہ الترمذی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو پیٹ کے بل اوندھا لیٹا ہوا دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ لیٹنے کا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) ظاہر ہے کہ یہ لیٹنے کا غیر فطری اور غیر مہذب طریقہ ہے اسی لیے اس کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں اس کو دوزخیوں کا طریقہ بھی فرمایا گیا ہے۔

عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ مَرَّ بِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا مُضْطَجِعٌ عَلَى بَطْنِي فَرَكَضَنِي بِرِجْلِهِ وَقَالَ يَا جُنْدُبُ إِنَّمَا هِيَ ضِجْعَةُ أَهْلِ النَّارِ

——— رواہ ابن ماجہ

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے اور میں پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا تو آپ نے اپنے قدم مبارک سے مجھے ہلایا اور فرمایا اے جُندُب یہ دوزخیوں کے لیٹنے کا طریقہ ہے! (سنن ابن ماجہ)

(تشریح) کسی عمل یا کسی عادت کی قباحت یا شناعت اہل ایمان کے دلوں پر بٹھانے کے لیے یہ نہایت مؤثر طریقہ ہے کہ ان کو بتایا جائے کہ یہ دوزخیوں کا طریقہ یا ان کی عادت ہے

——— جُندُب حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا اصلی نام ہے۔ حضور نے اس تعلیم و ہدایت کے وقت ان کو اسی نام سے یاد فرمایا۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح لیٹتے تھے :-

عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا عَرَّسَ بِلَیْلٍ اِضْطَجَعَ عَلٰی شِقِّہِ الْاَیْمَنِ وَاِذَا عَرَّسَ قُبَیْلَ الصُّبْحِ نَصَبَ ذِرَاعَہٗ وَوَضَعَ رَأْسَہٗ عَلٰی کَفِّہٖ رواہ فی شرح السنۃ

ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول اور دستور تھا کہ (سفر میں) جب آپ رات میں پڑاؤ کرتے تو داہنی کروٹ پر آرام فرماتے اور جب صبح سے کچھ پہلے پڑاؤ کرتے تو اپنی کلائی کھڑی کر لیتے اور سر مبارک اپنی ہتھیلی پر رکھ کر کچھ آرام لے لیتے۔ (شرح السنۃ للبغوی)

(تشریح) اہل عرب عام طور سے رات کے ٹھنڈے وقت میں سفر کرتے تھے، پھر اگر سفر سویرے سرِ شام شروع کرتے تو کسی مناسب جگہ ایسے وقت آرام کے لیے اتر جاتے اور پڑاؤ کرتے کہ رات کا کافی حصہ باقی ہوتا تھا اور سونے کا کافی موقع مل جاتا تھا، اور اگر سفر دیر رات سے شروع کرتے تو آرام کے لیے صبح سے کچھ پہلے اتر جاتے تھے ——— حضرت ابو قتادہ کی اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ حضور جب ایسے وقت اترتے اور پڑاؤ کرتے کہ رات کافی باقی ہوتی تو آپ سونے کے لیے اطمینان سے داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے جیسا کہ سونے میں آپ کا ہمیشہ کا معمول تھا۔ اور جب آپ رات کے بالکل آخری حصہ میں اترتے کہ فجر کا وقت ہوتا تو آپ اپنی کہنی ٹیک کے اور کلائی کھڑی کر کے ہتھیلی پہ سر مبارک رکھ کر لیٹ جاتے تھے اور اس طرح گویا نماز فجر کا انتظار فرماتے تھے ——— اس قسم کی حادیث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیٹنے اور سونے تک کی ہیئتوں کو بھی کتنے اہتمام سے محفوظ رکھ کر امت کو پہنچایا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی اس فکر و کاوش کا ان کو بہتر سے بہتر صلہ پوری امت کی طرف سے عطا فرمائے اور ہم کو اتباع اور پیروی کی توفیق دے۔

عَنْ حُذَیْفَۃَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَخَذَ مَضْجَعَہٗ مِنَ اللَّیْلِ وَضَعَ یَدَہٗ تَحْتَ خَدِّہٖ ثُمَّ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ

بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْيىٰ وَاِذَا اسْتَيْقَظَ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْر ـــــــ رواہ البخاری

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپ رات کو بستر پر لیٹتے تو اپنا ہاتھ رخسار مبارک کے نیچے رکھ لیتے اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کرتے "اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْيىٰ" (اے اللہ میں تیرے ہی نام کے ساتھ مرنا چاہتا ہوں اور تیرے ہی نام کے ساتھ جینا چاہتا ہوں) اور پھر جب آپ بیدار ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کرتے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَحْيَانَا بَعْدَ اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ" (ساری حمد و ستائش اس اللہ کے لیے جس نے ہمیں (ایک طرح کی) موت دینے کے بعد جلا دیا، اور مرنے کے بعد اسی کی طرف ہمارا اٹھنا ہوگا)۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) دوسری روایتوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ داہنی کروٹ پر داہنا ہاتھ رخسار مبارک کے نیچے رکھ کر لیٹتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے۔ علاوہ ازیں اس حدیث میں سونے کے لیے لیٹنے کے وقت اور پھر جاگتے وقت کی جس مختصر دُعا کا ذکر ہے دوسری حدیثوں میں اس کے علاوہ بھی متعدد دُعائیں ان دونوں موقعوں کے لیے روایت کی گئی ہیں ـــــ یہ سب حدیثیں اس سلسلۂ معارف الحدیث کی پانچویں جلد میں زیر عنوان "سونے کے وقت کی دُعائیں" درج کی جا چکی ہیں۔

سونے سے پہلے اور سو کے اٹھ کر مسواک کا اہتمام:-

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَنَامُ اِلَّا وَالسِّوَاكُ عِنْدَ رَأْسِهٖ فَاِذَا اسْتَيْقَظَ بَدَأَ بِالسِّوَاكِ۔

ـــــــ رواہ احمد والحاکم

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ سونے کا ارادہ کرتے تو مسواک اپنے سرہانے رکھ لیتے پھر جب بیدار ہوتے تو

سب سے پہلے مسواک کرتے۔ (مسند احمد، مستدرک حاکم)

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَا یَرْقُدُ مِنْ لَیْلٍ وَلَا نَہَارٍ فَیَسْتَیْقِظُ اِلَّا تَسَوَّکَ ——— رواہ ابوداؤد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں یا دن میں جب بھی سوتے تو اٹھ کر مسواک ضرور کرتے۔

(سنن ابی داؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح بیٹھتے تھے اور کس طرح بیٹھنے کی ہدایت فرماتے تھے:-

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِفِنَاءِ الْکَعْبَۃِ مُحْتَبِیًا بِیَدَیْہِ ——— رواہ البخاری

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کے صحن میں احتبا کے طور پر (یعنی گوٹ مارے) بیٹھا دیکھا ہے۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) احتبا بیٹھنے کا ایک خاص طریقہ ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ دونوں سرینیں اور دونوں پاؤں کے تلوے زمین پر ہوں اور دونوں زانو کھڑے ہوں اور اُن کو دونوں ہاتھوں کے حلقہ میں لے لیا جائے، یہ اہلِ فقرا اور اصحابِ مسکنت کے بیٹھنے کا طریقہ ہے، اس کو ہندی میں گوٹ مار کے بیٹھنا بھی کہتے ہیں، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اس طرح بیٹھتے تھے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ فِی الْمَسْجِدِ اِحْتَبٰی بِیَدَیْہِ ——— رواہ رزین

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں بیٹھتے تو عموماً احتبا کے طور پر بیٹھتے تھے۔ (مسند رزین)

عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَۃَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

إِذَا صَلَّى الْفَجْرَ تَرَبَّعَ فِي مَجْلِسِهِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ حَسْنَاءَ۔

_____ رواه ابوداؤد

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ اپنی اسی جگہ میں چہارزانو بیٹھے رہتے تھے یہاں تک کہ آفتاب اچھی طرح نکل آتا تھا۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احتبا کی شکل کے علاوہ چہارزانو بھی بیٹھتے تھے۔ اور حدیث کے راوی جابر بن سمرہ کے بیان کے مطابق فجر کی نماز کے بعد سے طلوع آفتاب کے بعد تک گویا اشراق تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد شریف میں اپنی جگہ پر چہارزانو ہی بیٹھے رہتے تھے۔

مجلس میں آنے والے کو چاہیے کہ مجلس کے کنارے ہی بیٹھ جائے :۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كُنَّا إِذَا أَتَيْنَا النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَلَسَ أَحَدُنَا حَيْثُ يَنْتَهِي _____ رواه ابوداؤد

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگوں کا (یعنی صحابہ کا) یہ طریقہ اور دستور تھا کہ جب ہم میں سے کوئی مجلس میں آتا تو (حاضرین مجلس کے درمیان سے گزر کے آگے جانے کی کوشش نہیں کرتا تھا بلکہ) کنارے ہی بیٹھ جایا کرتا تھا۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) اُصولِ حدیث میں یہ بات مسلّم اور مقرر ہو چکی ہے کہ کسی صحابی کا یہ بیان کرنا کہ حضورؐ کے زمانہ میں آپ کے صحابہ ایسا کیا کرتے تھے اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کا وہ عمل آپ کی مرضی کے مطابق اور آپ ہی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا ــــ اس بنا پر اس حدیث کا مطلب اور مدعا یہ ہوگا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ ادب سکھایا تھا کہ جب مجلس قائم ہو اور کوئی آدمی بعد میں آئے تو وہ مجلس کے کنارہ پر جہاں جگہ پائے وہیں بیٹھ جائے ــــ ہاں صاحب مجلس کو حق ہے کہ کسی خصوصیت یا مصلحت کی وجہ سے اُس کو آگے بلالے۔

حلقہ کے بیچ میں آکر بیٹھ جانا سخت ممنوع ہے :۔

عَنْ حُذَيْفَةَ مَلْعُوْنٌ عَلٰى لِسَانِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَعَدَ وَسْطَ الْحَلْقَةِ ـــــــــــــــ رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک نے اُس شخص کو قابلِ لعنت قرار دیا ہے جو بیچ حلقہ میں بیٹھ جائے۔
(جامع ترمذی وسنن ابی داؤد)

(تشریح) شارحین نے اس حدیث کی کئی توجیہیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کے بندے حلقہ بنائے بیٹھے ہیں، ایک متکبر یا بے تمیز اور ادب سے ناآشنا آدمی لوگوں کے اوپر سے پھلانگ کے حلقہ کے بیچ میں آکر بیٹھ جاتا ہے، بلاشبہ یہ سخت مجرمانہ حرکت ہے اور ایسا آدمی لوگوں کی لعنت کا مستحق ہے۔ دوسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ اللہ کے کچھ بندے حلقہ بنائے بیٹھے ہیں اور ہر ایک کا دوسرے سے مواجہہ یعنی آمنا سامنا ہے، ایک آدمی آکر اس طرح حلقہ کے بیچ میں بیٹھ جاتا ہے کہ بعض لوگوں کا مواجہہ باقی نہیں رہتا، ظاہر ہے کہ یہ بھی بہت بیہودہ حرکت ہے ـــ تیسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ اس سے وہ مسخرے مراد ہیں جو لوگوں کے بیچ میں اُن کو ہنسانے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں اور یہی ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

متفرق ہو کر بیٹھنے کی ممانعت :۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُهٗ جُلُوْسٌ فَقَالَ مَالِيْ اَرَاكُمْ عِزِيْنَ ـــــــــــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور صحابہ متفرق الگ الگ ٹکڑیاں بنائے) بیٹھے تھے تو آپ نے فرمایا مجھے کیا ہو گیا ہو کہ میں تمھیں الگ الگ بیٹھے دیکھ رہا ہوں۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) کسی چیز پر اظہار ناراضی کا یہ ایک خاص انداز ہے کہ کہا جائے کہ "میری آنکھیں یہ کیا دیکھ رہی ہیں" یعنی جو کچھ دیکھنے میں آرہا ہے وہ نہیں ہونا چاہیے اور نظر نہ آنا چاہیے ـ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو دیکھا کہ وہ الگ الگ ٹکڑیوں کی شکل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس پر آپ نے اپنی حیرت کا اظہار فرماکر تنبیہ فرمائی اور بتایا کہ بجائے اس طرح الگ الگ بیٹھنے کے سب مل کے ایک جگہ بیٹھو۔ بعض دوسری حدیثوں میں اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اس ظاہری تفرق اور تشتت کا اثر دلوں پر پڑتا ہے اور مل کر ساتھ بیٹھنے سے قلوب میں جوڑ اور توافق پیدا ہوتا ہے۔

اس طرح نہ بیٹھا جائے کہ جسم کا کچھ حصہ دھوپ میں ہو اور کچھ سایہ میں:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا كَانَ اَحَدُكُمْ فِی الْفَیْءِ فَقَلَصَ عَنْهُ الظِّلُّ فَصَارَ بَعْضُهٗ فِی الشَّمْسِ وَ بَعْضُهٗ فِی الظِّلِّ فَلْیَقُمْ ——— رواہ ابوداؤد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی سایہ کی جگہ میں بیٹھا ہو پھر اس پر سے سایہ ہٹ جائے اور پھر اس کے جسم کا کچھ حصہ دھوپ میں اور کچھ سائے میں ہو جائے تو اسے چاہیئے کہ وہ اس جگہ سے اٹھ جائے۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) ماہرین نے بتایا ہے کہ اس طرح بیٹھنا یا لیٹنا کہ جسم کا کچھ حصہ دھوپ میں اور کچھ سایہ میں ہو طبی لحاظ سے مضر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ممانعت غالباً اسی لیے فرمائی ہوگی۔ واللہ اعلم۔

مُصلحِ اعظم

از مولانا عبدُ السّلام صاحب قدوائی

چودہ پندرہ سو برس پہلے دُنیا جن حالات سے گزر رہی تھی اُن کا تذکرہ پچھلے مضامین[۱] میں نظر سے گزر چکا ہے اور آپ دیکھ چکے ہیں کہ دُنیا کے مختلف ممالک، مذاہب اور اقوام کو کیا مشکلات درپیش تھیں۔ تاریخ عالم کے ایک مبصر نے اُس وقت کی صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"گوتم بدھ کی تعلیم چین، تبت اور مشرقی ایشیا کی خانقاہوں میں "تیاگی" بن کر بیٹھ رہی تھی۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیم چھ سو برس تک مغربی دُنیا میں سرمار چکی تھی اور اس کے پیرؤوں کے جھگڑے اس کی جگ ہنسائی کر رہے تھے۔ پرانے دیوتا بُت بن کر رہ گئے تھے اور اُن کے ماننے والے زندگی اور اُس کے کشمکش دھندوں سے الگ ہو کر فلسفہ کی شانتی اور بیچارگی میں پناہ لے رہے تھے۔ سیاسی دنیا میں بھی ایسی ہی ابتری تھی۔ ادھر ہندوستان کی گپت تہذیب کو اُدھر روم کی شان دار سلطنت کو وحشی نسلوں نے تباہ کر دیا تھا۔ چین اپنے الگ کونے میں پڑا تھا۔ ایران میں ساسانی خاندان نے ایک خاصی بڑی سلطنت قائم کی تھی، مگر وہ روم کی مشرقی سلطنت سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ چکی تھی، اس میں کچھ بدن تو تھا مگر جان نہ تھی۔ مذہبی رہنماؤں کے فساد نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔"[۲]

ان حالات کی اصلاح کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ انسانیت کی کشتی گرداب مصائب میں

۱؎ الفرقان ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۰ء ۲؎ دنیا کی کہانی باب ۹ صـ۱۱۰ و صـ۱۱۱۔

چکر کھا رہی تھی اور کوئی ایسا باہمت شناور دکھائی نہ دیتا تھا جو اسے موجوں کے تلاطم سے بچا کر ساحلِ مراد تک پہونچا سکتا۔ عقلاءِ روزگار حیران اور مفکرین عالم پریشان تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ مایوسی کے اس عالم میں صحرائے عرب سے ایک صدا بلند ہوئی۔

یا ایها الناس قد جاءکم الرّسول بالحق من ربکم فاٰمنوا خیراً لکم، وان تکفروا فان للّٰه ما فی السّمٰوات والارض، وکان اللّٰه علیماً حکیماً ٥

اے لوگو! وہ پیغامبر جس کی آمد کے تم منتظر تھے، تمھارے رب کی طرف سے پیغامِ حق لے کر آ گیا ہے لہذا تم ایمان لے آؤ اور اپنے لیے خیر و فلاح کا سامان کرو اور اگر تم نہ مانوگے تو یقین رکھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔

اس ندائے ربّانی کے بعد لوگوں نے یہ بھی سُنا کہ وہ پیغمبر برحق اعلان کر رہے ہیں کہ میں کسی خاص قوم و ملک سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ میں سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، خدا کے تمام بندوں کو راہِ حق دکھانا میرا مقصد ہے اور سب کو مشکلات و مصائب سے بچا کر فلاح و کامرانی کی منزل تک پہونچانا میرا مقصود ہے۔

وہ اگرچہ عرب میں پیدا ہوئے تھے لیکن اُنھوں نے اپنے آپ کو کسی ملک کی چہار دیواری میں محدود نہیں کیا۔ وہ نسلاً قبیلۂ قریش سے تعلق رکھتے تھے لیکن انھوں نے کسی قوم کے ساتھ اپنے کو وابستہ نہیں کیا بلکہ برملا اعلان کیا کہ :-

یٰآیها الناس انی رسول اللّٰه الیکم جمیعا الذی له ملک السّمٰوات والارض، لا اِلٰه الا هو یحیی ویمیت

اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغامبر ہوں جسے آسمانوں اور زمین کی فرماں روائی حاصل ہو اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔

اُس نے صاف صاف کہا کہ :-

بُعِثْتُ الی الاسود والاحمر	میں کالے اور گورے سبھی کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

اس کے ہدایت نامہ میں تصریح تھی کہ بلا تفریق نسل و وطن وہ ساری نوع انسانی کی ہدایت پر مامور کیا گیا ہے۔

وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا۔

اس کی آمد کسی ایک کے لیے نہیں بلکہ سارے جہانوں کے لیے پیام رحمت ہے۔

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین	ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں رنگ و نسل اور ملک و قوم کی تفریق کے خلاف یہ پہلا کھلا ہوا اعلان تھا۔ اور ساری نوع انسانی کو یکساں سمجھنے اور سب کی فلاح و بہبود کے لیے یکساں جد و جہد کرنے کا یہ پہلا بیان تھا۔ وہ مصلح اعظم جو دستور دے کر آیا تھا اس کے اندر صاف صاف تصریح تھی کہ:۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔	اے لوگو ہم نے تمھیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں اقوام و قبائل کی شکل صرف اس لیے دی ہے تاکہ ایک دوسرے کی پہچان ہو سکے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اس بیان کی مزید وضاحت اس مصلح اعظم نے ان الفاظ میں فرمائی۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں[۱]، نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر کوئی تفوق حاصل ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے[۲]۔"

---

[۱] سنن ابی داؤد۔ کتاب الصلوٰۃ۔ [۲] صحیح مسلم

یہ الفاظ پیغمبر اسلام خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ایک مجمع عظیم کے سامنے ادا ہوئے۔ آپ نے صرف الفاظ ہی میں یہ اعلان نہیں کیا بلکہ ان الفاظ کو اسلامی زندگی کا دستور العمل بنادیا۔ پوری زندگی اس اصول کو برت کر دکھایا اور اپنے پیروؤں کے سامنے ایسا واضح نمونہ قائم کیا کہ وہ کسی حال میں اس اصول کو فراموش نہ کر سکے اور انسانیت کی وحدت کا تصور کبھی بھی ان کے ذہن سے نہ نکل سکا۔ اس تیرہ چودہ سو برس کے اندر ان کے اندر بہت سی خرابیاں رونما ہوئیں لیکن رنگ و نسل اور ملک و قوم کی بنیاد پر انسانیت کی تفریق کے وہ کبھی قائل نہ ہو سکے۔ بلکہ تاریخ کے ہر دور میں آپ انھیں بین الاقوامیت کا حامل پائیں گے اور وہ ہر زمانہ میں عالمگیر انسانی برادری کے مبلغ نظر آئیں گے۔

جس وقت یہ اعلان ہوا ہے اُس وقت دنیا ملکوں اور قوموں میں بٹی ہوئی تھی اور رنگ و نسل کی تفریق تمام قوموں کا مسلم اصول تھا۔ قدیم عربوں، مصریوں، ہندیوں، ایرانیوں، رومیوں کا حال آپ کو معلوم ہے کہ وہ اپنے حلقہ سے باہر کے لوگوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ ارسطو جیسے معلم نے سکندر کو یہ نصیحت کی تھی کہ:-

> "تو یونانیوں کے ساتھ دوستوں اور رشتہ داروں کا سا برتاؤ کر اور ان کے علاوہ غیروں کے ساتھ ویسا برتاؤ کر جیسا کہ درندوں اور درختوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔"[۵]

رنگ و نسل کی اس تفریق کے دور میں پیغمبر اسلام نے انسانی مساوات اور عالمگیر اُخوت کا اعلان کیا جس طرح آپ نے ملکوں اور قوموں کی تفریق گوارا نہیں کی اسی طرح آپ نے پیشوں اور ذاتوں کی اونچ نیچ بھی تسلیم نہیں کی بلکہ اس بارہ میں بھی مساوات کا اعلان کیا۔ آپ نے پیشوں کو نہ خاندانی قرار دیا نہ انھیں عزت و ذلت کا معیار تسلیم کیا۔ بلکہ ہر شخص کو پوری آزادی دی کہ وہ اپنے حالات، ضروریات، مزاجی مناسبت اور طبعی ذوق کی بنا پر اپنے لیے جو پیشہ مناسب سمجھے اختیار کرے، کسی پیشہ کی بنا پر وہ شریف یا رذیل نہ سمجھا جائے گا بلکہ اپنے اعمال کی بنا پر عزت یا ذلت کا مستحق ہوگا۔ اگر سلیقہ، قاعدہ، اور دیانتداری کے ساتھ کام کرے گا تو عزت کی نظر سے دیکھا جائے گا، لیکن بدعنوانی، بے قاعدگی، فریب،

---

[۵] اسلام کے معاشی نظریے از ڈاکٹر یوسف الدین صاحب بحوالہ اکنامک ہسٹری آف دی اینشنٹ ورلڈ۔

دغابازی اور بے ایمانی سے کام کرے گا تو برا سمجھا جائے گا خواہ کتنا ہی اہم پیشہ کیوں نہ اختیار کرے اسے عزت کی نظر سے نہ دیکھا جائے گا۔

نوع انسانی جس طرح رنگ و نسل اور قوم و ملک کے اختلافات کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا تھی اور آئے دن سب و شتم اور کشت و خون کے واقعات پیش آتے رہتے تھے اسی طرح بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ مذہبی گروہ بندیاں انسانیت کے لیے تباہ کن تھیں۔ تعصب کا یہ حال تھا کہ ہر شخص اپنے خیالات و عقائد سے اختلاف رکھنے والے کو قابل گردن زدنی سمجھتا تھا۔ ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے جانی دشمن تھے اور اُن کو ستانا، نقصان پہونچانا، بلکہ مار ڈالنا کار ثواب سمجھتے تھے۔ مذہب کی حقیقی تعلیم پر عمل کرنے والے تو بہت کم تھے مگر دوسرے مذہب والوں کے ساتھ دشمنی رکھنے کا ذوق عام تھا۔ ان کا تعصب بسا اوقات دیوانگی کی حد تک پہونچ جاتا تھا۔ اور درندوں کی طرح انسانوں کا خون چوسنے میں تامل نہ کرتے۔

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس تعصب کی ماری ہوئی دنیا کو غور و فکر، صبر و تحمل اور انصاف و رواداری کی تلقین کی۔ آپ نے کتاب ہدایت (قرآن مجید) کا یہ حقیقت افروز اعلان پڑھ کر سنایا کہ:۔

لا اکراہ فی الدین		دین کے بارہ میں کسی قسم کا جبر درست نہیں ہے۔

پھر رواداری کے اس بے مثل منشور کا اعلان کیا۔

لکم دینکم ولی دین		تمہارے لیے تمہارا دین ہو اور میرے لیے میرا دین ہے

اور سمجھایا کہ عقیدہ دل کے یقین کا نام ہے۔ جبر سے زبان مجبور ہو سکتی ہے لیکن دل قائل نہیں ہو سکتا ہے۔ دل کو قائل کرنے کے لیے بات کو سمجھانے اور ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے جبر و تشدد کے بجائے ایسے دل پذیر طریقہ سے بات سمجھائی جائے کہ دل میں اتر جائے۔

ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ		اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت
والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی		کے ساتھ دعوت دیجئے اور ان سے بطریق
ھی احسن		احسن بحث کیجئے۔

اس موقع پر اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی گئی کہ:۔

کل حزب بما لدیھم فرحون		ہر گروہ اپنی باتوں میں مگن ہوتا ہے

سب لوگ اپنے عقائد و خیالات کو ٹھیک سمجھتے ہیں اور اپنے رسوم و رواج کو پسند کرتے ہیں ان کو صحیح راستہ پر لانے میں بڑے صبر و ضبط اور انتہائی حکمت و دانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا بحث و گفتگو میں اس کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے کہ دلوں کو ٹھیس نہ لگنے پائے ورنہ ان کے اندر انقباض کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور معقول سے معقول بات بھی ان پر اثر نہ کر سکے گی۔

آپ نے فرمایا کہ اللہ کے مقدس پیغمبر دنیا کے ہر ملک اور قوم میں آئے ہیں خواہ ہم ان کے ناموں اور حالات سے واقف نہ ہوں، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زمین کا کوئی خطہ اور انسانوں کا کوئی گروہ ایسا نہیں ہے جس کے پاس خدا کی ہدایت نہ آئی ہو اور کسی پیغمبر نے ان کی رہنمائی نہ کی ہو۔ ارشاد ہوا لکل قوم ھاد (ہر قوم کے لیے ایک نہ ایک رہنما ہوا ہے) ما من امۃ الا خلا فیھا نذیر (ہر امت میں کوئی خدا کا خوف دلانے والا آیا ہے)

دین کے اصل مسائل اور بنیادی باتوں میں تمام نبی متفق ہیں۔ البتہ زمانہ کے حالات، قوم کی مخصوص ضروریات اور مزاجی کیفیات کے اعتبار سے مذہبی رسوم و آئین اور قواعد و ضوابط میں کسی قدر فرق ہے۔ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تمام قوموں کو دعوت دی کہ وہ اپنے نبیوں کی ہدایت پر عمل کریں۔ قرآن مجید انہیں تعلیمات کی تجدید اور انھیں ہدایات کی تشکیل نو کا داعی ہے۔ اگر عناد و تعصب کو ترک کر کے وہ غور کریں گے تو انھیں نظر آئے گا کہ قرآن مجید وہی تعلیم دیتا ہے جو اگلی کتابوں میں دی جا چکی ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہی راہ عمل اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جس پر سابق انبیاء علیہم السلام عمل کر چکے ہیں۔ آپ نے قیصر روم کو اسلام کا جو دعوت نامہ بھیجا تھا اس میں صاف صاف تحریر کیا تھا۔

یا اھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃ	اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ
سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد	جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں (مسلّم)
الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا	ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا اور کسی کی بندگی نہ
ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا	کریں اور اسکے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں
من دون اللہ فان تولوا فقولوا	اور اللہ کے علاوہ ہم میں سے بعض بعض کو رب نہ بنائیں
اشھدوا بانا مسلمون۔	پس اگر وہ (اس متفق علیہ بات کو بھی ماننے سے)

روگردانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ تم گواہ

رہو کہ ہم فرمانبردار ہیں

یہ اختلافات کی فضا میں اتفاق کی مخلصانہ کوشش تھی لیکن قومیں خود اپنے دین و آئین سے اتنی دور ہو چکی تھیں کہ انھیں یہ دعوت اتحاد بھی قبول نہ ہو سکی اور ان کی بے راہ روی کو کسی بھی دینی اور اخلاقی ضابطہ کی پابندی گوارا نہ ہو سکی لیکن ان کی مخالفت کے باوجود ہادی عالم اپنی مصالحانہ روش پر قائم رہے اور تمام پیغمبروں کے احترام اور ان کی کتابوں کی عزت پر زور دیتے رہے یہاں تک کہ اسے مسلمانوں کے ان بنیادی عقائد میں داخل کر دیا جنھیں تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ہر نبی کی عزت کرنا اور ہر صحیفۂ ربانی کی تعظیم کرنا اس کا اولین فرض ہے۔ داعی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تبلیغ برابر جاری رہی اور ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جس نے تعصب کی شدید آندھیوں میں بھی رواداری کا چراغ گل نہیں ہونے دیا اسی تعلیم کا اثر ہے کہ تیرہ چودہ سو برس کے طویل دور میں کبھی بھی کسی مسلمان نے کسی مذہب کے بانی کی توہین نہیں کی بلکہ ہمیشہ ادب و احترام سے ان کا ذکر کیا۔

مسلمان بانیانِ مذاہب اور ان کی کتابوں کا احترام کرتے ہیں البتہ ان تحریفوں کو واضح کرتے ہیں جو بعد کے لوگ اپنے مذہب کی اصل تعلیمات میں کرتے رہے ہیں اسی طرح بانیان مذہب اور ہادیان برحق پر جو اتہامات بعد کے نفس پرستوں نے اپنی نفس پرستی کو جائز کرنے کے لیے لگائے ہیں اور اپنی ہوس پرستی کو درست قرار دینے کی غرض سے ان بزرگوں کی سیرت کو جس طرح داغ دار کیا ہے اس کی تردید کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے بڑے اہتمام سے انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کی پاکیزگی اور ان کی مقدس کتابوں کی صحت وصفائی کی کوشش کی ہے اس طرح قرآن مجید نے تمام پیغمبروں اور ان کی کتابوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ قرآن مجید کی وضاحت نے حقیقت کو واضح کر دیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے زندگی کی صحیح شاہ راہ نمایاں ہو گئی ہے جس پر چل کر انسانیت کا قافلہ اپنی منزل مقصود پر پہونچ سکتا ہے۔

ملک و قوم اور رنگ و نسل کے تفرقوں اور مذہبی تعصب کے ہنگاموں سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کی جو جد و جہد آپ نے کی اور دنیا کو میدان کارزار کے بجائے دارالامن بنانے کے لیے جو کوششیں آپ نے کیں ان کا حال آپ سطور بالا میں پڑھ چکے ہیں اس کے ساتھ آپ نے لوگوں کو

ایک اور اہم حقیقت کی جانب توجہ دلائی یعنی انسانوں کو ان کا صحیح مقام یاد دلایا۔ دین میں مسلسل تحریفوں نے اب انھیں اس درجہ تک پہنچا دیا تھا کہ وہ اپنی حیثیت بھی بھول گئے تھے۔ انسان اشرف المخلوقات تھا لیکن کائنات پر فرماں روائی کے بجائے اب یہ ہر چیز کے سامنے سربسجود تھا۔ آگ، پانی، دریا، پہاڑ، سورج، چاند، ستارے، درخت، جانور سب کے سامنے اس کا سر خم تھا۔ پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نوع انسانی پر یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس کو اس پستی سے نکالنے کی کوشش کی۔ آپ نے لوگوں کو بتایا کہ ساری کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے۔ انسان ان مظاہر قدرت کے سامنے سر جھکانے کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ ان سے کام لینے اور انھیں انسانیت کی خدمت میں لگانے کے لیے آیا ہے۔ کتاب الٰہی میں بار بار انسان کو اس کی بلند حیثیت یاد دلائی گئی ہے فرمایا۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔	بے شک ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔

انسان کو خلیفۃ اللہ قرار دیا گیا اور کائنات میں نیابت الٰہی کا فریضہ اس کے سپرد کیا گیا۔ ملائکہ کو بھی اس کے سامنے سربسجود ہونے کا حکم دیا گیا جس نے سرتابی کی ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ قرار دیا گیا انسانی عظمت کا اس طرح اعلان کیا گیا۔

ولقد کرمنا بنی آدم وحملنٰھم فی البر والبحر ورزقنٰھم من الطیبٰت وفضلنٰھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلا۔	بے شک ہم نے اولاد آدم کو عزت بخشی انھیں خشکی و تری میں سوار کیا۔ پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور اپنی پیدا کردہ بہت سی مخلوق پر اسے فضیلت عطا فرمائی۔

مزید ارشاد ہوا۔

وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعاً	آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب خدا نے تمہارے لیے مسخر کر دیا۔

اوپر چند آیتیں نمونہ کے طور پر نقل کر دی گئی ہیں ورنہ سارا قرآن مجید اس قسم کی آیتوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ خالق کائنات کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ وہ مرضی الٰہی کا تابع ہے اور ساری کائنات اس کی ماتحت ہے۔

الدنیا خلقت لکم وانتم خلقتم لله۔ — دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم اللہ کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔

یہ تھی انسان کی عظمت لیکن اس نے اپنے آپ کو اس بلندی سے گرا کر ایسی پستی میں پہونچا یا تھا کہ شجرو حجر کے سامنے سر جھکائے پڑا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نوع انسانی پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ آپؐ نے اسے اس کی اعلیٰ حیثیت یاد دلائی اور ذلت و پستی کے غار سے نکال کر عزت و عظمت کے بام بلند تک پہونچایا۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ جس طرح انسان کو کائنات کی دوسری چیزوں کے سامنے نہ جھکنا چاہیے اسی طرح کسی انسان کے سامنے بھی نہ جھکنا چاہیے چاہے اسے دینی اور دنیاوی کیسی ہی عظمت کیوں نہ حاصل ہو۔ حضورؐ نے شاہ روم کے نام جو خط لکھا تھا اس میں خاص طور سے مذکور تھا کہ

"ہم میں سے بعض بعض کو رب نہ بنائیں۔"

اسی حقیقت کو ایک اسلامی سفیر نے ایران کے سپہ سالار رستم کے سامنے ان الفاظ میں واضح کیا تھا۔

"تمہارے یہاں بعض لوگ بعض کے خدا ہوتے ہیں لیکن ہمارے یہاں یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے سامنے بندگی کریں۔"

جنگ یرموک کے زمانہ میں ایک مرتبہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ایک رومی سپہ سالار باہان سے گفتگو کر رہے تھے اس نے اپنے بادشاہ ہرقل کی غیر معمولی تعریف کرتے ہوئے اسے شہنشاہ کہا حضرت خالد نے سن کر فرمایا:۔

"لیکن ہم نے جس شخص کو اپنا سردار بنایا ہے اگر اسے ایک لمحہ کے لیے بھی بادشاہی کا خیال آئے تو اسی وقت ہم اسے معزول کر دیں۔"

اسی طرح ایک اور موقع پر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک رومی سردار نے کہا۔

"ہماری فوج کی تعداد آسمان کے تاروں اور ریت کے ذروں کے برابر ہے اور ہمارا بادشاہ سب سے بڑا ہے۔"

اس کے جواب میں حضرت معاذ نے فرمایا:۔

"کثرت فوج کی ہمیں پروا نہیں۔ خدا نے فرمایا ہے کہ اس کے حکم سے تھوڑی فوج بہت

بڑی فوج پر غالب آجاتی ہے تمہیں اپنے بادشاہ کی عظمت پر ناز ہوتا ہمیں تو ایسے حکمراں پر فخر ہے جو کسی بات میں اپنے آپ کو ہم پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ زنا کرے تو درے لگائے جائیں، چوری کرے تو ہاتھ کاٹے جائیں سب سے بے روک ملتا ہے اپنے کو کسی سے بڑا نہیں سمجھتا۔ دولت میں بھی اوروں سے زیادہ نہیں ہے۔[1]"

ان تصریحات سے اسلام کی اسپرٹ ظاہر ہے وہ کسی انسان کی دوسرے انسان کے سامنے ذلت وخواری گوارا نہیں کرتا اسی لیے اسلامی اصطلاح میں فرمانروا کو ملِک کے بجائے امیر المومنین کہتے ہیں۔ مَلِک تو اللہ ہے انسان عبد الملِک سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو شہنشاہ کا لفظ بھی سننا پسند نہیں کیا۔[2] ایک مرتبہ کسی نے آپ کو سیدنا کہا تو آپؐ نے منع کیا اور فرمایا کہ سید تو اللہ ہے۔[3] اس بارہ میں آپ کے احساس کا یہ عالم تھا کہ غلام کو بھی عبد کہلانا پسند نہیں فرمایا اور حکم دیا کہ اسے فتیٰ (جوان) کہا جائے۔ غلام کو تاکید کی کہ وہ آقا کو رب نہ کہے بلکہ مولیٰ (دوست و مددگار) کہکر مخاطب کرے۔[4]

قرآن مجید اور احادیث پاک کی ان تصریحات کے پیش نظر فقہاء (متقنین) اسلام نے یہاں تک تاکید کی ہے کہ کسی کے سامنے ذرا سا جسم بھی نہ جھکنے پائے کہ رکوع اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے ہاتھ باندھ کر نہ کھڑا ہو کہ اس طرح دست بستہ قیام خدا ہی کے سامنے چاہیے سر جھکا کر باادب خاموش دو زانو کسی کے سامنے نہ بیٹھے کہ اس طرح نماز میں خدا کے سامنے بیٹھا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ آپ نے اسے پسند نہیں کیا اور فرمایا۔

لا تقوموا کما یقوم الاعاجم عجمیوں کی طرح مت کھڑے ہوا کرو۔

الغرض اسلامی تعلیمات میں انسان کو ذلت وخواری سے بچانے کی پوری کوشش کی گئی ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ کسی مخلوق کے سامنے سر جھکایا جائے یا اسے جسم وجان کا مالک سمجھا جائے یہاں تک کہ کسی انسانی فرد یا جماعت کو اس کا بھی حق نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے دوسروں کے لیے قانون بنائے اور حسب دلخواہ ان کے معاملات کا فیصلہ کرے۔

---

[1] تاریخ کامل ابن اثیر اور طبری میں متعدد اس قسم کے بیانات درج ہیں۔ [2] ابوداؤد
[3] ایضاً ابوداؤد [4] صحیح بخاری

من لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ہم الظٰلمون۔ | جو اللہ کی نازل کردہ ہدایات کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ پکے ظالم ہیں۔

کیوں کہ اس طرح انسان کی اپنے ابنائے جنس کے ہاتھوں غلامی اور محکومی کی راہ کھل جاتی ہے اس لیے تاکید کی گئی کہ جو قانون بنایا جائے وہ تصریحات ربانی اور تشریحات نبوی (منصوص کتاب و سنت) کی روشنی میں مرتب کیا جائے۔

اس اصول کی تصریح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے پہلے خطبہ میں کردی ہے تاکہ اسلام کا نظریۂ حکومت شروع ہی سے سب کے سامنے آجائے اور خلافت کے آغاز ہی میں خلیفہ کی حیثیت ہمیشہ کے لیے واضح ہو جائے۔ آپ نے فرمایا۔

ان احسنتُ فاعینونی وان اسأتُ فقوّمونی اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم[1]

اگر میں نیک روی اختیار کروں تو تم میری اطاعت کرو اور اگر میں کج روی اختیار کروں تو تم مجھے سیدھا کردو۔ میری اطاعت اسی وقت تک کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں۔ جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں ہے۔

خلیفہ مطلق العنان حکمراں نہیں ہوتا وہ اللہ و رسول کے احکام نافذ کرتا ہے۔ اسلام نے کسی ایسے نظام حکومت کو پسند نہیں کیا جس میں فرد یا جماعت کے حاکم مطلق بن جانے کا امکان ہو وہ تو اپنے پیروؤں کے اندر آزادی و حق گوئی کی یہ کیفیت دیکھنا چاہتا ہے کہ اگر خلیفۂ وقت کوئی غلطی کرے تو ایک معمولی شخص بھی اسے برملا ٹوک دے اور بے جھجک کہہ دے کہ

"اگر تم کج روی اختیار کروگے تو ہم تمہیں سیدھا کردیں گے۔"[2]

---

[1] طبری، ابن اثیر وغیرہ: تاریخ اسلام کی کتابوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پہلا خطبہ ملاحظہ ہو۔

[2] یہ وہ مشہور جملہ ہے جو ایک بدو نے حضرت عمر کے اس سوال کے جواب میں کہا تھا کہ اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو تم کیا کروگے

اگر خلیفہ کے بیان میں کوئی غلطی محسوس ہو تو ایک بڑھیا علی الاعلان اسے ٹوک سکے اور خلیفہ اپنی غلطی کو تسلیم کرے[1]

آج لوگ روسو کے اس فقرہ پر سر دھنتے ہیں کہ:

"انسان آزاد پیدا ہوتا ہے مگر جدھر دیکھو پابہ زنجیر نظر آتا ہے[2]"

لیکن حضرت عمرؓ نے تیرہ چودہ سو برس پہلے اس سے کہیں زیادہ موثر اور معنی خیز فقرہ کہا تھا۔ کسی شخص نے مصر کے حاکم حضرت عمرو بن العاص کی ان سے شکایت کی اس شکایت پہ بے چین ہو کر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"ان کی ماں نے تو انھیں آزاد پیدا کیا تھا تم نے انھیں غلام کب سے بنا لیا[3]"

اس فاروقی اعلان کی بنیاد پر ایک نامور فقیہ[4] نے انسانی آزادی کا اصول ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ان الله خلقك حرا فكن كما خلقك۔　　اللہ نے تجھے آزاد پیدا کیا ہے پس تو اسی طرح رہ جس طرح اس نے تجھے پیدا کیا۔

اسلامی شریعت میں یہ الفاظ صرف کہے ہی نہیں گئے بلکہ دین و آئین، سیاست و معشیت، اخلاق و معاشرت اور تہذیب و تمدن غرض زندگی کے تمام گوشوں میں اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ انسانی شرف کو کہیں ٹھیس نہ لگنے پائے۔ انسان کی خودداری اور عزت نفس پورے طور پر قائم رہے اور بے جا بندشیں اس کی آزادی کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہ ڈالنے پائیں۔ امارت و سیاست کا اہل اسی کو قرار دیا جس کے اندر خدا کا خوف اور اس کے بندوں کی خدمت کا جذبہ ہو جو سب کو کھلا کر کھائے اور سب کو پہنا کر پہنے اپنے کو قوم کا فرماں روا نہیں بلکہ خدمت گزار سمجھے۔ سید القوم خادمھم ہر وقت اس کے پیش نظر رہے وہ قوم کی مرضی سے زمام اقتدار ہاتھ میں لے اور قوم ہی کے مشورہ سے ملک کا انتظام کرے۔　　(باقی)

---

[1] ملاحظہ ہو مہر کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقریر اور اس پہ پھر ایک بڑھیا کا اعتراض اور حضرت عمر کا اعتراف [2] معاہدہ عمرانی [3] حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ جلد دوم [4] امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ۔

پاکستانی مطبوعات

(جن کے صرف ایک ایک ہی نسخے کتب خانہ میں موجود ہیں)

تاریخ اسلام کامل در سہ حصص از مولانا اکبر شاہ نجیب آبادیؒ -/۲۵
تاریخ الخلفاء .. .. -/۱۲
البرامکہ .. .. -/۱۵
تاریخ غرناطہ کامل (دو حصوں میں) .. .. .. -/۲۴
تاریخ فاطمین مصر کامل۔ کامل دو حصوں میں .. .. -/۲۰
تاریخ فیروز شاہی (فیروز شاہ تغلق کی مکمل سوانح حیات) ۴/۲۵
تاریخ طبری۔ سوم -/۱۲ چہارم -/۱۵ ششم -/۱۵ ہفتم -/۱۵
گلشن بے خار .. .. -/۹
آئینہ حقیقت نما .. .. -/۱۲
فقہ الاسلام .. .. -/۱۲
سفینۃ الاولیاء ۴/۷۵
اسلامی معاشیات .. .. -/۱۵
حیات ابن القیم .. .. -/۱۵
اسلامی مذاہب .. .. -/۹
احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام .. .. -/۱۰
ابن ماجہ اور علم حدیث .. .. -/۹
تزکیۂ نفس .. .. -/۶
فلاسفۃ الاسلام ۸/۷۵
عبقات (عربی) از حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ .. ۵/۵۰

قرآن مجید مترجم و معرّیٰ

قرآن شریف مترجم اشرف الشان عکسی محشّٰی۔ ہدیہ -/۱۸
قرآن مجید حمائلی مترجم ۲۶×۲۰ ترجمہ مولانا تھانویؒ ۱۲/۵۰
قرآن مجید مترجم بدو ترجمہ ۲۲×۱۸ ترجمہ اول مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ ترجمہ ثانی مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ ہدیہ مجلد -/۱۵
قرآن مجید مع تفسیر کشف الرحمٰن از مولانا احمد سعید دہلویؒ -/۳۰
قرآن مجید عکسی معرّیٰ جلی قلم ۲۲×۳۰ ۹/۵۰
عکسی قرآن مجید معرّیٰ چوگلہ ۲۲×۵۲ -/۷
حافظی قرآن مجید نظامی ۷/۵۰
نقل نظامی حافظی حمائل شریف ہدیہ مجلد پلاسٹک کور -/۳
قرآن مجید حقانی معرّیٰ .. .. -/۹
قرآن مجید بے مثل عکسی مثل نظامی .. .. .. -/۹
قرآن شریف مترجم ۲۰×۳۰ ازمولانا اشرف علی تھانویؒ -/۲۰
قرآن شریف مترجم ۱۸×۲۲ (سوغات ایڈیشن)
خاص طور پر شادیوں اور جہیز میں تحفہ کے لیے۔ ہدیہ -/۲۴
مناجات مقبول۔ سبز حنا مجلد رنگین .. .. -/۴
دلائل الخیرات عکسی۔ پاکٹ سائز .. .. ..
.. .. پلاسٹک کور ۳/۵۰
یازدہ سورہ عکسی مترجم۔ جلد پلاسٹک کور .. -/۳
دوازدہ سورہ مترجم ۔ ۔ ۔ ۔ ۳/۵۰
مجموعہ وظائف۔ مترجم ۔ ۔ ۔ -/۵

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

حجۃ الوداع اور اس کی شان یکتائی

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

[ہمارے مخدوم حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی دامت برکاتہم پر جہاں اللہ تعالیٰ کے بہت سے انعامات ہیں، وہاں اس کا ایک بہت بڑا انعام یہ ہے کہ اس نے ممدوح کو مختلف نوعیتوں سے خدمت حدیث کی ایسی توفیق بخشی جو اس عہد میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔

مؤطا امام مالک کی شرح اوجز المسالک کی چھ ضخیم جلدوں اور لامع الدراری شرح صحیح البخاری کی تین جلدوں کے ماسوا جو ایک ممتاز تحقیقی و علمی شان رکھتی ہیں، نیز ان اردو تصنیفات کے علاوہ جو مقبول خاص و عام ہیں اور جن کے بلاشبہ سیکڑوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ممدوح نے سنہ ۱۳۴۲ھ میں جب ان کی عمر صرف ستائیس سال کی تھی، آنحضرت صلعم کے آخری حج "حجۃ الوداع" پر صرف ایک شب و روز کی مدت قلیل میں ایک رسالہ تصنیف فرمایا جس میں اس سفر مبارک کے تمام جزئیات، منازل اور اس کے متعلقہ احکام کو جمع فرمایا، پھر ان پر مفید حواشی کا اضافہ دوسرے اوقات میں فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس موضوع پر ایک جامع کتاب بلکہ کتب خانہ بن گیا۔ بعد میں حضرت ممدوح اپنے دوسرے دینی و تعلیمی و تربیتی مشاغل میں ایسے مشغول ہوئے کہ ان کو اس رسالہ کی طرف جو "قامت کہتر اور بقیمت بہتر" کا صحیح مصداق تھا، توجہ کی مطلق فرصت نہ ہوئی، لیکن اسی سال جب آپ نے ایک آنکھ کا قدح کروایا اور معذوریوں کی بنا پر کسی بڑے علمی و تصنیفی کام میں مشغول ہونے کا موقع نہیں رہا جس کے بغیر آپ کے لیے وقت گزارنا مشکل تھا تو آپ کو اپنا وہ رسالہ یاد آیا، اور سعادتمند

شاگردوں کی مدد سے آپ نے اس میں بہت سے مقامات پر اجمال کی تفصیل، اور جدید معلومات و تحقیقات کا اضافہ فرمایا اور اس کو گزشتہ رجب سنہ ۱۳۹۰ھ میں لیتھو پر چھپوا بھی لیا، بعد میں اس خیال سے کہ علماء عرب لیتھو کی طباعت کے عادی نہیں اس کو ندوۃ العلماء کے ٹائپ پریس میں چھاپنے کا ایماء فرمایا۔

اسی دوران میں بعض غیبی اشارات و مبشرات سے اس تصنیف کی مقبولیت کا اظہار ہوا ساتھ ہی ساتھ یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ حضرت ممدوح آنحضرت کے عمروں پر بھی تحقیق و بحث کر کے اس مبارک سلسلہ کی بالکل تکمیل فرما دیں، چنانچہ ایک مستقل رسالہ "جزء العمرات" کے نام سے املا فرمایا، اور اس کی بھی ہندوستانی طباعت ہو گئی، اب یہ دونوں رسالے خوبصورت عربی ٹائپ میں "حجۃ الوداع و عمرات النبی صلعم" کے نام سے شائع ہو رہے ہیں جو اہلِ علم اور اہلِ ایمان کے لیے ایک نایاب تحفے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کتاب پر محب گرامی مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا جس میں حجۃ الوداع کی دینی، و تاریخی و علمی حیثیت سے شانِ یکتائی کو واضح کیا، پھر کتاب کی خصوصیات کی تشریح کی، یہ مقدمہ بجائے خود ایک علمی و افادی حیثیت رکھتا ہے، صاحب مقدمہ کے برادر زادہ عزیز مولوی سید محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی نے ہماری فرمائش پر اس کے اس حصہ کا ترجمہ "الفرقان" کے لیے کیا جو "نفس" حجۃ الوداع " اور اس کی خصوصیات سے متعلق تھا، ہم یہ ترجمہ بڑی مسرت اور تشکر کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں کہ حج کا زمانہ قریب آ گیا ہے، امید ہے کہ بہت سے عازمین حج نیز دوسرے اہلِ علم اس کے مطالعہ سے محظوظ و مستفید ہوں گے۔]

—————— ادارہ الفرقان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اَمَّا بَعْد۔ اللہ نے اُمّتِ مسلمہ کو اقوامِ عالم کے درمیان جن انعامات سے نوازا ہے اور دینِ اسلام کو دوسرے مذاہب کے مقابلے میں جو خصوصیات عطا فرمائی ہیں اُن میں ایک حج بھی ہے

مذاہب و اقوام کی پوری تاریخ میں ہمیں کسی ایسی عبادت کا سراغ نہیں ملتا جو اپنی اصلاح و تاثیر، قلوب کو اللہ کے ساتھ وابستہ کرنے، شوق و ذوق پیدا کرنے، بہترین طریقہ پر انسان کے اُن جذبات کی تسکین و تکمیل، ملت حنیفی اور اس کے امام و بانی سے تجدید تعلق، قلوب کو نئی طاقت اور نئے ایمان سے معمور کرنے، دلوں کی سرد انگیٹھیوں کو دوبارہ سلگانے اور بھڑکانے، عادات و رسوم کی بندشوں سے آزادی اور رواج و دستور کی گراں باری سے گلو خلاصی، توحید اور دین خالص کی دعوت، شرک و ثنیت کے مظاہر سے بے تعلقی و اظہار بیزاری، جغرافیائی حد بندیوں، سرحدی پابندیوں اور انسانوں کے مادّی و ظاہری اختلافات سے بالاتری، تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے مقاصد کی تحصیل و تکمیل، اس دین کو تحریف سے، اور اُمّت کو عمومی انحراف و گمراہی سے باز رکھنے اور اہل غلو، اہل باطل اور اہل جہل کی دست درازیوں سے دور رکھنے، اصل سرچشمہ کی حفاظت کرنے، تحمل و برداشت کی عادت ڈالنے اور مسلمانوں کو عادت کا غلام اور رسم و رواج کا پابند بنانے کے بجائے حکم کا بندہ اور "راضی برضائے مولیٰ" بنانے میں اس درجہ کمال اور اثر رکھتی ہو اور اس میں یہ سارے فوائد و منافع اور ثمرات و برکات یکجا ہوں۔"[1]

لیشھدوا منافع لھم ویذکروا	تاکہ اپنے فوائد و منافع کے لیے وہاں حاضر
اسم اللہ فی ایّام معلومات۔	ہوں اور معلوم و متعین دنوں میں خدا
(سورہ حج)	کا نام لیں....

اس روشنی میں دیکھئے تو خاتم النبیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور آپ کے معجزات میں سے ایک زندہ معجزہ ہے، انبیاء کرام کی عبادات و مناسک میں اس کو ایک بلند و منفرد مرتبہ حاصل ہے، وہ بہت سے پہلوؤں میں منفرد ہے۔ اصلاحی و تربیتی شعبہ میں بھی منفرد ہے باطنی و روحانی شعبہ میں بھی، اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس حج میں ایک مجمع کثیر کو آپ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا، اور آپ کی پیروی، آپ کی باتوں پر عمل، آپ کے حرکات و سکنات کا مطالعہ، آپ کے صبح و شام کے معمولات ضبط کرنے اور محفوظ کرنے کا

---

[1] حج کے مقاصد و اسرار سے تفصیلی واقفیت کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ فرمائیں۔

موقع ملا، اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ سلف سے خلف تک اُمّت کے تمام طبقات نے اس کا پورا اہتمام رکھا کہ اس سفر میں آپ کے ہر قول یا عمل، عادات یا عبادات، نفی یا اثبات سے احکام کا استنباط اور جزئیات کا استخراج کیا جائے، اس معاملہ میں ان حضرات کی ہمّتیں اتنی بلند، دماغ اتنا رسا، اور شعور اس درجہ لطیف و حساس تھا کہ وہ اس کی ان دقیق تفصیلات اور نزاکتوں کو بھی اپنی گرفت میں لائے جسکے بعد کوئی درجہ اور منزل باقی نہیں رہتی، انھوں نے اپنی عقل اور ذہانت کی ساری توانائیاں اسکے لیے نچوڑ کر رکھ دیں۔

لیکن یہ کارنامہ صرف علم یا عقل کا نہ تھا، علم و عقل کی کارگزاری ہم نے بہت کم دیکھی ہو۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بڑے لوگوں کے سفرناموں یا کارناموں کے بیان میں اس سے بہت سی وہ اہم چیزیں چھوٹ گئیں جن کی کوئی علمی یا تاریخی قیمت اہمیت نہ تھی یہ دراصل اس محبت کا کرشمہ ہے جو کسی وقت غافل نہیں ہوتی اور کبھی نہیں اکتاتی۔ جس کو محبوب سے نسبت رکھنے والا ہر ذرّہ عزیز ہوتا ہے۔ بال سے زیادہ باریک و نازک باتیں اس کو محبوب ہوتی ہیں، وہ اس کو اپنی سب سے قیمتی دولت اور سب سے بہترین سرمایہ قرار دیتی ہے بلکہ جان سے زیادہ عزیز اور دل سے بھی زیادہ قریب سمجھتی ہے۔

اس پورے طویل و مبارک سفر میں محبت عقل کی رفیق رہی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا پہلی بار اعلان فرمایا اور لوگ اس طرح آپ کے چاروں طرف جمع ہونے لگے جس طرح پروانے کسی روشن چراغ پر، اُس وقت سے لے کر آپ کی واپسی تک محبت اور عقل کا یہ ساتھ ایک لمحہ کے لیے نہ چھوٹا۔ ان دونوں نے مل کر آپ کے سفر و حضر اور افعال و اقوال کا مشاہدہ کیا اور اُمّت اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسی دستاویز، ایک ایسا زندہ اور جیتا جاگتا مرقع اور اس مبارک سفر کی ایسی پاکیزہ، سچی اور روشن تصویر پیش کر دی جس کو دیکھ کر ہر مسلمان سمجھ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ کس طرح تشریف لے گئے ہوں گے۔ پھر منیٰ، عرفات اور اس کے بعد مکہ واپسی اور آخر میں مدینہ کی تشریف آوری کے دوران کیا کیا باتیں پیش آئیں، وہ اس شفاف و نازک آئینہ میں آپ کو طواف و سعی فرماتے ہوئے دیکھ سکتا ہو تقریر کرتے ہوئے، گفتگو کرتے ہوئے، تعلیم دیتے ہوئے مسئلے بتاتے ہوئے سن سکتا ہو۔ اور آپ کے ساتھ ان سارے مقامات کا اس طرح مشاہدہ کر سکتا ہو جیسے وہ کوئی چشم دید واقعہ ہو یا ابھی کل کی بات ہو۔ وہ اسکے ذریعہ ہر اُس سعادت سے اپنی محرومی اور اس مبارک قافلہ میں اپنی غیر موجودگی کی کسی قدر تلافی بھی کر سکتا ہو

غائب اس کے لیے حاضر بن جاتا ہے، ماضی حال بن جاتا ہے، گزرے ہوئے دن گویا اس کے لیے لوٹ آتے ہیں۔ اس سے اس کو بڑی تسلی اور تسکین حاصل ہوتی ہے، وہ خدا کی حمد کرتا ہے اور دل سے اس کا احساس و اعتراف کرتا ہے کہ اس سفرِ حج کی روداد قلمبند کر کے ان وفاداروں اور جاں نثاروں، اور ان امین و ثقہ راویوں کا امت پر اور ملت پر اور خود اس کے جان و دل پر کتنا بڑا فضل و احسان ہے۔ وہ ان کے لیے سراسر شکر و سپاس بن جاتا ہے اور حق یہ ہے کہ کسی امت نے اپنے نبی کے ساتھ وہ نہیں کیا جو اس امت نے کیا، اور کسی ملت نے آثار و نقوش کو محفوظ و زندۂ جاوید بنانے، روایت احادیث اور ہر چھوٹی بڑی چیز کی نقل و حفاظت کا اس درجہ اہتمام اور اس کی وہ فکر نہیں کی جو امتِ محمدیہ نے کی، نہ کسی مذہب کے علماء نے اپنے انبیاء کی ایک ایک عبادت کو اس طرح قلمبند کیا اور اس کو محفوظ رکھا جس طرح اس امت نے حجۃ الوداع کے ساتھ کیا، نہ اس میں اتنی دقیقہ رسی اور باریک نظری سے کام لیا جتنا اس حج میں لیا گیا۔

تمام قرائن اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ حج اسی تفصیل کے ساتھ مقصود تھا، یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا بلکہ اپنے مناسب ترین وقت میں پیش آیا "قد جعل اللہ لکل شیئ قدرا" اس کی اس تاخیر میں بھی خدا کی بڑی حکمت و مصلحت پوشیدہ تھی، چنانچہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب اسلام جزیرۃ العرب میں پھیل چکا تھا، مسلمانوں کی تعداد بڑھ چکی تھی، ایمان مضبوط و مستحکم ہو گیا تھا، محبت پروان چڑھ چکی تھی اور برگ و بار لا رہی تھی، نفوس تعلیم و استفادہ کے لیے تیار تھے، قلوب بیدار و مشتاق تھے، اور نگاہیں مطالعہ و مشاہدہ کے لیے بے قرار و منتظر تھیں، جدائی کی گھڑی قریب آ پہونچی تھی اور ضرورت اس بات کی مقتضی تھی کہ امت کو وداع کیا جائے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج بیت اللہ کے لیے تشریف لائے تاکہ مسلمانوں سے ملاقات کریں، ان کو آخری طور پر ان کی طریقۂ عبادت و مناسک سے آگاہ کر دیں، شہادتِ حق کا فریضہ ادا کریں، اور امانت ان کے ہاتھوں میں پہونچا دیں، ان کو آخری وصیتیں کر دیں اور ان سے اس بات کا عہد و میثاق لے لیں کہ وہ آپ کے بعد بھی جادۂ حق اور راہِ شریعت پر قائم رہیں نیز جاہلیت کے آثار و نشانات کو اپنے قدموں سے پامال کر دیں اور ہمیشہ کے لیے مٹا دیں۔

اس لحاظ سے یہ حج ہزار تقریروں اور نصیحتوں اور درس و تعلیم کا قائم مقام تھا، یہ ایک چلتا پھرتا مدرسہ، متحرک مسجد اور ایک گشتی کیمپ یا چھاؤنی تھی، جاہل اس میں علم حاصل کرتا، غافل

بیدار ہوتا، کاہل چست و چالاک ہو جاتا، کمزور و پست ہمت حوصلہ مند و طاقتور ہو جاتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و محبت، آپ کی شفقت اور دلداری، اور تربیت و سرپرستی ابرِ رحمت کی طرح قیام و سفر ہر حال میں اور ہر جگہ ان پر سایہ فگن تھی۔

مسلمانوں کی عقلی پختگی اور اس محبوب شخصیت (فداہ ابی و امی) سے ان کی محبت، شدت تعلق اور وابستگی اس درجہ پر تھی کہ اس سفر کے معمولی سے معمولی واقعہ اور چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ کو انھوں نے اس طرح قلمبند کیا کہ اس کی مثال بڑے بڑے سلاطین و سربراہوں اور بڑی سے بڑی شخصیتوں اور عبقری و غیر معمولی انسانوں کے حالات سفر میں بھی نہیں ملتی، یہ درحقیقت اس عاشقِ صادق کی شان ہے جس کو محبوب کی ہر چیز محبوب اور ہر ادا پسند ہوتی ہے۔ اس کو اس کے ذکر میں مزہ آتا ہے، اور وہ خوب جی لگا کر اور دل کھول کر اس کی تفصیلات بیان کرتا ہے اور معمولی سے معمولی چیز کو بھی نظر انداز کرنا اس کو گوارا نہیں ہوتا، اور باریک سے باریک پہلو اور دقیق سے دقیق مسئلہ بھی اس سلسلہ میں اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھتے وقت خوشبو استعمال فرماتے ہیں تو راوی اس کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ خوشبو کس نے آپ کے لگائی، اور خوشبو کی یہ کون سی قسم تھی، کہتے ہیں، "پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ہاتھ سے آپ کو ذریرہ[1] کی خوشبو لگائی، اور مشک کی خوشبو بھی لگائی، یہاں تک کہ مشک کی چمک آپ کے بالوں کی مانگ اور ریش مبارک پر نظر آرہی تھی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِشعار[2] کرتے ہیں تو راوی اس کی پوری تفصیل کا ذکر کرتے ہیں اور اس میں پورے تعین و تیقن سے کام لیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ "اشعار" جانور کے داہنی طرف تھا یا بائیں طرف، اور خون کس طرح پونچھا گیا تھا؟ آپ کے پچھنے لگوانے کا ذکر کرتے ہیں تو باوجود اس کے کہ پچھنے لگوانا ایک خاص طبی اور طبعی فعل ہے جس کا مناسک حج سے کوئی تعلق نہیں، اس حصۂ جسم کی اس جگہ کا تعین کرتے ہیں جہاں لگایا گیا، اس مقام کی تشریح کرتے ہیں جہاں یہ واقعہ پیش آیا، ان کے الفاظ ہیں، "آپ نے لحی جمل میں پچھنے لگوایا، اور لحی جمل مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے جس کا فاصلہ مدینۂ طیبہ سے ۷ میل ہے"۔

---

[1] شراح حدیث نے ذریرہ کی تعریف اور اس کی اقسام پر تفصیل سے کلام کیا ہے اس کا ذکر اسی کتاب میں ملے گا۔

[2] "اشعار" سفر حج میں قربانی کے جانور کے جسم پر ایک چرکہ لگا دینا جس سے ایک ہلکا سا نشان ہو جائے اور معلوم ہو کہ یہ منیٰ میں قربانی کے لیے جا رہا ہے۔ اور ہدی کا جانور ہو۔ عرب اس کا ہر دور میں احترام کرتے تھے اور اس سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ حدیث و فقہ کی اصطلاح میں اس کو "اشعار" کہتے ہیں۔

آپ نے اپنے سرپر "لحی جمل" کے مقام پر پچھنہ لگوایا جو مکہ کے راستہ میں ایک مقام ہے" آپ کی خدمت میں گوشت کا ایک حصہ پیش کیا جاتا ہے جو کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں اور عام طور پر لوگوں کو اس طرح کی چیزوں کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی، لیکن اس کا ذکر بھی تعین و تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

"جب سب لوگ ابواء پہونچے تو صعب بن جثامہ نے آپ کی خدمت میں گورخر کا گوشت پیش کیا" مدینہ اور مکہ کے مابین جتنی منزلیں ہیں وہ ان سب کا شمار کرتے ہیں، ایام سفر کی پوری گنتی یاد رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ ہے جب نہ ڈائری اور روزنامچہ لکھنے کا معمول تھا نہ حالات سفر قلمبند کرنے کا دستور، لیکن

محبت خود سکھا دیتی ہے آداب خرد مندی

راوی کہتے ہیں،

"پھر آپ تشریف لے چلے یہانتک کہ "ذی طویٰ" میں پہونچے وہاں آپ نے سنیچر کی رات گزاری، ذی الحجہ کی ۴ تاریخ گزار کر فجر کی نماز آپ نے وہیں ادا فرمائی، اسی دن غسل فرمایا اور مکہ کی طرف روانہ ہوئے"

ایک ایسے سفر میں جس میں حد درجہ مصروفیت و انہماک ہو، متعدد منزلیں ہوں، ہجوم کی کثرت ہو، اس میں ایک سانپ نکلنے اور پھر اس کے بچ نکلنے کا واقعہ بھی ان کی توجہ سے محروم نہ رہا۔
منیٰ کی رات کا ذکر کرتے ہوئے روایت کرتے ہیں، "ایک سانپ نکلا، لیکن جب اس کو مارنے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنے بل میں گھس گیا" وہ اُس شخص کا ذکر کرتے ہیں جس کو اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری پر پیچھے بٹھا لیا تھا[۱] حجام کا ذکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اُس نے کس طرح بال بنائے۔ آپ نے دائیں طرف والوں میں کس کو عنایت فرمایا اور بائیں طرف والوں میں سے کس کو مرحمت فرمایا۔ یہ ساری باتیں وہ ہیں جن کو محبت کی کرشمہ سازی کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔

---

[۱] نسیم الریاض کے مصنف نے ان سب حضرات کا استیعاب کیا ہے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اس کی سعادت حاصل ہوئی۔ انھوں نے انکی تعداد ۴۰ لکھی ہو، ابن مندہ نے اس تعداد سے زیادہ لکھا ہے تفصیل کے لیے اسی کتاب کو ملاحظہ فرمائیں۔

بڑا اضاعت وقت ہوگا اگر ہم مشاہیر وزعما کے سفرناموں میں اس طرح کے نظائر تلاش کریں، بہت سی قوموں نے اپنے انبیاء کی ناقص و ناتمام تاریخ لکھی اور اس کا بہت بڑا حصہ ان سے ضائع ہو گیا جس کے بغیر ان کے حالات کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی، ان کے احوال و اخبار کا بہت تھوڑا حصہ محفوظ رکھنے میں وہ کامیاب ہوئے۔ چنانچہ سیدنا مسیح علیہ علی نبینا الصلوٰۃ والسلام کے متعلق زیادہ سے زیادہ جو ہم کو معلوم ہے وہ اُن کی زندگی کے آخری تین سال کے واقعات ہیں۔ اس کے علاوہ بہت متمدن و قدیم قوموں میں مذاہب اور فلسفوں کے بانی گزرے ہیں لیکن آج اُن کے صرف نام نظر آتے ہیں اور اگر کہیں حالات بھی ملتے ہیں تو اتنے ادھورے اور تشنہ جن سے نہ زندگی کے معاملات پر کوئی روشنی پڑتی ہے نہ ان کے اندر کسی نسل و قوم کی رہنمائی کا سامان ہے۔

حج اپنے مخصوص طرز و مزاج کی وجہ سے جس میں وہ دوسرے ارکان سے بہت ممتاز و مختلف ہے، نیز اپنے مسلسل نقل و حرکت، مختلف مناسک و اعمال اور پیہم سفر و جد و جہد، نیز اُن احکام و آداب جزئیات اور لوگوں کے احوال کے اختلاف کی وجہ سے فقہ کے ابواب و مباحث میں سے ایک بہت وسیع باب اور نازک بحث ہے۔ اور ان میں احکام و مسائل کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اسی لیے متقدمین و متاخرین ہر زمانہ کے علماء نے اس پر ہمیشہ اپنی خاص توجہ مرکوز کی۔ تابعین، تبع تابعین اور اُن کے بعد کے علماء میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو اس کے علوم اور اس کے فقہی مسائل میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، اور اس میں ان کو اختصاص و کمال حاصل تھا۔ خلفاء اور ارباب حل و عقد کو بھی اس کا بہت اہتمام تھا، اور وہ اس کا اعلان کر دیتے تھے کہ زمانۂ حج میں فتویٰ دینے کے مجاز صرف فلاں فلاں حضرات ہوں گے، خلفاء راشدین، خلفاء بنی امیہ اور بنی العباس سب کے یہاں امیر الحج ضروری تھا اور اس کو حج کے موقع پر روانہ کیا جاتا تھا[1]

علماء اسلام، فقہاء اُمت اور بڑے بڑے مصنفوں نے اس میں جس قدر دیدہ وری اور عرق ریزی سے کام لیا اور اس کا جس قدر استیعاب کیا وہ فقہ کے کسی اور شعبہ کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ بہت سے لوگوں نے مناسک حج اور اعمال حج پر کتابیں لکھیں اور خاص اسی کو اپنے بحث و نظر اور مطالعہ کا موضوع بنایا، اگر وہ کتابیں جو

---

[1] البدایہ والنہایہ ابن کثیر وغیرہ۔

مختلف ملکوں، مختلف زبانوں، اور مختلف زمانوں میں مناسک اور احکام حج پر لکھی گئی ہیں یکجا کی جائیں تو ایک پورا کتب خانہ تیار ہو جائے۔ بہت سے مصنف وہ ہیں جنھوں نے اس سلسلہ میں اپنے "فقہی مسلک" کو اساس بنایا، بہت سے وہ ہیں جنھوں نے سارے مسلکوں کا استیعاب کیا اور سب کے دلائل لکھے اور ان کا علمی موازنہ بھی کیا۔ بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے حجۃ الوداع پر پوری کتاب تصنیف کی۔

یہ سب باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اسلام میں حج کا بہت بڑا مرتبہ ہے اور اُمت نے ہمیشہ اس سے غایت درجہ دلچسپی اور وابستگی رکھی ہے۔

چونکہ حج کا فریضہ سال میں صرف ایک بار ادا کیا جاتا ہے اور اُس کے ساتھ اجرِ عظیم اور قربِ جزیل اور مغفرت کے جو وعدے ہیں (من حج فلم یرفث ولم یفسق، رجع کیوم ولدتہ امہ) اس کے جو فضائل بیان کیے گئے ہیں اور اس سفر میں جو غیر معمولی اہتمام کیا جاتا ہے، تکلیفیں، مشقتیں برداشت کی جاتی ہیں، کبھی سمندروں کو عبور کرنا ہوتا ہے، کبھی صحراؤں اور ریگستانوں کو، خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے، گھر بار اور اہل و عیال سے جدائی بھی ہوتی ہے، احرام کے احکام اور شرائط کی پابندی کرنی پڑتی ہے، فسق و فجور، سخت کلامی اور بد زبانی سے بچنا ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں خود اس کی متقضی ہیں کہ اس کے مسائل و آداب سے واقفیت کی پوری بلند ہمتی اور عزیمت کے ساتھ فکر کی جائے اور ساری توجہ اور طاقت اس کو درجۂ کمال تک پہونچانے پر مرکوز کر دی جائے، اور شمار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت پر عمل کیا جائے اور آپ کے نقوشِ پا کو چراغ راہ بنایا جائے اور اپنی امکانی طاقت تک آپ کی پیروی و اتباع اور نقل و تقلید میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حج سے اُمت کے اس تعلق کا راز اور اس کی بنیادی اہمیت یہی ہے، اور یہ حج ہر مسلمان کے لیے تا قیامت ایک ایسا مثالی حج ہے جو اس کو ہمیشہ راہِ ہدایت اور جادۂ استقامت پر قائم رکھ سکتا ہے۔

صراطِ مستقیم

از حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ

(۲)

ممکن چیز کو لوگ محال سمجھتے ہیں

ایک بات اور لکھنا ضروری ہے جو انشاء اللہ کارآمد ثابت ہوگی وہ یہ کہ عام عادت ہو چکی ہے کہ ممکن چیز کو محال خیال کر کے اس کے حصول سے رو گردانی اختیار کر لیتے ہیں۔ بزرگان دین کے ارشادات سے، ان الفاظ کو پاتے ہیں جن کا مطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے ان چیزوں کو محال اور ناممکن سمجھتے ہیں جن کو انھوں نے بیان کیا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ چیزیں وہی ہوتی ہیں جو فطرت انسانی کے مطابق ہیں اور ہر فرد خود ان کو عمل میں لا رہا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ عمل میں لانے کی اب کوشش کی جائے گی بلکہ انسانی عمل میں یہ چیزیں جاری ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موقع اور محل پر نہیں ہیں۔ اگر یہ چیزیں موقع اور محل پر جاری ہو جائیں تو وہی درجات حسب استعداد حاصل ہونا شروع ہو جائیں جو کہ حاصل ہوئے ہیں۔ ایک بڑی مشینری جس کے سینکڑوں پرزے ہیں اگر اس کا ہر پرزہ صحیح جگہ پر رہے تو مشینری چلنا شروع ہو جائے گی اور جس کام کے لیے واضع نے اس کو وضع کیا ہے وہ کام کرے گی لیکن ایک پرزہ بھی جب اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا تو سب پرزے اپنا عمل چھوڑ دیں گے۔

جو عبارت ہم لکھ چکے ہیں اب اس کو ذرا نظر ڈال کر پھر غور سے ملاحظہ فرمائیے ہمارا تو یہ خیال تھا کہ پھر اسی عبارت کو بار بار لکھتے مگر طوالتِ عبارت سے بچ کر ہم صرف یہ لکھتے ہیں کہ دیکھنے والے حضرات اس کو بار بار ملاحظہ فرما کر غور فرمائیں کہ یہ کیا معمہ ہے اور اس میں کچھ خوبی حاصل

ہوسکتی ہے یا نہیں کہ پرزہ تو صرف ایک اپنی جگہ سے ہٹتا ہے لیکن بے کار سب پرزے ہو جاتے ہیں، حالانکہ دوسرے پرزے اس سے قوی ہوتے ہیں اور یہ پرزہ سب سے نازک ہوتا ہے مگر نازک پرزہ کے اپنی جگہ سے ہٹنے سے سب مشینری رک جاتی ہے اس کا کیا سبب ہے؟

غور طلب امر یہ ہے کہ ایک معصیت جس کو کرنے والا چھوٹی سمجھتا ہے بڑی بڑی عبادتوں کو مٹانے والی اور برباد کرنے والی اور ان کے برکات کو زائل کرنے والی بعض وقت ہو جاتی ہے اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (حجرات - رکوع ۱) ترجمہ: کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جاویں اور تم کو خبر بھی نہ ہو) معصیت کو چھوٹا سمجھنا اس طرح ہے جیسا کہ پرزہ کو چھوٹا سمجھنا، اگرچہ وہ پرزہ دیکھنے میں بہت چھوٹا اور باریک ہوتا ہے مگر اس کا اثر بڑے بڑے پرزوں پر پڑتا ہے۔ ہمارے برادران محترم اور ہمارے بزرگ اکثر ان چیزوں کو نظر انداز فرما کر بڑی بڑی برکتوں اور رحمتوں سے محروم رہتے ہیں، اس کو بلا مثال اور تشبیہ کے تحریر کر رہا ہوں۔ مثالیں اور تشبیہات خود تلاش فرمالیں اور مناسب تو یہ ہے کہ بڑے بڑے کارخانوں میں جاکر مشاہدہ فرمالیں کہ نازک پرزہ کی قوت پر اور نازک ہی پرزہ سے قوت حاصل کرکے بڑے بڑے پرزے اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ ہماری ناقص عقل اور کوتاہ معلومات سے کافی غور و فکر تجسس و تلاش کے بعد یہ معلوم ہوا کہ قرآن پاک کی آیت قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا کا ترجمہ ہے اور یہی آیت مبارکہ اسی طرف ہدایت فرما رہی ہے کہ اسی پرزہ کی حفاظت کرو، کیونکہ اس پرزہ پر تمہاری ساری زندگی منحصر ہے یعنی تزکیہ نفس۔

کیفیت تخیلات بصورت مشاہدات

ایک اور بات قابل تحریر ہے۔ اگر غور و فکر کریں تو شاید ہمارے اور آپ کے کام آئے اور وہ یہ ہے کہ درویشوں اور فقیروں میں ایک طبقہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا اور ایسی ہستیاں بھی نظر سے گزریں کہ انھوں نے اپنے تخیلات پر زور دے کر تخیلات کو مشاہدات کی صورت میں دیکھنا شروع کیا اور اس کے لیے انھوں نے از قسم مسکرات بھنگ وغیرہ سے بھی کام لیا تاکہ دماغ محسوسات اور معقولات سے معطل ہو جائے اور جن خیالات کو انھوں نے اپنے دماغ میں قائم کیا ہے ان کو مشاہدات کی صورت میں دیکھیں اور اسی کا نام انھوں نے ترقیٔ باطن اور سلوک رکھا اور کچھ عجائبات اور غرائبات بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ پھر تو ان کو اور زیادہ یقین ہو گیا کہ اگر یہ فیضان باطن نہ ہوتا تو عجائبات اور غرائبات اور نوادرات ظاہر کیوں ہوتے۔ مثلاً کسی کے خواب میں

چلے جانا یا کسی کی گمشدہ چیز کو بتا دینا یا اس کے مثل اور چیزیں جن کو انھوں نے کرامات سے تعبیر کیا ہے۔ یہ سب چیزیں قوت خیالیہ سے پیدا ہو کر مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتی ہیں۔

جدید لوگوں نے ان خیالات کو پختہ کر کے بہت کام لینا شروع کر دیے ہیں اور برابر لیتے جا رہے ہیں۔ مثالات اور تشبیہات جدید کتابوں میں، جدید علوم میں اور جدید ترقیات میں تلاش کر لیجئے۔ اس کے حصول کے لیے کمالات انسانی کو مٹانا رکن اول ہے۔ یعنی خواہشات انسانی از قسم طعام و شراب مٹ جائیں اور ان تخیلات کے ذریعہ سے وہ محسوسات سے بیگانہ ہو جائیں، تاکہ وہ مقناطیسی قوت جو انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، کام کرنا شروع کر دے لیکن تعلیم قرآن پاک اور ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چیز تعلیم فرمائی ہے جو کمالات انسانی کو ان کی جگہ پر قائم رکھ کر ان کو موقع و محل اور اندازہ پر صرف کرنا بتلائے اور ان سے موقع و محل اور اندازہ کے موافق فائدہ اٹھانا سکھائے۔ یہ رہبری قرآن پاک ہی فرماتا ہے اور دیگر تمام کتب اس سے خالی ہیں۔

عقیدہ کی بنیاد کتاب و سنت پر ہی ضروری ہے

اس کے بعد ایک بات اور قابل غور و فکر ہے۔ وہ یہ کہ عقیدہ جو اسلام کی ایک بنیادی چیز ہے اور جس پر تمام اعمال قائم اور منحصر ہیں۔ اس کی درستگی اور استحکام سوائے کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسری چیزوں پر رکھنا بالکل نامناسب اور راہ صحیح سے دور ہٹانے والا ہے مثلاً کوئی عبارت یا کوئی شعر متقدمین کے کلام میں ایسا پایا جائے جس کا مفہوم کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ پایا جائے بلکہ اس کے مخالف اور منافی ہو، اور جن چیزوں کو برا کہا گیا ہے اور مٹایا گیا ہے اور دین کا اعلیٰ جزو ان کے مٹانے میں اور ان کے انہدام میں رکھا گیا ہے، ان کو مظہر تجلیات مقرر کرنا پھر ان سے اذواق و اشواق حاصل کر کے مست و مگن ہونا ایسا ہے جیسے نابالغ بچے کی شادی کی جائے اور وہ لذت و اشواق اٹھا کر اپنی آئندہ زندگی کو برباد کر لے ـــــــ ان چیزوں سے جو حضرات اذواق و اشواق حاصل کرتے ہیں بجائے ان کے اگر قرآن پاک کی آیات سے اذواق و اشواق حاصل کر کے اپنی عارضی حیات کو دائمی حیات سے بدلیں تو یہ بہت اعلیٰ اور اولیٰ ہے۔ نکاح کے بعد جو لذات حاصل ہوتے ہیں ان سے توالد اور تناسل زیادہ مقصود ہوتا ہے۔ بہ نسبت سب لذتوں کے۔ اذواق و

اشواق سے مقصود و مطلوب قلب سلیم ہے جس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ؕ (شعراء، رکوع ۱) (ترجمہ: اس دن (نجات کے لیے) نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد مگر ہاں (اس کی نجات ہوگی) جو اللہ کے پاس پاک دل لے کر آوے گا) کیا ہو اور کیسی بہتر اور مناسب بات ہو کہ تلاوت قرآن پاک میں اتنا انہماک حاصل ہو کہ جس کے ذریعہ سے قلب سلیم حاصل ہو کر حیات ابدی ہاتھ آجائے۔

ایک اور بات قابل غور ہے، وہ یہ کہ ہماری مثال متقدمین حضرات کی شخصیات بابرکات کے مقابلہ میں بالکل ایسی ہے جیسے ایک وجود باروح اور ایک وجود بے روح۔ وجود باروح کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر برائی کو دور کرنے کی اور ہر بھلائی کے حاصل کرنے کی قوت عطا فرمائی ہے اور وجود بے روح اس کے برعکس ہے، نہ تو بھلائی کر سکتا ہے اور نہ برائی کو دفع کر سکتا ہے۔ ان حضرات نے اپنے دل اور دماغ کو اللہ تعالیٰ اور حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت اور اطاعت سے ایسا مزکّیٰ اور مصفّیٰ فرمایا تھا کہ کوئی کدورت ان کو مکدر نہیں کر سکی اور وہ چیزیں جن سے دوسرے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ انھوں نے ان سے فائدہ اٹھالیا ہے۔

نگویند از سر بازیچہ حرفے　　کزاں پندے نگیرد صاحب ہوش
دگر صد باب حکمت پیش ناداں　　بخوانند آیدش بازیچہ در گوش

ترجمہ:۔ لوگ از راہ تفریح و مذاق کوئی بات کہدیں تو صاحب ہوش ایسی بات سے بھی کوئی (نہ کوئی) پند و نصیحت حاصل کر لیتے ہیں اور اگر کسی نادان کے سامنے حکمت و دانائی کے سو باب کھول دیے جائیں تو اُس کو یہ حکمت کے پیام مذاق سمجھ میں آئیں گے۔

یہ ان کے قلوب اور دماغ کے مزکّیٰ اور مصفّیٰ ہونے کی دلیل تھی۔ معمولی چیزوں سے بھی انھوں نے نصیحت حاصل کر کے ترقیات حاصل کیں اور ان منازل کو پالیا جن کو دوسروں کا پالینا ممکن نہیں ؎

پاک بیں از نظر پاک بمقصود رسید　　احول از چشم دو بیں در طمع خام افتاد

ترجمہ:۔ پاکیزہ نظر والے اپنی پاک نظر سے مقصود پالیتے ہیں اور ٹیڑھی نظر والوں کو ان کی چشم دو بیں خام امیدوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اس تمام تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اشواق و اذواق کو محفوظ رکھ کر اپنے عقائد و خیالات کی بنیاد

کو مضبوط رکھنا اور کسی شعر یا تاویل پر منحصر نہ کرنا اصل حقیقت ہے۔ بعض کتابیں اور رسالے ایسے بھی دیکھنے میں آرہے ہیں جن میں منازل اور مراتب باطن ایسے بیان ہو رہے ہیں کہ قرآن پاک اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کا پتہ نہیں ہے۔ آیات کو اپنے مطلب کے موافق تاویل کرکے ان کی تائید میں تحریر کرتے ہیں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں اور آپؐ کے ارشادات اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمل میں اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس سے نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ جن کے دل و دماغ میں اللہ جل شانہ کی عظمت اور محبت کے سوا دوسری چیز کی گنجائش نہیں۔ ان پر جو چیز وارد ہوتی ہے وہ اس کو اسی طرف محمول کرتے ہیں جس سے ان کو تقرب خداوندی حاصل ہو سکے۔ اسکے برعکس جن لوگوں کے دل و دماغ محبت اور عظمت خداوندی سے مملو نہیں ہوئے ان کے لیے یہ باتیں فائدہ مند ہونے کے بجائے مضرت اور نقصان کا باعث ہوتی ہیں۔ ایک چیز ایک وقت میں فائدہ دہ ہوتی ہیں۔ اور وہی چیز دوسرے وقت میں مضر بھی ہو جاتی ہے۔ ایک نسخہ ایک شخص کو فائدہ دیتا ہے اور وہی نسخہ دوسرے کو نقصان بھی پہونچا دیتا ہے۔ کیوں کہ حالات بدلتے رہتے ہیں اور تبدیلی احوال و تبدیلی اوقات و کیفیات کا نسخہ میں لحاظ ضروری ہے۔

صوفیائے کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو منازل اور مراتب بیان فرمائے ہیں انکی اصطلاحات کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے کچھ اور ہی سمجھ لیا گیا۔ کیونکہ جو کچھ انھوں نے لکھا وہ تو سمجھ سے بالاتر رہا اور ہم نے جو کچھ سمجھا وہ ان کا مطلب نہ تھا۔ بس جو کچھ ہم نے سمجھ لیا اسی کا نام وحدۃ الوجود رکھ لیا اور آیات قرآنی اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی دلیل بنا کر پیش کیا اور تاویل وہ بیان کی جس کا ثبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہیں ملتا ہے بلکہ اس کے خلاف ملتا ہے یا للعجب! بعض ایسی بھی چیزیں ہیں جو عقیدہ کو بالکل خراب کر دیتی ہیں اور قرآن پاک کے فرمان کے مخالف پڑ جاتی ہیں مگر بعض حضرات ان سے اذواق حاصل کرتے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے کہ مفسرین سابق نے ان کی یہ تاویل تو نہیں کی جو ہم کر رہے ہیں۔ پس ہم اپنے احباب کو آگاہ کرتے ہیں کہ اعتراض کی زبان کو بند رکھ کر قرآن پاک میں اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کھلا کھلا جو بیان ہے اس پر اپنے عقائد کا انحصار رکھنا چاہیے۔ اس کے سوا کوئی امر ایسا پیدا نہ ہو کہ عقاید کا انحصار اس پر رکھا جائے خواہ وہ کتنی ہی باریک اور مطلب خیز بات کیوں

نہ ہو. کیوں کہ ہم نے بہت سی ظلم و زیادتی اس امر میں دیکھی ہے. حتیٰ کہ خدا اور بندہ میں ایسا ربط پیدا کیا جیسا قطرہ اور دریا میں ہوتا ہے. اس بحث کو طویل کرنا مناسب نہیں اور نہ اس مختصر میں تمام باتیں آسکتی ہیں. بس یہی کافی ہے کہ عقیدہ کا انحصار اور عمل کی بنیاد کتاب اللہ اور فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھی جائے اور ان کی حد سے کسی بھی حالت میں باہر نہ ہو نا صراط مستقیم پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہے اللہ تعالیٰ نے بندہ کے ظلم اور جہالت کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ (احزاب رکوع ۹) (ترجمہ: بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے دوسری جگہ ارشاد ہے. مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ط مِنْ نُّطْفَةٍ ط خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۝ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۝ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ۝ (عبس) (ترجمہ: اللہ نے اس کو کیسی (حقیر) چیز سے پیدا کیا یعنی نطفہ سے اس کی صورت بنائی پھر اُس کے اعضاء کو بنایا پھر اُس کو (نکلنے کا) راستہ آسان کر دیا. پھر (بعد عمر ختم ہونے کے) اس کو موت دی. پھر اُس کو قبر میں لے گیا. اللہ چاہے گا اُس کو دوبارہ زندہ کرے گا) اور ایک جگہ یہ ارشاد ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝ (انفطار) (ترجمہ: اے انسان تجھ کو کس چیز نے تیرے ایسے رب کریم کیساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھ کو انسان بنایا پھر تیرے اعضاء کو درست کیا. پھر تجھ کو مناسب اعتدال پر بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو ترکیب دیدیا) کہیں یہ ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (عٰدیٰت) (بے شک آدمی اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے) ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ ذات باری تعالیٰ جل شانہٗ سے بندہ کو کیا نسبت ہوسکتی ہے سوائے اس کے کہ مخلوق اور خالق کی نسبت ہو اور ان آیات کے علاوہ اور مقامات پر بھی جہاں انسان کا ذکر اور اسکی حقیقت کا بیان ہے اس پر غور فرمائیے اور قرآن پاک سے مطابق فرمائیے. بلا شبہہ مخلوق کی خالق سے نسبت کی حقیقت اتنی ہی ہے جتنی کہ ان آیات شریفہ میں اور دیگر آیات میں بیان ہوئی ہے. اور خالق عالم کی بزرگی و برتری جسے قرآن پاک جا بجا ظاہر فرما رہا ہے ذرا اس کی طرف بھی توجہ کیجئے. ارشاد ہوتا ہے:

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝ (یٰسین رکوع ۵) ترجمہ:۔ اور جس نے آسمان و زمین پیدا کیے ہیں کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے آدمیوں کو دوبارہ پیدا کرے. ضرور وہ قادر ہے اور بڑا پیدا کرنے والا ہے اور خوب جاننے والا ہے. اور کہیں ارشاد

ہے ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝
ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ
الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝ ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ
الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

(حشر رکوع ۳) ترجمہ:۔ وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے (سب عیبوں سے) پاک ہے۔ سالم ہے امن دینے والا ہے۔ وہ معبود برحق ہے۔ پیدا کرنے والا ہے صورت بنانے والا ہے اس کے اچھے اچھے نام ہیں۔ سب چیزیں اس کی تسبیح کرتی ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور وہی زبردست حکمت والا ہے۔

علاوہ اس کے اور بھی کثیر آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی عظمت وبزرگی اور بڑائی ارشاد فرمائی ہے جیسے کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ "اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے اس لیے اس کی مثالیں مت بیان کرو ہاں وہی مثالیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے لیے بیان فرمائی ہیں ان کا بیان کرنا ہم کو زیبا ہے۔ اس کے علاوہ بیان کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰہِ الْاَمْثَالَ ۝ اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (نحل رکوع ۱۰) (ترجمہ:۔ اللہ کے لیے مثالیں مت بیان کرو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے) اس تشریح کو مختصر طور پر چھوڑنا ہی مناسب ہے فہمیدہ اور منصف مزاج لوگ آئندہ تلاش وتجسس سے بہت سی باتیں انشاءاللہ اخذ فرما سکتے ہیں۔ ایک اور بات اس وقت کارآمد اور مفید تحریر میں لانا مناسب معلوم ہوتا ہے اور یہ تو ہم پہلے ہی لکھ چکے کہ عبارت کے ربط اور تسلسل بیان سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

قرآن مجید کا ایک تشریحی پہلو طب جسمانی کے اصول سے

قرآن مجید کے سمجھنے کے لیے بہت سی چیزیں درکار ہیں اور وہ وہی چیزیں ہیں جو امکان میں ہیں اور ذہنوں سے قریب ہیں ممکن الحصول ہیں۔ ناممکن الحصول اور وصول نہیں ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ طب میں ہر عضو میں چار قوتیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ۱۔ جاذبہ ۲۔ ماسکہ ۳۔ ہاضمہ ۴۔ دافعہ

۱۔ جاذبہ..... اپنے مفید مادہ کو جسم سے جذب کرتی ہے۔
۲۔ ماسکہ..... مفید مادہ کو جسم میں ٹھیراتی ہے۔

۳۔ ہاضمہ ..... جزو بدن بناتی ہے۔

۴۔ دافعہ ..... ردی فضلہ کو دفع کرتی ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان ان ہی چار قوتوں سے ترکیب پایا ہوا ہے مگر حسب استعداد ہر شخص میں ان چار قوتوں میں باہمی کمی بیشی ضروری ہے یعنی کسی شخص میں کوئی قوت بڑھی ہوئی ہے اور کوئی قوت کم ہے اور کسی دوسرے میں اس کے برعکس معاملہ ہے۔ مثلاً قوت جاذبہ کسی میں زیادہ ہے لیکن قوت دافعہ کم ہے اور کسی میں قوت ماسکہ زیادہ ہے لیکن قوت ہاضمہ کم ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ایک شخص کی کیفیت سے دوسرے شخص کی کیفیت میں فرق ہے۔ اسی طرح اخذ علم اخذ نصیحت کے اعتبار سے بعض لوگ تو وہ ہیں جن میں قوت جاذبہ بالکل ہی نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد خداوندی ہے کہ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ (بقرہ۔ رکوع)

ترجمہ:۔ یعنی آپ ان کو خوف آخرت دلائیں یا نہ دلائیں، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ان میں قوت جاذبہ مفقود ہے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جن میں قوت جاذبہ ہے ماسکہ نہیں ہے جیسے کہ یَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ (بقرہ رکوع ۹) (ترجمہ:۔ سنتے ہیں وہ اللہ کے کلام کو پھر بدل دیتے ہیں اس کو سمجھنے کے بعد اور وہ اس کو جانتے ہوتے ہیں) اور جیسے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ (انفال رکوع ۳) (ترجمہ:۔ اور نہ ہو ان لوگوں کی طرح جنھوں نے کہا سنا ہم نے اور وہ نہیں سنتے) ایسے لوگ اللہ کے کلام کو سمجھتے بھی ہیں، سنتے بھی ہیں، لیکن صحیح طور پر اس کو نہ محفوظ کرتے ہیں اور نہ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں مگر قوت اخذ موجود ہے۔

تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو سنتے ہیں اور یاد بھی رکھتے ہیں یعنی ان میں قوت جاذبہ بھی ہے اور ماسکہ بھی ہے لیکن ان کی قوت ہاضمہ ضعیف ہے اس وجہ سے وہ خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے جیسے کہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (بقرہ رکوع ۵) (ترجمہ: تم لوگوں کو تو بھلائی کا حکم دیتے ہو مگر خود اپنی ذات کو اس بھلائی پر عمل پیرا ہونے کے لیے بھلا دیتے ہو اور حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔)

اور چوتھی قسم کے لوگ وہ ہیں جن میں قوت دافعہ یا تو بہت ضعیف ہے یا مفقود ہے۔ اس قسم

کے لوگ اونچے طبقے میں زیادہ پائے جاتے ہیں اور یہ کمزوری اس طبقہ میں زیادہ ملتی ہو۔ یہ وہ طبقہ ہے جو صاحب ایمان بھی ہے اور اعمال صالحہ سے بھی کافی حد تک آراستہ ہے۔ یہ لوگ قرآن شریف پڑھتے ہیں ان کی باتوں کو یاد بھی رکھتے ہیں لیکن اپنی بری عادتوں کو نہیں چھوڑتے۔ جن باتوں کے وہ خوگر ہو چکے ہیں ان کو چھوڑنا اور دفع کرنا ان پر شاق ہے۔ کسی میں غصہ ہے تو وہ عادت بن چکا ہے اور کسی میں حب جاہ غرض ہر ایک میں ایک نہ ایک نقص پائی جاتی ہے۔ یعنی قوت دافعہ سے کام لے کر وہ اس ردی فضلہ کو دفع نہیں کرتے جس کا دفع کرنا ضروری ہے۔

اب اسی اندازہ پر اپنا بھی جائزہ لے کر دیکھو اور غور کرو کہ ہمارے اندر کس قوت میں ضعف ہے اور کون سی قوت مفقود ہے۔ انشاء اللہ اگر اس اصول کو مدنظر رکھ کر غور کرتے رہے تو بہت سے نقائص دور ہونے کا اور بڑے بڑے بے شمار فائدوں کے حاصل ہونے کا امکان ہے۔ جس شخص نے جو چیزیں اختیار کر لی ہیں اور اس کی عادت میں جو چیزیں داخل ہو چکی ہیں غور فرمائیے کہ وہ ان کو اچھی نظر سے دیکھتا ہے یا یہ کہ برا سمجھتا ہے۔ دیکھا تو یہ جا رہا ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ہر ایک شخص نے جو اختیار کر لیا ہے وہ اسی میں خوش ہے۔ اور یہ گرفت، دل اور دماغ پر بڑی سخت ہے اس سے چھوٹنا اور آزاد ہو کر ترقیات حاصل کرنا در اصل اہم ترین فرائض انسانی میں سے ایک فرض ہے۔ حقیقی طاقت سے وابستگی دیگر عارضی طاقتوں سے آزادی ہے اور سعادت انسانی ہے۔

پروانۂ فطرت ما در دام بال میزد　　آزاد کردہ فضلش از ہر قیود ما را　　(باقی)

بزمِ خواجہ خُرد دہلویؒ کی ایک جھلک

ایک نادر نسخۂ ملفوظات کا انتخاب

تلخیص و ترجمہ ——————— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی —

حضرت خواجہ عُبید اللہ عرف خواجہ خُرد دہلویؒ — حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی قدس سرہٗ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی کا اسمِ گرامی جو دوسری ماں سے تھے اور صرف چار ماہ بڑے تھے — خواجہ عبید اللہ اور لقب خواجہ کلاں تھا۔ احقر نے اِن دونوں باکمال بھائیوں پر ایک مقالہ لکھا تھا جو "بحرِ ولایت کے دو آبدار موتی" کے عنوان سے الفرقان بابت جمادی الاخریٰ اور رجب ۱۳۷۲ھ میں شایع ہو چکا ہے —

اُس مقالے میں اِن دونوں بھائیوں کے تفصیلی حالات اسراریہ (قلمی) مولفہ سید کمال سنبھلیؒ سے اخذ کرکے اُس غلطی کو خاص طور پر ظاہر کیا گیا ہے جو اکثر مورخوں اور تذکرہ نگاروں کے قلم سے ہوتی چلی جا رہی ہے یعنی خواجہ کلاں کا نام عبید اللہ بتانا اور خواجہ خرد کا عبد اللہ — حالانکہ نام اس کے برعکس ہونے چاہئیں۔

اُس مقالے میں ماثر الکرام مولفہ علامہ آزاد بلگرامیؒ کے قلم کی اُس غلطی کی بھی نشاندہی کی گئی تھی جو یقیناً نادانستہ اور حیرت انگیز طریقے سے سرزد ہو گئی ہے۔ انھوں نے خواجہ خردؒ کی تاریخ پیدائش رجب سنہ ۱۰۱۰ھ لکھی ہے جو بالکل صحیح ہے اور وفات کا سن پیدائش سے پینتیس سال پہلے کا بتایا ہے یعنی سنہ ۹۷۵ھ۔

۱؎ حاشیہ کے لیے ملاحظہ ہو اگلا صفحہ

خواجہ خردؒ کے مختصر حالات یہ ہیں۔

خواجہ عبید اللہ نام۔ خواجہ خرد لقب۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے چھوٹے صاحبزادے تھے خواجہ خرد اپنے زمانے کے ایک بلند پایہ درویش، بڑے زبردست عالم و فاضل اور یگانۂ روزگار جامع معقول و منقول بزرگ تھے۔ سید کمال سنبھلیؒ آپ کے مرید خاص تھے۔ انھوں نے اسراریہ میں آپ کے احوال و اقوال تفصیل سے لکھے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ نے حضرت خواجہ خرد سے اخذ فیض کیا ہے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے انفاس العارفین اور الانتباہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بلگرام کے ایک مشہور محدث سید محمد مبارک بلگرامیؒ بھی ـــ جن کا ذکر مآثر الکرام میں ہے آپ کے شاگردوں میں ہیں آپ پر توحید وجودی کا غلبہ تھا۔ آپ نے وفات کے ایک سال قبل ایک ماہ سنبھل میں سید کمال سنبھلیؒ کے مکان پر مقیم رہ کر سرزمین سنبھل کو اپنے فیوض سے مالامال فرمایا۔ اس سے پہلے چند ماہ امروہہ میں بھی مقیم رہے ہیں ـــ دیگر اکابر کے علاوہ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے بھی خلافت و اجازت حاصل کی ہے ـــ "زبدۃ المقامات" میں فہرست خلفاء میں آپ کا نام درج نہیں ہے۔ شاید خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کو آپ کی خلافت کا علم حاصل نہ ہوا ہو۔ احقر نے بھی "تذکرۂ خلفاء مجدد الف ثانیؒ" میں آپ کا ذکر "زبدۃ المقامات" کی تتبع میں نہیں کیا تھا ـــ "اسراریہ" اور نسخۂ سلام اللہ دہلویؒ کے مطالعے سے اپنی اس کوتاہی کا احساس ہوا ـــ حضرت خواجہ خردؒ نے ۱۰۷۴ھ میں وفات پائی اور اپنے والد ماجدؒ کے قریب دفن ہوئے ـــ میں ستمبر ۱۹۶۹ء میں حیدرآباد دکن گیا تھا۔ وہاں کتب خانہ اصفیہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں ایک نادر قلمی رسالہ "ملفوظات خواجہ خردؒ" کے نام سے نظر سے گزرا جس کے مرتب سلام اللہ دہلویؒ ہیں۔ "اسراریہ" سے معلوم ہوا کہ خواجہ سلام اللہ

ؔ لفظوں میں "خمس وسبعین وتسعمائۃ" لکھا ہوا ہے جس کے بعد ناقل کی غلطی کا شبہ کم ہو جاتا ہے۔ پھر بھی احقر کو خیال تھا کہ شاید ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کو مآثر الکرام کا جو نسخہ ملا تھا اس کے کاتب سے یہ غلطی ہو گئی ہو مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے کتب خانہ دارالعلوم کے ذخیرہ ملفوظات کے اندر کتب خانہ مفتی سعد اللہؒ سے آئی ہوئی مآثر الکرام میں جو خود علامہ آزاد بلگرامیؒ کے قلم سے لکھی ہوئی تھی بعینہٖ یہی غلطی موجود دیکھی۔

پھر فرمایا۔۔۔ ہمارے احباب اِس بات کا یقین رکھیں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ حیّ وقیوم ہے اور سب کا رزق اُس نے اپنے ذمّے لے رکھا ہے پس (بے ضرورت) سعی واضطراب سے کوئی فائدہ نہیں ۔۔۔ پھر یہ آیت تلاوت کی ۔۔۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ عَدُوٌّ لَّكُمْ [1] (تمہارے مال اور تمہاری اولاد (اگر توجہ الی الحق سے تم کو غافل کرتے ہیں تو) تمہارے دشمن ہیں) ۔۔۔

فرمایا۔۔۔ ایک مجذوب ہمیشہ اس طرح رہتے تھے گویا سو رہے ہیں، کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اور اکثر زمین پر پڑے رہتے تھے۔ شاہ شجاع کرمانی نے اُن کی زیارت کا قصد کیا۔ وہ جب اُن کی خدمت میں پہونچے تو انھوں نے سر اُٹھا کر کہا۔ سو جا تاکہ ہم بھی سو جائیں۔ حضرت ولی نعمتی (والد ماجد) نے یہ حکایت (میری موجودگی میں) اُس وقت بیان فرمائی جبکہ وہ ایک روز چاہتے تھے کہ سوئیں۔۔۔ بعدہٗ میری طرف روئے مبارک کرکے فرمایا۔ سو جا تاکہ ہم بھی سو جائیں ۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ۔ فرمایا اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ تو بھی متوجہ ذاتِ الٰہی ہو جا ہم بھی متوجہ ذات الٰہی ہو جائیں ۔۔۔

فرمایا۔۔۔ ضَرَبَنِیْ وَاَکْرَمَنِیْ زَیْدٌ میں (تنازعِ فعلان کی وجہ سے) نحویوں کے درمیان (ایک مشہور) اختلاف ہے۔ اہل کوفہ فعلِ اوّل کو عمل دیتے ہیں اور اہل بصرہ فعلِ ثانی کو ۔۔۔ پہلا قول (یعنی کوفیوں کا قول) احسن واولیٰ ہے ۔۔۔ بعد ازاں فرمایا کہ روحیں عالمِ ارواح میں (قطعی طور پر) تصرفِ الٰہی کی پابند تھیں۔ جب ارواح، اجسام سے متعلق ہوئیں تو اجسام نے اُن میں تصرف کرکے اپنے اندر گرفتار کر لیا پس حق، بمنزلہ عاملِ اوّل کے ہے اور عالمِ کون، بمنزلہ عاملِ ثانی کے ۔۔۔ بہتر یہی ہے کہ عاملِ اوّل کا عمل برقرار رکھا جائے یعنی حق تعالیٰ کو پورا پورا عامل اور متصرف مانیں

فرمایا۔۔۔ ریاکاری کے ساتھ جو عبادت کی جائے گی۔ اگرچہ ایسی عبادت کرنے سے فرض کی ادائیگی ہو جائے گی، مگر اُس عبادت پر (آخرت کے اجر کے لحاظ سے) کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوگا۔

---

[1] آیت کے الفاظ میں ملفوظات کے ناقل یا کاتب سے یا خود صاحب ملفوظات علیہ الرحمہ سے غالباً سہو ہو گیا ہے۔ سورۂ انفال اور سورۂ تغابن دونوں میں آیت کے الفاظ یہ ہیں "اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ" اور سورۂ تغابن میں دوسری ایک آیت اس طرح ہے "اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ" ۔۔۔ (الفرقان)

حضرت خواجہ خُرد کے ایک صاحبزادے کا نام ہے. میں نے اُن ملفوظات میں سے اکثر ملفوظات نقل کر لیے تھے. اب اُن کا انتخاب و ترجمہ ناظرینِ الفرقان کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں. آئیے اب آپ براہِ راست حضرت خواجہ محمدؒ کی محفل میں چلیے. سنیے وہ کیا فرما رہے ہیں.

فرمایا ___ ہمارے نزدیک گناہوں میں بدترین گناہ 'طلبِ دنیا' ہے ___ اور بہترین کام 'ترکِ دنیا' ہے ___ چنانچہ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے. "حُبُّ الدنیا راسُ کُلِّ خطیئۃٍ" (دنیا کی طلب و محبت، تمام خطاؤں اور گناہوں کی جڑ ہے)

فرمایا ___ جو کوئی طالبِ دنیا ہے اس کی دین و دنیا میں کچھ عزت آبرو نہیں ___ بعد ازاں فقیر (سلام اللہ دہلوی) کی طرف مخاطب ہو کر یہ آیت تلاوت فرمائی. ___ وَمَا مِنْ دَابَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (زمین پر جو جاندار بھی ہے اُس کا رزق اللہ تعالٰی کے ذمہ ہے) ___

فرمایا ___ ایک درویش نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی یہ بات کہے کہ جو شخص دنیا میں کوشش وسعی کرتا ہے وہ فراغت کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اور جو کوشش نہیں کرتا وہ فقر و فاقہ میں مبتلا رہتا ہے ___ اس بات کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی مشاہدہ ہے کہ بہت سے آدمی، دنیا کو طلب کرتے ہیں اور رات دن انتہائی کوشش میں لگے رہتے ہیں مگر اُس کوشش کا کچھ بھی فائدہ مرتب نہیں ہوتا اور بہت سے ایسے ہیں جو گوشہ نشین ہیں مگر اُن کو ہر چیز دنیا کی (نعمتوں میں سے) حاصل ہے اور دربارۂ معیشت اُن کو کوئی تکلیف نہیں پھر یہ شعر پڑھا ؎

قناعت، توانگر کند مرد را   خبر دِہ حریصِ جہاں گرد را

(قناعت، انسان کو غنی و توانگر کر دیتی ہے. دُنیا جہان میں روزی کے لیے مارے مارے پھرنے والے حریص کو اس حقیقت سے آگاہ کر دو) ___

بعد ازاں ارشاد فرمایا ___ اگر کوئی کہے کہ طلبِ دنیا اور اُس کے حصول میں کوشش مُرادِ الٰہی ہے ___ یہ وسوسۂ شیطانی ہے اِس وسوسے کو استغفار اور تعوّذ سے دفع کرنا چاہیے ....

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت قبلہ گاہی (والد ماجد) کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کثرتِ عیال نیز معیشت کی تنگی کے سلسلے میں نالہ و فریاد کرنے لگا. اس موقع

اور وہ معصیت جو ندامت پر لے آئے اور پشیمان کر دے اُس کا ثمرہ (آخرت کے لحاظ سے) خیر و خوبی ہے۔

ایک موقع پر یہ دو شعر پڑھے۔

آدم ز خاک بود دلے خلق نیک داشت — در محفلِ ملائک مقامش عظیم بود

ابلیس بدخصال اگرچہ زِ نار بود — ناشی ز کبر و عُجب لعین و رجیم بود

(یعنی آدم علیہ السلام اگرچہ خاک سے بنے ہوئے تھے مگر چونکہ اخلاقِ محمودہ رکھتے تھے اس لیے محفلِ ملائکہ میں اُن کا بہت اونچا مقام تھا — اور ابلیس بدبخت اگرچہ آگ سے پیدا شدہ تھا مگر اپنے غرور و تکبر کی وجہ سے ملعون و راندۂ درگاہ ہوگیا) — صاحبزادۂ گرامی قدر خواجہ سلام اللہ دہلوی فرماتے ہیں — ایک روز خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ حضرتِ والا پر عجیب بسط و انبساط کی کیفیت طاری تھی جس کی وجہ سے تمام محفل کیف و سرور سے بھری ہوئی تھی اور حاضرین میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو اُس وقت برکتِ صحبت کے اثر سے ایک ذوق اور ایک وجد اپنے اندر محسوس نہ کر رہا ہو مجھے سامنے بلا کر ایک نگاہِ خاص میری طرف ڈالی۔ اُس وقت ایک ایسی زبردست کیفیت پیدا ہوئی جس کو بیان نہیں کر سکتا۔ اور یہ شعر حضرت والا نے پڑھا ؎

دور بینانِ بارگاہِ الست — بیش ازیں پے نہ بُردہ اند کہ ہست

یعنی بارگاہِ الست کو دور سے دیکھنے والوں نے یہ پتہ تو چلا لیا ہے کہ وہ ہے اس سے زیادہ سراغ نہ لگا سکے۔

فرمایا — شریعت میں جو کچھ ہے سب حق ہے اور جو کچھ صوفیۂ محققین نے فرمایا وہ بھی حق ہے۔

فرمایا — حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کے بعد کوئی شخص (اس سلسلے میں) حضرت خواجہ بیرنگؒ (یعنی حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ) کے مثل نہیں ہوا۔

فرمایا — وہم سے علم تک پہونچنا مشکل ہے اور علم سے وحدت کا پتہ چلانا اس سے زیادہ مشکل ہے۔

فرمایا — جب میں بارہ یا تیرہ سال کا تھا حضرت مخدومی ارشاد پناہی میاں شیخ الہداد نے — جو کہ خلفائے حضرت والد ماجدؒ سے تھے — بغیر کسی طلب کے مجھے ذکر تلقین فرمایا — اُسی عمر میں میاں شیخ الہدادؒ کی . . . .

.... توجہ کی برکت سے میرے اندر آثارِ جمعیت
ظاہر ہو گئے۔ اُس کے بعد جب حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات دیکھے تو اُن کی خدمت میں پہونچنے کا اشتیاق ہو گیا۔ جب میں سرہند کی طرف روانہ ہوا تو حضرت مجددؒ کو ہر منزل پر خواب میں دیکھتا تھا۔ وہ عالمِ خواب میں بڑی مہربانیاں فرماتے تھے۔ جب شہر سرہند میں داخل ہوا تو کیفیتِ قلبی نے غلبہ کیا اور جب شرفِ دیدار سے مشرف ہوا تو ایک عجیب کیف حاصل ہوا۔

پھر فرمایا۔ خدمتِ حضرت مجددؒ میں بعد از کشوفِ صوریہ اوّل چیز جو ظاہر ہوئی وہ یہ توحید تھی۔ ــــ توحید میں مراتب و درجات بہت ہیں۔ بطفیلِ حضرت ایشاں اکثر مراتبِ توحید واضح ہوئے۔

فرمایا۔ اس راہِ طریقت کا اوّل، توبہ ہے اور آخر، تجلیٔ ذاتی برقی۔

فرمایا۔ نعمتہائے الٰہی میں سے ہر نعمت پر شکر واجب ہے۔ کوئی بھی نعمت ہو ــ لیکن دل دنیا سے نہ لگانا چاہیے ــ پھر یہ شعر پڑھا ؎

تعلق، حجاب است و بے حاصلی چو پیوند ہا بگسلی واصلی

یعنی دنیا سے دل لگانا حصول مقصد میں ایک رکاوٹ ہے اور بے حاصلی کی بات ہے۔ جب تو تمام بندھنوں کو توڑ دے گا تب واصل ہوگا) ــــ

خدمتِ اقدس میں ایک درویش نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ فلاں اہل دولت لیے اہلِ سلسلۂ نقشبندیہ کی شان میں بے ادبی کی ہے فرمایا کہ یہ حرکت اُس رئیس کے زوال کی علامت ہے۔

فرمایا ــ ایک رات میں نے حضرت خواجہ بیرنگؒ (حضرت خواجہ باقی باللہؒ) کو خواب میں دیکھا کہ آپ کے سامنے بیٹھا ہوں اور آپ بالتفاتِ تمام فرما رہے ہیں ــ کہو ــ اللہ اللہ ــ میں آپکے ساتھ ساتھ اللہ اللہ کہہ رہا ہوں۔ حضرتؒ نے میرے باطن میں ایک تصرف فرمایا جس سے ایک کیفیتِ عظیمہ اور حالت تو یہ مجھے حاصل ہوئی ہے۔ اُس کے بعد جب بیدار ہوا وہی کیفیت و جمعیت جو حضرت والد ماجدؒ کی توجہ سے خواب میں تھی۔ بیداری میں بھی اپنے اندر پائی ــــ

فرمایا کہ ــ ابھی میں دو سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ حضرت خواجہ بیرنگؒ (یعنی والد ماجد) نے مجھے خصوصی توجہ سے نوازا اور فرمایا کہ اس بچے کو بچپن ہی میں اللہ تعالیٰ نے قبول فرما لیا ہے ــ پھر فرمایا کہ یہ بات مجھ سے شیخ الشیوخ اُستاذ الاساتذہ حضرت شیخ عبدالحق (محدث دہلویؒ) نے

بیان فرمائی تھی ____

فرمایا کہ ___ ایک بزرگ کا قول ہے کہ جوانمردہ ہے کہ جو ایسے شخص کو بھی رنجیدہ نہ کرے جو رنجیدہ کرنے کا مستحق ہو اور آزاد مردوہ ہے جو کسی کے رنجیدہ کرنے اور ستانے پر بھی اس کو رنجیدہ نہ کرے۔ بعد ازاں فرمایا کہ طالب کو اپنے اندر یہ ہر دو صفتیں پیدا کرنی چاہئیں۔ پھر یہ مصرع پڑھا ع

مرنج و مرنجاں ہمیں است کار

(یعنی نہ رنجیدہ ہو نہ کسی کو رنجیدہ کر یہی اصل کار ہے)

فرمایا۔ فقیر وہ ہے کہ اپنے دشمن سے بھی دوستی کرے اور ہر شخص کا اعزاز و اکرام کرے۔ کسی شخص کو چشم دوئی سے نہ دیکھے ___ بالفرض اگر کسی نے اس کو گالی بھی دی تو وہ اس کے لیے دعائے خیر کرے یا اس کو کوئی تحفہ دے تاکہ اس کا دل شاد و خرم ہو جائے۔ بعد ازاں اپنے دو شعر پڑھے جن میں سے ایک یہ ہے ؎

ہر کہ با دشمن نورزد دوستی ره نیابد در جناب کبریا

(یعنی جو شخص دشمن سے دوستی نہ برتے گا وہ بارگاہِ کبریا میں راہ نہ پائے گا۔)

فرمایا ___ میر سید احمد مکیؒ جو کہ حضرت خواجہ بیرنگؒ (والد ماجد) کے مخلصین میں سے تھے فرماتے تھے کہ حضرت خواجہ جیو (خواجہ باقی باللہؒ) نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ جب ہم بہشت میں جائیں گے تم کو بھی (باذن اللہ) اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

فرمایا ___ میں (سرہند میں) ایک روز حضرت شیخ احمد جیو (حضرت مجدد الف ثانیؒ) کی مجلس میں بیٹھا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے تھے کہ بہشت میں جانا (معمولی بات نہیں ہے) بہت دشوار ہے پھر حضرت مجددؒ نے ایک حدیث پڑھی جس کا مضمون یہ تھا کہ بہشت میں وہ شخص جائے گا جو مثلِ آبِ باراں، پاک و صاف ہو گیا ہوگا ___ حضرت مجددؒ یہ بیان کرتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے ____

فرمایا ___ کہ تاج العارفین شیخ تاج الدین (سنبھلیؒ) نے اپنے بعض رسائل میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص برائے خدا دعائے سیفی کا ورد رکھتا ہے ___ تو وہ دنیاوی مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ اور اگر دعائے سیفی کا پڑھنا محض دنیا کے حصول کے واسطے ہے تو خسر الدنیا والآخرۃ

کا مصداق ہے

فرمایا ـــ تعلقِ حُسن صوری (یعنی عشق مجازی) کے دفع کرنے کے لیے نماز در روزہ میں اشتغال اور ایسی کتابوں کا مطالعہ بہت مفید ہے جن میں احوال مشائخ لکھے ہوئے ہیں ـــــ

فرمایا ـ کہ حضرت شیخ احمد جیو (حضرت مجدد الف ثانیؒ) فرماتے تھے کہ اُن کے پیر و مرشد حضرت خواجہ صاحب (خواجہ باقی باللہؒ) فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ہندوستان میں مثل شاہ اللہ بخش گڑھ مکتیسریؒ کے کسی درویش کو نہیں پایا ـــ اُن کے جذب کی تعریف کرتے تھے ــــ اسی سلسلہ گفتگو میں حضرت مجددؒ نے فرمایا کہ خواجہؒ نے بعض درویشوں سے فرمایا تھا کہ میرا ارادہ ہوا تھا کہ خواجہ اللہ بخش گڑھ مکتیسریؒ کا مرید ہو جاؤں مگر ایک وجہ سے میں نے اُن سے بیعت نہیں کی۔ (وہ وجہ ملفوظات میں موجود ہے مگر مصلحت اور اختصار کے پیش نظر اُس کا ذکر اس جگہ نہیں کیا گیا۔ (باقی)

عہ۔ الشیخ العارف الکبیر اللہ بخش ..... الشطاری الگڑھ مکتیسری احد مشائخ المشہورین کان من نسل عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ ــــ آپ کے دادا کے دادا موسیٰ بن عمران ملتان سے ہندوستان آئے اور گڑھ مکتیسر میں قیام کیا۔ موسیٰ بن عمران کے چچا شیخ قوام الدین نے رُہتک میں سکونت اختیار کی تھی ـــــ شیخ اللہ بخش شطاری گڑھ مکتیسر میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی۔ اساتذہ عصر سے تعلیم پاکر طریقت کی تعلیم شیخ مبارک بن عبد المقتدر جھنجانویؒ سے حاصل کی جو کہ سید علی قوام شطاریؒ کے خلیفہ تھے ــ مونس الذاکرین آپ کی ایک کتاب ہے جو اپنے پیر و مرشد کے حکم سے آپ نے لکھی ہے۔ اس میں فضیلت ذکر اور تاثیرات ذکر کا بیان ہے۔ محمد بن فضل اللہ المحبی نے خلاصۃ الاثر میں آپ کا ذکر خیر کیا ہے۔ ۹ رمضان ۱۰۰۲ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔ سورۂ اخلاص کے اعداد سے آپ کی تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ حضرت شیخ تاج الدین سنبھلیؒ پہلے سلسلۂ عشقیہ شطاریہ میں آپ کے خلیفہ ہوئے۔ بعد کو حضرت خواجہ باقی باللہؒ دہلوی سے سلسلۂ نقشبندیہ میں خلافت حاصل کی تھی۔ آپ کا مزار گڑھ مکتیسر ضلع میرٹھ میں ہے ــــ ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد خامس و دیباچہ مونس الذاکرین۔

اِعتراف ذنب اور معصومیت

ایک سوال کا جواب

از محمد منظور نعمانی

ایک دوست جو صاحب مطالعہ اور صاحب قلم بھی ہیں انھوں نے ایک مسلم بزرگ کی کتاب میں ایک دعا دیکھی جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بتلایا گیا ہے اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارہ میں "ذنب" (گناہ) کا صاف صریح اعتراف کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے اس دعا کا وہ خاص حصہ یہ ہے۔

"...... وَاَنَا الْبَائِسُ الْفَقِیْرُ،	اور میں ہوں مصیبت زدہ محتاج فریاد کناں
اَلْمُسْتَغِیْثُ الْمُسْتَجِیْرُ اَلْوَجِلُ	پناہ جو، ترساں و ہراساں، اقرار و اعتراف
الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِیْ	کرنے والا اپنے گناہ کا، سوال کرتا ہوں
اَسْئَلُكَ مَسْئَلَةَ الْمِسْكِیْنِ اَبْتَهِلُ	تجھ سے سوال کسی بیکس بندے کا سا
اِلَیْكَ اِبْتِهَالَ الْمُذْنِبِ	گڑگڑاتا ہوں تیرے سامنے کسی گنہگار
الذَّلِیْلِ ...... الخ	ذلیل کی طرح۔ الخ

اس پر اُن صاحب کو یہ اشکال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں پھر اعتراف ذنب (اقرارِ گناہ) کے کیا معنی؟ انھوں نے اس بارے میں ناچیز راقم سطور کو لکھا اور دریافت کیا کہ کیا واقعی یہ دعا کسی حدیث میں وارد ہے اور یہ حدیث کس کتاب میں روایت کی گئی ہے؟ اس کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا مناسب معلوم ہوا کہ اس کو "الفرقان" میں بھی شائع

کر دیا جائے ممکن ہے اور بھی اللہ کے ایسے بندے ہوں جن کے ذہنوں میں اس طرح کا غلجان ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مکرمی و محترمی سلام مسنون!

آپ کے مکتوب کے جواب میں گزارش ہے

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا حدیث کی مشہور کتاب "کنز العمال" میں معجم کبیر طبرانی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ اس کے راوی حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن شام کو عرفات کے میدان میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں کی تھی۔ کنز العمال ہی کے حوالہ سے یہ حدیث "معارف الحدیث" کی پانچویں جلد میں بھی نقل کی گئی ہے۔ صفحہ ۲۵۲ اس کے علاوہ بھی بہت سی صحیح ترین روایتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی دعائیں مروی ہیں جن میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے "ذنب" یا "ذنوب" کا اعتراف کر کے بڑے عاجزانہ انداز میں معافی اور مغفرت کی استدعا کی ہے۔

صحیح مسلم شریف وغیرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بڑی طویل دعا مروی ہے جو آپ کبھی کبھی نماز کے شروع میں تکبیر تحریمہ کے بعد اور قرأت سے پہلے پڑھتے تھے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

اَنْتَ رَبِّیْ وَاَنَا عَبْدُكَ	خداوندا! تو میرا رب اور مالک ہے میں تیرا
ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاعْتَرَفْتُ	بندہ ہوں۔ میں نے اپنے پر بڑا ظلم کیا ہے
بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ	مجھے اپنے "ذنب" (گناہ) کا اعتراف ہے
جَمِیْعًا اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ	پس خداوندا! تو میرے سارے گناہ
اِلَّا اَنْتَ۔	بخش دے تیرے سوا کوئی نہیں جو گناہوں
	کو بخش سکے۔

صحیح مسلم ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ سجدہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ دعا بھی کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ كُلَّهٗ دِقَّهٗ وَجُلَّهٗ وَاَوَّلَهٗ وَآخِرَهٗ وَعَلَانِيَتَهٗ وَسِرَّهٗ۔	اے میرے اللہ میرے سارے گناہ بخش دے چھوٹے بھی، بڑے بھی، اگلے بھی پچھلے بھی، کھلے بھی اور چھپے بھی۔

اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک یہ دعا بھی روایت کی گئی ہے

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِيْئَتِیْ وَجَهْلِیْ وَاِسْرَافِیْ فِیْ اَمْرِیْ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ۔	اے اللہ میری خطائیں معاف کر دے اور نادانی اور زیادتی کے جو کام مجھ سے سرزد ہوئے وہ سب معاف فرما دے اور جن کا تجھے مجھ سے زیادہ علم ہے۔

یہ صرف تین دعائیں نقل کی گئی ہیں، ان کے علاوہ بھی ایسی بہت سی دعائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہیں جن میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے بارے میں خطا اور قصور اور گناہ کا اقرار کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کی استدعا کی ہے۔ اور دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات میں یہ بلند ترین کمال ہے اور ان دعاؤں میں اور معصومیت کے عقیدہ میں کوئی تضاد نہیں۔

عقیدۂ عصمت کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو اللہ کی نازل کی ہوئی شریعت نے گناہ قرار دیا ہے ایسی کوئی چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر نہیں ہوئی۔ اور یہ بالکل برحق ہے۔ حضورؐ سے نہ کبھی کوئی صغیرہ سرزد ہوا اور نہ کبیرہ۔ اور تمام انبیا علیہم السلام کا یہی حال ہے ــ لیکن جن بندوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کا قرب خاص حاصل ہوتا ہے ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ مالک الملک کے حق کی ادائیگی میں اپنے کو سراسر قصوروار سمجھتے ہیں، سب کچھ کرتے ہیں، وہ کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے معراج ہو لیکن پھر بھی اپنے کو قصوروار اور کوتاہ کار سمجھتے ہیں، وہ ایسی نماز پڑھتے ہیں جو بہت سے اولیاء اللہ کو کبھی نصیب نہیں ہوتی لیکن روتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کا کچھ بھی حق ادا نہ ہو سکا۔ وہ اپنی نیکیوں کو بھی گناہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ایسے احساس و تاثر کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہیں جو گناہگاروں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ صحیح روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ زبان مبارک پر استغفار کا کلمہ گویا اکثر اوقات جاری رہتا تھا۔ حدیث پاک میں

ہے کہ نماز کا سلام پھیرنے کے بعد آپ اللہ اکبر کہتے پھر تین دفعہ کہتے استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ
اس موقع پر اللہ اکبر اور پھر بار بار استغفار کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شان بہت عالی ہے
اس کی بڑائی اور کبریائی کی کوئی انتہا نہیں۔ مجھ سے اس کی شان عالی کے مطابق اس کی عبادت نہیں
سکی، اسی احساس کے تحت آپ بار بار استغفار کرتے اور معافی مانگتے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

میری گزارش کا حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام تمام
صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم اور محفوظ ہیں اُن سے کبھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں ہوا لیکن
وہ اپنے اعمال میں اللہ تعالیٰ کی شان عالی کے لحاظ سے قصور محسوس کرتے ہیں اور اسی کو اپنا
"ذنب" (گناہ) سمجھتے ہیں ——— "قربیان را بیش بود حیرانی"

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

دوسرے طور پر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم عوام جب اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش
چاہتے ہیں تو ہمارے سامنے ہمارے واقعی گناہ ہوتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح
دیگر انبیاء علیہم السلام جب اللہ تعالیٰ سے اپنے "ذنوب" (گناہوں اور قصوروں) کی معافی اور
بخشش مانگتے ہیں تو اُن کے سامنے اُن کے وہ اعمال و احوال ہوتے ہیں جن کو وہ اپنے مقام قرب اور
اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی کے لحاظ سے تقصیرات اور کوتاہیاں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ اعمال و احوال
ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ہم کو اُن کا ایک ذرہ بھی نصیب ہو جائے تو ہماری مغفرت اور کامیابی کے لیے وہی
کافی ہو۔ عارفین کا مشہور مقولہ ہے۔

حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْن　　　ابرار (نیکوکاروں) کی نیکیاں مقربین بارگاہ
کی برائیاں اور کوتاہیاں ہیں۔

ایک عارف کا مشہور شعر ہے۔

وَلَوْ خَطَرَتْ لِيْ فِيْ سِوَاكَ إِرَادَةٌ　　　عَلَىٰ خَاطِرِيْ سَهْوًا حَكَمْتُ بِرِدَّتِيْ

جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میرے دل میں تیرے سوا کسی دوسرے کا ارادہ بھولے سے بھی
آ جائے تو میں اپنے کو مرتد قرار دوں گا اور ارتداد کی سزا کا مستحق سمجھوں گا۔
امید ہے کہ میری اس وضاحت کے بعد آپ کا خلجان رفع ہو جائے گا ——— والسلام

Monthly 'ALFURQAN' Luckno[w]
VOL 38 NO. 11 JANUARY 1[9..]

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۶۰ صفحات
قیمت
فی کاپی .... ۷۵ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد (۳۸)	بابت ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق فروری سنہ ۱۹۷۱ء	شمارہ (۱۲)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ مارچ تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار :۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجکر اس کی اطلاع ہمیں بھی دیدیں۔ جن حضرات نے ہمارے خط کے جواب میں اطلاع دی ہے کہ ان کو رسالہ برابر پہونچ رہا ہے ان کے علاوہ باقی تمام حضرات کا رسالہ فی الحال بند ہے گا۔

نمبر خریداری :۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔ جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت :۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۱۵ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

الفرقان کوئی سیاسی جریدہ نہیں ہو وہ خالص دینی رسالہ ہو۔ اس کا حلقہ بھی بہت محدود اور دینی ذوق و ذہن کا ہو ــــ اسکے باوجود جب کبھی اپنی ذمہ داری کا تقاضہ ہوتاہے اور ضرورت محسوس ہوتی ہو تو سیاسی صورت حال کے بارہ میں بھی اظہار رائے کیا جاتاہے۔

اس وقت ہمارے ملک میں پارلیمنٹ کا الکشن ہو رہا ہو، اس سے پہلے بھی کئی الکشن آزادی کے بعد ہو چکے ہیں لیکن اس الکشن کی ایک خاص نوعیت اور غیر معمولی اہمیت ہے ــــ اگرچہ بظاہر اس مرتبہ بھی پچھلے الکشنوں کی طرح بہت سی پارٹیاں اور بہت سے آزاد امیدوار میدان میں ہیں لیکن فی الحقیقت اصل مقابلہ دو طاقتوں میں ہے ایک چار پارٹیوں کا وہ متحدہ محاذ جس میں اصل طاقت جن سنگھ کی ہو (جو در اصل آر ایس ایس کا سیاسی روپ ہو) ــــ اور دوسرا فریق مقابل ہو حکمراں کانگرس جس کی علامت مسز اندرا گاندھی بن گئی ہیں۔

اس الکشن کے نتیجہ کے اثرات پورے ملک پر غیر معمولی پڑیں گے اور سب سے زیادہ اثر مسلمانوں اور دوسرے کم تعداد والے فرقوں اور کمزور طبقوں پر پڑے گا۔ اگر جن سنگھ اور اس کی حلیف پارٹیوں (تنظیم کانگرس، ایس ایس پی اور سوتنتر پارٹی) کا متحدہ محاذ کامیاب ہوا تو ملک کا نقشہ وہ بنے گا اور داخلہ و خارجہ پالیسی وہ ہوگی جو جن سنگھ چاہتا ہو، کیونکہ ان چاروں پارٹیوں میں طاقتور پارٹی جن سنگھ ہی ہو، اکثریت کے ایک طبقہ کے عوام بھی خاصی تعداد میں اس کے ساتھ ہیں اور اس کی پشت پر آر ایس ایس جیسی مضبوط، طاقتور تنظیم بھی ہو، جبکہ باقی تینوں پارٹیوں کے پاس اب بس اُن کے لیڈر ہیں۔ اس لیے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو کہ اس متحدہ محاذ کی کامیابی در اصل جن سنگھ ہی کی کامیابی ہوگی اور اس صورت میں اسی کی پالیسی چلے گی۔ اور پھر بالخصوص مسلمانوں کو اس سے بھی بہت بُرے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا جن سے وہ ابتک گزرتے رہے ہیں۔

اور اگر حکمراں کانگرس کامیاب ہوتی ہو تو پچھلے تجربات کی بنا پر یہ امید کرنا تو مشکل ہے کہ اُسکے مینو فسٹو (الکشن اعلانیہ) میں جو وعدے ملک کے عام مسائل کے بارے میں اور خاص کر اقلیتوں کے بارے میں کیے گئے ہیں،

وہ ضرور ہی پورے ہوں گے، لیکن اسکی امید تو یقین کے ساتھ کی جاسکتی ہو کہ اب تک جو حالات رہے ہیں اُن سے بدتر نہ ہوں گے کچھ نہ کچھ بہتر ہی ہوں گے، اور اگر مسلمانوں میں ان حالات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہوئی تو اُن کے لیے ایک نیا دور اس ملک میں شروع ہو سکے گا جس کا رُخ بہتری ہی کی طرف ہو گا ــــ اور ملک میں جس طرح کی سیاسی صحت مندی کا عمل شروع ہو گیا ہو اُس میں خود کانگرس کی مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہو گا۔

خوش قسمتی سے اسوقت الکشن کے میدان کا کھلا نقشہ یہ ہو کہ اگر اقلیتوں اور ملک کے کمزور طبقوں نے جن میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو اپنی بھلائی اور پورے ملک کی بھلائی کے لیے حکمران کانگرس کے امیدواروں کی حمایت کی تو اسکی کامیابی یقینی ہو ــــ گویا ملک کا مستقبل اور خود اُن کا مستقبل بھی اس وقت بڑی حد تک ان طبقوں کے فیصلہ سے وابستہ ہے۔

اسوقت کے نقشہ میں اس کا تو بظاہر کوئی امکان نہیں ہو کہ ان طبقوں کی حمایت جن سنگھ یا اسکے حلیفوں کو حاصل ہو سکے لیکن اس کا پورا خطرہ ہو کہ سیاسی شعور کی کمی کی وجہ سے بہت سے سیدھے سادے مسلمان یا کسی دوسرے کمزور طبقہ اور برادری کے افراد، فرقہ یا برادری کے رشتہ سے کسی ایسے امیدوار کو ووٹ دے کر اپنے ووٹ اور اپنی طاقت کو ضائع کر دیں جو اسی کام کیلئے کھڑا کیا گیا ہو اور اس طرح کانگرس کو نقصان اور اسکی حریف پارٹیوں جن سنگھ وغیرہ کو نادانستہ فائدہ پہونچا دیں ــــ یہ الکشن کی ایک عام اور بہت کارگر حکمت عملی ہو کہ جو ووٹ فریق مخالف کو ملنے والے ہوں وہ کسی تیسرے کو دلوا کے ضائع کرا دیئے جائیں، اس مقصد سے بیسیوں فرضی اور نمائشی امیدوار کھڑے کیے جاتے ہیں اور اُن پر لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا ہو اور اس چال سے وہ امیدوار بھی الکشن جیت لیتے ہیں جو اسکے بغیر کبھی نہ جیت سکتے۔

اسوقت جو الکشن ہمارے ملک میں ہو رہا ہو، اُس میں یہ چال بھی بڑے وسیع پیمانہ پر چلی گئی ہو، بہت سے ایسے حلقوں میں جہاں مسلمانوں کی یا کسی خاص طبقہ اور برادری کی ایسی تعداد ہو جو الکشن پر اثر انداز ہو سکتی ہو، کسی مسلمان کو یا اُس طبقہ اور برادری کے کسی آدمی کو امیدوار بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہو تاکہ وہ اسلام کے رشتہ سے یا ذات برادری کے ناطے سے ووٹ حاصل کر کے کانگرس کے امیدواروں کو نقصان پہونچائے ــــ اور اس کی حریف پارٹیوں، جن سنگھ وغیرہ کے جیتنے کا امکان پیدا ہو۔

ضرورت ہو کہ ہر جگہ کے سمجھدار لوگ سیدھے سادے عوام کو اس چال سے باخبر کریں اور بتائیں کہ اس معاملہ میں ان کی غلطی کتنے بُرے اور بھیانک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

---

۳۸ ویں سال کا اختتام

الحمدللہ کہ الفرقان نے اپنی عمر کا اڑتیسواں سال اس شمارے پر پورا کرلیا۔ پاکستان کی ڈاک رُک جانے سے یہ سال بڑا کٹھن ہوگیا تھا اللہ تعالیٰ ان دو مخلصوں کو جزائے خیر دے جن کی اعانت سے اس پریشان کن صورتِ حال کے مسائل کسی حد تک حل ہوئے۔ لیکن ڈاک کی یہ رکاوٹ اب تک برقرار ہے اور کچھ معلوم نہیں کہ الفرقان کے پاکستان جانے کی صورت کب بحال ہو سکے گی۔ مرتب الفرقان کی مسلسل خرابیِ صحت یونہی ایک مسئلہ الفرقان کی اشاعت کے لیے بنی ہوئی تھی کہ یہ اس سے بھی سخت ایک دوسرے مسئلے کا اضافہ ہوگیا۔ تقریباً ایک تہائی خریداری پاکستان میں تھی جو اب قصۂ ماضی بن گئی۔

ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں جتنے بھی معاونینِ الفرقان اس وقت موجود ہیں وہ کسی خاص کوشش کا نتیجہ نہیں اُن کا دینی ذوق اور اندرونی تحریک ہی انھیں الفرقان کے خریداروں میں شامل کیے ہوئے ہے۔ اس لیے امید ہوتی ہے کہ الفرقان کی اس پریشانی کے سامنے آنے کے بعد وہ تھوڑی بہت زحمت اس کے لیے ضرور فرمائیں گے کہ پاکستانی خریداروں کی کمی کا بدل الفرقان کو کسی طرح مہیا ہو جائے۔

اگر کہیں کے احباب اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوں کہ ادارۂ الفرقان کی جانب سے کوئی شخص ان کے علاقے میں آئے تو اُن کی دعوت پر اس کے انتظام کی بھی کوشش کی جائے گی۔

بزمِ خواجہ خُردِ دہلوی کی ایک جھلک

ایک نادر نسخۂ ملفوظات کا انتخاب

(از مولانا نسیم احمد فریدی)

(۲)

فرمایا ——— ایک روز میں حضرت شیخ احمد جیو (حضرت مجدد) کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا. حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ پیر دستگیر حضرت خواجہ صاحب، خواجہ حسام الدین، اور شیخ تاج (سنبھلی) کے درمیان فرق کرتے تھے بایں طور کہ خواجہ حسام الدین علم و معرفت میں زیادہ ہیں اور شیخ تاج، حال و سکر میں فوقیت رکھتے ہیں .....

خواجہ سلام اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے حضرت قبلہ گاہی (یعنی والد ماجد) کی خدمت میں یہ شعر پڑھا ؎

مے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ساکنِ بتخانہ باش و مردم آزاری مکن

یہ شعر سُنا کر میں نے دریافت کیا کہ لوگ اس شعر کو حضرت حافظ شیرازی کی طرف منسوب کرتے ہیں. جواب میں ارشاد فرمایا کہ یہ شعر حافظ شیرازی کا نہیں ہے ——— (شاید) کسی ملحد کا قول ہے جس نے اہانتِ شریعت کی ہے ———

فرمایا ——— کہ مخدومی ارشاد پناہی شیخ الہداد نے آخری عمر میں مجھے بلایا اور فرمایا کہ جو کچھ

مجھے حضرت خواجہ بیرنگؒ (خواجہ باقی باللہ) سے ملا ہے اور دیگر بعض بزرگوں اور مشائخ چشتیہ کی ارواح سے بطور فیض پہونچا ہے وہ میں نے تم کو دیا۔ اسی وقت میں نے ایک زبردست کیفیت اپنے اندر محسوس کی ..... یہ اجازت بعد از اجازت حضرت شیخ احمد جیو قدس سرہٗ، وقوع میں آئی۔ اس سے پہلے شیخ احمد جیو (حضرت مجددؒ) نے مجھ کو تعلیم طریقۂ نقشبندیہ اور اس طریقہ میں ارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی تھی ـــــ ارشاد پناہی حضرت شیخ الہدادؒ کی اجازت کے مدتوں بعد، عالم ربانی، عارف سبحانی حضرت شیخ محمد سعیدؒ (فرزند حضرت مجدد الف ثانیؒ) سے بھی سلسلۂ قادریہ میں اجازت میں نے پائی ـــ

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت قبلہ گاہی (خواجہ خوردؒ) کی خدمت میں پہونچا آپ پر بہت زیادہ روحانی قبض کی کیفیت طاری تھی۔ اس دن آپ کی جو حالت دیکھی اس سے پہلے کبھی ایسی حالت مشاہدہ میں نہیں آئی تھی ـــ آپ روتے جاتے تھے اور بار بار کہتے تھے "میرا خدا مجھ سے ناراض ہے" ـــ بعدہٗ آنکھوں سے آنسو بدستور جاری تھے اور یہ فرما رہے تھے ـــ ایک درویش نے کہا ہے کہ درویشی (فقط) نماز، روزہ، احیائے شب اور کم کھانے کا نام نہیں ہے۔ یہ تمام امور اسباب بندگی ہیں۔ بلکہ درویشی یہ ہے کہ کسی کو رنجیدہ و آزردہ نہ کرے۔ اسکے بعد یہ مصرعہ پڑھا۔

مع مرنج و مرنجاں ہمیں است کار

فرمایا ـــ حق سبحانہٗ نے میرے اوپر یہ آیت کریمہ کھول دی ہے۔ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ـــ

پھر فرمایا کہ طالب کو چاہیے کہ اس آیت کو پڑھے، خواہ دل سے خواہ زبان سے اس طریقے کہ جَاءَ الْحَقُّ کہتے وقت دل پر ضرب لگائے اور زَهَقَ الْبَاطِلُ کہتے وقت (باطل کو) دل سے بجانب پشت پھینکے ـــ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا کہ امید ہے کہ اس عمل سے طالب بہت کچھ کشادگی پائے گا ـــ

نیز فرمایا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا حاصل اور اس آیت کریمہ کا حاصل ایک ہی ہے ـــ بس اس قدر فرق ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں نفی مقدم ہے اثبات پر۔ اور اس آیت میں اثبات، مقدم ہے نفی پر ـــ

فرمایا ـــ ابتدائے حال کی بات ہے کہ ایک راستے پر ایک نداف کا مکان تھا لوگ اُن کے

حق میں اچھا اعتقاد رکھتے تھے اور ان کو غوثیت کے مرتبے پر فائز سمجھتے تھے ــــ جب میرا اُن کے کوچے میں گزر ہوتا تھا تو وہ میرے لیے دُعائے خیر کرتے تھے ــــ

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی حضرت والد ماجدؒ یہ شعر پڑھتے تھے۔

شیرزادِ بیشۂ عشقم، قوی در کارِ خود
گو حریفِ من بیا تا زورِ بازو بنگرد

(یعنی میں صحرائے عشق کا شیر زادہ ہوں اپنے کام میں مضبوط ہوں۔ میرے حریف و مد مقابل سے کہہ دو کہ اسے زورِ بازو دیکھنا ہے تو یہاں آجائے) ــــ

فرمایا ــــ کہ لوگوں کو بیماری میں اضطراب جو ہوتا ہے وہ عالمِ اطلاق (آخرت) سے عدمِ توجہ اور عالمِ کون (دُنیا) سے عدمِ انقطاعِ کُلّی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور اگر دُنیا سے انقطاعِ کُلّی رکھتے ہوں تو بیماری میں اور موت میں راحت ہی راحت اور آرام ہی آرام ہے ــــ

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت والد ماجد نے مجھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کام میں اصلی چیز نیستی اور غربت ہے جو کہ منتہائے اربابِ ہمت ہے۔ پھر یہ شعر پڑھے ــــ

خاکؑ شو خاک تا بروید گُل
کہ بجز خاک نیست مظہرِ گُل
درؑ بہاراں کے شود سرسبز سنگ
خاک شو تا گُل بروید رنگ رنگ

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک درویش نے حضرت قبلہ گاہی (والد ماجد) سے عرض کیا کہ کوئی دلیلِ نقلی، حدوثِ عالم پر ہے؟ ارشاد فرمایا ہاں یہ حدیث، اشارہ حدوثِ عالم کی طرف کر رہی ہے۔ کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْءٌ (اللہ تعالیٰ تھا اور اس کے ساتھ کوئی شے نہ تھی۔) ــــ پھر دوسری حدیث حضرت ابوذر غفاریؓ کی پڑھی جو دلیلِ حدوثِ عالم ہے ــــ

عہ خاک ہو جا خاک تا کہ پھول اُگیں۔ خاک مظہرِ گُل ہے۔ عہ پتھر بہار کے زمانے میں کب سرسبز ہوتا ہے؟ خاک بن جا تا کہ رنگ برنگ کے پھول پیدا ہوں۔

فرمایا ـــــ حضرت شیخ نظام الدین اولیار قدس اللہ روحہ کے زمانے میں تین ضیار الدین ہوگئے ہیں۔ ان میں سے ایک یعنی مولانا ضیار الدین برنیؒ (ہندوستان کے مشہور مورخ) حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معتقد اور خاص اصحاب میں سے تھے۔ دوسرے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے منکر و مخالف تھے یعنی قاضی ضیار الدین نامی۔ تیسرے نہ معتقد تھے نہ منکر اور یہ شیخ ضیار الدین نخشبیؒ (بدایونی) تھے جو کتاب سلک السلوک کے مصنف ہیں ـــــ

فرمایا ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ یشیب ابن آدم ویشب فیہ الخصلتان الحرص وطول الامل ـــــ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی انسان بوڑھا ہوتا ہے اور اس کے اندر دو خصلتیں جوان ہو جاتی ہیں۔ ایک حرص اور دوسری طول آرزو)۔ اس حدیث سے بظاہر لازم آتا ہے کہ اولیار حق بھی بڑھاپے میں ان دونوں بُری خصلتوں (کے شباب) سے خالی نہ ہوں۔ اور یہ بہت بڑا اشکال ہے۔ اس مشکل کا حل جو سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ ان دونوں صفات مذمومہ کی جوانی تقاضہ کرتی ہے اس بات کا کہ ان دونوں صفتوں کا وجود و بقا، انسان کے زمانۂ شباب سے ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص جوانی کے زمانہ ہی میں ان دونوں صفتوں کو دفع کیے ہوئے ہو تو وہ ان دونوں صفتوں کے شباب سے بھی منزہ و مبرا ہوگا۔ ـــــ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یوں ارشاد فرماتے۔ یشیب ابن آدم ویتولد او یحدث فیہ الخصلتان الخ (یعنی انسان بوڑھا ہوتا ہے اور پیدا ہوتی ہیں اس میں یہ دو خصلتیں) تب بات مشکل ہو جاتی ـــــ

فرمایا ـــــ ہمت عالی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ انسان کو جمیع مراتب دنیا سے انقطاع کلی حاصل ہو اور دُنیا کی باعث فخر چیزیں اس کی نظر میں بے حیثیت اور بے قدر ہوں تاکہ بجناب حق توجہ دائمی میسر ہو ـــــ

فرمایا ـــــ منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (ایک دن) شہر سے صحرا کی جانب جا رہے تھے۔ ایک شخص نے دریافت کیا، یا رُوح اللہ آپ کہاں جاتے ہیں؟۔ جواب میں ارشاد فرمایا میں احمقوں کی وجہ سے تنگ آگیا ہوں، ان کا علاج میں نہیں جانتا۔ مادرزاد نابینا اور ابرص کا علاج کر سکتا ہوں اور مُردوں کو باذن اللہ بارہا زندہ کیا ہے۔ لیکن ان احمقوں کے علاج سے عاجز

درماندہ ہوں ـــــ اسی لیے شہر سے صحرا کی طرف جا رہا ہوں ـــــ

فرمایا کہ ـــــ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند نے فرمایا ہے کہ جو کچھ دکھائی دے اور جو کچھ سمجھ میں آئے سب غیر ہے کلمۂ "لا" کے ذریعے اس کی نفی کرنا چاہئے۔ اور اس کی طرف متوجہ نہ ہونا چاہئے..... کمال و تکمیل اسی میں ہے۔ ع

ذرۂ در دست دلِ عطّار را

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز حضرت قبلہ گاہی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور سعادتِ قدمبوسی حاصل تھی، اس زمانہ میں حضرتِ والا کو بیماری شکم لاحق ہو گئی تھی ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ فلاں دوا اس مرض میں بہت نافع و مفید ہے۔ حضرت ایشان نے میری طرف رُخ کر کے فرمایا ـــ کہ جو کچھ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے چاہا ہے ہو کر رہے گا اور جو بھی تقدیر میں ہے ظاہر ہوگا ـــ اس دن سے زیادہ عمدہ کون سا دن ہوگا جس دن دوست کی ملاقات دوست سے ہو اور یار نزدیک یار پہونچ جائے، پھر یہ دو شعر پڑھے ؎

گر اجل، مرد است گو پیش من آئے
تا در آغوشش بگیرم تنگ تنگ
من ازو جانے ستانم جاوداں
او زِمن دلقے بگیرد رنگ رنگ

(یعنی موت سے کہہ دو اگر وہ ہمت رکھتی ہے تو میرے پاس آئے تاکہ میں اُس سے اچھی طرح معانقہ کروں ـــ میں اُس سے ایک زندگی حاصل کروں گا جو جاودانی ہوگی اور وہ مجھ سے رنگ برنگ کے پیوند لگی ہوئی گدڑی لے گی)۔

فرمایا ـــ جب مولانا حسن طاقی (؟) نے رحلت فرمائی تو استاذ العلماء شیخ عبدالحق (محدّث دہلویؒ) نے ان کی تعزیت کے سلسلے میں یہ شعر لکھا تھا ؎

ورنہ قضا بود کہ باہم رویم
میرسد آں وقت کہ ماہم رویم

(یعنی اس وقت اگرچہ یہ فیصلۂ خداوندی نہیں تھا کہ ہم اور تم ساتھ ساتھ عالم فانی سے

سفر کریں مگر وہ وقت قریب ہے کہ ہم بھی یہاں سے کوچ کریں گے) اس کے بعد حضرت خواجہ خُردؒ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دیر تک روتے رہے ــــ

ایک شخص نے حضرت خواجہ خُردؒ سے دریافت کیا کہ ملفوظاتِ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ (فوائدالفواد) میں حقائق و معارف کا اندراج کم ہے ــــ (اس کی کیا وجہ ہے) اس کے جواب میں ارشاد فرمایا ــــ کہ امیر حسن (سنجریؒ) نے جو ملفوظات لکھے ہیں خوب لکھے ہیں۔ حقائق و معارف کا تعلق (زیادہ تر) سکر و حال سے ہوا کرتا ہے ــــ طالب کو جو چیز ضروری ہو امیر حسنؒ نے بس اُن کو قلمبند کیا ہے۔

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں ایک روز ایک درویش نے حضرت والد ماجدؒ سے دریافت کیا کہ مشاہدۂ حسن و جمال (صوری) میں لذّتِ نفسی ہے یا لذّتِ روحی۔ میں بھی اس مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ ہو سکتا ہے مشاہدۂ حسن و جمال، بعض کے لیے لذّتِ نفسی ہو اور بعض کے لیے لذّتِ رُوحی ــــ حضرت ایشان نے فرمایا کہ فرض کرلو کہ مشاہدۂ حسن و جمال، لذّتِ روحی ہے تب بھی اُس سے بچنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ جو چاہیے وہ آتا نہیں اور جو آتا ہے وہ چاہیئے نہیں۔ ؎

یار می باید و نمی آید　　غیر می آید و نمی شاید

(یعنی یار مطلوب ہے وہ آتا نہیں، غیر آتا ہے وہ چاہیئے نہیں۔)

اس کے بعد مولانا رومیؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

عاشقی ہا کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

(یعنی جو عشق رنگ اور روپ کی وجہ سے ہوتا ہے وہ عشق نہیں ہوتا باعثِ ننگ ہوتا ہے)

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ تحریر کرتے ہیں کہ مخدومی واخی خواجہ کلیمُ اللہ فرماتے تھے کہ ایک دن میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ (حضرت والد ماجد کے) دستِ مبارک میں ایک بیاض تھی جس میں بہترین اشعار لکھے ہوئے تھے۔ میرے دل میں یہ بات آئی کہ بیاض کو میں دیکھتا۔ حضرت ایشان نے میری طرف رُخ کرکے فرمایا بیٹا اس بیاض کو دیکھو ــــ یہ فرماکر بیاض مجھے

دیکھنے کے لیے عنایت فرمادی. جب بیاض میرے پاس آگئی تو دوسرا خیال میرے دل میں یہ گزرا کہ اس کو چند روز اپنے پاس رکھ کر اس کا انتخاب کرلوں۔ یہ بات دل میں آئی تھی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ چند روز اپنے پاس رکھ لو۔ ..... مجھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی روشن ضمیری کا اس واقعے سے اندازہ ہوا۔

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ ارقام فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نفحات الانس (مؤلفہ مولانا جامیؒ) کو ہاتھ میں لیے ہوئے حضرت قبلہ گاہی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے چند مقامات دریافت کیے جو دقیق باتوں پر مشتمل تھے۔ اور اغلاق رکھتے تھے۔ قبلہ گاہی نے خوب اچھی طرح ان عبارات کا مطلب بیان فرما دیا، پھر فرمایا۔ کہ اس کتاب مستطاب سے اشتغال اتنی بڑی سعادت کی بات ہے کہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اے جانِ من! میں یہ چاہتا ہوں کہ میری طرح جاہل نہ رہ جانا (کچھ حاصل کرلینا)......

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن یہ نقیر، خدمتِ اقدس میں کھڑا ہوا پنکھا جھل رہا تھا اور حضرت والا سر جھکائے ہوئے مراقبے میں بیٹھے تھے اچانک پنکھا نقیر کے ہاتھ سے خطا کر گیا اور حضرت ایشان کے سرِ مبارک پر جا کر لگا۔ محفل میں جتنے حاضرین تھے سب متفکر ہو گئے۔ مگر حضرت والا سے کوئی حس و حرکت ظاہر نہیں ہوئی۔ بعد ازاں سر اٹھا کر یوں فرمایا جس پر استغراق و استہلاک کا غلبہ ہوتا ہے اُسے کچھ خبر نہیں رہتی۔

فرمایا سالک و طالب کے لیے دو باتیں ناگزیر اور ضروری ہیں۔ (۱) ایسے درویشوں سے ارتباط و صحبت نہ رکھے جو اُس کے مرشد سے ربط نہیں رکھتے، اور جب غیر طریقہ کے درویشوں کی صحبت کو تجویز نہیں کیا گیا تو پھر وہ لوگ۔ جو مطلق، طریق سے بیگانہ و ناآشنا ہیں ان کی صحبت کیسے تجویز کی جا سکتی ہے؟ مناسب یہ ہے کہ طالب ابتدائے سلوک میں کسی سے صحبت و ارتباط نہ رکھے۔ ہاں حکمِ مرشد سے کسی کی صحبت میں بیٹھ سکتا ہے۔ اور اپنے یارانِ مخصوص کی صحبت میں بھی رہ سکتا ہے۔ اس تدبیر سے نسبت حاصل ہوگی اور باطن میں قوت پیدا ہوگی۔

(۲) جو کام، مرشد سے صادر ہو اگرچہ بظاہر قبیح معلوم ہوتا ہو (اوّل) اُس کا صحیح محمل تلاش کرے (یا مرشد سے براہِ راست معلوم کرلے) ایک دم اعتراض نہ کرے (البتہ اگر وہ فعل واقعی شرعی

نقطۂ نظر سے قبیح اور معصیت ہے اس میں کسی کی اطاعت و تابعداری نہیں اس سے بچنا ضروری ہے)

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ تحریر کرتے ہیں کہ ایک دن والد ماجدؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا وہ واقعہ سنا کر جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو قُم یا ابا تراب ــ سے خطاب فرمایا ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی مثنوی کے وہ اشعار پڑھے جو اہلبیت کی منقبت میں لکھے گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک شعر یہ ہے ؎

این سلسلہ از طلائے ناب است
این خانہ تمام آفتاب است

(یعنی یہ خاندان خالص سونے کی زنجیر کے مانند ہے اور یہ گھرانہ آفتاب کی طرح روشن اور منوّر ہے۔)

خواجہ سلام اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ــ ایک روز حافظ صادق نے جو کہ مخلصین حضرت قبلہ گاہی میں سے تھے، مثنوی مولانا رومیؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

علم حق در علم صوفی گُم شود
این سخن کے باور مردُم شود

اور اس شعر کے معنیٰ بیان کرنے کی درخواست کی۔ حضرت والا نے فقیر کی طرف رُخ کر کے ارشاد فرمایا کہ قُرب دو قسم کا ہے ایک یہ کہ عبدؔ ظاہر ہو اور حقؔ باطن۔ چنانچہ اس شعر میں اسی قُرب کی طرف اشارہ ہے اور حدیث قدسی۔ فَبِی یَسْمَعُ وَبِی یُبْصِرُ وَبِی یَنْطِقُ۔ اس کی شاہد ہے۔ اس کو قُرب نوافل کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حقؔ ظاہر ہو اور عبدؔ مستہلک و مستغرق اور باطن ہو حدیث اِنَّ اللّٰہَ یَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ۔ اس قرب کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس کو قرب فرائض

سرسید احمد خاں کے نام ایک تاریخی خط

(از مولانا حکیم سید عبد الحیؒ رائے بریلوی)

(مخدوم و محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے ایک تازہ کتاب اپنے مرحوم والد ماجد علامہ حکیم سید عبد الحیٔ حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) پر نکلی ہے اور بڑی بصیرت افروز اور سبق آموز ہے۔ اسی کتاب کا ایک اقتباس کتاب کی تصنیف کے خاص الخاص محرک حضرت محترم سید عبد الرب صاحب صوفی ایم۔ اے کی فرمائش پر یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کی اجازت محترم مصنف سے بھی لے لی گئی ہے۔ مرتب)

یہ وہ زمانہ ہے کہ سارا ہندوستان سرسید کے نام اور ان کے اصلاحی کارناموں، اور ان کی عظیم الشان تعلیمی تحریک کے آوازہ اور غلغلہ سے گونج رہا تھا، اور پڑھے لکھے مسلمانوں کا کوئی گھر کوئی دینی و علمی مجلس، یہاں تک کہ شادی و غمی کی کوئی تقریب بھی جہاں چند مسلمان جمع ہوں بالعموم اس تذکرہ سے خالی نہیں جاتی تھی، کہیں تنقید و اعتراض کے ساتھ، کہیں تحسین و اعتراف کے ساتھ، اور کہیں حیرت و استعجاب کے ساتھ، لیکن قدیم حلقوں میں زیادہ تر تنقید و اعتراض اور حیرت و استعجاب کے ساتھ، اور جدید حلقوں میں تمام تر تحسین و اعتراف بلکہ عقیدتمندی کے غلو و مبالغہ کے ساتھ، جہاں تک انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم کی ضرورت کا تعلق ہے اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے اور اس کو بہت سے اہل قلم لکھ چکے ہیں کہ علماء نے اس کی یکسر مخالفت نہیں کی اور نہ اس بنا پر کسی نے سرسید مرحوم کی تکفیر و تفسیق کی، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب انگریزی زبان کے سیکھنے کے جواز کا فتویٰ دے چکے تھے، سرسید کے شدید ترین مخالفین (مولانا محمد قاسم

نانوتوی اور مولوی سید امداد العلی صاحب ڈپٹی کلکٹر وغیرہ) نے بھی کبھی اس کی (مطلق) حرمت کا اعلان نہیں کیا تھا۔

لیکن سرسید مرحوم کی تحریک (بدقسمتی دسوئے اتفاق سے) خالص تعلیمی تحریک اور مغربی زبانوں اور جدید علوم کے حصول کی دعوت نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو صورتحال قطعاً مختلف ہوتی اور یہ ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں بہت اچھا ہوتا لیکن اس میں چند ایسے اجزا اور عناصر شامل ہو گئے جو نہ صرف یہ کہ اس تحریک کو کامیاب اور مقبول بنانے کے لیے ضروری نہ تھے بلکہ اس کے لیے مضر اور اس کی کامیابی کی راہ میں حائل ہو گئے تھے اور انھوں نے مسئلہ کو ایسا پیچیدہ بنا دیا کہ اچھے اچھے وسیع الخیال اور انصاف پسند علمار کو بھی اس کے بارے میں اپنا رویہ اور پالیسی متعین کرنے کی راہ میں مشکلات پیدا ہو گئیں اور لسان العصر میر سید اکبر حسین الٰہ آبادی اور مولوی امداد العلی کو بھی کلی یا جزوی مخالفت پر مجبور ہونا پڑا اور عقائد و تحقیقات میں ان کے مخلص ترین رفیق دموید نواب وقار الملک مرحوم بھی ان کے ہمنوا نہ تھے۔

ان میں دو عنصر بہت اہم تھے اور وہ دونوں تقریباً بانی تحریک کے ذاتی رجحان افتادِ طبع اور ان کی غیر معمولی ذکاوت حس، مسلمانوں کی مادی ترقی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش و جذبہ اور انگریزوں کے تمدن و تہذیب اور ان کی صنعتی و سائنسی ترقی سے ضرورت سے زیادہ مرعوبیت کا نتیجہ تھا، ایک انگریزی تعلیم کے ساتھ انگریزوں کی تہذیب و معاشرت اختیار کرنے کی دعوت جو سرسید کے مضامین، خطبات اور "تہذیب الاخلاق" کے فائل سے بخوبی نمایاں ہے، دوسرے قرآن پاک کی وہ عقلی اور جدید تفسیر جو قدیم مسلمات و اصول موضوعہ سے آزاد، لغت، تواتر، تعامل، حدیث و سنت اور اجماع امت سے بے نیاز اور جدید تحقیقات و انکشافات بلکہ رجحانات و میلانات کو (جو مغربی تہذیب کے اثر سے اس دور میں پھیلے ہوئے تھے) قرآن مجید کے فہم و تفہیم میں اساس قرار دینا اور اگر ان کا تقاضہ ہو تو بے تکلف کسی بڑے سے بڑے یا قطعی الثبوت اور اجماعی مسئلہ اور عقیدہ کی نہ صرف تاویل اور نہ صرف انکار بلکہ استخفاف و استہزا، اس بنا پر وہ تمام غیبی حقیقتیں جو تمام آسمانی مذاہب اور صحف سماوی کی بنیاد ہیں، اور جن پر ایمان لانا ضروریات دین میں داخل تھا مثلاً جنت و دوزخ کا خارجی وجود، ملائکہ و شیاطین کا حیثیت

اجسام، وجود جن کا وجود، وحی اور نبوت کی حقیقت، رویتِ باری، قرآن کا لفظاً و معناً منزل من اللہ ہونا، معجزات و خوارق کا صدور، جو عام انسانی طاقتوں اور بشری ذرائع کے بغیر انسانی تجربہ کے خلاف پیش آئے اور مابعد الطبیعات کا ایک بہت بڑا حصہ جس کے ماننے اور ایمان لانے کے لیے خدا کی قدرت کاملہ اور عالم غیب کے وجود پر ایمان لانا ضروری ہے، نہایت بعید تاویلات یا کھلے انکار کا نشانہ بن گئی ۔[1] یہ عناصر ان کی دعوت کے ساتھ کچھ اس طرح گھل مل گئے اور انھوں نے اس پورے مجموعے کی تبلیغ اور اعلان و تشہیر میں اور ان کے مخالفین کی تردید میں اس طرح یکساں جوش خطابت سے کام لیا کہ اُن کے بہت سے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو بھی ان کی مدافعت اور ان کی تعلیمی تحریک کو ان اجزاء اور عناصر سے الگ کرنا مشکل ہو گیا اور اس امتزاج نے غیر ضروری طریقے پر ان کی اس تحریک کے لیے مشکلات پیدا کر دیں، جو اس دور کے مسلمانوں کے لیے نہ صرف مفید بلکہ ضروری و ناگزیر تھی، اور مدافعت و مخالفت میں ملت کی ذہانت اور وقت کا ایک بڑا سرمایہ بلا وجہ ضائع ہوا، جس پر ہر دردمند اور حقیقت پسند مسلمان کو خواہ وہ قدیم حلقہ سے تعلق رکھتا ہو یا جدید حلقے سے، افسوس ہونا چاہیے ۔

مولانا سید عبدالحئی صاحب خود انگریزی تعلیم کے مخالف نہ تھے انھوں نے .... کچھ عرصہ اس کی ابتدائی تعلیم حاصل بھی کی تھی، ان کے خاندان کے ایک متقدر بزرگ جن کی انھوں نے بچپن میں زیارت کی تھی، مولوی سعید الدین صاحب نہ صرف انگریزی داں اور کامیاب وکیل رہ چکے تھے بلکہ اپنے بعض کم سن عزیز بچوں کو انھوں نے انگریزی پڑھنے کی ترغیب بھی دی تھی اسی طرح وہ خاندانی طور پر سرسید کے علاوہ خاندان، ان کے خلوص، ان کی ہمدردیِ اسلامی، انکی بلند ہمتی اور اولوالعزمی سے بخوبی واقف تھے۔ اور اس کے دل سے قدردان تھے، لیکن وہ نہ صرف ایک راسخ العقیدہ، بلکہ ایک راسخ العلم اور صاحب نظر عالم کی حیثیت سے ان کی بے اعتدالیوں اور علمی جسارت اور اس غیر محدود اور غیر مقید دینی تاویلات اور انحراف کو ناپسند کرتے تھے جو

---

[1] حیات جاوید میں مولانا حالی نے سرسید کے "تفردات" کی فہرست دی ہے جن میں وہ سوادِ اعظم اور اہل سنت کے مسلک سے الگ ہیں

انھوں نے اپنی تفسیر میں اختیار کیا تھا۔ اور جس میں وہ نہ صرف صحابۂ کرام جو قرآن کے اولین مخاطب اور اہل زبان تھے، بلکہ لغت عرب، اور تمام اسلامی نسلوں اور تاریخ کے تمام عہدوں کے متفقہ فہم و نقل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، اسی احساس اور حمیت اسلامی نے ان کو باوجود اس کے کہ وہ ایک گمنام طالبعلم تھے جو تحصیل علم کے آخری مدارج طے کر رہا تھا، سرسید جیسی عظیم شخصیت سے خط و کتابت پر آمادہ کیا، جس کی تحریروں و تقریروں اور کارناموں کی سارے ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی تھی، انھوں نے ۱۸۹۴ء عیسوی مطابق ۱۳۱۲ھ ہجری میں (سرسید کی وفات سے تین سال پہلے[1]) ان کو اس زمانے میں خط لکھا جب وہ بھوپال میں طالب علمی کر رہے تھے.......... خط کا مرکزی و بنیادی مضمون یہ ہے کہ دین کے نصوص و قطعیات کے فہم و تفہیم کے بارے میں ان فطری و عقلی ذرائع اور ان آخذ پر اعتماد و انحصار کیا جائے جو عقل صحیح اور فطرت سلیم کے نزدیک ہمیشہ سے ضروری کار رہے ہیں یعنی لغتِ عرب، سنتِ متواتر فہم صحابہ اور اجماعِ امت، .... مولانا لکھتے ہیں۔

بخدمت عالیجناب ڈاکٹر سرسید احمد خانصاحب بہادر دام بالقابہ، تسلیم!

ہر چند کہ مجھ میں اور آپ میں سابقۂ معرفت نہیں اور آپ مجھ کو نہیں جانتے مگر میں آپ کو آپ کی ذاتی شہرت کی وجہ سے خوب جانتا ہوں اور آپ کی قومی خدمتوں کو تعظیم و اخلاص کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں جلد باز لوگوں کی طرح بہت جلد ردّ و قبول میں پیش قدمی نہیں کرتا بلکہ غور و فکر کے بعد نتیجہ اخذ کر کے آپ کی عقل و ذہانت و خوش تدبیری و نیک نیتی و قومی خدمت و پاک نفسی اسی قسم کی اور باتوں کو قابل ستائش سمجھتا ہوں میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے سیادت کو صرف لفاظی و شیریں زبانی پر نہیں چھوڑا بلکہ سچی اور اصل سیادت خادم قوم بن کر حاصل کی ہے جس کی نسبت ہمارے حضرت روحی فداہ کا ارشاد ہے "سید القوم خادمہم" میں اس کا بھی معترف ہوں کہ آپ کی سچی خدمتوں کی داد دینے میں میرے ناچیز الفاظ قاصر ہیں، بے شک آپ کا جوہر ذاتی اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ کوئی شخص اس کی تحسین و آفرین کرے، بلکہ وہ میری یا کسی کی تحسین و آفریں کا محتاج نہیں ہے، اور ان کے اظہار کے واسطے اپنا وقت ضائع کرنا اور آپ کو سمع خراشی کی تکلیف دینا بے سود ہی نہیں، تحصیل حاصل ہے

[1] سرسید کا انتقال ۱۸۹۸ء م ۱۳۱۵ھ میں ہوا۔

اسی واسطے میں ان باتوں سے قطع نظر کرکے ان افسوسناک باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے مجھ کو بلا سابقۂ معرفت خط لکھنے پر آمادہ کیا ہے اور جن کے بارے مجھ کو بعض باتوں میں ایسے بزرگ و تجربہ کار شخص سے اختلاف رائے کرنے میں کچھ باک نہیں مگر وہ باتیں دنیاوی تدابیر سے متعلق نہیں ہیں، کیونکہ میں ان میں آپ کا ہم خیال ہوں بلکہ یہ کہنا بھی چھوٹا منھ بڑی بات ہو، ورنہ میں کیا اور میرا خیال کیا، تجربہ کی حیثیت سے ان امور میں جس قدر آپ کو تفوق ہے، وہ پوشیدہ نہیں ہے۔

وہ باتیں جن سے مجھ کو اختلاف ہے مذہب و ملّت کے متعلق ہیں جن میں آپ کو جادۂ اعتدال سے ہٹا ہوا پاتا ہوں اور بے شک آپ ان باتوں میں غلطی پر ہیں۔ اگر میرا زعم و خیال ان باتوں میں آپ کا تخطیہ کرتا تو ممکن تھا کہ میں اپنی زعم و خیال کی تغلیط کرتا اور آپ کو برسر حق سمجھتا، مگر افسوس تو یہ ہے کہ جمہور اہل سنت و جماعت کے حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب آپ کے خیالوں کی تغلیط کر رہے ہیں، پس میں کیونکر آپ کی شخصی رائے کو ان امور میں ان کے سامنے کسی قدر و قعت کی نظر سے دیکھ سکوں، خصوصاً ان بزرگان قوم کے حضور میں جن کی عمر عزیز کا بہت بڑا حصہ صرف کتاب و سنت کی خدمت میں گزرا ہے، جنھوں نے اپنی آسائش سے بالکل دست بردار ہو کر نشر علوم ہی کو سرمایۂ حیات سمجھا ہے، بہار زندگی کے وہ دن جن کو عموماً ہر شخص آرام طلبی میں بسر کرتا ہے، انھوں نے طلب علم کے مصائب اور دور دراز سفر کی تکلیفوں کی نذر کر دیے اور علم کو حاصل کیا، حاصل ہی نہیں بلکہ جرح و تعدیل، تخریج و ترجیح، اصول و فروع کے قواعد ایسے منضبط کیے جن سے زیادہ منقح ہونا محال عادی ہے اور مقتضائے عقل بھی یہی ہے کہ جس نے تمام عمر ایک کام میں صرف کی، اس کے اصول و فروع پر مباحثہ بھی کیا اور بجائے خود بھی ردّ و قبول کی نگاہ سے اس کو دیکھتا رہا تو وہ اس کام کے اکثر پوشیدہ رازوں اور باریک راہوں سے واقف ہو جاتا ہے چہ جائیکہ ایک جم غفیر نے اپنی اپنی زندگیوں کو ان کی نذر کر دیا ہو اور قرناً بعد قرنٍ ہر ہر بات پر

مباحثے کیے گئے ہوں، اسمیں خطا کا گمان کرنا سوءِ ظن ہی نہیں بلکہ ایک حد تک خود رائی ہے،
مگر اس سے بھی قطع نظر کر کے ایک اور بات کہتا ہوں جس میں ہم اور آپ شریک
ہیں۔ قرآن کتاب آسمانی منزل من اللہ قطعی الثبوت ہے، اس میں ارشاد ہوتا ہے
فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْئٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ۔ اللہ کے سامنے
پیش کرنا یہی ہے کہ قرآن کو حاکم ٹھہرائیں اور رسول مقبول صلعم سے تصفیہ کی درخواست
کریں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر آخرت اختیار فرمالیا ہے پس ضرور ہے
کہ سرور کائنات سے جو باتیں منقول ہیں ان ہی کو بجائے آنحضرت کے مقتدا تسلیم
کریں تاہم اس قدر ضرورت باقی ہے کہ ان احادیث کے صحت و سقم کے احتمال کو دفع
کریں لیکن جس وقت محدثین نے رواۃ ثقات بحفظ قواعد جرح و تعدیل کے روایت
کر کے کتابیں مدون کیں اور متلقی علیہا بالقبول ہوگئیں تو وہی احادیث بلاشبہ رفع
نزاع و فیصلے کے واسطے مستند ہیں پس ان مقدمات سے میں جہاں تک خیال کرتا
ہوں یہ دونوں حاکم عادل، مقبول الفریقین ہیں اور یہ دونوں جو فیصلہ کریں وہی
ٹھیک ہے، اس میں مرافعہ کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اس قدر اس مقام میں خدشہ
ہو سکتا ہے کہ الفاظ و معانی میں گو شبہ نہیں ہے معانی کے تحقیق و تاویل میں
گفتگو ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ خدشہ بھی نسج عنکبوت سے زیادہ وقعت
نہیں رکھتا کیونکہ اس کے واسطے بہت کافی معیار ہمارے ہاتھ میں ہے، اگر تھوڑا بھی
آدمی غور کرے، تو معلوم ہو سکتا ہے کہ طرز ادا اور انداز کلام کو وہی خوب سمجھ سکتا ہے جس
کے سامنے متکلم نے گفتگو کی ہے، دوسرا شخص جو اس موقع پر حاضر نہیں ہے۔ اس گفتگو
کا پورا حظ حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ اکثر باتیں وقت و قرینہ و موقع و سیاق سے سمجھی جاتی
ہیں اور ان سب باتوں کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو اس کا اصل مخاطب ہے۔
اس مقدمہ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ صحابۂ کرام سے بہتر آپ کی حدیثوں کا
مطلب کوئی نہیں سمجھ سکتا، پس ان سے اس امر میں مدد لینا ضروری ہی نہیں بلکہ
واجب ہے، ان کے سامنے ہماری رائے مستند نہیں ہو سکتی، اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ فہم

مطالب میں ہم اور وہ دونوں برابر ہیں، حاشا ثم حاشا ان کو جو باتیں حاصل تھیں ان کا عشر عشیر بھی ہم کو حاصل نہیں ہاں اگر کسی بارے میں ان کا کوئی قول منقول نہیں ہے تو اس وقت ہم اس میں غور کر سکتے ہیں لیکن یہ بات نہیں ہے کہ صرف شخصی رائے کی پابندی سے بلکہ بلحاظ قواعد مقررہ کے جن کے واسطے علوم آلیہ کی بہت ضرورت ہو، اسی واسطے صرف، نحو، معانی و بیان و بدیع و حفظ اشعار عرب عربا، و لغت و ایام العرب و مصطلحات وغیرہ ذالک سے کسی طرح سبکدوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور ان سب پر عقل سلیم اور ذوق صحیح کی اشد ضرورت ہے۔ پس جو شخص ان میں بخوبی ماہر ہو اور قوت مجتہدانہ رکھتا ہو وہ کچھ بحث و تفتیش کی صلاحیت رکھتا ہے اور جو علوم مذکورہ سے ناواقف ہو وہ صرف عقل کی پابندی سے کچھ نہیں کر سکتا بلکہ ایسا خیال کرنا بوالہوسی و طمع خام ہے، جو معانی صحابہ کرام و مجتہدان ملّت سے منقول ہیں وہی معمول بہ و مدار علیہ دین و ملّت کے ہو سکتے ہیں، اس کی شہادت میں یہ حدیث بھی پیش کر سکتا ہوں۔ "سَتَفْتَرِقُ اُمتی ثلاثاً و سبعین فرقۃً کلّھا فی النّار الّا واحدۃ قیل من ھم قال الذی ما انا علیہ و اصحابی"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ طریقہ مرضیہ وہی طریقہ ہے جو صحابہ کرام کا ہے، پس کلام کو بغیر صارف قطعی کے مصروف عن الظاہر اور غیر محتمل التاویل کو تاویل .... کرنا، جرأت ہی نہیں بلکہ توجیہ الکلام بمالا یرضی بہ قائلہ کا مصداق ہے، اگر کچھ شک ہو تو اس آیت کی تلاوت فرمالیجیے:۔ هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ، فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ، رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً۔

اس سے بھی قطع نظر کیجیے، تیسری بات بھی بداہت کے درجہ پر ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے جس طور پر ہر شخص کی صورت و شکل مختلف ہیں اسی طور پر ہر ایک کا مزاج مختلف ہے، اور سب کی عقلیں یکساں نہیں ہیں کوئی بلید الذہن ہے اور کوئی ذکی الطبع، اور ان صفتوں میں بھی درجات متفاوت ہیں، بعضہا فوق بعض، اسکے ثبوت کے واسطے زیادہ غور کی ضرورت نہیں ہے ہر شخص بے وقوفی اور ہوشمندی کے تمائز کو خوب سمجھتا ہے۔ مثلاً آپ ہی ہیں کہ میرے زعم میں ہزار دو ہزار میں دقیق النظر وحدید البصر ہیں، ایسی حالت میں اگر احکام و شرع الٰہیہ میں غور و فکر جائز رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی رائے کے موافق رائے زنی کریگا اور اس میں ہر رائے زن کی رائے صواب پر نہیں ہو سکتی، اسی واسطے جناب شاہ ولی اللہ صاحب کا یہ قول بہت صحیح ہے کہ الٰہیات میں گفتگو کرنے کی اجازت بڑی خطرناک ہے، بہر حال قانونِ شریعت کی پابندی کے سوا کوئی راہ منزل مقصود تک نہیں پہونچا سکتی اور جو شخص اس کے سوا اور راہ موصل الی اللہ سمجھے وہ الٰہیات سے بالکل بیگانہ ہے ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ می روی بہ ترکستان است

یہ مقدمات جو میں نے ذکر کیے ہیں، وہ مقدمات ہیں جن کے تسلیم کرنے میں عقل کچھ پس وپیش نہیں کرتی اور چونکہ فی زعمی آپ بہت دانشمند ہیں اس واسطے ضرور ہے کہ آپ بھی ان کو تسلیم کریں گے گویا یہ مقدمات مسلمۃ الفریقین ہیں، لہٰذا ان کو میں لطفِ تحریک کی تحویل میں دیکر مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ آپ نے اس وقت تک جتنی تاویلیں فرمائی ہیں وہ سب بمنزلہ توجیہ الکلام بما لا یرضی بہ قائلہ کے ہیں، خود ہی اگر آپ مقدمات مذکورہ کی مراعات سے ان میں غور فرمائیے تو آپ ہی کی نگاہ میں ہیچ دپوچ نظر آئیں گے، کسی قائل

کے سامنے ان کی اس سے زیادہ وقعت نہیں ہے جتنی اس جھوٹ کی ہے کہ جس کو شیریں بیانی اور لفاظی کا لباس پہنا دیا گیا ہے، مگر انجام کیا ہے وہی جو ظاہر ہے یعنی دروغ بے فروغ، اَلصِّدْقُ یُنْجِی وَالْکِذْبُ یُهْلِكُ۔ مخالف کو جواب دینا اور خدا اور رسولِ خدا کے دشمنوں کی زبان بند کرنا کتنا ہی مقصود ہو لیکن جب توجیہ الکلام بِمَا لَا یَرْضٰی بِهٖ قَائِلُهٗ ہے تو بالکل بے سود، نہ اس سے خدا خوش نہ رسولِ خدا راضی، نہ جن پر سے وہ الزام اٹھائے گئے ہیں وہ شکر گزار۔

خدارا مشکوٰۃِ نبوت سے روشنی حاصل کیجئے، یورپ کی لالٹینوں کی دھندلی اور نکمی روشنی ایسے خطرناک راستے میں کام نہیں دے سکتی آپ تو خاندانِ نبوت میں منسلک ہیں، اگر آپ اپنی طبیعت ایک لحظہ بھر کے واسطے ماذمن کے خیالات سے فارغ کر کے غور کیجیے گا تو آپ پر یقیناً حق بات پوشیدہ نہیں رہے گی، قاعدہ کی بات ہے کہ آدمی کو جو دھن بندھ جاتی ہے اسی کو حق سمجھنے لگتا ہے فلسفی کا یہ قول غلط نہیں ہے، اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ فلاسفۂ ہند کا قول ہے اور بہت صحیح ہے کہ "انسان کو جس بات کی دھن بندھ جاتی ہے اس کی عکسی تصویر اس کے خانۂ خیال میں ایسی متمثل ہو جاتی ہے کہ وہ اسی کو نفس الامر سمجھنے لگتا ہے۔" آپ خود جانتے ہیں مگر افسوس غفلت میں ہیں، زندگی کا مدار علیہ شاید آپ نے یہیں کی بے ہودہ سرائے کو سمجھ لیا ہے، مگر یہ بہت بڑی غلطی ہے، یہی غفلت انجام کار انسان کو ہلاک کر دیتی ہو۔ یہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں کاش آپ اپنے مذہبی عقاید کو صحیح کر کے کرتے تو دنیا میں اس سے زیادہ آپ کو نیکنامی حاصل ہوتی اور آخرت میں اپنے سلفِ صالحین کے ساتھ ہوتے مگر میں ڈرتا ہوں کہ اس بہت بڑی غلطی سے آپ نے اخروی توقعات کو خیر باد کہی اور دنیاوی زیب و زینت کو رفیقِ طریق سمجھنے لگے جس کا انجام خدا نخواستہ وہی ہوتا ہے جو خدا نے کہا ہے "قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا"

فرمائیے تو سہی فوز و فلاح کی کیا امید ہے۔ حقیقت کو چھوڑ کر مجاز پر عمل کرنا کیسی بری بات ہے۔

روزے کہ بارگاہِ حقیقت شود پذیر
شرمندہ رہ روے کہ عمل بر مجاز کرد

اس میں شک نہیں کہ کسب معاش اور خودداری کسی حد تک شرعاً محمود ہے، لیکن اس کو نہ بھولنا چاہیے کہ یہ سب وسائل ہیں اور مقصود خدا طلبی ہے۔ وسیلہ کو وسیلہ اور مقصود کو مقصود سمجھنا فرض و لازمۂ انسانیت ہے، اگر کوئی شخص وسیلے کو مقصود پر ترجیح دے تو سب وہی کہیں گے جو ایک دیرینہ سال تجربہ کار فاضل رفارمر کہہ گیا ہے ۔

بناشد دلِ آں فرد مایہ شاد
کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

دنیا اسی کا نام ہے کسبِ معاش کا نہیں، صحابۂ کرامؓ کو دیکھیے کہ کس قدر دولتمند تھے۔ حضرت عثمانؓ نے اسی دولت مندی کی بدولت "غنی" کا لقب حاصل کیا، اور حضرت زبیرؓ کا جب انتقال ہوا تو پانچ کروڑ دو ہزار کی دولت چھوڑ گئے۔ (دیکھو صحیح بخاری) اسی کے قریب قریب حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے چھوڑا، مگر یہ اکابر صحابہؓ دنیا دار نہ تھے جن کی مذمت خدا نے جا بجا اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمائی ہے، دنیا دار ہم ہیں جو دین کو ارزاں سمجھتے ہیں اور اسی کو قبلۂ ہمت بنائے ہوئے ہیں۔

"وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ"

سید صاحب! خاکستر اگرچہ نسب عالی دارد کہ آتش جوہر علویست مگر چوں در ذراتِ خود ہنرے نہ دارد با خاک برابر است، ان باتوں کو سرسری نگاہ سے نہ دیکھیے، خوب غور کر کے دیکھیے۔ پھر تنہائی میں دیکھیے اور دل کو تمام وسوسوں سے خالی کر کے دیکھیے، یہ باتیں ایسی ہیں کہ ان کو سن کر باخدا لوگوں کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں [illegible] دل کانپ اٹھتے ہیں، تو یہ اسلام

بڑی عزیز الوجود چیز ہے اور یہ سب نعمائے دنیاوی چند روزہ ہیں۔ آپ رئیسِ قوم ہیں تو اپنے خیالات کو درست کر کے قوم کے خیالات درست کیجئے۔ ہمارے حضرت کی حدیث ہے (روحی فداہ) کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ۔
آپ کے تابعین اور تبع تابعین کا مواخذہ بھی آپ ہی سے ہوگا' میرا دل نہیں چاہتا کہ ابھی قلم روکوں' مگر چونکہ زیادہ سمع خراشی کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس پر کفایت کرتا ہوں آپ یہ خیال نہ فرمائیے گا ایک سن رسیدہ شخص کو دوسرا حدیث السن رہنمائی کر رہا ہے' بلکہ خود ان باتوں کو نظرِ غور سے دیکھیے اور خیال فرمائیے کہ آپ سن رسیدہ ہیں آپ کو ان باتوں کے سننے کی زیادہ ضرورت ہے۔ اب زیادہ آخرت کی فکر کیجیے اور اعلان کے ساتھ اپنے خیالات سے رجوع فرمائیے تاکہ گمشدگانِ وادیٔ آخرت راہ پر آئیں' کیا خوب ہو کہ اس کے بعد میں سنوں کہ ہمارا نیک نیت اور پاک نفس سیّد اپنے سلفِ کرام کا ہم خیال ہو گیا ہے اور اپنی قوم کے واسطے داعی الی اللہ کا کام کر رہا ہے' یہ آپ کا نیاز مند آپ کے واسطے نہایت سچے دل سے دعا کرتا ہے اور ان لوگوں میں نہیں ہے جو کافر و فاسق کہہ کر نرم دل کو بھی گرم کر دیتے ہیں۔ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفَاتِحِیْنَ۔

میں ہوں آپ کا سچا خیرخواہ
سید عبد الحئی رائے بریلوی
۳۰ جنوری ۱۸۹۴ء
از بھوپال

صِراطِ مُستقیم

از حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی

(آخری قسط)

اپنی اصلاح پر نظر اور دوسروں کے عیوب سے درگزر

ایک اور بات ضروری تحریر میں آنا مناسب اور اہم ترین ہے جو تمام باتوں کی جان ہے اور نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو کچھ اس تحریر میں آیا اور سعادت خداوندی سے آئے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ وہ صرف اس لیے ہے کہ اپنی اصلاح اور اپنے عیوب کی تلاش اور اپنی کوتاہیوں کی تلافی اس سے مقصود ہے۔ یہ بات ہرگز نہیں کہ ان امور کے ذریعہ سے دوسروں کے عیوب تلاش کیے جائیں اور اور اگر کسی میں کوئی کوتاہی یا نقص پایا جائے تو اس کا ذکر دوسری جگہ کیا جائے یا اس کا عیب مجلسوں میں یا تنہائی میں کسی سے ظاہر کیا جائے یہ بدترین عیوب اور قبیح ترین گناہوں میں سے ہے اور بلند لوگوں کو پستی میں پہنچانے والی چیز ہے۔ اگر کسی میں کوئی کوتاہی یا نقص یا کوئی کمی معلوم ہو یا دکھائی

دے یا سننے میں آئے تو اس کو فوراً نظر انداز کر دو اور دعا میں مشغول ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ اس کی یہ کوتاہی دور فرما کر اس کو صراط مستقیم کی رہبری فرمائے۔

بہت سے حضرات ایسے بھی ملیں گے جن میں سراپا کوتاہیاں نمایاں ہوں گی مگر یقین سے سمجھیے کہ ان میں کوئی خوبی ایسی ہوگی جو آپ کی نظروں سے پوشیدہ ہوگی اور وہ خوبی شاید ان تمام برائیوں کو مٹانے اور ختم کرنے والی ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ "اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ" اور ہو سکتا ہے کہ ان کو یہ درجہ حاصل ہو۔ فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ اسے مکرر لکھتا ہوں کہ جن کو سب اچھا کہتے اور اچھی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کا اچھا ذکر کرتے ہیں اگر ان میں اندرونی کوئی کوتاہی یا نقص وعیب تم کو معلوم ہو جائے تو اس کو منھ پر لانا تو درکنار خیال سے بھی دور کر دینا اور دعا میں مشغول ہو جانا کہ اللہ تعالیٰ یہ کوتاہیاں ہمارے برادر دینی کی دور فرما کر ان کو کمال اور بہتری پر پہنچا دے۔ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (حشر رکوع ۱)

(ترجمہ:- اور نہ ڈال ہمارے دل میں کینہ اور حسد مومنوں کے لیے اے ہمارے رب بے شک آپ رؤف ورحیم ہیں)

روز وشب اپنے اعمال کا جائزہ لینا اور ان پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ دن گزرے تو شب میں یہ غور کر لیا جائے کہ آج کیا کام ہوئے اور ان میں کون سا کام اللہ کی رضامندی اور قرب حاصل کرنے کا ہوا اور کون سا کام غفلت اور دوری کا ہوا تاکہ استغفار سے اس کی تلافی میں مشغول ہو کر آئندہ کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ اسی طرح رات گزرنے پر دن میں بھی یہ غور کر لیا جائے کہ رات کیسی گزری تو انشاء اللہ کافی ہوگا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ يَدَهٗ بِاللَّيْلِ لِيَتُوْبَ مُسِيْءُ النَّهَارِ وَيَبْسُطُ يَدَهٗ بِالنَّهَارِ لِيَتُوْبَ مُسِيْءُ اللَّيْلِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا (الحدیث) (ترجمہ:- اللہ تعالیٰ قبولیت توبہ کے لیے اپنا ہاتھ رات کے وقت پھیلاتے ہیں تاکہ دن کا گنہگار توبہ کرے اور اسی طرح دن میں اپنا ہاتھ کشادہ فرماتے ہیں تاکہ رات کا گنہگار اپنی توبہ پیش کرے اور یہ عمل برابر جاری ہے۔ یہاں تک کہ سورج مغرب سے نکلے یعنی باب توبہ بند ہو)

باہمی مغائرت اسلام کے منافی ہے خصوصیتیں جو باہمی پیدا ہیں خواہ وہ رشتہ کے سبب سے ہوں یا مریدی کے سبب سے ہوں یا شاگردی کے سبب سے ہوں۔ ان خصوصیتوں میں ایسا مبالغہ کرنا جس سے دوسری کی اہانت کا کچھ شائبہ

پایا جائے بہت ہی ظلمت کا باعث ہے۔
یَا اَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسٰی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (حجرات رکوع ۲) (ترجمہ: اے ایمان والو نہ مذاق اڑائے تم میں سے کوئی قوم کسی دوسری قوم کا شاید کہ وہ بہتر ہوں ان سے اور نہ عورتیں (مذاق اڑائیں) دوسری عورتوں کا شاید کہ وہ بہتر ہوں ان سے۔ اور نہ عیب لگاؤ آپس میں اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام بھی برا ہے اور جو توبہ نہ کرے وہ ظالم ہے۔

تعریف اور خصوصیت اسی حد تک ہو کہ دوسرے طریقوں کی اور ملت اور جماعت کی اہانت نہ نکلے اس میں اکثر قدم تجاوز کر جاتے ہیں۔ ایک جماعت والے دوسری جماعت سے مغائرت اختیار کیے ہوئے ہیں اور ایک پیر کے مرید دوسرے پیر سے بیگانہ ہیں اور ایک خاندان والوں کی دوسرے خاندان والوں سے مغائرت ہے۔ یہ تعلیم قرآن پاک اور فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل خلاف ہے۔ اخوت اسلامی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جس دن لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس دن صرف تقوے کی دوستی باقی رہے گی۔ اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ۝ (زخرف رکوع ۷) (ترجمہ: دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے اہل تقویٰ کے)

بہتر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق ہم سب کو عطا فرمائے کہ اگر کوئی شخص ہمارا برائی سے ذکر کرتا ہو خواہ سامنے ہو یا پیچھے تو ہم اس کا ذکر برائی سے ہرگز نہ کریں بلکہ اس بات پر غور کریں کہ اگر ہم میں وہ برائی موجود ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یہ برائی ہم سے دور ہو جائے اور اگر اس نے غلط کہا ہے تو اللہ کا شکر بجالائیں کہ فضل ایزدی نے ہم کو اس برائی سے پاک رکھا ہے۔

نیک باشی و بدت گویند خلق   بہ کہ بد باشی و نیکت گویند

ترجمہ: اگر تو نیک ہے اور مخلوق تجھ کو برا کہتی ہے تو خیر ایہ بہتر ہے اس بات سے کہ تو برا ہو اور لوگ تجھ کو اچھا کہیں۔

انھیں باتوں سے انشاء اللہ تزکیہ باطن حاصل ہو کر فیضان برکات قرآن پاک سے مستفیض ہونے کا موقع اور توفیق حاصل ہو گی۔ یہ بیان کردہ تمام امور متقدمین حضرات کی خوشہ چینی ہے، جن کو ان حضرات نے بہت اچھی

طرح واضح فرمایا ہے۔ یہاں صرف اعادہ کیا جا رہا ہے اور غفلت اور سہو کو دور کیا جا رہا ہے تاکہ بھولی ہوئی باتیں یاد آ جائیں۔ اس پر جو آیات شریفہ اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤید ہوتی ہوں وہ تلاش کر لی جائیں۔ طوالت تحریر کی وجہ سے ان سب کو لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ موجودہ زمانہ میں جو بات بھی کوئی کہے گا سابقین ہی کی خوشہ چینی سے کہے گا۔ اس سے باہر نہیں جا سکتا۔

بزرگوں کی صحبت سے خوش نظری پیدا ہوتی ہے

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ممتاز مخلص مرید مجھ سے ارشاد فرمانے لگے کہ جب سے حضرت صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اس وقت سے جس کے پاس جاتا ہوں میری نظر میں کوئی کوتاہی نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بہت بڑی کوتاہی اور قباحت اور بہت بڑا سقم آپ میں پیدا ہو گیا۔ اس کو بہت جلد دور فرمائیے۔ بزرگوں کی صحبت سے تو نظر ایسی وسیع ہو جاتی ہے کہ برے لوگوں کے اندر بھی بھلائیاں نظر آنے لگتی ہیں اور ناقص اور کوتاہ لوگوں میں سے بھی کوئی نہ کوئی خوبی اخذ کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے بزرگوں کی صحبت کا تو یہی اثر ہوتا ہے کہ

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

ترجمہ:۔ ہوشیار آدمی کی نظر میں درختوں کے ہرے پتوں میں ہر ایک پتا خدا کی معرفت کا دفتر ہے۔ اللہ کے مقبولوں کو جھاڑ دل جڑی بوٹیوں اور بجا نوروں سے بھی معرفت حاصل ہوئی ہے

اور آپ کی نظر اتنی کوتاہ ہو گئی کہ "نظر میں کوئی سوا تاہی نہیں" اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ آپ اپنی اس نظر کو بدل دیجئے اور یہ یاد رکھیے کہ اچھے اور برے کے معلوم ہونے کا تو وہ موقع ہے جس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ (عٰدیٰت) (ترجمہ: کیا انسان نہیں جانتا کہ جب وہ دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور وہ چیز حاصل کی جائے گی جو سینوں میں ہے"۔ اور يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ (شعراء رکوع ۵) وہ قیامت کا دن ایسا ہوگا جبکہ مال اور اولاد کچھ کام نہ دے گی ہاں مگر جو شخص خدا کے پاس قلب سلیم لائے گا وہ کامیاب ہوگا۔

ایک شخص نہایت ہی بری حالت میں دکھائی دیتا ہے اور مرنے سے کچھ پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا حال بدل دیتے ہیں اور وہ اچھوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص اچھا دکھائی دیتا ہے مگر آخرت میں العیاذ باللہ وہ اچھائی اس کو کام نہیں دیتی۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْم

ترجمہ:۔ اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے ۔ اس لیے برائی کا اطلاق کسی پر نہ کرنا چاہیے اور بری نظر سے نہ دیکھنا چاہیے .... اور اس کے عیب کو دماغ میں کبھی جگہ نہ دینی چاہیے، یہ بہتری اور ترقی کی چیز ہے، یہ بات مشکل نہیں اس پر عمل آسان ہے۔ حسن ظن ترقی کا زینہ ہے۔ جب سے انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ اسی وقت سے اس کی خوبیاں اور برکتیں محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہیں، تمام عبادتوں کی یہ جان ہے اس لیے کہ کپڑا اگر دھو لیا جائے تو ہر رنگ اس پر اچھی طرح سے چڑھ سکتا ہے۔ برے خیالات سے اپنے دماغ کو محفوظ رکھ لینا کپڑے کا دھونا ہے اب اس پر ہر عبادت کا رنگ اور اثر اچھی طرح قائم ہونے کا امکان ہے، یہ معمولی باتیں ہر مسلمان کی جانی اور سمجھی ہوئی ہیں۔ اب ان کے ذکر اور چرچے کم ہو جانے سے ظلمات نے بڑھ کر عبادتوں کے اثرات کو کم کر دیا ہے۔ بہت مقدس اور طبقہ لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ فلاں شخص فلاں حالت میں گرفتار ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ ان کو سب کچھ معلوم ہے مگر وہی قوت دافعہ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، ضعیف ہے اس لیے قبائح کے دور کرنے سے مجبور ہو گئے ہیں اگر غور و فکر کریں تو اس کا دفع کرنا بہت آسان ہے۔ گو یہ بات بظاہر معمولی معلوم ہوتی ہے مگر خوبی اس کی بہت بڑی ہے۔

دنیا میں آخرت کا مشاہدہ

اب اس کے بعد شیخ سالک راہ کو جو کچھ تعلیم فرمائیں گے اس پر عمل کرنا آسان ہوگا اور اس کے برکات انشاء اللہ اچھی طرح سے ظاہر ہوں گے اور قرآن پاک میں بھی انہا کے پیدا ہو کر یقین کا زیادہ زمانہ بڑھتا جائے گا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ (انفال، رکوع ۱) ترجمہ:۔ بے شک ایمان والے وہی لوگ ہیں کہ جب خدا کا ذکر ان کے سامنے ہوتا ہے تو دل دہل جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ایمان میں ہر روز ترقی ہے آج کے ایمان سے کل کا ایمان بلند ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ دنیا اور دنیا کے اسباب اور ذخائر حقیر اور کمزور بے ثبات معلوم ہونے لگتے ہیں اور اخروی مدارج اور منازل کا مشاہدہ عملی شروع ہو جاتا ہے اور دنیا کی ہر چیز میں آخرت نظر آنا شروع ہو جاتی ہے اور بھروسہ اللہ پر کامل ہو جاتا ہے۔ دنیا سے اطمینان اور اشتیاق میں اٹھنے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔

بزرگان دین متقدمین نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ سینہ کی اسی صفائی کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے لیے ہے پھر اس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ خواہشات نفسی کو پورا کرنے میں ہم جس طرح حریص رہتے ہیں اسی طرح ان فرائض کے ادا کرنے میں حریص ہو جاتے ہیں جن کو تکلیفات شرعیہ کہا جاتا ہے۔ اب اس کے بعد جو بھی طریقہ اللہ تبارک و تعالیٰ نصیب فرمائیں شیخ کامل و مکمل کی رہبری سے وہ مفید اور کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

موجود اور معدوم یہ بات بھی خوب یاد رکھنا چاہیے کہ صحبت کے اثرات ضرور ہوتے ہیں اَلصُّحْبَۃُ تَاثِیْرٌ وَّ لَوْ کَانَ بِالسَّاعَۃِ کسی بھی قسم کے بیج یا انڈے کو یا گیہوں کو چولہے کے پیچھے تھوڑی دیر رکھ دیجیے پھر دنیا کے بڑے سے بڑے فلسوف کو بتا دو کہ ان گیہوؤں اور انڈوں میں جو چولہے پیچھے رکھے گئے اور ان میں جو چولہے کے پیچھے نہیں رکھے گئے بظاہر کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا لیکن چولہے کے پیچھے تھوڑی دیر رکھے ہوئے گیہوں اُگ نہیں سکتے اور انڈوں میں سے بچے نہیں ہو سکتے۔ معلوم ہوا کہ کوئی جوہر لطیف ہے جو نظر نہیں آتا اور وہ آگ کی معمولی سی صحبت سے زائل ہو جاتا ہے۔ اسی کو روح کہتے ہیں۔ اللہ کے اس فرمان سے تصدیق ہو کر یہ معلوم ہو گیا کہ ایک شے جو بظاہر موجود ہے حقیقت میں معدوم ہے۔ ایک ہی وقت میں دونوں حالتیں ثابت ہیں موجود اور معدوم۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ ۞ (اعراف۔ رکوع ۲۲) ترجمہ ان کے دل تو ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں اور کان بھی ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ درحقیقت وہی غافل ہیں۔) اسی طرح انسان کا بھی یہ حال ہوا اس سے ثابت ہو گیا کہ اچھی صحبت کا اچھا اثر اور بری صحبت کا برا اثر اس پر لازمی امر ہے۔ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ہر دن میں ستر بار استغفار پڑھتا ہوں۔ جب تم لوگوں کی کثافت مجھ سے دور ہوتی ہے۔ جب اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اثر پڑتا تھا تو دوسروں پر اثر پڑنا لازمی ہوا۔

ربڑ کے کارخانہ میں بدبو کا اثر اور عطر کے کارخانہ میں خوشبو کا اثر محسوس ہونا لازمی امر ہے ہمارے احباب اگر اس کو مدنظر رکھیں گے تو اس بات سے بہت سے فائدے حاصل ہونے کی

امید ہے بے ساختگی بے خودی میں بہت کچھ لکھ دیا جو ارادہ نہ تھا مگر تقاضائے طبیعت یہ ہو رہا ہے کہ کچھ اور بھی مختصر طریقہ پر ادا کروں، وہ یہ کہ ہماری بہت بڑی بڑی ہستیاں جو قرآن پاک کی دن رات تلاوت فرماتی ہیں اور وہ حضرات احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم رات دن پڑھتے اور پڑھاتے رہتے ہیں ان کی زبان مبارک سے ایسے کلمات سنے جن کی صاف اور صریح ممانعت قرآن پاک میں مختلف طریقوں سے موجود ہے۔ اس سے یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں ہم اور ہمارے احباب بھی خدانخواستہ غافل ہو کر اپنے اعمال برباد نہ کر لیں۔ ان حضرات کی تو اتنی نیکیاں ہوں گی انشاءاللہ کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ اور شاید ان کو یہ درجہ حاصل ہو فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ مگر ہم قلیل البضاعت، سرمایۂ عمل سے خالی ہیں اگر ایسے کلمات اور ایسے خیالات رکھیں گے تو بہت نقصان کا باعث ہوگا۔ اس لیے ان امور پر توجہ ڈالنا اور ادھر خیال کرنا اہم ضروریات میں سے ہے۔ لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ (مائدہ ۷ رکوع ۲) ترجمہ:۔ بری بات کو زور سے کہنا اللہ پسند نہیں کرتا مگر اس شخص کے لیے جو مظلوم ہے۔

یہ آیت مبارک ہمیں منع کر رہی ہے اور روک رہی ہے کسی کی برائی ظاہر کرنے سے، سوائے مظلومیت کی حالت کے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے عیوب اور لغزشیں ہم محفلوں میں بیان کریں اور تحریروں میں لا کر اپنے اعمال اور برکات کو ضائع کر دیں۔ مثالات خود غور فرمالیں۔ اوپر تحریر کردہ ارشاد باری تعالیٰ مکرر لکھتا ہوں کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ (حجرات رکوع ۲) ترجمہ:۔ اے ایمان والو نہ مذاق اڑائے تم میں سے کوئی قوم کسی دوسری قوم کا شاید کہ وہ بہتر ہوں ان سے۔ اور نہ عورتیں مذاق اڑائیں دوسری عورتوں کا شاید کہ وہ بہتر ہوں ان سے اور نہ عیب لگاؤ آپس میں اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام بھی برا ہے اور جو توبہ نہ کرے وہ ظالم ہے۔ اے ایمان والو بچو بہت سے گمانوں سے کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور تجسس مت کیا کرو۔ اور نہ آپس میں ایک دوسرے کی غیبت کیا

کرو۔ کیا اس بات کو تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو پس ڈرو اللہ سے بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اگر کسی سے کوئی لغزش قول، فعل یا تحریر میں ہوئی ہے تو اس کو وہیں رفع دفع کر دینا چاہیے اور اگر ہو سکے تو با حسن وجوہ اس کو آگاہ کر دیں ورنہ سکوت اختیار کرنا بہتر ہے۔ دل اور دماغ میں اس کو جگہ نہ دینا چاہیے اور دعا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان سے برائی کو دور فرمائے۔ اخوتِ اسلامی کا رشتہ کسی بھی حالت میں اور کسی بھی موقع پر ہاتھ سے جانے نہ دو۔ (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (حجرات رکوع ۱) ترجمہ:۔ بے شک مسلمان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کیا کرو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

ہر کلمہ گو کو اپنا بھائی سمجھنا چاہیے اور اس کی برائی کو اپنی برائی خیال کرنا چاہیے۔ عیبوں کی تلاش اور تجسس کرنا تو بہت ہی زیادہ بری بات ہے۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِہْتُمُوْہُ ۝ (حجرات رکوع ۲) ترجمہ:۔ اور تجسس مت کیا کرو اور نہ آپس میں ایک دوسرے کی غیبت کیا کرو کیا اس بات کو تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ اس کو تم ناگوار سمجھتے ہو۔

یہ بہت بری بات ہے اور اس سے ہمارے ظاہر و باطن کو نقصان پہنچے گا۔

اگر کسی مسئلہ میں اختلاف پڑے اور ایک جانب سراسر غلطی ہو تو اس کو ایسے بہتر طریقہ پر ظاہر کریں کہ مخاطب کی اس سے دل آزاری نہ ہو بلکہ اصلاح ہو اور مناسب الفاظ میں تردید ہو سکتی ہے مثلاً یوں تحریر میں آسکتا ہے کہ ہماری کوتاہ معلومات اور ناقص علم کی رسائی اس مسئلہ کو اس طریقہ پر سمجھی ہے اگر اس تحریر میں کوئی سقم ہو تو مخاطبین دور کریں ایسا نہ ہو کہ بہت جلد کفر کے فتوے ہونے لگیں اور الزامات بے جا مقابلہ میں لاکر منافرت جانبین کا سبب بن جائے۔ ہر طریقہ پر باہمی الفت کو مستحکم بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑ لو اور پراگندہ نہ ہو۔ اس فرمان خداوندی پر ہم کو ہر وقت اور ہر عمل میں پابند رہنا ضروری ہے۔ ان امور سے انشاء اللہ ظاہر کی درستی کے علاوہ باطن کی بھی اصلاح ہوگی۔

بذل نفس اور بذل نفیس | پھر اس ارشاد مبارک پر عمل کرنا بھی موجب فوائد کثیرہ اور ترقی درجات

کا سبب ہوگا کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ ترجمہ: تم اُس وقت تک ہرگز بھلائی پر نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیزیں خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ اب اس پر غور فرما لیجئے کہ کیا کیا چیز ہم کو مرغوب اور محبوب ہیں جس طرح مال و اسباب نقد و جنس وغیرہ ہم کو مرغوب و محبوب ہیں۔ اسی طرح جوانی تندرستی اور اعضائے ظاہری و باطنی ہم کو بہت زیادہ عزیز اور مرغوب ہیں۔

اللہ جل شانہ کے پاس قرب اختیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو اللہ کی رضا و رغبت میں صرف کرنے کی امکانی کوشش کی جائے۔ اپنے وابستہ اور گھر والوں کو بھی اس طرف ترغیب و تحریص دلانا لازم ہے کہ شعور اور تمیز پیدا ہوتے ہی تمہاری یہ کوشش ہونا چاہیے کہ تم اپنے اعضائے ظاہری اور باطنی کو اللہ کی رضا اور رغبت میں مصروف کر کے اپنی بہبودی و نجات اور فلاح حال و مستقبل حاصل کرو کہ تاکہ درجات حاصل ہوں جس کے لیے اللہ نے تمہاری تخلیق فرمائی ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔ ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔ اوائل عمری اور ابتدائے شعور میں جو چیزیں ذہن نشین ہو جاتی ہیں اور جن چیزوں کا عادی اور عامل ہو جاتا ہے۔ آئندہ انھیں سے ثمرات اور برکات حاصل ہونا ممکن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خواہش نفسانی اور حصول فانی میں یہ دولت لازوال صرف ہو کر آئندہ خسارہ اور نقصان سے دوچار ہونا پڑے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں نتائج میں جا کر بڑے بڑے نقصان اور خسارہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ اذہان خیالات اور جذبات کو جس طرف لے جائیں یا وہ خود جس طرف راہ لے لیں وہ اسی رنگ اور اسی کیفیت میں متکیف ہو جاتے ہیں جس طرف ان کو راستہ ملتا ہے۔ پھر ان راہوں سے ہٹانا یا ان کیفیتوں سے متبدل کرنا دشوار ہوتا ہے جس کے یہ خوگر ہو چکے ہیں۔ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ہم نے انسان کے لیے دونوں راہوں کو واضح کر دیا ہے۔ پس مناسب یہ ہے کہ اول ہی سے ان کو صحیح اور درست راہوں پر چلایا جائے اور نامناسب اور نقصان دہ راستوں سے بچایا جائے تو ان کی حفاظت کرنا آسان ہے۔ اس لیے بہترین شکل یہی ہے کہ قرآن پاک کے نصائح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور ارشادات غور و فکر سے دیکھ کر ان کو اپنا لائحہ عمل بنایا جائے اور جو سقم اور کوتاہی تلاش و تجسس سے ملتی جائے اس کو رفتہ رفتہ دور کرنے کی فکر کی جائے تاکہ فلاح اور بہبودی کی راہیں آسانی سے کھل جائیں۔

یہ مختصر تحریر (جس کو مفید سمجھا گیا) لکھ دی اور باقی تمام باتیں صحبت پر موقوف ہیں جن کا تحریر

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

ایک دینی مدرسہ کے طلبہ کے سامنے

وداعی تقریر

(اعظم گڑھ میں "جامعۃ الرشاد" ایک دینی مدرسہ ہے جو اب سے چند ہی سال پہلے قائم ہوا ہے، اُس کے ناظم و سربراہ ہمارے عزیز دوست مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی ہیں۔ غالباً وہی اُس کے بانی بھی ہیں۔ اُن کو اپنے اس مدرسہ کے ساتھ اُس طرح کا شغف ہے جیسا کبھی ہمارے قدیم بزرگوں کو ہوا کرتا تھا —— ذیل میں ان کی ایک تقریر درج کی جا رہی ہے جو موصوف نے "جامعۃ الرشاد" کے گزشتہ تعلیمی سال کے اختتام پر طلبا کو رخصت کرتے وقت اُن کے سامنے کی تھی —— یہ تقریر اس کی مستحق ہے کہ ہمارے مدارس دینیہ کے طلبا بلکہ حضرات اساتذہ بھی اس کو پڑھیں۔ —— اسی لیے اور اسی امید پر اس کو الفرقان میں شائع کیا جا رہا ہے)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ —— اَمَّا بَعْدُ

عزیز طلبہ! جہاں مدرسہ کی اور بہت سی روایات ہیں ان میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ سالانہ امتحانات کے بعد طلبہ کے گھر روانہ ہونے سے پہلے ایک استاذ یا مدرسہ کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے میں کچھ باتیں اپنے عزیز طلبہ سے کرتا ہوں۔ ان باتوں کی ضرورت اس لیے بھی ہوتی ہے کہ آپ لوگوں میں بہت سے طلبہ ممکن ہے آئندہ سال نہ آسکیں یا فارغ ہو کر زندگی کے دوسرے کاموں میں لگ جانے والے ہوں تو ان سے کچھ آخری اور الوداعی باتیں کرلینی ضروری

معلوم ہوتی ہیں اور یہ اس لحاظ سے بھی ضروری ہیں کہ جو طلبہ آنے والے ہیں وہ بھی ڈیڑھ مہینے تک مدرسہ کی اس تعلیمی فضا سے دور رہیں گے اس لیے ان کے کانوں میں ان باتوں کا ڈال دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے وطن اور گھر پہنچ کر وہاں کے ماحول اور وہاں کی عوامی زندگی میں بالکل کھو نہ جائیں بلکہ وہاں وہ اپنی مدرسی زندگی کی خوبیوں اور اس کے اثرات کا کچھ نہ کچھ مظاہرہ کر سکیں۔ پرانے طلبہ کے لیے ان میں شاید کوئی نئی بات نہ ہو مگر ان باتوں کی حیثیت گھر کے اس بڑے بوڑھے کی نصیحت کی ہے جو اپنے بچوں یا چھوٹوں کو کسی سفر پر روانہ کرتے وقت کرتا ہے اس میں بعض ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو غایت احتیاط میں وہ کہتا ہے ــــــ خواہ وہ پیش آئیں یا نہ آئیں یا ان باتوں کی احتیاط عموماً ہر آدمی کرتا ہی ہو، مگر اس کی محبت اور تعلق کا تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ ان باتوں کو ان کے گوش گذار کر دے انھیں بار بار کہنے سے بھی دریغ نہ کرے!

عزیز طلبہ! سب سے پہلے تو مجھے آپ سے معذرت کرنی بلکہ معافی مانگنی ہے کہ اگر دس ماہ کے درمیان آپ کو ہمارے کسی طرزِ عمل سے تکلیف پہونچی ہو یا آپ کی کسی غلطی یا کوتاہی پر ضرورت سے زائد تنبیہ و سزا کر دی گئی ہو یا ہم سے کسی اور طرح کی زیادتی ہو گئی ہو تو آپ خلوصِ دل سے معاف کر دیں، اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہم نے اپنی حد تک آپ کی تعلیم و تربیت کا اور آپ کے قیام و طعام کا بہتر سے بہتر انتظام کرنے کی کوشش کی مگر اس کے باوجود ہم کو احساس ہے کہ تعلیم و تربیت میں نہ سہی مگر بے سر و سامانی کی وجہ سے آپ کو کھانے پینے اور رہنے سہنے کی کچھ تکلیف ضرور ہوئی ہوگی اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس تکلیف کو اپنے گھر کی یا ایک بلند مقصد کے راہ کی تکلیف تصوّر کریں گے۔ گھر میں تمام آسائشوں اور راحتوں کے باوجود بسا اوقات آدمی کو کبھی نہ کبھی تکلیف بھی ہو جاتی ہے لیکن اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا اور اسے آدمی بھول جاتا ہے اسی طرح جو قافلہ کسی منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے وہ راستہ کی پریشانیوں کو خاطر میں نہیں لاتا اور ہمیشہ یاد نہیں رکھتا۔ آپ بھی اس مدرسہ کی تکلیف کو گھر کی اور مقصد کے راہ کی عارضی تکلیف سمجھ کر بھول جائیں اور اس کو یاد نہ رکھیں، گھر اور مقصد کے راہ کی کوئی تکلیف اگر یاد بھی رہتی ہے تو اس کا ذکر وہ دوسروں سے برے

انداز میں نہیں بلکہ ایک خاص فخر و ترغیب کے انداز میں کرتا ہے ۔ ۔ ۔ میں اس وقت اسلاف کے واقعات نقل کر کے آپ کا بہت سا وقت لینا نہیں چاہتا اس لیے کہ اس سے آپ خود بھی کچھ نہ کچھ واقف ہیں۔

عزیزو! آج آپ لوگ ہم سے ڈیڑھ ماہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں اور ممکن ہے کچھ لوگ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہوں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ آپ کی یہ جدائی ہمارے لیے بڑی آزمائش ہے اور ہمارا دل اس پر بہت مضطرب ہے۔ آزمائش اس لیے ہے کہ ہماری آنکھیں دس مہینے سے یا یوں کہیے کہ کئی برس سے چوبیس گھنٹہ آپ کو دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں، دماغ آپ ہی کی فلاح و بہبود کی فکر میں لگا رہتا تھا اور ہمارے جسم کی ہر حرکت آپ کے آرام و آسائش کے لیے وقف تھی۔ آپ ہمارے قلب و روح کا سکون اور آنکھوں کا نور بن گئے تھے۔ اب یکایک یہ بسی بسائی بستی کچھ دنوں کے لیے اُجڑ جائے گی اور آنکھیں آپ کو ایک مدت تک نہ دیکھ سکیں گی۔ زبان پر آپ میں سے کتنوں کے نام آئیں گے لیکن آپ کو نہ پا کر زبان ہی تک آ کر رہ جائیں گے۔

عزیزو! کاش تم بھی ہمارے دل و دماغ کی اس کیفیت کو محسوس کرتے اور اپنے دل و دماغ میں اس اضطراب کی کچھ چبھن اور کسک لے کر وطن جاتے اور جب تک رہتے اس کو محسوس کرتے رہتے تو ہمارے قلب کو اس سے سکون ملتا۔

پیارے طلبہ! تمہارا سالانہ امتحان ختم ہو گیا اور جلد ہی اس کے نتائج تمہارے سامنے آ جائیں گے۔ جن لوگوں نے دس ماہ کی اس مدت کو جتنی ذمہ داری کے ساتھ گزارا ہوگا انھیں ویسے ہی نتیجہ کی اُمید رکھنی چاہیے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کوئی طالب علم نو ماہ غافل رہا ہو اور اپنی ذہانت و طباعی سے اور امتحان میں کامیابی کے خاص گر معلوم کر کے ایک ہی ماہ کی محنت اور مطالعہ سے زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرے اور امتحان میں کامیاب ہو جائے مگر صرف اچھے نمبر حاصل کر لینا تعلیم کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ اصل حاصل تو وہ ہے جس کا نتیجہ آئندہ زندگی میں بر آمد ہو۔ ہمیشہ وہی طلبہ اپنی آئندہ زندگی میں کامیاب ہوئے ہیں جو محنت و شوق لگن اور ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مستقل طور سے لگے رہتے ہیں۔ ذہانت اور وقتی تیاری عارضی طور پر کتنی ہی نتیجہ خیز ہو لیکن آپ کو یاد

رکھنا چاہیے کہ وہ محنت اور شوق کا بدل ہرگز نہیں ہوسکتی ـــــ مولانا شبلی کے جانشین اور لائق شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ناظم دار المصنفین کا نام نامی آپ نے اردو کتابوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں ضرور پڑھا اور سنا ہوگا۔ وہ اپنی اسی محنت، لگن، اور شوق کی بدولت اس مرتبہ تک پہنچے تھے اور دنیا میں اپنا نام کر گئے اور ان کے بہت سے ذہین ساتھی محنت و شوق کی کمی کی وجہ سے ان سے پیچھے رہ گئے۔

عزیزو! آپ نے اس وقت جو امتحان دیا ہے وہ در حقیقت اپنے علم یعنی اپنی درسی کتابوں کا دیا ہے اور اسی کے نتائج آپ کے سامنے آئیں گے مگر آپ کو یہاں نصابی کتابوں کی تعلیم و تدریس کے ساتھ کچھ اعمال اور اخلاق بھی سکھائے گئے اور تعلیم کے ساتھ آپ کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی کی گئی ہے اور اس کا امتحان ابھی نہیں ہو سکا ہے۔ اس کے اصل امتحان کا وقت تو قبر میں اور قبر سے اٹھنے کے بعد میدان حشر میں ہوگا جیسا آپ کا نامۂ اعمال ہوگا ویسا اس کا نتیجہ آپ کے سامنے آئے گا مگر عارضی طور پر اس کا امتحان اسی ماحول میں بھی ہوگا جہاں آپ محاسن اخلاق کی اس تربیت گاہ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ جب آپ گھر اور وطن کے ماحول میں جائیں گے اور گھر کی زندگی میں داخل ہوں گے تو آپ کی بستی یا محلہ میں آپ کی تعلیم کا جائزہ لینے والے شاید ایک ہی دو آدمی ملیں گے لیکن آپ کے عمل کا، آپ کے اخلاق کا، آپ کے ادب و تہذیب اور آپ کے کردار کا اور آپ کی پوری عملی زندگی کا جائزہ نہ صرف آپ کے والدین، آپ کے بھائی بہن لیں گے بلکہ اس کا جائزہ آپ کے اعزہ و اقربا، آپ کے دوست و احباب اور خاندان کے علاوہ بستی کا ہر خرد و کلاں لے گا، جس سے آپ ملیں گے اور تعلقات رکھیں گے وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ آپ نے نحو و صرف، فقہ و حدیث اور ادب و انشاء میں کتنا درک پیدا کیا بلکہ ان کی نگاہیں تو آپ کی رفتار، گفتار، نشست و برخاست پر رہیں گی، وہ دیکھیں گے کہ آپ بڑوں سے کس طرح ملتے ہیں، چھوٹوں سے کس طرح پیش آتے ہیں، پاس پڑوس کے لوگوں سے آپ کا سلوک کیسا ہے۔ شادی و غم کے موقع پر آپ کا طرز عمل کیا ہے ان معاشرتی حدود سے بڑھ کر آپ کو وہ مسجدوں میں پنجوقتہ نمازوں کی صفوں میں وعظ و ارشاد کی مجلسوں میں تلاش کریں گے، غرض اپنے گھر اور اپنی بستی کے اس ماحول میں ڈیڑھ مہینے کی

مدت میں ہر ہر قدم پر آپ کو اپنے دین و اخلاق اور ادب و تہذیب کا امتحان دینا ہوگا' اگر آپ خدانخواستہ اس امتحان میں ناکام ہو گئے تو پھر مدرسہ کی دس ماہہ تعلیم کے امتحان میں آپ کی سو فیصدی کامیابی بھی آپ کے حسن و خوبی کی ضامن نہیں ہو سکتی' پھر اس پر یکھکل امتحان ...... میں لوگ نہ صرف آپ کو جانچیں گے اور پھر پرکھیں گے بلکہ وہ ہمارا اور آپ کی اس مادر علمی کا بھی جائزہ لیں گے جس کے آغوش شفقت میں رہ کر آپ نے اپنی زندگی کے دس ماہ یا کئی سال گزارے ہیں' اگر آپ نے اس پر یکھکل امتحان میں کامیابی حاصل کر لی تو آپ کے طفیل میں ہم بھی ان تمام لوگوں کی نگاہوں میں کامیاب سمجھے جائیں گے اور اگر خدانخواستہ آپ کامیاب نہ ہوئے اور لوگوں نے آپ میں وہ اچھے اعمال و اخلاق نہیں دیکھے جو دینی مدارس کے طلبہ میں ہونے چاہئیں تو وہ ہمارے اور آپ کی اس درس گاہ کے متعلق بھی اچھی رائے قائم نہیں کریں گے جس کے آغوش میں آپ اتنی مدت تک رہے یعنی آپ کے ساتھ مدرسہ کی تعلیم و تربیت پر بھی پانی پھر جائے گا' اگر ایسا ہوا تو آپ سوچیں کہ ہمارے لیے اور اس مدرسہ کے لیے جس کو ہم اتنی مشقتوں' محنتوں' جانفشانیوں کے ساتھ چلا رہے ہیں کتنا بڑا المیہ ہوگا اور وہ اس کے بارے میں کیسی کیسی بدگمانیوں میں مبتلا ہوں گے بلکہ ممکن ہے کہ تمام دینی مدارس کی طرف سے وہ بدگمان ہو جائیں' سوچیے کہ اس لحاظ سے اپنے سر آپ کتنی بڑی ذمہ داری لے کر جا رہے ہیں۔

عزیزو! یہاں ہم نے جو آپ کو زیادہ ٹیپ ٹاپ کی زندگی گزارنے اور وضع قطع میں زیادہ تراش و خراش پیدا کرنے سے بار بار منع کیا ہے تو اس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ کسی بڑے مقصد کے حصول کی راہ میں یہ چیزیں روڑہ ہوتی ہیں بلکہ اس کا ایک معاشرتی پہلو بھی ہے' عربی مدارس میں زیادہ تر غریب طبقہ کے بچے آتے ہیں اور اہل ثروت کے جو بچے آتے ہیں وہ ان کے جذبۂ دینی کی بنا پر آتے ہیں تو ان دونوں طبقوں کے نقطۂ نظر سے زندگی میں زیادہ ٹیپ ٹاپ اور تراش و خراش مناسب نہ ہوگی بلکہ اس کو اختیار کر کے غریب طبقہ کے بچے اپنے ماحول اور گھر میں جا کر اجنبی بن جاتے ہیں اور ان کی فطری سادگی مجروح ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ خود اپنی نظر میں اپنے کو اونچا سمجھنے لگتے ہیں اور گھر کے لوگ بھی ان کو بادل نخواستہ اپنے سے اونچا سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں' پھر اسکے نتیجہ میں ان میں اور آپ میں ایک خاص طرح کی اجنبیت پیدا ہو جائے گی اور

آپ گھر کے ماحول سے کٹ جائیں گے برخلاف اس کے جو بچے اپنی فطری سادگی پر قائم رہیں گے اور اسی کو لے کر گھر جائیں گے تو نہ ان کے گھر والوں کو .... ان سے اجنبیت ہوگی نہ وہ خود اپنے گھر والوں سے بیگانگی اور اجنبیت محسوس کریں گے، اہل ثروت کے جو بچے آتے ہیں انکے والدین بھی ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اضافہ کے لیے یہاں نہیں بھیجتے کیونکہ یہ ظاہری چیزیں تو ان کو گھر پر بھی حاصل تھیں بلکہ وہ یہاں آپ کے ذہن و اخلاق اور سیرت و کردار کو سدھارنے کے لیے بھیجتے ہیں تو اگر یہاں سے آپ وہی چیز لے کر واپس ہوئے جو آپ کو گھر پر حاصل تھی تو ان کا اتنا پیسہ خرچ کرنا بیکار گیا۔ آپ یقین کر لیں کہ آپ کی استری کی ہوئی قمیص، آپ کے کھڑے کالر، آپ کے کپڑوں کی خوبصورتی اور جوتوں کی چمک دمک پر کسی کی نگاہ نہیں جائے گی، بلکہ انکی نگاہیں آپ کی سیرت و کردار میں حسن و خوبی کو تلاش کریں گی۔ وہ آپ کے قول و عمل میں دین و اخلاق کی جھلک دیکھنا چاہیں گے اس لیے آپ اپنے کپڑوں کے خوش وضعی و خوش قطعی سے زیادہ اپنے اخلاق و کردار میں حسن و خوبصورتی اور کشش پیدا کیجیے تاکہ وہ آپکو دیکھیں تو آپ کی طرف سے مایوس نہ ہوں۔

اس سے پہلے بہت سے بچوں کے گھروں سے ہمارے پاس مبارکباد کے خطوط آئے ہیں ان میں ہم کو اسی بات کی مبارکباد دی گئی ہے کہ آپ کے مدرسہ کے پڑھے ہوئے بچوں نے مدرسہ کے حسن و تربیت کا بہت اچھا مظاہرہ کیا، مسجدیں خوب آباد کیں، نمازیں بڑی پابندی سے پڑھیں، گھر اور گاؤں اور بستی کے ہر شخص سے بڑے اخلاق سے پیش آئے، ہم آپ کے مدرسہ سے ان ہی اوصاف کے متوقع تھے کسی نے ہم کو یہ نہیں لکھا کہ یہ بہت اچھے کپڑے پہنتے ہیں، بہت خوش نما ٹوپی اوڑھتے ہیں ان کے شو بہت اپٹوڈیٹ ہیں اور اُن کی پالش خوب چمکتی ہے۔ درحقیقت یہ ظاہری چیزیں نہ لکھنے کی ہیں اور نہ کوئی لکھ سکتا ہے۔ ہر شخص صرف حسن تعلیم اور حسن تربیت کو دیکھتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم اس معیار پر پورا اتر جاتا ہے تو وہ سب کی نگاہوں میں محبوب ہو جاتا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ ظاہری زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کے بجائے اپنے اخلاق و کردار کو سنوارنے اور انکو پرکشش بنانے کی کوشش کریں۔

تاکہ آپ جہاں جائیں تو دینی تعلیم و تربیت کا مکمل نمونہ ثابت ہوں۔

عزیز طلبہ! یہ بات بھی ذہن نشین کرلیں کہ یہاں آپ کا سارا وقت مشغول تھا، سونے کے علاوہ کوئی وقت آپ کا خالی نہیں تھا، پھر آپ دو چار آدمیوں میں نہیں بلکہ ایک جم غفیر میں رہتے تھے۔ اس مشغول اور ہماہمی کی زندگی کے بعد آپ گھر جائیں گے تو ایک دو دن تک آپ گھر کی خوشی میں یہاں کی زندگی کو بھول جائیں گے مگر دو چار دن بعد آپ اپنے کو بے کار محسوس کرنے لگیں گے نہ تو وہاں اتنی مشغولیت ہوگی اور نہ دوستوں اور ساتھیوں کا یہ جم غفیر وہاں ملے گا اس کے نتیجہ میں آپ کو ایک عجیب قسم کی بے کیفی محسوس ہوگی اس لیے آپ ابھی سے اپنے لیے کچھ مشغولیت کا پروگرام بنا لیجیے اور اپنے کو آپ کو مصروف رکھنے کا عزم کر لیجیے اگر آپ ایسا کریں گے تو وقت گزاری کے لیے آپ کو نہ تو دوسرے آزاد روش دوستوں کی تلاش کی ضرورت پیش آئے گی اور نہ آپ کے دماغ میں کسی غلط کام اور بے مقصد تفریح کا جذبہ پیدا ہوگا، شیطان کا داؤ سب سے زیادہ بے کام اور خالی آدمیوں پر چلتا ہے اسی بنا پر حضرت عمرؓ کسی آدمی کو بیکار دیکھتے تھے تو اس کے سلام کا جواب تک نہیں دیتے تھے، اس لیے آپ اپنی مشغولیت کے لیے اپنی پڑھی کتابوں میں سے کسی کتاب کے مطالعہ کا پروگرام بنائیے قرآن پاک کی تلاوت اور اس کے حفظ کا پروگرام بنائیے اور کچھ لکھنے پڑھنے کا پروگرام بنا لیجیے۔

ایک بات اور ذہن نشین کر لیجیے کہ اس وقت جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے جتنی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں، اتنی اس سے پہلے نہیں تھیں۔ اس وقت ہندوستان کی کوئی بستی ایسی نہیں ہے جس کے قریب کوئی ہائی اسکول یا کالج موجود نہ ہو۔ اگر آپ کے والدین غریب ہیں جب بھی اگر وہ چاہتے تو آپ کو ان درسگاہوں میں بھیج کر کمانے کھانے کے بقدر تعلیم تو دلا ہی سکتے تھے مگر انھوں نے اس سہولت سے فائدہ نہ اٹھا کر آپ کو گھر سے اتنی دور تعلیم کے لیے بھیجا ہے اس تعلیم سے ان کو یہ توقع نہ ہوگی کہ ہمارا لڑکا اس کی تکمیل کرکے کسی بڑے عہدہ پر پہنچ جائیگا بلکہ ان کا جذبہ صرف یہ ہوگا ہمارا بچہ دینی تعلیم اور حسن سیرت سے آراستہ ہو جائے گا۔ اس صورت میں آپ سوچیے کہ اگر آپ نے ان کی توقع پوری نہ کی تو ان کو کتنی مایوسی اور شرمندگی ہوگی کتنے لوگ ان پر طنز و تعریض کا یہ جملہ کسیں گے کہ "وہ فلاں کا بیٹا نہ دین کا ہوا نہ دنیا کا۔"

عزیز طلبہ! آخر میں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ آپ نے جو راہ اختیار کی ہے وہ عیش و عشرت اور دنیاوی عزت و وجاہت کی راہ نہیں ہے بلکہ اس راہ میں اس دنیا اور اس زندگی میں کھونا زیادہ اور پانا کم ہے، یہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی راہ ہے جس راہ میں پھول نہیں بلکہ قدم قدم پر کانٹے اور پتھر ملیں گے اس لیے میں عرض کیے دیتا ہوں کہ جن کے قلب و جگر میں ان شدائد کے سہارنے کی طاقت نہ ہو وہ ابھی سے اپنی راہ بدل لیں ورنہ آگے چل کر وہ اپنے آپ کو ایک عجیب مخمصہ میں پائیں گے۔ اس راہ میں چلنے کے لیے تو جان و دل کو کھونا ہوگا اس لیے

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

یہ بات میں نے اس لیے عرض کر دی کہ آپ اگر بے جا توقعات کے ساتھ اس راہ کو اختیار کریں گے تو اپنے لیے بھی غیر مفید ہوں گے اور ملت کے لیے بھی ایک بوجھ بنیں گے یا پھر کافی عمر گنوانے کے بعد آپ کو اسکول و کالج یا کسی یونیورسٹی کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا اور پھر اس دروازہ میں داخل ہونے کے لیے ممکن ہے آپ دین و اخلاق کو بھی بالائے طاق رکھ دیں جیسا کہ عام طور پر دیکھا جا رہا ہے اس لیے اپنے عزم و ارادہ کا جائزہ لے لیجیے اگر اپنے اندر اس تعلیم کا بل بوتا پاتے ہوں تو اپنے دل و دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ اس میں لگ جائیے۔ انتشار ذہنی کے ساتھ کوئی کام انجام پا نہیں سکتا، زیادہ تر طلبہ اسی انتشار ذہنی کی بنا پر ناکام ہوتے ہیں۔ آپ رزق کی طرف سے بے پروا رہیے جو علیم و خبیر کیڑے مکوڑوں کو پالتا ہے اور جانوروں کو رزق دیتا ہے۔ وہ آپ کو ضائع نہ کرے گا اور آپ کے لیے تو رزق عام اور رزق مقسوم کے ساتھ ایک "رزق موعود" کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔ وَمَن يَتَّقِ اللهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجاً وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔

عزیزان من! اب جبکہ آپ رخصت ہو رہے ہیں تو ذرا اس حیثیت سے اپنا جائزہ لے ڈالیے کہ کسی ساتھی کو آپ سے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی ہے، آپ کے اساتذہ میں سے کوئی ناخوش تو نہیں ہے۔ مدرسہ کے ذمہ داروں اور دوسرے افراد حتیٰ کہ مدرسہ کے معمولی ملازم اور مطبخ کے باورچی وغیرہ کو آپ سے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی ہے اگر ایسا ہو تو اُن سے اپنی صفائی کر لیجیے ان سے معافی مانگ لیجیے، یہاں سے آپ اس طرح جائیں جس

طرح حاجی حج سے واپس ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کی طرف سے صاف دل ہوتے ہیں اور دوسروں کا دل ان کی طرف سے صاف ہوتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ گھروں کو جاتے ہوئے سفر کے اثنا میں آپ سے کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جو جدید درسگاہوں کے آج کے طلبہ کا عام شعار اور طرۂ امتیاز بن گیا ہے ورنہ اس سے دینی درسگاہوں کی بدنامی ہوگی یہ نہ سمجھیں کہ سفر میں سب لوگ اجنبی ہوتے ہیں اس لیے غیر ذمہ داری برتنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ عوام کا احساس اس بارے میں بڑا شدید اور تیز ہوتا ہے۔ وہ آپ کو دور سے دیکھکر سمجھ جائیں گے کہ آپ کسی دینی درسگاہ کے طالبعلم ہیں آپ کی ہر ہر حرکت پر ان کی نگاہ ہوگی وہ یہ تو شاید نہ جان سکیں گے کہ آپ کس درسگاہ کے طالبعلم ہیں لیکن اگر آپ سے کوئی نازیبا حرکت درمیانِ سفر صادر ہوئی تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ تربیت کے لحاظ سے دنیاوی اور دینی درسگاہوں کے طلبہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دو چار آدمیوں کے ذہن میں بھی یہ بات بیٹھ گئی تو بڑا المیہ ہوگا

عزیزو! ایک بات چلتے چلاتے اور سن لیجئے طلبہ میں ایک بیماری "تم خیر" کی ہوتی ہے یعنی وہ ایک درسگاہ میں ہوتے ہیں اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت بھی خاطر خواہ ہو رہی ہوتی ہے مگر جب وہ کسی دوسرے سے سنتے ہیں کہ فلاں درسگاہ بہت بڑی اور اچھی ہے تو بہت سے طلبہ اس دوسری درسگاہ میں جانے کی تمنا کرتے ہیں ہم آپ کو یہی مشورہ دیتے ہیں کہ آپکے اندر یہ بیماری نہ پیدا ہو، درسگاہیں سب اچھی ہیں آپ چھوٹی سے چھوٹی درسگاہ میں اگر محنت سے پڑھیں گے تو آپ کام کے بن جائیں گے اور اگر آپ محنت نہ کریں گے تو کوئی بڑی سے بڑی درسگاہ آپ کے اندر استعداد پیدا نہیں کر سکتی جو طلبہ بار بار درسگاہیں بدلتے ہیں وہ اکثر ناکام ہی رہتے ہیں۔

ایک اور بات یاد رکھیے کہ آپ گھر پہنچ کر مہمان کی حیثیت سے نہ رہیں بلکہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہیں۔ آپ کے گھر میں جو کام بھی ہوتا ہے اس میں اپنے والدین کا بھائیوں کا اور اپنے دوسرے اہل خاندان کا ہاتھ بٹائیں بلکہ آپ ان کے کام کو ہلکا کرنے کی کوشش کریں رات کے وقت اپنے والد اور والدہ کے سر پر تیل رکھنے اور پاؤں دبانے کی کوشش کریں اور

ان کو ہر طرح کا آرام پہنچائیں، ایسا نہ ہو کہ آپ ایک مہمان کی حیثیت اختیار کر کے ان کی پریشانی میں مزید اضافہ کریں ان کو آپ کے لیے کچھ اہتمام کرنا پڑے اور آپ کا جانا ان کے لیے بار محسوس ہو۔

عزیز طلبہ! سب سے آخری اور اہم بات یہ بھی یاد رکھیے کہ دینی درسگاہ میں پڑھنے والے طلبہ اور اس سے فارغ ہونے والے طلبہ سب کے سب نائب رسول ہیں یا ہونے والے ہیں۔ نائب رسول کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس پیغام کے امین ہیں جس کو لیکر سرکار دو عالم اس دنیا میں تشریف لائے تھے اس لیے آپ کا فرض ہے کہ آپ اس پیغام اور ہدایت کے "قولاً و عملاً" داعی بنیں جس کی دعوت و تعلیم کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے آپ نہ سوچیں کہ ابھی آپ تیسرے چوتھے یا پانچویں درجہ میں پڑھتے ہیں اس لیے تکمیل تعلیم کے بعد آپ پر یہ ذمہ داری آئے گی دینی درسگاہوں میں جو طلبہ پڑھتے ہیں خواہ وہ میزان منشعب پڑھتے ہوں یا بیضاوی و بخاری پڑھتے ہوں عام لوگ اس کے درمیان فرق نہیں کریں گے کہ آپ کس درجہ میں اور کون کتاب پڑھتے ہیں وہ آپ سب کو مولوی، عالم ہی سمجھیں گے اس لیے اگر آپ نے یہ سمجھ کر کہ ابھی آپ کی ذمہ داری کی عمر نہیں آئی ہے کوئی غلط حرکت کر دی یا آپ اپنے خاص مقام اور اپنی ذمہ داری کو بھلا کر معاشرے میں بالکل گھل مل گئے تو اس سے نہ صرف آپ بدنام ہوں گے بلکہ نیابت رسول کی ذمہ داری پر بھی حرف آئے گا مگر یہ بھی یاد رکھیے کہ ذاتی طور پر اپنے عمل میں آپ پتھر کی چٹان کی طرح مضبوط اور سخت بنے رہیے گا تاکہ ماحول کے غلط اثرات آپ کو متاثر نہ کر سکیں مگر دوسروں سے دین پر عمل کرانے یا انکو دین کی طرف بلانے میں موم سے بھی زیادہ نرم بنکر رہیے گا ایسے موقع پر آپ کے جذبات میں شدت اور تیزی نہ آنے پائے ورنہ آپ لوگوں کو قریب لانیکے بجائے دین سے دور کر دینگے، خاکساری تواضع علما کا سب سے بڑا زیور ہے اسی سے ان کا علم علم نافع بنتا ہے اور داعی کیلیے تو یہ بمنزلہ فرض عین ہے۔

یہ چند باتیں خیر خواہی کے جذبہ کے تحت عرض کر دی گئی ہیں انکی حیثیت آپ زاد راہ کی سمجھیے جس طرح سفر میں ہر آدمی اپنے زاد راہ اور سامان کی حفاظت کرتا ہے آپ بھی انکو دل و دماغ میں محفوظ کر لیں اور ان کی حفاظت کریں، زاد راہ کی حفاظت سے آدمی کو سفر کے دوران جو آرام ملتا ہے انشاء اللہ ان باتوں سے بھی آپکو اس وقتی سفر میں اور پورے تعلیمی سفر میں سکون ملے گا اور آپ قلب میں طمانیت کی ایک خاص کیفیت محسوس کریں گے اللہ ہم کو آپ کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

یادِ رفتگاں

محمد منظور نعمانی

شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب فلسفی رح

حکیم صاحب مرحوم کی رُوح پر خدا کی رحمتیں! رمضان مبارک کے دوسرے عشرہ میں ان کی رحلت کا واقعہ پیش آیا تھا جس کو قریباً تین مہینے گزر چکے، اس عرصہ میں اُن کے کریمانہ اخلاق اور مخلصانہ عنایتوں کی یاد برابر تقاضہ کرتی رہی کہ مرحوم کے بارہ میں اپنے احساسات و تاثرات کا الفرقان میں بھی کچھ تذکرہ کرکے اپنے ناظرین سے بھی اُن کے لیے دُعاءِ مغفرت و رحمت کی استدعا کی جائے کہ اس دنیا سے جانے والے کسی محسن یا دوست کے لیے سب سے زیادہ کارآمد نفعمند تحفہ یہی ہوسکتا ہے ــــــ لیکن الفرقان کے پچھلے دو شماروں (بابت شوال و ذیقعدہ) کی تیاری کے وقت طبیعت کا حال کچھ ایسا رہا کہ دو چار سطریں بھی نہیں لکھی جاسکیں ــــــ (اس عرصہ میں اور بھی کئی بزرگوں اور دوستوں کی وفات ہوئی، جن کے اس عاجز پر خاص احسانات اور حقوق ہیں، انشاء اللہ آج ہی کی صحبت میں اُن کے بارہ میں بھی کچھ عرض کیا جاسکے گا ــــــ واللہ الموفق!)

شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب کو عام طور سے ایک باکمال اور حاذق طبیب ہی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا، شروع میں خود راقم سطور کا تعلق اور رابطہ بھی اُن سے اسی حیثیت سے قائم ہوا، اب سے قریباً ۲۰ برس پہلے کی بات ہے، کسی سلسلہ سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جانا ہوا، وہاں نزلہ اور بخار میں مبتلا ہوگیا، میں اُس زمانہ میں یونانی علاج ہی کا عادی تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ہمارے لکھنؤ کے شفاء الملک حکیم عبد المعید صاحب کے چھوٹے بھائی حکیم عبد اللطیف صاحب یہاں طبیہ کالج میں پرنسپل ہیں،

اگرچہ کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن حکیم عبدالمعید صاحب کے تعلق سے (کہ وہ میرے بڑے ہی عنایت فرما معالج تھے) انہی کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کیا، میں نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ میں حکیم صاحب کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہم ان کو اطلاع کیے دیتے ہیں وہ ابھی تشریف لے آئیں گے، میں نے کہا کہ میں مریض ہوں مجھے خود طبیب اور معالج کے پاس جانا چاہیئے۔ لوگوں نے کہا کہ اُن کو آپ جیسے حضرات کے ساتھ ایسا تعلق ہے کہ آپ کے پہونچنے سے انھیں تکلیف ہوگی اور ہم لوگوں سے سخت شکایت ہوگی ــــــ بہرحال ان حضرات نے حکیم صاحب کو اطلاع دے دی اور وہ فوراً ہی تشریف لے آئے، میں نے حکیم صاحب کو پہلی دفعہ اسی دن دیکھا، نبض دیکھ کے اور حال سُن کے جوشاندہ کا نسخہ لکھا اور فرمایا کہ میں خود ہی دوا تیار کرا کے ابھی بھیجتا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دوا آگئی، میں نے پی لی، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جلد ہی طبیعت اچھی ہوگئی اور ایک دو ہی دن کے بعد میں لکھنؤ چلا آیا ــــــ کچھ مدت کے بعد حکیم صاحب طبیہ کالج سے ریٹائرڈ ہو کر لکھنؤ تشریف لے آئے۔ پھر کچھ عرصہ کے لیے دہلی کے ایک طبیہ کالج کی پرنسپلی قبول فرمالی، اسی زمانہ میں دہلی ہی میں غالباً پہلی دفعہ سخت قسم کا قلبی دورہ پڑا، کئی دن موت و زیست کی کشمکش میں گزرے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور صحت یاب ہوگئے ــــــ اس کے کچھ عرصہ کے بعد لکھنؤ میں تشریف لے آئے اور یہیں مطب شروع فرمادیا۔ یہاں بھی میرے لیے حکیم صاحب سے ربط و تعلق بڑھنے کا بہانہ تو اپنی یا اپنے گھر والوں کی بیماری یا علاج معالجہ کا سلسلہ ہی ہوا لیکن چند ہی ملاقاتوں کے بعد معلوم ہوگیا کہ حکیم صاحب صرف ایک حاذق طبیب ہی نہیں ہیں، بلکہ درس نظامی کے ذریعہ جو ایک خاص قسم کی ٹھوس اور پختہ علمی استعداد پیدا ہو جاتی ہے حکیم صاحب اُس کے بھی سرمایہ دار ہیں، اور بالخصوص دینی علوم سے اچھا خاصا تعلق ہے، جب بھی علاج معالجہ ہی کے سلسلے سے مطب میں پہونچ جاتا یا وہ غریب خانہ پر تشریف لاتے تو اکثر اہم دینی موضوعات پر گفتگو فرماتے، کبھی کبھی قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی حدیث کے بارے میں تحریری مراسلت بھی فرماتے۔

راقم سطور کی تالیف "معارف الحدیث" کی جب کوئی نئی جلد تیار ہوتی اور میں اُس کا نسخہ ہدیۃً اُن کو بھیجتا تو عموماً ہفتہ عشرہ کے اندر ہی اندر اس کا مطالعہ فرما لیتے اور اس طرح غور سے مطالعہ فرماتے کہ کتابت و طباعت کی بعض اغلاط کی بھی نشاندہی فرما دیتے تاکہ آئندہ اڈیشن میں

تصحیح کی جا سکے) اور مجھے اپنے تاثرات لکھتے جو میرے لیے بڑے خوشکن ہوتے۔ اُن کا اصرار کے ساتھ یہ بھی مشورہ تھا کہ جن صحابۂ کرام کی روایات معارف الحدیث میں لی گئی ہیں اُن سب کا مختصر تعارفی تذکرہ بہتر تو یہ تھا کہ ساتھ ساتھ حاشیہ میں کر دیا جاتا۔ لیکن اب جبکہ کئی جلدیں بغیر اس کے شائع ہو چکی ہیں تو آخری جلد میں ایک ضمیمہ شائع کر کے اس کمی کو پورا کر دیا جائے، میں نے حکیم صاحب کا یہ مشورہ قبول بھی کر لیا تھا، اللہ تعالیٰ اس کو عمل میں لانے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس عاجز کے ساتھ حکیم صاحب کی غیر معمولی عنایت و محبت اور ممدوح کے ساتھ اس ناچیز کی روحی و قلبی مناسبت و وابستگی کی خاص وجہ غالباً دینی مسلک و مشرب کی یگانگت اور اس باب میں ذوق اور طرز فکر تک کی وحدت اور ہمارے اکابر و مشائخ، اسلاف جماعت دیوبند سے ان کی انتہائی عقیدت بھی تھی ــــــ عملی زندگی میں بھی جہاں تک اس عاجز کو معلوم ہے وہ صوم و صلوٰۃ کے علاوہ اوراد و وظائف کا بھی ایک درجہ میں اہتمام فرماتے تھے ــــــ اخلاق میں تو بہت ہی بلند مقام تھا، میں نے اپنی عمر میں ایسے کریم النفس بہت کم دیکھے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا حکیم صاحب کئی سال سے قلب کے مریض تھے، گزشتہ رمضان مبارک کے پہلے عشرہ کے آخری دنوں میں قلبی شکایت شروع ہوئی۔ دو تین دن تک گھر ہی پر علاج معالجہ ہوتا رہا، اس ناچیز کو علم بھی نہیں ہوا، جب مرض نے خطرناک شکل اختیار کر لی تو میڈیکل کالج کے ہسپتال میں داخل کر دیے گئے، اگلے دن صبح کو مجھے معلوم ہوا اور میں عیادت کے لیے گیا میں نے ان کے کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے تیماردار کے ذریعہ یہ پیام بھیجا کہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں لیکن میری شرط یہ ہے کہ نہ میں آپ سے بات کروں نہ آپ مجھ سے کلام فرمائیں، کیونکہ اس وقت بات کرنا آپ کے لیے مضر ہو سکتا ہے، اس کے بعد حاضر ہوا۔ لیکن حکیم صاحب نے ہمیشہ کی عادت کے مطابق مصافحہ کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا اور کچھ بات بھی کرنی چاہی اور مجھے پھر عرض کرنا پڑا کہ اسوقت نہ میں بولوں گا نہ آپ بولیں ــــــ یہی حکیم صاحب کی زندگی کا آخری دن تھا اور یہی راقم سطور کی اُن سے آخری ملاقات تھی ــــــ اسی رات میں جو غالباً رمضان مبارک کی بارھویں شب یعنی عشرۂ رحمت کی دوسری رات تھی ہسپتال ہی میں، داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔

علی الصبح حکیم مسیح الزماں صاحب ندوی پرنسپل تکمیل الطب کالج نے مجھے ٹیلی فون سے اطلاع دی اور یہ بھی بتایا کہ نماز جنازہ کے لیے ۴ بجے سہ پہر کا وقت طے ہوا ہے۔

جب میرے کسی بزرگ یا دوست یا محسن کا انتقال ہوتا ہے تو میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے ان کو آخری غسل دوں، کفن پہناؤں اور اپنے ہاتھوں سے قبر میں لٹا کر خدا کی رحمت کے سپرد کروں، اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اکثر یہ خواہش پوری ہو ہی جاتی ہے۔ الحمد للہ حکیم صاحب مرحوم کو بھی غسل دینے کی توفیق ملی، ان کے خاص شاگردوں اور نیازمندوں میں سے طبیہ کالج علی گڑھ کے پروفیسر حکیم انعام اللہ صاحب اور تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے پرنسپل حکیم مسیح الزماں صاحب ندوی بھی غسل میں شریک اور معاون رہے، اور سب سے زیادہ حصہ ہمارے تبلیغی مرکز لکھنؤ کے رفیق خاص مولوی محمد سلیم کا رہا جو اس کے خاص ماہر ہیں اور اکثر ایسے موقعوں پر اس عاجز کے ساتھ ہوتے ہیں۔

عصر کی نماز کے بعد نماز جنازہ پڑھی گئی اور خاندانی قبرستان میں جو جھوائی ٹولہ ہی میں حکیم صاحب مرحوم کے مکان کے بالکل قریب ہے تدفین عمل میں آئی اور اپنے اس مخلص محب و محسن کو قبر میں اتارنے اور لٹانے کی بھی اس عاجز کو توفیق ملی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس طرح اس نے حکیم صاحب مرحوم کو اس دنیا میں بہت سی نعمتوں اور بلندیوں سے نوازا تھا، اسی طرح قبر و برزخ کی اور اس کے آگے کی آخرت کی منزلوں میں اپنی خاص رحمتوں اور عنایتوں سے نوازے اور پوری پوری مغفرت فرمائے۔ اپنے ناظرین کرام سے بھی استدعا ہو کہ وہ بھی دعا فرمائیں اس عاجز پر بھی احسان ہوگا۔

قاری محمد شبیر صاحب لکھنوی ثم رائے پوری

اس عاجز راقم سطور اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو توفیق الٰہی نے مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر (قدس سرہٗ) کی خدمت میں پہونچایا اور حضرت سے خادمانہ ربط و تعلق قائم ہوا اور پھر ہم خدام کی استدعا پر حضرت کی لکھنؤ بھی بار بار تشریف آوری ہوئی اور کئی کئی ہفتے قیام رہا تو لکھنؤ کے ہمارے بہت سے احباب و مخلصین نے بھی حضرت سے بیعت و اصلاح کا تعلق قائم کیا، ان میں سے کئی ایک پر خدا کی توفیق سے راہ سلوک کی طلب کا ایسا غلبہ ہوا کہ انھوں نے اپنے کو بالکل ہی

حضرت سے وابستہ کر دیا اور رائے پور کی خانقاہ ہی میں جا پڑے جہاں اس دور میں طالبین کو بالخصوص
کھانے پینے کے معاملہ میں بڑے مجاہدہ کی زندگی گزارنی پڑتی تھی ـــــ انہی میں ایک نہایت مخلص
بندے قاری محمد شبیر صاحب بھی تھے۔ اصل وطن تو غالباً بارہ بنکی کے کسی دیہات میں تھا، لیکن
اُن کے والد صاحب لکھنؤ کے مشہور عطر کے کارخانہ "اصغر علی محمد علی" میں ملازم تھے، اس لیے
قاری صاحب لکھنؤ ہی میں رہتے تھے، جہاں تک معلوم ہے گھر کا گزارا اچھا خاصا متوسط درجہ کا
تھا لیکن انھوں نے رائے پور کی خانقاہ میں پہونچنے کے بعد پوری زندگی مثالی زہد و توکل اور
انتہائی صبر و مجاہدہ کے ساتھ گزاری، دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ جسم میں خون بالکل نہیں ہے۔
گویا کوئی مردہ ہے جو قبر سے اُٹھ کر آگیا ہے۔ مگر اس جسمانی ضعف و نقاہت کے ساتھ دن اور رات
ذکر و عبادت میں اتنی مشغولیت کہ عاجز راقم سطور نے اپنی پوری زندگی میں کوئی دوسرا ان کا عدیل و
مثیل نہیں دیکھا۔ اور اس کے باوجود ایسی گمنامی بلکہ کس مپرسی کہ خاص دوستوں کے علاوہ کوئی
نہیں جانتا اور سمجھتا تھا کہ یہ بھی کچھ ہیں۔

راقم السطور گزشتہ رمضان المبارک کے دوسرے عشرہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا
مدظلہ کی خدمت میں ۲۔۴ دن قیام کی نیت سے سہارن پور حاضر ہوا، وہاں پہونچکر غالباً سب سے پہلے حضرت
شیخ الحدیث ہی سے معلوم ہوا کہ ہمارے قاری محمد شبیر صاحب سخت مریض ہیں اور ان کو علاج اور
دیکھ بھال کے لیے رائے پور سے سہارن پور ہی لے آیا گیا ہے اور شاہ مسعود صاحب کے بہشتی دار کے
تحتانی حصہ میں مقیم ہیں۔ یہ عاجز زیارت و عیادت کے لیے گیا، دیکھ کر اندازہ ہوا کہ حالت نازک
اور تشویش ناک ہے، خود ان کا بھی اندازہ تھا کہ وقت غالباً قریب ہی ہے ـــــ میرے سہارن پور
پہونچنے کے دوسرے یا تیسرے دن رفیق محترم مولانا علی میاں بھی آگئے۔ ہم دونوں کو آخری عشرہ
شروع ہونے سے پہلے واپس آجانا تھا، لکھنؤ کے دو اور مخلص دوست (بھائی عبدالقادر
حاجی اسماعیل)، جن کا ارادہ آخر رمضان تک حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی خدمت میں سہارن پور قیام
کا تھا، ان کو ہم دونوں نے مشورہ دیا کہ وہ زیادہ وقت قاری صاحب کے پاس اور اُن کی خدمت
اور دیکھ بھال میں گزاریں اور اسی کو اپنا سب سے اچھا معمول اور وظیفہ سمجھیں، اللہ تعالیٰ جزائے
خیر دے ان حضرات نے ایسا ہی کیا، لیکن قاری صاحب کا وقت موعود قریب آگیا تھا، ہماری

واپسی کے ۲۔۲ دن دن بعد بہٹ ہاؤس ہی میں انتقال ہوگیا اوران کی ذاکر روح اپنے اصل مسکن میں پہونچ گئی۔ یَاۤ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝۔

بندہ کا اصل حال اور درجہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، لیکن اس عاجز نے قاری صاحب کو ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پاک کا خاص مصداق سمجھا۔

مشکوٰۃ شریف میں مسند احمد اور جامع ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالہ اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے — کہ

اغبط اولیائی عندی لمؤمن	میرے دوستوں میں بہت زیادہ قابل رشک
خفیف الحاذ ذو حظ من	میرے نزدیک وہ مومن ہے جو سبک بار (یعنی
الصلوٰۃ احسن عبادۃ ربه	دنیا کے ساز و سامان اور مال و عیال کے
واطاعه فی السّر و کان	لحاظ سے بہت ہلکا پھلکا) ہو۔ نماز میں
غامضاً فی الناس لا یشار	اس کا خاص حصہ ہو اور اپنے رب کی عبادت
الیه بالاصابع وکان رزقه	و طاعت خوبی کے ساتھ اور صفت احسان
کفافاً فصبر علی ذالك	کے ساتھ کرتا ہو اور یہ سب اخفا کے ساتھ
ثم نقد بیده فقال عُجِّلَتْ	اور خلوت میں کرتا ہو اور وہ چھپا ہوا اور
منیته قلت بواکیه قل تراثه	گمنامی کی حالت میں ہو، اس کی طرف انگلیوں
	سے اشارے نہ کیے جاتے ہوں (کہ یہ فلاں
	بزرگ اور کامل ہیں) اور اس کی روزی بھی
	بقدر کفاف ہو اور وہ اس پر صابر و قانع ہو
	— پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے
	ہاتھ سے چٹکی بجائی، اور فرمایا جلدی آگئی اس
	کو موت اور اس پر رونے والیاں بھی کم ہیں
	اور اس کا ترکہ بھی بہت تھوڑا سا ہے۔

اس حدیث پاک میں "قابلِ رشک اولیا" کی جو صفات بیان فرمائی گئی ہیں وہ جس طرح اس عاجز نے اللہ کے اس بندے (قاری محمد شبیر مرحوم) میں جمع دیکھیں کسی دوسری شخصیت میں ان کا اس طرح اجتماع دیکھنا یاد نہیں ــــ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہم بندوں کے گمان سے بھی بہتر معاملہ فرمائے، مغفرت اور رحمت خاصہ سے نوازے اور درجات عالیہ عطا فرمائے اور ان کے مقبول احوال و صفات کا کوئی حصہ ہم کو بھی نصیب فرمائے۔

حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ و مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانویؒ

ہندوستان کی تقسیم نے جو بہت سے مسائل خاص کر ہم مسلمانوں کے لیے پیدا کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت سے وہ بزرگ یا عزیز جن سے انتہائی قریبی نسبی یا روحانی تعلق تھا وہ ہم سے امریکا اور روس سے بھی زیادہ دور ہوگئے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ فوجی حکمرانوں نے قریباً ڈیڑھ سال سے ہر قسم کی کتابوں، رسائل اور اخبارات کی آمد و رفت پر بھی پابندی لگا رکھی ہے جس کی وجہ سے بہت سے اہم واقعات و حادثات کا وقت پر علم بھی نہیں ہوسکتا ـــــ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری اور مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی متحدہ ہندوستان کے اکابر و مشاہیر علماء میں سے تھے۔ یقیناً ہندوستان کے طول و عرض میں سیکڑوں ایسے مسلمان ہیں جو ان بزرگوں سے محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے ہیں۔ ان بزرگوں کی وفات اب سے ۲-۳ مہینے پہلے ہوئی لیکن پاکستان کے اخبارات و رسائل نہ آسکنے کی وجہ سے یہاں اس کی اطلاع بہت دیر سے ہوسکی۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری بڑے ممتاز صاحب درس اور وسیع النظر عالم تھے، خاص کر فن حدیث میں مولانا کا خاص مقام تھا، اسی کے ساتھ حکیم الامۃ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے ارشد خلفاء میں سے تھے، ملک کی تقسیم سے پہلے جالندھر میں ان کا مدرسہ "خیر المدارس" دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور جیسے مدارس کے طرز پر اس وقت کے پنجاب کا سب سے بڑا اور بافیض مدرسہ تھا، بلکہ جہاں تک علم ہے سندھ اور صوبۂ سرحد میں بھی اس وقت کوئی دینی درسگاہ اس درجہ کی نہیں تھی، تقسیم کے فیصلہ کے بعد جب مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے پاکستان کے علاقہ میں منتقل ہونا پڑا تو مولانا مرحوم نے ملتان میں قیام کا فیصلہ فرمایا اور وہیں "خیر المدارس" قائم کیا، پاکستان کے اس

ابتدائی دور میں وہی سب سے بڑا مدرسہ تھا، بعد میں کراچی اور لاہور اور دوسرے شہروں میں بھی بڑے اور مرکزی مدارس قائم ہوگئے۔

تقسیم سے پہلے جب کہ خیر المدارس اور حضرت مولانا کا قیام جالندھر میں تھا کئی بار وہاں حاضری کا موقع ملا، قیام پاکستان کے بعد اگرچہ اس عاجز کے دو سفر مغربی پاکستان کے ہوئے، ایک ۵۲ء میں اور دوسرا ۶۳ء میں لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کسی سفر میں بھی ملتان اور خیر المدارس میں حاضری نہ ہو سکی، البتہ ایک دفعہ غالباً کراچی سے لاہور آتے ہوئے ملتان اسٹیشن سے گزرنا تھا، حضرت مولانا کو تار سے اطلاع دلا دی تھی تاکہ کم از کم اسٹیشن ہی پر زیارت و ملاقات ہو سکے۔ حضرت ممدوح صاحبزادگان اور خیر المدارس کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ اسٹیشن پر تشریف لائے۔ میرے لیے کھانا بھی گھر سے پکوا کر ساتھ لائے، جب ٹرین ملتان اسٹیشن پر پہونچی تو حضرت مولانا تشریف فرما تھے، میں نے اتر کر مصافحہ و معانقہ کیا، مولانا نے ساتھ والے مجمع کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں نے ان سب کو مصافحہ سے منع کر دیا ہے تاکہ گڑبڑ اور تجھے زحمت نہ ہو اور اطمینان و سکون سے پاس بیٹھنے اور کچھ بات کرنے کا موقع مل جائے۔ (میں نے محسوس کیا کہ یہ خاص تھانوی ذوق و مزاج کی برکت ہے) پھر مجھے ساتھ لے کر پلیٹ فارم کے ایک گوشے میں تشریف لے آئے جہاں اسٹیشن کے ذمہ دار حضرات کی اجازت سے پورے مجمع کے بیٹھنے کا پہلے ہی سے انتظام کر لیا گیا تھا، سب لوگ حیرت انگیز نظم و سکون کے ساتھ بیٹھ گئے ——— حضرت مولانا نے فرمایا کہ اگر بار محسوس نہ ہو اور طبیعت حاضر ہو تو اس موقع پر کچھ کہہ دے! میں نے تعمیل کو سعادت سمجھ کر طلباء سے کچھ عرض کیا اور دعا ہوئی ——— جب میری ٹرین کی روانگی کا وقت آیا تو مولانا سے آخری مصافحہ کر کے روانہ ہو گیا ——— یہی حضرت مرحوم کی آخری زیارت اور ملاقات تھی ——— وفات کی صحیح تاریخ کسی خط سے معلوم نہ ہو سکی، اندازہ یہ ہے کہ گزشتہ رمضان مبارک یا شوال (نومبر یا دسمبر) میں وفات پائی ——— اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے اور آپ کے علمی و دینی فیوض کے سلسلہ کو جاری رکھ کر درجات میں مسلسل ترقی کا وسیلہ بنائے اور اخلاف کو اخلاص اور اتباع مرضیات کی توفیق دے۔

حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی، لدھیانہ کے مشہور قدیم علمی خاندان کے ممتاز فرد تھے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے آخری دور کے تلامذہ میں سے تھے، ابتدائی زمانہ تدریس میں

گزرا، اچھے اچھے مدرسوں میں صدر مدرس رہے، بعد میں سیاسی تحریکات میں انہماک ہوگیا، کانگرس اور جمعیتہ علماء سے وابستہ اور اچھے عہدوں پر رہے۔ بار بار جیل بھی گئے، لیکن ملک کی تقسیم کے فیصلہ کے بعد مشرقی پنجاب کے دوسرے عام مسلمانوں کی طرح ان کو بھی اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان منتقل ہونا پڑا۔

راقم سطور پر مفتی صاحب کا خاص الخاص احسان ہے، ناظرین الفرقان میری اس سرگزشت سے الفرقان ہی کے ذریعہ واقف ہو چکے ہیں کہ ابتدائی عربی تعلیم میں میرے کئی سال ضائع ہوئے تھے، متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مجھے بہت کم عمری میں عربی یعنی اس کی صرف و نحو شروع کرادی گئی تھی، اس کی مروجہ درسی کتابیں (میزان منشعب پنج گنج نحو میر وغیرہ) مجھے پڑھائی جاتی تھیں اور اس طرح پڑھائی جاتی تھیں کہ میں اس عمر میں بالکل نہیں سمجھ سکتا تھا اس لیے وہ پڑھنا میرے لیے سراسر بوجھ تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر اس لاحاصل اور غیر مفہوم پڑھائی سے ایک طرح کی بیزاری تھی، میرے وطن سنبھل میں کئی عربی مدرسے تھے، اور ہر سال میرا ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسہ میں تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ جب ایک مدرسہ میں پڑھتے پڑھتے سال پورا ہو جاتا اور گھر والے محسوس کرتے کہ مجھے کچھ نہیں آیا تو اگلے سال دوسرے مدرسہ میں بھیج دیا جاتا۔ اس دوسرے مدرسہ میں سال پورا کرنے کے بعد بھی میں وہیں رہتا جہاں پہلے تھا ــــ کئی سال میرے اسی طرح گزر چکے تھے کہ سنہ ۳۲ھ (سنہ ۱۳ء) میں مولانا مفتی محمد نعیم صاحب سنبھل کے "مدرسۃ الشرع" میں صدر مدرس ہو کر آگئے، ہمارے ہی محلہ کے ایک عالم صاحب نے جو اچھے طبیب بھی تھے میرے والد صاحب سے مفتی صاحب کا ذکر کیا اور مشورہ دیا کہ مجھے پڑھنے کے لیے ان کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ اگلے ہی دن میں ان کی خدمت میں "مدرسۃ الشرع" بھیج دیا گیا، انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھ گچھ کی، اس میں میرے ذاتی اور گھریلو حالات بھی پوچھے اور اندازہ لگایا کہ مجھے اس تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور بس مارے باندھے گھر والوں کے جبر سے اب تک مدرسوں میں جاتا رہا ہوں ــــ انھوں نے اپنی باتوں سے مجھے مانوس کر کے بڑی شفقت سے فرمایا ــــ کہ تم سوچ سمجھ کر اپنے بارے میں خود فیصلہ کرو، اگر تمھارا ارادہ عربی پڑھنے کا نہیں ہے، کچھ اور پڑھنا یا کچھ اور کرنا چاہتے ہو تو صفائی سے ہم کو بتا دو، ہم تمھارے والد صاحب کو مشورہ دیں گے کہ تم کو اس لائن پر لگائیں، اور اگر تمھارا ارادہ عربی پڑھنے کا ہو تو ہم تمھیں پڑھائیں گے اور خدا نے چاہا تو تم بہت جلد پڑھ لوگے ــــ ان کے اس شفقانہ اور حکیمانہ طرز عمل نے دل کے رُخ کو بدل دیا اور

میں نے پڑھنے کا ارادہ کرلیا اور مفتی صاحب سے عرض کر دیا۔ انھوں نے ایک خاص انداز سے پڑھانا شروع کیا اور واقعہ یہ ہے کہ میں جو کچھ کئی سال میں نہیں پڑھ سکا تھا وہ میں نے ان سے چند مہینوں میں پڑھ لیا ــــــ مفتی صاحب تو اس سال کے بعد سنبھل تشریف نہیں لائے لیکن میری تعلیم کی گاڑی صحیح لائن پر چل پڑی اور علم کا جو حصہ مقدر تھا وہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نصیب فرما دیا ــــــ بہرحال میری تعلیم میں بنیادی حصہ مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی علیہ الرحمہ کا ہے اس لیے وہ میرے بہت بڑے محسن تھے ۔ پچھلے دنوں دار العلوم دیوبند جانا ہوا تو پہلے وہیں اُن کی خبر وفات سُنی ــــــ اس کے بعد ساہیوال (پاکستان) سے ان کے بڑے صاحبزادے مولانا ضیاء الحسن صاحب کا اطلاعی مکتوب بھی ملا ــــــ اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے، بالخصوص اس ناچیز پر اُن کا جو علمی احسان ہے اُس کا اُن کو بہتر سے بہتر صلہ دار آخرت میں عطا فرمائے اور فضلِ خاص سے نوازے ــــــ ناظرین کرام سے بھی دُعا کی استدعا ہے۔

(بقیہ صراط مستقیم ص ۳۲)

میں آنا محال بلکہ ناممکن ہے اور بیان کرنا بے سود ہے بلکہ بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ جس کو طلب کی توفیق عطا فرمائے گا وہ طلب کرے گا۔ مثل مشہور ہے

علم دل از سینہ می آید بطرف سینہا
بے معلم طفل ایں مکتب سخن ور میشود

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم
کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَالْتَزَمَ مُتَابَعَةَ الْمُصْطَفٰى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ماہنامہ "رضوان" کے لیے

اپیل

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

ساری دنیا کے مسلمان عمومیت کے ساتھ اور برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمان خصوصیت کے ساتھ جس اخلاقی زوال، ذہنی انتشار اور معاشرتی خلفشار کے نازک دور سے گزر رہے ہیں اس پر جن حضرات کی نظر ہے اور مسلمانوں کا موجودہ معاشرہ ان کے سامنے ہے، وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس صورت حال کا ذمہ دار زیادہ تر وہ بگاڑ ہے جو طبقۂ نسواں میں تیزی کے ساتھ پھیلتا جا رہا ہے، درحقیقت اس معاشرہ یا سوسائٹی میں اس اخلاقی اور دینی زوال کی رفتار اسوقت سے بہت تیز ہو گئی اور نمایاں طریقہ پر سب کو نظر آنے لگی جب سے کہ مسلمان خواتین اور مسلمان بچیوں اور لڑکیوں میں مغربی تعلیم نے اپنا اثر دکھایا، غیر دینی بلکہ مخالف دین اور مخرب اخلاق لٹریچر، ناولوں اور ترقی پسند رسالوں اور پرچوں نے ان کے دل و دماغ کو متاثر کیا، خدا کا خوف، آخرت کی فکر، حقوق و فرائض کا خیال اور اپنے جذبۂ خدمت انس و محبت اور صبر و قناعت سے اپنے گھر کو نمونۂ جنت بنانے سے ان کی توجہ ہٹ کر باہر کی دنیا سے لطف و مسرت حاصل کرنے کی طرف مبذول ہو گئی، اسوقت سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی خانگی زندگی کو ایک تپ کہنہ لاحق ہو گیا بلکہ خالص دینی دعوت و اصلاح کے راستے میں بھی ایسی سخت رکاوٹیں اور مشکلات پیش آئیں جن کا عبور کرنا بڑی سے بڑی طاقتور دینی تحریک کے لیے ناممکن بن گیا، اسلیے کہ باہر کی تمام کوششوں اور جد و جہد پر گھریلو زندگی کا انتشار اور گھر والوں کی بے راہ روی گھنٹوں اور منٹوں میں پانی پھیر دیتی ہے۔

ان سب حقیقتوں کے پیش نظر عرصہ سے اسکی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ مسلمان خواتین اور مسلمان لڑکیوں کے لیے کوئی ایسا رسالہ نکالا جائے جو ان کے دل و دماغ کے لیے صحیح دینی غذا مہیا کرے، ان کے دلوں میں دین کی محبت و عظمت اور آخرت کی اہمیت اور فکر پیدا کرے۔ ان کے سامنے نیک بیبیوں اور باخدا عالم و فاضل، عابد و زاہد مسلمان عورتوں کی زندگی کے نمونے اور کارنامے پیش کرے اور مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کو ان کا بھولا ہوا سبق اور زندگی کا وہ

نئے یاد دلاتا ہے گا جو انکا بھولتے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔

اس ضرورت کو محسوس کرکے میرے گھرانے کے چند افراد نے دسمبر ۱۹۵۶ء سے رسالہ "رضوان" جاری کیا جس کو شروع سے اس وقت تک بہت سے دیندار اور باحمیت مسلمانوں کی تائید و سرپرستی اور بزرگوں کی دعائیں حاصل رہیں۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ اس نے اپنے محدود دائرہ میں رہ کر گزشتہ چودہ سال میں بڑا مفید کام انجام دیا اور اسکے پڑھنے والوں کو اس سے ایک ذاتی اور جذباتی تعلق پیدا ہو گیا۔ اسکے پڑھنے سے بہت سی عورتوں نے اپنی غلط زندگی سے توبہ کی اور اپنے بچوں کی دینی و اخلاقی تعلیم کا انتظام کیا۔ اور اسکو ایسے گھرانوں تک پہونچایا جہاں تک اسکی رسائی مشکل تھی، یہاں تک کہ ہندوستان و پاکستان کے علاوہ امریکہ اور یورپی ممالک، عرب اور افریقہ میں بسنے والے بعض ہندوستانی و پاکستانی مسلم گھرانوں میں وہ مقبول ہونے لگا۔ اس سے تعلق رکھنے والے بھائیوں اور بہنوں کی ہمت افزائی سے اسنے کئی خصوصی شمارے بھی نکالے جو بہت مقبول ہوئے اور بہت جلد نایاب ہو گئے۔

ادھر کچھ عرصہ سے وہ مختلف اسباب کی بنا پر سخت مالی مشکلات سے دوچار ہے جسکی وجہ سے اسکے ذمہ دار مجبور ہو گئے اسکو بند کرنے کے مسئلہ پر غور کرنے لگے۔ لیکن میں نے اور میرے بعض دوستوں اور بزرگوں نے "رضوان" سے ذاتی اور جذباتی تعلق رکھنے والے بھائیوں اور بہنوں نے زبانی اور خطوط کے ذریعہ انکو اس ارادہ سے باز رکھا کہ یہ کسی قوم کے زوال کی بہت بری علامت اور کسی ملک کے باشندوں کے لیے بری بدشگونی کی بات ہو کہ ایک ایک کرکے اسکے چراغ گل ہوتے اور اسکے ادارے بند ہوتے چلے جائیں، یہ ایک قوم کی ناراہلی، پست ہمتی، مردہ دلی، اور بے حمیتی کی نشانی ہے۔

ہمارے حوصلہ دلانے سے "رضوان" کے ذمہ داروں نے ہمت کی ہے کہ وہ ایکبار پھر کوشش کرینگے اور رسالہ کو جاری رکھیں گے، اب ہمیں اپنے سب دوستوں اور ان سب لوگوں سے پوری امید ہے جنکے دلوں میں دین کا درد اور اپنی بچیوں اور بہنوں کے اخلاق اور دینی رجحان کی فکر ہے کہ وہ اس رسالہ کو بند ہونے سے بچائیں گے اور اس کار خیر کو جاری رکھنے بلکہ اسکو وسعت و ترقی دینے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔ ایسے ہمدردوں کی تھوڑی سی کوشش سے اس رسالہ کو نئی زندگی مل جائے گی اور دین و اخلاق کی آواز مسلمان گھرانوں میں پہونچتی رہے گی ـــــ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ ـــــ

ابو الحسن علی ندوی

چندہ سالانہ رضوان برائے ہندوستان ..... چھ روپے .... ممالک غیر سے ..... ۱۲ شلنگ

پتہ

دفتر ماہ نامہ "رضوان" گوئن روڈ، لکھنؤ

حدیث فقہ و تاریخ پر منتخب کتابیں

حدیث

کتاب الزہد والرقائق (عربی)	۳۰/-
ترجمان السنہ (کامل چار جلدیں)	۴۶/-
محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے	۴/۵۰
نصرۃ الحدیث	۲/۵۰
فن اسماء الرجال	۱/۷۵
زاد سفر اول	۴/۵۰
شرح شمائل ترمذی	۶/-
موضوعات کبیر	۸/-
مختصر شعب الایمان	۱/-
کتابت حدیث	۱/۵۰

فقہ

فتاویٰ دار العلوم دیوبند (مکمل ۶ جلدوں میں)	۴۳/-
فتاویٰ رشیدیہ	۸/-
فتاویٰ عبد الحئی	۱۶/-
اختری بہشتی زیور مکمل	۱۸/-
بہشتی ثمر	۳/۷۵
علم الفقہ مکمل	۱۶/-
فقہ الاسلام	۱۵/-
تبلیغ دین	۳/۵۰
کتاب الصلوٰۃ	۲/۵۰
صلاح الرسوم	۱/۷۵
رکعات تراویح	۱/۲۵

تاریخ

تاریخ اسلام مکمل	۴۳/-
تاریخ ملت کامل	۳۷/-
تاریخ مغلیہ کامل	۱۸/-
تاریخ دولت عثمانیہ	۹/-
تاریخ فقہ اسلامی	۱۰/-
تاریخ اندلس	۸/۵۰
اسلام اور عربی تمدن	۸/۵۰
آئینہ حقیقت نما	۱۵/-
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں	۴/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک	۱۰/۲۵
سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات	۱۱/-
تاریخ ردہ	۴/-
تاریخ گجرات	۸/-
سرکشی ضلع بجنور	۶/-
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء	۸/-
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	۴/۵۰
اشاعت اسلام	۶/-
تاریخ اسلام پر ایک نظر	۷/-
تاریخ ہند پر نئی روشنی	۲/-
بزم مملوکیہ	۵/۵۰
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں	۷/-
ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء	۱/۲۵

Regd No. L-353
Monthly 'ALFURQAN' Lucknow
VOL 38 NO. 12 FEBRUARY 197